

محمد کاظم

# عربی ادب کی تاریخ

دور جاہلیت سے موجودہ دور تک

سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور



Scanned with CamScanner


برقی کتب (E-book) کی دنیا میں خوش آمدید
آپ ہمارے کتابی سلسلے کا حصہ بن سکتے ہیں
مزید اس طرح کی شان دار، مفید اور نایاب کتب کے
حصول کے لیے ہمارے واٹس ایپ گروپ کو جوائن
کریں
ایڈمن پینل :
محمد ذوالقرنین حیدر : 03123050300
محمد ثاقب ریاض : 03447227224
سدرہ طاہر : 03340120123

# عربی ادب کی تاریخ

دورِ جاہلیت سے موجودہ دور تک

محمد کاظم

سنگِ میل پبلی کیشنز، لاہور

892.7 Kazim, Mohammad
Arbi Adab Ki Tarikh : Daur-e-Jahliyyat Say Majoodah Daur Tak/ Mohammad Kazim.- Lahore : Sang-e-Meel Publications, 2004.
511p.
1. Arabic Literature. 2. History.
I. Title.



2004
نیاز احمد نے
سنگ میل پبلی کیشنز لاہور
سے شائع کی۔

ISBN 969-35-1545-5

Sang-e-Meel Publications
25 Shahrah-e-Pakistan (Lower Mall), P.O. Box 997 Lahore-54000 PAKISTAN
Phones: 7220100-7228143 Fax: 7245101
http://www.sang-e-meel.com e-mail: smp@sang-e-meel.com
Chowk Urdu Bazar Lahore Pakistan Phone 7667970

حاجی حنیف اینڈ سنز پرنٹرز لاہور

الاستاذ مسعود الندوی کے نام

جنہوں نے عربی زبان وادب میں میرے ذوق کی تربیت کی



Scanned with CamScanner

# ترتیب

علم نحو اور اس کے رجال: سیبویہ۔ کسائی۔ فرآء۔ ابن الحاجب۔ ابن مالک۔ ابن ھشام۔
علم لغت اور مؤلفینِ لغات: الخلیل بن احمد۔ ابن درید۔ ابو علی القالی۔ ازھری۔ جوھری۔
ابن سیدہ۔ زمخشری۔ ابن منظور اور لسان العرب۔ فیروز آبادی۔ مرتضی زبیدی۔
عربی زبان میں ادب و شعر کے مجموعے (Anthologies) اور مختارات (Selections) البیان والتبیین (جاحظ)۔ ادب الکاتب (ابن قتیبہ) الکامل فی اللغۃ والادب (المبرد)۔ العقد الفرید (ابن عبدربہ) کتاب الامالی (ابو علی القالی)۔ کتاب الأغانی (ابوالفرج اصفہانی) نہایۃ الارب فی فنون الادب (نویری)۔ حیاۃ الحیوان (دمیری) صبح الأعشی فی صناعۃ الانشاء (قلقشندی)
علم تاریخ اور مشہور مؤرخین
شرعی علوم: علوم حدیث اور علم فقہ
عربی ادب میں قصے اور حکایات: لوک کہانیاں...... الف لیلہ ولیلہ

## باب ۷ عربی ادب کا موجودہ دور (انیسویں صدی کے آغاز سے بیسویں صدی کی دوسری تہائی تک) 386

موجودہ دور کا تعارف...... عربوں کی بیداری کے وسائل (مدارس۔ وفود۔ جامع ازہر۔ جامعۂ مصریہ۔ چھاپے خانے۔ صحافت۔ ادبی اکیڈمیاں)۔ اہل قلم اور ادباء: جمال الدین افغانی۔ شیخ محمد عبدہ۔ محمد رشید رضا۔ قاسم امین۔ جرجی زیدان۔ مصطفیٰ لطفی المنفلوطی۔
ماضی قریب کے اہم ادباء اور مصنفین: احمد امین۔ طٰہٰ حسین۔ احمد حسن الزیات۔ عباس محمود العقاد۔
جدید عربی شاعری اور اس کے پانچ گروہ۔ جدید دور کے اہم کلاسیکی شعراء: محمود سامی البارودی۔ اسماعیل صبری۔ احمد شوقی۔ حافظ ابراہیم۔ جمیل صدقی الزہاوی۔ معروف الرصافی۔ خلیل مطران۔
عربی ادب میں فکشن (افسانہ ناول اور ڈراما) کا رواج۔ عربی افسانہ اور افسانہ نگار۔ جون ۶۷ء کی شکست کے بعد کا عربی افسانہ...... عربی ناول اور اس کی پانچ اقسام...... ہر قسم سے ایک منتخب ناول کا تعارف...... ناول نگاری کا دوسرا اور پختگی کا دور...... اس دور کے آٹھ

منتخب ناول اور ناول نگار...... مصر کے ممتاز ناول نگار نجیب محفوظ کا تعارف۔ عربی ادب میں ڈراما: احمد شوقی کے منظوم اور توفیق الحکیم کے منثور ڈرامے۔

زمانۂ حال کی عربی شاعری...... ۱۹۴۰ء کے بعد کی عربی شاعری میں چار بڑے رجحانات: آزاد شاعری کی تحریک...... مجلۂ "شعر" کی تحریک...... حزیران (جون ۶۷ء کی شکست) کا تجربہ...... بیروت پر اسرائیلی غلبے کا تجربہ۔

المیۂ فلسطین سے پیدا ہونے والی مزاحمتی شاعری، اس کے اہم نمائندے اور ان کے کلام کے نمونے: نزار قبانی۔ فدوی طوقان۔ نازک الملائکہ۔ صلاح عبدالصبور۔ بدر شاکر السیاب۔ عبدالوہاب البیاتی۔ سمیح القاسم۔ محمود درویش۔


Scanned with CamScanner

# پیش لفظ

کسی زبان کے ادب کی تاریخ پڑھنے کی صحیح صورت تو یہی ہے کہ وہ اُس کی اپنی زبان میں پڑھی جائے۔ ہم نے انگریزی ادب کی تاریخ ہمیشہ انگریزی میں ہی پڑھی ہے۔ اب سے کئی سال پہلے محمد احسن فاروقی نے انگریزی ادب کی تاریخ اردو زبان میں لکھ کے شائع کی تھی۔ معلوم نہیں اس کا کیسا استقبال ہوا' لیکن یہ بات انوکھی ضرور لگی کہ آپ کو ملٹن کی شاعری اور شیکسپیئر کے ڈراموں سے اردو زبان میں متعارف کرایا جا رہا ہے اور ان کے نمونے اردو ترجموں کی صورت میں آپ کے سامنے لائے جا رہے ہیں۔ اس کی وجہ یہ کہ جو لوگ انگریزی ادب کی تاریخ سے آگاہ ہونا چاہتے ہیں وہ اتنی انگریزی تو جانتے ہی ہوں گے کہ وہ تاریخ خود انگریزی زبان میں پڑھ سکیں۔

لیکن عربی زبان کا معاملہ دوسرا ہے۔ ہمارے یہاں جو لوگ عربی ادب کی تاریخ میں کسی قدر دلچسپی رکھتے ہیں اور اس سے واقف ہونا چاہتے ہیں' ان میں ہمارا اعلیٰ تعلیم یافتہ طبقہ بھی ہے' ہمارے ادباء وشعراء بھی ہیں' ہماری یونیورسٹیوں کے طلبہ اور ان کے اساتذہ بھی ہیں' اور یہ سب لوگ (سوائے عربی کے اساتذہ کے) عربی زبان کا اتنا علم نہیں رکھتے کہ عربی ادب کی تاریخ عربی زبان میں پڑھ سکیں۔ اُدھر ادب کی تاریخ لکھنے والے عرب مصنفین نے یہ ستم کیا ہے کہ یہ تاریخ سادہ اور عام فہم زبان میں لکھنے کی بجائے اس طرح لکھی ہے کہ جیسے وہ تاریخ نہیں لکھ رہے ادب عالیہ تخلیق فرما رہے ہیں۔ چنانچہ ان کی کتابوں کا سمجھنا اور ان سے پورا فائدہ اٹھانا ایک اوسط عربی خواندہ شخص کے لیے بہت مشکل ہے۔ ایسی صورت حال میں یہ ضرورت ہمیشہ رہی کہ عربی ادب کی تاریخ اردو زبان میں لکھ کے پیش کی جائے' تا کہ وہ تمام طبقے جن کا اوپر ذکر ہوا اور جو عربی زبان کی شُد بد نہیں رکھتے۔ اس سے اپنے اپنے انداز میں فائدہ اُٹھا سکیں۔

اس ضرورت کو پورا کرنے کے لیے برصغیر میں کچھ کام یقیناً ہوا ہے۔ اردو زبان میں اب تک عربی ادب کی تاریخ کے موضوع پر متعدد کتابیں لکھی گئی ہیں، جن میں سے ایک عبدالرحمان طاہر سورتی کی "تاریخ ادب عربی" ہے جو عربی میں مصری ادیب احمد حسن الزیات کی مشہور و متداول کتاب "تاریخ الادب العربی" کا اردو ترجمہ ہے۔ سورتی کی یہ کتاب، باوجود خواہش کے، میں نہیں دیکھ سکا۔ (ہماری یونیورسٹی لائبریریوں میں نصاب سے متعلق کتابیں دستیاب نہیں رہتیں) لیکن حیران ہوں کہ انہوں نے یہ ترجمہ کیسے کیا ہوگا اس لیے کہ زیات لغوی ادیب ہونے کی وجہ سے بہت مشکل اور گٹھی ہوئی (Compact) زبان لکھتے ہیں اور ان کے جملے بھی اکثر مزدوج اور موزوں ہوتے ہیں۔ ایک دوسرا ترجمہ مستشرق ایچ اے آر گب کی کتاب Introduction to History of Arabic Literature کا سید محمد اولاد علی گیلانی نے کیا جو ۱۹۵۹ میں مجلس ترقی ادب لاہور نے شائع کیا۔ یہ ترجمہ کتاب کے پہلے ایڈیشن مطبوعہ ۱۹۲۶ء سے کیا گیا، جو عربی ادب کی مختصر ترین تاریخ ہی کہلایا جا سکتا ہے۔ اس کتاب کا دوسرا اضافہ شدہ ایڈیشن کچھ بدلے ہوئے نام کے ساتھ ۱۹۶۳ء میں آیا جو اس وقت متداول ہے اور جس کا اردو میں ترجمہ ہونا شاید ابھی باقی ہے۔ ان کے علاوہ ترجمے کی صورت میں کچھ جزوی کوششیں بھی ہوئی ہیں۔ مثلاً ابن قتیبہ کی کتاب "الشعر والشعراء" کا اردو ترجمہ "شعر العرب" کے نام سے عبدالصمد صارم ازہری نے کیا۔ اسی طرح عربی ادب کی تاریخ کی دوسری مشہور کتاب "الوسیط فی الادب العربی" کے نصف حصے کا ترجمہ پروفیسر عبدالقیوم نے کیا۔ لیکن یہ دوسری کتاب بھی دستیاب نہیں ہے۔

اس موضوع پر اورجنل کتاب ڈاکٹر عبدالحلیم ندوی کی "عربی ادب کی تاریخ" ہے جو اپنی دو جلدوں (تقریباً ۷۲۰ صفحات) میں صرف خلفائے راشدین کے زمانے تک پہنچ پائی ہے۔ کتاب بہت محنت سے لکھی ہوئی اور اپنے موضوع پر معلومات کا ایک بیش بہا خزانہ ہے۔ خدا کرے ڈاکٹر صاحب اپنا یہ منصوبہ مکمل کر پائیں جو عربی ادب کے آخری اور جدید دور تک آتے آتے تین ہزار سے کم صفحات میں کہاں سمٹ پائے گا۔ ایک دوسری کتاب حیدر آباد دکن سے سید ابوالفضل نے "تاریخ ادبیات عربی" کے عنوان سے لکھی۔ اسی طرح الہ آباد یونیورسٹی کے ڈاکٹر زبیر احمد نے ادب العرب (داستان مشاہیر عرب) کے نام سے عربی ادب کی تاریخ لکھی۔ یہ دونوں کتابیں چونکہ میں نہیں دیکھ سکا، اس لیے ان کے بارے میں کوئی اظہار خیال نہیں کر سکتا۔ جزوی تاریخ ادب کے ضمن میں ایک تازہ کتاب سید ضیاء الحسن ندوی کی "عربی ادب دیار غیر میں" ہے، جس میں مہجر کے ادباء (یعنی شمالی اور جنوبی امریکہ کو ہجرت کر جانے والے عرب ادباء) کے حالات اور کلام کا تفصیلی جائزہ لیا گیا ہے اور کتاب کوئی شک نہیں محنت سے لکھی ہوئی ہے۔

عربی ادب کی تاریخ کے موضوع پر اردو زبان میں یہی چند کتابیں ہیں جو میرے محدود علم میں ہیں (اور میرا



Scanned with CamScanner

علم اس بارے میں واقعی محدود ہے) ان کے علاوہ اگر کوئی کتاب موجود ہے تو میں اس سے آگاہ نہیں ہوں۔ اب ان سب کتابوں کو دیکھتے ہوئے کہا جا سکتا ہے کہ یہ عربی ادب کی تاریخ کے بارے میں معلومات تو مہیا کرتی ہیں' لیکن ان میں سے کچھ تو ترجمے کی صورت میں ہیں اور کچھ اور مجمل اور مفصل تو ہیں' لیکن ابھی نامکمل ہیں اور زیادہ تر کتابیں بازار میں دستیاب نہیں ہیں اور تقریباً ناپید ہیں۔ اس لیے ایک ایسی کتاب کی ضرورت ایک عرصے سے تھی جو ترجمہ ہونے کی بجائے اصل اور طبع زاد ہو اور وہ عربی ادب کی تاریخ کے تمام ادوار کا' دور جاہلیت سے لے کر موجودہ دور تک' جہاں تک ممکن ہو احاطہ کرے۔ اس ضرورت کے پیش نظر ''عربی ادب کی تاریخ'' کی یہ کتاب لکھی گئی ہے' جو امید ہے پڑھنے والوں کی توقعات پر کافی حد تک پورا اترے گی اور اسے پڑھتے ہوئے وہ ایک بڑے ادب کی دنیا کی سیر کر سکیں گے۔

☆......☆......☆

عربی ادب کی تاریخ اگر ایک پیراگراف میں بیان کی جائے تو وہ یوں ہوگی کہ اس کے پانچ بڑے دور ہیں۔ ایک جاہلی دور (امرؤالقیس اور زُہیر اور نابغہ والا) دوسرا صدرِ اسلام اور بنواُمیہ کا دور (نعتیہ قصیدہ بانت سعاد والے کعب بن زُہیر اور حسان بن ثابت اسی دور میں ہوئے۔ ان کے علاوہ خالص عشقیہ شاعری کے شعراء جمیل اور عمر بن ابی ربیعہ کا بھی یہی دور تھا۔ پھر اخطل' فرزدق اور جریر جیسے اکابر شعراء بھی اسی دور میں ادب کے اُفق پر چھائے رہے) تیسرا عباسی دور (جو ابوالعتاہیہ' ابونواس' ابو تمام' متنبّی اور ابوالعلاء معرّی جیسے دانشور شعراء کا دور تھا)۔ پھر چوتھا دور ہے جو اندلسی' فاطمی اور ترکی ادوار کو محیط ہے۔ (اندلس میں ابن زیدون اور قید خانے میں فریاد کرنے والے معتمد بن عبّاد' فاطمی دور میں صوفی شعراء ابن الفارض اور ابن العربی اور ترکی دور میں قصیدہ بُردہ والے بوصیری زیادہ معروف نام ہیں) اس کے بعد آخری اور پانچواں دور آتا ہے (جس میں پہلے احمد شوقی' حافظ ابراہیم اور خلیل مطران نمایاں رہے اور پھر زمانہ قریب کی نسل کے شعراء اور بالخصوص مزاحمت کے شعراء میں سے نزار قبانی' نازک الملائکہ' بدر شاکر السیاب' عبدالوہاب البیاتی' سمیح القاسم اور محمود درویش نے سٹیج سنبھال لیا۔) اوپر ان پانچ ادوار کا مختصر تذکرہ شاعری کو سامنے رکھ کر کیا گیا۔ اس کے علاوہ عربی نثر بھی ہر دور میں رہی۔ خاص طور پر عباسی دور میں اس نے ارتقا کی اعلیٰ منزلیں طے کیں اور جاحظ جیسا بے مثال نثر نگار پیدا کیا۔ عربی نثر میں البتہ جو بڑا علمی کام ہوا وہ چوتھے دور (یعنی اندلسیوں' فاطمیوں اور ایوبیوں) کے مؤخر زمانوں میں ہوا۔ یاقوت الحموی کی معجم البلدان' ابن خلکان کی وفیات الاعیان' ابن منظور کی لسان العرب (عربی زبان کی سب سے بڑی لغت) قلقشندی کی صبح الاعشیٰ اور فلسفۂ تاریخ کے مشہور عالم ابن خلدون کا ''مقدمہ''...... یہ سب اور کچھ دوسری شہرۂ آفاق تصانیف اسی دور میں

منصۂ شہود پر آئیں۔ عجیب بات ہے کہ اس زمانے میں عربی شاعری تو زوال و ادبار سے دوچار رہی' لیکن عربی نثر میں ایسا کام ہوا جو رہتی دنیا تک باقی رہے گا۔

عربی ادب کی یہ تاریخ لکھتے ہوئے میں نے حتی الوسع یہ کوشش کی ہے کہ اس میں ادب کی کوئی اہم شخصیت یا کوئی اہم صنف چھوٹنے نہ پائے۔ لیکن یہ موضوع اتنا وسیع ہے اور پندرہ صدیوں پر پھیلا ہوا اس کا زمانہ اتنا طویل ہے کہ اگر اس تاریخ کے کچھ گوشے ایسے رہ گئے ہوں جہاں میں نہیں جا سکا تو اس کی بڑی وجہ کتاب کے حجم کی فکر ہو سکتی ہے۔ خاص طور پر آخری اور موجودہ دور والے باب میں مجھے یوں لگا کہ اگر میں نے قریبی دور کے ادباء کے حالات اور ان کی تخلیقات کا (جن میں مہجر کے شعراء بھی شامل ہیں) ذرا زیادہ تفصیل کے ساتھ جائزہ لیا تو کتاب کا یہی باب تین سو صفحات تک پھیل جائے گا۔ چنانچہ طوعاً و کرہاً مجھے اپنا ہاتھ روک کے لکھنا پڑا۔ ویسے غالباً طٰہٰ حسین نے یہ کہا ہے کہ عربی زبان میں عربی ادب کی مکمل تاریخ آج تک نہیں لکھی گئی۔ اگر عربی زبان میں مکمل تاریخ نہیں لکھی جا سکی' تو اردو زبان تو اس کا دعویٰ بالکل نہیں کر سکتی کہ اس میں عربی ادب کی جو تاریخ لکھی جائے گی وہ ہر لحاظ سے مکمل ہو گی۔

☆......☆......☆

ایک بات جس کی طرف توجہ دلانا ضروری ہے یہ ہے کہ اس کتاب میں سنین جہاں جہاں بھی آئے ہیں وہ سب عیسوی ہیں۔ اسی لیے عموماً ان کے آگے ہمزہ (ء) کا نشان نہیں لگایا گیا۔ دنیا میں تاریخ کی اور دوسرے علوم کی کتابیں ہمیشہ عیسوی تقویم ہی استعمال کرتی ہیں اور ہمیں اس کی ایسی عادت پڑ گئی ہے کہ عیسوی تقویم سے ہم کسی واقعے کے وقت اور زمانے کا تعین بہتر انداز میں کر سکتے ہیں اور اگر ہمیں کبھی عیسوی سن کے مقابل ہجری سن معلوم کرنا ہو تو وہ ایک سادہ سے فارمولے سے بآسانی معلوم ہو سکتا ہے' جو اس کتاب کے آخر میں دیا ہوا ہے۔

اس کتاب میں جو عربی نام آئے ہیں ان میں سے بعضوں سے میں نے الف اور لام حذف کر دیا ہے۔ اس خیال سے کہ یہ نام پڑھنے میں بوجھل نہ محسوس ہوں۔ مثلاً الجاحظ کو میں نے جاحظ لکھا ہے اور المتنبی کی جگہ متنبی' کہ یہ نام الف لام کے بغیر سبک لگتے ہیں اور ہمارے ہاں یہ اسی طرح معروف ہیں۔ البتہ بعض ناموں کے معاملے میں الف لام محذوف کرنا مناسب نہیں لگا' اس لیے کہ یہ نام الف لام کے ساتھ ہی زیادہ معروف ہیں۔ مثلاً الخلیل بن احمد (مشہور عالمِ لغت)' الشریف الرضی (شاعر) القاضی الفاضل (انشا پرداز)

کتاب میں جہاں جہاں عرب شعراء کے کلام کے نمونے دیئے گئے ہیں ان پر پورے اعراب نہیں لگائے گئے۔ میری خواہش تو یہ تھی کہ یہ سارے اشعار نیز عربی نثر کے سارے نمونے پوری طرح مشکول ہوں۔ لیکن کمپیوٹر پر عربی کمپوزنگ کی مشکلات کو سامنے رکھتے ہوئے میں نے صرف ضروری جگہوں پر اعراب لگائے ہیں۔ دوسری صورت میں ایک تو کمپوزنگ کا کام بہت بڑھ جاتا ہے' دوسرے پروف ریڈنگ میں احتیاط کے باوجود غلطیوں کا امکان رہ جاتا۔ اب جو قارئین عربی زبان سے واقف ہیں وہ تو پورے اعراب کے بغیر بھی ان شعروں کو پڑھ اور سمجھ لیں گے اور جو اصحاب عربی زبان کا زیادہ علم نہیں رکھتے انہیں اس سے کوئی فرق نہیں پڑے گا کہ اعراب پورے ہیں یا جزوی!

عربی شاعری میں یہ دستور ہے کہ کبھی کبھار وزن کی ضرورت کے تحت ایک لفظ کو دو مصرعوں میں یوں تقسیم کیا جاتا ہے کہ اس کا ایک حصہ پہلے مصرعے میں اور دوسرا حصہ دوسرے مصرعے میں آتا ہے' اور ان دونوں ٹوٹے ہوئے حصوں کو عموماً ایک لکیر سے جوڑا جاتا ہے۔ ہمارے ہاں پہلے کتابت کی صورت میں بھی یہ کام آسان نہیں تھا' اور اب کمپیوٹر کی کمپوزنگ میں ایک لفظ کو دو مصرعوں میں تقسیم کرنے کا کام خاصا مشقت طلب اور غلطیوں کے امکانات سے بھرا ہوا ہے۔ اس لیے میں نے ایسے مقامات پر (جو تعداد میں زیادہ نہیں ہیں) الفاظ کو بجائے توڑنے کے ایک ہی مصرعے میں رہنے دیا ہے اور کوشش کی ہے کہ شعر پڑھتے ہوئے ایک عام قاری کو اس کا احساس نہ ہونے پائے۔ ٹھیٹ عروضیوں کا معاملہ البتہ دوسرا ہے' اس لیے ان سے معذرت کیے بغیر چارہ نہیں۔

☆......☆......☆

یہ کتاب لکھتے ہوئے میں نے اپنے فاضل دوست ڈاکٹر خورشید رضوی کی بعض کتابوں سے خاصا استفادہ کیا۔ ان کی ایک مختصر کتاب ہے ''عربی شاعری'' (آغاز تا عہد بنی امیہ) اس میں جاہلی اور دوسرے شعراء کے کلام کے جو تراجم انہوں نے کیے ہیں' ان میں سے بعض اشعار کے تراجم جو مجھے بہت اچھے لگے وہ میں نے اپنی کتاب میں جوں کے توں یا معمولی ردّ و بدل کے ساتھ استعمال کر لیے۔ اسی طرح ان کے مضامین کے مجموعے ''تالیف'' میں مصر کے ممتاز ناول نگار نجیب محفوظ پر ان کا ایک بھرپور مضمون ہے۔ میں جب آخری باب میں نجیب محفوظ کا تعارف کرانے لگا تو مجھے یہ مناسب معلوم ہوا کہ اس مضمون میں سے دو پیراگراف لے کر اپنی کتاب میں' حوالے کے ساتھ' نقل کر دوں۔ استفادے کی ان دونوں صورتوں کے لیے میں ڈاکٹر خورشید رضوی کا تہ دل سے ممنون ہوں۔



Scanned with CamScanner

☆......☆......☆

کتاب اب آپ کے سامنے ہے۔ ہر انسانی کوشش کی طرح میری اس کوشش میں بھی کوتاہی اور خطا کا امکان موجود ہے۔ میں ان اصحاب علم وفضل کا احسان مند رہوں گا جو اس کتاب کے ضمن میں میری ان کوتاہیوں اور لغزشوں کی نشاندہی فرمائیں گے۔ تاکہ کتاب کے آئندہ ایڈیشن میں ان کا ازالہ کیا جا سکے۔

وما توفیقی الا باللہ

محمد کاظم



Scanned with CamScanner

## باب ۱

# تمہید

## عربی زبان

دنیا کی سب سے بڑی اور قدیم زبانیں تین ہیں: سامی' آریائی اور حامی۔ پھر ان میں سے ہر ایک زبان کی آگے کئی کئی شاخیں ہیں اور ہر شاخ کی آگے کچھ اور شاخیں ہیں۔

چنانچہ سامی زبان کی شاخیں یہ ہیں: آرامی' کنعانی اور عربی۔

آرامی زبان کی شاخیں ہیں : کلدانی' اشوری' سریانی

کنعانی زبان کی شاخیں ہیں : عبرانی' فینیقی

پھر عربی زبان کی آگے یہ شاخیں ہیں : فصیح مضری زبان اور یمن اور حبشہ کے قبائل کی زبان

آریائی زبان کی شاخیں حسبِ ذیل ہیں : لاطینی' یونانی اور سنسکرت

اس طرح عربی ایک سامی زبان ہے یعنی ان قوموں کی زبان جو حضرت نوحؑ کے بیٹے سام کی نسل سے تھیں۔ سامی اقوام کا وطنِ اوّل وادئ فرات یا دجلہ اور فرات کے درمیان کا علاقہ تھا۔ جب یہ تعداد میں زیادہ ہو گئے تو آس پاس کے علاقوں میں پھیل گئے۔ بابلی اور اشوری عراق میں آ گئے' آرامی شام میں' عبرانی فلسطین میں' فینیقی ساحلِ شام اور لبنان میں' عرب جزیرہ نمائے عرب میں اور کچھ دوسرے لوگ حبشہ چلے گئے۔ گمانِ غالب یہ ہے کہ سامی زبانوں میں عربی زبان ہی اصل اور بنیادی زبان کے سب سے زیادہ قریب ہے۔ اس لیے کہ یہ دنیا سے کٹ کر رہنے کی وجہ سے ان تغیرات و انقلابات سے محفوظ رہی جن سے دوسری زبانیں دوچار ہوئیں۔

چنانچہ عربی زبان دنیا کی قدیم زبانوں میں سے ایک ہے اور اس وقت دنیا کی زندہ زبانوں میں یہ غالباً سب سے پرانی ہے۔ ۶۱۰ء میں اسلام کے ظہور سے پہلے یہ جزیرہ نمائے عرب میں موجود تھی اور نہ صرف موجود تھی بلکہ اپنے ارتقاء اور کمال کی ساری منزلیں طے کر چکی تھی۔ اس زبان میں شاعری اور خطابت کے جو نمونے اسلام سے پہلے کے زمانے میں ملتے ہیں وہ فن کا بہت اعلیٰ معیار پیش کرتے ہیں۔

جزیرہ نمائے عرب میں اسلام سے پہلے کے زمانے کو زمانۂ جاہلیت کہتے ہیں اور اس دور میں ہونے والی شاعری کو جاہلی شاعری کا نام دیا جاتا ہے۔ لیکن جاہلیت کو جہالت کے ساتھ خلط ملط نہیں کرنا



Scanned with CamScanner

چاہیے۔ یہ جہالت سے مختلف چیز ہے۔ جہالت کے معنی ہیں اَن پڑھ اور بے علم ہونا۔ لیکن جاہلیت نام ہے زندگی کے معاملات میں نامعقولیت' بے انصافی اور ڈھٹائی کا رویہ اختیار کرنے کا نیز اس میں ایک خدا کو چھوڑ کر کئی بتوں کی پرستش کرنے کا مفہوم بھی شامل ہے۔ دورِ جاہلیت کی شاعری کن مراحل سے گزر کر پروان چڑھی اور کتنے عرصے میں یہ اپنے اوجِ کمال کو پہنچی' اس کا کوئی سراغ نہیں ملتا۔ اس کے سب سے قدیم نمونے جو دستیاب ہیں وہ ظہورِ اسلام سے ڈیڑھ سو برس پہلے تک جاتے ہیں۔ اس طرح عربی زبان کی معلوم عمر ساڑھے پندرہ سو برس سے بھی متجاوز ہے۔ تاہم اس کی لغت' اس کی صرف و نحو اور اس کا محاورہ اور روزمرّہ آج بھی وہی ہے جو پندرہ سو برس پہلے تھا۔ کوئی شک نہیں کہ اس خصوصیت میں دنیا کی کوئی دوسری زبان اس کا مقابلہ نہیں کرتی۔ (موازنہ کے لیے یوں دیکھیے کہ انگریزی زبان کی عمر تقریباً چھ سو سال ہے' اردو زبان کی تقریباً چار سو سال البتہ فارسی زبان ان دونوں سے قدیم ہے اور اس کی عمر گیارہ سو برس سے کچھ متجاوز ہے۔)

عربی زبان ایک زمانے تک جزیرہ نمائے عرب تک محدود رہی۔ جب اس سرزمین پر اسلام کا ظہور ہوا اور محمد ﷺ پر قرآن نازل ہونے لگا تو وہ اسی عربی زبان میں نازل ہوا جو اس خطے میں بولی اور سمجھی جاتی تھی۔ اسلام کچھ عرصہ تو جزیرہ نمائے عرب کی حدود میں رہا لیکن پھر اپنی فتوحات کے نتیجے میں دنیا میں پھیلتا چلا گیا اور جہاں جہاں بھی عرب مسلمان گئے عربی زبان بھی ان کے ساتھ گئی اور جن ملکوں پر عربوں کا تسلط قائم ہوا وہ رفتہ رفتہ ان ملکوں میں رواج پا گئی۔ اس طرح وقت کے ساتھ ساتھ عربی زبان دنیا کے بہت سے ممالک میں بولی اور سمجھی جانے لگی اور آخرکار وہاں کی زبان قرار پائی۔ آج جسے ہم عربی زبان کہتے ہیں وہ اب مندرجہ ذیل ممالک کی زبان ہے :

سعودی عرب' کویت' متحدہ عرب امارات' عمان' قطر' بحرین' یمن' عراق' شرق اردن' شام' لبنان' فلسطین نیز شمالی افریقہ کے ممالک : مصر' سوڈان' لیبیا' تیونس' الجزائر اور مراکش۔

لیکن یہ عربی زبان دو طرح کی ہے : ایک فصیح عربی جسے فصحیٰ کہتے ہیں' جو قرآن کریم کی زبان ہے' جو لکھنے پڑھنے کی زبان ہے اور جس میں عرب ممالک میں کتابیں' رسالے اور اخبار شائع ہوتے ہیں۔ یہ زبان مذکورہ بالا تمام ممالک کی زبان ہے اور اپنے قواعد اور ذخیرۂ الفاظ کے اعتبار سے ایک ہی ہے اور ہر جگہ سمجھی جاتی ہے۔ دوسری عامی عربی' جسے ہر ملک میں مقامی لوگ بولتے ہیں۔ اسے علاقائی زبان بھی کہتے ہیں اور یہ علاقائی زبانیں ایک دوسرے سے بہت مختلف واقع ہوئی ہیں۔ یہاں تک کہ بعض اوقات ایک عرب ملک کے باشندے دوسرے عرب ملک کی یہ مقامی بولی آسانی سے نہیں سمجھ سکتے۔ جب ہم عربی ادب کی تاریخ کی بات کرتے ہیں تو اس سے لازماً فصیح عربی مراد ہوتی ہے جس کا ادب تمام عرب



Scanned with CamScanner

ممالک میں پڑھا اور سمجھا جاتا ہے اور یہ ادب تخلیق کرنے والوں میں ان سب ملکوں کے ادباء اور شعراء کا حصہ زمانۂ قدیم سے اب تک رہا ہے۔

## عرب قوم کی تاریخ، ان کے علاقے اور مشہور قبائل

عرب قوم جس کا قدیم زمانے سے عربی زبان کے کسی نہ کسی ارتقائی مرحلے کے ساتھ تعلق رہا ہے، تاریخی زمانوں کے اعتبار سے تین طبقوں میں تقسیم کی جاتی ہے۔ پہلا عرب بائدہ، دوسرا عرب عاربہ اور تیسرا عرب مستعربہ!

**عرب بائدہ**...... یہ بہت قدیم عرب لوگ ہیں جن کا کوئی مستند حال معلوم نہیں ہے۔ سوائے ان بیانات کے جو قرآن یا حدیث میں ان کے بارے میں آئے ہیں۔ ان کے قدیم قبائل میں طسم، جدیس اور عاد اور ثمود تھے۔ عاد اور ثمود کا ذکر قرآن میں کئی مقامات پر آیا ہے جن سے معلوم ہوتا ہے کہ عاد، جو جنوب کی طرف احقاف میں رہتے تھے، بڑی متمدن قوم تھے اور بڑے بڑے ستونوں والی عمارتیں بناتے تھے۔ (کیا تم نے نہیں دیکھا کہ تمہارے رب نے اونچے اونچے ستونوں والے عاد ارم کے ساتھ کیا کیا؟ سورہ الفجر ۸۹ : ۶۔۷) ان کی طرف حضرت ہودؑ کو پیغمبر بنا کر بھیجا گیا۔ ثمود حجاز اور شام کے درمیان وادیٔ قری میں آباد تھے اور پہاڑوں کی چٹانوں کو کاٹ کر ان میں عمارتیں بناتے تھے۔ (اور ثمود، جنہوں نے وادی میں چٹانیں تراشی تھیں۔ سورہ الفجر ۸۹ : ۹) ان کی طرف حضرت صالحؑ کو پیغمبر بنا کر بھیجا گیا۔

**عرب عاربہ**...... یہ وہ لوگ تھے جو فرات کے علاقے سے آ کر یمن میں بس گئے تھے۔ ان کا تعلق یعرب بن قحطان سے تھا، جس کے متعلق یہ خیال کیا جاتا ہے کہ عربی زبان کی ابتداء اسی سے ہوئی تھی۔ ان کے بڑے قبائل میں کہلان اور حمیرَ تھے۔ ان کی مشہور حکومتیں سبا اور حمیرَ تھیں۔ سبا کی حکومت آٹھویں صدی قبل مسیح سے دوسری صدی قبل مسیح تک رہی۔ ان کی تہذیب کافی ترقی یافتہ تھی۔ خشکی کی راہ سے ہونے والی تجارت کے راستے میں ہونے کی وجہ سے یہ بہت خوش حال اور ترقی یافتہ لوگ تھے۔ انہوں نے آبپاشی کے لیے بند (Dams) بنائے تھے۔ لیکن جب بعد میں تجارت سمندر کے راستے سے ہونے لگی تو ان کی معاشی حالت زیادہ اچھی نہ رہی۔ ساتھ ہی جب مأرب کا بند ٹوٹا تو ملک میں سیلاب آ گیا، جس سے بڑی تباہی ہوئی اور یہ قوم بکھر کے رہ گئی۔ ان کے بعد حمیر آئے۔ ان کا زمانہ دوسری صدی قبل مسیح سے چھٹی صدی عیسوی تک ہے۔ ان کے حکمران یہودی مذہب کے پیرو تھے۔ بعد میں یمن کے

علاقے نجران میں عیسائی مراکز قائم ہو گئے۔ یہودی حکمرانوں نے جب یہ دیکھا تو وہ عیسائیوں پر مظالم ڈھانے لگے۔ اس پر ملک حبشہ نے' جو پہلے ہی عیسوی مذہب قبول کر چکا تھا' یمن کے مظلوم عیسائیوں کی مدد کے لیے یمن پر چڑھائی کر دی۔ اس جنگ میں یہودی حکمران کو شکست ہوئی اور ۵۲۵ء میں یمن پر حبشہ کا مکمل قبضہ ہو گیا۔

عرب مستعربہ...... یہ لوگ حضرت اسماعیلؑ کی اولاد تھے' جو انیسویں صدی قبل مسیح میں حجاز میں پروان چڑھے اور یہاں انہوں نے جرہم کے شاہی خاندان میں شادی کی۔ چنانچہ یہاں ان کی نسل چلی۔ لیکن یہ لوگ زمانے کی گرد میں ایسے گم ہوئے کہ ان کے بارے میں کچھ بھی پتا نہ چل سکا اور تاریخ میں پہلی بار جو نام گمنامی سے ابھر کر سامنے آیا وہ عدنان کا تھا اور اسی سے صحیح عربی نسب شروع ہوتا ہے۔ عدنان سے جو قبائل چلے ان میں سب سے مشہور ربیعہ اور مضر تھے۔ پھر ربیعہ اور مضر سے آگے بہت سے قبائل نکلے' جن میں سے کچھ مشہور قبائل اور ان کی شاخوں کے نام یہ ہیں:

ربیعہ سے عبدالقیس اور بکر اور تغلب

مضر سے قیس عیلان اور اس سے ہوازن اور غطفان۔ اور غطفان سے دو قبیلے عبس اور ذبیان۔

مضر سے ہی کنانہ اور اس سے قریش اور قریش سے آگے بہت سی شاخیں' جن میں سب سے اہم شاخ قصی سے ہوتی ہوئی عبد مناف اور ہاشم اور عبدالمطلب تک آئی۔ عبدالمطلب کے دس بیٹے تھے۔ جن میں سے ایک کا نام عبداللہ تھا۔ یہی عبداللہ ہمارے نبی ﷺ کے والد تھے۔

باوجود اس کے کہ ربیعہ اور مضر کے اب وجد ایک ہی تھے' ان کی ایک دوسرے کے سات سخت دشمنی رہی اور ان کے درمیان بڑی خونریز جنگیں واقع ہوئیں۔ پھر ان میں سے ہر ایک قبیلے کی اپنی شاخوں کے درمیان بھی بہت طویل جنگیں رہیں' جن کا ذکر ''ایام العرب'' کے عنوان سے کیا جاتا ہے۔ ان میں سے دو جنگیں خاص طور پر مشہور ہیں: ایک وہ جو قبیلہ ربیعہ کی دو شاخوں بکر اور تغلب کے درمیان ''حرب البسوس'' کے نام سے ہوئی اور اس کا سلسلہ چالیس سال تک چلتا رہا۔ اس کی وجہ قبیلہ بکر کی ایک عورت بسوس کی اونٹنی تھی جو مخالف قبیلے تغلب کے سردار کی چراگاہ میں پانی پینے چلی گئی۔ سردار نے اس اونٹنی کو تیر مار کر زخمی کر دیا اور اس سے بکر اور تغلب کے درمیان جنگ کا آغاز ہو گیا۔ دوسری جنگ وہ جو قبیلہ مضر کی دو شاخوں عبس اور ذبیان کے درمیان ہوئی جسے ''حرب داحس والغبراء'' کہتے ہیں۔ یہ جنگ جو گھڑ دوڑ کے ایک مقابلے میں ہار جیت کے اختلاف کی وجہ سے شروع ہوئی' یہ بھی چالیس برس تک چلتی رہی اور

اس میں دونوں طرف کے سینکڑوں آدمی لقمۂ اجل بنے۔ اسی طرح مضر کے دوسرے قبائل قریش اور کنانہ کے درمیان بھی مستقل جنگوں کا سلسلہ چلتا رہا اور اسے "حرب فجار" کا نام دیا گیا۔

عدنانیوں نے حجاز میں سکونت اختیار کی اور اس کے مختلف قبائل مختلف علاقوں میں بس گئے۔ مثلاً قریش نے مکہ اور اس کے اطراف میں سکونت اختیار کی، ثقیف طائف میں بس گئے، بنو تمیم بصرہ میں، ہوازن مکہ کے مشرق میں اور بنو اسد مشرقی تیماء اور مغربی کوفہ میں۔

## عربی ادب کی تاریخ کے پانچ دور

ہر قوم کی ادبی تاریخ کا اس کی سیاسی اور معاشرتی تاریخ کے ساتھ ایک واضح تعلق ہوتا ہے اور دونوں ایک دوسرے کے لیے لازم وملزوم ہوتے ہیں۔ تاہم ادبی حالات میں تغیر اور تبدیلی پہلے واقع ہوتی ہے اور وہ سیاسی اور اجتماعی حالات پر اثر انداز ہوتی ہے۔ چنانچہ کوئی سیاسی انقلاب ہو یا اجتماعی بیداری ہو، اس سے پہلے ہمیشہ ایک فکری انقلاب واقع ہوتا ہے، جو شعراء اور خطباء کے کلام میں اور اہل قلم کی تحریروں میں ظاہر ہوتا ہے اور اس سے آگے پھیل کر عام لوگوں تک پہنچ جاتا ہے۔ اس اعتبار سے عربی ادب کے مؤرخین اس کی تاریخ کو پانچ ادوار میں تقسیم کرتے ہیں۔ ایسا کرتے ہوئے وہ عباسی دور اور اندلسی دور کو تاریخ میں متوازی ہونے کے سبب ایک ہی دور قرار دیتے ہیں۔ لیکن ہم نے وضاحت اور سہولت کی خاطر اندلسی دور کو علیحدہ کر کے اسے زمانۂ انحطاط کے دو ادوار یعنی فاطمی دور اور ترکی دور سے پہلے رکھ دیا ہے، اس لیے کہ مؤخر الذکر دونوں دور کئی صدیوں کا عرصہ اندلسی دور کے متوازی چلتے ہیں۔

### ۱۔ جاہلی دور

یہ پانچویں صدی عیسوی کے وسط سے شروع ہوتا ہے، جب عدنانی قبائل یمن کے قحطانیوں سے آزاد ہو گئے تھے اور ۶۱۰ء میں آنحضرتؐ کی بعثت اور ظہور اسلام کے ساتھ ختم ہو جاتا ہے۔ اس دور میں جاہلیت کے وہ سات بڑے شعراء آتے ہیں جو سبع معلقات (در کعبہ پر آویزاں کی گئی سات بڑی نظموں) کے شعراء کہلاتے ہیں، یعنی امرؤ القیس، طرفہ، زہیر ابن ابی سلمیٰ، لبید، عمرو بن کلثوم، حارث بن حلزہ اور عنترہ بن شداد! ان کے علاوہ اس دور کے طبقۂ اولیٰ کے دوسرے شعراء یعنی نابغہ ذبیانی، اعشیٰ اور شنفریٰ کا شمار بھی بڑے جاہلی شعراء میں ہوتا ہے۔



Scanned with CamScanner

شاعری کے علاوہ اس دور میں کچھ ایسے خطیب بھی ہوئے جنہوں نے عربی کی مسجع اور مقفیٰ نثر کے کچھ اعلیٰ نمونے پیش کیے۔ ان میں قس بن ساعدۃ الایادی اور عمرو بن معدیکرب زبیدی زیادہ مشہور ہیں۔

## ۲۔ صدر اسلام اور اموی حکومت کا دور

یہ ظہور اسلام سے شروع ہو کر ۷۴۹ء میں عباسی حکومت کے قیام پر ختم ہوتا ہے۔ اس دور میں وہ شاعر بھی آتے ہیں جنہوں نے جاہلیت اور اسلام دونوں کا زمانہ پایا اور جنہیں مخضرم کہا جاتا ہے۔ دو ادوار کے ان شعراء میں نعتیہ قصیدہ بانت سُعاد کے شاعر کعب بن زُہیر، مشہور مرثیہ گو شاعرہ خنساءؔ دربار نبوت کے نعت گو شاعر حسان بن ثابتؓ اور مشہور ہجو گو حُطیۂ زیادہ نمایاں ہیں۔ دور اسلامی میں غزل کی (یعنی عشقیہ) شاعری کو رواج حاصل ہوا اور اس شاعری کے دو نمائندے جمیل اور عمر بن ابی ربیعہ بہت نمایاں رہے اور جب بنوامیہ کا دور آیا تو اس میں ایک تو سیاسی اور مناسباتی شاعری نے فروغ پایا، دوسرے اس کے ساتھ قدیم شاعری کے سارے متنوع موضوعات (مثلاً مدح، فخر، ہجو، مرثیہ، وصف وغیرہ) میں بہت جاندار شاعری ہونے لگی۔ نیز اکابر شعراء کے درمیان ہجو گوئی کے بڑے معرکے دیکھنے میں آئے۔ اس زمانے کے شعراء میں اخطل، فرزدق اور جریر نے فن کے بہت اعلیٰ نمونے پیش کیے۔

ادبی تاریخ کے اس دوسرے دور کے خطباء میں خود رسول اللہؐ سب سے ارفع مقام پر ہیں۔ ان کے بعد خلفاء عمرؓ بن الخطاب اور علیؓ ابن ابی طالب آتے ہیں۔ ان کے علاوہ سحبان وائل، زیاد بن ابیہ اور اموی گورنر حجاج بن یوسف نے خطابت میں بہت اعلیٰ معیار پیش کیا۔ اسی زمانے میں نثری تحریر کا رواج بھی پڑا اور کچھ لوگوں نے بعض خلفاء کے لیے کاتب (معتمد یا سیکرٹری) کا کام انجام دیا اور اس میں بڑی شہرت پائی۔ چنانچہ عبدالحمید الکاتب بطور میر منشی بہت نمایاں رہے۔ اس کے علاوہ اسی دور میں عاملوں کے لیے خلفاء کے پند و نصائح اور ان کے نام جاری کردہ مکاتیب اور ہدایت ناموں نے بھی عربی نثر کا بہت عمدہ نمونہ پیش کیا۔

## ۳۔ عباسی دور

یہ طویل دور عباسی حکومت کے قیام سے شروع ہو کر ۱۲۵۸ میں تاتاریوں کے ہاتھوں اس کے زوال پر ختم ہوتا ہے۔ اس کے متوازی اندلسی دور بھی ہے جس کا زمانہ آٹھویں صدی عیسوی سے لے کر



Scanned with CamScanner

پندرھویں صدی عیسوی تک ہے۔ عباسی دور میں جو بڑے اور نامور شعراء ہوئے ان میں بشار بن بُردُ ابو العتاہیہ' ابو نواس' ابن الرومی' ابن المعتز' ابوتمام' بحتری' متنبّی اور ابوالعلاء معری نمایاں ہیں۔ عربی ادب کے اس عباسی دور میں عربی نثر نے ارتقاء کی اہم منزلیں طے کریں اور ادب میں اسے بہت فروغ حاصل ہوا۔ اس میں ابن المقفع (مترجم کلیلہ و دمنہ)' جاحظ' ابن العمید' صاحب ابن عبّاد' خوارزمی' بدیع الزمان ہمذانی' حریری اور القاضی الفاضل نے نثر کی مختلف اصناف (مقالہ' رسائل' مواعظ' بحث و نقد اور تدوین وغیرہ) میں قابلِ قدر تخلیقی کام کیا اور عربی نثر کو کہیں سے کہیں پہنچا دیا۔ اس کے علاوہ اس دور میں ادبی اور شرعی علوم میں بہت بڑے بڑے نام سامنے آتے ہیں مثلاً نحو میں سیبویہ' لغت میں الخلیل ابن احمد' تاریخ میں ابن الاثیر' اسی طرح حدیث میں امام بخاری اور مسلم' نیز فقہ میں چاروں امام: ابوحنیفہ' مالک بن انس' شافعی اور احمد بن حنبل! اس دور میں حکایات اور مقامات کو بھی فروغ حاصل ہوا' چنانچہ کلیلہ و دمنہ' الف لیلہ ولیلہ اور مقامات ہمذانی اسی زمانے کی چیزیں ہیں۔

## ۴۔ اندلسی دور' فاطمی دور اور ترکی دور

یہ دور اندلس میں اموی حکومت کے قیام (۷۵۶) سے شروع ہو کر' فاطمی اور ترکی ادوار سے ہوتا ہوا احیائے جدید کے دور (۱۸۰۱) تک آتا ہے۔ اندلس میں عربوں کی اموی حکومت عبدالرحمان الداخل کے غلبے سے شروع ہوتی ہے۔ عربوں کے لیے اندلس کی سرزمین' وہاں کی آب و ہوا' وہاں کے قدرتی مناظر اور سبزہ ایک بالکل نئی چیز تھی اور اس نے ان کی عادات و اطوار اور رہن سہن کے طرز کو بہت متاثر کیا۔ عربوں کو اس نئی دنیا میں جب کچھ امن وسکون نصیب ہوا تو وہ شاعری کی طرف مائل ہوئے۔ اندلس کی شاعری میں ایک نیا ذائقہ اور کچھ مختلف طرزِ اظہار دیکھنے میں آیا۔ اور اس میں کوئی شک نہیں کہ اندلس میں عربوں کی موجودگی کے سات سو سال سے بھی زیادہ عرصے میں نہ صرف بہت اچھے اچھے شعراء پیدا ہوئے بلکہ مایۂ ناز نثر نگار' علماء اور فلاسفہ بھی ہوئے۔ اندلس کے شعراء میں ابن عبدربہ' ابن ہانی اندلسی' ابن زیدون' ابن خفاجہ اور لسان الدین الخطیب شعر و ادب کے افق پر بہت نمایاں ہیں۔

اندلسی دور کے دوسو سال بعد اور اس کے متوازی پہلے فاطمی دور آیا' پھر ایوبی آئے اور ان کے بعد ممالیک اور سلاطین بنی عثمان (ترکوں) نے اسلامی مملکت کی باگ ڈور سنبھالی۔ یہ آخری دور جس میں ممالیک اور ترک برسرِ اقتدار رہے پانچ سو برس پر پھیلا ہوا ہے اور عربی ادب کی تاریخ میں بہت ہی ویران دور ہے۔ اس میں عربی ادب انحطاط سے دوچار ہوا۔ اس سارے عرصے میں ایک شاعر بھی ایسا نظر

نہیں آتا جسے دورِ عباسی کے شعراء کے مقابل لایا جا سکے۔ اسی طرح ادبی نثر میں بھی کوئی قابل ذکر نمونے دیکھنے میں نہیں آتے۔ البتہ اس زمانے میں تصنیف و تالیف' سیرت و سوانح' ادبی روایات' لغت نویسی' تاریخ نگاری اور فلسفۂ تاریخ کے باب میں بہت عمدہ کام ہوا۔ وفیات الاعیان (ابن خلکان)' صبح الاعشیٰ (قلقشندی) القاموس المحیط (فیروز آبادی) اسی دور کی مایۂ ناز تصانیف ہیں۔ عربی زبان کی سب سے بڑی لغت ''لسان العرب'' اسی دور میں ابن منظور نے مرتب کی۔ تاریخ نویسی میں ابوالفداء اور ابن خلدون اسی زمانے میں ہوئے۔ ابن خلدون نے فلسفۂ تاریخ میں اپنا مشہورِ زمانہ ''مقدمہ'' لکھا۔ نیز عربی علم و ادب اور سوانح کے بڑے مجموعے اسی زمانے میں دیکھنے میں آئے۔ اس دور کے شعراء میں ابن الفارض' بوصیری اور صفی الدین حلی زیادہ معروف ہیں۔

### ۵۔ جدید دور

یہ مصر پر محمد علی پاشا کے غلبے (۱۸۰۱) سے لے کر اب تک چلا آتا ہے۔ اس دور میں عربی ادب اپنے طویل دورِ انحطاط سے نکل کر باہر آیا اور بدلے ہوئے حالات کے تقاضوں اور مغربی ادبیات کے اثر سے اس میں زبان و بیان کے نئے نئے اسالیب پیدا ہوئے۔ نیز ادب کی بعض اصناف مثلاً افسانہ' ڈراما اور ناول میں پہلی بار عربی زبان میں تخلیقات پیش کی گئیں۔ اس دور پر اب دو سو سال گزر چکے ہیں اور اس میں طبقہ اولیٰ کے شعراء و ادباء کی تعداد اتنی زیادہ ہے کہ ان کا احاطہ نہیں کیا جا سکتا۔ تاہم شعراء میں احمد شوقی' حافظ ابراہیم' خلیل مطران اور ادباء میں طٰہٰ حسین' احمد امین' احمد حسن الزیات' عباس محمود العقاد' محمد حسین ہیکل' توفیق الحکیم' نجیب محفوظ اور طیب صالح وہ چند نام ہیں جو نمونے کے طور پر لیے جا سکتے ہیں اور جن سے یہاں کا پڑھا لکھا طبقہ کسی قدر آشنا ہے۔ اسی دور کی آخری نصف صدی میں عربی شاعری میں مزاحمت(Resistance) کی وہ لہر دیکھنے میں آتی ہے جو فلسطین کے المیے کا نتیجہ ہے اور اس میں محمود درویش' سمیح القاسم اور نزار قبانی کے نام آجکل بہت معروف اور ہردلعزیز ہیں۔

## اسلام سے پہلے عربوں کی معاشرتی' سیاسی' مذہبی اور فکری زندگی

کسی ملک یا علاقے کی آب و ہوا کا اس کے باشندوں کی زندگی پر بہت گہرا اثر ہوتا ہے کہ اسی سے ان کا طرز بود و باش اور مزاج اور عادات متعین ہوتے ہیں۔ عرب کا خطہ زیادہ تر ریگستان ہے جہاں

بارش بہت کم ہوتی ہے اور قدرتی چشمے بھی نہیں ہیں۔ اس لیے یہاں موسمی فصلیں کاشت نہیں ہو سکتیں اور نہ ایک جگہ ٹک کر رہا جا سکتا ہے۔ چنانچہ عرب کے لوگ بیشتر صحرا میں بسنے والے بدّو ہوتے تھے جو خیموں میں رہتے تھے اور مویشی چراتے تھے۔ ان کی زندگی میں مویشی (اونٹ، بھیڑ بکریاں اور گھوڑے) ہی سب کچھ تھے۔ وہ ان کا دودھ پیتے، ان کا گوشت کھاتے اور ان کی اون وغیرہ سے اپنے لیے کپڑے بنتے اور پہنتے تھے۔ یہ عموماً خانہ بدوش لوگ ہوتے تھے۔ وہ اور ان کے جانور چونکہ پانی کے بغیر نہیں رہ سکتے تھے اس لیے ان کی زندگی کا سب سے بڑا مسئلہ پانی کی تلاش تھا۔ وہ اس کی خاطر مارے مارے پھرتے اور جہاں کوئی نخلستان یا پانی کا ذخیرہ دیکھتے وہاں پڑاؤ کر لیتے اور جب پانی کا یہ ذخیرہ ختم ہو جاتا تو اس جگہ کو چھوڑ کر آگے چل دیتے۔ عرب کے اکثر و بیشتر قبائل کا یہی حال تھا۔ سوائے قریش کے کہ وہ چونکہ کعبہ کے متولی اور نگران تھے اور ان کی تجارت ایک طرف یمن تک اور دوسری طرف شام تک پھیلی ہوئی تھی، اس لیے وہ مکہ اور اس کے نواح میں مقیم تھے اور ایک طرح سے شہری زندگی بسر کرتے تھے۔ یہی صورت جنوب میں قحطانی عربوں کی بھی رہی، اس لیے کہ ان کے ملک میں بارش ہوتی تھی اور زمینیں آباد تھیں جو کافی اناج اور کھجور پیدا کرتی تھیں اور ان کے ہاں بھی شہری زندگی اور تمدن کے آثار نظر آتے تھے.....
لیکن جہاں تک عرب کے صحرا میں رہنے والے لوگوں کی زندگی کا سوال تھا وہ بہت پر مشقت تھی۔ جب کافی عرصہ بارش نہ ہوتی اور زمینیں خشک ہو جاتیں تو ان کے قبائل ایک دوسرے پر حملہ کر کے پانی اور خوراک حاصل کرنے کی کوشش کرتے۔ اس طرح کی سرگرمیوں نے ان لوگوں کے دل سخت کر دیئے تھے اور ان کے درمیان ہمیشہ جنگیں برپا رہتی تھیں اور امن و صلح کی فضا شاذ و نادر ہی دیکھنے میں آتی تھی۔ ان حالات کی وجہ سے قبائلی عربوں کا مزاج یہ بن گیا تھا کہ وہ طاقت اور شجاعت پر فخر کرتے، اپنی زباندانی اور بلاغت سے دشمن کو مرعوب کرنے کی کوشش کرتے۔ اولاد میں بیٹوں کو پسند کرتے اور بیٹیوں کو عموماً زمین میں زندہ دفن کر دیتے۔ اپنے قبیلے کی کثرتِ تعداد کو دشمن کے مقابلے میں اپنی طاقت سمجھتے۔ خانہ بدوش زندگی کی عادت اور جدال و قتال کی مصروفیت نے ان کے اندر آزادی، عصبیت اور وحشیانہ عادات پیدا کر دی تھیں۔ ان کے ہاں نہ کوئی معاشرتی تہذیب تھی، نہ سیاسی حکومت اور نہ مذہبی فلسفہ۔ ان کا معاشرہ بس ان کے قبیلے اور خیمے تک محدود تھا۔ قوم اور امت کا ان کے ہاں تصور بھی نہیں تھا۔ حکومت قبائل کے سرداروں کے پاس تھی جو انہیں ورثے میں ملتی تھی اور وہ رائج دستور کے مطابق حکومت کرتے تھے۔ رائے عامہ کیا ہوتی ہے، آمریت کسے کہتے ہیں اور جمہوریت کس طرزِ حکومت کا نام ہے؟ اس بارے میں وہ کچھ بھی نہیں جانتے تھے۔ ان کے ہاں کوئی ایسا فوجی نظام نہیں تھا جو منظم اور مستحکم ہو، اس لیے کہ کامل فرمانبرداری اور اپنی ذات کی نفی ایک عرب کے خودسر اور مغرور مزاج سے بالکل لگا نہیں کھاتی تھی۔

اسلام سے پہلے عربوں کا مذہب بہت سادہ اور زاہدانہ تھا۔ ان کے ہاں اغریقیوں کی طرح بہت سے معبود اور بڑے بڑے ہیکل نہیں تھے' نہ ان کے ہاں اسطوری داستانیں تھیں اور نہ عقائد کا کوئی فلسفہ۔ ان کے ہاں البتہ دین ابراہیمی کی کچھ باقیات تھیں' جو ایک طویل زمانہ گزرنے پر اور جہالت اور خانہ بدوشی کی وجہ سے اپنی اصل صورت کھو چکی تھیں۔ چنانچہ ان کے ہاں اس کی شکل اب یہ رہ گئی تھی کہ وہ بتوں کی پوجا کرتے اور جو چھوٹے چھوٹے خدا انہوں نے بنا رکھے تھے ان کی تعظیم کرتے اور اپنے زعم میں اللہ کا تقرب حاصل کرنے کے لیے انہوں نے ان بتوں کو کعبہ میں نصب کر دیا تھا۔ عربوں کی اکثریت کا مذہب تو یہی بت پرستی تھا۔ لیکن اقلیت میں سے کچھ لوگ یمن' یثرب اور خیبر کے علاقے میں یہودی مذہب کے پیرو تھے اور کچھ دوسرے لوگ جو نجران اور حیرہ میں رہتے تھے اور قبیلہ طی اور غسانیوں سے ان کا تعلق تھا' انہوں نے عیسائی مذہب اختیار کیا تھا۔

خاندان' جو عربی قبیلے کی بنیاد تھا' باپ' ماں' اولاد' پوتے پوتیوں اور غلاموں پر مشتمل ہوتا تھا۔ خاندان میں باپ کا حکم چلتا تھا۔ وہی ان کی زندگی اور موت اور شادی بیاہ کا فیصلہ کرتا تھا۔ کبھی ایسا ہوتا کہ وہ بیٹی کو پیدا ہوتے ہی دفن کر دیتا اور کبھی عزت کی خاطر اپنی لونڈی کے بیٹے کو اپنانے سے انکار کر دیتا۔ باپ کے بعد ماں کا رتبہ ہوتا تھا۔ وہ اپنے خاوند اور گھرانے کی عزت و آبرو تھی اور خاوند کے ساتھ کئی امور میں شریک ہوتی تھی۔ بیٹا جس طرح باپ کے رشتے پر فخر کرتا تھا' اسی طرح ماں کا بیٹا ہونے پر بھی فخر کرتا۔ مرد ایک وقت میں متعدد بیویاں رکھ سکتا تھا اور ان کی تعداد پر کوئی قید نہیں تھی۔ باپ جب مر جاتا تو بیٹا عموماً (اپنی ماں کو چھوڑ کر) اس کی کسی بیوی سے شادی کر لیتا۔ لیکن بیٹی' بہن' خالہ اور چچی کے ساتھ شادی نہیں ہو سکتی تھی۔ خاندان کے افراد کا قبیلے کے ساتھ تعلق اس بنیاد پر تھا کہ "اپنے بھائی کی مدد کرو چاہے وہ ظالم ہو یا مظلوم۔"

بادیہ کے عربوں کی علمی اور ذہنی سطح معمولی درجے کی تھی۔ صرف یمن میں بعض قبائل اور شمال میں مناذرہ اور غساسنہ کے خاندان کسی حد تک علم سے بہرہ ور تھے' جس کا ثبوت یہ ہے کہ انہوں نے دریاؤں پر بند باندھے۔ ان سے اپنی زمینوں کو آباد کیا اور شہر بسائے۔ لیکن انہوں نے کہاں تک ترقی کی تھی اور ان کے علوم کی کیفیت کیا تھی' یہ ابھی تک معلوم نہیں ہو سکا۔ اس پر شاید زمانہ حال میں ہونے والی کھدائیاں کچھ روشنی ڈال سکیں۔

رہے عدنانی عرب تو ان کے مشاہدے کی قوت' زندگی کے تجربوں کی کثرت اور ضرورت کی مجبوری نے ان کو بعض ایسے علوم سے بہرہ مند کر دیا تھا جن کی بنیاد تجربے' مشاہدے اور خیال پر تھی۔ چنانچہ انہوں نے طب' دواسازی اور گھڑ سواری کے علوم میں مہارت پیدا کر لی تھی۔ اسی طرح انہیں ستاروں کا علم بھی

تھا اور وہ طوفانوں اور ہواؤں کا رُخ بھی پہچانتے تھے، جس سے انہیں یہ پتا چل جاتا تھا کہ عنقریب بارش ہوگی یا نہیں ہوگی۔ پھر انہیں نسب ناموں (انساب) کا بھی پورا علم تھا اور وہ جانتے تھے کہ کسی شخص کا نسب کیا ہے، یعنی وہ کس قبیلے سے ہے اور اس کے آباء و اجداد کون تھے۔ وہ اشعار اور واقعات جمع کرتے تھے اور اس طرح دوسروں پر اپنی علمیت اور برتری جتلاتے تھے۔ اس کے ساتھ ساتھ وہ قیافہ شناسی اور وجدانی مشاہدے کے لیے بھی مشہور تھے۔ وہ ایک بیٹے کو دیکھ کر یہ بتلا سکتے تھے کہ وہ اپنے باپ کا ہے یا نہیں اور ان کی روحانیات نے انہیں پیشگوئی کرنے اور لوگوں کی قسمت کا حال بتانے کی طرف بھی راغب کیا ہوا تھا۔

مختصر یہ کہ قبیلے سے باہر تو معاشرہ اگرچہ سیاسی، اقتصادی اور بول چال کے اعتبار سے کچھ پراگندہ سا تھا، لیکن قبیلے کے اندر وہ عقلی اور ادبی اعتبار سے خاصا مربوط تھا۔ اگر ہم عربوں کے بارے میں ان کی زبان اور ادب کی روشنی میں کچھ کہنا چاہیں تو یہی کہیں گے کہ وہ طاقتور شخصیتوں اور بیدار ذہنوں کے مالک تھے۔ انہوں نے زندگی میں کافی تجربے کیے تھے اور اپنے ماحول اور اطراف کے بارے میں کافی معلومات جمع کر رکھی تھیں۔ چنانچہ ان کی زبان جو ان کے معاشرے کی عکاسی کرتی ہے اس کو دیکھ کے لگتا ہے کہ ان کے سامنے کوئی ایسا مضمون اور خیال نہیں تھا جس کا تعلق انسان کی روح یا فکر سے ہو، اس کے معاشرے اور ماحول، یا اس کائنات کے مظاہر سے ہو اور اس کے لیے ان کے ہاں خاص الفاظ اور مفردات موجود نہ ہوں اور اس پر انہوں نے مختلف طریقوں سے اپنے شعروں میں یا اپنے خطبوں اور حکیمانہ اقوال میں اظہارِ خیال نہ کیا ہو۔

اس پس منظر کے ساتھ اب ہم عربی ادب کے جاہلی دور میں داخل ہوتے ہیں اور اس میں شعر و ادب کی کیفیت اور اس کے رجال پر گفتگو کرتے ہیں۔

☆......☆......☆



Scanned with CamScanner

باب ۲

# جاہلی دور

## عربی زبان کا ارتقا

عربی زبان، جس کے ادب کی ہم بات کرنے چلے ہیں عدنانیوں کی زبان تھی جو جزیرہ کے شمالی علاقے حجاز میں بولی جاتی تھی۔ جاہلی دور کی شاعری کا اتنا بڑا سرمایہ جو ہمارے سامنے ہے وہ اسی عدنانی لہجے میں ہے کیونکہ یہ جن شعراء کا کلام ہے ان کا تعلق شمال کے ربیعہ اور مضر قبائل سے تھا اور اگر کوئی شاعر نسلاً یمنی تھا بھی تو وہ ان قبائل سے تعلق رکھتا تھا جو وہاں سے ہجرت کر کے شمال کی طرف آ گئے تھے۔ مثلاً طی، کندہ اور تنوخ وغیرہ کے قبائل۔ پھر شمالی عرب کی زبان اور لہجوں نے جنوب کی زبانوں پر غلبہ تو حاصل کیا ہی تھا، ان زبانوں اور ان کے لہجوں پر جہالت، بدویت اور کھردرے پن کے جو اثرات چلے آتے تھے وہ بھی وقت کے ساتھ کم ہوتے چلے گئے تھے۔ پھر یہ ہوا کہ رفتہ رفتہ قبیلہ قریش کی زبان شمالی علاقے کی تمام زبانوں پر حاوی ہوگئی۔ جس کے کچھ مذہبی اور کچھ اقتصادی اور معاشرتی اسباب تھے، جن میں زیادہ اہم یہ تھے:

ا۔ **اسواق (میلے):** عرب لوگ یہ میلے سال کے کچھ مہینوں میں تجارت اور کاروبار کی غرض سے منعقد کرتے تھے۔ ان میلوں میں ملک کے اطراف سے عرب قبائل جمع ہوتے اور تجارتی لین دین کے علاوہ ان میلوں میں گھڑ دوڑ، تیر اندازی اور شہسواری کے مقابلے ہوتے۔ ان مقابلوں کے ساتھ ساتھ قبائل کے درمیان شعر و شاعری کا بھی مقابلہ ہوتا اور بڑے بڑے شعراء اپنا بہترین کلام یہاں پیش کرتے۔ دور کے علاقوں سے آئے ہوئے شعراء یہ کوشش کرتے کہ وہ جو کچھ کہیں وہ ایسی زبان اور ایسے محاورے میں ہو جو زیادہ سے زیادہ لوگ سمجھ سکیں اور اس میں کوئی اجنبیت یا غرابت نہ ہو۔ اس طرح عربی زبان رفتہ رفتہ مہذب اور عام فہم ہوتی چلی گئی۔ ان میلوں میں ''عُکاظ'' کا میلہ سب سے زیادہ مشہور تھا جو ذی القعدہ کے مہینے میں لگتا تھا اور اس میں شاعری کے مقابلے میں اس سال کے بہترین کلام کا فیصلہ کیا جاتا تھا۔

**۲۔ مکہ اور قریش کے اثرات :** عربی لہجوں میں وحدت پیدا کرنے اور عربوں کو بیدار کرنے میں مکہ کو کافی دخل تھا۔ اس لیے کہ چھٹی صدی کے دوسرے نصف سے مکہ ایک طرح کا تجارتی مرکز بن چکا تھا۔ جنوب سے آنے والے تجارتی قافلے ہند اور یمن کا سامان لے کر آتے اور مکہ والے ان سے یہ سامان خرید کر اسے شام اور مصر کی منڈیوں میں لے جا کر بیچتے۔ مکہ کے قرب و جوار کے تجارتی راستے چونکہ خانہ کعبہ اور قریش کے اثر و رسوخ کی وجہ سے کافی محفوظ و مامون تھے اس لیے تجارتی قافلے بے دھڑک مکہ سے گزرتے رہتے۔ پھر حج کے دنوں میں تو لوگ تمام عرب کے اطراف سے چل کر مکہ آتے اور بیت اللہ کا طواف کرتے۔ اس طرح مختلف قبائل کے درمیان محاورے اور بول چال کا تبادلہ ہوتا اور قبائل اور قریش کے درمیان اس تعامل (Interaction) کے نتیجے میں عربی زبان روز بروز نکھرتی چلی جاتی تھی۔ چنانچہ جاہلی شعراء اپنی شاعری میں یہی مرکزی زبان استعمال کرتے تھے۔ پھر جب قرآن بھی قبیلۂ قریش کی زبان میں نازل ہوا تو ان کی زبان کو باقی سب زبانوں اور لہجوں پر فوقیت حاصل ہوگئی اور اس کے ساتھ اسے پورے ملک میں بھی مرکزی حیثیت حاصل ہوگئی۔

## جاہلی نثر اور اس کے نمونے

کوئی بھی زبان ہو، اس میں نثر پہلے وجود میں آتی ہے اور شاعری بعد میں۔ اس لیے کہ نثر اظہار کا آسان اور قدرتی ذریعہ ہوا کرتی ہے جبکہ شاعری میں اظہار کے لیے ایک نظم اور ضابطے کا پابند ہونا پڑتا ہے۔ زمانۂ جاہلیت کی نثر دو طرح کی تھی ایک مسجّع، یعنی وہ جس کے جملوں کے آخر میں قافیہ کا التزام ہوتا تھا، اور دوسری مُرسَل یعنی آزاد، جس میں اس طرح کا کوئی التزام نہیں ہوتا تھا۔ اس زمانے میں لکھنے کا رواج چونکہ بہت ہی کم تھا اس لیے عربی نثر کے نمونے لوگوں کی گفتگو اور خطبوں اور تقریروں میں ملتے تھے۔ اس طرح کی نثر اگرچہ خاصی زیادہ ہے لیکن راویوں نے اس کے بہت تھوڑے حصے پر توجہ کی یعنی صرف اسی حصے پر جو اپنی خوبصورتی، بلاغت اور اختصار کی وجہ سے ذہنوں میں محفوظ رہ گیا۔ جاہلی نثر کا یہ حصہ کہاوتوں (ضرب الامثال) حکیمانہ مقولوں، پند و نصائح اور تقریروں پر مشتمل ہے۔

کہاوت یا ضرب المثل ایسی دانائی کا اظہار ہوتی ہے جو روز مرّہ زندگی کے تجربے سے حاصل کی جاتی ہے۔ بہت ہی چھوٹے اور مختصر جملے میں ایسی بات کہہ دی جاتی ہے جس میں یا تو کسی واقعے کی طرف اشارہ ہوتا ہے یا پھر اس میں کوئی عملی دانائی سمٹ آتی ہے۔ جیسے کوئی کہے کہ کل الصید فی جوف الفرا (چھوٹے چھوٹے تمام شکار ایک بڑے شکار کے پیٹ میں سما جاتے ہیں) اردو میں اس معنی کے لیے ایک مثل ہے کہ ہاتھی کے پاؤں میں سب کا پاؤں۔ یا مثلاً السلامة غنيمة (سلامتی بڑی غنیمت ہے) اردو میں

اس موقع پر بولتے ہیں: جان بچی لاکھوں پائے۔ یا کوئی کہے کہ الحدیث ذو شجون (بات شاخ در شاخ چلتی ہے) اردو میں اس موقع پر کہتے ہیں کہ بات میں سے بات نکلتی ہے۔ عربی زبان میں امثال کا بہت بڑا ذخیرہ ہے جسے متعدد لوگوں نے جمع کیا ہے۔ ان سب میں میدانی کی ''مجمع الامثال'' جسے اس نے پچاس کتابوں سے جمع کیا ہے بہت جامع اور مستند مانی جاتی ہے۔

اسی طرح حکمت اور دانائی کی باتیں ہیں جو اس زمانے کی عربی نثر میں بہت چھوٹے چھوٹے جملوں کی صورت میں ملتی ہیں مثلاً الخطاءُ زاد العجول (غلطی عجلت پسند کا زادِ راہ ہوتی ہے) یا من سلک الجدد امن العثار (جو سیدھے اور پختہ راستے پر چلے گا' پھسلنے سے بچا رہے گا) وغیرہ۔

تقریروں میں عرب مقرر عام طور پر سجع کی پابندی کرتے تھے اور ان کے جملوں میں اکثر قافیہ اور وزن ہوتا تھا۔ اچھی اور موثر تقریر وہ سمجھی جاتی تھی جو بلاغت اور فصاحت کا اعلیٰ نمونہ ہو۔ اس زمانے کا خطیب کسی ٹیلے پر چڑھ کر یا کسی اونٹ اور گھوڑے پر سوار ہو کر لوگوں سے خطاب کرتا تھا اور علاوہ منہ سے نکلنے والے الفاظ کے اپنے ہاتھ کی جنبش اور ابرو کے اشاروں سے بھی کام لیتا تھا۔ اس زمانے کے مشہور خطیبوں میں دو نام ہیں قس بن ساعدہ ایادی اور عمر بن معدیکرب ہیں۔

قس بن ساعدہ نجران کا لاٹ پادری تھا اور اکثر زمین پر تلوار ٹیک کر اس کے سہارے کھڑے ہو کے تقریر کیا کرتا تھا۔ آنحضرتؐ نے قس بن ساعدہ کو عُکاظ کے میلے میں سنا تو اس کی تعریف کی۔ عکاظ میں اس کی ایک تقریر کے الفاظ ہیں:

> **أیھا الناس! اسمعوا وعوا' انه من عاش مات' ومن مات فات' و کل ماھو آتٍ آت' لیل داج' ونھار ساج' وسماء ذات ابراج' ونجوم تزھر' و بحار تزخَر' وجبال مُرسلة وارض مُدحاة' وانھار مجراة. ان فی السماء لخبراً وان فی الارض لعبرا. مابال الناس یذھبون ولایرجعون؟ أرضوا فأقاموا؟ أم ترکوا فناموا' یا معشر ایاد' این الآباء والاجداد' واین الفراعنة الشداد؟ الم یکونوا أکثر منکم مالاً وأطول آجالاً؟ طحنھم الدھر بکلکله ومزّقھم بتطاوله**

(لوگو! سنو اور سمجھو۔ جو بھی یہاں زندہ ہے وہ ایک دن مر جائے گا اور جو مر جائے گا وہ اوجھل ہو جائے گا۔ اور جو کچھ آنے والا ہے وہ آ کر رہے گا۔ رات ہے جو تاریک ہے اور دن ہے جو پرسکون ہے اور برجوں والا آسمان ہے' ستارے ہیں جو چمکتے ہیں اور سمندر ہیں جو موجزن ہیں۔ پہاڑ ہیں مضبوطی سے جمائے ہوئے اور زمین ہے پھیلائی ہوئی اور دریا ہیں بہائے ہوئے! آسمانوں میں یقیناً کوئی خبر ہے اور زمین میں عبرت ناک واقعات ہیں۔ لوگوں کو کیا ہو گیا ہے کہ



Scanned with CamScanner

جاتے ہیں اور واپس نہیں آتے؟ کیا وہ وہاں جا کر آسودہ ہو گئے ہیں اور وہیں کے ہو رہے ہیں؟
یا انہوں نے اس دنیا کو بھلا دیا ہے اور سو گئے ہیں۔ اے عیاد والو! تمہارے آباؤ اجداد کیا ہوئے
اور ظالم فراعنہ آج کہاں ہیں؟ کیا وہ تم سے زیادہ مال و ثروت والے اور لمبی عمروں والے نہ تھے؟
زمانے نے انہیں اپنے سینے تلے دبا کر کچل دیا اور اپنے زور سے ان کو تتر بتر کر دیا۔)

عمرو بن معدیکرب زبیدیؒ دوسرا خطیب تھا جو آنحضرتؐ سے اس وقت ملا جب آپؐ تبوک سے واپس آ رہے تھے چنانچہ وہ اور اس کی قوم کے لوگ مسلمان ہو گئے۔ لیکن پھر جاہلیت کی پرانی عادتوں کی وجہ سے اسلام کی زندگی اسے راس نہ آئی اور اس نے اسلام چھوڑ دیا۔ لیکن کچھ عرصے کے بعد وہ پھر مسلمان ہوا اور ایک سو دس برس کی عمر میں جنگ قادسیہ میں شریک ہوا۔ عمرو بن معدیکرب حضرت عمرؓ کی خلافت کے آخری زمانے میں فوت ہوا۔ اس کی تقریر کا ایک مشہور جملہ ہے کہ چھوٹے سے دو عضو ہیں جن سے انسان انسان بنتا ہے' ایک دل اور دوسرا زبان! وہ خطیب ہونے کے ساتھ ساتھ شاعر بھی تھا۔ کہتا ہے:

کم من اخ لی صالح　　بوّأتہ بیدیّ لحدا
ما ان جزعتُ ولا ھلعت　　ولا یرد بکای رُشدا
ذھب الذین احبّھم　　وبقیتُ مثل السیف فردا

(اپنے کتنے بھائیوں کو میں نے اپنے ہاتھوں لحد میں اتار دیا۔
نہ میں نے ان پر بین کیا اور نہ رویا دھویا۔ میرے رونے دھونے سے ہونا بھی کیا تھا۔
میں جن کو عزیز رکھتا تھا وہ چلے گئے اور میں یوں اکیلا رہ گیا جیسے نیام میں تلوار اکیلی پڑی رہتی ہے۔)

ضرب الامثال' حکیمانہ اقوال اور تقریروں کے علاوہ وعظ و نصیحت کے باب میں بھی جاہلی نثر میں بہت عمدہ نمونے ملتے ہیں۔ مثلاً زہیر بن جناب الکلبی اپنے بیٹوں کو نصیحت کرتے ہوئے کہتا ہے:

یا بُنَیّ ...... ایّاکم ان تکونوا بالأحداث مغترّین' ولھا آمنین' ومنھا ساخرین' فانہ ما سخر قوم قطّ الا ابتُلُوا' ولکن توقّعوھا' فان الانسان فی الدنیا غرض تَعَاورہ الرماۃ' فمقصّر دونہ' ومجاوز لموضعہ' و واقع عن یمینہ و شمالہ' ثم لا بدان یصیبہ

(اے بیٹو! ایسا نہ ہو کہ تم حوادث زمانہ سے دھوکا کھا جاؤ اور ان کے معاملے میں بے فکر ہو جاؤ یا ان پر ہنسنے لگو۔ اس لیے کہ کسی قوم نے جب بھی تمسخر کیا ہے آزمائش میں ڈالی گئی ہے۔ تم ہمیشہ

حوادث زمانہ کی گھات میں رہو اس لیے کہ اس دنیا میں انسان ایک ایسا ہدف(Target) ہے تیر انداز جس کا نشانہ کرتے رہتے ہیں۔ ان میں سے بعض تو اس تک پہنچ ہی نہیں پاتے اور بعض اس کے اوپر سے گزر جاتے ہیں۔ کوئی ایسے ہیں جو دائیں بائیں نکل جاتے ہیں۔ لیکن یاد رکھو ایک تیر ایسا ضرور ہوتا ہے جو ٹھیک نشانے پر جا کے لگتا ہے۔)

## جاہلی شاعری اور معاشرے میں اس کا مقام

شاعری اعلیٰ خیالات' نازک جذبہ و احساس اور فنکارانہ وصف اور تصویر کشی کا ایسا موزوں (Rhythmic) اور قافیہ بند(Rhymed) بیان ہے جو دل و دماغ پر گہرا اثر کرتا ہے۔ جب قوموں کے ادب کی بات ہوتی ہے تو اس میں شاعری کے نمونوں کو عموماً اولیت دی جاتی ہے۔ اس لیے کہ نثر کے مقابلے میں شعری پیداوار عموماً زیادہ ہوتی ہے۔ اگر انسان کی فطرت میں بیان و اظہار کا ملکہ ہو اور زبان پر کسی قدر عبور حاصل ہو تو شعر کہا جا سکتا ہے۔ عربی زبان میں جاہلی شاعری بہت قدیم ہے' لیکن عجیب بات یہ ہے کہ اسلام سے سو ڈیڑھ سو برس پہلے کی اس شاعری کو ہم جب بھی سامنے رکھتے ہیں تو یہی دیکھنے میں آتا ہے کہ یہ شاعری بہت محکم اور پختہ (Mature) حالت میں ہے اور فن کی اعلیٰ ترین بلندیوں پر فائز ہے۔ اس شاعری کا ماضی کیا ہے اور وہ کتنا طویل ہے کہ جس سے گزر کر یہ اپنے اس عروج کو پہنچی ہے' اس کے متعلق جاننا آج بہت مشکل لگتا ہے۔ جاہلی شاعر امرؤ القیس' جس کا زمانہ ہجرت نبوی سے سو سال پہلے کا ہے۔ اپنے ایک شعر میں کہتا ہے:

"ذرا پرانے کھنڈروں پر رکنا کہ اجڑے دیار پر ہم بھی آنسو بہالیں گے جس طرح ابن حذام نے بہائے تھے۔"

یہ ابن حذام کون تھا؟ جس نے امرؤ القیس سے بھی پہلے محبوبہ کے چھوڑے ہوئے کھنڈروں پر کھڑے ہو کر رونے کی رسم چلائی تھی؟ اس کا کسی کو علم نہیں۔

گمان یہ کیا جاتا ہے کہ عربوں کے ہاں پہلے سجع کا رواج پڑا' یعنی ایسے جملے بولنا جو ہم قافیہ ہوں اور سننے والے کے کانوں کو بھلے لگیں۔ سجع سے ترقی کر کے وہ رجز کہنے لگے جو ایسا موزوں کلام ہوتا تھا جس کے مضمون اور صوتی زیروبم سے سننے والے کے اندر جوش و خروش پیدا ہوتا تھا اور انسان جنگ کے میدان میں بہادری کے جوہر دکھاتا تھا۔ رجز سے آگے بڑھے تو عربوں نے باقاعدہ قصیدہ نظم کرنا شروع کیا اور اس طرح جاہلی شاعری وجود میں آئی۔ مسجّع (سجع بند) کلام کاہن اور پروہت لوگ استعمال کرتے تھے۔ اس سے وہ اپنے معبودوں کے حضور دعا کرتے تھے اور اس سے اپنے سامعین پر اثر ڈالتے تھے۔ اس کے

بعد جب عربوں میں گنگنانے اور گانے کا شوق پیدا ہوا اور شاعری عبادت گاہوں سے نکل کر کھلے صحرا میں آئی تو اس سے رجز اور حُدی کا کام لیا جانے لگا۔ رَجز لڑنے والوں کو جوش دلانے کے لیے ہوتا تھا اور حُدی سواری کے اونٹوں کو تیز چلنے پر اکساتی تھی۔

سامی لوگوں میں عرب لوگ فطرۃً شاعری کے زیادہ قریب تھے اور دوسروں کے مقابلے میں شعر کہنے پر زیادہ قدرت رکھتے تھے۔ اس کی وجہ یہ کہ ان کی زبان عربی بہت وسیع اور شاعری کے لیے موزوں تھی۔ اس کے ساتھ ان کے ماحول کا کُھلا پن' طبیعت کی موزونیت' زندگی کی سادگی اور اجتماعی معاملات میں تعصب اور گروہ بندی کا رویّہ اور ذاتی معاملات میں کامل آزادی...... ان سب چیزوں نے مل کر ان کے اندر شاعری کے تمام لوازمات پیدا کر دیے تھے۔ چنانچہ جب وہ شاد اور مسرور ہوتے تب بھی اور جب وہ غصے اور برہمی کی حالت میں ہوتے تب بھی' ان کی زبان پر بے ساختہ شعر رواں ہو جاتے۔ اس طرح انسانی جذبہ و احساس اور انسانی مشاہدے اور سوچ کی کوئی صورت ایسی نہ تھی جس کا اظہار ان کے شعروں میں نہ ہوا ہو۔ اسی لیے کہا گیا کہ الشعر دیوان العرب (شاعری عربوں کی قومی خصوصیات کا ریکارڈ ہے۔)

شاعر کو جو مقام عربوں کے جاہلی معاشرے میں حاصل تھا اس کی مثال دوسری قوموں اور دوسرے معاشروں میں نہیں ملتی۔ مثلاً ایران میں شاعری تفریحِ طبع کی چیز سمجھی جاتی تھی۔ چنانچہ انوری نے ایک قطعہ میں ثابت کیا ہے کہ انسانی جماعت میں شاعر کی اتنی بھی ضرورت نہیں جتنی کہ ایک خاکروب کی ہوتی ہے۔ اس سے بہت پہلے یونان میں شاعری سے عموماً جو کام لیا جاتا تھا وہ صرف تفنن آمیز جلسوں کو گرم کرنے کا ہوتا تھا اور شاعر سخن ساز اور دروغ گو کے لقب سے پکارا جاتا تھا۔ چنانچہ ارسطو نے جھوٹا طلسم باندھنے کو کمالِ شاعری قرار دیا تھا۔ لیکن عربوں کے ہاں زمانہ جاہلیت میں شاعر کو وہ اہمیت حاصل تھی جو آج کے زمانے میں تمام ذرائع ابلاغ (Media) کی مل کر ہوتی ہے۔ وہ اپنے کلام میں اپنے قبیلے کے محاسن بیان کر کے اسے سربلند کر سکتا تھا اور مخالف قبیلے کی ہجو کہ کر اسے ذلیل و خوار کر سکتا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ جب کسی قبیلے میں بڑے شاعر کا ظہور ہوتا تو اسے ہر طرف سے مبارکباد ملتی تھی اور اس کی قسمت پر رشک کیا جاتا تھا۔ اس زمانے کے عرب معاشرے میں ایسی بہت سی مثالیں ملتی ہیں جن میں ایک شاعر نے محض اپنے کلام کے زور سے کسی ضرورت مند کا مسئلہ حل کر دیا یا ایک شاعر نے اپنے شعروں میں پہلے تو ایک قبیلے کو ذلیل و خوار کیا اور پھر اسی قبیلے کے حق میں شعر کہہ کر اس کی عزت و شہرت بحال کر دی۔ اس ضمن میں متعدد واقعات بیان کیے جا سکتے ہیں لیکن یہاں صرف تین مثالوں پر اکتفا کی جائے گی۔

قبیلہ کلاب کا ایک غریب شخص محلّق تھا جس کے آٹھ لڑکیاں تھیں اور اس کی غربت کی وجہ سے کوئی بھی ان سے شادی کرنے کو تیار نہ تھا۔ اتفاق سے مشہور جاہلی شاعر اَعشٰی کا مکہ جاتے ہوئے ادھر سے گزر

ہوا تو محلّق کی بیوی نے یہ موقع غنیمت جانا اور اپنے شوہر کو بھیج کر اسے اپنے ہاں مدعو کر لیا۔ ان لوگوں نے ایک اونٹنی ذبح کر کے اس کی خوب خاطر تواضع کی اور شراب بھی پلائی۔ اعشیٰ پر جب شراب کا نشہ چڑھا تو اس نے محلّق سے گھر والوں اور بچوں کے متعلق پوچھا۔ جواب میں محلّق نے اپنی غریبی اور گھر میں آٹھ لڑکیوں کے ہونے کا مسئلہ پیش کیا تو شاعر کے دل میں اس کی یہ بات اتر گئی۔ چنانچہ اگلے روز جب وہ عکاظ کے میلے میں پہنچا تو اس نے اپنا مشہور قصیدہ پڑھا اور اس کے دو شعروں میں کہا کہ میری جان کی قسم میں نے ایسا منظر بھی اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے کہ ایک میدان میں آگ جل رہی ہے اور اسے سردی سے ٹھٹھرتے ہوئے دو شخص تاپ رہے ہیں۔ ان میں ایک تو جود و کرم تھا اور دوسرا محلّق تھا اور وہ ساری کالی رات یہ آگ تاپتے رہے کہ ان دونوں نے ایک ہی ماں کا دودھ پیا ہے اور قسم کھائی ہے کہ زندگی میں ایک دوسرے سے کبھی جدا نہ ہوں گے۔ عربی اشعار یوں ہیں:

تشبّ لمقرو رَین یصطلیا نہا وبات علی النار الندی و المحلّق

رضیعی لبان ثدی ام تقاسما باسحم داج عوضُ لا نتفرّق

محلّق کی تعریف میں اعشیٰ کا یہ قصیدہ سننا تھا کہ چاروں طرف سے لوگ محلّق سے رابطہ کرنے اور اس کی لڑکیوں کا رشتہ مانگنے کے لیے آنے لگے اور ایک سال بھی نہ گزرا کہ اس کی سب لڑکیوں کی شادیاں اچھے اچھے گھرانوں میں ہو گئیں۔

اسی طرح کا ایک واقعہ حضرت حسان بن ثابتؓ سے متعلق ہے۔ انہوں نے ایک زمانے میں قبیلہ بنی عبدالمدان کی ہجو کی تھی جس میں کہا تھا کہ یہ لوگ بڑے قد آور اور تنومند تو ہیں لیکن کیا کیا جائے کہ ان کے جسم تو خچروں کے سے ہیں اور دماغ چڑیوں کے سے!

لا باس بالقوم من طول و من غلظ جسم البغال واحلام العصافیر

اس پر بنی عبدالمدان کے لوگوں نے شاعر سے شکایت کی کہ آپ نے تو ہمیں ذلیل کر کے رکھ دیا۔ اب ہمیں اپنے جسموں کا ذکر کرتے ہوئے شرم آتی ہے۔ اس پر حسانؓ نے کہا: کوئی بات نہیں، میں اس کی تلافی کر دوں گا۔ چنانچہ انہوں نے کچھ عرصہ بعد ان لوگوں کے بارے میں یہ شعر کہے:

وقد کنا نقول اذا رأینا لذی جسم یُعدّ و ذی بیان

کانک ایھا المعطی لساناً و جسماً من بنی عبدالمدان

(جب ہم کسی ایسے آدمی کو دیکھتے جو بڑے ڈیل والا اور ساتھ ہی فصیح و بلیغ ہوتا تو اس سے کہتے کہ ایسی زبان اور ایسے جسم کے ساتھ لگتا ہے تم بنی عبدالمدان سے ہو۔)

حسانؓ کی زبان سے نکلے ہوئے ان اشعار نے سارے علاقے میں بنی عبدالمدان کا وہ پہلے والا تصور



Scanned with CamScanner

(Image) بحال کر دیا۔

ایک اور شاعر حُطیئہ (جو جاہلیت اور اسلام دونوں زمانوں کا شاعر تھا) کے زمانے میں ایک والی زبرقان اور اس کے قبیلے کے کچھ لوگوں کے درمیان جو "بنی انف الناقہ" (اونٹنی کی ناک پر قانع لوگ) کہلاتے تھے۔ کچھ اختلافات اور مقابلہ بازی چلی آتی تھی۔ یہ نام ان لوگوں کے اجداد میں سے ایک شخص جعفر بن قریع کا اس لیے پڑا کہ جب ایک اونٹنی ذبح کی گئی اور اس کا گوشت اس کے باپ نے بیویوں میں تقسیم کیا تو جعفر کی ماں نے بیٹے کو اپنا حصہ لانے کے لیے بھیجا' لیکن اس وقت تک اونٹنی کا سر اور کچھ گردن ہی بچی تھی۔ چنانچہ اس نے اونٹنی کے ناک میں ہاتھ ڈال کر اپنا یہ حصہ الگ کیا اور اسے لے گیا۔ اس دن سے اس کا نام "انف الناقہ" (اونٹنی کا ناک) پڑ گیا اور اس کے بیٹے اور پوتے بنی انف الناقہ (اونٹنی کی ناک والے) کہلائے۔ جب ان لوگوں نے دیکھا کہ شاعر حطیہ ان کے حریف زبرقان کا پڑوسی بنا ہوا ہے تو انہوں نے اسے اپنی طرف بلانے کی تدبیر کی۔ اسی دوران میں زبرقان کے اہل خانہ سے جو سفر پر جا رہے تھے کوئی ایسی حرکت سرزد ہوئی جس سے حطیہ ان سے ناراض ہوگیا۔ بنی انف الناقہ اس دن کے انتظار میں تھے۔ چنانچہ انہوں نے حطیہ کو اپنے پاس بلا لیا' اس کے لیے خیمہ لگایا' اس کو خوب کھلایا پلایا اور ایک اونٹنی اور پہننے کا لباس دیا۔ جب زبرقان سفر سے واپس آیا تو اس نے ان لوگوں سے اپنے مہمان حطیہ کو واپس کرنے کے لیے کہا۔ لیکن شاعر نے واپس آنے کی بجائے بنی انف الناقہ کے ہاں رہنے کو ترجیح دی۔ اس موقع پر اس نے ان کی مدح اور زبرقان کی ہجو میں کچھ اشعار کہے۔ بنی انف الناقہ کی مدح میں اس نے کہا:

هـم الأنف والاذنـاب غيرهـم ومـن يسـوّى بـانف الناقة الذنبا

(وہ ناک ہیں اور دوسرے لوگ دُمیں ہیں اور کون ایسا ہے جو اونٹنی کی دم کو اس کی ناک کا درجہ دے گا)

اس دن کے بعد سے "بنی انف الناقہ" کا لقب ان کے لیے فخر کی چیز بن گیا۔

## شاعری کی اقسام اور مقاصد اور جاہلی شاعری

شاعری تین طرح کی ہوتی ہے ایک جذبہ واحساس کی شاعری جو غنائیت اور وجدان کی شاعری کہلاتی ہے۔ یہ ایسی شاعری ہے جس میں شاعر اپنے خیال اور اپنے شعور اور احساس کو زبان دیتا ہے۔ دوسری رزمیہ شاعری (Epic) جس میں شاعر جنگوں کے واقعات اور بہادروں کے کارنامے کہانی کی صورت میں بیان کرتا ہے جیسے ہومر کی ایلیڈ (Eliad) ' فردوسی کا شاہنامہ اور ویاس کی مہابھارت۔ اور تیسری تمثیلی

(Dramatic) شاعری، جس میں شاعر ایک واقعہ کو لے کر اس کے کرداروں کی صورت گری کرتا ہے اور ان کے باہمی تعامل اور گفتگو سے ایک غنائیہ ڈراما شعر میں ترتیب دیتا ہے۔ یہ تیسری قسم کی شاعری یونان میں بہت مقبول تھی۔ شاعری کی ان تمام اقسام میں پہلی قسم کی یعنی جذبہ و احساس کی یا طربیہ و غنائیہ شاعری سب سے پہلے وجود میں آئی، اس لیے کہ اس کی بنیاد غنائیت یا نغمگی ہے اور اس میں انسان دوسروں سے پہلے اپنے دل کی بات کرتا ہے۔

ایک عرب کے سامنے چونکہ صرف صحرا کے مناظر ہوتے تھے اور قصے اس نے صرف بہادری کے اور جنگوں کے سنے تھے اور حسن اس نے صرف عورت کا دیکھا تھا۔ اس لیے ایک عرب شاعر کے کلام میں جہاں قدرت کے مناظر اور جنگل کے حیوانوں اور سواری کے جانوروں کا بیان ہوتا ہے وہاں اس میں لڑائیوں اور ان میں دادِ شجاعت دینے والے بہادروں کا احوال بھی سننے میں آتا ہے۔ نیز اس میں عشقیہ شاعری اور محبوباؤں اور ان کے ہجر و وصال کا تذکرہ بھی ہوتا ہے۔ یہی تین موضوعات ہیں جو جاہلی شاعری میں تکرار سے اور ایک ہی انداز میں ملتے ہیں۔ عربی قصیدے میں موضوعات کی یہ تکرار اتنی بڑھی کہ جاہلی شاعر زُہیر کو کہنا پڑا کہ :

ما ارانا نقول الا معاراً　　　او مُعاداً من لفظنا مکرورا

(میں تو یہ دیکھتا ہوں کہ ہم جو بھی کہتے ہیں وہ یا تو کسی سے مستعار لیا ہوا ہوتا ہے یا پھر اس میں ہماری ہی کسی بات کی تکرار ہوتی ہے۔)

رہی رزمیہ قسم کی شاعری تو وہ عربوں کے ہاں نہیں تھی۔ اسی طرح تمثیلی شاعری کا بھی ان کے ہاں کوئی وجود نہیں تھا۔ اس کی وجہ یہ کہ شاعری کی یہ دونوں اقسام سوچ اور فکر کا تقاضا کرتی ہیں جبکہ عرب جو بھی کہتے تھے بے ساختہ کہتے تھے اور بدیہہ گوئی ان کا خاص وصف تھا۔ پھر شاعری کی یہ اقسام اس امر کا تقاضا کرتی ہیں کہ شاعر لوگوں کا مشاہدہ کرے، اُن کی نفسیات کو جانے اور پھر ان کی نفسیات کے مطابق انہیں اپنی تخلیقات میں پیش کرے۔ جبکہ عرب شاعر کو اپنے سوا کوئی اور دکھائی ہی نہیں دیتا تھا۔ اس لیے وہ نہ تو رزمیہ شاعری تخلیق کر سکتا تھا اور نہ تمثیلی اور ڈرامائی شاعری۔ پھر رزمیہ شاعری کا ایک اور بڑا مصدر و ماخذ اساطیر (Mythology) ہوتے ہیں۔ لیکن عربوں کی ریتلی زمین کا خاص ماحول، ان کے مذہب کی سادگی، ان کے تصور و خیال کا محدود ہونا ان سب باتوں نے ان کے ہاں اساطیر کو زیادہ پنپنے نہیں دیا۔ چنانچہ اس دور کی عربی شاعری میں فخر، شجاعت و مردانگی، مدح، ہجو، مرثیہ اور معاملاتِ حسن و عشق، وصف و منظر کشی اور حکمت و دانائی کی بڑی فراوانی ہے۔ لیکن اپنی ساری وسعت کے باوجود یہ ایسے طویل رزم ناموں سے خالی رہی جن میں قوم کے قابل فخر کارنامے بیان ہوئے ہوں، جن میں بہادروں اور شہسواروں

کے قصے ہوں، جیسے یونان میں ایلیڈ، اطالیہ میں اینیڈ، ہندوؤں میں مہابھارت اور ایرانیوں کے ہاں شاہنامہ تھے۔

## جاہلی شاعری کی خصوصیات

جاہلی شاعری کی سب سے بڑی خصوصیت اس کی سچائی، واقعیت اور بے ساختگی ہے۔ جاہلی شاعر چاہے اپنے دل کی بات کر رہا ہو، یا سامنے کے کسی منظر کی تصویر کشی کر رہا ہو اس کا بیان بالکل سچ ہوگا اور اس میں جھوٹ یا مبالغے کی آمیزش نہیں ہوگی۔ اسی لیے جاہلی شاعری میں ایجاز و اختصار ہے۔ مجاز و استعارے کا استعمال بہت کم ہے اور مبالغہ شاذ و نادر ہی ہے۔ اس طرح کی شاعری کی تاریخی اہمیت بہت زیادہ ہوتی ہے۔ اس لیے کہ یہ شاعر کے زمانے کے جغرافیائی، معاشرتی اور اخلاقی حالات کا ایسا ریکارڈ فراہم کرتی ہے جس پر بڑی حد تک اعتماد کیا جا سکتا ہے۔

جاہلی شاعری کی دوسری خصوصیت اس کے مضامین کی محدودیت اور سادگی اور یک رنگی ہے۔ اس شاعری کی جو ہر دلعزیز فارم قصیدہ ہے (یعنی نظم) وہ اپنے مضامین کے اعتبار سے ایک غیر مربوط اور بے نظم چیز ہے۔ چنانچہ اس میں سے اگر کوئی شعر حذف کر دیا جائے یا اسے ترتیب میں آگے یا پیچھے کر دیا جائے تو اس سے قصیدے کے بیانیہ پر کوئی اثر نہیں پڑتا اور اس سے اس میں کوئی نقص واقع نہیں ہوتا۔ عربوں کا مزاج جس طرح کا تھا اس میں ایک مفکر یا فلسفی کی نگاہ پیدا نہیں ہو سکتی تھی۔ چنانچہ وہ اپنے اردگرد کی اشیاء کو اور اپنے ساتھ بیتنے والے حوادث کو یوں دیکھتے تھے جیسے وہ الگ الگ واقعات ہوں جن کا آپس میں کوئی تعلق نہ ہو اور اسی طرح ان کو بیان کرتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ عربی تنقید کا موضوع پوری نظم نہیں ہوتی بلکہ اس کا انفرادی شعر ہوتا ہے اور وہ صرف اس شعر کے محاسن اور معایب سے بحث کرتی ہے۔ ابن قتیبہ کا بیان ہے کہ اس نے ایک عالم ادب سے سنا کہ عربی قصیدے کا دستور یہ ہے کہ اس میں شاعر پہلے اُن کھنڈروں اور چھوڑے ہوئے گھروں کا ذکر کرتا ہے جہاں ایک زمانے میں اس کی محبوبہ اور اس کے خاندان والے رہتے تھے اور پھر وہ انہیں چھوڑ کر چل دیے۔ شاعر اپنے ساتھیوں کے ساتھ ان کھنڈرات پر کھڑے ہو کر آنسو بہاتا ہے اور اُن اچھے دنوں کو یاد کرتا ہے جو اب نہیں رہے۔ پھر وہ اپنی محبوبہ کے حسن و شباب اور اس کے غمزوں اور اداؤں کا ذکر کرتا ہے اور اس کے ہجر و فراق میں اس پر جو بیت رہی ہے اس کا احوال سناتا ہے اور اس طرح اپنے سامعین کی ہمدردی اور توجہ حاصل کرتا ہے۔ اس کے بعد وہ اپنے پُر مشقت سفر کا احوال بیان کرتا ہے اور اس سفر میں اپنی خاص سواری کی تعریف میں چاہے وہ گھوڑا ہو یا اونٹنی ہو، متعدد اشعار کہتا ہے۔ یہاں تک کہ وہ اپنے ممدوح حاکم یا امیر کے ہاں جا



Scanned with CamScanner

جاتا ہے۔ وہاں پہلے تو وہ اپنے سفر کی صعوبتوں اور گرمی اور جاڑے کی شدتوں اور راستے کے خطرات کا دکھڑا سناتا ہے پھر اپنے ممدوح کی فیاضی اور دریادلی کا ذکر کرتا ہے جس کی شہرت کا سن کر وہ کالے کوسوں کا سفر کر کے یہاں تک پہنچا ہے اور مدح کے اس موضوع پر وہ بالآخر اپنا قصیدہ ختم کرتا ہے...... اس میں کوئی مبالغہ نہیں ہے کہ جاہلی شاعری میں قصیدے کا ڈھانچا اور اس کے موضوعات اور اُن کی ترتیب قریب قریب یہی ہیں جو اوپر بیان ہوئے۔ اسی وجہ سے یہ کہا جاتا ہے کہ جاہلی شاعری مجموعی طور پر تقریباً ایک جیسی ہے اور اس میں بہت کم تنوع ہے۔ چنانچہ اس شاعری کا ایک قصیدہ پڑھ لیں یا زیادہ قصائد پڑھ لیں بات ایک ہی رہتی ہے۔

باوجود اس کے کہ جاہلی شاعری کا زمانہ زیادہ طویل نہیں تھا' یہ شاعری اپنی کثرت اور ضخامت میں اتنی زیادہ ہے کہ نہ اس کو جمع کیا جا سکا ہے اور نہ یہ پوری کی پوری انسانی حافظے میں محفوظ رہ سکی ہے۔ اس شاعری کے راویوں کی ایک کثیر تعداد اسلامی فتوحات کے معرکوں میں کھیت رہی اور ان کے ساتھ اس شاعری کا بہت سا حصہ بھی ضائع ہوگیا۔ عربی ادب کے ایک عالم اور راوی ابوعمرو بن العلاء اپنے معاصرین سے کہا کرتا تھا کہ ''آپ لوگوں تک جاہلی شاعری کا جو حصہ پہنچا ہے وہ بہت کم ہے۔ اگر آپ لوگوں تک پوری شاعری پہنچ پاتی تو آپ بہت زیادہ علم اور شعری ذخیرے سے مستفید ہوتے'' لیکن زمانہ جاہلیت کی جتنی کچھ شاعری بھی محفوظ رہی اور اگلی نسلوں تک پہنچی اس کے بارے میں بھی شکوک وشبہات کا اظہار کیا گیا کہ اتنا طویل عرصہ جو یہ شاعری روایت ہوتی رہی تو اس میں خدا جانے کیا کیا تبدیلیاں نہ ہوئی ہوں گی۔ اس پر کیا کیا اضافے نہ ہوئے ہوں گے۔ بعد کے زمانے کے کچھ راویوں میں ایسے لوگ بھی تھے جن کا ملکۂ شعری بہت مضبوط تھا اور وہ جاہلی زمانے کی شاعری کے طرز پر اس طرح شعر کہتے کہ انہیں جاہلی کلام سے ممیز کرنا آسان نہیں تھا۔ چنانچہ وہ اپنی طرف سے کچھ شعر کہہ کر جاہلی شعراء کے نام لگا دیتے تھے۔ یہ سب کچھ اپنی جگہ لیکن پھر بھی جاہلی شاعری کا ایک بڑا ذخیرہ ایسا ہے کہ اس کے ثقہ ہونے میں کوئی کلام نہیں ہوسکتا اور اہل نقد ونظر کی رائے ہے کہ ایسا کلام آسانی سے پہچانا جا سکتا ہے۔ جاہلی شاعری کا یہ ذخیرہ عربی ادب میں اصل اور بنیاد کی حیثیت رکھتا ہے۔ اس ذخیرے میں شامل شعری تخلیقات نے شاعری کا وہ اعلیٰ معیار قائم کیا جو بعد کے ادوار کے لیے نمونہ اور مثال بنا رہا۔

آج اگر آپ جاہلی شاعری کا مطالعہ کرنا چاہیں اور یہ جاننا چاہیں کہ اس کے کون کون سے مجموعے نمائندہ اور مستند ہیں اور وہ آج بھی دستیاب ہیں تو ان کی تفصیل کچھ یوں ہے:

۱۔ **معلّقات:** یہ سات چوٹی کے جاہلی شعراء کے سات طویل قصیدے ہیں جن کو عکاظ کے میلے کے سالانہ مقابلوں میں بہترین قرار دیا گیا اور وہ ایک مقبولِ عام روایت کے مطابق سونے کے پانی سے



Scanned with CamScanner

لکھ کر در کعبہ پر لٹکائے گئے تھے (معلقہ کے معنی لٹکائی ہوئی چیز کے ہیں)۔ کوئی شک نہیں کہ جاہلی شاعری کے بہترین نمونے ان سات قصائد میں ملتے ہیں جن کے شعراء کے نام یہ ہیں امرؤ القیس، طرفہ بن العبد، زہیر بن ابی سلمیٰ، لبید بن ربیعہ، عمرو بن کلثوم، عنترہ بن شداد اور حارث بن حلزہ۔ چونکہ یہ قصائد سونے کے پانی سے لکھے جاتے تھے اس لیے ان کو مذہبات بھی کہا گیا۔

**۲۔ مفضلیات:** یہ جاہلی شاعری کا وہ انتخاب ہے جو آٹھویں صدی عیسوی میں ایک عالم اور ادیب مفضل الضبی نے خلیفہ ابوجعفر منصور کے کہنے پر اس کے بیٹے اور ولی عہد مہدی کے لیے کیا تھا جو اس کا شاگرد بھی تھا۔

**۳۔ اصمعیات:** اسی طرح کا ایک اور انتخاب مشہور راوی اصمعی نے آٹھویں صدی عیسوی ہی میں ہارون الرشید کے کہنے پر اس کے بیٹے امین کے لیے کیا۔

ان دونوں مجموعوں یعنی مفضلیات اور اصمعیات میں معلقات کے شعراء کو چھوڑ کر دور جاہلیت کے دوسرے بڑے شعراء کا کلام ہے۔

**۴۔ دیوان الحماسۃ:** یہ جاہلی اور اسلامی دور کی شاعری کا وہ مشہور اور قابل قدر انتخاب ہے جو دور عباسی کے نامور شاعر ابوتمام (م ۸۴۵) نے نویں صدی عیسوی میں کیا اور اس میں عربی شاعری کے بہترین نمونوں کو جگہ دی۔ ابوتمام خود بھی بڑے پائے کا شاعر تھا۔ لیکن اس کے بارے میں یہ قول مشہور ہے کہ ''ابوتمام نے اپنے انتخاب حماسہ میں زیادہ بڑا شاعر ہونے کا ثبوت دیا ہے'' بہ نسبت خود اپنی شاعری کے'' حماسہ کے معنی سرگرمی، جوش و ولولے اور تعصب کے ہیں۔ یہ انتخاب دس چھوٹے بڑے ابواب پر مشتمل ہے جن میں خود باب الحماسہ سب سے بڑا باب ہے۔

**۵۔ جمہرۃ اشعار العرب:** بارہویں صدی عیسوی کے اوائل میں عربی کے ایک بڑے عالم اور ادیب ابوزید قرشی نے جاہلی اور ابتدائی اسلامی دور کی بہترین شاعری کا انتخاب سات سات نظموں پر مشتمل سات عنوانات کے تحت کیا۔ مثلاً معلقات: یہ وہ سات نظمیں ہیں جن کا اوپر ذکر ہوا اور ان کے بعد مجمہرات، منتقیات، مذہبات۔ یہ سب اپنے زمانے کی چیدہ اور منتخب نظمیں تھیں، مراثی، مشوبات، ملحمات۔ مراثی میں سات مرثیے ہیں اور مشوبات میں ایسی نظمیں ہیں جن کے شاعروں میں اہل کفر بھی ہیں اور اہل اسلام بھی۔

منتخب شاعری کے ان مجموعوں کے علاوہ جاہلی شاعری کے نمونے کچھ دوسری کتابوں میں بھی دیکھے جا سکتے ہیں۔ مثلاً ابن قتیبہ (م ۸۸۹) کی کتاب ''الشعر والشعراء'' جو جاہلی اور اس کے بعد اسلامی، اموی اور

عباسی ادوار سے متعلق ایک اچھا اور مستند تذکرۂ شعراء ہے۔ اسی طرح جاہلی شاعری کے بہت اعلیٰ نمونے عباسی دور کے ابو الفرج اصفہانی (م ۹۶۷) کی شہرۂ آفاق تاریخی کتاب ''کتاب الاغانی'' میں بھی دیکھے جاسکتے ہیں۔

## جاہلی شعراء اور ان کے طبقے

زمانے کے اعتبار سے جاہلی شعراء کو دو طبقوں میں تقسیم کیا جاتا ہے:

۱۔ **جاہلی شعراء**: یہ وہ شاعر ہیں جو اسلام سے پہلے ہوئے اور اگرچہ ان میں سے بعض نے اسلام کا زمانہ پایا لیکن اس زمانے میں انہوں نے کوئی خاص شاعری نہیں کی۔ ان میں ہم مثال کے طور پر امرؤ القیس، طرفہ، زہیر، لبید، امیہ بن ابی صلت کا نام لے سکتے ہیں۔

۲۔ **مُخضرم شعراء**: ایسے شعراء جن کی زندگی کا کچھ حصہ جاہلیت میں گزرا اور کچھ اسلام میں اور انہوں نے دونوں زمانوں میں شعر کہے۔ مثلاً حسان بن ثابتؓ (شاعرِ رسولؐ) اور مشہور مرثیہ نگار خنساء

فنی معیار کے اعتبار سے جاہلی شعراء کے عموماً تین طبقے قرار دیے جاتے ہیں:

طبقۂ اولیٰ: اس میں امرؤ القیس، زہیر اور نابغہ ذبیانی کو گنا جاتا ہے۔

طبقہ ثانیہ: اس میں لبید، طرفہ، اعشٰی وغیرہ شامل ہیں۔

طبقہ ثالثہ: اس میں عنترہ بن شدّاد، درید بن الصمّہ اور امیہ بن ابی صلت کے نام آتے ہیں۔

لیکن ان طبقات میں شاعروں کی یہ تقسیم کوئی بندھی ٹکی چیز نہیں۔ یہ زیادہ تر زمانہ قدیم کے لوگوں کی رائے کی بنا پر کی گئی ہے، جو ظاہر ہے تنقیدِ شعر میں کوئی ایسا بلند مقام نہیں رکھتے تھے۔

جاہلی شعراء یوں تو اپنے قبیلے کی آواز ہوتے تھے۔ وہ اپنے قبیلے کے قابلِ فخر کارنامے بیان کرتے۔ اس کے دشمنوں کی ہجو کہتے اور وقت پڑنے پر اپنے لوگوں کی رہنمائی کرتے اور اس کے بدلے میں وہ اپنے قبیلے کی طرف سے کسی جزا یا معاوضے کی اُمید نہ رکھتے۔ لیکن پھر ان میں سے بعض ایسے بھی ہوئے جنہوں نے اپنی شاعری کو روزگار کا ذریعہ بنایا اور وہ یوں کہ وہ امراء اور سلاطین کی مدح کرتے اور اس کے صلے میں انعام و اکرام پاتے۔ چنانچہ ان جاہلی شعراء میں سے نابغہ نے حیرہ کے بادشاہ نعمان بن المنذر کی، زہیر نے غسان کے بادشاہ ہرم بن سنان کی اور اعشٰی نے مختلف بادشاہوں اور دوسرے عام لوگوں کی مدح کی۔ پھر اس زمانے کے شعراء کا ایک دستور یہ تھا کہ ان کے ساتھ ایک راوی ضرور ہوتا تھا

جوان کے اشعار یاد رکھتا اور انہیں جگہ جگہ پڑھ کر سناتا تھا۔ بڑے شاعروں کے یہی راوی بعد میں خود شاعر بن جاتے۔ چنانچہ امرؤ القیس ابو داؤد ایادی کا راوی تھا۔ زہیر اپنے ماموں اوس بن حجر کا راوی تھا اور اعشیٰ میتب بن علس کا راوی رہا تھا۔

# مقامات کے شعراء اور ان کی نظمیں

## ا۔ امرؤ القیس (م ۵۴۰)

اس امر پر سب کا اتفاق ہے کہ جاہلی شعراء کا سرخیل اور ان کا رئیس طائفہ امرؤ القیس تھا۔ یہ شاعر جو الملک الضِلّیل (دربدر پھرنے والا بادشاہ) کے لقب سے مشہور ہوا' اس نے اپنی شاعری میں ایسے ایسے اسالیب اور مضامین کی طرح ڈالی جس نے بعد کے شعراء کے لیے نمونے اور مثال کا کام دیا۔

امرؤ القیس کے آباء و اجداد جنوبی عرب کے قبیلے بنو کندہ کے شاہی خاندان سے تھے' جو اب شمال میں آ کر بس گیا تھا اور اس کا باپ حُجر نجد میں مضر کے قبائل بنو اسد اور غطفان کا حکمران تھا۔ امرؤ القیس نے بچپن میں شاہزادوں کی سی تربیت پائی۔ چنانچہ اس کا زیادہ وقت لہو ولعب' مے نوشی اور حسین عورتوں کے ساتھ اظہارِ عشق میں گزرنے لگا۔ اس شوق میں وہ اتنا آگے بڑھا کہ اپنی شاعری میں بھی حسیناؤں کا ذکر اور ان کے بارے میں فحش باتوں کا اظہار کرنے لگا۔ اس کا باپ اس کے رویے سے برافروختہ ہوا اور اس نے امرؤ القیس کو اس سے باز رہنے کی تلقین کی۔ لیکن جب بیٹے نے باپ کی بات مان کر نہ دی تو امیر حُجر نے اسے گھر سے نکال دیا۔ گھر سے نکل کر امرؤ القیس نے قبیلہ طی' اور کلب اور بکر کے کچھ آوارہ' طفیلی اور چوری پیشہ نوجوانوں کی صحبت اختیار کی اور ان کو ساتھ لیے وہ در در کی خاک چھانتا پھرا۔ ان لوگوں کی زندگی کا چلن اب یوں تھا کہ یہ جہاں کہیں پانی کا جوہڑ یا نخلستان یا شکار گاہ دیکھتے' وہیں پڑاؤ کر لیتے۔ دن کو شکار کے پیچھے گھوڑے دوڑاتے اور شام کو بھنے ہوئے گوشت اور شراب سے اپنی آتشِ شکم بجھاتے اور شعر و شاعری کی محفلیں برپا کرتے۔ ان کے ساتھ کبھی کبھی کوئی گانے والی لونڈی بھی ہوتی جو اپنے رقص و سرود سے انہیں محظوظ کرتی۔ اپنی ان آوارگیوں میں امرؤ القیس یمن میں جا نکلا اور وہیں کوہ دمّون کے قریب واقع ایک آبادی میں اس نے پڑاؤ کیا ہوا تھا اور ایک دن اپنے ایک دوست کے ساتھ پینے پلانے اور چوسر کھیلنے میں مصروف تھا کہ کسی نے اسے یہ خبر آ کر سنائی کہ اس کے باپ حُجر کے خلاف بنو اسد نے بغاوت کر دی اور اسے قتل کر ڈالا۔ امرؤ القیس نے پہلے تو یہ سن کر اپنا کھیل جاری


Scanned with CamScanner

رکھا۔ پھر جب اس سے فارغ ہوا تو اس موقع پر اس نے یہ مشہور جملہ کہا:

ضیّعنی ابی صغیراً و حمّلنی دمَه کبیرا

لا صَحْو الیوم، ولا سُکر غداً

الیوم خمر و غداً امرٌ

(میں چھوٹا تھا تو میرے باپ نے مجھے ضائع کر دیا اور اب بڑا ہوا ہوں تو مجھ پر اپنے خون کا بوجھ لاد کر چل دیا ہے۔ آج تو میں ہوش میں آؤں گا نہیں، اور کل نشہ کروں گا نہیں۔ آج کا دن جام کے لیے ہے اور کل کا دن ایک بڑے کام کے لیے)

ہوش میں آنے کے بعد امرؤ القیس نے قسم کھائی کہ جب تک قبیلہ بنو اسد کے سو افراد کو تہ تیغ کر کے اپنے باپ کے خون کا بدلہ نہ لے لوں گا، نہ گوشت چکھوں گا، نہ شراب کو منہ لگاؤں گا اور نہ بالوں میں تیل ڈالوں گا۔ اپنی اس قسم کو پورا کرنے اور باغیوں سے بدلہ لینے کے لیے اس نے تگ و دو شروع کر دی اور اپنی اس مہم میں مختلف قبائل سے امداد مانگی۔ بعض قبائل نے تو اس کا ساتھ دیا، لیکن دوسروں نے انکار کر دیا۔ تاہم اس نے بنو اسد پر چڑھائی کی اور ان کے سو آدمی تہ تیغ کر ڈالے اور بے شمار زخمی کر دیئے۔ لیکن اس پر بھی اس کی آتشِ انتقام ٹھنڈی نہ ہوئی اور اس نے گویا بنو اسد کو صفحۂ ہستی سے مٹا دینے کی ٹھان لی۔ اس کے ان سرپھرے ارادوں کو بھانپ کر بکر و تغلب کے لوگوں نے اس کی مدد سے ہاتھ کھینچ لیا اور یہ شاعر مدد کے لیے دوسرے قبائل کے پاس گیا۔ لیکن کہیں سے اسے خاطر خواہ حمایت حاصل نہ ہوئی۔ اس طرح دربدر کی ٹھوکریں کھاتا یہ بالآخر اپنے آبائی وطن یمن میں جا نکلا اور اپنے اہلِ خاندان سے امداد طلب کی۔ انہوں نے اس کی حالت دیکھ کر اپنے پانچ سو جوان اس کے ساتھ کر دیے اور وہ ان کو لے کر بنو اسد کی سرکوبی کے لیے نکلا۔ اس اثناء میں اس کے دشمنوں کو ملک حیرہ کے فرمانرواؤں مناذرہ کی مدد حاصل ہو گئی تھی جن کی امرؤ القیس کے خاندان کے ساتھ کسی بات پر سخت مخالفت چلی آتی تھی۔ یہ دیکھ کر لوگ ایک ایک کر کے امرؤ القیس سے الگ ہوتے چلے گئے اور اسے بے یار و مددگار چھوڑ دیا۔ ان حالات میں کسی نے اسے مشورہ دیا کہ وہ قسطنطنیہ میں قیصر روم کے پاس جا کر بنو اسد اور مناذرہ کے خلاف۔ جن کو کسریٰ کی پشت پناہی حاصل تھی۔ مدد کا طالب ہو۔ چنانچہ ہمارا یہ شاعر قیصر کے ہاں پہنچا۔ وہاں اس کی اچھی آؤ بھگت ہوئی اور قیصر نے یہ دیکھتے ہوئے کہ اس کے حریف کسریٰ کے خلاف امرؤ القیس عرب میں اس کے لیے ایک اچھی طاقت ثابت ہو سکتا ہے، اس کے ساتھ ایک لشکر روانہ کر دیا۔ لیکن امرؤ القیس ابھی بلادِ روم سے چلا ہی تھا کہ کسی بات سے بدظن ہو کر قیصر نے اپنا ارادہ بدل دیا اور اپنا لشکر واپس بلا لیا۔ انہی دنوں امرؤ القیس ایک ایسی بیماری میں مبتلا ہوا جس سے اس کے سارے جسم پر دانے

نکل آئے اور وہ اسی تکلیف میں بالآخر انتقال کر گیا اور وہیں ۵۴۰ میں جبل عسیب میں دفن ہوا۔ مؤرخین کا خیال ہے کہ کسی نے جا کر قیصر کو اس کی بہن کے معاملے میں امرؤ القیس کے خلاف بھڑکایا تو اس نے زہر میں بجھی ہوئی ایک خلعتِ فاخرہ اس کو بھیجی' جو اسے انقرہ میں ملی۔ اسے پہنتے ہی اس کے سارے جسم پر دانے نکل آئے اور وہ اس مہلک بیماری میں مبتلا ہو گیا۔ اسی لیے اس کو ''ذوالقروح'' (زخموں والا) بھی کہا جاتا ہے۔

امرؤ القیس کے سوانحی تذکرے سے اس کی زندگی کے دو جداگانہ دور سامنے آتے ہیں۔ ایک دور وہ ہے جس میں وہ ایک عیاش' بے فکرا اور کھلنڈرا نوجوان ہے اور دوسرا وہ جس میں وہ باپ کے قصاص کا بوجھ اپنے کندھوں پر لادے ناقابلِ حصول اُمنگوں کی راہ پر چل کھڑا ہوتا ہے۔ زندگی کے ان دونوں اطوار کی چھاپ اس کی شاعری میں واضح طور پر دیکھی جا سکتی ہے۔ اس کی اوائل شباب کی نظموں میں وصف و بیان' واردات ہجر و وصال اور اس کے ساتھ ساتھ مہم جوئی اور خود پنداری کا عنصر غالب ہے۔ جبکہ اس کی موخر زمانے کی شاعری میں فکر و تامّل اور قنوطیت اور راضی بتقدیر ہونے کی کیفیت نمایاں دکھائی دیتی ہے۔

زمانہ حال کے مصری ادیب اور عربی ادب کے مؤرخ احمد حسن الزیات امرؤ القیس کی شاعری کے بارے میں لکھتے ہیں:

> ''زندگی بھر کی سیاحتوں' مہم جوئیوں اور قبائل کے ساتھ میل جول نے اس کی طبیعت کو جلا بخشی۔ چنانچہ اس نے شاعری میں نئے نئے معانی پیدا کیے اور اپنے بعد آنے والوں کے لیے نئی راہیں کھولیں۔ وہ پہلا شخص ہے جس نے کھنڈروں پر کھڑے ہو کر دیار محبوب کی ویرانی پر اشک بہائے' معاملات حسن و عشق کا اپنی نظموں میں برملا ذکر کیا اور حسیناؤں کو ہرنیوں اور غزالوں سے تشبیہ دی۔ اس کی شاعری میں اس کی اصل زندگی کے سارے رُخ دکھائی دیتے ہیں۔ چنانچہ اس میں بادشاہوں کا فخر و اعتزاز بھی ہے اور دریوزہ گروں کی زبوں حالی بھی۔ اس میں ایک عیاش انسان کی ہوس پرستی بھی ہے اور ایک طالب انتقام کی غیرت وحمیت بھی۔ اس میں ایک مصیبت زدہ کا شکوہ بھی ہے اور در در ٹھوکریں کھانے والے کی سی ذلت بھی اور ان سب اسباب کی بنا پر اہل روایت کا اس امر پر اتفاق ہے کہ امرؤ القیس جاہلی شعراء کا سرخیل ہے۔''

امرؤ القیس کے اسلوب شعر کا بہترین اور نمائندہ نمونہ اسّی اشعار پر مشتمل اس کی طویل نظم معلقہ ہی ہے' جو بحر طویل میں ہے اور جس کے بارے میں یقین سے کہا جا سکتا ہے کہ پوری عربی شاعری میں اس سے زیادہ پڑھی جانے والی نظم اور کوئی نہیں۔ اس نظم کے شروع کے اشعار میں ہم شاعر کو اپنی محبوبہ کے چھوڑے ہوئے آثار پر کھڑے ہوئے اس کی یاد میں آنسو بہاتے ہوئے دیکھتے ہیں۔ امرؤ القیس کے اس قصیدے کے مضامین اور خصوصاً اس کے پیرایۂ آغاز نے عربی شاعری میں ایک ایسی طرح ڈالی کہ



Scanned with CamScanner

صدیوں تک شعراء اس کی پابندی سے آزاد نہ ہو سکے اور ایک مقدس روایت کی طرح عربی قصیدے کی مثالی صورت یہ ٹھہری کہ شاعر اس کا آغاز لازماً ذکرِ محبوب سے کرے گا اور اس کے چھوڑے ہوئے کھنڈروں پر آنسو بہائے گا۔ اس ضمن میں شراب کا ذکر بھی آ سکتا ہے اور اُن ایام کا بھی جو اس نے اپنی محبوبہ کی مقاربت میں گزارے تھے۔ اس کے بعد وہ ایک خوبصورت گریز کر کے اپنے گھوڑے یا اونٹنی کے ذکر پر آئے گا اور اپنے سامعین اور قارئین سے اپنے اس جانور کا ایک تفصیلی تعارف کرائے گا جو اسے ایک لمبے صحرائی سفر کی جوکھوں سے سلامت نکال لایا ہے۔ اسی ضمن میں وہ اپنے سفر کی ہولناکیوں کو یاد کرنے لگے گا، جن میں کالی وحشتناک راتیں ہوں گی، بادل اور بجلی کے کڑاکے ہوں گے اور اگر شاعر اپنے کسی مہربان امیر یا حکمران کے پاس جا کر اس کی مدح کرنے کے ارادے سے نکلا ہے تو پھر وہ ایک اور گریز کر کے اس شخصیت کی مدح میں کچھ اشعار کہے گا جن میں اس کی شجاعت اور نیکی اور دریا دلی کے گن گائے جائیں گے اور پھر آخر میں کچھ حکمت و دانائی کی باتیں ہوں گی اور نظم اپنے اختتام کو پہنچے گی۔

امرؤ القیس کے معلقے کے کچھ اشعار نمونے کے طور پر یوں ہیں۔ شروع میں تشبیب کا مضمون ہے:

قِفا نبکِ من ذکری حبیب و منزل     بسقط اللوی بین الدخول فحومل
وقوفاً بها صحبی علیَّ مطیّھم     یقولون لا تھلک أسیً و تجمّل
وان شفائی عبرۃ مھراقۃ     فھل عند رسم دارس من معوّل

(ذرا ٹھہرو دوستو کہ ہم ایک محبوبہ اور اس کے مسکن کی یاد میں آنسو بہالیں، جو دخول اور حومل کے درمیان ٹوٹتی ریت پر واقع ہے۔

میرے ساتھیوں نے میری خاطر اپنی سواریوں کو روک رکھا تھا اور مجھے نصیحت کر رہے تھے کہ صبر کرو، اپنے آپ کو اس غم سے ہلاک نہ کر ڈالو

حالانکہ میرا علاجِ غم وہی بہتے ہوئے آنسو تھے اور میں سوچتا تھا کہ محبوب کے یہ بوسیدہ آثار مجھے تسکین دے سکیں گے؟)

آگے چل کر رات کے بارے میں کہتا ہے:

ولیل کموج البحر أرخی سدوله     علیَّ بانواع الھموم لیبتلی
فقلت له لمّا تمطیّٰ بصلبه     و اردف اعجازاً و ناء بکلکل
الا ایھا اللیل الطویل الا انجلی     بصبح وما الاصباح منک بامثل
فیالک من لیل کان نجومه     بکل مغار الفتل شُدّت بیذبل

(اور کئی مرتبہ ایک ایسی رات جو سمندر کی موج کے مانند تھی، طرح طرح کے تفکرات لیے آئی اور اپنے پردے مجھ پر تان دیے کہ میرے صبر کا امتحان لے۔


Scanned with CamScanner

جب وہ رات کمر سیدھی کر کے لمبی ہو گئی اپنے پٹھے پھیلا دیے اور سینہ زمین پر ٹیک دیا تو میں نے اس سے کہا۔
اے شبِ طویل ہجر! اب تیری صبح ہو بھی چکے۔ لیکن صبح اگر ہو بھی گئی تو وہ تجھ سے بہتر کاہے کو ہو گی۔
کیسی رات ہے تو کہ جیسے تیرے ستاروں کو کسی نے بٹی ہوئی رسیوں سے کوہ یذبل کی چٹانوں کے ساتھ باندھ دیا ہو۔)

اسی معلقے میں وہ اپنے گھوڑے کے بیان میں کہتا ہے:

وقد اغتدی والطیر فی وکناتها     بمنجردٍ قید الا وابد هیکل
مِکَر مِفرّ مُقبل مُدبر معاً     کجلمود صخرٍ حطّه السیلُ من علی
له ایطلاظبی وساقا نعامة     وارخاء سرحان و تقریب تتفل

(پرندے ابھی اپنے آشیانوں میں ہوتے ہیں کہ میں صبحدم ایک ایسے گھوڑے کو لے کر نکل کھڑا ہوتا ہوں جس کی جلد صاف ہے،
جو بڑے ڈیل والا ہے اور اپنی تیز رفتاری سے وحشی جانوروں کے لیے قید ثابت ہوتا ہے۔
ایک ہی وقت میں وہ کبھی حملہ آور ہوتا ہے اور کبھی پہلو بچا جاتا ہے، کبھی آگے بڑھتا ہے اور کبھی پیچھے لوٹتا ہے، جیسے ایک چٹان کا تودہ جسے سیلاب نے پہاڑ کی چوٹی سے نیچے لڑھکا دیا ہو۔
اس کے دونوں پہلو ہرن کے سے ہے اور دونوں پنڈلیاں شتر مرغ کی سی، اور تیز روی بھیڑیے کی اور پویا چال لومڑی کے بچے کی)

ایک جگہ وہ آسمانی بجلی کا ذکر کرتے ہوئے کہتا ہے:

اصاحِ تری برقا اُریکَ ومیضَه     کلمع الیدین فی حبیّ مُکلّل
یُضیی سناه او مصابیح راهب     امال السلیط بالذبال المفتّل

(اے میرے ساتھی تو اس بجلی کو دیکھ رہا ہے، جس کی چمک میں تجھے دکھا رہا ہوں، یوں جیسے تہ در تہ بادلوں میں دو ہاتھوں سے نکلنے والی چمک!
کیا یہ بجلی کی روشنی ہے یا ایک معبد میں راہب کا دیا، جس کی بتی تیل پڑنے سے روشن ہو اٹھی ہو۔)

معلقے کے علاوہ امرؤ القیس کے بعض اشعار ایسے ہیں جو ضرب المثل کی طرح زبانوں پر چڑھ گئے ہیں، جن کی کچھ مثالیں یہ ہیں:

و قد طوّفت ُفی الآفاق حتی　　رضیتُ من الغنیمة بالایاب

(میں نے سب آفاق کی خاک چھان لی اور جب کچھ ہاتھ نہ آیا تو آخر واپس لوٹ آنے کو ہی غنیمت جانا)

فتُوسع اهلَها اقطا و سمنا　　وحسبک من غنیً شبع وریّ

(ایسی بکریاں جو اپنے مالکوں کو پنیر اور مکھن سے سیر کر دیں اور اگر تمہیں کھانے کو اور پینے کو مل جائے تو اس کے علاوہ امیری اور کیا ہوتی ہے۔)

اذا المرء لم یخزن علیه لسانه　　فلیس علی شئ سواه بخزّان

(اگر انسان اپنی زبان پر قابو نہیں رکھ سکا تو وہ اس کے علاوہ کسی شے پر بھی قابو نہیں رکھ سکتا۔)

فانک لم یفخر علیک کفاخرٍ　　ضعیف ولم یغلبک مثل مغلَّب

(اس سے بڑی اور کوئی بات نہیں ہو سکتی کہ ایک کمزور شخص تم پر فخر کرنے لگے اور ایک ہارا ہوا شخص تم کو ہرا دے۔)

## ۲۔ طَرَفہ بن العبد (م ۵۶۴)

معلقات کے شاعروں میں دوسرا شاعر طرفہ بن العبد ہے۔ یہ اگرچہ کم عمری میں ہی فوت ہو گیا تھا۔ (اکثر روایات کے مطابق اس نے صرف چھبیس برس عمر پائی۔) لیکن اپنی شاعری کے معیار کی وجہ سے معلقات کے شعراء میں وہ امروَ القیس کے طبقے میں آتا ہے۔ پھر زمانۂ جاہلیت میں شاعری یوں تو بہت ہوئی لیکن اس میں فکر کی شاعری بہت کم دیکھنے میں آتی ہے۔ اس طرح کے طرزِ سخن میں صرف دو شاعروں کے نام سامنے آتے ہیں جن میں سے ایک طرفہ ہے اور دوسرا معلقات ہی کا ایک اور شاعر زہیر بن ابی سُلمیٰ۔

طرفہ کا تعلق قبیلہ بنوبکر سے تھا' جس کی ایک شاخ بحرین میں جا بسی تھی اور وہیں طرفہ کی پیدائش ہوئی۔ وہ مشہور جاہلی شاعر متلمّس کا بھانجا اور دوسرے معروف شاعر المرقّش الاصغر کا بھتیجا تھا۔ بچپن میں ہی اس کے سر سے باپ کا سایہ اُٹھ گیا اور اس کی پرورش اس کے چچاؤں نے کی اور نہایت نامناسب طریقے سے کی۔ یہاں تک کہ اس کی ماں وردہ کی جائیداد بھی غصب کر لی۔ طرفہ کو اس بات کا رنج ہوا اور اس نے ان کی ہجو میں کچھ اشعار کہے۔ جب اس کا اپنے خاندان والوں سے نباہ نہ ہو سکا تو وہ گھر سے

نکل کھڑا ہوا اور لہو ولعب اور شراب و کباب سے شغل کرنے لگا۔ جب تک اس کے پاس پیسہ ہوتا اس کے دوست اس کی بزم آرائیوں میں شریک رہتے اور اس کا ساتھ دیتے' اور جب پیسہ ختم ہو جاتا تو وہ ساتھ چھوڑ جاتے اور طرفہ کو اپنے بھائی بندوں سے مانگنا پڑتا اور یوں اپنے قبیلے کے طعن و تشنیع کا نشانہ بننا پڑتا۔

طرفہ کو قدرت نے بلا کی ذہانت عطا کی تھی اور شاعری کا اعلیٰ ذوق بخشا تھا۔ وہ بچپن ہی سے شعر کہنے لگا اور بیس سال کی عمر کو پہنچ کر اسے شعر کہنے میں استادانہ مہارت حاصل ہو گئی۔ اب اس کے اہل قبیلہ اور دوسرے لوگ اس سے اس لیے بھی پہلو بچاتے تھے کہ اس کی زبان سخت بے لگام تھی اور اپنا یا پرایا کوئی بھی اس کی ہجو گوئی کا نشانہ بن سکتا تھا۔ اپنے خاندان والوں سے مسلسل نزاع و اختلاف کی وجہ سے اس کی زندگی اکثر تلخ رہنے لگی تھی۔ کچھ عرصے کے بعد بالآخر طرفہ اور اس کے اہل خاندان کے درمیان مصالحت ہو گئی۔ اس نے اپنا رویہ درست کرنے کا وعدہ کیا' اپنے اہل خانہ کی طرف واپس آیا اور بسوس کی جنگ میں حصہ لیا۔ اس کے بعد جب اس کا ہاتھ تنگ ہوا تو اس نے اپنے بھائی کے مویشی چرانے کا کام اپنے ذمے لے لیا۔ اسی زمانے میں اس نے اپنا معلقہ کہا جسے اس کے ایک دولت مند رشتے دار نے پسند کیا اور اسے کچھ پیسہ دے کر جانوروں کی رکھوالی سے آزاد کر دیا۔ پھر جب بکر اور تغلب کے درمیان امن قائم ہو گیا تو اس نے حیرہ کے بادشاہ عمرو بن ہند کے دربار کا رُخ کیا۔ وہاں اس کی پہلے تو کافی قدر ہوئی اور بادشاہ نے اسے اور اس کے ماموں متلمس کو اپنا ندیم و جلیس بنایا لیکن پھر انہیں اپنے ولی عہد کے حوالے کر دیا۔ تاہم شہزادے نے ان شعراء کی وہ قدر نہ کی بلکہ ان کے ساتھ کچھ توہین آمیز سلوک کیا۔ اس پر ان شاعروں نے بادشاہ اور اس کے بھانجے کی ہجو میں اشعار کہے۔ جب عمرو بن ہند کو ان اشعار کا علم ہوا تو اس نے یہ بات اپنے دل میں رکھ لی۔ جب یہ دونوں ماموں اور بھانجا انعام و اکرام کی خاطر بادشاہ کی خدمت میں حاضر ہوئے تو اس نے دونوں کا خوش دلی سے استقبال کیا اور کہا کہ اس نے ان کو انعام دینے کا فیصلہ کیا ہے۔ اس نے انہیں بحرین میں اپنے گورنر کے نام دو الگ الگ خط دیئے اور کہا کہ وہ جب یہ خط اسے جا کر دیں گے تو وہ انہیں مناسب انعام دے گا۔ یہ دونوں شاعر ابھی راستے میں ہی تھے کہ متلمس کو کچھ شک گزرا اور اس نے اپنا خط کھول کر کسی سے پڑھوا لیا۔ اس میں لکھا تھا کہ جب متلمس وہاں پہنچے تو اس کے ہاتھ اور پاؤں کاٹ دینا اور اسے زندہ دفن کر دینا۔ متلمس نے وہ خط پھاڑ کر نہر میں پھینک دیا اور طرفہ سے بھی ویسا ہی کرنے کو کہا۔ لیکن طرفہ نے اپنا خط نہ کھولا۔ اسے یقین تھا کہ بادشاہ اس کے ساتھ یہ برتاؤ کرنے کی جرأت نہیں کرے گا۔ لیکن جب وہ بحرین پہنچا تو اس کے گورنر نے معاملہ بھانپ کر طرفہ کو موقع دیا کہ وہ وہاں سے فرار ہو جائے۔ لیکن طرفہ نہ مانا۔ آخر خط

کھولا گیا تو قتل کا حکم برآمد ہوا۔ گورنر نے طرفہ کو اختیار دیا کہ اپنی موت کا طریقہ وہ خود تجویز کرے۔ طرفہ نے خواہش ظاہر کی کہ اسے خوب شراب پلا کر اکحل نامی شریان کا منہ نشتر سے کھول دیا جائے۔ چنانچہ ایسا ہی کیا گیا اور وہ زیادہ خون بہہ جانے سے مرگیا۔ قتل کے وقت اس کی عمر چھبیس سال کے لگ بھگ تھی۔ اسی لیے اسے ''الغلام القتیل'' (مقتول نوجوان) کا لقب دیا جاتا ہے۔

طرفہ کا معلقہ بحرِ طویل میں ایک سو چار اشعار پر مشتمل ایک دالیہ قصیدہ ہے۔ لیکن دوسرے معلقات کی طرح اس میں بھی ایک مکمل ادبی وحدت نظر نہیں آتی۔ چنانچہ مختلف موضوعات پر اس کے متعدد ٹکڑے ہیں، جو لگتا ہے شاعر نے مختلف اوقات میں نظم کیے ہیں، جن کا زمانہ اور جن کا ماحول مختلف ہو سکتا ہے۔

قصیدے کی ابتدا جاہلی دستور کے مطابق تشبیب سے ہوتی ہے۔ اس کے بعد شاعر اپنی اونٹنی کا وصف شروع کرتا ہے اور پینتیس اشعار میں اس کا سراپا بیان کرتا ہے، جو اپنی اچھوتی تشبیہات کے سبب عربی ادب میں بہت اہم سمجھا جاتا ہے۔ اس کے بعد وہ اصل مطلب پر آتا ہے اور اپنی ذات اور اپنی صفات پر فخر کرتا ہے اور اس کے ساتھ زندگی سے متعلق اپنا فلسفہ اور نظریہ بیان کرتا ہے، جو یونان کے ایپیکیوری (Epicurian) فلسفے سے کافی مماثلت رکھتا ہے۔ اس کے بعد بڑے دکھ درد کے ساتھ وہ اپنے اعزاء و اقارب کی زیادتی کا شکوہ کرتا ہے اور اپنے معلقے کو زہیر کی طرح حکمت و فلسفے کی باتوں پر ختم کرتا ہے۔

طرفہ کے معلقے کے کچھ اشعار بطور نمونہ اس طرح سے ہیں:

لِخَولَةَ اطلالٌ ببرقة ثهمد    تلوح كباقي الوشم في ظاهر اليد

كأنّ حدوج المالكية غدوة    خلايا سفين بالنواصف من دد

عدولية او من سفين ابن يامن    يجوربها الملّاح طورًا ويهتدي

(ثمد کی کنکریلی زمین میں خولہ کے کھنڈرات ہیں جو ہاتھ پر مٹتے ہوئے گدنے کے نشانات کی طرح دکھائی دیتے ہیں۔
فراق کی صبح کو بنو مالک کے کجاوے دَد کی وادی میں یوں دکھائی دیتے تھے جیسے وہ اونٹوں پر لدے بڑے بڑے سفینے ہوں۔
یہ سفینے یا تو قبیلہ عدولی کے یا پھر ابن یامن کے لگتے ہیں جنہیں ملاح کبھی سیدھا لے جاتا ہے اور کبھی بھٹک کر دوسری طرف سے لے جاتا ہے۔)

اپنے پینے کے بارے میں اور زندگی اور موت کے مسئلے پر وہ اپنی آراء کا اظہار اس طرح کرتا ہے:

وما زال تشرابي الخمورَ ولذّتي    و بيعي و انفاقي طريفي و مُتلدي

الى ان تحامتني العشيرة كلها    وأفردت افراد البعير المعبّد

الا ایھاذا الائمی اشھد الوغی — و ان احضر اللذّات ھل انت مُخلدی
فان کنت لا تسطیع دفع منیتی — فدعنی ابادر ھا بما ملکت یدی
فلو لا ثلاث ھن من لذّة الفتی — وجدّک لم احفل متی قام عُودّی
فمنھن سبقی العاذلات بشربة — کمیت، متی ما تعل بالماء تُزبد
و کری اذا نادی المضاف — کسید الغضا نبھتہ المتورّد
و تقصیرُ یوم الدّجن والدجن مُعجب — ببھکنة تحت الخباء المعمّد

(میری شراب نوشی اور لطف اندوزی کا عالم وہی رہا ہے' اسی طرح میں اپنی نئی اور موروثی جائداد کو خریدتا اور بیچتا رہا ہوں۔

یہاں تک کہ میرے اہل خاندان نے مجھ سے کنارہ کشی کر لی اور مجھے ایک ایسے اونٹ کی طرح الگ کر دیا جسے خارپشت کا روگ لگ گیا ہو۔

اے وہ جو مجھے اس بات پر ملامت کرتے ہو کہ میں جنگوں میں کیوں شامل ہوتا ہوں اور عیش و طرب کا شغل کیوں کرتا ہوں' تو اگر میں یہ سب کچھ نہ کروں تو کیا تم مجھے ہمیشہ زندہ رہنے کی ضمانت دے سکتے ہو!

اگر تم میری موت کو مجھ سے ٹال نہیں سکتے تو مجھے چھوڑ دو' میں اپنے مال کے ساتھ جو چاہوں کروں اور پھر موت کو گلے لگا لوں۔ اگر تین چیزیں ایسی نہ ہوتیں جو ایک نوجوان کے لیے باعث لذت ہوتی ہیں' تو تیرے نصیبوں کی قسم مجھے کچھ پروا نہ ہوتی کہ میری عیادت کو آنے والے کب مایوس ہو کر اُٹھے اور چل دیئے۔

ان میں سے ایک یہ کہ میں ناصحوں کی نصیحت سے پہلے ہی ایسی سرخ شراب کے جام چڑھا لوں جس میں اگر پانی ملایا جائے تو جھاگ دینے لگتی ہے اور دوسری یہ کہ جب مجھے کوئی خوف کا مارا پکارے تو اس کی مدد کے لیے دوڑ کے جاؤں' ایک ایسے خوفناک بھیڑیے کی طرح جو پانی کی تلاش میں جاتا ہو اور تم نے اسے چونکا دیا ہو۔

اور تیسری یہ کہ ایک ابر آلود دن میں ایک حسینۂ خوش اندام کے ساتھ گزاروں جو ستونوں والے خیمہ کے نیچے میرے ساتھ رہے۔)

ان کے علاوہ طرفہ کے کچھ اشعار ایسے ہیں جو اپنی حکمت اور دانائی اور اپنے الہامی لہجے کی وجہ سے زبان زدِ خاص و عام ہیں۔ مثلاً ایک جگہ وہ کہتا ہے کہ میں نے دیکھا ہے کہ مرنے کے بعد ایک بخیل انسان کی قبر بھی ویسی ہی ہوتی ہے جیسی ایک گمراہ اور بے عمل انسان کی جو اپنا مال ضائع کر دیتا ہے۔ تو پھر ان دونوں انسانوں کے درمیان فرق کیا ہوا؟

اری قبر نحام بخیل بمالہ　　　کقبر غویٍ فی البطالۃ مفسدِ

پھر وہ اپنے اعزاء و اقارب کے ظالمانہ رویے کے خلاف شکایت کرتے ہوئے کہتا ہے کہ اپنوں کے کیے ہوئے ظلم ہندی تلوار کے وار سے بھی زیادہ اذیت ناک ہوتے ہیں۔

و ظلم ذوی القربی أشد مضاضۃً　　　علی المرء من وقع الحُسام المهنّدِ

پھر اپنے ایک خوبصورت الہامی شعر میں کہتا ہے کہ زمانہ تمہیں وہ کچھ دکھائے گا جس کا تم نے سوچا بھی نہ تھا اور تمہارے پاس ایسے لوگ خبریں لے کر آئیں گے جن کو تم نے یہ خبریں لانے کے لیے زادِ راہ دے کر نہیں بھیجا تھا۔

ستبدی لک الایامُ ماکنت جاهلاً　　　ویاتیک بالاخبار من لم تزوّدِ

## ۳۔ زہیر بن ابی سُلمٰی (م ۶۱۱)

زہیر بن ابی سلمٰی قبیلہ مضر کی شاخ قبیلہ مُزینہ سے تھا۔ یہ اور اس کے خاندان کے لوگ نجد میں غطفان کے علاقے میں رہتے تھے۔ زہیر امرؤ القیس اور نابغہ ذبیانی کے ساتھ دور جاہلیت کے تین بڑے شعراء میں شمار کیا جاتا ہے۔ لیکن اپنے ہم طبقہ دونوں شعراء کے مقابلے میں زہیر کے مزاج میں متانت اور شرافت تھی اور وہ اپنی شاعری میں ایک دانا اور معلّمِ اخلاق نظر آتا ہے۔ وہ بے سبب کسی کی مدح یا ہجو نہیں کرتا تھا' نیز اس کے کلام میں جنگ سے نفرت اور امن و صلح پسندی کا پیغام ملتا ہے۔ اس کی شاعری کے بہت اعلیٰ و ارفع ہونے کی ایک بڑی وجہ یہ بھی ہے کہ وہ اس میں بہت کاٹ چھانٹ اور اصلاح کرتا رہتا تھا اور اپنی نظم میں صرف وہی اشعار باقی رہنے دیتا تھا جو ہر طرح سے فن کے اعلیٰ معیار پر پورے اترتے ہوں۔

زہیر کی تربیت بنی غطفان میں اس کے باپ کے رشتہ داروں میں ہوئی اور اس نے اپنے باپ کے ماموں بشامہ بن الغدیر کی صحبت اختیار کی جو اگرچہ معذور تھا' لیکن دانا اور حکیم تھا جس کی رائے صائب تھی' جو بہت اچھے شعر کہتا تھا اور خاصا مال دار تھا۔ زہیر نے اس کی شاعری کا اثر قبول کیا اور اس کے علم اور دانائی سے خوب فائدہ اٹھایا۔ چنانچہ آگے جا کر اس نے جو شاعری کی اس میں فکر و دانش کے عناصر بہت نمایاں دکھائی دیتے ہیں۔ اس کے علاوہ وہ اپنے سر اوس بن حجر کے ساتھ بھی کافی عرصہ اس کا راوی بن کر رہا۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ شاعری زہیر کے خاندان میں تھی۔ اس کا سر اوس بن حجر' اس کی دو ہمشیرگان سلمٰی اور خنساء اور دو بیٹے کعب بن زہیر اور بُجیر' سب نے شاعری میں نام پیدا کیا۔ کعب بن

زہیر وہی ہے جس نے اسلام لانے کے بعد آنحضرت ﷺ کی خدمت میں حاضر ہو کر اپنا مشہور قصیدہ ''بانت سعاد'' سنایا تھا۔

جاہلی معاشرے کے دو قبیلوں عبس اور ذبیان کے درمیان طویل عرصے سے جنگ چلی آتی تھی؛ جس کا ذکر ''ایام العرب'' میں ''داحس والغبراء'' کے نام سے آتا ہے۔ جب حارث بن عوف اور ہرم ابن سنان نامی دو سرداروں نے اپنی کوششوں سے عبس اور ذبیان کے قبائل کے درمیان صلح کرا دی اور مقتولین کے قصاص کے طور پر تین ہزار اونٹ دے دیے تو ان سرداروں کی اس فیاضی' ایثار اور امن پسندی سے زہیر اتنا متاثر ہوا کہ اس نے اپنے معلقے میں ان کی مدح کی۔ پھر اس نے خاص طور پر ہرم بن سنان کی تعریف میں کافی شعر کہے۔ یہاں تک کہ ہرم نے قسم کھائی کہ زہیر جب بھی اس کی مدح کرے گا' یا اس سے کچھ مانگے گا یا اسے صرف سلام ہی کرے گا تو وہ اسے غلام یا لونڈی یا گھوڑا انعام میں دے گا۔ اس پر زہیر کو کچھ لاج آئی اور وہ ہرم کو جب بھی مجمع میں دیکھتا تو پکار اُٹھتا۔ ''آپ سب لوگوں کو میرا سلام ہو' سوائے ہرم کے اور آپ میں سے جو بہترین تھا میں نے اسی کو مستثنیٰ کر دیا ہے۔'' ایک دفعہ حضرت عمرؓ نے ہرم کے کسی بیٹے سے کہا کہ مجھے وہ کچھ مدحیہ قصائد سناؤ جو زہیر نے تمہارے والد کی تعریف میں کہے تھے' تو اس نے وہ قصائد سنائے۔ حضرت عمرؓ کہنے لگے زہیر آپ لوگوں کی بڑی ہی تعریف کیا کرتا تھا۔ تو بیٹے نے جواب دیا کہ ہم بھی اس کو اچھا خاصا انعام دیتے تھے۔ اس پر آپ نے فرمایا۔ ''جو تم لوگوں نے اسے دیا وہ تو ختم ہو گیا' لیکن جو کچھ وہ آپ لوگوں کو دے گیا وہ سدا باقی رہے گا۔''

زہیر امارت کے باوجود بہت حوصلہ مند' بڑی عقل والا' صائب الرائے' زہد و ورع کی طرف مائل' امن کا دلدادہ اور اللہ اور یوم آخرت پر ایمان رکھنے والا شخص تھا۔ اس کے معلقے کے یہ اشعار اس کے ایمان پر دلالت کرتے ہیں:

فلا تکتمنَّ اللہ مافی صدورکم ... لیخفی ومھمایُکتم اللہُ یَعلَمِ
یؤخّر فیوضع فی کتاب فیدّخر ... لیوم حساب او یعجّل فینقمِ

(جو کچھ تمہارے دلوں میں ہے وہ اللہ سے ہرگز نہ چھپاؤ' اس خیال سے کہ وہ مخفی رہے' اس لیے کہ جو کچھ بھی اللہ سے چھپایا جائے گا وہ اسے جان لے گا۔
یا تو اسے تاخیر میں ڈالا جائے گا اور ایک کتاب میں لکھ کر یوم حساب تک محفوظ کر دیا جائے گا' یا پھر اس سے جلد ہی نمٹا جائے گا' اور یہیں اس کی سزا دے دی جائے گی۔)

زہیر ہجرت سے گیارہ سال قبل فوت ہوا۔ تاہم اس کے دونوں بیٹے بُجیر اور کعب اسلام لے آئے۔ کچھ لوگ زہیر کو امرؤ القیس اور نابغہ پر بھی فوقیت دیتے ہیں۔ اس لیے کہ اس کی شاعری میں لہجے کی

صداقت ہے' اس میں اجنبی' مشکل اور پیچیدہ لفظ کوئی نہیں۔ پھر اس کی شاعری بے ہودہ مضامین سے خالی ہے اور وہ بہت سے معانی کو تھوڑے الفاظ میں بیان کرنے کا ہنر جانتا ہے۔ وہ عبید الشعر ہے' یعنی اپنی شاعری کو بنانے سنوارنے میں بہت محنت کرتا ہے۔ اس کے بعض قصائد ''حولیات'' کہلاتے ہیں (یعنی سال بھر میں مکمل کی جانے والی نظمیں) اس لیے کہ لوگوں کا خیال تھا کہ وہ ایک قصیدہ چار ماہ میں کہتا ہے' پھر چار مہینے اس کی نوک پلک سنوارنے میں لگا دیتا ہے۔ اس کے بعد وہ چار ماہ اسے خواص شعراء کو پیش کرنے میں لگا دیتا ہے اور اس طرح وہ پورے ایک سال میں ایک قصیدہ مکمل کر کے لوگوں کو سناتا ہے۔

زہیر کے معلّقے کا موضوع تو' جیسا کہ اوپر ذکر ہوا' عبس اور ذبیان کے درمیان صلح کرانے والے دو سرداروں حارث بن عوف اور ہرم بن سنان کی مدح ہے۔ لیکن وہ جاہلی روایت کے مطابق نظم کی ابتدا اپنی مطلّقہ بیوی اُمّ اوفی کے چھوڑے ہوئے کھنڈروں اور حویلیوں کے سامنے کھڑے ہوئے بیس برس پہلے کے اس زمانے کو یاد کر کے کرتا ہے جب وہ یہاں اس کے ساتھ رہتی تھی۔ اور اس کے ساتھ وہ ان دنوں کا تصور کرتا ہے جب ام اوفی اور اس کی ہمجولیاں اونٹوں کے کجاووں پر سوار اس علاقے میں وادی وادی گھوما کرتی تھیں۔ ان کے اس سفر و حضر کا احوال وہ اتنی وضاحت اور خوبصورتی سے بیان کرتا ہے کہ جیسے وہ سب کچھ اس کی آنکھوں کے سامنے ہو رہا ہے۔ اس کے بعد وہ ان سرداروں کی تعریف کرنے لگتا ہے جنہوں نے اپنی کوششوں سے عبس و ذبیان کے درمیان خون خرابے کا طویل سلسلہ ختم کر دیا اور ساتھ ہی وہ باہم لڑنے والے فریقوں کو نصیحت کرتا ہے اور ان کے لیے جنگ کی ہولناکیوں کا نقشہ کھینچتا ہے اور بتاتا ہے کہ آپس میں لڑنے اور ایک دوسرے کا خون بہانے سے کچھ حاصل نہیں ہوتا۔ چنانچہ وہ انہیں امن اور صلح جوئی کی تلقین کرتا ہے۔ پھر نظم کے آخری حصے میں وہ انسان دوستی کے جذبے کے تحت اپنی زندگی کے تجربوں سے اخذ کی ہوئی حکمت و دانائی کی باتیں کرنے لگتا ہے اور دور جاہلیت میں فکر کی شاعری کا بہت اعلیٰ نمونہ پیش کرتا ہے۔

زہیر کے معلّقے کا مطلع ہے:

أمِن أم اوفى دمنة لم تكلّم بحومَانة الدّرّاج فالمتثلّم

(کیا یہ اُم اوفی کا چھوڑا ہوا سیاہ کھنڈر ہے حومانۃ الدراج کے پانی کے پاس' متثلم کے قریب' جو خاموش کھڑا ہے اور کچھ بول نہیں رہا۔)

اس کے بعد کے شعروں میں شاعر کہتا ہے۔

و دار لها بالرقمتين كأنها مراجيع وشم في نواشر معصم

(اور رقمتین میں جو اس کا گھر ہے اس کے نشانات یوں لگتے ہیں جیسے کلائی کی رگوں پر گودنوں کو پھر سے گود کر نکھار دیا گیا ہو۔)

وقفت بها من بعد عشرین حجّة　　فلأیاً عرفت الدار بعد توهّم

(میں وہاں بیس سال کے بعد آیا تو بڑی مشکل سے اور کافی وہم و خیال کے بعد اس کو پہچان پایا۔)

اگلے شعروں میں زُہیر ان صلح کرانے والے دو سرداروں کے بارے میں کہتا ہے:

فأقسمتُ بالبیت الذی طاف حوله　　رجال بنوه من قریش و جرهم

یمیناً لنعم السیدان وُجدتما　　علی کل حال من سحیل و مبرَم

تدار کتما عبساً و ذبیان بعد ما　　تفانوا و دقّوا بینهم عطر منشم

(میں اس گھر کی قسم کھا کر کہتا ہوں جسے قریش اور جرہم کے لوگوں نے تعمیر کیا ہے اور وہ اس کا طواف کرتے ہیں کہ حالات چاہے نرمی کے ہوں یا سختی کے، آپ دونہایت ہی شریف اور معزز سردار ہیں۔

آپ نے عبس اور ذبیان قبیلوں کو بچا لیا ورنہ وہ تو ہلاک ہونے اور اپنے مُردوں پر منشم کا حنوط ملنے پر تُلے ہوئے تھے۔)

آگے چل کر جنگ اور اس کی خونناکیوں اور اس کے بُرے نتائج کے بارے میں کہتا ہے:

وما الحرب الا ماعلمتم و ذقتم　　وماهو عنها بالحدیث المرجّم

متی تبعثوها تبعثوها ذمیمة　　و تضر اذا ضرّیمتوها فتضرم

فتعر ککم عرک الرحی بثفالها　　وتلقح کشافاً، ثم تُنتج فتُتئم

(جنگ وہی تو ہے جس کو تم نے جان لیا ہے اور اس کا مزا چکھ لیا ہے۔ اب یہ کوئی ظن و گمان والی بات نہیں رہ گئی ہے۔

جب تم جنگ چھیڑتے ہو تو بہت بُری چیز چھیڑتے ہو اور جب تم اس کی آگ کو ہوا دیتے ہو تو یہ بھڑک اُٹھتی ہے۔

پھر وہ تمہیں اس طرح پیستی ہے جس طرح چکی دانوں کو پیستی ہے۔ وہ ایسی بھیڑ کی طرح ہوتی ہے جو سال میں دو مرتبہ حاملہ ہو اور ہر دفعہ دو دو بچے جنے)

پھر نظم کے بعد کے حصے میں وہ حکمت و دانائی کی باتیں کرتا ہے، کہتا ہے:

رایتُ المنایا خبط عشواء من تُصب — تُمتہ، ومن تخطئی یعمّر فیھرم
ومن لا یصانع فی امور کثیرۃ — یضرّس بانیاب ویوطأ بمنسم
ومن یجعل المعروف فی غیر اھلہ — یکن حمدہ ذماً علیہ ویندم
ومن لم یذد عن حوضہ بسلاحہ — یھدّم، ومن لا یظلم الناس یُظلم
ومن یغترب یحسب عدواً صدیقہ — ومن لا یکرّم نفسہ لا یکرّم
وکاین تری من صامت لک معجب — زیادتہ او نقصہ فی التکلم
لسان الفتی نصف و نصف فؤادہ — فلم یبق الاصورۃ اللحم والدم

(میں نے موت کو ایک شب کور اونٹنی کی بے ڈھنگی چال کی طرح پایا کہ جو اس کی زد میں آ جائے وہ ہلاک ہوتا ہے اور جو اس سے بچ رہے وہ بڑی عمر کو پہنچتا اور بوڑھا ہوتا ہے۔
اور جو شخص بہت سے معاملات میں مفاہمت سے کام نہیں لیتا وہ دانتوں میں چبا ڈالا اور پاؤں تلے روند دیا جاتا ہے۔
اور جو شخص کسی ایسے آدمی پر احسان کرتا ہے جو اس کا اہل نہیں ہوتا تو اس کا یہ قابل تعریف فعل مذمت بن جاتا ہے اور وہ اس پر نادم ہوتا ہے۔
اور جو اپنی جان اور آبرو کی حفاظت ہتھیار اٹھا کر نہیں کرتا وہ مسمار کر دیا جاتا ہے اور جو دوسروں پر ظلم نہیں کر سکتا وہ خود ظلم کا نشانہ بن جاتا ہے۔
اور جو شخص اغیار سے رشتہ جوڑتا ہے وہ گویا دشمن کو دوست سمجھتا ہے اور جو اپنی عزت نہیں کرتا دنیا بھی اس کی عزت نہیں کرتی اور کبھی ایسا ہوتا ہے کہ ایک خاموش آدمی کو دیکھ کر تم مرعوب ہو جاتے ہو لیکن وہ کسی دوسرے انسان سے بہتر ہے یا کمتر اس کا پتا اس کے بولنے سے چلتا ہے۔
انسان کا نصف اس کی زبان ہے اور دوسرا نصف اس کا دل۔ ان کو الگ کر لو تو گوشت اور خون کا ایک پتلا ہی باقی رہ جاتا ہے۔)

زہیر کے کلام کی کچھ خصوصیات ہیں جو دورِ جاہلیت کے دوسرے شاعروں میں یا تو کم پائی جاتی ہیں یا بالکل نہیں پائی جاتیں۔ وہ یہ کہ اس کے کلام میں نہ تو لفظی تعقید (الجھاؤ) ہے اور نہ معنوی تعقید اور ابہام۔ وہ اپنی شاعری میں نامانوس اور بھونڈے الفاظ استعمال نہیں کرتا۔ اس کا کلام شفاف اور شیریں پانی کی طرح ہے جو پڑھنے والے کی پیاس بجھاتا ہے۔ دوسرے یہ کہ اس کے کلام میں گھٹیا اور معیار سے گرے ہوئے مضامین یا فحش اور غیر اخلاقی باتیں بالکل نہیں پائی جاتیں جس کی وجہ سے اس کے کلام میں عفت اور تقدس کی شان پیدا ہو گئی ہے۔ جاہلی دور میں بعض دوسرے شاعروں نے بھی حکمت اور دانائی کی باتیں کی ہیں لیکن زہیر کی خصوصیت اس ضمن میں یہ ہے کہ اس نے زندگی کے بعض ایسے تجربوں اور بعض

ایسے حقائق کا اظہار کیا ہے جو دوسرے شاعروں کے ہاں دیکھنے میں نہیں آتے۔ مثلاً جنگ کی تباہ کاریاں، اخلاق فاضلہ اور اقدارِ عالیہ کی تعریف و توصیف یا موت اور زندگی کی حقیقت کا اظہار اور اس بات کا اظہار کہ اس کارگہِ ہستی کو چلانے والی ایک ایسی ذات ہے جس سے کوئی چیز مخفی نہیں ہے اور جو ہمارے دلوں کے اندر کا حال بھی جانتی ہے...... چنانچہ ان تمام خصائص کے ساتھ کوئی شک نہیں کہ زہیر بن ابی سلمی نہ صرف لفظ و محاورہ کے اعتبار سے بلکہ مضمون و معنی کے اعتبار سے بھی جاہلی دور کی شاعری میں سب سے اونچے مقام پر فائز دکھائی دیتا ہے۔

## ۴۔ لبید بن ربیعہ (م ۶۶۱)

معلقات کا چوتھا شاعر بنو عامر کا لبید بن ربیعہ ہے جو چھٹی صدی عیسوی کے آخر میں پیدا ہوا اور معاویہ کی خلافت کے آغاز (۶۶۱) میں فوت ہوا۔ یہ عمر میں معلقات کے سات شعراء میں سب سے چھوٹا تھا۔ لبید نے جب اسلام قبول کیا تو عام روایت کے مطابق اس کے بعد اس نے شعر کہنے ترک کر دیئے۔ وہ کہتا تھا کہ ''خدا نے اس کے بدلے مجھے قرآن سے نوازا ہے'' اسلام لانے سے پہلے لبید بھی زہیر کی طرح قوی مذہبی میلانات رکھتا تھا۔

لبید کا باپ ربیعہ سخاوت میں اور چچا ملاعب الاسنہ جنگ آزمائی میں مشہور تھے۔ لبید کی جاہلی دور کی زندگی ایک عالی نسب اور بلند ہمت صحرانشین کی زندگی ہے، جس کا اثر اس کے شعروں پر نمایاں ہے۔ اس کے معلقے میں بدوی اور صحرائی زندگی کی بہت عمدہ اور صحیح تصویریں ملتی ہیں، اسی لیے اس کے قصیدے کو قبل از اسلام شاعری کا بہت اعلیٰ اور نمائندہ نمونہ قرار دیا جاتا ہے۔ لبید نے کم عمری میں ہی شعر کہنے شروع کیے اور اس میں اس نے عنترہ اور عمرو بن کلثوم جیسے سورماؤں اور غیرت مندوں کی پیروی کی اور شاعری کو روزگار کا ذریعہ نہ بننے دیا۔ اسی لیے اس کی شاعری اور خاص طور پر اس کے معلقے میں فخر کا احساس، شجاعت اور عالی ہمتی کا رویہ، سخاوت اور ہمسایے کی خبر گیری اور قبیلے کی عزت کا خیال جیسے مضامین دیکھنے میں آتے ہیں۔ لبید کے کلام میں جوش پر ہوش غالب ہے، جس سے اس میں جا بجا حکیمانہ رنگ پیدا ہو گیا ہے اور عقیدے کی پاکیزگی اور وعظ و نصیحت کی باتوں نے اس کی شاعری میں ایک رفعت سی پیدا کر دی ہے۔ صحیحین میں آتا ہے کہ آنحضرتؐ نے فرمایا کہ سب سے سچا کلمہ جو کسی شاعر نے بولا ہے وہ لبید بن ربیعہ کا یہ قول ہے:

الا کل شیئ ما خلا اللہ باطل      وکل نعیم لا محالۃ زائل



Scanned with CamScanner

(جان لو کہ اللہ کے سوا جو کچھ بھی ہے باطل ہے اور نعمت جیسی بھی ہو آخر ایک دن زائل ہو جائے گی)

لبید کے باقاعدہ شاعری شروع کرنے کا واقعہ یوں ہے کہ اس کے قبیلے اور اس کے ماموں کے قبیلے بنی عبس میں عداوت چلی آتی تھی۔ ان دونوں کے وفد حیرہ کے بادشاہ نعمان بن المنذر کے ہاں جمع ہوئے۔ عبسی قبیلے کا سربراہ ربیع بن زیاد تھا' جو نعمان کا مقرب اور ساتھی تھا اور عامری لوگوں کا سربراہ ملاعب الاسنہ تھا۔ ربیع نے نعمان کو عامری لوگوں کے خلاف بھڑکایا ہوا تھا۔ اس لیے جب وہ اس کے پاس حاضر ہوئے تو نعمان نے ان کی توہین کی اور ان سے اعراض برتا۔ یہ لوگ غصے میں بڑبڑاتے ہوئے باہر آئے تو لبید نے جو ابھی نوعمر تھا اور ان کے اونٹ چراتا تھا' پوچھا کہ کیا معاملہ ہے۔ پہلے تو ان لوگوں نے اسے بچہ سمجھ کر کچھ نہ بتایا' لیکن جب اس نے اصرار کیا تو اسے سارا واقعہ سنا دیا۔ لبید نے کہا کہ ہم نعمان کے پاس پھر جائیں گے اور عبسی لوگوں سے انتقام لیں گے۔ میں ربیع کی ایسی ہجو کہوں گا کہ اس کے اور بادشاہ کے درمیان وہ تعلق باقی نہیں رہے گا۔ انہوں نے اس کا امتحان لینے کے لیے اس سے کہا کہ اچھا تو تربہ نام کی جو جڑی بوٹی ہے تمہارے سامنے' اس کے عیوب گن کے سناؤ۔ لبید نے ایک مقفّی عبارت میں اس کے عیوب گنوائے: **"ھذہ التربة لا تذکی ناراً ولا تؤھل داراً' ولا تسّر جاراً عُودھا ضئیل و خیرھا قلیل و فرعھا کلیل' أقبح البقول مرعیً وأقصرھا فرعاً واشدھا قلعاً......** ("یہ بوٹی نہ آگ جلاتی ہے' نہ گھر میں پیدا ہوتی ہے' نہ اس کے قُرب والے لوگ اس سے خوش ہوتے ہیں۔ اس کی لکڑی کمزور ہوتی ہے' اس کا فائدہ نہ ہونے کے برابر ہے' اور اس کی شاخ کسی کام کی نہیں ہوتی۔ چراگاہ کی بوٹیوں میں یہ سب سے بدہیئت ہوتی ہے۔ شاخیں اس کی چھوٹی ہوتی ہیں' لیکن اکھاڑنے میں یہ بہت سخت ہوتی ہے") یہ سن کر ان لوگوں کو اطمینان ہو گیا کہ لبید ہجو کہہ سکتا ہے۔ ان کی اجازت پا کر لبید نے ربیع کی ایسی ہجو کہی کہ جب بادشاہ نے اسے سنا تو وہ ربیع سے بددل ہو گیا اور اس نے عامریوں کو عزت بخشی اور انہیں اپنے قریب کر لیا۔ اس واقعے کے بعد لبید کا نام بطور شاعر کے ہر طرف مشہور ہو گیا اور اس نے چھوٹی بڑی نظمیں کہنی شروع کر دیں۔ مشہور شاعر نابغہ نے اس کو نعمان کے ہاں دیکھا تو اس کی آنکھوں میں اسے شاعری کی علامات دکھائی دیں۔ نابغہ نے پوچھا: کچھ کہتے ہو؟ اس پر لبید نے اپنے قصائد میں سے کچھ سنایا تو نابغہ کہنے لگا۔ "جاؤ' تم قبیلہ قیس کے سب سے بڑے شاعر ہو۔"

لبید کی جنگ آزمائی کے واقعات میں سے ایک یوں روایت کیا جاتا ہے کہ ایک دفعہ حارث غسانی نے ایک سو جنگجو نوجوان لبید کی سربراہی میں اس مقصد سے بھیجے کہ وہ حیرہ کے بادشاہ منذر بن ماء السماء کو

ٹھکانے لگا دیں۔ یہ لوگ اس کے پاس پہنچے اور ظاہر کیا کہ وہ اس کی اطاعت میں داخل ہونے کے لیے آئے ہیں اور پھر ایک دن اسے غافل پا کر قتل کر دیا۔ اس پر منذر کی فوجوں نے ان کا پیچھا کیا اور بہت سے نوجوانوں کو قتل کر دیا۔ لیکن باقی لوگوں نے بھاگ کر اپنی جان بچائی' جن میں لبید بھی تھا چنانچہ وہ اس مہم کو سر کر کے صحیح سالم نکل آیا۔

جب اسلام آیا تو عرب کے وفد آنحضرتؐ کے پاس آنے لگے۔ اپنے لوگوں کے وفد میں لبید بھی آیا اور اسلام قبول کیا۔ اس کے بعد وہ واپس چلا گیا اور زُہد اختیار کیا اور قرآن کریم حفظ کر لیا۔ اسلام لانے کے بعد اس نے شعر گوئی ترک کر دی۔ چنانچہ زمانۂ اسلام میں اس کی زبانی صرف ایک شعر روایت کیا جاتا ہے:

الحمدللہ اذ لم یاتنی اجلی — حی اکتسیتُ من الاسلام سربالا

(تعریف ہو اللہ کی کہ مجھے اس وقت تک موت نہیں آئی جب تک میں نے اسلام کا جامہ نہیں اوڑھ لیا)

کچھ دوسرے لوگوں کا خیال ہے کہ وہ شعر یہ ہے:

ما عاتَب الحّر الکریم کنفسہ — والمرءُ یُصلحہ الجلیس الصالح

(ایک اچھے انسان کو اس کے نفس سے بڑھ کر کوئی ملامت نہیں کرتا اور انسان کی اصلاح تو اس کا نیک ساتھی ہی کر سکتا ہے۔)

دور جدید کے بعض محققین (خصوصاً فؤاد افرام البستانی) کا خیال ہے کہ لبید کے متعلق جو دو تین باتیں مشہور ہیں وہ محض اساطیر (افسانے) ہیں اور ان میں کوئی صداقت نہیں ہے۔ ان میں سے ایک تو یہی کہ بادشاہ منذر بن ماء السماء کو قتل کرنے کے لیے جن سو بہادروں کو بھیجا گیا ان کا سربراہ لبید بن ربیعہ تھا۔ اس لیے کہ بعض قدیم راویوں نے اس کا نام لبید بن عمرو بتایا ہے اور دوسرے لوگوں نے اسے صرف لبید کر دیا۔ بعد کے زمانے میں جو ادب کے مؤرخ آئے انہوں نے اسے شاعر لبید بن ربیعہ سمجھ لیا۔ شاعر لبید کا اس مہم پر بھیجا جانا اس لیے صحیح نہیں ہے کہ بادشاہ نعمان بن المنذر جو شاعر نابغہ کا سرپرست تھا اور جس کے ہاں لبید بن ربیعہ بھی ایک دفعہ آیا تھا' اس کے اور منذر بن ماء السماء کے درمیان (جس کے قتل پر لبید کو مامور کیا گیا تھا) بیسیوں سالوں کا فاصلہ تھا۔ اس لیے تاریخی اعتبار سے یہ بات ناقابلِ تسلیم لگتی ہے۔ دوسرے یہ واقعہ اس لیے بھی صحیح نہیں لگتا کہ لبید کا جو کردار اس کی زندگی کے حالات اور اس کی شاعری سے سامنے آتا ہے' اس کے ہوتے ہوئے وہ اس طرح کا ظالمانہ فعل کر ہی نہیں سکتا تھا۔

دوسری بات جو لبید کے متعلق مشہور ہے یہ ہے کہ اس نے ایک روایت کے مطابق ۱۴۵ سال کی عمر پائی، جس کا اشارہ اس کے کئی شعروں میں ملتا ہے۔ ایک شعر میں وہ کہتا ہے: کیا سو سال کا عرصہ اور اس کے بعد مزید دس سال انسان کے لیے کافی عمر نہیں ہے۔ لیکن اگر اس معاملے میں کچھ تحقیق کی جائے تو پتہ چلے گا کہ یہ بات تو طے ہے کہ لبید کی موت معاویہ کی خلافت کے اوائل زمانے میں ہوئی، جو کچھ لیجیے کہ ۴۱ یا ۴۲ سن ہجری تھا، یعنی ۶۶۰-۶۶۱ عیسوی۔ اب اس امر پر بھی راویوں میں اتفاق ہے کہ جب لبید نعمان بن المنذر کے پاس ایک وفد میں شامل ہو کر آیا تو اس وقت وہ نوجوان تھا۔ نعمان کا زمانہ ۵۸۰ سے ۶۰۲ تک تھا۔ اب اگر لبید اس زمانے کے شروع میں بھی آیا ہو اور وہ اس وقت بیس برس کا ہو تو اس کی پیدائش ۵۶۰ عیسوی بنتی ہے۔ اس طرح لبید نے ایک سو سال کی عمر تو ضرور پائی اور یہ بھی خاصی لمبی عمر ہے، لیکن ۱۴۵ یا ۱۵۷ سال کو پہنچ کر وفات پانا کچھ افسانہ طرازی لگتی ہے۔

اسی طرح یہ کہنا کہ اسلام لانے کے بعد لبید نے شعر کہنا ترک کر دیا تھا، یہ بھی صحیح نہیں ہے اور محقق فؤاد افرام البستانی کا خیال ہے کہ جو لوگ یہ بات کہتے ہیں انہوں نے لبید کا دیوان سامنے نہیں رکھا۔ اس لیے کہ اس دیوان میں ایسی نظمیں ہیں جو اس نے اپنی وفات سے کچھ ہی عرصہ پہلے کہی تھیں اور اسلام لانے کے بعد وہ تیس برس سے بھی زیادہ عرصہ زندہ رہا تھا۔ پھر اس کے دیوان میں کچھ قطعات ایسے ہیں جو دینی اور اخلاقی امور کے بارے میں ہیں اور جو اس نے قرآن پڑھنے کے بعد ہی نظم کیے ہوں گے۔ چنانچہ اس نے اسلام لانے کے بعد بھی شاعری کی، اگرچہ وہ پہلے کے مقابلے میں بہت کم تھی۔

اسلام میں جب فتوحات بڑھنے لگیں تو حضرت عمرؓ کے زمانے میں لبید کوفہ کے نئے شہر میں جا کے بس گیا۔ اس نے زمانۂ جاہلیت میں نذر مانی تھی کہ جب بھی بادِ صبا چلے گی وہ لوگوں کو کھانا کھلائے گا۔ یہ نذر اس نے اسلام کے زمانے میں بھی بحال رکھی۔ اس نے دو پات بنائے ہوئے تھے جن میں کھانا ڈال کے وہ کوفہ کی مسجد میں جاتا اور لوگوں کو کھلاتا۔ ایک دفعہ صَبا چلی تو ولید بن عقبہ نے جو کوفے کا گورنر تھا دیکھا کہ لبید کا ہاتھ بہت تنگ ہے، تو اس نے لوگوں سے کہا کہ لبید کی مالی مدد کرو تا کہ وہ اپنی نذر پوری کر سکے اور خود اس نے شاعر کو سو جوان اونٹ بھیج دیئے۔ لبید نے کوفہ میں ہی ۶۶۰ میں معاویہ کی خلافت کے اوائل میں وفات پائی۔

**شاعری:** جیسا کہ اوپر ذکر ہوا، لبید کی شاعری اس کے اخلاق اور اس کے اعلیٰ کردار کا آئینہ ہے۔ وہ جب اس میں فخر کے مضامین بھی بیان کرتا ہے تو ان میں شرافت اور نیک مزاجی کی جھلک دیکھی جا سکتی ہے۔ اس کے قصیدے کی عبارت پرشوکت ہوتی ہے جس میں الفاظ نگینے کی طرح جڑے ہوتے ہیں اور


Scanned with CamScanner

بھرتی کے مضامین بالکل نہیں ہوتے۔ پھر اس میں جابجا اونچے پایے کی حکمت اور موعظت کی باتیں ہوتی ہیں۔ مرثیہ نگاری میں وہ غالباً جاہلی شاعروں پر فوقیت رکھتا ہے اور ایک غم رسیدہ انسان کے جذبات کی تصویر کشی وہ ایک مؤثر اسلوب اور دل نشین الفاظ میں کرتا ہے۔

اس کا معلقہ بہت پرزور الفاظ اور سنجیدہ اسلوب والی نظم ہے۔ جس میں بادیہ اور اس کے رہنے والوں کی زندگی اور عادات و اخلاق کی سچی تصویر دکھائی دیتی ہے۔ پھر اس میں اہل شوق کی خواہشوں کا اظہار بھی ہے اور بڑے دل والوں کی آرزوؤں کا بیان بھی۔

لبید کا معلقہ اٹھاسی اشعار پر مشتمل بحر کامل میں ایک میمیہ قصیدہ ہے۔ اس کے مضامین اگرچہ روایتی ہیں، لیکن اسلوب کی تازگی نے ان میں نیا پن پیدا کر دیا ہے۔ نظم کا آغاز تشبیب کی عام روایت کے مطابق محبوبہ کے اجڑے ہوئے دیار کے دکھ سے ہوتا ہے۔ پھر اپنی اونٹنی کی تیز رفتاری کا ذکر کرتے ہوئے گورخر اور نیل گائے کی تشبیہہ کو پھیلا کر حیوانی زندگی کی بہت مؤثر اور جیتی جاگتی تصویریں پیش کی گئی ہیں۔ پھر وہ اپنی زندگی اور اس کے لذیذ مشغلوں کا ذکر کرتا ہے، اپنی سخاوت اور قوت و شوکت کا احوال بیان کرتے ہوئے وہ اپنی قوم پر فخر کا اظہار کرتا ہے اور یہ سب کچھ وہ بڑی سچائی اور اخلاص اور توازن کے ساتھ کرتا ہے۔

لبید کا معلقہ اس طرح شروع ہوتا ہے:

عَفَتِ الدیارُ محلّها فمقامها　　　بمنیً تأبّد غولها فرجامها

(مقام منیٰ کے دیار، جن میں کچھ دن ٹھہرے تھے اور پھر زیادہ عرصہ بھی وہاں قیام رہا، سب مٹ گئے اور غول اور رجام کے پہاڑی ڈیرے بھی اُجاڑ ہو گئے۔)

اس سے اگلے شعروں میں کہتا ہے:

فعَلاَ فروعُ الأیهقان وأطفلت　　　بالجلهتین ظباؤ ها و نعامها
وجلا السیول من الطلول کانها　　　زُبُر تجدّ متونها اقلامها
فوقفتُ اسالها و کیف سؤالنا　　　صُمّاً خوالد ما یبین کلامها

(سوایہقان کی شاخیں بلند ہو گئیں اور وادی کے دونوں جانب ہرنیوں اور مادہ شتر مرغوں نے بچے دے لیے۔
اور سیلاب کے پانیوں نے ان دیار کے نشانات کو یوں نکھار دیا ہے جیسے وہ کتابیں تھیں جن کی عبارتوں کو قلموں نے جگا دیا۔
سو میں وہاں کھڑا ہوا ان آثار سے سوال کرنے لگا اور بھلا ان ٹھوس اٹل چٹانوں سے جو بول نہیں


Scanned with CamScanner

سکتیں ہمارا سوال بھی کیا ہوتا۔)

پھر اپنے جود وسخاء کے بارے میں کہتا ہے:

انا اذا التقت المجامع لم یزل — منا لِزازُ عظیمۃٍ جشّامہا
و مقسّم یُعطی العشیرۃ حقَّہا — و مغذّمر لحقوقہا ھضّامہا
من معشر سنّت لھم آباؤھم — ولکل قوم سُنّۃ و امامہا
لا یطبعون ولا یبور فعالھم — اذلا تمیل مع الھوی احلامہا
فاقنع بما قسم الملیک فانما — قسم الخلائق بیننا علاّمہا

(ہم وہ لوگ ہیں کہ جب قبائل جمع ہوں تو اس وقت ہم میں کارِ عظیم کو سرانجام دینے اور اس سے عہدہ برآ ہونے والا ضرور موجود ہوتا ہے۔

ایسا تقسیم کنندہ جو قبیلے کو اس کا حق لا دیتا ہے اور بعض لوگوں سے کچھ حقوق چھین کر دوسروں کی جھولی میں ڈال دیتا ہے۔

ہم ایسے لوگ ہیں جن کے لیے ان کے آباء نے اچھے کاموں کی راہ مقرر کر دی ہے اور ہر قوم کے لیے ایک راہ ہوتی ہے اور اس پر چلانے والا امام ہوتا ہے۔

ان کی آبرو پر کبھی کوئی میل نہیں آتا اور نہ ان کے افعال بے سود ہوتے ہیں اس لیے کہ ان کے ذہن ان کی خواہشات کے پیچھے نہیں جاتے۔

تو اے عدو! مالک نے جو تقسیم کر دی ہے اس کو مان لے اس لیے کہ طبیعتوں اور مزاجوں کی تقسیم وہی کرتا ہے جو سب سے زیادہ ان کا جاننے والا ہے۔)

اپنے بھائی اربد کے مرثیے میں لبید کہتا ہے:

بلینا وما تبلی النجوم الطوالع — و تبقی الدیار بعدنا والمصانع
فلاجزع ان فرّق الدھر بیننا — فکل امرئ یوماً بہ الدھرُ فاجع
وما المال والاھلون الاّ ودائع — ولا بدّ یوماً ان ترد الودائعُ
لعمرک ما تدری الضوارب بالحصی — ولا زاجرات الطیر ما اللہ صانعُ

(ہم تو مٹ جاتے ہیں لیکن یہ طلوع ہونے والے ستارے کبھی نہیں بجھتے اور ہمارے بعد یہ دیار بھی اسی طرح باقی رہتے ہیں اور یہ تعمیریں بھی۔

اگر ہمارے لیے زمانے نے جدائی لکھ دی ہے تو اس کا گلہ کیا کرنا کہ ہر انسان کو زمانہ ایک نہ ایک دن غم دے کے ہی رہتا ہے۔

اور یہ مال اور یہ اہل و عیال امانتیں ہی تو ہیں اور ایک دن یہ امانتیں بہر حال واپس کرنی ہوتی ہیں۔ بلاشبہ کنکریاں پھینکنے والے اور پرندوں کو اڑا کر فال نکالنے والے جانتے ہیں کہ اللہ کیا کرنے والا ہے۔)

## ۵۔ عمرو بن کلثوم (م ۵۸۴)

ابوالاسود عمرو بن کلثوم بن مالک تغلب کے قبیلے کا سردار اور شہسوار تھا۔ وہ عرب کا ایک ایسا بہادر اور جنگجو شاعر تھا جو اپنے ایک ہی قصیدے کی وجہ سے لازوال ہو گیا۔ اس نے امیرانہ اور شان و شکوہ کے ماحول میں پرورش پائی اور اپنی غیرت و حمیت اور تیز و تند زبان کی وجہ سے مشہور ہوا۔ وہ ابھی پندرہ برس ہی کا تھا کہ اپنے قبیلے کا سردار بن گیا۔ اس نے لشکروں کی قیادت کی اور بہت سے موقعوں پر فتح مند رہا۔ جنگ بسوس کی وجہ سے تغلب اور بکر بن وائل کے قبیلوں کے درمیان اکثر چپقلشیں ہوتی رہتی تھیں تا آنکہ ان کے درمیان حیرہ کے بادشاہ عمرو بن ہند کی موجودگی میں ہی نزاع اور مخاصمت کی صورت پیدا ہو گئی۔ اس موقع پر قبیلہ بکر کا شاعر حارث بن حلزہ اٹھا اور اس نے اپنا مشہور قصیدہ پڑھا۔ بادشاہ نے جب یہ قصیدہ سنا تو اس کے رویے سے ایسا لگا کہ اس کا جھکاؤ بکر کی طرف ہو گیا ہے۔ اس پر عمرو بن کلثوم بادشاہ سے ناراض ہو کر چلا گیا۔ یہ دیکھ کر بادشاہ عمرو بن ہند کے جی میں آئی کہ تغلب والوں کی نخوت اور تکبر کو نیچا دکھائے۔ چنانچہ اس نے ان کے سردار عمرو بن کلثوم کو ذلیل کرنے کا منصوبہ بنایا۔ اس سلسلے میں ایک دن اس نے اپنے مصاحبوں سے پوچھا: کیا تم کسی ایسے عرب کو جانتے ہو جس کی ماں کو میری ماں کی خدمت کرنے سے عار ہو؟ انہوں نے کہا: ہاں، عمرو بن کلثوم کی ماں! ایسا کیوں ہے؟ اس لیے کہ اس کا باپ مشہور شاعر مہلہل بن ربیعہ ہے اس کا ماموں کلیب بن وائل ہے جو عربوں میں سب سے جری سمجھا جاتا ہے، اس کا خاوند کلثوم بن مالک ہے جو مزاج میں شاہزادہ ہے اور اس کا بیٹا عمرو اپنے قبیلے کا سردار ہے۔ اس پر بادشاہ نے عمرو بن کلثوم کو بلا بھیجا کہ وہ اپنی ماں کے ساتھ آئے جو بادشاہ کی ماں کے ساتھ کچھ وقت گزارے۔ چنانچہ عمرو اور اس کی ماں تغلب کی ایک جماعت کے ساتھ آئے۔ بادشاہ نے حیرہ اور فرات کے درمیان شامیانے لگا دیے تھے اور اپنی مملکت کے بعض سرداروں کو بھی بلا لیا تھا۔ اس نے اپنی ماں سے کہہ رکھا تھا کہ جب عمرو بن کلثوم کی ماں اس کے پاس بیٹھی ہو تو اس سے اپنا کوئی کام کرنے کو کہے۔ جب عمرو بن کلثوم کی ماں خیمے میں آئی اور بادشاہ کی ماں کے پاس بیٹھی تو اس نے اشارے سے خدام کو باہر بھیج دیا اور عمرو بن کلثوم کی ماں لیلیٰ سے کہا کہ ذرا اُٹھ کر مجھے وہ طبق تو لا دو۔ اس پر لیلیٰ

نے کہا کہ جس کو ضرورت ہو وہ یہ کام خود ہی کر لے۔ جب بادشاہ کی ماں نے اصرار کیا تو اس پر لیلیٰ پکار اٹھی : ہائے یہ ذلت! ہائے کہاں ہو تغلب والو! دوسرے خیمے میں عمرو بن کلثوم نے جب اپنی ماں کا یہ واویلا سنا تو اٹھا اور خیمے میں آویزاں بادشاہ کی تلوار ہاتھ میں لے کر عمرو بن ہند کی گردن اڑا دی اور پھر تغلبیوں کو حکم دیا کہ وہ سب کچھ لوٹ لیں اور واپس چلیں۔

اس واقعے کے بعد عمرو بن کلثوم اپنے علاقے میں واپس آ گیا اور آتے ہی اس نے اپنا وہ معلقہ کہا جس کا مطلع ہے :

الا ھُبیّ بصحنک فاصبحینا　　　ولا تُبقی خمار الاندرینا

(اے ساقی! اپنا پیالہ شراب کا لے کر اُٹھ اور صبح سویرے ہی ہمیں پلا دے اور اندرین کی بہترین شراب کو بچا کر مت رکھ)

اس معلقے کا آغاز دیارِ محبوب کے ذکر کی بجائے ساغر و ساقی کے ذکر سے ہوتا ہے۔ اس کے بعد چند اشعار محبوبہ کے حسن کے بیان اور اس کی جدائی کے دکھ سے متعلق ہیں۔ آگے چل کر وہ بادشاہ حیرہ سے براہِ راست خطاب کر کے فخریہ اشعار کا سلسلہ شروع کرتا ہے جس میں وہ اپنی قوم کی معرکہ آرائیوں اور ان کے مشہور حملوں کا ذکر کرتا ہے اور یہ سلسلہ نظم کے آخر تک چلا جاتا ہے۔ عمرو بن کلثوم نے اپنا یہ قصیدہ عکاظ کے میلے میں سنایا تو اسے اس سال کی بہترین نظم قرار دیا گیا۔ اس قصیدے کو بڑی شہرت ملی اور قبیلہ تغلب کے لوگوں نے اسے اتنی بار پڑھا اور اس کی روایت کی کہ ایک شاعر یہ کہہ اُٹھا کہ

الھی بنی تغلب عن کل مکرمۃٍ　　　قصیدۃٌ قالھا عمرو بن کلثوم

یفاخرون بھا مذکان اوّلھم　　　یا لَلرّجال لشعر غیر مسئوم

(بنو تغلب کو عمرو بن کلثوم کے ایک قصیدے نے اتنا مگن کر دیا ہے کہ اب وہ سارے اچھے کام چھوڑ چکے ہیں۔
اس قصیدے کی وجہ سے وہ اپنے اسلاف پر فخر کرتے ہیں' اے لوگو ذرا اس کلام کو دیکھنا کہ جس سے ان کا جی ہی نہیں بھرتا۔)

عمرو بن کلثوم چھٹی صدی عیسوی کے دوسرے نصف میں' یعنی ظہور اسلام سے نصف صدی پہلے فوت ہوا۔

**شاعری :** عمرو بن کلثوم جاہلیت کے اعلیٰ خاندانوں میں سے ایک خاندان کا فرد تھا اور بہت بہادر شاہسوار تھا۔ اسے اپنی سرداری کے امور اور جنگوں میں شرکت نے اتنی مہلت نہ دی کہ وہ شاعری کی

طرف توجہ دیتا اور دوسرے شعراء کی طرح اس کی اکثر اصناف (مدح' ہجو' وصف و بیان' مرثیہ وغیرہ) میں طبع آزمائی کر کے شاعری کو مشغلہ اور ذریعۂ روزگار بناتا۔ چنانچہ اس نے ایک ہی معلقہ کہا اور اس کی وجہ سے اتنا ہی مشہور ہو گیا جتنا دوسرے لوگ بہت سی شاعری کر کے ہوتے تھے۔ اس نے جتنا کچھ بھی کہا اس میں الفاظ کا حسن ہے' عبارت کی موزونیت ہے' معنی اور خیال کی صفائی ہے' اسلوب کی خوبصورتی ہے' جذبۂ تحریک کی شدت اور مقصد کی بلندی ہے۔ لیکن باوجود اس امر کے کہ اس کی شاعری بہت قلیل ہے' اس میں ہمیں اس وقت کے عربوں کی حالت کے بارے میں بہت قیمتی معلومات ملتی ہیں۔ مثلاً یہ کہ ان کا مذہب کیا تھا' ان کا معاشرہ کس طرح کا تھا' ان کے روزمرہ کے مشاغل کیا تھے۔ کیا کیا ہنر ان کے پاس تھے' کس طرح کے کھیل وہ کھیلتے تھے۔ چنانچہ اس کے شعروں سے پتا چلتا ہے کہ مذہب کے معاملے میں بعض عرب عورتیں بتوں کا طواف کرتی تھیں اور اس کے ساتھ مذہبی رقص بھی کیا کرتی تھیں۔ معاشرتی زندگی میں جنگ کے وقت عورتیں اپنے مردوں کا ساتھ دیتی تھیں' گھوڑوں کو چارہ کھلاتی تھیں' مردوں کو لڑنے مرنے پر آمادہ کرتی تھیں اور ان سے کہتی تھیں ''اگر تم نے ہمیں دشمن سے نہ بچایا تو تم ہمارے خاوند نہیں ہو۔'' جہاں تک مختلف ہنرمندیوں کا سوال ہے تو عمرو کے شعروں سے پتا چلتا ہے کہ وہ لوگ کپڑوں کے رنگنے کے لیے ارغوانی (Purple) رنگ استعمال کرتے تھے اور تیروں کو سیدھا کرنے کے لیے ثقاف (لوہے کے خاص اوزار) استعمال کرتے تھے۔ کپڑا رنگنے کے لیے ان کی دکانیں ہوا کرتی تھیں۔ اسی طرح وہ دھونکنی کے ساتھ آگ تیز کر کے کانٹے اور بندے بنایا کرتے۔ ان کے بچے لکڑی کی تلواروں سے کھیلتے تھے' اور ان کے نوجوان نرم زمین میں فٹ بال کی طرح کے کھیل میں مشغول ہوتے تھے۔ ان تاریخی فوائد کے علاوہ عمرو بن کلثوم کے معلقے میں اور بہت سی باتیں ہیں جو اس کے ساتھ خاص ہیں۔ مثلاً اس کا اپنے آباء و اجداد پر فخر کرنا کہ وہ کتنے معزز لوگ تھے' اپنے قبیلے کی معرکہ آرائیوں اور دشمنوں پر ان کی فتوحات کا احوال بیان کرنا' اس کا اپنے آپ کو ایک جری اور جنگ آزما کے طور پر پیش کرنا جس کے سامنے کوئی ٹھہر نہیں سکتا۔ پھر فخر و مباہات کے معاملے میں بچگانہ قسم کی مبالغہ آرائی کرنا جسے آج کے زمانے میں ہم پڑھ کر ہنستے ہیں۔ لیکن بہادری اور شجاعت کے یہ سارے دعوے شاعر کی زبان سے اچھے لگتے ہیں۔ مثلاً اس کا یہ کہنا کہ جب ہم زمین میں چلتے ہیں تو اسے انسانوں سے بھر دیتے ہیں اور جب سمندر میں اترتے ہیں تو اس پر اپنی کشتیوں سے چھا جاتے ہیں۔ حالانکہ ہو سکتا ہے کہ اس کے ساتھ بیس تیس آدمیوں سے زیادہ نہ ہوں اور سمندر میں اتارنے کے لیے دو تین کشتیاں ہی ہوں۔

کوئی شک نہیں کہ عمرو بن کلثوم کے معلقے میں امرؤ القیس یا طرفہ یا لبید کے جیسے فنی محاسن نہیں ملتے۔ تاہم اس کے قصیدے کی زبان دوسرے معلقات کے مقابلے میں آسان اور سلیس ہے اور اس میں ایسی



Scanned with CamScanner

قدرتی روانی ہے کہ انسان جب اسے شروع کرتا ہے تو پڑھتا چلا جاتا ہے۔
معلقے کا مطلع اوپر آپ نے دیکھا۔ اس کے بعد کے کچھ اشعار کا انتخاب اس طرح ہے :

| | |
|---|---|
| وانا سوف تدرکنا المنایا | مقدرة لنا و مقدرّینا |
| قفی نسالک هل احدثت صرماً | لوشک البین ام خنت الامینا |
| تریک اذا دخلت علی خلاء | و قد امِنت عیون الکاشحینا |
| ذراعی عیطل ادماء بکر | هجان اللون لم تقرأ جنینا |
| وثدیا مثل حق العاج رخصاً | حصانا من اکفّ اللّامسینا |
| ومتنی لدنة سمقت و طالت | رواد فها تنوء بما ولینا |
| اباهند فلا تعجل علینا | وانظرنا نخبرّک الیقینا |
| بانا نورد الرایات بیضاً | و نصدر هن حُمراً قدروینا |
| متی ننقل الی قوم رحانا | یکونوا فی اللقاء لها طحینا |
| الا لا یجهلن احد علینا | فنجهل فوق جهل الجاهلینا |
| و نشرب ان وردنا الماء صفواً | و یشرب غیرنا کدراً وطینا |
| اذا ما المَلک سام الناس خسفاً | اَبینا ان نُقرّ الذل فینا |
| ملأنا البرّ حتی ضاق عنا | وماء البحر نملؤه سفینا |
| اذا بلغ الفطامَ لنا صبیّ | تخرله الجبابر ساجدینا |

(موت تو ہمیں آ کے ہی رہے گی' وہ ہمارے لیے مقدر ہے اور ہم اس کے لیے مقدر کیے گئے ہیں۔
ذرا رک جاؤ تم سے یہ تو پوچھ لیں کہ کیا جانے کی جلدی میں تم نے قطع تعلق کر لیا ہے' یا ایک باوفا دوست کے ساتھ خیانت کی ہے۔

جب تم اس کے پاس اکیلے میں آتے ہو تو وہ دشمنوں کی آنکھ بچا کر تمہیں دکھاتی ہے:
ایسی اونٹنی کی طرح کے بھرے بھرے بازو' جو سفید رنگ ہے اور جس نے ابھی کوئی بچہ نہیں جنا
اور ایسی چھاتیاں جو ملائمت میں ہاتھی دانت کے پیالوں کی طرح ہیں' جو ابھی لمس کرنے والوں کے ہاتھوں سے محفوظ ہیں۔

اور ایک نکلتے ہوئے قد کے اطراف' اس کے پچھاوے اتنے بھاری ہیں کہ قریب کے حصوں پر ان کا بوجھ پڑتا ہے۔

اے ابوہند! ہمارے معاملے میں جلد بازی سے کام نہ لو' ہمیں تھوڑا وقت دو تو ہم تمہیں یقینی بات کی خبر دیں

وہ یہ کہ ہم جب جھنڈے لے کر جنگ میں جاتے ہیں تو وہ سفید ہوتے ہیں اور جب ہم انہیں واپس لاتے ہیں تو وہ سرخ اور خون سے سیراب ہوتے ہیں۔

جب ہم کسی قوم کی طرف چکی کا رُخ پھیرتے ہیں تو وہ اس سے رگڑ کھاتے ہی پس کر آٹا ہو جاتے ہیں۔

خبردار! کوئی ہمارے ساتھ نامعقولیت نہ برتے' ورنہ ہم ان سے بھی زیادہ ڈھٹائی اور نامعقولیت کا رویہ اختیار کریں گے

جب ہم گھاٹ پر اترتے ہیں تو صاف پانی پیتے ہیں اور دوسرے لوگوں کے حصے میں گدلا اور مٹیالا پانی ہی آتا ہے۔

جب کوئی بادشاہ لوگوں کو ذلیل کرنے پر آتا ہے تو ہم اس کے سامنے ذلیل ہونے سے انکار کر دیتے ہیں۔

ہم نے زمین کو اپنے آدمیوں سے اس طرح بھر دیا کہ وہ تنگ ہو گئی اور جب ہم سمندر میں اترتے ہیں تو اسے اپنی کشتیوں سے بھر دیتے ہیں۔

جب ہمارا کوئی بچہ دودھ چھوڑنے کی عمر کو پہنچتا ہے تو اسی وقت سے اس کے سامنے بڑے بڑے جابر اور سرکش لوگ سجدہ کرنے لگتے ہیں۔)

## ۶۔ حارث بن حِلّزہ (م ۵۷۰)

ابوالظلیم حارث بن حِلّزہ قبیلہ بکر کا شاعر تھا۔ بنوبکر میں اس کو وہی مقام حاصل تھا جو بنو تغلب میں شاعر عمرو بن کلثوم کا تھا۔ اس نے بھی عمرو بن کلثوم اور طرفہ بن العبد کی طرح صرف ایک قصیدے کی بدولت شہرتِ دوام حاصل کی۔ یہ قصیدہ عام روایت کے مطابق اس نے بادشاہ عمرو بن ہند کے سامنے فی البدیہہ کہا تھا اور بادشاہ کی رائے اپنے قبیلے کے حق میں کر لی تھی۔ اس نے بھی بہت طویل عمر پائی اور ''معمرین'' کے زمرے میں شمار ہوا۔

بنوبکر اور بنو تغلب کے درمیان ایک عرصے سے دشمنی چلی آتی تھی' جس کی وجہ سے ان قبیلوں میں لڑائی کا وہ طویل سلسلہ جاری تھا جسے ''حرب البسوس'' کہتے ہیں۔ حیرہ کے بادشاہ منذر بن ماء السماء نے بڑی مشکل سے ان دونوں میں صلح کرائی اور ہر قبیلے سے سو سو غلام بطور ضمانت لیے کہ اگر کسی قبیلے نے زیادتی کی تو اس کے غلام دوسرے قبیلے کو دے دیے جائیں گے۔ منذر کے بعد اس کے بیٹے عمرو بن ہند نے بھی یہ عہد برقرار رکھا۔ ایک دفعہ یہ ضمانتی غلام کسی مہم پر بھیجے گئے تو بنوشیبان کے ایک کنویں پر پہنچ کر بکر کے غلاموں نے تغلبی غلاموں کو وہاں سے مار بھگایا۔ یہ غلام صحرا میں بھٹک گئے اور انہیں کہیں پانی یا

سایہ نہ ملا تو یہ بیچارے بھوک، پیاس اور لو سے مر گئے۔ اس پر بنو تغلب نے ان کا خون بہا مانگا تو بنو بکر نے ان کا خون بہا دینے سے انکار کر دیا۔ معاملہ عمرو بن ہند کے سامنے پیش ہوا۔ اس مقدمے میں تغلبیوں کا وکیل شاعر عمرو بن کلثوم تھا' اور بکریوں کی طرف سے نعمان بن ہرم نے وکالت کی اور اپنی بات کہتے ہوئے اس نے کچھ جملے تہذیب سے گرے ہوئے کہہ دیئے جس سے بادشاہ خفا ہو گیا اور قریب تھا کہ وہ تغلبیوں کے حق میں فیصلہ دے دے' اتنے میں حارث بن حلّزہ جو دربار میں موجود تھا کھڑا ہوا اور فی البدیہہ اپنا مشہور معلقہ کہنا شروع کیا جس کا مطلع ہے:

آذنتنا ببینها اسماء　　　رُبَّ ثاوٍ یُملّ منه الثواء

(اسماء نے ہمیں اپنے جدا ہونے کی خبر سنا دی۔ بسا اوقات اپنے قرب میں ٹھہرے ہوئے آدمی سے طبیعت اچاٹ ہو جاتی ہے' لیکن اسماء ایسی نہیں تھی۔)

اس نظم میں وہ اپنی قوم کی تعریف و توصیف اور ان کے کارناموں پر فخر کرتا ہے اور عمرو بن ہند کی تعریف کے ساتھ عمرو بن کلثوم کے دعووں کو بھی جھوٹا ثابت کرنے کی کوشش کرتا ہے۔

اغانی کی روایت ہے کہ حارث بن حلّزہ کے جسم پر برص کے داغ تھے۔ چنانچہ جب وہ اپنا قصیدہ پڑھنے کے لیے کھڑا ہوا تو عمرو بن ہند نے اپنے سامنے سات پردے ڈلوا دیئے کہ اس قسم کی بیماری کو دیکھنا عربوں کی ریت کے مطابق اس کی شان کے خلاف تھا۔ جب حارث نے اپنا معلقہ پڑھنا شروع کیا تو عمرو بن ہند اتنا متاثر ہوا کہ ایک کے بعد ایک پردہ اٹھواتا گیا' حتیٰ کہ سارے پردے اٹھوا دیئے اور جب حارث نے اپنا معلقہ ختم کیا تو اسے اپنے پاس بٹھا کر کھانا کھلایا اور اس کی بڑی آؤ بھگت کی۔ نتیجۃً اس کی ہمدردیاں قبیلہ بنو بکر کی طرف ہو گئیں۔ حارث کے اس قصیدے سے سارے عرب میں قبیلہ بکر کی دھوم مچ گئی اور ایک زمانے تک تغلبی دبے رہے۔ پھر جب عمرو بن کلثوم نے بادشاہ کو قتل کرنے کے بعد اپنا مشہور معلقہ کہا تو دونوں کا پلڑا تقریباً برابر ہو گیا۔ اگرچہ فخر میں مبالغے کی وجہ سے جو اثر عمرو بن کلثوم کے معلقے کا ہوا وہ حارث کے معلقے کا نہیں ہو سکا۔

حارث کا معلقہ تراسی اشعار پر مشتمل بحر خفیف میں ایک ہمزیہ ہے۔ روایت کے مطابق جب حارث نے یہ قصیدہ سنانا شروع کیا تو اس وقت اس نے ایک کمان کا سہارا لے رکھا تھا۔ اس کے تخلیقی انہماک اور جوش کا یہ عالم بتایا گیا ہے کہ کمان کا سرا اس کی ہتھیلی میں گھب گیا اور وہاں زخم کر دیا' لیکن اسے کچھ خبر نہ ہوئی۔ معلقے کا آغاز حسب دستور عشقیہ اشعار سے ہوتا ہے۔ پھر چند شعر اس کی اونٹنی کے بیان میں ہیں۔ اس کے بعد وہ بنو تغلب کی برائیاں گنواتا اور اس سلسلے میں بہت سے "ایام عرب" اور جاہلیت کے متعدد واقعات کا ذکر کرتا ہے۔ اس اعتبار سے اس کا معلقہ ان واقعات اور مقامات کی ایک دستاویز کی



Scanned with CamScanner

حیثیت رکھتا ہے۔ پھر وہ اپنے قبیلے بنوبکر کی وکالت کرتا ہے اور اس کے موقف کو جس زیرکی اور حسنِ ترتیب کے ساتھ پیش کرتا ہے وہ غیر معمولی سوجھ بوجھ کا پتا دیتی ہے۔ حارث کے قصیدے کا یہ حصہ دور جاہلیت میں سیاسی شاعری کا بہترین نمونہ ہے۔ بعض ناقدین کی رائے ہے کہ حارث کا شاعرانہ تخیل اس کی بندش کی چستی' بیان کی صفائی اور اغراض و معانی کی وضاحت عمرو بن کلثوم سے بڑھ کر ہے۔ اگرچہ عمرو بن کلثوم کے قصیدے کا صوتی آہنگ اور اس میں شاعر کا فخر وطنطنہ بعض پڑھنے والوں کو زیادہ متاثر کرتا ہے۔

حارث کے معلقے کا مطلع اوپر آپ نے دیکھا۔ قصیدے کے کچھ دوسرے شعر اس طرح سے ہیں:

ان اخـوانـنـا الا راقـم يـغـلـون — عـلـيـنـا فـی قـيـلـهـم احـفـاء

يخلطون البریٔ منا بذی الذنب — ولا يـنـفـع الـخـلّـی الـخـلاء

ايـهـا الـنـاطـق الـمـرقـش عـنـا — عـنـد عـمـرو و هـل لذاک بقاء

لا تـخـلـنـا علی غـرّاتـک انـا — قـبـلُ مـا قـد و شـی بـنـا الاعداء

فـبـقـينـا علی الشناء ة تـنـمـيـنـا — حـصـونٌ و عـزّة قـعـسـاء

مـلـک مـقـسـط وأفـضـل مـن — يـمـشـی ومـن دون مالديه الثناء

واذكروا حلف ذی المجاز وما — قُـدِّم فـيـه الـعُـهـود و الـكُـفـلاء

واعـلـمـوا انـنـا وايـاكـم فيما — اشـتـرطـنـا يـوم احـتـلـفـنـا سـواء

اعـلـيـنـا جـنـاح كـنـدة ان — يـغـنـم غـازيـهـم ومـنـا الـجـزاء

(یقیناً ہمارے بھائی بنوتغلب ہم پر زیادتی کرتے ہیں اور ان کی بات میں ایک طرح کا اصرار بے جا ہے۔
وہ ہم میں سے بے قصور کو قصور وار سے ملا دیتے ہیں اور بے گناہ کو اس کی بے گناہی کچھ فائدہ نہیں دیتی
اے ہمارے بارے میں عمرو بن ہند کے ہاں باتیں بنانے اور لگائی بجھائی کرنے والے' کیا تمہاری ان باتوں کا کوئی اثر باقی رہنے والا ہے؟
بادشاہ کو اکسانے کے باوجود ہمیں دبنے والا خیال نہ کر' کیونکہ اس سے پہلے بھی ہمارے بارے میں دشمن چغلیاں کھا چکے ہیں۔
چنانچہ اس بغض و عناد کے باوجود ہم اس حال میں باقی رہے کہ ہمارے قلعے اور ہماری لازوال عزت ہمیں رفعت بخشتی رہی۔
وہ ایک عادل بادشاہ ہے' زمین کی ساری مخلوق سے افضل۔ اس کے پاس جو کچھ ہے اس کی

تعریف نہیں ہوسکتی۔
ذوالمجاز کا وہ معاہدہ یاد کرو، جس میں عہد و پیمان باندھے گئے اور ضامن دیے گئے تھے
اور یہ بھی جان لو کہ آپ لوگ اور ہم ان تمام شرائط میں جن پر ہم نے حلف لیا تھا' برابر کے شریک ہیں۔
اگر کندہ نے آپ لوگوں سے لڑکر مالِ غنیمت لے لیا ہے تو اس کا گناہ ہم پر تو نہیں ہے کہ ہم اس کا معاوضہ دیں۔)

اس آخری شعر کے بعد متعدد اشعار ایسے ہیں جن میں حارث قبیلہ بنو تغلب کو عار دلاتا ہے کہ تم پر فلاں فلاں قبائل نے حملہ کیا اور تمہیں نقصان پہنچا کر چل دیئے تو کیا ان سب کی ذمہ داری ہم پر ہے اور ہم اس کا خمیازہ بھگتیں؟

ایک موقع پر شاعر اپنے لوگوں کی جنگ کے لیے تیاری کا ذکر کرتے ہوئے بہت ہو بہو (Graphic) تصویر کھینچتا ہے' کہتا ہے:

أجمعوا أمرهم عشاءً فلما ۔۔۔ أصبحوا أصبحت لهم ضوضاء
من منادٍ ومن مجيبٍ ومن ۔۔۔ تصهال خيل خلال ذاك رُغاء

(انہوں نے شب کو اگلے دن کے سفر کا فیصلہ کیا۔ جب صبح ہوئی تو تیاری کا شور و غل برپا تھا۔
کوئی آواز دیتا تھا اور کوئی جواب دیتا تھا اور گھوڑے ہنہنائے جاتے تھے اور بیچ بیچ میں اونٹوں کے بلبلانے کا شور تھا۔)

## ۷۔ عنترہ بن شدّاد (م ۶۱۵)

ساتواں معلقہ عنترہ بن شداد کا ہے جس کا تعلق بنو عبس سے تھا۔ عنترہ کی ماں زبیبہ ایک حبشی کنیز تھی' جس سے عنترہ نے سیاہ رنگت ورثے میں پائی۔ عربوں کا قاعدہ تھا کہ لونڈی کے پیٹ سے جو اولاد پیدا ہوتی تھی اسے بھی وہ غلام بنا لیتے تھے اور اس سے غلاموں والے کام لیتے تھے' جب تک وہ اپنے کارہائے نمایاں سے اپنی نجابت کا کوئی ثبوت مہیا نہ کر دے۔ عنترہ بھی اپنے باپ کے خاندان میں اچھوت کی طرح رہتا تھا جس کے ذمے دوسرے کاموں کے علاوہ گھوڑوں اور اونٹوں کی گلہ بانی کرنا تھا۔ عنترہ کو اپنی سیاہ رنگت اور کنیزک زادگی کی وجہ سے طعنے سننے پڑتے تھے۔ ان حالات کا مداوا اس نے اس طرح کیا کہ اس نے فنونِ جنگ اور شاہسواری میں مہارت حاصل کر لی اور شجاعت میں نامور ہو گیا۔ روایت


Scanned with CamScanner

ہے کہ ایک دفعہ کسی قبیلے نے بنو عبس کے کچھ آدمیوں پر حملہ کیا اور ان کے اونٹ اور گھوڑے لے کر بھاگ گئے۔ بنو عبس نے ان کا پیچھا کیا لیکن دشمن کا کچھ نہ بگاڑ سکے۔ اس موقع پر عنترہ کے باپ نے اس سے کہا : کرِّ یا عَنتَرہ! (اے عنترہ، حملہ کر) چونکہ عنترہ غلام سمجھا جاتا تھا اس لیے اس نے طنزیہ لہجے میں کہا۔ "العبدلا یُحسن الکرّ، انما یُحسن الحلاب والصّر" یعنی غلام کہاں حملہ کرسکتا ہے، وہ تو بس دودھ دوہنا اور تھنوں کو باندھنا جانتا ہے۔ اس پر باپ نے کہا۔ "کرّ و اَنت حُرّ" (اگر حملہ کردے تو تُو آزاد ہے) چنانچہ عنترہ ان لوگوں پر ٹوٹ پڑا اور اس بہادری اور بے جگری سے لڑا کہ دشمنوں کے اوسان خطا ہوگئے اور وہ اونٹ اور گھوڑے چھوڑ کر بھاگ کھڑے ہوئے اور عنترہ اپنے جانوروں کو واپس لے آیا۔ اس کے اس کارنامے کے بعد اس کے باپ نے اسے اپنے نسب میں شامل کرلیا اور قبائل عرب میں لوگ اسے عبس کے سردار اور ایک بڑے شاہسوار کی حیثیت سے جاننے لگے۔ چنانچہ اس نے داحس و غبراء کی لڑائیوں میں بڑی قابلیت اور جرأت کے ساتھ قبیلہ بنو عبس کی قیادت کی۔ وہ اپنی بہادری، بے خوفی اور فن سپہ گری میں مہارت کے باعث ہر طرف قدر کی نگاہ سے دیکھا جانے لگا اور شجاعت اور دلیری میں اس کی شہرت اتنی بڑھی کہ اس کے لیے وہ ضرب المثل بن گیا اور کچھ مبالغہ آمیز روایتوں کی وجہ سے آگے چل کر وہ عوامی داستانوں اور قصوں کا ہیرو بن گیا، جو اب تک عرب ممالک میں مشہور ہیں۔

ایک دفعہ عنترہ سے کسی نے کہا کہ تم سب لوگوں سے زیادہ بہادر اور طاقتور ہو۔ اس نے جواب دیا: ایسا تو نہیں ہے۔ اس شخص نے پوچھا: تو پھر لوگوں میں تمہاری یہ شہرت کیونکر ہوئی ہے؟ عنترہ نے کہا: وہ یوں کہ مجھے جب حوصلہ اور ارادہ آگے بڑھنے پر اکساتا تھا تو میں آگے بڑھ کر حملہ کرتا تھا اور جب میں پیچھے رہنے میں ہی مصلحت دیکھتا تھا تو پیچھے رہ جاتا تھا۔ اور میں کبھی ایسے مقام میں داخل نہیں ہوا جس سے نکلنے کا راستہ مجھے معلوم نہ ہو۔ میں ایک کمزور اور بزدل کو دیکھ کر اس پر اس شدت سے حملہ کرتا تھا کہ اسے دیکھ کر ایک بہادر انسان کا دل بھی لرز جاتا تھا۔ چنانچہ میں پھر اپنا رخ اُس بہادر کی طرف کرتا اور اسے قتل کردیتا۔

عنترہ رنگت میں چونکہ کالا تھا اس لیے اسے "اغربۃ العرب" یعنی عرب کے کوّوں میں شمار کیا جاتا تھا۔ ان میں عنترہ کے علاوہ تین اور لوگ بھی تھے جن کا رنگ سیاہ تھا۔ ہمارے اس شاعر نے بھی لمبی عمر پائی۔ آخری زمانے میں بڑھاپے کی وجہ سے وہ بہت نحیف و لاغر تھا جب قبیلہ طی پر حملے کے دوران میں وہ ایک تیر کے زخم سے ہلاک ہوگیا۔ زیادہ قابلِ اعتماد روایات کے مطابق اس کی وفات ٦١٥ء میں ہوئی۔

بہادری اور فنون سپہ گری میں مہارت پیدا کرکے سارے عبسی نوجوانوں میں امتیاز حاصل کرنے کا



Scanned with CamScanner

عنترہ کے لیے ایک بڑا سبب یہ بھی تھا کہ اسے نوجوانی میں اپنی چچا زاد بہن عبلہ سے محبت ہوگئی تھی۔ اس نے اسے حاصل کرنے کی بہت کوشش کی لیکن اس کے چچا نے اسے اپنی دامادی میں لینا گوارا نہ کیا۔ اس محرومی کے سبب اس کی شاعری میں شجاعت کی بلند آہنگی کے ساتھ ساتھ محبت کا گداز بھی پیدا ہوگیا۔
عنترہ کے معلقہ کہنے کا سبب یہ ہوا کہ قبیلہ عبس کے ایک شخص نے اس کو اس کے کالے رنگ اور حبشی ماں کا طعنہ دیا تو عنترہ نے کہا کہ تم میرا کیا مقابلہ کرسکتے ہو؟ میں جنگوں میں بے دھڑک کود سکتا ہوں اور جب مال غنیمت میرے ہاتھ لگتا ہے تو اسے پورا پورا بانٹتا ہوں۔ میں دستِ سوال دراز کرنے سے پرہیز کرتا ہوں اور اپنے مال میں سے بے دریغ لوگوں کو دیتا ہوں۔ اس پر عبسی نے کہا۔ ''لیکن میں تم سے شعر اچھے کہہ لیتا ہوں'' اس پر عنترہ نے کہا۔ ''ٹھیک ہے تم یہ بھی جان لوگے کہ کون اچھے شعر کہتا ہے۔'' چنانچہ اس نے اپنا معلقہ نظم کیا اور جب اسے لے جا کر لوگوں کے سامنے پڑھا تو اپنے مخالف کا منہ بند کردیا۔
عنترہ کا معلقہ بحرِ کامل میں ایک میمیہ ہے جس کے اشعار کی تعداد مختلف روایتوں کے مطابق ۷۵ سے ۸۵ تک ہے۔ نظم کا آغاز حسب دستور تشبیب سے ہوتا ہے۔ شاعر کہتا ہے:

هل غادر الشعراءُ من متردّم — ام هل عرفت الدار بعد توهّم
يا دار عبلة بالجواء تكلّمي — و عمي صباحاً دار عبلة و اسلمي

(کیا شاعروں نے بخیہ گری کے لیے کوئی جگہ چھوڑی بھی ہے اور کیا تو نے محبوبہ کا گھر بہت غور کے بعد پہچانا ہے۔
جواء کے مقام پر اے عبلہ کی حویلی! تو کچھ تو بول' تو ہر صبح خوش وخرم رہ اور تم پر سلامتی سایہ فگن ہو)

پھر وہ اپنی اونٹنی کا ذکر کرتا ہے اور اپنا یہ وصف بتاتا ہے کہ وہ کبھی ظلم نہیں کرتا اور نہ کوئی اس پر ظلم کرنے کی جرأت کرسکتا ہے۔ وہ شراب پیتا ہے لیکن ایسا کرتے ہوئے وہ شرافت اور تہذیب کے دائرے میں رہتا ہے۔ پھر وہ اپنی بہادری کے کارنامے گنواتا ہے اور اپنی محبوبہ سے خطاب کرکے اپنی قوت و شجاعت' بلانوشی اور سخاوت وغیرہ کا ذکر کرتا ہے اور یہ سلسلہ دور تک جاری رہتا ہے۔ اسی حصے میں وہ اشعار بھی آتے ہیں جن میں وہ اپنے گھوڑے ''ادہم'' سے نہایت لطیف احساسات منسوب کرکے گویا اسے آدمیت کے مرتبے پر فائز کردیتا ہے۔ چنانچہ کہتا ہے:

يدعون عنتر والرماح كانها — اشطان بئر في لبان الادهم
ما زلتُ ارميهم بثغرة نحره — ولبانه حتى تسربل بالدم
فازورّ من وقع القفا بلبانه — وشكا اليّ بعبرة و تحمحم

لو كان يدري ما المحاورة اشتكى ولكان لو علم الكلام مكلمي

ولقد شفى نفسي واذهب سقمها قيل الفوارس ويك عنتر اقدم

(وہ پکارتے ہیں: اے عنترہ! جبکہ نیزے میرے گھوڑے ادہم کے سینے میں یوں داخل ہیں جیسے وہ کنویں میں اترنے والی رسیاں ہوں۔

میں اُن کو برابر اس کے سینے کی سیدھ اور اس کی گردن کے میان میں لاتا رہا حتیٰ کہ وہ خون خون ہو گیا۔

پس نیزوں کی بوچھاڑ کے سبب اس نے اپنا سینہ ایک طرف کو موڑ لیا اور ایک آنسو اور ہنہناہٹ کے ساتھ مجھ سے اپنا دکھ بیان کیا۔

اگر وہ جانتا کہ گفتگو کیا ہوتی ہے تو وہ اپنی شکایت زبان پر لاتا اور اگر اسے کلام کا شعور ہوتا تو وہ میرے ساتھ ہم کلام ہوتا

کوئی شک نہیں کہ شہسواروں کی اس آواز نے کہ اے عنترہ آگے بڑھ! میرے جی کو شانت کر دیا اور اس کے روگ مٹا دیے)

اپنی بادہ نوشی کے بارے میں شاعر کہتا ہے:

ولقد شربتُ من المدامة بعدما ركد الهواجر بالمشوف المعلَم

فاذا شربتُ فانني مستهلك مالي و عرضي وافر لم يُكلَم

واذا صحوتُ فما أقصّر عن ندى وكما علمت شمائلي و تكرّم

(جب سورج کی گرمی نرم پڑ گئی تو میں نے ایسی شراب کے گھونٹ پیے جسے میں نے ایک چمکتا ہوا دینار دے کر خریدا تھا جس پر الفاظ کندہ تھے۔

جب میں پیتا ہوں تو اس حالت میں بھی اپنا مال خرچ کرتا ہوں اور میری جو عزت بنی ہوئی ہے اس پر کوئی حرف نہیں آتا۔

اور جب ہوش میں آتا ہوں تو بھی اپنی فیاضی میں کوئی کمی نہیں کرتا' اور تُو تو (اے حبیبہ) میرے اخلاق اور میری سخاوت سے واقف ہی ہے۔)

پھر وہ اپنی مخالفت اور اپنے آپ پر ظلم کیے جانے کے بارے میں اپنی محبوبہ سے خطاب کرتے ہوئے کہتا ہے:

أثني عليّ بما علمت فانني سمح مخالقتي اذا لم أظلم

واذا ظُلمتُ فان ظلمي باسل مرّ مذاقته كطعم العلقم

(تو ان باتوں کی تعریف تو کر جو تُو میرے متعلق جانتی ہے' وہ یہ کہ جب تک مجھ پر ظلم نہیں کیا جاتا
میں بااخلاق رہتا ہوں۔
اور جب مجھ پر ظلم کیا جائے تو پھر جواب میں میرا ظلم بہت بُرا اور اندرائن کی طرح کڑوا ہوتا ہے۔)

☆......☆......☆

اوپر جن سات جاہلی شعراء کا ذکر ہوا یہ وہ لوگ تھے جن کی نظمیں عکاظ کے میلے میں اول قرار دی گئیں' چنانچہ وہ در کعبہ پر لٹکائی گئیں اور انہیں ''معلقات'' کہا گیا۔ کوئی شک نہیں کہ یہ ساتوں نظمیں زبان و بیان اور فنِ شاعری میں نہایت اعلیٰ درجے کی سمجھی جاتی ہیں اور ان کے نظم کرنے والے شاعروں کا مرتبہ بھی جاہلی شاعری میں بہت بلند ہے۔ لیکن معلقات کے ان شعراء کے علاوہ اسی زمانے میں کچھ اور شاعر بھی تھے جن کا فنی مرتبہ ان سے کسی طرح کم نہیں تھا اور ان کی نظمیں اگرچہ معلقات قرار نہ دی گئیں' لیکن ان میں سے بعض تو ایسے ہیں جو طبقۂ اولیٰ میں شمار کیے جاتے ہیں اور بعض وہ ہیں جو اپنے فنی قد و قامت میں ان کے قریب پڑتے ہیں۔ یہ شاعر ہیں: نابغہ ذبیانی' اعشیٰ قیس' حاتم طائی اور امیہ بن ابی الصلت۔ ان میں سے نابغہ اور اعشیٰ کا تذکرہ اس موقع پر برمحل لگتا ہے۔

## نابغہ ذبیانی (م ۶۰۴)

اس کا نام ابو امامہ زیاد بن معاویہ تھا۔ وہ نابغہ اس لیے کہلایا کہ اچھی خاصی عمر کا ہو جانے کے باوجود وہ کوئی شعر نہ کہہ سکا تھا۔ لیکن ادھیڑ عمر میں جب اس پر آمد ہونے لگی اور اس نے شعر کہنے شروع کیے تو پھر لوگوں نے دیکھا کہ شعر اس کی زبان سے چشمے کی طرح پھوٹ نکلتے ہیں۔ اس مناسبت سے اس کا نام نابغہ (پھوٹ نکلنے والا) پڑ گیا۔ وہ قبیلہ مضر کی ایک شاخ ذبیان کا سردار اور سربراہ تھا۔ وہ بہت بڑا شاعر تھا۔ یہاں تک کہ بعض اہلِ نقد اسے امرؤ القیس کے بعد دوسرے نمبر پر رکھتے ہیں اور زُہیر کو اس کے بعد تیسرے نمبر پر لاتے ہیں۔ لیکن ایک چیز جس نے اس کے شعری مرتبے کی قدر و قیمت کم کر دی اور معاشرے میں اس کے مقام کو بھی نقصان پہنچایا' یہ ہے کہ اس نے اپنی شاعری کو مال و دولت جمع کرنے کا ذریعہ بنا لیا۔ وہ حیرہ کے شاہ نعمان بن المنذر کے پاس پہنچا' جس نے اس کی بڑی قدر کی اور اپنا مصاحبِ خاص بنا لیا۔ اس نے شاعر کو دل کھول کر اپنے انعامات سے نوازا' جس سے نابغہ کی امارت کا یہ عالم ہو گیا کہ وہ سونے چاندی کے برتنوں میں کھانا کھاتا تھا۔ لیکن پھر بعض لوگ اس سے حسد کرنے لگے



Scanned with CamScanner

اور انہوں نے اس کے اور بادشاہ کے درمیان پھوٹ ڈالنے کا منصوبہ بنایا اور اس میں وہ کامیاب ہو گئے۔ چنانچہ نعمان اس سے اس قدر خفا ہوا کہ اسے قتل کرانے کی دھمکی دے دی۔

بادشاہ کی خفگی کا جو بھی سبب ہو' نابغہ نے خیریت اسی میں جانی کہ وہاں سے بھاگ کھڑا ہوا اور شام میں جا کر عمرو بن حارث اصغر کے دربار میں پہنچ گیا۔ یہاں اس کا بہت خیر مقدم ہوا اور اسے عزت و تکریم دی گئی۔ اس بات نے نعمان کو اور بھی ناراض کر دیا کہ اس سے بھاگ کر نابغہ نے اس کے دشمن کے ہاں جا کر پناہ لی۔ نابغہ کچھ عرصہ بنو غسان کے پاس رہا۔ وہ ان کی مدح میں شعر کہتا رہا اور وہ اس کو سونا چاندی عنایت کرتے رہے' حتیٰ کہ ایک دن اسے خبر ملی کہ نعمان بیمار پڑ گیا ہے۔ یہ سن کر نابغہ بے چین ہو گیا اور فوراً نعمان کے پاس واپس آیا اور اس سے معافی کا خواستگار ہوا۔ وہ اپنے ساتھ دو شفاعت کرنے والے بھی لایا اور اپنے وہ قصائد بھی جو اس نے معذرت خواہی کے لیے لکھے تھے۔ ان باتوں کا اثر یہ ہوا کہ بادشاہ کے دل سے کانٹا نکل گیا اور اس نے نابغہ کو وہی پہلے والا مقام و مرتبہ عطا کر دیا۔ وہ اچھے حالات میں رہا' یہاں تک کہ بڑھاپے کو پہنچ کر کمزور ہو گیا' اس کا چلنا پھرنا دوبھر ہوا اور وہ زندگی سے تنگ آ گیا۔ چنانچہ کہتا ہے۔

المرء یامل ان یعیش — و طول عیش قد یضرّہ
تفنی بشاشتہ ویبقی — بعد حلو العیش مرّہ
و تخونہ الایام حتی — لایری شیئاً یسرّہ
کم شامتٍ بی ان ھلکتُ — و قائل للّٰہ درّہ

(انسان اس امید میں رہتا ہے کہ زندہ رہے گا لیکن لمبی زندگی بعض دفعہ اس کے لیے مضر ثابت ہوتی ہے۔
اس کی ساری شگفتگی اور تروتازگی جاتی رہتی ہے اور زندگی کی حلاوت کے بعد اس کی کڑواہٹ باقی رہ جاتی ہے۔
زمانہ اس سے منہ پھیر لیتا ہے یہاں تک کہ کوئی چیز ایسی نہیں رہتی جسے دیکھ کر اس کے دل کی کلی کھل اٹھے
جب میں مر گیا تو کتنے ہی لوگ میرے اس انجام پر بغلیں بجائیں گے۔ اور کتنے ایسے ہوں گے جو کہیں گے کہ وہ اللہ کی دین ہی تھا)

نابغہ ہجرت سے اٹھارہ سال قبل فوت ہو گیا۔

**شاعری:** نابغہ ذبیانی سارے جاہلی شعراء میں معذرت خواہی کے فن (اعتذار) میں ایک امتیازی

شان رکھتا ہے۔ اپنے محسن اور ولی نعمت نعمان بن المنذر سے الگ ہو جانے کے بعد وہ ایک عرصے تک اس صورتِ حال سے ناخوش رہا اور نعمان کو راضی کرنے کے لیے معذرت خواہانہ نظمیں لکھتا رہا۔ اس قسم کی نظمیں وہ چونکہ اپنے دل کی گہرائیوں سے کہتا تھا اس لیے وہ بہت موثر ہوتی تھیں اور فن کا اعلیٰ نمونہ ان کے اندر دیکھنے میں آتا تھا۔ نابغہ کے کلام کا ایک حصہ جس میں یہ نظمیں شامل ہیں ''اعتذاریات'' کہلاتا ہے۔

جیسا کہ اوپر ذکر ہوا نابغہ جاہلیت کے ان تین شعراء میں آتا ہے جن سے کوئی سبقت نہیں لے جا سکا اور نہ فن شعر میں کوئی ان کی برابری کر سکا ہے۔ وہ شاعر ہیں: امرؤ القیس، خود نابغہ اور زُہیر۔ نابغہ کے کلام کی خصوصیت اس کے ساتھیوں کے مقابلے میں یہ ہے کہ اس کے الفاظ بہت سبک اور خوبصورت، بندش بہت چست اور معانی و مطالب واضح اور اسلوب بہت دلکش اور موثر ہوتا ہے۔ اس میں تکلف بالکل نہیں ہوتا۔ اس کی شاعری میں ایک ایسی دل لبھانے والی کیفیت ہے کہ جس کی وجہ سے دوسرے جاہلی شعراء کے مقابلے میں نابغہ کا کلام سب سے زیادہ گایا گیا۔ البتہ شروع زمانے میں اس کے کلام میں ''اقواء'' کا نقص تھا (یعنی اشعار کے قوافی میں کبھی پیش استعمال کرنا اور کبھی زیر) نابغہ کو یہ خیال تو تھا کہ اس کے شعروں میں کوئی عیب ہوتا ہے، لیکن وہ کیا ہے؟ اس کا اس کو پتا نہیں تھا۔ ایک دفعہ کسی مغنیہ نے اس کا کلام گا کر سنایا تو اس کے شعروں میں اقواء تھا۔ نابغہ کو اس نقص کا پتا چل گیا اور اس کے بعد اس نے کبھی یہ غلطی نہ کی۔

نابغہ کے فنی مرتبے اور اس کے شعری ذوق کا سب سے بڑا ثبوت یہ ہے کہ عکاظ کے سالانہ میلے میں جب شاعری کا مقابلہ ہوتا تھا تو وہ منصف اور حَکَم کے فرائض انجام دیتا تھا اور کسی شاعر کو اگر وہ اس سال کا بہترین شاعر قرار دیتا تو اس کے فیصلے کو بے چوں و چرا تسلیم کیا جاتا تھا۔

**نمونہ کلام:** نابغہ اپنی ایک معذرت خواہانہ نظم میں کہتا ہے:

| | |
|---|---|
| أتانی ابیتَ اللّعن انک لمتنی | و تلک التی اهتم منها و انصب |
| فبِتّ کان العائدات فرشن لی | هراساً به یُعلی فراشی و یُقشب |
| حلفت فلم اترک لنفسک ریبة | ولیس وراء الله للمرء مذهب |
| لئن کنتَ قد بُلّغت عنی خیانة | لمبلغک الواشی اغش و أکذب |
| ولکننی کنت امرءً الی جانب | من الارض فیه مستراد و مذهب |
| ملوک و اخوان اذاما أیتهم | احکّم فی اموالهم و اقرَّب |

| | |
|---|---|
| کفعلک فی قوم اراک اصطنعتہم | فلم ترہم' فی شکر ذلک' اذنبوا |
| ولست بمستبقٍ اخاالا تلمّہ | علی شعث' ایّ الرجال المہذّب |
| فان اک مظلوماً فعبد ظلمتہ | وان تک ذاعُتبیٰ' فمثلک یعتب |

(خدا آپ کو نفرین سے بچائے مجھے پتا چلا کہ آپ نے مجھے ملامت کی ہے۔ اس بات سے میں فکرمند اور درماندہ ہو گیا ہوں۔

اس تکلیف کی وجہ سے میں نے رات اس طرح کاٹی کہ جیسے میری تیمار دار عورتوں نے میرے لیے کانٹوں کی سیج بچھا دی جن پر میرا بستر اوپر نیچے ہوتا رہا۔

میں نے ایسی قسم کھائی کہ آپ کے لیے اس میں کوئی شک کی گنجائش نہیں ہو سکتی' اور انسان اللہ کے سوا اور کہیں جا بھی تو نہیں سکتا۔

اگر آپ کو میری طرف سے خیانت کی اطلاع ملی ہے تو یقین کیجیے خبر دینے والا چغل خور بڑا دھوکے باز اور جھوٹا ہے۔

تاہم میں ایسا فرد رہا ہوں جس کے لیے زمین کا ایک گوشہ ایسا ہے جہاں میں آ جا سکتا ہوں۔

وہاں بادشاہ بھی ہوں گے' بھائی بھی ہوں گے۔ جب میں ان کے پاس آؤں گا تو وہ مجھے اپنے اموال کا مختار اور اپنا مصاحب بنا لیں گے۔

آپ کا طرز عمل بھی تو یہی ہے کہ جب کسی پر آپ احسان کرتے ہیں اور وہ اس پر آپ کا شکر ادا کرتے ہیں' تو آپ انہیں گنہ گار نہیں سمجھتے۔

اگر آپ ایک بھائی کے غلط رویے کی اصلاح نہیں کریں گے تو وہ آپ سے دور ہو جائے گا اور کتنے ایسے ہوں گے جن میں کوتاہیاں نہ ہوں (غالب نے اسی معنی میں کہا: ایسا بھی کوئی ہے کہ سب اچھا کہیں جسے)

اگر آپ نے مجھ پر ظلم کیا ہے تو اپنے ایک بندے پر ظلم کیا ہے اور اگر آپ مجھ سے راضی ہوں تو یہ آپ کے شایان ہے کہ عفو و درگزر سے کام لیں)

ایک دوسری نظم میں نابغہ بنو غسان کے بادشاہ عمرو بن الحارث الاصغر کی تعریف میں کہتا ہے:

| | |
|---|---|
| کلینی لهم یا اُمیمة ناصب | ولیل اقاسیه بطئی الکواکب |
| و صدر أراح اللیل عازب همّه | تضاعف فیه الحزن من کل جانب |
| علیّ لعمرو نعمة بعد نعمة | لوالده' لیست بذات عقارب |
| ولقت له بالنصر اذ قیل قد غزت | کتائب من غسّان غیر اشائب |
| اذا ماغزوا بالجیش حلّق فوقهم | عصائب طیر تهتدی بعصائب |



Scanned with CamScanner

فهم يتسـاقون المنيّة بينهم بأيديهم بيض رقاق المضارب

لهم شيمة لم يعطها الله غيرهم من الجود والاحلام غير عوازب

ولا يحسبون الخير لا شرّ بعده ولا يحسبون الشرّ ضربة لازب

(امیمہ! مجھے اس تکلیف دہ غم میں اپنے حال پر چھوڑ دو اور آہستہ خرام ستاروں والی رات میں مجھے تنہا رہنے دو
ایک ایسے سینے کے ساتھ جس کے بھولے بسرے اندیشوں کو اس رات نے تازہ کر دیا ہے اور اس پر غموں نے ہر طرف سے یلغار کر دی ہے۔
مجھ پر عمرو (بن الحارث الغسانی) نے مہربانی کی ہے اس مہربانی کے بعد جو ان کے والد حارث نے مجھ پر بغیر احسان جتائے کی تھی۔
مجھے اس کی کامیابی کا یقین ہو گیا جب کہا گیا کہ عام لوگوں سے کوئی مدد لیے بغیر غسان کی فوجیں معرکۂ کارزار میں اتری ہیں
جب وہ اپنا لشکر لے کر جنگ میں گئے تو ان کے سروں پر پرندوں کے غول پر غول چکر کاٹنے لگے۔
وہ بے جگری سے لڑ کر موت کے جام نوش کر رہے تھے اگر چہ ان کے ہاتھوں میں تیز دھار والی تلواریں تھیں۔
ان کی ایک خصوصیت ایسی ہے کہ اللہ نے کسی اور کو نہیں دی۔ وہ یہ کہ ان میں جود وسخاء ہے اور ایسی عقل جو ہر وقت ان کے ساتھ رہتی ہے۔
ان کے نزدیک کوئی خیر ایسا نہیں ہے جس کے بعد شر نہ ہو اور کوئی شر ایسا نہیں ہے کہ ہمیشہ رہ جائے اور اسے کبھی زوال نہ ہو۔)

## أعشیٰ قیس (م ۶۲۹)

ابوبصیر میمون بن قیس بن جندل أعشیٰ کے لقب سے مشہور ہوا۔ اس لیے کہ اسے رات کو دکھائی نہیں دیتا تھا۔ اسے أعشیٰ قیس اس لیے کہتے تھے کہ وہ دوسرے ایسے شعراء سے الگ پہچانا جائے جو اسی کی طرح أعشیٰ کہلاتے تھے اور ان کی تعداد ایک مستشرق Geyer کے مطابق بائیس تھی۔ أعشیٰ بڑے جاہلی شعراء: امرؤ القیس، نابغہ اور زہیر کے بعد چوتھے نمبر پر آتا ہے۔ اگر چہ وہ معلقات کے سات شعراء میں نہیں ہے تاہم بعض ناقدین ادب اس کی ایک طویل نظم کو معلقہ قرار دیتے ہیں اور ان کے نزدیک معلقات کے



Scanned with CamScanner

شعراء کی تعداد سات نہیں دس ہے' جن میں وہ نابغہ اور اعشیٰ کے علاوہ علقمۃ الفحل کو گنتے ہیں۔ اعشیٰ کا امتیاز یہ ہے کہ اس نے بادشاہوں کی سب سے زیادہ مدح کی' شراب کے بارے میں بہترین شعر کہے' شاعری کی ہر صنف میں طبع آزمائی کی اور بہت لمبی لمبی اعلیٰ درجے کی نظمیں کہیں۔

وہ یمامہ کے ایک گاؤں منفوحہ میں پروان چڑھا۔ ابتدا میں وہ اپنے ماموں مسیب بن علس کا راوی تھا' جو کم گو تھا لیکن اچھے شعر کہتا تھا۔ جب اعشیٰ ذہنی طور پر کچھ پختہ ہو گیا اور شاعری میں اس کی زبان رواں ہو گئی تو وہ اطراف عرب میں نکل کھڑا ہوا اور بادشاہوں کے درباروں میں پہنچ کر ان کی مدح سرائی کرنے لگا اور ان کی عنایات کا طالب ہوا۔ وہ پہلا شاعر ہے جو اپنے کلام میں اپنی ضرورتوں کا اظہار کر کے مالی معاونت کا طلبگار رہا۔ اس چیز نے لوگوں کی نگاہوں میں اس کا رتبہ کم کر دیا۔ اس سے پہلے شعراء مدح کرتے تھے لیکن سوال نہیں کرتے تھے۔ اس غرض سے وہ جنوب کی طرف نجران کے بادشاہوں کے پاس بھی گیا۔ انہوں نے اس کی بہت خاطر مدارات کی اور انعامات سے نوازا۔ ان بادشاہوں کے محلات میں اسے شراب پینے کی عادت بھی پڑ گئی اور وہ عقائد میں ان کی بعض آراء سے بھی متاثر ہوا۔ چنانچہ اس نے اپنی بعد کی شاعری میں شراب کے متعلق بہت عمدہ اشعار کہے۔ اسی طرح ان لوگوں کے بعض عقائد بھی اس کی شاعری میں در آئے۔ پھر وہ حیرہ کے بادشاہوں کی طرف جا نکلا اور خاص طور پر نعمان بن المنذر کے بھائی اسود کے ہاں آنے جانے لگا۔ یہاں کچھ عرصہ گزارنے کے بعد اسے بادشاہ کسریٰ کے انعامات حاصل کرنے کی تمنا ہوئی۔ چنانچہ وہ اس کے پاس گیا اور عربی نظم کہہ کر اس کی بہت تعریف کی جس پر کسریٰ نے اسے دل کھول کر انعام دیا۔ اگرچہ اس کی نظم کے (فارسی میں) بُرے ترجمے کی وجہ سے وہ اس کی شاعری کو زیادہ پسند نہ کر سکا۔

اعشیٰ جب عمر رسیدہ ہوا تو بڑھاپے کی وجہ سے اس کی آنکھوں میں سفیدی آ گئی اور وہ اندھا ہو گیا۔ اس زمانے میں اس نے آنحضرت ﷺ کے بارے میں سنا تو ان کی مدح میں ایک قصیدہ کہا اور اسے لے کر حجاز کی طرف روانہ ہوا کہ ان کی خدمت میں حاضر ہو کر انہیں سنائے۔ قریش کو اس کا پتا چلا تو وہ اعشیٰ کے اسلام لانے کے امکان سے بہت خوفزدہ ہوئے۔ ابوسفیان نے ان سے کہا۔ "واللہ اگر اعشیٰ محمدؐ کے پاس پہنچ گیا اور اسلام لے آیا تو وہ اپنے شعروں میں تمہارے خلاف پورے عرب میں آگ بھڑکا دے گا۔" چنانچہ ان لوگوں نے اس کے لیے سو اونٹ جمع کیے اور اس سے کہا کہ وہ فی الحال اپنے گھر واپس چلا جائے۔ اعشیٰ نے اونٹ لے لیے اور واپسی کا سفر اختیار کیا۔ وہ یمامہ کے قریب پہنچا تو ایک اونٹنی سے گر پڑا' جس سے اس کی گردن ٹوٹ گئی اور وہ مر گیا اور اپنے گاؤں منفوحہ میں دفن ہوا۔

کتاب الاغانی میں اس واقعے کی تفصیل یوں آئی ہے کہ قریش نے جب اعشیٰ کو راستے میں پکڑ لیا تو



Scanned with CamScanner

اس سے پوچھا: کہاں جا رہے ہو؟ وہ کہنے لگا: تمہارے ایک عزیز کے پاس، شاید میں اس کے ہاتھ پر اسلام لے آؤں۔ انہوں نے کہا کہ بہت سی چیزیں ہیں جن کا تم شوق رکھتے ہو وہ تمہارے لیے ناجائز قرار دے دے گا۔ اس نے کہا: ایسی کون سی چیزیں ہیں؟ ابوسفیان نے کہا: ''مثلاً زناکاری۔'' اس پر اعشیٰ نے کہا۔ ''میں نے تو اس عادت کو نہیں چھوڑا، لیکن یہ عادت مجھے چھوڑ گئی ہے۔ اور کیا چیز ہے؟'' ''جوئے بازی'' انہوں نے جواب دیا۔ اعشیٰ کہنے لگا۔ ''میں شاید اُس سے تلافی کے طور پر کوئی ایسی چیز مانگ لوں کہ مجھے جوا کھیلنے کی ضرورت ہی نہ پڑے۔ اور کیا؟''۔ ''سود'' انہوں نے کہا۔ اس پر اعشیٰ نے جواب دیا۔ ''نہ میں نے کبھی قرض لیا ہے، نہ قرض دیا ہے۔ اور کیا چیز ہے؟'' ان لوگوں نے کہا ''شراب۔'' اعشیٰ نے جواب میں کہا۔ ''اوہ! پھر تو مجھے وہی پانی پینا پڑے گا جو میں نے محراس میں جمع کر رکھا ہے۔'' اس پر ان لوگوں نے فیصلہ کیا کہ اعشیٰ کو سو اونٹ دے کر واپس گھر بھیج دیا جائے۔

**شاعری:** جیسا کہ اوپر ذکر ہوا اعشیٰ کو چار بڑے جاہلی شعراء میں گنا جاتا ہے۔ ایک مشہور نحوی یونس بن حبیب کا قول ہے کہ أشعُر الناس امرؤ القيس اذا ركب و زُهير اذا رغِبَ، والنابغة اذا رهِبَ والاعشى اذا طرِبَ یعنی سب سے بڑا شاعر امرؤ القیس ہے اگر مضمون گھڑسواری کا ہو، اور زُہیر ہے اگر مضمون اپنی آرزو بیان کرنے کا ہو، اور نابغہ ہے اگر عذر پیش کرنے کی ضرورت آ پڑے اور اعشیٰ ہے، اگر پینے پلانے اور عیش و عشرت کی بات ہو۔ اعشیٰ کی شاعری کی خصوصیت اس کے اظہار کا حسن ہے، اس کے اسلوب کی تازگی ہے۔ شراب کا وصف بیان کرنے پر اسکی قدرت اور نظموں کی طوالت کے باوجود ان کی عمدگی اور اعلیٰ معیار ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس کے کلام کو لوگ شوق و رغبت سے سنتے اور اس سے متاثر ہوتے تھے، اور اسی لیے اسے "صنّاجة العرب" (عرب کی جھانجھ) کا نام دیا گیا۔ اعشیٰ کے کلام کی یہ تاثیر تھی کہ وہ اگر چاہتا تو کسی کو معزز و مکرّم بنا دیتا اور اگر چاہتا تو کسی کو ایسا ذلیل کرتا کہ وہ دنیا کو منہ دکھانے کے قابل نہ رہتا۔ اس سلسلے میں ایک شخص محلّق کے ساتھ اس کا قصہ مشہور ہے، جس کی تفصیل اوپر (صفحہ ۳۲) آ چکی ہے۔ مختصراً یہ کہ محلّق ایک غریب آدمی تھا جس کے آٹھ بیٹیاں تھیں اور سب کنواری تھیں اس لیے کہ ان کے باپ کی غربت کی وجہ سے کوئی ان سے شادی نہیں کرتا تھا۔ اتفاق سے ایک دن اعشیٰ کا گزر اس طرف ہوا تو ان لوگوں نے اسے اپنے ہاں مہمان ٹھہرایا، اس کی خوب خاطر تواضع کی اور کھلایا پلایا۔ شب میں جب باتیں چلیں تو اعشیٰ کو ان لوگوں کی مشکل کا حال معلوم ہوا۔ اس نے بات اپنے دل میں رکھ لی۔ چنانچہ اس کے بعد جب وہ عکاظ کے میلے میں پہنچا تو اس نے اپنا وہ مشہور قصیدہ پڑھا جس کا مطلع ہے:

ارِقتُ وما هذا السُّهاد المؤرِّقُ (میں جاگتا رہا اور یہ بے خوابی کیا ہے جو مجھے جگائے رکھتی ہے)

اور آگے چل کر اس کے ایک شعر میں کہا:

تشبّ لمقرورَین یصطلیانها | وباتَ علی النار الندی والمحلّقُ

(میں نے دیکھا کہ وہ آگ سخت سردی کھائے ہوئے دو اشخاص تاپ رہے ہیں۔ ان میں سے ایک تو جود وسخاء تھا اور دوسرا محلّق تھا' جو ساری رات آگ کے گرد بیٹھے رہے تھے۔)

جونہی اعشیٰ نے محلّق کی تعریف میں اپنا یہ مدحیہ قصیدہ ختم کیا' چاروں طرف سے امراء' شرفاء اور بڑے لوگوں کی طرف سے اس کی لڑکیوں کے لیے پیغام آنا شروع ہو گئے اور ایک سال نہ گزرا تھا کہ اس کی آٹھوں لڑکیاں اچھے گھرانوں میں بیاہ دی گئیں۔

**نمونۂ کلام:** اعشیٰ کی وہ طویل نظم جسے بعض لوگوں نے اس کا معلقہ قرار دیا ہے اس کا مطلع ہے:

ودع هريرة ان الركب مرتحل | وهل تطيق وداعاً ايها الرجل

(ہریرہ کو اب رخصت کرو کہ قافلہ اب کوچ کرنے والا ہے۔ لیکن ذرا سوچو تو کیا تم اسے وداع کر بھی سکو گے؟)

اس کے شروع کے کچھ اشعار اس کی محبوبہ کی تعریف اور اس کی بے توجہی کی شکایت کے بارے میں ہیں۔ پھر وہ وصف و بیان کی طرف آتا ہے اور شراب میں عیش کوشی کا ذکر کرتا ہے۔ اس کے بعد وہ یزید بن مسہر الشیبانی کو لطیف انداز میں دھمکی دیتے ہوئے کہتا ہے:

أبلغ يزيد بنى شيبان مألُكةً | ابا ثُبيتٍ' اماتنفكّ تأتكل
الست منتهياً عن نحت اسلتنا | ولست ضائرها ما أطّت الابل
كناطح صخرةٍ يوماً ليفلقها | فلم يضرها و أوهى قرنَه الوعِلُ
لقد زعمتم بانا لا نقا تلكم | انّا لا مثالكم يا قومنا قُتُل
قالو: الطراد' فقلنا: تلك عادتنا | او تنزلون' فانا معشر نُزُل

(یزید بن شیبان کو میرا یہ پیغام پہنچا دو: اے ابوثبیت' کیا تم اپنی شرارتوں پر قائم رہو گے۔
کیا تم ہماری بے عزتی کرنے سے باز نہیں آؤ گے' حالانکہ تم لاکھ کوشش کرو' کبھی ہماری اصل کو نقصان نہیں پہنچا سکو گے۔
تمہاری یہ کوشش ایسی ہے جیسے کوئی پہاڑی بکرا کسی چٹان کو اپنے سینگ سے توڑتا ہو۔ وہ چٹان کو تو نہ توڑ سکا' الٹا اپنے سینگ کا نقصان کر لیا۔



Scanned with CamScanner

تم نے گمان کیا کہ ہم تمہارے ساتھ نہیں لڑیں گے۔ لیکن ہم تو تم جیسے لوگوں کے ساتھ ہمیشہ لڑتے آئے ہیں۔

انہوں نے کہا: گھوڑوں پر سوار ہو کر مقابلہ ہوگا' تو ہم نے کہا: یہ تو ہماری عادت ہے۔ اور اگر تم زمین پر اتر آؤ گے' تو ہم لوگ بھی زمین پر اتر کر لڑنے والے ہیں۔)

اور وہ نظم جس میں اعشیٰ نے آنحضرتؐ کی مدح کی تھی' اس کے کچھ اشعار یوں ہیں:

الم تغمض عیناک لیلة أرمدا — وبتّ کما بات السلیمُ مسهّدا
وما ذاک من عشق النساء وانما — تناسیتُ قبل الیوم خلّة مهددا
فآلیتُ لا أرثی من کلالةٍ — ولا من وجیً حتی تلاقی محمدا
متی ما تُناخی عندباب ابن هاشم — تُراحی و تلقی من فواضله ندی
نبی یری ما لا یرون و ذکره — أغار لعمری فی البلاد وأنجدا
له صدقات ما تغبّ و نائل — و لیس عطاء الیوم یمنعه غدا

(کیا رات کو آنکھ کی تکلیف نے تمہیں سونے نہیں دیا' اور تو ایک ڈسے ہوئے انسان کی طرح جاگتا رہا
اس کا سبب عورتوں کا عشق نہیں تھا' بلکہ میں تو پہلے ہی مہدد کی دوستی کو بھول چکا تھا۔
میں نے قسم کھائی کہ اس (اونٹنی) کی تھکن پہ آزردہ نہیں ہوں گا اور نہ اس کے پیروں کی تکلیف کا خیال کروں گا جب تک کہ وہ محمدؐ تک نہ پہنچ جائے۔
جب وہ بنی ہاشم کے در پر جا کے بیٹھے گی تو اُسے آرام نصیب ہوگا' اور وہ ان کی عنایت سے بہت کچھ پالے گی۔
وہ ایسا نبی ہے کہ جو کچھ وہ دیکھتا ہے لوگ نہیں دیکھ سکتے۔ اور اس کی شہرت بخدا ملک کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک پہنچ گئی ہے۔
وہ جو کچھ بھی بخشتا ہے اس میں انقطاع نہیں آتا' اور وہ آج جو کچھ دیتا ہے کل اسے نہیں روکے گا۔)

اور محلّق کی خاطر اس نے جو قصیدہ لکھا' اس کا مطلع ہے:

أرقتُ وما هذا السُّهاد المؤرّقُ — وما بی من سُقم و مابی تعشُّق

(میں جاگتا رہا' اور یہ بے خوابی کیا ہے جو مجھے جگائے رکھتی ہے۔ حالانکہ نہ مجھے کوئی عارضہ ہے اور نہ میں مبتلائے عشق ہوں)

اس نظم میں آگے چل کر کہتا ہے:

لعمری لقد لاحت عیون کثیرۃ  
الی ضوء نار فی الیفاع تحرّق

تُشَبّ لمقرورَین یصطلیانھا  
وبات علی النار الندی والمحلّقُ

رضیعی لبان ثدی ام تقاسما  
باسحم داج : عوض لا نتفرّق

تری الجود یجری ظاھراً فوق وجھه  
کما زان متن الھندوانی رونق

یداہ یدا صدق : فکفّ مبیدۃ  
وکفٌ اذا ماضُنّ بالمال تُنفق

(قسم بخدا بہت سی آنکھوں نے اس میں آگ کی روشنی دیکھی جو ٹیلے پر جل رہی تھی۔

اور اسے سردی سے ٹھٹھرتے ہوئے دو شخص تاپ رہے تھے' ان میں ایک تو جود وسخا تھا اور دوسرا محلّق' جو ساری رات یہ آگ تاپتے رہے۔

ان دونوں نے ایک ہی ماں کا دودھ پیا ہے اور اس کالی رات کی قسم کھائی ہے کہ کبھی ایک دوسرے سے جدا نہ ہوں گے۔

تم سخاوت اس کے چہرے پر عیاں دیکھتے ہو جس طرح ایک ہندی تلوار کو اس کی چمک رونق بخشتی ہے۔

اس کے دونوں ہاتھ نیک نہاد ہیں۔ ایک وہ ہے جو مال لٹاتا ہے اور دوسرا وہ ہے کہ جب لوگ مال کو بچا کے رکھتے ہیں تو وہ خرچ کرتا ہے۔)

اعشیٰ کے یہ دو شعر اس کے مشہور اشعار میں سے ہیں:

عُلّقتُھا عرضاً و عُلّقت رجلاً  
غیری' وعلّق اخری ذلک الرجلُ

(میں نے اتفاق سے اس سے محبت کر لی اور اس کو میرے سوا کسی اور سے محبت ہو گئی اور وہ جو اور' تھا وہ کسی دوسری عورت کے عشق میں گرفتار ہو گیا۔)

کناطح صخرۃ یوماً لیوھنھا  
فلم یضرھا واوھی قرنه الوعلُ

(جیسے کوئی پہاڑی بکرا کسی چٹان کو سینگ سے توڑنا چاہے' وہ اسے تو نہ توڑ سکا اور اپنے سینگ کا نقصان کر بیٹھا۔)

اعشیٰ نے بڑی لمبی عمر پائی۔ اس طویل عرصے میں اس نے اکثر اصناف شعر میں طبع آزمائی کی۔ ابو عمرو بن العلا نے اس کے بارے میں ٹھیک کہا کہ مثله کمثل البازی یضرب کبیر الطیر و صغیرہ' یعنی اعشیٰ کی مثال اس باز کی سی ہے جو چھوٹے بڑے سب پرندوں پر جھپٹتا ہے اور ان کا شکار کرتا ہے۔

☆......☆......☆

جاہلی شاعری کا یہ باب ختم کرنے سے پہلے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اس میں اس دور کے ان شعراء کا کچھ تذکرہ بھی کر دیا جائے جنہیں عربی میں ''صعالیک شعراء'' کا نام دیا جاتا ہے۔ یہ وہ لوگ ہیں جو قلاش اور بے خانماں ہوتے تھے اور صحراؤں اور جنگلوں میں وحشی جانوروں اور درندوں کے ساتھ رہتے تھے۔ ان کی گزر اوقات لوٹ مار اور چوری پر تھی۔ یہ لوگ اتنا تیز بھاگتے تھے کہ گھوڑا بھی ان تک نہیں پہنچ پاتا تھا۔ لیکن حیوانیت کے قریب قریب زندگی گزارنے کے باوجود یہ لوگ اچھے اور قادر الکلام شاعر تھے اور ان کے کلام کے نمونے اب تک محفوظ چلے آتے ہیں۔ صعالیک (فقیر منش) شعراء میں دو لوگ زیادہ مشہور ہیں: ایک تأبّط شرًا اور دوسرا شنفری۔ نیچے ان کا مختصر احوال اور ان کے کلام کے کچھ نمونے پیش کیے جاتے ہیں۔

## تأبَّط شرَّا (م ۵۳۰ تقریباً)

تابط شرا کا نام ثابت بن جابر تھا۔ اُس کا یہ عرف اس طرح پڑا کہ ایک دن اس کی ماں نے اسے بغل میں کوئی ہتھیار دبا کر جاتے ہوئے دیکھا۔ کچھ دیر بعد جب اس سے پوچھا گیا کہ ثابت کہاں ہے تو اس نے جواب دیا: پتا نہیں، اس نے بغل میں کوئی بُری چیز دبا رکھی تھی اور وہ باہر نکل گیا۔ بغل میں بُری چیز دبانے کے لیے اس کی ماں نے ''تأبّط شرًا'' کے الفاظ استعمال کیے۔ اور انہی سے اس کا یہ نام پڑ گیا۔ تابط شرا اور شنفری معاصر تھے اور ان کا زمانہ چھٹی صدی عیسوی کا غالباً نصف اول ہے۔ لیکن شنفری جو تابط شرا کا بھانجا تھا، اس سے پہلے فوت ہوا۔ چنانچہ تابط شرا نے اس کا مرثیہ کہا۔ تابط شرا نے ایک نظم اپنے ابن عم شمس بن مالک سے خطاب کرتے ہوئے کہی، جس کے کچھ اشعار یوں ہیں:

| | |
|---|---|
| قليل التشكى للمهم يصيبه | كثير الهوى شتّى النوى والمسالك |
| يظلّ بموماة و يُمسى بغيرها | جحيشاً و يَعْرَوْرى ظهور المهالك |
| ويسبق وفد الريح من حيث ينتحي | بمنخرق من شدّة المتدارك |
| اذا حاص عينيه كرىَ النوم لم يزل | له كالئ من قلب شيحان فاتك |
| و يجعل عينيه ربيئة قلبه | الى سلّة من صارم الغرب باتك |

(جو بھی مشکلات اسے درپیش ہوں ان کا شکوہ نہیں کرتا، اس کی خواہشیں کثیر ہیں اور اس کی

منزلیں اور راہیں ہر طرف ہیں۔ وہ دوپہر ایک صحرا میں کرتا ہے اور شام دوسرے صحرا میں، تن تنہا، ہلاکت کے راستوں پر چلتا ہوا۔
وہ پہلی ہوا میں بھی آگے نکل جاتا ہے۔ یہ تو اپنے بے قاعدہ جھونکوں کے ساتھ چلتی ہے، لیکن اپنی رفتار کی تیزی میں وہ آگے ہی آگے چلا جاتا ہے،
اس کی آنکھیں اگر سو بھی جائیں تو اس کا دل نہیں سوتا، اور ایک ہوشیار اور حملہ کرنے پر تیار نگران کی طرح چوکنا رہتا ہے۔
وہ اپنی آنکھوں کو دل کا پاسبان بنا دیتا ہے کہ ضرورت پڑنے پر ہاتھ ایک تیز کاٹ والی تلوار کے دستے پر پڑ جائے۔)

''مفضلیات'' میں قدیم عربی شاعری کا جو انتخاب ہے وہ تابط شرا کے اس قصیدے سے شروع ہوتا ہے جو اس نے قبیلہ بجیلہ کی قید سے نکل بھاگنے کے بعد کہا تھا۔ یہ تینوں یعنی وہ اور عمرو بن براق اور شفری کوئی بڑی چال چل کر ان لوگوں کی قید سے پیدل بھاگ کھڑے ہوئے تھے اور وہ کوشش کے باوجود ان تک نہ پہنچ سکے۔ اس میں تابط شرا کہتا ہے :

انـی اذا خُـلّة ضـنّـت بـنـائـلهـا  وأمسکت بضعیف الوصل احذاق
نـجـوت منهـا نـجـائی من بَجِیلة اذ  ألقیتُ لیلة خبت الرهط أرواقی
لاشیٔ أسـرع مـنـی لیـس ذاغُـذَرٍ  وذا جناح بجنب الرِّید خفّاق

(جب دوستی کچھ دینے میں بخل کرنے لگے اور ایک کمزور اور ٹوٹنے والی رسی کا سہارا لینے لگ جائے۔
تو میں نے اسے ایسے چھوڑ دیا، جس طرح میں نے قبیلہ بجیلہ کو چھوڑ دیا اُس رات جب میں اپنے قبیلے سے بھاگ کھڑا ہوا۔
مجھ سے کوئی چیز تیز رفتار نہیں، سوائے گھوڑے کے اور سوائے اس پرندے کے جو پہاڑ میں رہتا ہے اور پھڑ پھڑاتے ہوئے اڑتا ہے)

اپنے اسی قصیدے میں آگے چل کر کہتا ہے۔

بـل مَـن لـعـذّالةٍ خـذّالةٍ اشِـبٍ  حـرّق بـاللّوم جلدی ایّ تحراق
بقول : أهلکتَ مالاً لو قنعتَ به  من ثوب صدق و من بـزّ و اعلاق
سـذّ خـلا لک من مـالٍ تـجـمّعه  حتـی تلاقی الذی کل امریٔ لاق
عـاذلتـی ان بـعض اللـوم مَـعْـنَفَة  و هـل متـاع و ان أبـقیتـهُ بـاقِ

انی لئیم لئن لم تترکوا عذلی ‏— ان یسأل الحیّ عنی اهل آفاق
ان یسأل القوم عنی اهل معرفة ‏— فلا یخبرهم عن ثابت لاق
لتقرعنّ علیّ السنّ من ندم ‏— اذا تذکرت یوماً بعض اخلاقی

(کون ہے جو مجھے ملامت کرنے' میرا ساتھ چھوڑنے اور مجھ پر اعتراض کرنے والے سے بچائے' جس نے اپنی ملامت سے میرا جسم بھسم کر ڈالا ہے۔
کہتا ہے: تم نے مال ضائع کر دیا' کاش تم اچھے کپڑوں اور لباس اور قیمتی اشیاء کے بدلے اپنے مال پر قناعت کرتے۔
جو مال تم جمع کرتے ہو اس سے اپنے فقر کا علاج کر لو' یہاں تک کہ تمہارا وہ وقت آ جائے جو ہر انسان کے لیے آتا ہے۔
اے ملامت کرنے والے! بعض ملامتیں بہت شدید ہوتی ہیں اور کیا کوئی ایسا سامان بھی ہے کہ اگر تم اسے سینت کر رکھو تو وہ ہمیشہ باقی رہے!
اگر آپ لوگوں نے میری مذمت ترک نہ کی تو میں سمجھتا ہوں کہ قبیلہ میرے متعلق دور افق میں رہنے والوں سے دریافت کرے گا یا لوگ میرے بارے میں جاننے والوں سے پوچھیں گے' تو کوئی بھی ملنے والا انہیں ثابت (تابط شرا) کا پتا نہیں دے گا'
اگر کسی دن تمہیں میری بعض صفات و اخلاق کا خیال آ جائے' تو میرے معاملے میں تم ندامت سے دانت پیسو گے۔)

## شنفریٰ (چھٹی صدی عیسوی کے اوائل)

شنفری کا نام ثابت بن اوس الازدی تھا۔ بعض لوگوں کا خیال ہے کہ اس کا عرف شنفری اس لیے پڑا کہ اس کے ہونٹ موٹے تھے۔ شنفری کا باپ اس کے بچپنے میں ہی قتل ہو گیا تھا اور اس کے خاندان والوں نے نہ صرف اس کے خون کا بدلہ نہ لیا' بلکہ اس کے باپ کے مرتے ہی اس سے آنکھیں پھیر لیں۔ اس کی نشوونما جن حالات میں ہوئی' ان کے متعلق مختلف روایات ہیں۔ بعض لوگ کہتے ہیں کہ وہ اپنی قوم ازد میں پروان چڑھا' لیکن ایک قتل کے واقعے میں جب ان لوگوں سے خون بہا مانگا گیا تو انہوں نے شنفری' اس کی ماں اور اس کے چھوٹے بھائی کو بطور رہن ان کے حوالے کر دیا اور پھر کبھی ان کو آزاد نہ کرایا۔ چنانچہ شنفری جب کچھ بڑا ہوا تو اپنے خاندان والوں کے بارے میں سخت نفرت و عداوت کے

جذبات اس کے دل میں پیدا ہو گئے۔ کچھ دوسرے لوگ کہتے ہیں کہ شنفری کے ننھیالی قبیلے قیس بن عیلان کی ایک شاخ بنو شبابہ نے اسے بچپنے میں قید کر لیا اور وہ ان کے ہاں رہنے لگا۔ ایک دفعہ بنو سلامان نے بنو شبابہ کے ایک آدمی کو گرفتار کر لیا۔ جب بنو شبابہ نے اپنے آدمی کو واپس مانگا تو بنو سلامان نے اس کے بدلے میں دو سو اونٹ طلب کیے۔ چنانچہ انہوں نے شنفری کو بدلے میں دے کر اپنا آدمی چھڑا لیا۔ اب شنفری بنو سلامان کے ہاں رہنے لگا۔ ایک دفعہ اس نے اپنے خیالی باپ کی لڑکی سے کہا کہ بہن ذرا میرا سر تو دھو دو۔ اس پر لڑکی نے بگڑ کر اس کے سر پر ایک طمانچہ رسید کیا اور بولی کہ تیری یہ مجال کہ تو مجھے بہن کہتا ہے۔ شنفری نے اس کا سبب پوچھا تو اس کو حقیقت کا پتا چلا۔ یہ بات اس نے پلّے باندھ لی اور قسم کھائی کہ بنو سلامان کے سو آدمی مار کے دم لوں گا۔ چنانچہ اس نے اپنے ساتھیوں کے ہمراہ ان پر مختلف اوقات میں سخت حملے کیے اور ان میں سے بہت سے لوگوں کو موت کے گھاٹ اُتار دیا۔ ادھر بنو سلامان شنفری کے آئے دن کے حملوں سے تنگ آ کر اس کی جان کے درپے ہو گئے۔ ایک طویل عرصے تک تو شنفری ان کے ہاتھ نہ آیا۔ لیکن پھر انہوں نے کچھ دوسرے بہادروں کی خدمات حاصل کر کے بالآخر اسے زیر کر لیا اور درخت کے ساتھ باندھ کر اسے قتل کر دیا۔ شنفری اب تک اپنے دشمنوں کے ننانوے آدمی مار چکا تھا۔ اس کے قتل کے بعد ان لوگوں نے اس کا سر قبیلے کے راستے میں ڈال دیا۔ اتفاق سے ادھر سے ان کا ایک آدمی گزرا تو اس نے کھوپڑی کو ٹھوکر مار دی۔ اس سے کھوپڑی کی ایک ہڈی اس کے پاؤں میں چبھ گئی۔ ہڈی کا زہر اس کی ٹانگ پر چڑھ گیا اور وہ آدمی مر گیا۔ اس طرح سو آدمی مارنے کی شنفری کی قسم پوری ہو گئی۔

**شاعری:** شنفری کی شاعری کا بہترین نمونہ اس کا وہ قصیدہ ہے جو "لامیۃ العرب" کے نام سے مشہور ہے، جس کا یورپ کی کئی زبانوں میں ترجمہ ہو چکا ہے۔ شنفری ایک قدیم فطری شاعر کی عمدہ مثال ہے۔ وہ ویرانوں میں جوان ہوا تھا، جنگلوں میں رہا کرتا تھا اور وہاں کے جانور اور درندے اس کے ساتھی تھے۔ چنانچہ اس کے شعروں میں اُس کی اس طرح کی زندگی کی تصویر ملتی ہے۔ اس کی سوچ اور اس کے طرز اظہار میں کچھ کھردرا پن ضرور ہے، لیکن وہ جو کچھ بھی کہتا ہے بڑی سچائی کے ساتھ کہتا ہے اور جو مناظر ہمیں دکھاتا ہے۔ ان میں وہ باریک بینی سے کام لیتا ہے۔ وہ اپنے بالوں اور اپنے بدن کے میل کا ذکر کرنے سے بھی نہیں چوکتا اور واقعہ اور حقیقت کی ہو بہو تصویر کشی کرتا ہے۔ چنانچہ وہ ہمارے لیے بادیۂ عرب کے ایک ایسے شاعر کی نمائندگی کرتا ہے جسے تمدّن و عمران کی ہوا بھی نہیں لگی۔ تاہم اس ساری سادگی اور فطرت کے قریب ہونے کے باوجود اس کے بعض شعروں میں بڑی حکمت اور دانائی کی باتیں



Scanned with CamScanner

ملتی ہیں۔

**نمونۂ کلام:** لامیہ قصیدے کے مطلع اور اس کے شروع کے اشعار میں شنفری اپنی قوم سے بیزاری کا اظہار کرتے ہوئے کہتا ہے کہ انسان پر جیسے بھی حالات گزریں، خدا کی زمین اس کے لیے تنگ نہیں ہوتی۔

| | |
|---|---|
| أقیموا بنی امّی صدور مطیّکم | فانی الی قوم سواکم لأمیل |
| وفی الارض منای للکریم عن الأذی | و فیھا لمن خاف القلی متعزّل |
| لعمرک ما بالارض ضیق علی امریٔ | سری راغباً اور راھباً وھو یعقل |
| ولی دونکم أھلون : سید عملّس | وارقط زُھلول و عرفاء جَیال |
| ھم الاھل، لا مستودع السرّ ذائع | لدیھم ولا الجانی بماجرّ یُخذل |

(اے ننھیال والو! یہاں سے کوچ کی تیاری کرو، کہ میں آپ کے بدلے دوسروں کی طرف زیادہ میلان رکھتا ہوں۔

اس زمین میں ایک باعزت انسان کے لیے پناہ کی کمی نہیں، اور جس کو خدشہ ہو کہ لوگ اسے پسند نہیں کرتے وہ اس دنیا میں الگ تھلگ رہ سکتا ہے۔

بخدا یہ زمین ایک ایسے انسان پر تنگ نہیں ہے، جو سمجھ بوجھ رکھتا ہو اور اپنی کسی خواہش یا کسی ڈر کی وجہ سے کہیں چل دینا چاہتا ہو۔

آپ لوگوں کو چھوڑ کر میرے کچھ قرابت دار ہیں: تیز رفتار بھیڑیا، ملائم جلد والا چیتا اور گردن کے بالوں والے چرخ

وہ ایسے اقربا ہیں کہ ان سے کوئی راز کی بات کہہ دو تو اسے فاش نہیں کرتے، اور نہ کسی خطاکار سے اس کی خطا کی وجہ سے منہ موڑ لیتے ہیں)

آگے چل کر شاعر اپنے بارے میں کچھ شعر فخر کے انداز میں کہتا ہے، کہ میں ایسا نہیں ہوں اور ویسا نہیں ہوں:

| | |
|---|---|
| ولا جُبّا اکھی مُربّ بعرسہٖ | یُطالعھا فی شانہ کیف یفعل |
| ولا خرق ھیق کأن فؤادہ | یظلّ بہ المُکّاء یعلو ویسفل |
| ادیم مطال الجوع حتی أمیتہ | واضرب عنہ الذکر صفحاً فاذھل |
| ولو لا اجتناب الذأم لم یُلف مشرب | یعاش بہ الا لدیّ و ماکل |

ولکن نفساً مرّۃ لا تقیم بی          علی الضیم الا ریثما اتحوّل

(نہ میں بزدل اور کمزور ہوں جو اپنی بیوی کے پاس بیٹھا اس سے پوچھتا رہے کہ آگے اسے کیا کرنا چاہیے۔
نہ میں دہشت زدہ شترمرغ ہوں کہ میرا دل ڈر کے مارے اوپر نیچے ڈولتا رہے۔
میں بھوک کو ٹالتا رہتا ہوں یہاں تک کہ وہ ختم ہو جاتی ہے' اور اس کے ذکر سے اجتناب کر کے اس سے غافل ہو جاتا ہوں۔
اگر عیب سے بچنا مقصود نہ ہوتا تو کھانے اور پینے کی کوئی چیز بھی جو زندہ رہنے کے لیے ضروری ہے میرے پاس ہوتی۔
لیکن ایک غیرت مند نفس ہے جو مجھے ظلم پر ٹکا نہیں رہنے دیتا' اور میں فوراً اس سے کنارہ کر لیتا ہوں۔)

شنفری کے اس ''لامیۃ العرب'' کے متعلق اہل نقد کے ہاں کچھ شکوک وشبہات پائے گئے ہیں۔ وہ کہتے ہیں اگر یہ قصیدہ جاہلی دور کا ہوتا تو اہلِ لغت اپنے مباحثوں میں اس سے سند لیتے۔ ان کا خیال ہے کہ یہ صدر اسلام کے دور کا ہے۔ لیکن ان کا یہ استدلال کافی نہیں ہے۔ اس لیے کہ اگر اس قصیدے کو بہت غور سے معروضی طریقے پر دیکھیں تو وہ نہ صرف اپنے جذبات اور افکار کے ساتھ' بلکہ اپنے ظاہری بیانات کے ساتھ بھی بہت قدیم لگتا ہے۔ کچھ لوگوں کا خیال ہے کہ راوی خلف الاحمر کو یہ عادت تھی کہ خود سے شعر کہہ کر جاہلی شعراء کے نام لگا دیتا تھا۔ اگر یہ مان بھی لیا جائے کہ یہ خلف الاحمر کی حرکت ہے' تو یہ بھی ماننا پڑے گا کہ اس نے یہ قصیدہ خالص قدیم جاہلی ماحول اور صعلوک شعراء کی زندگی کو سامنے رکھ کر نظم کیا ہے۔ اس لیے اہم بات یہ ہے کہ ''لامیۃ العرب'' اگر شنفری کا نہیں بھی ہے تو بھی یہ خالصتہً جاہلی مزاج اور ذائقے کا ہے' اور ہمیں اسے جاہلی ہی سمجھنا چاہیے۔

# باب ۳

# صدرِ اسلام اور اُموی خلافت کا دور

جاہلیت کے آخری زمانے میں عرب قوم پر بدویت غالب تھی، حتیٰ کہ ان کے امراء اور سربراہ اور
شہروں میں رہنے والے لوگ بھی تہذیب سے بہت دور تھے۔ نہ وہ کسی علم سے آشنا تھے، نہ ان کے ہاں
کوئی ایسا قانون رائج تھا جو ان کی زندگیوں کو منضبط کرے، نہ ان کے یہاں کوئی باقاعدہ صنعت وحرفت
تھی۔ نہ کوئی باضابطہ کاروبار ایسا تھا جو وہ کرتے ہوں۔ ان کے معاملات میں اکثر ضبط و توازن کی کمی
دیکھنے میں آتی تھی۔ امن و امان کی حالت سال کے اکثر مہینوں میں غیر تسلی بخش رہتی تھی۔ ان کے اوپر
کوئی ایسی حکومت یا کوئی ایسا سیاسی نظام موجود نہیں تھا جو ان کے امور کا نگران ہو۔ ایسے حالات میں
جب اسلام کا ظہور ہوا تو وہ اس قوم کے لیے ہدایت اور خیر کا سرچشمہ بن کر آیا۔ اس نے ان کی فکری،
اعتقادی، معاشرتی اور اخلاقی زندگی کو بالکل بدل کے رکھ دیا اور رفتہ رفتہ فتوحات کے نتیجے میں ان کے اندر
بہت سی چھپی ہوئی صلاحیتوں کو اُبھارا، اور وہ اس قابل ہوئے کہ نہ صرف اپنے لوگوں پر، بلکہ دوسری قوموں
پر بھی حکومت کرنے لگیں۔

اسلام کے طفیل عرب لوگوں کی معاشرتی زندگی میں جو اصلاح اور ترقی ہوئی وہ مندرجہ پہلوؤں سے تھی:

## (۱) خاندانی نظام

اسلام نے آ کر عربوں میں رائج ازدواج کی بہت سی صورتوں کو بدل دیا اور عورتوں اور مردوں کے
درمیان آزادانہ اختلاط کی ممانعت کر دی۔ اس نے شادی بیاہ کی شرعی صورتیں مقرر کیں اور لوگوں کو ان کا
پابند بنایا۔ جاہلیت میں بیویوں کی تعداد کی کوئی حد مقرر نہ تھی۔ اسلام نے اس تعداد کو چار تک محدود کر دیا
وہ بھی اس شرط کے ساتھ کہ مرد ان تمام بیویوں کے درمیان عدل قائم کرے گا۔ جن عورتوں کے مرد
جنگوں میں کام آ جاتے تھے، ان کو دوسری شادی کرنے کی کھلی اجازت دے دی۔ نیز عورتوں کا جائداد میں
حصہ مقرر کیا، جس کا اس سے پہلے اکثر قبائل میں دستور نہیں تھا۔ ان تمام اصلاحات کے طفیل اسلام نے
ایک مضبوط اور محکم خاندانی نظام کی بنیاد رکھی۔ جس میں مرد کو نگران کی حیثیت حاصل تھی اور عورت کے
ذمہ اپنی عزت و آبرو کی حفاظت کرنا، بچوں کو پالنا اور گھر کا نظم و نسق چلانا تھا۔

## (۲) جماعت کا نظام

جاہلی معاشرے میں قبائلی نظام کے باوجود افراد ایک دوسرے سے الگ تھلگ اور غیر متعلق زندگی بسر کرتے اور اپنے روزمرہ مشاغل میں مگن رہتے تھے۔ اسلام نے آ کر ان کو بتایا کہ ایک خدا' ایک رسول اور ایک دین کو ماننے کی وجہ سے ان کے درمیان وحدت کا ایک مضبوط رشتہ ہے۔ وہ سب بھائی بھائی ہیں اور ان کے درمیان کوئی اونچ نیچ نہیں ہے۔ اس نے ان کے لیے دن میں پانچ وقت مسجد میں آ کر نماز پڑھنے اور ایک دوسرے سے ملنے کا نظام قائم کیا۔ پھر ہفتہ میں ایک دن جمعہ کی نماز کے لیے پوری آبادی کے ایک بڑے اجتماع کی صورت پیدا کی اور اس سے بھی بڑا اجتماع سال میں دو عیدوں کی نمازوں کی صورت میں' اور پھر سال میں ایک دفعہ حج کی صورت میں فرض کیا۔ اس طرح گویا جاہلی معاشرے میں انفرادی زندگی کی جو نفسانفسی' بے تعلقی اور خودغرضی ہر طرف دیکھنے میں آتی تھی' اسلام نے آ کر اسے ایک اجتماعی زندگی کی صورت دے دی' جس میں فرد اکیلا نہیں تھا' بلکہ وہ اپنے جیسے دوسرے افراد کے ساتھ ایک بڑی جماعت کا حصہ تھا اور اس جماعت کے ارباب حل وعقد کے ساتھ جڑا ہوا تھا۔

## (۳) معیشت اور روزگار کا نظام

اسلام سے پہلے عرب کے قبائل ایک دوسرے پر حملے کر کے' ایک دوسرے کا مال چُرا کے اور آس پاس کے علاقوں میں لوٹ مار کر کے اپنی گزر اوقات کرتے تھے۔ اسلام نے آ کر حصولِ رزق کی یہ ساری صورتیں ناجائز قرار دے دیں۔ اس نے لوگوں کو تلقین کی کہ جائز طریقے استعمال کر کے مثلاً جانور پالنے سے' فصلیں اور باغات اُگانے اور تجارتی کاروبار کرنے سے اللہ کا رزق تلاش کریں' اور پھر اس نے ان کو اس امر پر اُکسایا کہ ان کے پاس جو مال ان کی ضرورت سے زائد ہو' وہ غریبوں اور ناداروں میں تقسیم کر دیں تا کہ معاشرے میں کوئی شخص ایسا نہ رہے جس کے پاس زندگی کی بنیادی ضروریات نہ ہوں۔ پھر جب فتوحات کا سلسلہ چل نکلا تو ہر طرف سے مالِ غنیمت آنا شروع ہوا اور خلافت کے بیت المال بھرے رہنے لگے' جس سے معاشرے میں مالی آسودگی آ گئی۔

## (۴) سیاسی زندگی کا نظام

اسلام کے آنے سے عرب لوگوں کی سیاسی زندگی میں بھی کافی ترقی ہوئی اور اس کے مظاہر اس طرح دیکھے گئے کہ

(ا) عرب لوگ جب مسلمان ہوئے تو وہ سب ایک سربراہ کے تابع ہو گئے۔ ان کا وہ سربراہ جو کہتا وہی بجا لاتے، اور جس سے منع کرتا اس سے رک جاتے۔ یہ سربراہ پہلے تو خود رسول اللہ ﷺ تھے اور ان کے بعد ان کے خلفاء کو یہ منصب ملا۔ خلیفہ کے ہاتھ پر بیعت کرنے کے بعد یہ لوگ اس کا اتباع کرتے ہوئے دین کا کلمہ بلند کرنے کے لیے ہر طرف نکل کھڑے ہوتے اور اپنے قرب و جوار کے علاقوں اور مملکتوں کو اسلام کی طرف بلاتے اور اُن کی طرف سے مزاحمت کی صورت میں ان پر فتح حاصل کر کے انہیں اسلامی سلطنت میں شامل کر لیتے۔ اس طرح سب قبائل عرب میں ایک سیاسی وحدت پیدا ہو گئی اور سب کا مطمحِ نظر ایک ہو گیا کہ اپنے ملک اور اپنے ملک سے باہر کی دنیا میں دین کی سربلندی اور غلبے کے لیے جدوجہد کریں۔

(ب) عرب کے بہت سے علاقے اسلام سے پہلے پڑوسی مملکتوں (فارس اور روم) کے تابع چلے آئے تھے اور عرب لوگ ان چھوٹی چھوٹی ریاستوں کے خوشہ چیں تھے جو ان بڑی بڑی مملکتوں نے عرب کی سرحدوں پر اپنی حفاظت کے لیے قائم کر رکھی تھیں۔ چنانچہ یمن کے عرب حکومت فارس کے زیرنگیں تھے جو ان پر ایک عرب امیر مقرر کیا کرتی تھی۔ اور وسطی جزیرہ نما کے عرب مناذرہ کے زیردست تھے جو فارس کی طرف سے حیرہ کے حکمران تھے اور فرات کے عربوں پر ان کی طرف سے عامل تھے۔ اسی طرح شمال میں شام کے عرب غسانی امراء کو اپنا حاکم و مطاع مانتے تھے جو سلطنت روم کے نائب ہوتے تھے۔ اسلام نے آ کر عربوں کو پاس پڑوس کی ان مملکتوں اور ان کی ریاستوں کی غلامی سے بالکل آزاد کر دیا اور ان ریاستوں کے سردار اور امراء جو فارس اور روم کی حکومتوں کے تابع ہوتے تھے، ایک ایک کر کے اسلام میں داخل ہو گئے۔

فتوحات کے نتیجے میں عرب لوگوں کا رابطہ ان ممالک سے ہوا جو زمانۂ قدیم سے متمدن چلے آئے تھے اور جن کے ہاں حکومت کرنے اور رعایا کی فلاح و بہبود کا خیال رکھنے کے لیے قانون اور ضابطے بنے ہوئے تھے۔ عرب لوگوں نے جب یہ ممالک فتح کیے تو وہاں کی قوموں میں جو اچھی باتیں تھیں وہ سیکھ لیں اور ان کو اپنے ہاں رائج کیا۔ اس طرح ان کے اندر بھی خلافت کے معاملات چلانے اور اپنے عُمّال اور اپنی رعایا کے لیے کچھ قاعدے اور قانون وضع کرنے کا دستور رائج ہوا، اور وہ ذمہ دار اولوالامر ثابت ہوئے۔ اسلام کے اوائل زمانے میں خلفاء نے اپنے گورنروں اور قاضیوں کو جو مکاتیب اور عہد نامے لکھے انہیں پڑھ کے لگتا ہے کہ عرب قوم جو ایک زمانے میں ایک سرپھری، آزاد اور بے نظم صحرائی قوم تھی رفتہ رفتہ ایسی مہذب اور سلیقہ مند ہوئی کہ ہر طرف پھیلتی اور بڑھتی ہوئی اسلامی سلطنت کے امور کی باگ ڈور سنبھالنے کے قابل ہو گئی۔

# عربی ادب پر اسلام کے اثرات

## قرآن کریم

اسلام کا سب سے گہرا اور ہمہ گیر اثر عربوں پر قرآن کی وجہ سے ہوا' جو ایک طرف تو ان کی اعتقادی' اخلاقی اور معاشرتی زندگی میں انقلاب لے آیا اور دوسری طرف عربی زبان و ادب میں اس نے ان کے سامنے ایک ایسا اعلیٰ نمونہ پیش کیا کہ جس کے سامنے وہ مبہوت اور حیرت زدہ رہ گئے۔ عربوں کو اپنی زبان دانی اور اپنی شاعری پر بڑا ناز تھا۔ اسی لیے وہ اپنے آپ کو عرب (فصیح البیان) اور دوسری قوموں کو عجم (گونگا) کہتے تھے۔ قرآن نے ان کے سامنے عربی زبان میں ایک ایسی چیز لا کے رکھی جس کے متعلق وہ کوئی فیصلہ نہ کر سکے کہ یہ شاعری ہے' یا نثر ہے' یا کسی کاہن یا جادوگر کا مسجع کلام ہے' یا یہ اعلیٰ خطابت کا کوئی نمونہ ہے۔ وہ ان میں سے کچھ بھی نہ تھی' لیکن اس کے باوجود وہ بہت کچھ تھی۔ قرآن نے اپنی لائی ہوئی ہدایت اور تعلیمات کے بیان کے لیے عربی زبان میں بالکل نئے الفاظ اور اصطلاحات رائج کیں' اور کچھ پہلے سے موجود الفاظ میں نئے معانی اور مفاہیم پیدا کر دیے۔ اس طرح کے الفاظ مثلاً صلوٰۃ' زکوٰۃ' قیام' رکوع' سجود' وضوء' مومن' کافر' منافق' عذاب' ثواب' آیات' شیطان' ملائک وغیرہ اب کچھ معیّن اور اصطلاحی معنوں میں بولے جانے لگے جو دین اسلام کے ساتھ مخصوص تھے۔ قرآن نے اس کے علاوہ اپنی مدنی سورتوں میں عربی زبان میں رواں نثر کا بہت اعلیٰ نمونہ پیش کیا اور ایک مسلمان کی روزمرّہ زندگی کے متعلق اپنے سارے تفصیلی احکامات اسی نثر میں دیئے جو عربوں کے لیے ایک بالکل نئی چیز تھی۔ قرآن کی ابتدائی مکّی سورتیں اس کے مقابلے میں بہت مختصر ہوتی تھیں اور ان کی آیات شاعری کے مصرعوں کی طرح موزوں اور مسجع و مقفّی ہوتی تھیں۔ یہ اپنی خوبصورتی اور اپنے مضامین اور زورِ بیان میں عرب ذہن کو متحیر کرنے والی تھیں۔ چنانچہ اس امر پر اہلِ علم و دانش کا اتفاق ہے کہ آنحضرت ﷺ کو اصل میں ایک ہی معجزہ خدا کی طرف سے دیا گیا اور وہ قرآن ہے۔ عربوں کو جنہیں اپنی شاعری اور فصاحت و بلاغت پر غرور تھا خدا نے چیلنج کیا کہ اگر تمہیں اس بات میں شک ہے کہ ہم نے یہ کتاب اپنے بندے پر نازل کی ہے' تو ایک سورت اس جیسی بنا کر لے آؤ۔ اس چیلنج کا نہ آنحضرت ﷺ کے زمانے میں کوئی جواب دے سکا اور نہ اتنی صدیاں گزرنے کے بعد آج تک اس کا جواب کسی سے بن پڑا ہے اور یہ بات اب پایۂ ثبوت کو پہنچ چکی ہے کہ قرآن دراصل ایک معجزہ ہے جو آنحضرت ﷺ کو عطا ہوا۔

عربوں کی شاعری پر قرآن کا اثر دو طرح سے ہوا: ایک تو یہ کہ جاہلی دور کے جو شعراء اسلام لے

آئے وہ قرآن کے حسنِ بیان اور بلاغت و فصاحت سے اس قدر مرعوب و متاثر ہوئے کہ انہوں نے شعر کہنا یا تو بالکل ترک کر دیا یا اسے بالکل کم کر دیا۔ کچھ دوسرے شعراء نے آگے چل کر رسول اللہ ﷺ کی مدح اور اسلام کو پھیلانے کے مقصد سے شعر کہنے شروع کیے۔ لبید بن ربیعہ جو مشہور جاہلی شاعر تھا اور معلقات کے شعراء میں سے تھا' جب اسلام لے آیا تو اپنا زیادہ وقت قرآن پڑھنے میں بسر کرنے لگا اور شعر گوئی ترک کر دی۔ جیسا کہ اس سے پہلے باب میں ذکر ہوا' لوگوں کا خیال ہے کہ اسلام لانے کے بعد اس نے صرف ایک شعر کہا اور وہ یہ تھا:

الحمدللہ اذ لم یاتنی اجلی      حتی اکتسیتُ من الاسلام سر بالا

(اللہ کا شکر ہے کہ مجھے اس وقت تک موت نہیں آئی جب تک میں نے اسلام کا پیراہن نہیں پہن لیا۔)

کچھ دوسرے لوگوں کا خیال ہے کہ وہ واحد شعر یہ ہے:

ماعاتَب الحرّ الکریم کنفسہ      والمرءُ یُصلحہ الجلیسُ الصالحُ

(ایک شریف اور نیک نہاد انسان کو اس کے نفس سے بڑھ کر کوئی ملامت نہیں کرتا' اور انسان کی اصلاح تو اس کا نیک ساتھی ہی کر سکتا ہے۔)

اسی طرح حسّان بن ثابتؓ بھی' جو زمانۂ جاہلیت میں ایک ممتاز شاعر تھے' اسلام لانے کے کچھ عرصہ بعد تک خاموش رہے۔ پھر جب ایک موقع پر رسول اللہ ﷺ نے شکوہ کیا کہ لوگ اپنے ہتھیاروں کے ساتھ تو میرا دفاع کرتے ہیں' انہیں کس چیز نے روکا ہے کہ قریش کے ان شعراء کے مقابلے میں میرا دفاع کریں جو میرے خلاف ہجو گوئی کرتے رہتے ہیں' تو حسان بن ثابتؓ نے اس خدمت کے لیے اپنے آپ کو پیش کیا اور اس کے بعد انہوں نے جو شاعری کی اس میں رسولِ خداؐ کی مدح بھی تھی' ان کے مخالفین کی ہجوؤں کا منہ توڑ جواب بھی تھا اور اسلام کی نعمتوں اور برکتوں کا اظہار بھی تھا۔

قرآن کا ایک دوسرا اثر عربوں کی شاعری پر یہ پڑا کہ اب شاعری کے موضوع شریفانہ اور سنجیدہ ہونے لگے اور ان میں جاہلی دور کے ہر دلعزیز موضوعات مثلاً سلاطین و امراء کی مدح سرائی اور ان کے انعام و اکرام کی جستجو' غلط باتوں پر فخر' عورتوں سے فحش انداز میں اظہارِ عشق' ایک دوسرے کے خلاف بے وجہ ہجو گوئی' شراب نوشی اور شراب کی محفلوں اور مغنیات اور ندیموں کا ذکر' جانوروں کا شکار اور اس کے قصے وغیرہ جو اسلامی طرز زندگی کے ساتھ میل نہیں کھاتے تھے' اب وقت کے ساتھ ساتھ کم ہوتے چلے گئے اور ان کی جگہ دوسرے موضوعات رواج پانے لگے۔

## قرآن کی جمع و تدوین

قرآن کریم آنحضرت ﷺ پر وقفے وقفے سے تئیس سال کے عرصے میں اترا۔ جیسے جیسے مسائل درپیش ہوتے اور جیسا جیسا حالات کا تقاضا ہوتا' اس کے مطابق آیات کا نزول ہوتا۔ آنحضرت ﷺ پھر وحی کے کاتبوں کو ہدایت کرتے کہ جو کچھ ان پر نازل ہوا ہے وہ لکھ لیں۔ چنانچہ وہ قرآنی آیات کو کھجور کی ننگی شاخوں پر' سفید پتھروں پر اور چوڑی ہڈیوں پر لکھ لیتے۔ پھر وہ ہر آیت کے متعلق ان کو بتاتے کہ اسے کس سورت میں شامل کرنا ہے۔ صحیح بخاری میں ہے کہ جبریل علیہ السلام ہر سال ایک دفعہ آ کر آنحضرتؐ کے ساتھ قرآن کا دورہ کرتے تھے۔ حضرت زید بن ثابتؓ سب سے بڑے کاتبِ وحی تھے۔ انہوں نے قرآن کو اس کی آخری شکل میں آنحضرت کو پڑھ کر سنایا تھا' اسی لیے قرآن کے جمع کرنے میں حضرت ابوبکرؓ اور حضرت عمرؓ نے ان پر اعتماد کیا اور حضرت عثمانؓ نے مصاحف کی کتابت کا کام بھی ان کے سپرد کیا۔

جب آنحضرتؐ نے وصال فرمایا تو قرآن پورا لکھا ہوا موجود تھا اور صحابہ کے سینوں میں بھی محفوظ تھا۔ جب حضرت عمرؓ نے دیکھا کہ یمامہ کے معرکے میں قرآن کے سات سو حُفّاظ شہید ہو گئے' تو آپ کو فکر ہوئی کہ حافظوں کے اس طرح اُٹھ جانے سے کہیں قرآن ضائع نہ ہو جائے۔ وہ ابوبکرؓ کے پاس گئے اور ان کے سامنے قرآن کو جمع کرنے اور اسے لکھنے کی تجویز پیش کی۔ حضرت ابوبکرؓ نے پہلے تو پس و پیش کیا کہ جس کام کی آنحضرتؐ نے ہدایت نہیں کی وہ ہم کیسے کریں' لیکن پھر مان گئے۔ چنانچہ قرآن کی تدوین اور کتابت کا یہ کام زید بن ثابتؓ کے سپرد کیا گیا۔ انہوں نے کھجور کی شاخوں' پتھروں اور ہڈیوں سے خدا کا کلام اکٹھا کیا اور پھر اسے صحیفوں کی شکل میں لکھ لیا۔ یہ صحیفے حضرت ابوبکرؓ کی زندگی میں انہی کے پاس رہے' پھر وہ حضرت عمرؓ کے پاس آ گئے اور ان کی موت کے بعد اُم المومنین حضرت حفصہؓ بنت عمرؓ کے ہاں رکھوا دیے گئے۔

حضرت عثمانؓ کے دور خلافت میں فتوحات کا سلسلہ وسیع ہوا تو دور دراز علاقوں میں قُراء پھیل گئے اور وہ اپنی خاص لغت اور لہجوں میں قرآن پڑھنے لگے' جو ہر جگہ مختلف تھے۔ نتیجہ یہ کہ ان میں سے کچھ لوگ زبان کے اختلاف کی وجہ سے دوسروں کو غلط ٹھہرانے لگے۔ حضرت عثمانؓ کو یہ دیکھ کر خدشہ ہوا کہ اس طرح کے اختلافات سے تو معاملہ سنگین ہو جائے گا۔ چنانچہ انہوں نے زید بن ثابتؓ، عبداللہ بن الزبیرؓ، سعید بن العاصؓ اور عبدالرحمانؓ بن الحارث بن ہشام کی ایک کمیٹی بنائی جس کی ہدایت کے مطابق انہوں نے قرآن کے وہ صحیفے جمع کر کے ایک ہی مصحف میں' سورتوں کی معلوم ترتیب سے نقل کر دیئے اور باقی

# قرآن کی جمع و تدوین

قرآن کریم آنحضرت ﷺ پر وقفے وقفے سے تیئیس سال کے عرصے میں اترا۔ جیسے جیسے مسائل درپیش ہوتے اور جیسا جیسا حالات کا تقاضا ہوتا' اس کے مطابق آیات کا نزول ہوتا۔ آنحضرت ﷺ پھر وحی کے کاتبوں کو ہدایت کرتے کہ جو کچھ ان پر نازل ہوا ہے وہ لکھ لیں۔ چنانچہ وہ قرآنی آیات کو کھجور کی ننگی شاخوں پر' سفید پتھروں پر اور چوڑی ہڈیوں پر لکھ لیتے۔ پھر وہ ہر آیت کے متعلق ان کو بتاتے کہ اسے کس سورت میں شامل کرنا ہے۔ صحیح بخاری میں ہے کہ جبریل علیہ السلام ہر سال ایک دفعہ آ کر آنحضرتؐ کے ساتھ قرآن کا دورہ کرتے تھے۔ حضرت زید بن ثابتؓ سب سے بڑے کاتبِ وحی تھے۔ انہوں نے قرآن کو اس کی آخری شکل میں آنحضرت کو پڑھ کر سنایا تھا' اسی لیے قرآن کے جمع کرنے میں حضرت ابوبکرؓ اور حضرت عمرؓ نے ان پر اعتماد کیا اور حضرت عثمانؓ نے مصاحف کی کتابت کا کام بھی ان کے سپرد کیا۔

جب آنحضرتؐ نے وصال فرمایا تو قرآن پورا لکھا ہوا موجود تھا اور صحابہ کے سینوں میں بھی محفوظ تھا۔ جب حضرت عمرؓ نے دیکھا کہ یمامہ کے معرکے میں قرآن کے سات سو حُفّاظ شہید ہو گئے' تو آپ کو فکر ہوئی کہ حافظوں کے اس طرح اُٹھ جانے سے کہیں قرآن ضائع نہ ہو جائے۔ وہ ابوبکرؓ کے پاس گئے اور ان کے سامنے قرآن کو جمع کرنے اور اسے لکھنے کی تجویز پیش کی۔ حضرت ابوبکرؓ نے پہلے تو پس و پیش کیا کہ جس کام کی آنحضرتؐ نے ہدایت نہیں کی وہ ہم کیسے کریں' لیکن پھر مان گئے۔ چنانچہ قرآن کی تدوین اور کتابت کا یہ کام زید بن ثابتؓ کے سپرد کیا گیا۔ انہوں نے کھجور کی شاخوں' پتھروں اور ہڈیوں سے خدا کا کلام اکٹھا کیا اور پھر اسے صحیفوں کی شکل میں لکھ لیا۔ یہ صحیفے حضرت ابوبکرؓ کی زندگی میں انہی کے پاس رہے' پھر وہ حضرت عمرؓ کے پاس آ گئے اور ان کی موت کے بعد اُم المومنین حضرت حفصہؓ بنت عمرؓ کے ہاں رکھوا دیے گئے۔

حضرت عثمانؓ کے دورِ خلافت میں فتوحات کا سلسلہ وسیع ہوا تو دور دراز علاقوں میں قُراء پھیل گئے اور وہ اپنی خاص لغت اور لہجوں میں قرآن پڑھنے لگے' جو ہر جگہ مختلف تھے۔ نتیجہ یہ کہ ان میں سے کچھ لوگ زبان کے اختلاف کی وجہ سے دوسروں کو غلط ٹھہرانے لگے۔ حضرت عثمانؓ کو یہ دیکھ کر خدشہ ہوا کہ اس طرح کے اختلافات سے تو معاملہ سنگین ہو جائے گا۔ چنانچہ انہوں نے زید بن ثابتؓ، عبداللہ بن الزبیرؓ، سعید بن العاصؓ اور عبدالرحمانؓ بن الحارث بن ہشام کی ایک کمیٹی بنائی جس کی ہدایت کے مطابق انہوں نے قرآن کے وہ صحیفے جمع کر کے ایک ہی مصحف میں' سورتوں کی معلوم ترتیب سے نقل کر دیئے اور باقی



Scanned with CamScanner

قبائل کی لغتوں اور لہجوں کو چھوڑ کر قریش کی زبان اور لہجہ باقی رکھا گیا۔ اس لیے کہ قرآن اسی میں اترا تھا۔ پھر اس مستند مصحف کی سات نقلیں تیار کی گئیں اور ان میں سے ہر مصحف مکہ، شام، یمن، بحرین، بصرہ اور کوفہ کی طرف بھیجا گیا اور ایک مصحف مدینے میں رکھا گیا، جسے اس کی مرکزی اہمیت کی وجہ سے 'الامام' کہا گیا۔

قرآن کی آیات کے کچھ نمونے:

قَولٌ مَعرُوفٌ و مَغفِرةٌ خيرٌ من صَدَقَةٍ يَتبَعُهآ اذًى (البقره ۲، ۲۶۳) قُل لاَ يَستَوِى الخبيثُ والطَّيبُ ولو اعجَبَک كثرةُ الخَبيثِ (المائده ۵: ۱۰۰) من يَعْمَلْ سوءً ايُجزَبه ولا يجد له مِن دُون الله وِلياً ولاَ نصيراً (النساء ۴ ۱۲۳) اِن الله لَا يُغَيِّر مَا بِقومٍ حتىّ يُغَيِّروا مَا بِانفُسِهِم (الرعد ۱۳ : ۱۱) لله الأمر مِن قبلُ و مِن بعدُ (الروم ۳۰ : ۴) كُلُّ نفسٍ ذَائقةُ المَوتِ ثمَّ اِلينا تُرجَعُون (العنكبوت ۲۹ : ۵۷) كلُّ نفسٍ بِمَا كَسَبَتْ رَهِينَةٌ (المدثر ۷۴ : ۳۸)

(ایک میٹھا بول اور کسی ناگوار بات پر ذرا سی چشم پوشی اس خیرات سے بہتر ہے جس کے پیچھے دکھ ہو) (اے پیغمبر! ان سے کہہ دو کہ پاک اور ناپاک بہرحال یکساں نہیں ہیں، خواہ ناپاک کی بہتات تمہیں کتنی ہی اچھی لگے) (جو بھی برائی کرے گا اس کا پھل پائے گا اور اللہ کے مقابلے میں کوئی حامی و مددگار نہ پا سکے گا) (اللہ کسی قوم کی حالت اس وقت تک نہیں بدلتا جب تک کہ وہ خود اپنی حالت کو نہ بدلے) (حکم تو خدا کا ہی ہے، پہلے بھی اور بعد میں بھی) (ہر متنفس موت کا مزہ چکھنے والا ہے، پھر تم ہماری ہی طرف لوٹ کر آؤ گے) (ہر متنفس اپنے اعمال کے بدلے رہن ہے۔)

## حدیث نبوی

حدیث کے معنی ہیں آنحضرتؐ کا قول یا ان کے کسی فعل کا بیان یا صحابہ کی ان کے بارے میں کوئی بات! یہ جہاں تک مذہب اور ثقافت کا تعلق ہے قرآن کے بعد دوسرے نمبر پر آتی ہے اور یہ عبادات اور حقوق کے معاملے میں شریعت کا ایک بڑا ماخذ ہے۔ قرآن کے سمجھنے میں بھی حدیث کی اہمیت بہت زیادہ ہے اس لیے کہ یہ اس کے مشکل مقامات کی وضاحت کرتی ہے، اس کے اجمال کی تفصیل بیان کرتی ہے، اس کے مطلق احکام کو ایک ضابطے میں لے آتی ہے اور اس کی عمومی ہدایات کو خاص مقاصد کے لیے استعمال کرتی ہے۔ احادیث، جو آنحضرتؐ سے صحیح طور پر ثابت ہیں، تعداد میں تھوڑی ہیں، لیکن وہ اپنی

فصاحت و بلاغت میں اعلیٰ درجے کی ہیں۔ اس لیے کہ آنحضرتؐ قریش سے تھے اور عرب کے سب سے فصیح قبیلہ بنو سعد میں ان کی نشوونما ہوئی تھی۔ زبان دانی کے علاوہ ان کے اندر نئے اسالیب اظہار کا بھی ایک قدرتی ملکہ تھا۔ لیکن حدیث اپنی ساری فصاحت و بلاغت اور اظہار کی خوبصورتی کے باوجود قرآن کریم کے مرتبے کو نہیں پہنچتی اور دونوں میں ایک ایسا فرق ہے جسے اہل نقد ونظر پہچانتے ہیں۔

حدیث نبوی دوسری صدی ہجری کے نصف سے پہلے مدوّن نہیں ہوئی تھی۔ اس سے پہلے اس کی روایت حافظے سے کی جاتی تھی۔ کچھ عرصہ گزرنے پر جب مسلمانوں کے اندر سیاسی تنازعات شروع ہوئے اور متعدد مذہبی فرقے پیدا ہو گئے تو لوگ اپنی خواہش کے پیچھے پڑ کر آنحضرتؐ سے من گھڑت باتیں روایت کرنے لگے۔ اس طرح انہوں نے اپنی دعوت کی حمایت میں اور اپنے نظریات کو برتر ثابت کرنے کے لیے ہزاروں احادیث وضع کر لیں۔ بعض لوگوں نے دین کے اصولوں اور نیکی کے طریقوں کے بیان کے لیے بھی حدیث گھڑنے میں کوئی مضایقہ نہ سمجھا' اس لیے کہ لوگ صرف قرآن کی نص یا حدیث کی روایت کو اہمیت دیتے تھے۔

حضرت عمرؓ اور بعض دوسرے صحابہ حدیث کی زیادہ روایت کرنے کو اچھا نہیں سمجھتے تھے' اس خدشے کے پیش نظر کہ لوگ کہیں قرآن کو چھوڑ کر حدیث کے مسائل میں زیادہ مصروف نہ ہو جائیں۔ لیکن وقت کے ساتھ ساتھ جب احادیث کا ذخیرہ بہت زیادہ اور بے حد و حساب ہو گیا تو اموی خلیفہ حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ نے احادیث کو باضابطہ مدوّن کرنے کا حکم دیا۔ اس مقصد سے بعض ائمہ اور اصحاب علم نے حدیثوں کی چھان پھٹک کرنے اور صحیح حدیثوں کا انتخاب کرنے کا فریضہ اپنے ذمہ لیا۔ اس کام کے لیے انہوں نے ایسے کڑے معیار مقرر کیے کہ جن کو کام میں لا کر انہوں نے ضعیف اور گھڑی ہوئی حدیثوں کے ایک بڑے انبار کو رد کر دیا اور صرف وہ احادیث جمع کیں جن کے بارے میں کہا جا سکتا تھا کہ وہ فی الواقع اصل اور صحیح احادیث ہیں۔

صحیح احادیث کے مجموعوں میں پہلے موطّا امام مالک سامنے آئی' پھر مسند احمد بن حنبل۔ اس کے بعد احادیث کی چھ صحیح کتابیں آئیں جن کو صحاح ستہ کہا گیا۔ یہ کتابیں ہیں: صحیح بخاری' صحیح مسلم' سنن ابی داؤد' جامع ترمذی' سنن ابن ماجہ اور سنن نسائی۔

## حدیث کا اسلوب

حدیث میں بلاغت کی خوبصورتی بھی ہے اور اس کے ساتھ ساتھ اس پر نبوت کا جلال بھی دکھائی دیتا ہے۔ آنحضرتؐ کو تشبیہ و تمثیل اور حکیمانہ باتوں سے اپنے کہے کو مؤثر بنانے کا ملکہ حاصل تھا۔ مثلاً ان کے

یہ اقوال کہ اصحابی کالنجوم بایھم اقتدیتم اھتدیتم (میرے اصحاب ستاروں کی مانند ہیں، ان میں سے تم جس کسی کی اقتدا بھی کرو گے، ہدایت پا جاؤ گے) یا مثلاً المراۃ کالضلع ان رُمتَ قوامھا کسرتَھا (عورت پسلی کی طرح ہے، تم اگر اسے سیدھا کرنا چاہو گے تو اسے توڑ دو گے) یا مثلاً الناس سواسیۃٌ کاسنان المُشط (لوگ کنگھی کے دانوں کی طرح ایک دوسرے کے برابر ہیں)

عربی زبان پر حدیث کا اثر یہ ہوا کہ اس زمانے کے سیاسی، معاشرتی اور گھریلو مسائل کے بارے میں احادیث کی صورت میں ایک ایسا فصیح و بلیغ اور خوبصورت اندازِ بیان سامنے آیا جس میں کم سے کم الفاظ میں زیادہ سے زیادہ معانی بیان ہوئے، جو ماقلّ و دلّ کا بہترین نمونہ تھے۔ آنحضرتؐ نے اپنے خطبۂ الوداع میں جو باتیں ارشاد فرمائیں وہ باوجود اپنے چھوٹے اور مختصر جملوں کے اتنی موثر تھیں کہ دنیا میں انسانی حقوق کا پہلا منشور قرار دی گئیں، اور آج بھی انسانی تاریخ میں اس منشور کا جواب پیدا نہیں کیا جا سکا۔

## مخضرم شعراء

صدر اسلام کے بارے میں ان تمہیدی کلمات کے بعد اب ہم مخضرم شعراء کا تذکرہ شروع کرتے ہیں۔ مخضرم ان شعراء کو کہا جاتا ہے جن کی زندگی کا کچھ حصہ دور جاہلیت میں اور کچھ زمانۂ اسلام میں گزرا۔ اس میں چار شاعروں کا ذکر ہوگا، کعب بن زہیر، خنساء، حسّان بن ثابتؓ اور حُطیئہ اور ان کے کلام کے کچھ نمونے بھی پیش کیے جائیں گے۔

## کعب بن زُہیر (م۶۶۲)

یہ معلّقات کے شاعر زہیر بن ابی سلمیٰ کے بیٹے تھے۔ جب اسلام لائے تو دربار رسالتؐ میں حاضر ہو کر اپنا قصیدہ "بانت سعاد" پڑھ کر سنایا، جس میں دوسرے موضوعات کے ساتھ آنحضرتؐ کی مدح کی گئی تھی۔ آپؐ نے یہ قصیدہ پسند فرمایا اور شاعر کو انعام میں اپنی چادر عنایت کی۔ عربی ادب میں یہ سب سے پہلی نعت تھی اور اس کا امتیاز یہ ہے کہ اسے خود آنحضرتؐ نے سنا اور اس پر پسندیدگی کا اظہار فرمایا تھا۔

کعب نے لڑکپن میں ہی شعر کہنے شروع کر دیے تھے۔ لیکن ان کے والد زُہیر نے انہیں اس سے منع کیا اور تلقین کی کہ جب تک وہ اپنی سوچ اور قوت اظہار میں پختہ نہ ہو جائیں، شعر نہ کہیں۔ لیکن کعب پھر

بھی شعر کہتے رہے۔ آخر ایک دفعہ زہیر نے شاعری میں ان کا کڑا امتحان لیا اور جب وہ اس میں کامیاب ہو گئے تو انہیں شعر کہنے کی اجازت دے دی اور کعب ایک بڑے شاعر کی حیثیت سے مشہور ہوئے۔

جب اسلام کا ظہور ہوا تو کعب اور ان کا بھائی بُجیر دونوں دربار رسالت میں حاضر ہونے کے لیے نکلے۔ لیکن راستے میں کعب کی نیت بدل گئی اور وہ پیچھے رہ گئے۔ جبکہ بُجیر آنحضرتؐ کے پاس آئے' ان کی باتیں سنیں اور اسلام لے آئے۔ اس پر کعب نے بہت برہمی کا اظہار کیا اور ان کی اور ان کے ساتھ آنحضرتؐ کی ہجو بھی کہہ ڈالی۔ یہ بات آپ کو بہت بری لگی اور انہوں نے کعب کو اس کی سزا دینے کا فرمان جاری کر دیا۔ ان کے بھائی بُجیر نے انہیں سمجھایا کہ آنحضرتؐ کی سزا سے بچنے کے لیے وہ ان کے پاس آ کر ان سے معافی مانگ لیں اور اسلام قبول کر لیں۔ لیکن کعب مختلف قبائل میں جا جا کر ان سے پناہ طلب کرتے پھرے اور جب خدا کے رسول کے خلاف کسی نے انہیں پناہ نہ دی اور دنیا ان پر تنگ ہو گئی تو وہ مدینہ میں آئے اور حضرت ابوبکرؓ کے توسط سے آنحضرتؐ کی خدمت میں حاضر ہو کر معافی مانگی' اسلام لے آئے اور اپنا قصیدہ ''بانت سُعادُ'' جو وہ اس موقع کے لیے تیار کر کے لائے تھے' آپ کو سنایا۔ اس پر آنحضرتؐ نے انہیں معاف کر دیا اور اپنی چادر انہیں عنایت فرما دی۔ یہ چادر کعب بن زہیر کے خاندان میں رہی۔ پھر معاویہ نے اسے بیس ہزار درہم کے عوض ان سے خرید لیا۔ اس کے بعد یہ چادر اموی اور عباسی خلفاء کے پاس یکے بعد دیگرے پہنچی۔ چنانچہ وہ خلفاء خاص خاص مواقع پر اسے زیب تن کرتے تھے۔

**شاعری :** کعب کو شاعری کا ماحول گھر میں ہی ملا تھا اور یہ گویا انہوں نے ورثے میں پائی تھی۔ اس لیے وہ اپنی عمر کے اوائل سے ہی شعر کہنے لگے اور آگے چل کر انہوں نے اس میں بہت بڑا مقام پایا۔ شاعری کا ایک بڑا نقاد خلف الاحمر کہتا تھا کہ اگر زہیر کی وہ طویل نظمیں نہ ہوتیں جن کی وجہ سے وہ مشہور ہوا' تو میں اسے اپنے بیٹے سے بڑا شاعر نہ قرار دیتا۔ کچھ دوسرے لوگوں کا بھی یہی خیال ہے کہ اگر کعب کے ہاں کچھ نامانوس الفاظ' پیچیدہ تراکیب اور نظموں کی ناکافی لمبائی نہ ہوتی تو وہ اپنے عظیم باپ سے کسی طرح کم نہ ہوتے۔ تاہم کعب کے اعلیٰ مرتبے اور ان کے کلام کی اہمیت کا اندازہ اس سے لگایا جا سکتا ہے کہ مشہور شاعر حُطیئہ نے ان سے درخواست کی کہ اپنے شعروں میں اس کی تعریف کر دیں تا کہ اس کی شہرت ہو جائے۔ اس پر کعب نے کہا:

فمن للقوا فی شانھا من یحوکھا　　　اذا ما مضی کعب و فوّز جرولُ

(جب کعب اور جرول یعنی حطیئہ اس دنیا سے چلے گئے تو قوافی کے لیے کون رہ جائے گا۔ جو بھی انہیں نظم کرے گا ان کا حلیہ بگاڑ دے گا۔)

نمونۂ کلام : کعب کی شاعری کا ایک عمدہ نمونہ ان کا قصیدہ ''بانت سعاد'' ہے جو بحر بسیط میں ۵۸ اشعار کا ایک لامیہ قصیدہ ہے۔ زبان اور اسلوب کے اعتبار سے یہ کاملاً جاہلی شاعری کے سانچے میں ڈھلا ہوا ہے۔ چنانچہ اس کا آغاز تشبیب کے چودہ شعروں سے ہوتا ہے۔ آگے چل کر شاعر رسول خداؐ سے رحم طلب کرتے ہوئے آپ کے عفو و درگزر کی مدح کرتا ہے:

| | |
|---|---|
| وقـال كـلُّ خـليل كنتُ آملُـه | لا أُلهينّـك إنـى عنك مشغُول |
| فقلتُ خلّوا سبيلى لا ابالكم | فكلُّ مـا قدّر الـرحمـانُ مفعول |
| كل ابن انثى وان طالت سلامته | يـومـاً على آلةٍ حدباء محمولُ |
| أُنبئتُ ان رسول اللـه أوعدنى | والعَفْوُ عند رسول اللـه مامول |
| مهلاً هداك الذى اعطاك نافلة | القرآن فيها مواعيظٌ و تفصيل |
| لا تـاخذنـىّ بـاقوال الوشاة ولم | أُذنب ولـو كثرت فىّ الاقاويل |
| ان الـرسولَ لسيفٌ يُستضاء به | مهنّـد من سيوف اللـه مسلول |

(میرے ہر دوست نے جس سے مجھے کچھ اُمید تھی مجھ سے کہہ دیا کہ میرے بھروسے پہ نہ رہنا'
میں تمہاری طرف توجہ نہیں کر سکتا۔
تو میں نے کہا: تمہارا باپ نہ رہے' میرا راستہ چھوڑ دو' اس لیے کہ رحمان نے جو کچھ مقدر کر دیا ہے وہ ہو کر ہی رہے گا۔
ہر ماں کا جایا چاہے وہ کتنا ہی عرصہ سلامت رہے' ایک نہ ایک دن جنازے کی چارپائی پر اٹھایا جائے گا۔
مجھے خبر ملی ہے کہ اللہ کے رسول نے مجھے وعید فرمائی ہے' تاہم عفو و درگزر کی تو رسول اللہؐ سے اُمید ہے۔
ذرا رک جائیے' وہ ذات آپ کی رہنمائی فرمائے جس نے آپ کو قرآن کا عطیہ بخشا' جس میں موعظت کی باتیں ہیں اور نیک و بد کی وضاحت ہے۔
مجھے چغلی کھانے والوں کی باتوں پر نہ پکڑیں' اس لیے کہ میں نے کوئی گناہ نہیں کیا' اگرچہ میرے بارے میں بہت باتیں اڑائی گئی ہیں۔
رسول خداؐ ایسی تلوار ہیں جس کی چمک سے روشنی حاصل کی جاتی ہے..... اللہ کی تلواروں میں سے

ایک تیز اور بے نیام تلوار)

ایک روایت کے مطابق کعب نے دوسرے مصرع میں ''من سیوف الہند'' کے الفاظ استعمال کیے تھے' کیونکہ ہندی لوہے کی تلواریں عرب میں بہت عمدہ اور تیز سمجھی جاتی تھیں۔ آنحضرتؐ نے سن کر اسے بدل دیا اور فرمایا ''من سیوف اللہ''۔ اگر یہ روایت درست ہے تو پھر قصیدہ ''بانت سعاد'' کو یہ شرف حاصل ہے کہ خود رسول اللہؐ نے اس میں اصلاح دی تھی۔

## خنساء (م ۶۶۴؟)

تماضر بنت عمرو ان کا نام تھا اور یہ مضر کے قبیلہ بنو سلیم سے تھیں۔ اس امر پر اتفاق ہے کہ عربی ادب میں ان سے بڑی شاعرہ نہیں گزری۔ شاعری میں ان کا خاص موضوع مرثیہ تھا۔ چنانچہ غم و اندوہ کے اظہار میں ان سے زیادہ مؤثر شاعری شاید ہی کسی نے کی ہو۔

خنساء کے والد عمرو اور دو بھائی معاویہ اور صخر قبیلے کے سردار تھے۔ خود خنساء اپنے وقت کی بہت خوبصورت عورتوں میں سے تھیں۔ چنانچہ قبیلہ ہوازن کے سردار اور جشم کے شاہسوار درید بن صمۃ نے انہیں شادی کا پیغام بھیجا' لیکن انہوں نے رد کر دیا اور اپنے قبیلے میں ہی شادی کی۔ خنساء آغاز میں کبھی کبھی کچھ قطعات کہہ لیا کرتی تھیں' لیکن جب ان کا بھائی معاویہ اور پھر باپ کی طرف سے ان کا دوسرا بھائی صخر یکے بعد دیگرے ہلاک ہو گئے تو اس غم نے ان کے اندر شاعری کا بند کھول دیا اور مرثیہ گوئی اب ان کا شعار ٹھہرا۔ ان کی شدت غم صخر کی موت پر زیادہ رہی' اس لیے کہ صخر اور اس کی بیوی نے کئی مرتبہ اپنے مال و اسباب میں خنساء کو شریک کیا تھا۔ چنانچہ صخر کے چلے جانے سے زندگی میں ان کا بہت بڑا وسیلہ باقی نہ رہا۔ خنساء نے بھائیوں کی موت پر بہت طویل مرثیے کہے اور شاعری کی اس صنف میں مردوں اور عورتوں سب کو پیچھے چھوڑ گئیں۔ اس کے ساتھ انہوں نے ان کے غم میں آہ و بکا کا سلسلہ بھی جاری رکھا' یہاں تک کہ وہ غم اور آہ و زاری میں ضرب المثل بن گئیں۔ جب اسلام آیا تو وہ اپنے قبیلے بنو سلیم کے ساتھ آنحضرتؐ کی خدمت میں حاضر ہو کر اسلام لے آئیں اور صحابیت کا شرف حاصل کیا۔ آنحضرت کو خنساء کی شاعری پسند تھی۔ چنانچہ وہ اس کی طرف ہاتھ کا اشارہ کرتے اور فرماتے۔ ''ھیہ یا خناس'' 'ہاں تو اے خنساء کچھ سناؤ'

خنساء اسلام لانے کے بعد بھی اپنے بھائی صخر کو روتی رہیں' یہاں تک کہ ان کی بینائی جاتی رہی۔ پھر جب قادسیہ کی جنگ ہوئی تو ان کے چاروں بیٹے اس میں شریک ہونے کے لیے گئے۔ اس موقع پر انہوں

نے بیٹوں کو اپنی وہ مشہور وصیت کی کہ جنگ میں شجاعت اور پامردی دکھانا اور پیچھے بالکل نہ ہٹنا۔ اس جنگ میں ان کے چاروں بیٹے لڑتے ہوئے شہید ہو گئے۔ لیکن اسلام نے ان کے اندر کوئی ایسی چیز پیدا کر دی تھی کہ وہی خنساء جن کی اپنے بھائیوں پر گریہ و زاری ختم ہی نہیں ہوتی تھی، چاروں بیٹوں کی شہادت کی خبر پا کر کہنے لگیں: "الحمدلله الذی شرّفنی بقتلهم" اس خدا کی تعریف ہو جس نے مجھے ان کی شہادت کا شرف بخشا۔

**شاعری:** شاعری کے نقادوں کا خیال ہے کہ نہ ان سے پہلے اور نہ ان کے بعد کوئی عورت ان سے بہتر شاعرہ ہوئی۔ جن لوگوں نے لیلی الاخیلیہ کو ان سے افضل قرار دیا ہے وہ بھی یہ تو مانتے ہیں کہ بطور مرثیہ گو خنساء ہی سب سے بڑی شاعرہ ہے۔ شروع عباسی دور کا نامور شاعر بشار بن برد کہا کرتا تھا کہ عربی زبان میں جس عورت نے بھی شاعری کی ہے اس میں کہیں نہ کہیں کمزوری ضرور دیکھنے میں آئی ہے۔ اس سے کہا گیا: کیا یہ بات خنساء کے متعلق بھی کہتے ہو! تو بشار نے کہا: نہیں، وہ تو مردوں سے بھی آگے نکل گئی ہے۔ عہد اسلامی کے شعراء کے علاوہ جاہلی عہد کے شعراء کے ہاں بھی اس کی قدر و شان وہی تھی۔ چنانچہ جب اس نے عکاظ کے میلے میں اپنا وہ قصیدہ پڑھا جس کا مطلع ہے:

قذیً بعینک ام بالعین عوارٌ　　　ام ذرّفتْ اذ خلت من اهلها دار

(کیا تمہاری آنکھوں میں کوئی چیز پڑ گئی ہے، یا ان کو کوئی عارضہ ہو گیا ہے، یا وہ گھر کے خالی رہ جانے پر آب دیدہ ہیں؟)

تو نابغہ ذبیانی جو اس موقع پر منصف کے فرائض انجام دے رہا تھا کہ اٹھا کہ اگر تم سے پہلے ابو بصیر (یعنی اعشیٰ) اپنا کلام نہ پڑھ گیا ہوتا تو میں اعلان کرتا کہ آج کے میلے میں سب سے بڑی شاعر تم ہو۔

بات یہ ہے کہ خنساء کے کلام میں ایک طرف تو جاہلی شعراء کے کلام کی سی پختگی اور مضبوطی اور اسلوب بیان کا حُسن تھا اور دوسری طرف ایک غمزدہ عورت ہونے کی وجہ سے اس کے شعروں میں ایسا درد و سوز، ایسی تاثیر اور ایسی دلآویزی پائی جاتی ہے کہ ان چیزوں نے مل کر اس کے پورے کلام میں مردانہ صلابت اور زنانہ لطافت کا ایک حسین امتزاج پیدا کر دیا ہے۔

ایک دفعہ اموی دور کے بڑے شاعر جریر سے کسی نے پوچھا: تمہارے خیال میں سب سے بڑا شاعر کون ہے؟ کہنے لگا: اگر خنساء نہ ہوتی تو میں کہتا کہ مَیں! پوچھا گیا کہ تم نے اس کو اپنے سے افضل کیوں کر جانا؟ کہنے لگا: اس کے ان شعروں کی وجہ سے:

ان الزمان وما یفنی له عجب          أبقی لنا ذنبا واستوصل الرأسُ
ان الجدیدین فی طول اختلافهما          لا یفسدان ولکن یفسد الناسُ

(زمانے نے' کہ جس کے عجائبات کبھی ختم نہیں ہوتے' ہمارے لیے دُم چھوڑ دی' اور سر کو الگ کر لیا گیا۔
رات اور دن بار ہا ایک دوسرے کے بعد آتے ہیں لیکن ان میں بگاڑ پیدا نہیں ہوتا۔ اور لوگ ہیں کہ بگاڑ میں مبتلا ہو کے ہی رہتے ہیں۔)

**نمونہ کلام :** خنساء کے کلام کا ایک عمدہ نمونہ اس کا یہ مرثیہ ہے جو اس نے اپنے بھائی صخر کی موت پر کہا:

یذکّرنی طلوعُ الشمس صخرا          واذکرہ لکل غروب شمس
ولولا کثرۃ الباکین حولی          علی اخوانهم لقتلت نفسی
ولکن لا ازال اری عجولا          ونائحة تنوح لیوم نحس
وما یبکین مثل أخی ولکن          اعزّی النفس عنه بالتأسّی
فقد ودعت یوم فراق صخر          ابی حسان لذّاتی و انسی
فیا لهفی علیه ولهف أمیّ          أیُصبح فی الضریح وفیه یُمسی

(مجھے ہر طلوع آفتاب صخر کی یاد دلاتا ہے اور ہر غروب آفتاب کے وقت میں اسے یاد کرتی ہوں۔
اور اگر میرے آس پاس اپنے بھائی بندوں پر رونے والوں کی اتنی کثرت نہ ہوتی تو میں نے اپنے تئیں ہلاک کر ڈالا ہوتا۔
لیکن میں تو یہ دیکھ رہی ہوں کہ ادھر ایک بدنصیب ماں ہے جس کا نور نظر اس سے کم سنی میں بچھڑ گیا ہے اور ادھر ایک دوسری ماتم کناں ہے جو بُرے دن کو رو رہی ہے۔
یہ سب جن کا ماتم کر رہی ہیں اگرچہ ان میں سے کوئی بھی میرے بھائی جیسا نہیں' لیکن ان کے غم واندوہ کو دیکھ کر میں اپنے نفس کو دلاسا دے لیتی ہوں۔
میں نے صخر کے وداع کے دن سے زندگی کی تمام لذتوں اور دلچسپیوں سے کنارہ کر لیا ہے۔
اور ہائے افسوس میرے بھائی پر وائے افسوس! کیا اس کی صبح بھی اور شام بھی اب قبر کے اندھیرے غار میں ہوا کرے گی!)

خنساء کے جس قصیدے کا مطلع اوپر گزرا' اس کے دوسرے کچھ اشعار یہ ہیں:

وان صخراً لمولانا وسيّدنا — وان صخراً اذا نشتو لنحار
وان صخراً لتأتمّ الهداة به — كأنه علمٌ في رأسه نارُ
حمّال الوية' هباط اودية — شهّاد اندية' للجيش جرّارُ

(بے شک صخر ہمارا والی اور سردار ہے' بے شک صخر' جب ہم پر سرما کا موسم آتا ہے تو وہ ہمارے لیے جانور ذبح کرتا ہے۔
صخر وہ ہے کہ راستہ بتانے والے خود اس کے پیچھے چلتے ہیں' گویا وہ ایک پہاڑ ہے جس کی چوٹی پر آگ جل رہی ہے۔
وہ علم بلند کرنے والا اور وادی وادی اترنے والا ہے' محفلوں میں شرکت کرنے والا اور لشکر کو میدان میں لے کے جانے والا ہے۔)

## حسّان بن ثابتؓ (م ۶۷۴)

ابو الولید حسّان بن ثابتؓ الانصاری دربارِ رسالت کے شاعر تھے۔ اپنے زمانے میں وہ اہل المدر (شہری طبقے) کے سب سے بڑے شاعر مانے جاتے تھے اور مخضرم شعراء میں ان کو بلند ترین مقام حاصل تھا۔ ان کا تعلق اہل مدینہ کے قبیلے بنی النجار سے تھا۔

حسانؓ نے تقریباً ایک سو بیس برس عمر پائی' جس میں سے آدھی زمانۂ جاہلیت میں اور آدھی اسلام میں بسر ہوئی۔ شاعری ان کے خاندان میں تھی۔ بقول مبرّد شاعری میں سب سے زیادہ گہری جڑیں رکھنے والا خاندان حسان کا تھا۔ چنانچہ آپ کے دادا سے لے کر آپ کے پوتے تک مسلسل پانچ پشتیں شاعروں کی رہیں۔

زمانۂ جاہلیت میں حسان نے شاعری میں بڑا نام پایا اور اپنے معاصر جلیل القدر شعراء کے مرتبے کو پہنچے' بلکہ ان میں سے بہتوں سے آگے نکل گئے۔ اس زمانے میں یہ ایک عام دستور تھا کہ بڑے شعراء نابغہ' زہیر اور اعشی وغیرہ امراء اور ملوک کی مدح کرتے اور ان سے انعام و اکرام پاتے تھے۔ حسان نے بھی ملوک غسان میں سے آلِ جفنہ کی مدح کی اور ان سے کافی صلہ پایا۔ کبھی کبھی وہ حیرہ کے شاہ نعمان بن المنذر کے ہاں بھی پہنچے اور اس کی امداد اور سرپرستی حاصل کی۔ آلِ غسان کا چونکہ اہلِ یثرب کے ساتھ کچھ نسب اور کچھ پڑوس کا تعلق بھی تھا' اس لیے ان کی طرف سے حسان کو برابر امداد پہنچتی رہتی تھی۔ بلکہ بعض لوگوں کا کہنا ہے کہ انہوں نے شاعر کا سالانہ وظیفہ مقرر کر رکھا تھا جو انہیں باقاعدگی سے ملتا رہتا تھا۔


Scanned with CamScanner

اسلام کے ظہور کے بعد جب آنخضرتؐ نے مدینہ کو ہجرت کی اور انصار نے اسلام قبول کیا تو حسانؓ بھی اسلام لے آئے۔ وہ رسول خداؐ کی مدد تلوار سے تو نہیں کر سکتے تھے۔ البتہ انہوں نے اپنے شعروں سے آنخضرتؐ کی تائید و حمایت کی۔ اس زمانے میں قریش میں تین شخص ایسے تھے عبداللہ بن زبعریٰ ابوسفیان بن حارث بن عبدالمطلب اور عمرو بن العاصؓ جو اسلام لانے سے پہلے رسول اللہؐ اور انصار کی ہجو کیا کرتے تھے' جس سے آپ کو بہت تکلیف پہنچتی تھی۔ ایک دفعہ آپؐ نے اپنے اصحاب سے فرمایا: وہ لوگ جو اللہ اور اس کے رسول کی اپنے اسلحہ سے مدد کرتے ہیں انہیں کس چیز نے روکا ہے کہ وہ اپنی زبان سے ان کی مدد نہیں کرتے؟ اس پر حسان بن ثابتؓ آگے بڑھے اور کہا: یہ کام میں کروں گا' کہنے لگے کہ میری زبان بہت لمبی ہے اور اپنی زبان نکال کر اپنی ناک کی پھننگ سے لگا کر دکھائی' پھر کہا: واللہ اگر میں اسے چٹان پر رکھ دوں تو وہ بھی تڑخ جائے اور اگر اسے بالوں پر سے گزاروں تو وہ بھی کٹ جائیں۔ آنخضرتؐ نے کہا: لیکن تم ان کی ہجو کیسے کرو گے کہ میں بھی تو ان لوگوں کے خاندان میں سے ہوں۔ حسان نے جواب دیا۔ آپ اس کی فکر نہ کریں' میں ان میں سے آپ کو اس طرح نکال لوں گا جیسے آٹے میں سے بال نکالا جاتا ہے۔ اس پر آپ نے فرمایا کہ اس میں ابوبکرؓ کی مدد لینا کہ وہ ان لوگوں کے حسب نسب سے پوری طرح واقف ہیں اور پھر ان کو یہ کہہ کر اجازت دی کہ ''جاؤ' ان کی ہجو کرو اور روح القدس تمہارے ساتھ ہیں۔'' چنانچہ حسانؓ نے ان مشرکین کی ایسی ایسی ہجو کی کہ وہ تلملا اُٹھے اور ان کی زبانیں بند ہو گئیں۔ حسانؓ کے کہے ہوئے شعر ان پر ایسے تیروں کا کام کرتے تھے جو ان پر اندھیرے میں چھوڑے گئے ہوں۔ اس سے تمام اہل اسلام میں شاعر حسانؓ کی شہرت ہو گئی اور ان کی قدر و منزلت میں اضافہ ہو گیا۔ رسول اللہؐ کے زمانے میں اور بعد میں بھی ان کو مالِ غنیمت اور تحفوں میں سے حصہ ملتا رہا اور ان کی تمام ضروریات بیت المال سے پوری ہوتی رہیں۔ آنخضرتؐ نے ان کو ام المومنین ماریہ قبطیہؓ کی بہن سیرین عنایت کی۔ ان دونوں بہنوں کو مقوقس شاہ حبشہ نے رسول اللہ کو تحفے میں بھیجا تھا۔ چنانچہ سیرین سے حسان بن ثابتؓ کا بیٹا عبدالرحمان پیدا ہوا۔

**شاعری:** زمانۂ جاہلیت میں حسان شہری طبقے کے شاعر تھے۔ جب آنخضرتؐ کی بعثت ہوئی تو وہ دربارِ نبوی کے شاعر بن گئے اور زمانۂ اسلام میں وہ یمن والوں کے بھی شاعر رہے۔ ان کی شاعری کے غالب موضوعات فخر' جوش و ولولہ' مدح سرائی اور ہجو گوئی تھے' اور یہ سب ایسے موضوعات ہیں جن میں پُرشکوہ الفاظ اور طاقتور اسلوب درکار ہوتا ہے۔ چنانچہ اس زمانے میں حسان کے کلام میں کچھ اذق اور نامانوس الفاظ اور لہجے میں اکھڑ پن پایا جاتا تھا جو اسلام کے آجانے سے جاتا رہا۔ پھر یہ ہوا کہ دین نے

جس بھائی چارے اور ہمدردی کی تلقین کی تھی' اس کی وجہ سے کدورتیں کم ہو گئیں' ہجوگوئی کے مواقع باقی نہ رہے' اس کے ساتھ بڑھتی ہوئی عمر کی وجہ سے حسان میں شعر گوئی کا وہ پہلے والا جذبہ اور شوق باقی نہ رہا۔ چنانچہ اب وہ کبھی کبھی صرف اس وقت شعر کہہ لیتے جب پیغمبرؐ کا اور ان کے ساتھ انصار کا دفاع کرنے کی ضرورت پیش آتی۔ لیکن اس زمانے میں ان کی اکثر شاعری سادہ و ناہموار ہوتی تھی' جس میں عام سطح کے الفاظ زیادہ ہوتے اور بلاغت و بیان بھی کم کم دیکھنے میں آتے' اور ان کی جگہ سادگی اور سہل پسندی نمایاں رہتی۔ چنانچہ شاعری کے ایک بڑے نقاد اصمعی کا خیال تھا کہ حسان بن ثابت کی شاعری شر اور گمرہی کے زمانے میں تو طاقتور رہی' لیکن جب آپ اسلام لے آئے اور قرآن کو سنا اور یاد کیا اور پھر ان دنوں بار بار کچھ ایسے واقعات رونما ہونے لگے جن کے بارے میں انہیں ضرور کچھ کہنا ہوتا تھا تو وہ کثرت سے شعر کہنے لگے۔ اس سے ان کی شاعری میں کچھ سلاست اور دھیما پن پیدا ہو گیا۔ ان کا اسلوب آسان ہو گیا اور شاعری کے معانی و مضامین میں بھی وہ پہلے والی تندی اور تیکھا پن نہ رہا۔ ان حالات کو دیکھ کر بعض اہلِ نظر نے یہ کلیّہ قائم کر لیا کہ شاعری تو ہمیشہ گناہ اور برائی اور مقابلہ و تصادم کے ماحول میں پنپتی ہے۔ حسان کی شاعری میں یہ جو تبدیلی دیکھنے میں آئی اس کی یہ ساری وجوہات ہو سکتی ہیں : یعنی اسلام کے آ جانے سے ماحول کا بدل جانا' شاعر کی بڑھتی ہوئی عمر اور اس کے تقاضے اور پھر اس کا مختلف مواقع کے لیے کثرت سے شعر کہنا! جو کچھ بھی ہو حسان پھر بھی اونچے درجے کے شاعر مانے گئے۔ رسول اللہؐ کے اصحاب میں یا ان کے دشمنوں کی صفوں میں کوئی بھی ایسا شاعر نہ تھا جو ان کے مقابل لایا جا سکے۔ چنانچہ مشرکین مکّہ کے خلاف انہوں نے جو ہجویں کہیں وہ ان کے لیے سخت اذیت ناک ثابت ہوئیں اور اسلام کے خلاف ان کے شاعروں کی زبانیں گنگ ہو کے رہ گئیں۔

نمونہ کلام : زمانۂ جاہلیت میں حسّان بن ثابتؓ کی شاعری کا طور کچھ اس طرح تھا۔

| | |
|---|---|
| ولقد تقلّدنا العشيرة امرها | ونسود يوم النائبات و نعتلي |
| و يسود سيّدنا جَحَاجِحَ سادة | و يُصيب قائلنا سواء المَفصِلِ |
| ونحاول الامر المهم خطابةً | فيهم و نفصل كل امر مُعضلِ |
| و تزور ابواب الملوک رکابنا | ومتى نحكم فى البريّة نعدل |

(ہمارا قبیلہ ہمیں اپنے امور کا نگران بنا دیتا ہے اور جب مصائب آتے ہیں تو ہم ان پر غلبہ پا لیتے ہیں اور ہمارا سر اونچا رہتا ہے۔

ہمارا سردار تمام نیکوکار سرداروں پر فوقیت رکھتا ہے اور ہمارا آدمی جب کوئی بات کہتا ہے تو وہ نشانے پر پڑتی ہے۔

ہم ان کو وعظ و نصیحت کرتے ہوئے ان کے مسائل سے نمٹتے ہیں اور ہر مشکل کام کو کھول کر آسان بنا دیتے ہیں۔

ہمارے سوار شاہوں کے دروازوں پر دستک دیتے ہیں اور جب ہمیں لوگوں پر حکم بنایا جاتا ہے تو ہم انصاف کرتے ہیں۔)

زمانۂ اسلام میں مشرکوں کی ہجو کرتے ہوئے کہتے ہیں:

الا أبلغ ابا سفیان عنیّ — مغلغلةً فقد برح الخفاءُ
بأن سیوفنا ترکتک عبدا — و عبدالدار سادتها الاماء
هجوت محمداً فاجبتُ عنه — و عند الله فی ذاک الجزاء
اتهجوه ولست له بکفءٍ — فشر کما لخیر کما الفداء
لنا فی کل یوم من معدٍّ — سباب او قتال او هجاء
لسانی صارم لا عیب فیه — و بحری لا تکدرّه الدلاء
فان ابی و والدتی و عرضی — لعرض محمد منکم وقاء

(ابوسفیان کو میری طرف سے یہ پیغام دے دو کہ اب چھپی ہوئی بات چھپی نہیں رہی۔

یہ کہ ہماری تلواروں نے تمہیں غلام بنا کے چھوڑا' اور قبیلہ عبدالدار کا یہ حال ہوا کہ ان کے سردار لونڈیاں بن کے رہ گئے۔

تم نے محمدؐ کی شان میں گستاخانہ اشعار کہے' سو میں نے ان کی طرف سے جواب دیا اور اللہ کے ہاں اس عمل کی جزا ہے۔

کیا تو اُن کی ہجو کرتا ہے' حالانکہ تو ان کے برابر کا نہیں ہے۔ پس آپ دونوں میں سے جو بُرا ہے وہ اس پر قربان ہو جو اچھا ہے۔

ہمارے لیے ہر روز قبائل معدّ کی طرف سے گالی گلوچ' جنگ و جدل یا ہجو گوئی کا سلسلہ جاری رہتا ہے۔

میری زبان کاٹ والی ہے اور اس میں کوئی عیب نہیں ہے' اور میرا دریا ایسا ہے کہ ڈول ڈالنے سے گدلا نہیں ہوتا

پس میرا باپ' میری ماں اور میری عزت تمہارے مقابلے میں محمدؐ کی عزو شان کی حفاظت کرنے والی ڈھال ہے۔)



Scanned with CamScanner

ایک دفعہ آنحضرتؐ کے پاس قبیلہ تمیم کا ایک وفد زبرقان بن بدر کی سربراہی میں آیا اور اپنے مفاخر بیان کرنے لگا۔ جب وہ اپنا کلام سنا چکے تو آپؐ نے حضرت حسان سے فرمایا کہ ان کو جواب دیں۔ حسان نے کہا:

إن الذوائب من فهرٍ واخوتهم — قد سنّوا سُنّةً للناس تُتبع

قومٌ اذا حاربوا ضرّوا عدوّهم — او حاولوا النفع فی اشیاعهم نفعوا

سجیّة تلک فیهم غیر مُحدثَة — ان الخلائق فاعلم شرّها البدع

لا یرقع الناس ما أوهت اكفهم — عند الدفاع ولا یُوهون مارقعوا

اعفةٌ ذُكرت فی الوحی عفّهتم — لا یطبعون ولا یُزری بهم طمع

لا یفخرون اذا نالوا عدوّهم — وان أصیبوا فلا خور ولا جزع

(قریش کے برگزیدہ لوگوں اور ان کے بھائیوں نے لوگوں کو ایک راستہ دکھا دیا ہے کہ جس پر چلا جانا چاہیے۔
وہ ایسے لوگ ہیں کہ جب لڑتے ہیں تو اپنے دشمنوں کو ضرر پہنچاتے ہیں اور اپنے ساتھ والوں کو اگر فائدہ پہنچانا چاہیں تو انہیں فائدہ پہنچاتے ہیں۔
ان کی یہ عادت کوئی نئی نہیں ہے' عادتوں میں بُری وہ ہوتی ہیں جو نئی ہوں۔
جو چیز ان کے ہاتھوں کمزور ہو جائے اس میں کوئی پیوند نہیں لگا سکتا اور جو پیوندکاری وہ کر دیں اسے کوئی کمزور نہیں کر سکتا۔
یہ پاکباز لوگ ہیں اور وحی الٰہی نے ان کی پاکبازی کا ذکر کیا ہے۔ نہ یہ پست اخلاق ہوتے ہیں اور نہ ان میں طمع کا کوئی عیب ہوتا ہے۔
جب وہ دشمن پر فتح پالیں تو فخر نہیں کرتے اور اگر ان پر کوئی مصیبت آ جائے تو نہ یہ کمزور پڑتے ہیں اور نہ گھبراتے ہیں۔)

آنحضرتؐ کی مدح میں حضرت حسانؓ کے یہ شعر بہت مشہور ہیں اور عربی نعت کے بہترین شعروں میں ان کا شمار ہوتا ہے۔

واحسن منک لم ترقطّ عینی — واجمل منک لم تلد النساء

خُلقتَ مبرّاً من کل عیب — کانک قد خُلقتَ کما تشاء

(آپ سے بڑھ کر حسین میری آنکھوں نے آج تک نہیں دیکھا' نہ آپ سے زیادہ جمیل انسان کو عورتوں نے جنم دیا ہے۔



Scanned with CamScanner

آپ ہر عیب سے منزا پیدا کیے گئے ہیں' لگتا ہے کہ جس طرح آپ نے چاہا تھا آپ اسی طرح پیدا کیے گئے۔)

## حُطیئہ (م ۶۷۸)

اس کا نام ابو ملیکہ جرول بن اوس العبسی تھا۔ وہ بنی عبس میں پیدا تو ضرور ہوا لیکن نہ اس کے باپ کا پتا تھا اور نہ اس کے حسب نسب کا۔ چنانچہ وہ خاندانی شرف سے محروم رہا اور ایک مظلوم اور دھتکارے ہوئے فرد کی صورت میں پروان چڑھا' جسے نہ خاندان کی طرف سے کوئی مدد حاصل تھی اور نہ قبیلے کی طرف سے کوئی شناخت۔ چنانچہ مجبور ہو کر اس نے شعر کہنے شروع کر دیے جن سے وہ کچھ کما لیتا' اپنے آپ کو لوگوں کی زیادتی سے محفوظ رکھتا اور اپنے اس ماحول سے انتقام لیتا جس نے اس پر ظلم کیا اور اسے دھتکار دیا تھا۔ پھر کچھ ایسی باتیں اور صفات بھی اس میں جمع ہو گئیں جنھوں نے اسے بالکل رذیل اور کم ذات بنا کے رکھ دیا۔ وہ یہ کہ اصمعی کے بقول وہ کافی بداخلاق' کمینہ صفت' بے عقیدہ' بار بار اور لپٹ لپٹ کر سوال کرنے والا' حریص' بدنہاد' اچھی صفات سے عاری' بخیل' بدصورت' کوتاہ قد' پھٹے کپڑوں میں پھرنے والا' اور قبائل میں اپنے مشکوک نسب کی وجہ سے کم رتبہ تھا۔ اس کی بے شرمی اور بدلحاظی یہاں تک پہنچی کہ اس نے اپنی ماں' اپنی بیوی' اپنے بیٹوں حتیٰ کہ اپنے آپ کی بھی ہجو کہہ ڈالی۔ جب اسلام کا ظہور ہوا تو وہ اسلام لے آیا لیکن پھر مرتد ہو گیا اور حضرت ابوبکرؓ کے خلاف اہلِ ارتداد سے جا ملا۔ لیکن جب اس تحریک کو شکست ہوئی تو اس نے معافی مانگ لی اور پھر سے اسلام لے آیا۔ لیکن وہ اپنے عقیدے میں متزلزل ہی رہا' اور مذہب اسلام اس کے مزاج اور عادات میں کوئی بہتری پیدا نہ کر سکا اور نہ اس کی تیز اور بیہودہ باتوں کو لگام دے سکا۔ چنانچہ وہ اپنی زبان سے لوگوں کی عزتوں سے کھیلتا رہا اور ان میں طرح طرح کی عیب جوئیاں کرتا رہا۔ یہاں تک کہ رسول اللہؐ کے صحابی اور حضرت عمرؓ کے عامل زبرقان بن بدرؓ بھی باوجود اس کو پناہ دینے اور اس پر احسانات کرنے کے اس کی ہجو کا شکار ہونے سے نہ بچ سکے۔

اس واقعے کی تفصیل کتاب الاغانی میں یوں بیان ہوئی ہے کہ ایک دفعہ حطیئہ ان سے قرقریٰ کے مقام پر ملا۔ اس کے ساتھ اس کی بیوی' بیٹے اور بیٹیاں بھی تھیں۔ زبرقان نے اسے پہچان لیا تھا۔ چنانچہ پوچھا: کہاں کا ارادہ ہے؟ حطیئہ نے انہیں نہیں پہچانا تھا' کہنے لگا: عراق کا قصد ہے' اس لیے کہ اس دفعہ کی خشک سالی نے ہمیں پیس کر رکھ دیا ہے۔ زبرقان نے پوچھا: تو پھر کیا کرو گے' حطیئہ نے جواب دیا: شاید کوئی ایسا بندہ مجھے مل جائے جو میری اور میرے اہل وعیال کی کفالت کرے اور میں اس کی مدح کرتا

رہوں۔ زبرقان نے کہا: تو یوں سمجھو کہ وہ آدمی تمہیں مل گیا۔ وہ تمہیں دودھ اور کھجور مہیا کرے گا اور تمہارے لیے ایک عمدہ پڑوسی ثابت ہوگا۔ شاعر نے کہا: مجھے اور کیا چاہیے۔ اس پر زبرقان نے اپنا نام بتایا اور حطیہ کو کسی آدمی کے ساتھ اپنی بیوی کے پاس بھیج دیا کہ اس کی خاطر تواضع کرے اور اس کے اپنے ہاں ٹھہرنے کا بندوبست بھی کرے۔

زبرقان اور قبیلہ بنی انف الناقہ (اونٹنی کی ناک والوں) کے درمیان عرصے سے مخاصمت اور عزت و شہرت میں مقابلہ بازی چلی آتی تھی۔ بنی انف الناقہ نے جو زیادہ دور نہیں رہتے تھے جب دیکھا کہ حطیہ زبرقان کے ہاں ٹھہرا ہے تو وہ بہت فکرمند ہوئے اور انہوں نے اسے اپنے ہاں لے جانے کے لیے ہر طرح کی چالیں چلنی شروع کیں۔ اس سلسلے میں انہوں نے زبرقان کی بیوی تک یہ بات پہنچائی کہ زبرقان حطیہ کی لڑکی مُلیکہ سے، جو کافی خوش شکل تھی، شادی کرنا چاہتا ہے۔ زبرقان کی بیوی نے یہ بات دل میں رکھ لی اور آخر ایک موقع پر حطیہ اور اس کے اہل و عیال کو گھر میں اکیلا چھوڑ کر یہ لوگ کہیں چل دیے۔ بنی انف الناقہ نے یہ موقع غنیمت جانا اور حطیہ کو اپنے ہاں لے آئے۔ اس کے لیے ایک خیمہ لگایا، اس کے لیے بہت سی کھجور اور دودھ مہیا کیا، اس کو اونٹنیاں نذر کیں اور پہننے کے لیے اچھا لباس بھی دیا۔ جب زبرقان اپنے سفر سے واپس آیا تو اس نے اپنے مخالفین سے حطیہ کو واپس کرنے کا مطالبہ کیا۔ لیکن حطیہ واپس آنے پر راضی نہ ہوا۔ چنانچہ اس نے بنی انف الناقہ کی مدح کرنی شروع کی اور پھر زبرقان کی ہجو کرنے لگا۔ بنی انف الناقہ کی مدح میں اس نے ایک ایسا شعر کہا جس کی دور دور تک شہرت ہوئی اور اس کے طفیل بنی انف الناقہ جو اپنے نام کی وجہ سے شرمندہ شرمندہ سے رہتے تھے، اب فخر سے سر اٹھا کر چلنے لگے۔ حطیہ نے کہا:

قومٌ هم الأنفُ والاذناب غيرهم ومن يسوّی بانف الناقة الذنبا

(یہ لوگ بنی انف الناقہ تو ناک ہیں اور دوسرے لوگ دُم کی جگہ ہیں۔ بھلا دُم کو کوئی ناک کے برابر سمجھ سکتا ہے۔)

بنی انف الناقہ کا یہ عجیب سا نام کیوں پڑا۔ اس کا ذکر باب ۲ میں (صفحہ ۳۳ پر) ہو چکا ہے۔ حطیہ نے ان کے ہاں رہ کر اپنی وہ سیئیہ نظم کہی جس میں اس نے زبرقان کی ہجو کی اور زبرقان نے اس میں حد سے زیادہ اپنی تذلیل دیکھتے ہوئے اس کی شکایت حضرت عمرؓ سے کی۔ حضرت عمرؓ نے دریافت کیا: "کیسے؟ تو جواب میں انہوں نے حطیہ کا یہ شعر پڑھا۔

دعِ المکارمَ لا ترحلُ لبغیتها واقعُد فانک انت الطاعم الکاسی

(بڑے کارناموں کا خیال چھوڑ، انہیں پانے کے لیے مت اٹھ، گھر میں بیٹھ رہو کہ تمہیں تو صرف
کھانے اور پینے سے کام ہے۔)

حضرت عمرؓ نے سن کر کہا کہ اس میں ہجو کہاں سے آ گئی۔ زبرقان نے کہا: تو آپ ابن الفریعہ (حسان بن ثابتؓ) کو بلا کر پوچھ لیجئے۔ حضرت حسان نے یہ شعر سن کر کہا کہ اس میں حطیہ نے زبرقان کی ہجو کی ہے اور کافی بُری ہجو کی ہے۔ اس پر حضرت عمرؓ نے حطیہ کو جیل میں ڈال دیا۔ جیل میں پڑنے کے بعد حطیہ نے حضرت عمرؓ کو منانے کی کوشش کی اور جب بس نہ چلا تو اپنا وہ مشہور معذرت نامہ لکھا جو عربی ادب میں نابغہ ذبیانی کے معذرت نامے کے بعد سب سے موثر معذرت نامہ سمجھا جاتا ہے۔ اس میں وہ کہتا ہے:

ماذا تقول لافراخ بذی مَرَخٍ — زُغب الحواصل لاماء ولا شجر
القیتَ کاسبَھم فی قعر مظلمۃٍ — فاغفر' علیک سلامُ اللہ یا عمر
انت الامین الذی' من بعد صاحبہ — القی الیک مقالید النُّھی البشر
لم یؤثروک بھا اذ قد موک لھا — لکن لا نفسھم کانت بک الخِیَرَ

(آپ ذی مرخ میں پڑے ان چھوٹے چڑیا کے بچوں کے بارے میں کیا فرماتے ہیں جن کے
پوٹے ابھی تک لال ہیں' جن کو نہ پینے کا پانی میسّر ہے اور نہ درخت۔
آپ نے ان کے کمانے والے کو اندھیرے گڑھے میں ڈال دیا۔ اے عمر! آپ پر اللہ کی سلامتی
ہو' اس بیچارے کو بخش دیجئے۔
آپ وہ امانتدار ہیں جس کے ہاتھوں میں آپ کے ساتھی کے بعد انسانوں نے عقل کی کنجیاں
تھمائی ہیں۔
جب انہوں نے آپ کو اس منصب کے لیے چنا تو آپ کے ساتھ کوئی رعایت نہیں کی' بلکہ اپنے
ہی لیے انہوں نے آپ کا انتخاب کیا۔)

اس پر حضرت عمرؓ نے اسے جیل سے آزاد کر دیا اور خبردار کیا کہ اب لوگوں کی ہجو نہیں کرو گے۔ اس پر حطیہ نے جواب دیا کہ پھر تو میرے بال بچے بھوکے مر جائیں گے' اس لیے کہ یہی تو میری روزی اور دھندا ہے۔ چنانچہ روایت ہے کہ حضرت عمرؓ نے اس کو تین ہزار درہم دیے اور اس طرح سے گویا مسلمانوں کی عزت محفوظ کر لی اور اس سے وعدہ لیا کہ وہ پھر کسی کی ہجو نہ کرے گا۔ حطیہ نے یہ عہد حضرت عمرؓ کی زندگی تک تو نبھایا۔ لیکن ان کے انتقال کے بعد اس نے پھر سے ہجو کہنی شروع کر دی۔

**شاعری:** حطیئہ کی شاعری میں پختگی ہے جس کے لیے اس نے بہت سی بحریں استعمال کی ہیں۔ اس کا اسلوب بہت عمدہ ہے۔ ہر طرح کے موضوعات پر اس نے اظہار خیال کیا ہے۔ مدح سرائی، ہجو گوئی، نسب اور مفاخرت اس کے خاص میدان تھے۔ اگر اس کے مزاج اور عادات میں گھٹیا پن اور اس کی طمع اور لالچ میں خساست نہ ہوتی اور اس کی شخصیت اتنی گری ہوئی نہ ہوتی تو وہ مخضرم شعراء میں سب سے افضل مانا جاتا۔ اس لیے کہ اس کے شعروں میں وہ تمام عیوب (بنت کی کمزوری، الفاظ کا ہلکا پن اور بے رنگی اور قافیوں کی ناگواری وغیرہ) نہیں پائے جاتے جو اس کے معاصر شاعروں میں اکثر دیکھنے کو ملتے ہیں۔ لیکن کہتے ہیں کہ کلام وہی باشرف ہوتا ہے جس کا کہنے والا بھی معزز اور باشرف ہو۔

حطیئہ اس معاملے میں زہیر کا شاگرد تھا کہ وہ اپنے شعروں کی نوک پلک بہت سنوارتا تھا۔ ایسے شاعر عبید الشعر (شاعری کے غلام) کہلاتے تھے جو اس کو بناتے اور بہتر سے بہتر کرتے رہتے تھے۔ اس ضمن میں حطیئہ کا یہ قول مشہور ہے کہ ''خیر الشعر الحولی المنقح المحکک'' یعنی سب سے اچھا شعر وہی ہے جس کو بنانے سنوارنے میں ایک سال لگا دیا جائے۔ چنانچہ حطیئہ کی ہجویہ شاعری میں بھی اس کی تلخی کے باوجود فحش اور گرے ہوئے مضامین نہیں ملتے۔ اوپر آپ نے دیکھا کہ اس کی ہجو کا ایک شعر اتنا لطیف تھا کہ حضرت عمرؓ جیسے شخص کو اس بات کا پتا نہ چل سکا کہ اس میں ہجو کی گئی ہے۔

**نمونۂ کلام:** حطیئہ نے آل شماس کی مدح میں جو شعر کہے، وہ اس کی مدحیہ شاعری کا ایک اعلیٰ نمونہ ہیں۔ کہتا ہے:

یسوسون احلاماً بعیداً اناتُها | وان غضِبُوا جاء الحفیظةُ والجدّ
أقِلّوا علیهم (لا ابا لا بِیکم) | من اللّوم او سُدّوا المکان الذی سَدّوا
اولٰئک قوم ان بنوا احسنوا البُنی | وان عاهَدوا أوفوا وان عقدوا شدُّوا
وان کانت النعماءُ فیهم جزوا بها | وان أنعموا لا کدرُوها ولا کدّوا
مَطاعین فی الهیجا مکاشیف للدُّجی | بنی لهمُ آباؤهم و بنی الجدّ
و یعذلنی ابناء سعدٍ علیهم | وما قلتُ الا بالذی عِلمت سعدٌ

(یہ لوگ بڑے صاحب عقل اور برداشت کرنے والے ہیں۔ ہاں جب یہ ناراض ہو جائیں تو ان میں برہمی اور سنجیدگی آ جاتی ہے۔
تمہارا باپ نہ رہے ان پر ملامت کم کرو یا پھر اس مقام پر پہنچ کے دکھاؤ جہاں وہ پہنچے تھے۔
وہ ایسے لوگ ہیں کہ جب وہ کچھ بناتے ہیں تو بہت خوبی سے بناتے ہیں، جب وہ عہد کرتے ہیں

تو پورا کرتے ہیں اور جب گرہ لگاتے ہیں تو کس کر لگاتے ہیں۔

اگر ان کے پاس مال ہو تو اسے دوسروں پر خرچ کر دیتے ہیں اور جب وہ کسی پر انعام کرتے ہیں تو اس پر احسان جتا کر اسے مکدّر نہیں کرتے اور نہ لینے والے پر کسی قسم کا دباؤ ڈالتے ہیں۔

لڑائی میں وہ ڈٹ کر تیر اندازی کرتے ہیں' اندھیروں کو تار تار کر دیتے ہیں۔ ان کی یہ ساری عزت ان کے آباؤ اجداد کی بنائی ہوئی ہے۔

بنو سعد مجھے ان کے بارے میں ملامت کرتے ہیں' حالانکہ میں نے تو وہی کہا ہے جو بنو سعد پہلے سے جانتے ہیں۔)

ہجو میں حطیئہ کی وہ نظم مشہور ہے جو اس نے زبرقان کے خلاف کہی' جب اس نے اس کو پناہ دینے میں غفلت برتی اور وہ ان لوگوں کو چھوڑ کر بنی انف الناقہ کے ہاں چلا گیا۔ کہتا ہے :

| | |
|---|---|
| واللہ ما معشر لا مُوا امرء اجُنباً | فی آل لای و شماس باکیاس |
| لمأ بدالی منکم غیب انفسکم | ولم یکن لجروحی فیکم آسی |
| أزمعت یاسا مُبینا من نوالکم | ولن تری طارداً للحُر کالیاس |
| دع المکارم لا ترحل لبُغیتھا | واقعُد فانک انت الطاعم الکاسی |
| من یفعلِ الخیر لا یُعدم جوازیَہ | لا یذھب العُرف بین اللہ والناسِ |

(واللہ وہ لوگ جنہوں نے اس غریب کو آل لائی اور شماس کے معاملے میں ملامت کی' کچھ سمجھ دار نہیں ہیں۔

جب مجھ پر آپ لوگوں کے اندر کی بات ظاہر ہوئی اور میں نے دیکھا کہ آپ لوگوں میں میرے زخموں پر مرہم رکھنے والا کوئی نہیں ہے۔

تو میں نے آپ کی عطا سے مایوس ہونے کا فیصلہ کر لیا اور ایک آزاد انسان کے لیے مایوسی سے بڑھ کر کوئی چیز دھتکارنے والی نہیں ہے۔

بڑے کارناموں کو چھوڑو' انہیں پانے کے لیے مت نکلو' بس گھر میں بیٹھ رہو کہ تمہیں تو صرف کھانے اور پہننے سے کام ہے۔

جو انسان بھلا کام کرتا ہے اس پر جزا پا کر ہی رہتا ہے' اس لیے کہ اچھا کام اللہ اور لوگوں کے درمیان ضائع نہیں ہوتا۔)

اوپر کے ان اشعار میں کچھ مصرعے ایسے ہیں جو ضرب المثل بن چکے ہیں۔ مثلاً ولن تری طارداً للحُر کالیاس اور لا یذھب العرف بین اللہ والناس۔ شاعری کے مشہور نقاد ابو عمرو بن العلاء کا خیال

ہے کہ طیبہ کے اس آخری شعر سے زیادہ سچا شعر عربوں میں سے کسی نے نہیں کہا۔

صدر اسلام کے دور کے دوسرے مخضرم شعراء میں کعب بن مالک' عبداللہ بن رواحہ' نابغہ جعدی' عمرو بن معدی کرب اور ابو ذویب الہذلی کے نام آتے ہیں' جن کا تذکرہ عربی ادب کی بعض مفصل تاریخوں میں ملتا ہے۔

## اُموی دور کی شاعری

ظہور اسلام کی پہلی صدی عام طور پر عربی ادب کے نمو و ارتقا کے لیے سازگار نہیں تھی۔ پہلے کچھ عرصہ فتوحات کا سلسلہ چلا۔ اسلامی مملکت ہر طرف پھیلنے لگی اور اس کو تنظیمی مسائل درپیش ہوئے۔ پھر گروہی اور مذہبی اختلافات نے قوم کی بہت ساری توتیں اپنی طرف لگائے رکھیں۔ ادھر قرآن میں شعراء کے بارے میں جن آراء کا اظہار کیا گیا وہ کوئی حوصلہ افزا نہیں تھے۔ مسلم قوم کے بہت سے افراد نے محض اس لیے بھی شعر کہنے چھوڑ دیے کہ یہ کوئی پسندیدہ عمل نہیں تھا اور قرآن کی اپنی فصاحت و بلاغت اور حسنِ بیان نے ان کو مسحور و مرعوب کر دیا تھا۔ تاہم کچھ عرصہ گزرنے پر جب حالات میں کچھ سکون آیا تو اموی عہد کے آتے آتے عرب قوم کا طرزِ زندگی بدلنے لگا اور ان کے اوپر کے طبقے میں بہت سی تبدیلیاں رونما ہونے لگیں۔ ان تبدیلیوں کے اسباب میں دو سبب نمایاں تھے : ایک مادی اور دوسرا معنوی! مادی سبب یہ تھا کہ فتوحات کے نتیجے میں بہت سا مالِ غنیمت اور ساز و سامان ان کی مملکت میں جمع ہونے لگا اور ہر طرف مال و زر کی اس فراوانی نے لوگوں کی زندگیاں بدل ڈالیں۔ جہاں پہلے معاشی تنگی تھی اب خوشحالی آ گئی۔ جہاں پہلے زندگی میں سادگی اور کھردرا پن تھا وہاں آسودگی' خوشحالی اور عیش پسندی دکھائی دینے لگی۔ اور معنوی سبب یہ تھا کہ عرب لوگ اپنے مفتوحہ علاقوں کی حکومت اور سیاست کے ایسے طور طریقوں سے متعارف ہوئے جن سے انہیں پہلے کبھی واسطہ نہیں پڑا تھا۔ چنانچہ وہ ان مفتوحہ قوموں کے انتظام مُلکی سے متاثر ہوئے اور سیاسی زندگی کی یہ صورتیں انہوں نے رفتہ رفتہ اپنے ہاں بھی رائج کر دیں۔ خیموں اور شامیانوں کی جگہ اب محلات اور ایوانوں نے لے لی اور خلافت کا منصب جو اس سے پہلے سیدھا سادا اور بدوی طرز کا تھا اب ایک شہری حکمرانی اور ملوکیت میں بدل گیا۔

ان بدلے ہوئے حالات میں عربی شاعری' جو ایک عرصے تک پس منظر میں رہی تھی' بنو اُمیہ کے دور میں پھر سے اُبھر کر سامنے آتی ہے اور اگرچہ وہ جاہلی شاعری کی روایت سے زیادہ دور نہیں جاتی' تاہم اس میں دو ایسے رجحانات واضح طور پر دکھائی دیتے ہیں جو جاہلی شعراء میں اس طرح نہیں پائے جاتے تھے۔ ایک رجحان 'غزل' کا ہے یعنی شاعری میں عشق و محبت کا مضمون باندھنا اور اس طرح باندھنا کہ

پوری نظم میں اور کوئی مضمون بیان نہ ہو۔ حسن وعشق کا بیان جاہلی شعراء بھی کرتے تھے اور اپنے قصائد کا آغاز ہمیشہ تشبیب (یعنی حسن وعشق کے مضامین) سے کرتے تھے' جس سے ان کا مقصد غالباً سننے والے کی توجہ کو اپنی طرف مبذول کرنا ہوتا تھا۔ لیکن چند شعروں کے بعد وہ دوسرے موضوعات (مثلاً اپنی اونٹنی یا گھوڑے کا وصف' سفر کی صعوبتوں کا بیان' اپنے محسن کی مدح' فخر' مباہات اور ہجو وغیرہ) کی طرف نکل جاتے' جو ان کے نزدیک زیادہ اہم اور سنجیدہ ہوتے تھے۔ صرف عاشقانہ مضامین کو پوری نظم کا موضوع بنانا' بلکہ صرف اسی کے لیے نظم کہنا' یہ رجحان اموی عہد کی شاعری میں دیکھا جانے لگا...... دوسرا رجحان سیاسی یا مناسباتی (Occasional) شاعری کا ہے' یعنی ایسی شاعری جو سیاسی مقاصد کے لیے ہو یا خاص مواقع کی مناسبت سے کی جائے۔ بات یہ ہوئی کہ جب مسلم معاشرے میں سیاست' عقائد اور حسب و نسب کی بنیاد پر دھڑے بندیاں ہونے لگیں تو ہر گروہ کو ایسے شعراء کی ضرورت پیش آئی جو ان کے محاسن بیان کریں اور دوسروں کے مقابلے میں ان کو فائق اور حق بجانب ثابت کریں۔ اس طرح کی شاعری کسی حد تک جاہلی اور صدرِ اسلام کے دور میں بھی دیکھی جانے لگی تھی لیکن امویوں کے عہد میں اس کا غلغلہ زیادہ بلند ہو گیا اور ہر طرف سنائی دینے لگا۔ چنانچہ بنواُمیہ کی سیاست کی جن شعراء نے تائید وحمایت کی ان میں اخطل' فرزدق (یہ اندر سے شیعہ تھا) جریر اور نُصیب بہت نمایاں تھے۔ اسی طرح زبیریوں کا شاعر عبداللہ بن قیس الرقیّات تھا جو بعد میں اموی ہو گیا۔ خوارج کے شعراء میں عمران بن حطّان اور الطرمّاح بن حکیم ممتاز تھے۔ شیعہ کے حامی شعراء میں الکمیت الاسدی کا نام معروف ہے' اگرچہ بعد میں اس کی ہمدردیاں مروان بن الحکم کے ساتھ ہو گئی تھیں۔

اموی شعراء کے ہاں اگرچہ مقاصد اور موضوعات بدل گئے تھے' تاہم ان کی شاعری میں زورِ بیان' بلاغت اور حسنِ ادا کا معیار کم وبیش وہی تھا جو جاہلی اور صدر اسلام کے شعراء کے ہاں رہا تھا۔ اس دور میں غزل کی جو شاعری ہوئی اس میں ایک خاص بات یہ دیکھنے میں آئی کہ اس میں الفاظ اور محاورات بہت سادہ اور سہل ہو گئے اور شاعری کی زبان روزمرّہ بول چال کی زبان کے بہت قریب آ گئی۔ اس کی بڑی وجہ یہ تھی کہ معاشرے کے بدلے ہوئے حالات میں اور خاص طور پر مکّے اور مدینے کی سوسائٹی میں' جو دارالخلافت سے دور تھی' کچھ امراء اور فارغ البال لوگوں میں موسیقی کا رواج شروع ہو گیا' اور آگے چل کر گانے والے اور گانے والیاں بھی منظرِ عام پر آ گئیں۔ اب موسیقی کے لیے جس طرح کی شاعری درکار تھی وہ ایسی تھی کہ اس میں مشکل الفاظ نہ ہوں' اس کی بحریں لمبی نہ ہوں اور اس کے مضامین ایسے ہوں جنھیں ایک عام سطح کا سامع سمجھ سکے اور اس سے لطف اندوز ہو سکے۔ چنانچہ غزل کی جس شاعری نے اموی دور میں رواج پایا اس میں یہ ساری خصوصیات موجود تھیں۔

غزل کی جس شاعری کا اوپر ذکر ہوا وہ دو طرح کی تھی: ایک وہ جس نے بادیۂ عرب میں مقبولیت حاصل کی۔ یہ شاعری ایک گہرے جذبے اور احساس کی شاعری تھی اور اس کا موضوع زیادہ تر محبت کا وہ الیسہ پہلو تھا جس میں وہ محبت کرنے والے کبھی نہیں مل پاتے اور ساری عمر ہجر و فراق کے صدمے سہتے رہتے ہیں۔ اس محبت کو ''الھوی العذری'' (Platonic Love) کہتے تھے' جس کا مقصد محبوب کے ساتھ جنسی ملاپ نہیں تھا بلکہ اس کی روح اور اس کی شخصیت کے ساتھ گہری وابستگی تھی۔ اس طرح کی شاعری کا سب سے مشہور نمائندہ جمیل (م ۷۰۱) تھا جو اپنی محبوبہ کے نام کے حوالے سے جمیل بثینہ کے لقب سے یاد کیا جاتا ہے۔ دوسری طرح کی غزلیہ شاعری وہ تھی جو خوش باش' بے فکر اور شہری طور طریقوں والی تھی۔ اس کی بحریں بہت چھوٹی اور سبک' زبان بہت سادہ اور بے تکلف ہوتی تھی اور اس کو مؤثر بنانے کے لیے اس میں مکالمے کا سا انداز پیدا کیا جاتا تھا۔ یہی شاعری تھی جو موسیقی کی محفلوں میں زیادہ گائی جاتی تھی اور اس کا بہترین نمائندہ اس زمانے میں قریشی شاعر عمر بن ابی ربیعہ (م ۷۲۰) تھا۔

یہاں پہلے ہم غزل کی شاعری کے دو اہم نمائندوں کی بات کریں گے اور اس کے بعد اخطل' فرزدق اور جریر کے ذکر پر آئیں گے۔

## جمیل بن معمر (م ۷۰۱)

جمیل بن عبداللہ بن معمر عرب کے مشہور عشاق میں سے ہے۔ اس کی محبوبہ بثینہ تھی اور دونوں کا تعلق قبیلہ عذرہ سے تھا۔ اس قبیلے کے لوگ سچی محبت اور رقت و پاکیزگی جذبات میں ضرب المثل تھے۔ ایک آدمی سے پوچھا گیا تمہارا تعلق کس قبیلے سے ہے؟ تو اس نے جواب دیا: ان لوگوں سے جو محبت کرتے ہیں تو اس کے لیے اپنی جان دے دیتے ہیں۔ ایک لڑکی نے جب یہ سنا تو کہا: رب کعبہ کی قسم' یہ عذرہ قبیلے ہی سے ہوگا۔ جمیل بہت چھوٹا تھا جب وہ بثینہ کی محبت میں گرفتار ہوا۔ جب وہ بڑا ہوا تو اس نے بثینہ کا رشتہ مانگا' لیکن اسے انکار ہوگیا۔ اس کے بعد وہ بثینہ کی محبت میں شعر کہنے لگا اور چوری چھپے اسے وادی القریٰ میں ملنے کے لیے بھی آنے لگا۔ لیکن جب بثینہ کو پتا چلا کہ اس کے (بثینہ کے) اہل خانہ اسے پکڑنے اور مارنے پر تلے ہوئے ہیں تو اس نے اسے ملنے سے منع کر دیا۔

جمیل کی محبت بثینہ کے لیے بالکل پاک اور بے لوث تھی۔ ایسی محبت کے لیے عربی زبان میں ''الھوی العذری'' (Platonic Love) کی ترکیب رائج ہے۔ جمیل کی محبت میں سچائی تھی' خلوص تھا اور عمر لازوال تھی۔ اس نے کبھی یہ نہیں چاہا تھا کہ اگر بثینہ میری نہیں بن سکی تو میں نکاح کے بغیر ہی اس کا قرب

حاصل کر لوں۔ کہتے ہیں کہ ایک دفعہ بثینہ کی ایک کنیز نے اس کے خلاف سازش کی اور اس کے بھائی اور باپ کو جا کر بتا دیا کہ جمیل آج رات کو اس سے ملنے آیا ہوا ہے۔ یہ سن کر دونوں نے اپنی تلواریں سنبھالیں اور آ کے دیکھا تو جمیل اور بثینہ ایک کونے میں بیٹھے باتیں کر رہے تھے اور وہ اس کو اپنا دکھڑا سنا رہا تھا۔ باتوں باتوں میں جمیل کہنے لگا: بثینہ! تمہیں میری محبت کا تو پتا ہی ہے' تو کیا تم اس کے جواب میں مجھے کچھ نہیں دو گی؟ بولی: میں کیا دوں؟ جمیل نے کہا وہی جو دو محبت کرنے والوں کے درمیان ہوتا ہے۔ اس پر بثینہ بولی: جمیل' میرا خیال تھا تم ان باتوں سے دور ہو گے اور اگر تمہارا اشارہ کسی بُرائی کی طرف ہوا تو میں کبھی تمہارا چہرہ نہیں دیکھوں گی۔ یہ سن کر جمیل ہنس پڑا اور کہنے لگا: میں یہی دیکھنا چاہتا تھا کہ تم اس کے جواب میں کیا کہتی ہو۔ واللہ اگر میں دیکھتا کہ تم میری اس طلب کو پورا کرنے پر راضی ہو تو میں اپنی اس تلوار سے تمہارا سر اُڑا دیتا۔ اور اگر میرا دل مان جاتا تو میں تم سے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے جدا ہو جاتا۔ کیا تم نے میرا وہ قول نہیں سُنا!

وانی لأرضی من بُثینة بالذی — لو استیقن الواشی لقُرت بلابله
بلاوبان لا استیطع و بالمُنیٰ — وبالأمل المرجوّ قد خاب آمله
وبالنظرة العجلی وبالحول ینقضی — أواخره لا نلتقی و اوائله

(میں بثینہ کی طرف سے ایسی بات پر راضی ہوں جس کا اگر چغل خور یقین کر لے تو اس کے سارے اندیشے ختم ہو جائیں۔
اس کی نہیں' اور میں ایسا نہیں کر سکتی اور وہ آرزوئیں اور امیدیں جن کا انتظار کرنے والا نامراد رہ جائے۔
ایک اچنتی سی نظر' اور پھر ایک سال کا عرصہ جس کا آخر بھی گزر جائے اور اول بھی' اور ہم مل نہ پائیں۔)

یہ سن کر بثینہ کے باپ نے اس کے بھائی سے کہا: چلو' اُٹھ چلیں' آج کے بعد ہمیں اس آدمی کو بثینہ سے ملنے سے نہیں روکنا چاہیے۔ چنانچہ وہ ان دونوں کو وہیں چھوڑ کر چل دیے۔

جمیل کی عشقیہ شاعری کا ایک عمدہ نمونہ دیکھتے چلتے ہیں۔

الا لیت ریحان الشباب جدید — ودھراً تولّی یا بُثین یعود
فنغنی کما کنا جمیعاً وانتم — قریب واذ ماتبذلین زھید
الا لیت شعری ھل ابیتن لیلۃً — بوادی القُری انی اذا لسعید

وهل القين فرداً بثينة مرةً | تجود لها من ودّها و نجود
علقتُ الهوى منها وليداً فلم يزل | الى اليوم ينمى حبّها و يزيد
وافنيتُ عمرى بانتظارى نوالها | وأبليت فيها الدهر وهو جديد
فمن كان فى حُبّى بثينة يمترى | فبر قاء ذى ضال علىّ شهيد

(کاش کہ شباب کا ابتدائی زمانہ پھر سے آ جائے' اور جو زمانہ گزر گیا' اے بثینہ' وہ لوٹ آئے۔
ہم مل کر اسی طرح گائیں اور تم میرے قریب ہو اور جو کچھ تم عطا کرو وہ بہت قلیل ہو
اے کاش کیا میں وادی القریٰ کے قریب ایک رات گزاروں گا' پھر تو میری کیا ہی قسمت ہو گی۔
اور کیا میں بثینہ سے کبھی اکیلے میں مل پاؤں گا اور کیا وہ اپنی محبت مجھ پر نچھاور کرے گی اور میں اپنی محبت اس پر
میں ابھی بچہ تھا کہ اس کی محبت میں گرفتار ہوا اور اس کی محبت آج تک مسلسل بڑھتی اور پھلتی پھولتی رہی
میں نے اپنی ساری عمر اس کی عطا کے انتظار میں گزار دی اور میں نے زمانے کو جو نیا تھا بوسیدہ کر ڈالا۔
جس کسی کو بثینہ کے ساتھ میری محبت میں شک ہو' تو ذی ضال کا پتھریلا اور ریتلا علاقہ مجھ پر گواہ ہے۔)

ایک اور نمونہ شاعر کے اظہارِ عشق کا یوں ہے:

خليلىّ فيما عشتُما هل رأيتما | قتيلاً بكى من حُبّ قاتله مثلى
اِبيت مع الهُلّاک ضيفاً لاجلها | وأهلى قريب موسَعون ذو و فضلٍ

(اے دوستو! کیا تم نے ایسا مقتول بھی دیکھا ہے جو میری طرح اپنے قاتل کی محبت میں روتا ہو۔
میں اس کی خاطر فقیروں اور سائلوں کے ساتھ رات گزارتا ہوں' حالانکہ قریب ہی میرے اہلِ خانہ ذی ثروت اور صاحبِ فضل لوگ ہیں۔)

ایک اور نظم میں کہتا ہے:

لقد لامَنى فيها اخٌ ذو قرابةٍ | حبيبٌ اليه فى ملامته رُشدى
وقال : أفِقْ ' حتى متى أنت هائم؟ | بثينة فيها قد تعيد و قد تُبدى
فقلت له : فيها قضى الله ماترى | علىّ ' وهل فيما قضى الله من ردّ
فان يك رُشداً حبُّها او غوايةً | فقد جئتُه ' ما كان منى على عمد

(مجھے اس محبت پر میرے ایک قرابت دار بھائی نے ملامت کی' جسے میرا راہِ راست پر آ جانا بہت محبوب ہے۔



Scanned with CamScanner

کہنے لگا: ہوش میں آؤ' تم کب تک بثینہ کی محبت میں دیوانے رہو گے اور یہ حالت تم پر بار بار طاری ہوتی رہے گی؟

میں نے اس سے کہا: اللہ نے بثینہ کے معاملے میں میری جو حالت لکھ دی ہے وہ تم دیکھ رہے ہو' کیا اللہ کی قضا کو ٹالا بھی جا سکتا ہے۔

اگر اس کی محبت اچھی بات ہے یا گمراہی ہے' تو میں تو اس میں گرفتار ہو چکا ہوں۔ یہ میں نے جان کر تو نہیں کیا تھا۔)

اُموی دور میں غزل کی جو شاعری ہوئی اس میں پاکیزہ محبت (الھوی العذری) کا سب سے معروف نمونہ یہی جمیل ہے' جس کا بثینہ کے ساتھ عشق کا قصہ اتنا عام ہوا کہ لوگوں نے اسے اپنی محبوبہ کی نسبت سے جمیل بثینہ کہنا شروع کر دیا' اور وہ عموماً اسی نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ عشاق کے اس قبیلے کے کچھ اور افراد بھی مشہور ہوئے اور اسی طرح ان کا نام ان کی محبوباؤں کے ناموں کے ساتھ لیا جانے لگا۔ مثلاً کثیر' کہ جس کی محبوبہ عزّہ تھی اور وہ اس نسبت سے کثیر عزّہ مشہور ہے۔ یہ بھی غزل کا شاعر تھا' اگرچہ اس کے ساتھ اس نے مدح کی شاعری بھی کی اور اس سے کچھ مالی منفعت حاصل کی۔ ایک اور اسی طرح کا جوڑا قیس بن الملوّح اور اس کی محبوبہ لیلیٰ کا ہے' جو آگے چل کر لیلیٰ مجنون کے نام سے مشہور ہوا اور اس نے عربی اور فارسی دونوں زبانوں میں ایک افسانے یا اُسطور کی صورت اختیار کر لی۔ حالانکہ اس عشقیہ کہانی کے یہ دونوں کردار حقیقی تھے۔ بعد میں ان کی زندگی کے بارے میں جو واقعات بیان کیے گئے وہ اکثر من گھڑت تھے۔ اسی طرح کا ایک اور عاشق قیس بن ذریح نامی تھا' جس نے اپنی محبوبہ لُبنیٰ کے لیے غزل کی شاعری کی تھی۔

غزل کی شاعری کا دوسرا اہم نمائندہ عمر بن ابی ربیعہ ہے۔

## عمر بن ابی ربیعہ (م ۷۲۰)

ابوالخطّاب عمر بن عبداللہ ابی ربیعہ کا تعلق قریش کی شاخ بنو مخزوم سے تھا۔ اس نے مدینے میں اسی رات جنم لیا جس رات خلیفۂ ثانی عمر بن الخطاب ؓ کا انتقال ہوا۔ چنانچہ کہا جاتا تھا کہ "ایُّ حقٍ رُفع و ایُّ باطلٍ وُضع" (کیسا حق اس دنیا سے اٹھا لیا گیا اور کیسا باطل پیدا ہو گیا) وہ قریش کا سب سے بڑا شاعر تھا اور غزل کے موضوع پر اس نے سب سے زیادہ لطیف و نفیس شاعری کی اور عورتوں کے احوال کا بیان جو اس نے کر دکھایا وہ کسی نے نہ کیا۔


Scanned with CamScanner

عمر کی ماں عیسائی تھی اور اس کا باپ عبداللہ جو ایک مالدار تاجر تھا' آنحضرتؐ کے زمانے میں عامل رہا تھا اور ان کے بعد تین خلفاء کے لیے بھی اس نے اسی منصب پر کام کیا۔ چنانچہ عمر ابن ابی ربیعہ نے ایک معزز اور خوشحال گھرانے میں آنکھ کھولی اور اس کی زندگی شروع ہی سے پُر آسائش اور ہر قسم کی ذمہ داری سے آزاد رہی۔ طبیعت میں شعر کا ملکہ فطری تھا' چنانچہ اس نے بچپن ہی میں شعر کہنے شروع کر دیئے اور اس میں اس نے غزل کا راستہ اختیار کیا۔ اس کی شاعری کا مرکزی موضوع حسین عورتیں رہیں اور ان کا باہمی میل جول اور آپس کی چھیڑ چھاڑ! چنانچہ ان کے محاورۂ کلام کو جس بے تکلفی اور بے حجابی سے وہ شعر کا جامہ پہنا دیتا تھا' اس سے پہلے کوئی نہ پہنا سکا تھا۔ بڑے شعراء اس طرح کی باتوں کو اہمیت نہیں دیتے تھے۔ اسی لیے شروع میں جریر اور فرزدق جیسے اکابر نے اس نوجوان کی شاعری کو نظرانداز کیا اور اسے مدینہ کے آوارہ لوگوں کے ہذیان سے زیادہ وقعت نہ دی۔ لیکن عمر نے شعرگوئی کی مشق جاری رکھی اور شاعری کے اسالیب اور قوافی کو رام کرنے کی کوشش میں لگا رہا' یہاں تک کہ اسے اچھا شعری ملکہ حاصل ہوگیا اور جب اس نے اپنے خاص انداز کی یہ رائیہ نظم کہی جس کا مطلع تھا:

أمن آل نُعم انت غادٍ فمبكر　　غداةَ غدٍ أم رائحٌ فمهجّرُ

(کیا تم آلِ نُعم سے کل صبح سویرے ہی چل دو گے' یا رات پڑنے پر نکلو گے اور پھر دن کی گرمی میں بھی سفر کرو گے؟)

تو اسے سن کر جریر کہہ اٹھا کہ یہ قریشی نوجوان یاوہ گوئی کرتے کرتے آخر شعر کہنے لگ گیا۔ اہل عرب جو شاعری کے سوا باقی ہر میدان میں قریش کی فضیلت کے معترف تھے' اب عمر بن ابی ربیعہ کے منظر پر نمودار ہونے کے بعد وہ شاعری میں بھی قریش کا مرتبہ تسلیم کرنے لگے۔

شاعری میں ابن ابی ربیعہ نے ایک نئی راہ نکالی جو اس سے پہلے کسی کو نہیں سوجھی تھی۔ اس نے اپنی شاعری کو عورتوں کے حُسن و جمال کے بیان' ان کے ایک دوسرے سے میل ملاپ اور آپس کی ہنسی مذاق اور دل لگی کے تذکرے تک محدود کر دیا اور اس کے لیے اس نے خوبصورت الفاظ اور جدید اسلوب سے کام لیا۔ چنانچہ گانے والے اور مجلسی لوگوں میں یہ شاعری بہت مقبول ہوئی اور مغنیات اور عیش و طرب کے ساتھی اسے لے اُڑے۔ لوگوں نے ابن ابی ربیعہ کی شاعری کو بہت گایا اور دور دور تک اس کی روایت کی' یہاں تک کہ غیرت مند اور پارسا لوگ اس سے عاجز آ گئے اور ابن جریج کو کہنا پڑا کہ "خاندانی عورتوں کے نہاں خانوں میں ابن ابی ربیعہ کے شعروں سے زیادہ مضر چیز نہیں پہنچی۔" پھر شاعر نے اسی پر بس نہ کی' بلکہ وہ حج پر جانے والی حسیناؤں کا تعاقب بھی کرنے لگا' اور امیر زادیوں اور معزز عورتوں کے


Scanned with CamScanner

ساتھ اپنی شاعری میں اظہارِ عشق کرنے لگا۔ وہ ان کا ایسی حالت میں سراپا بیان کرتا جب وہ احرام باندھے طواف کی حالت میں ہوتیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ معزز گھرانوں کی خواتین نے حج کے لیے نکلنا بند کر دیا کہ کہیں اس آوارہ شاعر کی توجہ ان کی طرف نہ ہو جائے۔ اس وقت کے اربابِ اختیار کو اس صورت حال کا علم تھا' لیکن وہ اس سے اس لیے صرفِ نظر کرتے رہے کہ ابن ابی ربیعہ معزز قبیلے قریش کا فرد تھا اور شاعری بہت اچھی کر رہا تھا۔ پھر انہیں یہ بھی اُمید تھی کہ وہ جلد ہی اپنی ان حرکتوں سے توبہ کر لے گا۔ لیکن جب اموی خلیفہ عمر بن عبدالعزیزؒ کا وقت آیا تو وہ اس شاعر کی آوارگی اور دل لگی بازی کو برداشت نہ کر سکے اور اسے جلاوطن کر کے ایک مقام دہلک بھجوا دیا' جو یمن اور حبشہ کے درمیان واقع بحر احمر کا ایک جزیرہ ہے۔ بنو اُمیہ کے زمانے میں جب کوئی جلاوطن ہوتا تھا تو وہ اسی جگہ بھجوایا جاتا تھا۔ چنانچہ ابن ابی ربیعہ اس وقت تک واپس نہ آیا جب تک اس نے قسم نہ کھا لی کہ اپنی اس عشق بازی سے باز آ جائے گا اور اللہ کے حضور خلوصِ دل سے توبہ کرے گا۔ شاید اب اس کی عمر بھی بڑھ چلی تھی' اس لیے وہ اپنی اس قسم پر قائم رہنے میں کامیاب ہوا۔ اس نے باقی زندگی میں نیکی اور زہد کا راستہ اختیار کر لیا۔ بعض لوگوں کا خیال ہے کہ عمر بن ابی ربیعہ بدچلن نہیں تھا۔ وہ حسن و عشق کے معاملات کا ذکر ضرور کرتا تھا' لیکن غلط کاموں میں ملوث نہیں ہوتا تھا۔ کہتے ہیں کہ جب وہ مرض الموت میں مبتلا ہوا تو اس کا بھائی حارث اس پر بہت افسوس اور رنج و غم کا اظہار کرنے لگا۔ عمر نے اس سے کہا: میرا خیال ہے تم اس لیے افسوس کر رہے ہو کہ تمہارا میرے متعلق جو گمان رہا ہے اسے تم صحیح سمجھتے ہو۔ لیکن خدا کی قسم' مجھے نہیں معلوم کہ میں نے زندگی میں کبھی گناہ کا ارتکاب کیا ہو۔ اس کے بھائی نے کہا: یہی بات تھی جس سے میں خوفزدہ تھا۔ اب تم نے میری پریشانی دور کر دی ہے۔

عمر کے انجام سے متعلق ایک اور روایت ابن قتیبہ کی ''الشعر والشعراء'' میں ملتی ہے۔ جس کے مطابق وہ ۱۱۷ء میں جہاد کی ایک سمندری مہم میں شامل ہوا۔ جس کشتی میں وہ سوار تھا اسے آگ لگ گئی اور اس کا جسم اس میں جل گیا۔

**شعری رویہ:** اموی دور سے پہلے کوئی بھی شاعر اُس وقت تک نام پیدا نہیں کرتا تھا جب تک وہ مدح اور ہجو نہ کہہ لے' اور ایک قبیلے کو آسمان پر اور دوسرے کو پاتال میں نہ پہنچا دے۔ چنانچہ اس شاعر کے ان مدحیہ اور ہجویہ قصائد کی بنا پر شعراء کی صف میں اس کا مرتبہ متعین ہوتا تھا۔ ابن ابی ربیعہ نے آ کر یہ سارا دستور ہی بدل دیا۔ اس کا شمار اونچے طبقے کے شعراء میں تو نہیں ہوتا تھا' لیکن اس نے غزل کے موضوع پر ایسی شاعری کی کہ اس کے معاصر اس سے حسد کرنے لگے اور فرزدق اور جریر جیسے اکابر شعراء



Scanned with CamScanner

نے اس کی شاعری کو تسلیم کیا۔ اس سے یہ ہوا کہ غزل جو اس سے پہلے شاعری کے دوسرے موضوعات کے تابع ہوتی تھی یا شاعر کے لیے اپنے مقصد کے حصول کا محض ایک ذریعہ ہوتی تھی' اب ایک مستقل فن کی صورت اختیار کر گئی اور اس فن کے شعراء الگ سے پہچانے جانے لگے۔ اپنے اس نئے رویئے کی بدولت ابن ابی ربیعہ نے اپنی شاعری کو عورت میں محدود کر لیا۔ وہ مدح بھی کرتا تھا تو کسی نہ کسی حسینہ کے حسن و جمال کی اور زندگی اس کو وہی پسند تھی جو محبت اور دل لگی اور عیش و عشرت کی محفلوں میں گزرے۔ عمر جوان تھا' خوبصورت تھا' اچھا شاعر تھا' بڑے قبیلے کا فرد تھا اور خوشحال تھا۔ ان سب باتوں نے مل کر اس کے لیے عیش و طرب کی سب راہیں آسان کر دیں اور وہ جہاں چاہتا پہنچ جاتا اور حسین عورتوں کا قرب حاصل کرنے اور ان کے بارے میں شعر کہنے کا کوئی موقع ہاتھ سے نہ جانے دیتا۔ کچھ عرصے تک تو اس کی خاندانی وجاہت کی وجہ سے لوگ اسے برداشت کرتے رہے' لیکن پھر اسے اس شغل سے منع کیا جانے لگا اور خاندانوں یا علاقے کے والیوں کی طرف سے اسے دھمکیاں دی جانے لگیں۔ چنانچہ ایک دفعہ خود قبیلہ قریش کے بنی تیم بن مرّہ عورتوں کے بارے میں اس کی اس عاشقانہ شاعری پر سخت برہم ہوئے۔ پھر ایک دفعہ حجاج بن یوسف نے اسے لکھا کہ اگر اس نے عبدالملک بن مروان کی بیٹی فاطمہ کا ذکر اپنے شعروں میں کیا تو اس کو سخت سزا دی جائے گی۔ اغانی نے اموی خلیفہ عبدالملک کی اسی بیٹی فاطمہ کا یہ واقعہ نقل کیا ہے کہ جب عمر کو حجاج کی یہ دھمکی پہنچی تو وہ حج کے موقع پر خاموش رہا حالانکہ شہزادی اس انتظار میں تھی کہ ابن ابی ربیعہ اس کے بارے میں کچھ کہے گا۔ ایک دفعہ وہ باہر نکلی تو اسے ایک شخص ملا۔ اس سے پوچھا: تم کون ہو؟ تو وہ کہنے لگا: میں مکے کا رہنے والا ہوں۔ اس پر فاطمہ بولی: تم پر اور سب اہلِ مکّہ پر اللہ کی لعنت ہو۔ "وہ کس لیے؟" اس آدمی نے پوچھا۔ تو کہنے لگی: میں نے حج کیا اور مکے میں ایسی ایسی حسین لونڈیوں کے ساتھ داخل ہوئی کہ جنہیں زمانے کی آنکھ نے نہ دیکھا ہو گا اور اس فاسق ابن ابی ربیعہ سے اتنا نہ ہو سکا کہ ہمیں ایسے شعروں کا تحفہ دے دیتا جس سے ہم اپنے واپسی کے سفر میں دل بہلاتے جاتے۔ وہ آدمی کہنے لگا کہ اشعار تو اس نے کہے ہیں۔ اس پر فاطمہ بولی: تو پھر وہ شعر لے آؤ اور ہمیں سناؤ اور ہر شعر پر دس دینار تمہارے ہوں گے۔ چنانچہ اس نے شاعر کی وہ نظم سنائی جس کا مطلع ہے:

راع الفؤادَ تفرُّقُ الاحباب　　　یومَ الرحیل' فهاج بی اطرابی

(سفر والے دن احباب کے چل دینے کے خیال سے دل گھبرایا تو میرے شوق کے سارے جذبات بھڑک اُٹھے)

لیکن اس مختصر نظم میں اس نے اس کے باپ اور حجاج کے ڈر کے مارے کہیں فاطمہ کا نام نہ لیا۔


Scanned with CamScanner

**شاعری :** ابن ابی ربیعہ کی شاعری میں سلاست ہے' الفاظ کی خوبصورتی ہے' بیان کا حسن ہے' گرفت ہے' اور مفہوم کی آسانی ہے۔ نیز حسن کی تعریف اور عورت کے سراپا کے بیان میں ایسی دلآویزی ہے کہ ان ساری باتوں کی وجہ سے وہ سیدھا دل میں اترتی ہے اور نفس کو متاثر کرتی ہے۔ اس کے اعلیٰ نسب' بھرپور جوانی اور امارت اور خوشحالی نے اسے اس سلسلے میں وہ کچھ کہنے کا حوصلہ دیا جو دوسروں سے نہ کہا جا سکا۔ چنانچہ اس نے غزل کے موضوع میں قصہ گوئی داخل کر دی۔ وہ عورتوں کا احوال بیان کرتا اور ان کی بات چیت اور آپس کی چہلوں اور ہنسی مذاق کا تذکرہ کرتا۔ پھر ان کے ساتھ اپنی گفتگو اور چھیڑ چھاڑ کا قصہ سناتا۔ یہ سب کچھ دیکھ کر لوگ حیران رہ گئے اور انہیں یہ اقرار کرتے بنی کہ قریش کا یہ نوجوان صحیح معنی میں شاعر ہے اور جریر نے تو یہاں تک کہا کہ ھذا واللّٰہ الذی ارادتہ الشعراء فاخطأتہ و تعللت بوصف الدیار (واللہ یہی چیز تو شعراء کہنا چاہتے تھے' لیکن نہ کہہ سکے اور محبوبہ کے دیار کی باتیں کر کے رہ گئے۔)

لیکن عمر بن ابی ربیعہ کی شاعری میں ایک نمایاں کمی یہ ہے کہ اس میں محبت کا وہ گہرا شعور اور لطیف بیان نہیں ملتا جو جمیل اور کثیرؔ کی شاعری میں پایا جاتا ہے۔ عمر تو عورتوں کا بس پیچھا کرنے والا ہے۔ اس کی خوشی محض اس بات میں ہے کہ ان کے ساتھ مل کے بیٹھے' ان سے باتیں کرے اور ان کے سامنے بن ٹھن کے جائے۔ بجائے اس کے کہ ان میں سے کسی کے سامنے اپنا دل کھول کے رکھ دے۔ سوائے غالباً ثریا بنت علی بن عبداللہ کے ساتھ اس کے تعلق کے جس کو دیکھ کے لگتا ہے کہ وہ شاید محبت کا معاملہ تھا۔

**نمونۂ کلام :**

امن آل نُعم انت غادٍ فمبکر — غداۃً غدٍ ام رائح فمھجّر
تھیم الی نعم' فلا الشمل جامع — ولا الحبل موصول ولا القلب مُقصر
اشارت بمدراھا و قالت لاختھا — أھذا المغیریّ الذی کان یُذکر
اھذا الذی أطریت نعتاً فلم اکن — و عیشک انساہ الی یوم اُقبر
لئن کان ایّاہ لقد حال بعدنا — عن العھد والانسان قد یتغیّر
رأت رجلاً اما اذا الشمس عارضت — فیضحی واما بالعشیّ فیخصر
اخاسفرٍ جوّاب ارض تقاذفت — بہ فلوات فھم أشعث اغبر

☆☆☆

فلمّا تقضی اللیلُ الا أقلّہ — وکادت توالی نجمہ تغوّر

فقالت لأختيها أعينا على الفتی ‏ أتی زائراً والامر للامر یُقدر
فأقبلتا، فارتاعتا، ثم قالتا ‏ أقلّی علیکِ اللوم فالخطب أیسر
فقالت لها الصغری سأعطیه مطرفی ‏ ودرعی و هذا البرد ان کان یحذر
یقوم فیمشی بیننا متنکرًا ‏ فلاسرّنا یفشو ولا هو یظهر
فکان مِجنّی دون من کنت اتقی ‏ ثلاث شخوص : کاعبان و مُعصر
فلمّا اجزنا ساحة الحیّ قلن لی ‏ الم تتق الاعداء واللیل مقمر
وقلن : اهذاد أبک الدهر سادراً ‏ اما تستحی، ام ترعوی، ام تفکر
اذا جئت فامنح طرف عینیک غیرنا ‏ لکی یحسبوا ان الهوی حیث تنظر
هنیئاً لاهل العامریة نشرها اللذیذ ‏ وریّاها التی اتذکّر

(کیا تم آلِ نعم سے کل صبح سویرے ہی چل دو گے، یا رات پڑنے پر نکلو گے اور پھر دن کی گرمی میں بھی سفر کرو گے۔

تم نُعم کی الفت میں گرفتار ہو نہ تو اس سے مل پائے ہو نہ اس سے کوئی تعلق قائم ہے اور نہ دل اس چاہت سے باز آنے والا ہے۔

اس نے اپنی کنگھی سے اشارہ کرتے ہوئے اپنی بہن سے کہا: کیا یہی وہ مغیری (ابن ابی ربیعہ) ہے جس کا نام لیا جا رہا تھا۔

کیا یہی ہے جس کی تو نے اتنی تعریف کی کہ مجھے لگا کہ جیسے میں اسے مرتے دم تک نہیں بھول پاؤں گی۔

اگر وہ وہی ہے تو ہمارے بعد اپنی پہچان میں کچھ بدل گیا ہے، اور انسان میں تبدیلی تو آتی ہی رہتی ہے۔

اس نے ایک ایسے شخص کو دیکھا کہ جب سورج اس کے سامنے ہوتا تو اسے پسینہ آ جاتا اور جب رات ہوتی تو وہ ٹھنڈک محسوس کرتا۔

بہت سفر کرنے والا، زمین میں گھومنے پھرنے والا، صحراؤں سے نکل کے آیا ہے تو اس کے بال بکھرے ہوئے ہیں اور چہرہ غبار آلود ہے۔

☆☆☆

جب رات گزر چکی سوائے چند ساعتوں کے اور اس کے آخری ستارے بھی غائب ہونے لگے۔
تو وہ اپنی دو بہنوں سے کہنے لگی: اس نوجوان کے معاملے میں میری مدد کرو جو مجھ سے ملنے کے لیے آیا ہے، اور جب کوئی ایک قدم اٹھاتا ہے تو اس کا جواب دوسرا قدم ہوتا ہے۔

تو وہ دونوں آئیں، پہلے تو کچھ گھبرائیں اور پھر کہنے لگیں: اپنے آپ کو زیادہ الزام نہ دو، اس لیے کہ مسئلہ اتنا بھی گمبھیر نہیں ہے۔

پھر چھوٹی نے اس سے کہا: میں تو اس کو یہ چادر، یہ زنانہ قمیص اور یہ کڑھا ہوا کپڑا دوں گی، اگر وہ واقعی احتیاط کرنا چاہتا ہے۔

تو وہ اُٹھ کھڑا ہوگا اور ہمارے درمیان بھیس بدل کر چل پڑے گا۔ نہ ہمارا راز فاش ہوگا اور نہ وہ ظاہر ہوگا۔

تو جن لوگوں سے میں بچنا چاہتا تھا ان کے مقابلے میں تین شخص میری ڈھال بنے ہوئے تھے: دو نوجوان لڑکیاں اور ایک جوان عورت۔

جب ہم قبیلے کی حویلی سے گزر آئے تو وہ مجھ سے کہنے لگیں: تمہیں اس چاندنی رات میں اپنے دشمنوں سے ڈر نہیں لگا۔

کہنے لگیں: کیا تمہاری ہمیشہ سے یہی عادت ہے بے پروائی کی۔ تمہیں حیا نہیں آتی، تم گمراہی سے باز نہیں آتے اور کچھ فکر نہیں کرتے۔

جب تم آؤ تو اپنی نگاہیں دوسروں کی طرف کرنا تاکہ لوگ سمجھیں کہ تمہاری دلچسپی وہاں ہے جہاں تم دیکھ رہے ہو۔

کیا بات ہے عامری قبیلے والوں کی سانسوں کی مہک کی اور ان کی اس خوشبو کی جو مجھے اب تک یاد ہے۔)

اوپر کی یہ نظم اپنی کہانی، واقعات اور مکالمات کے ساتھ ابن ابی ربیعہ کے اسلوب شعر کی بہت اچھی نمائندگی کرتی ہے۔ جبھی اوپر اس کا ایک طویل اقتباس دیا گیا۔

ہند کے بارے میں وہ اپنی ایک نظم میں کہتا ہے:

لیتَ هنداً أنجزتنا ماتعِد — و شفَتْ انفسنا مما تجد
واستبدَّت مرة واحدة — انما العاجز من لم يستبدّ
زَعَمُوها سألت جارَاتها — و تعرَّت ذات يوم تَبْتَرِد
اكما ينعتني تُبصِرنني — عمر كنَّ الله ام لا يقتصد
فتضاحكن، و قد قُلن لها — حسن في كل عين من تودّ
حسد حُمِّلنه من اجلها — و قديماً كان في الناس حسد

(کاش ہند نے جو وعدہ کیا تھا اسے پورا کرتی، اور ہم پر جو گزر رہی ہے اس کا مداوا کرتی۔
اور جو من مانی کرنی تھی وہ ایک ہی دفعہ کر لیتی، عاجز انسان تو من مانی نہیں کر سکتا۔

کہتے ہیں اس نے اپنے ساتھ والیوں سے ایک دن پوچھا' جب اس نے ٹھنڈے پانی میں نہانے کے لیے کپڑے اتارے تھے۔

کیا جس طرح وہ میرا وصف بیان کرتا ہے مجھے تم ویسا ہی دیکھتی ہو'یا وہ صحیح بات نہیں کرتا۔

تو وہ ہنس پڑیں اور کہنے لگیں: ہر آنکھ جس کو چاہتی ہے وہ اسے خوبصورت ہی لگتا ہے۔

وہ دراصل حسد تھا جو اُن کو اس سے ہو گیا تھا اور حسد کی بیماری تو انسان میں قدیم سے ہے۔)

جن عورتوں کے بارے میں عمر بن ابی ربیعہ نے عشقیہ اشعار کہے تھے ان میں ایک عائشہ بنت طلحہ بھی تھی جو حسن و جمال اور عقل و دانش میں مشہور تھی۔ عمر نے اسے طواف کی حالت میں دیکھ لیا تھا اور وہ جان گئی تھی کہ اب وہ اس کے بارے میں عشقیہ شعر کہنے سے باز نہیں رہے گا۔ چنانچہ اس نے اپنی ایک لونڈی کے ہاتھ اسے یہ پیغام بھجوایا کہ ''اللہ سے ڈرنا اور کوئی ناشائستہ بات نہ کہنا۔'' عمر نے جواب دیا: اسے سلام دینا اور کہنا کہ تمہارا ابن عم صرف اچھی بات ہی کہے گا۔ چنانچہ اس نے کچھ شعر کہے' جن میں سے چند یہ ہیں:

لعائشة ابنة التيمي عندي ... حمىً في القلب لا يُرعى حماها

يذكّرني ابنةَ التيمي ظبيٌ ... يرود بروضةٍ سهلٍ رُباها

فقلتُ له و كاد يُراع قلبي ... فلم ارقط كاليوم اشتباها

سوى حَمش بساقك مستبين ... وأن شوَاك لم يشبه شواها

وانك عاطل عارٍ وليست ... بعارية ولا عُطُل يداها

(تیمی کی بیٹی عائشہ کے لیے میرے ہاں دل میں ایک محفوظ چراگاہ ہے جس میں کوئی دوسرا آ کے نہیں چر سکتا۔

مجھے تیمی کی بیٹی کی یاد دلاتا ہے ایک ہرن' جو نرم و ہموار ٹیلوں والے ایک باغ میں چرتا پھرتا ہے۔

میں نے اُس (ہرن) سے کہا۔ اس وقت میرا دل شدت حسن سے مبہوت تھا...... کہ میں نے آج کی سی مشابہت پہلے کبھی نہیں دیکھی۔

سوائے اس دُبلے پن کے جو تیری پنڈلی میں ہے اور سوائے تیرے ہاتھ پیروں کے جو اس کے ہاتھ پیروں جیسے نہیں ہیں۔

اور یہ کہ تو یکسر بے زینت و بے لباس ہے' جبکہ وہ نہ بے لباس ہے اور نہ اس کے ہاتھ زیور سے خالی ہیں۔)

ان شعروں میں عمر نے پہلے غزالِ رعنا کے مبہوت کر دینے والے حسن کو بیان کیا اور پھر اسے عائشہ

کے ساتھ تشبیہ دیتے ہوئے عائشہ کے حسن کی برتری کے پہلو نکال لیے اور غزال کو اس کے مقابلے میں ہیچ ثابت کر دیا۔

☆......☆......☆

بنو اُمیہ کے عہد میں دوسری طرح کی شاعری مناسباتی شاعری تھی' جسے انگریزی میں Occasional Poetry کہنا چاہیے' جو حالات اور مواقع کی مناسبت سے اور خاص مقاصد کے لیے کی جاتی تھی اور اس سے اس وقت کی تاریخ پر خاصی روشنی پڑتی ہے۔ ہوا یہ تھا کہ شاعری نے اب حجاز اور شام کے معاشرتی اور سیاسی مراکز سے دور عراق میں اپنے قدم جما لیے تھے۔ یہ شاعری اگرچہ ہیئت اور طرزِ اظہار میں ایک طرح سے جاہلی شاعری کا تسلسل ہی تھی لیکن نئے زمانے اور بدلے ہوئے حالات کی وجہ سے یہ اپنے اظہار میں زیادہ واضح' صاف اور پابند موضوع ہوتی تھی۔ اسلام نے آ کر عربوں کو جس نئی زندگی سے آشنا کیا تھا' یہ شاعری اس کا مظہر تھی۔ چنانچہ جوں جوں ان کی تمدنی زندگی میں پھیلاؤ آتا گیا' توں توں اسے مختلف مقاصد کے لیے استعمال کیا جانے لگا۔ کبھی تو یہ افراد کے درمیان ہجو گوئی کی صورت اختیار کرتی تھی' کبھی مذہبی اور سیاسی گروہوں کے درمیان مقابلے بازی کا کام دیتی تھی۔ کبھی یہ جاہلی دور کی طرح قبائل کے درمیان فخر و مباہات اور ایک دوسرے پر اپنی فوقیت جتانے کا وسیلہ بنتی تھی اور اس کے ساتھ ساتھ یہ خلفاء اور امراء کی مدح کے لیے بھی استعمال ہوتی تھی اور اس صنف میں اس نے بہت نادر نمونے پیش کیے۔ یہ سب موضوعات ایسے تھے کہ ان کے لیے شاعری میں شوکتِ الفاظ' دبدبہ' طاقتور اسلوب اور بادیۂ عرب کا خالص اور بے میل محاورہ درکار تھے۔ چنانچہ ان ضرورتوں کو پورا کرنے کے لیے جو شاعر خصوصیت کے ساتھ ادبی افق پر نمایاں ہوئے وہ تین بڑے شاعر: اخطل' فرزدق اور جریر تھے اور کوئی شک نہیں کہ انہوں نے اپنے اپنے انداز میں شاعری کا ایسا اعلیٰ معیار قائم کر کے دکھایا کہ عربی شاعری جو اسلام کے اوائل زمانے میں دب کر رہ گئی تھی' اب پھر سے ایک زوردار اور توانا صورت میں اُبھر کر سامنے آئی اور اس نے بعض باتوں میں مختلف ہوتے ہوئے بھی' جاہلی دور کی شاعری کی یاد تازہ کر دی۔

یہ مناسباتی شاعری' جسے سیاسی شاعری کا نام بھی دیا جاتا ہے' شروع میں شیعہ اور بنو اُمیہ کی تائید کے لیے میدان میں آئی تھی۔ لیکن بعد میں اس کا دائرہ دوسرے گروہوں اور جماعتوں مثلاً زبیریہ اور خوارج تک پھیل گیا۔ چنانچہ جن شعراء نے بنو اُمیہ کی سیاست کی تائید و حمایت کی ان میں اخطل' فرزدق' جریر اور نُصیب پیش پیش رہے۔ (ان میں سے فرزدق کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ وہ اندر سے شیعہ تھا) اور زبیریوں کے حامیوں میں عبداللہ بن قیس الرقیات کا نام لیا جاتا ہے۔ اگرچہ بعد میں وہ امویوں کی طرف چلے جانے پر مجبور ہوا۔ خوارج کے شعراء میں الطرماح بن حکیم اور عمران بن حطان بڑے نام تھے۔ جن

شعراء نے شیعہ اور مضر والوں کا ساتھ دیا ان میں الکمیت الاسدی کو نمایاں مقام حاصل ہے۔ تاہم کہتے ہیں کہ یہ شاعر بعد میں مروان کی حمایت پر مجبور ہو گیا۔

اُموی دور کے تین بڑے شعراء کوئی شک نہیں اخطل، فرزدق اور جریر ہیں۔ ان تینوں کے فنِ شعر میں اپنے اپنے خصائص ہیں اور کسی ایک کے حق میں یہ فیصلہ دینا دشوار ہے کہ وہ باقی دونوں پر فائق تھا۔ تاہم مختلف اصناف سخن میں بیک وقت رواں ہونے کے باعث ناقدینِ فن بسا اوقات جریر کو زیادہ مکمل شاعر تسلیم کرتے ہیں۔ اموی دور کی ادبی فضا پر جریر اور فرزدق کا بطور خاص تسلّط رہا۔ اردو ادب کے انشاء و مصحفی کی طرح ان دونوں کے درمیان شدید ہجو گوئی رہتی تھی، جو فحش گفتاری کی حدوں کو پہنچتی تھی۔ تاہم لغت و فن کے اعتبار سے ہجویہ قصائد جو انہوں نے ایک دوسرے کے جواب میں کہے "نقائض جریر و الفرزدق" کے نام سے بڑی اہمیت کے حامل ہیں اور آج تک مشہور ہیں۔ جریر اور فرزدق کی اس جنگ میں اخطل نے بھی فرزدق کی ہمنوائی کی۔ چنانچہ اس کے اور جریر کے "نقائض" یعنی باہمی ہجویہ قصائد بھی محفوظ ہیں۔ فرزدق اور جریر کا پورے معاشرے کی حیاتِ ذہنی پر نہایت گہرا اثر تھا۔ لوگ آپس میں ان کی خاطر کٹتے مرتے تھے۔ لکھنؤ کے "انیسیوں" اور "دبیریوں" کی طرح حامیانِ جریر اور حامیانِ فرزدق کے دھڑے بنے ہوئے تھے۔ جگہ جگہ یہ بحث چلتی رہتی تھی کہ دونوں میں سے کون بڑا شاعر ہے اور دلچسپ حدوں تک پہنچتی تھی۔ فرزدق کے ایک پُر جوش مدّاح نے ہر اس شخص کو جو اُسے جریر سے بڑا شاعر قرار دے چار ہزار درہم اور ایک گھوڑا انعام میں دینے کا اعلان کیا۔ اس سے بھی دلچسپ تر وہ روایت ہے کہ جس کے مطابق مہلّب بن ابی صفرہ نے، جو خارجیوں کے خلاف مصروفِ جنگ تھا، اپنے لشکر کی چھاؤنی میں ایک رات شور وغل سنا۔ پوچھ گچھ پر معلوم ہوا کہ سپاہیوں میں جریر اور فرزدق کے فن پر گرما گرم بحث جاری ہے۔ انہوں نے خود مہلّب کو منصف قرار دینا چاہا مگر مہلّب دونوں شاعروں کے خونخوار جبڑوں سے خائف تھا۔ اس نے خود کچھ فیصلہ کرنے کی بجائے کہا کہ میں تمہیں ایک ایسے شخص کا پتا بتاتا ہوں جو ان دونوں شاعروں کے غضب سے نہیں ڈرتا۔ وہ عبید بن ہلال ہے۔ وہ اس دن خارجی قطری بن الفجاءۃ کے لشکر میں تھا۔ چنانچہ وہ دونوں شخص آئے اور چھاؤنی کے سامنے کھڑے ہو کر اسے آواز دی۔ وہ اپنا نیزہ سنبھالے باہر نکلا، یہ سمجھ کر کہ شاید اسے مقابلے کے لیے بلایا گیا ہے۔ تو یہ اس سے کہنے لگے کہ فرزدق بڑا شاعر ہے یا جریر؟ اس نے جواب دیا: تم دونوں پر اور اُن دونوں پر بھی اللہ کی لعنت ہو۔ انہوں نے کہا: ہم آپ کی رائے سننا چاہتے ہیں، پھر آپ جہاں چاہیں گے ہم واپس چلے جائیں گے۔ اس نے جواب دیا کہ بڑا شاعر وہ ہے جو کہتا ہے:

وطوی القیادُ مع الطراد بطونها　　　طیَّ التجار بحضر موت برودا

(اس نے گھوڑوں کے پیٹ رسی سے اس طرح باندھ دیے جیسے تاجر حضرموت میں چادروں کو لپیٹتے ہیں۔)

انہوں نے کہا: یہ تو جریر کا شعر ہے۔ اس نے جواب دیا: وہی ان دو میں سے بڑا شاعر ہے۔

# اخطل (م ۷۱۴ء)

نام غیاث بن غوث، کنیت ابو مالک، لقب اخطل۔ بنو تغلب کے نصرانی خاندان سے تھا۔ وہ بنو اُمیہ کا شاعر تھا اور اس عہد کے تین بڑے شاعروں میں سے سب سے بہتر مدح گو تھا۔ نیز شراب کے موضوع پر اس کے شعروں کی گہرائی کو زمانۂ اسلام کا کوئی دوسرا شاعر نہ پہنچ سکا۔

وہ جزیرے میں اپنے قبیلے بنو تغلب میں، اس قبیلے کے اکثر افراد کی طرح نصرانی مذہب پر پروان چڑھا۔ وہ ابھی چھوٹا تھا کہ اس کی ماں فوت ہوگئی۔ چنانچہ اس کی تربیت سوتیلی ماں کے ہاتھوں ہوئی جس نے اسے کوئی اچھی تربیت نہ دی۔ نتیجہ یہ کہ وہ ایک زبان دراز، بدطینت اور شرابی بن کر بڑا ہوا، اور لڑکپن ہی میں شعر کہنے لگ گیا۔ اس نے بنو تغلب کے بڑے شاعر کعب بن جُعیل کے ساتھ ٹکر لی اور اس کو ہرا دیا۔ چنانچہ اس کے شاعر ہونے کا چرچا ہونے لگا۔ اموی دربار تک اس کی رسائی یوں ہوئی کہ حضرت حسان بن ثابتؓ کے لڑکے عبدالرحمان بن حسان نے شعرائے عرب کی روایت پر چلتے ہوئے یزید بن معاویہ کی بہن رملہ کا ذکر تشبیب کے اشعار میں کر دیا۔ اس پر یزید سخت برہم ہوا اور کعب بن جُعیل سے کہا کہ انصار مدینہ کی ہجو کہے۔ کعب مسلمان تھا، اس لیے وہ آنحضرتؐ کے انصار کی ہجو کرنے پر آمادہ نہ ہوا اور یزید کو اخطل کا نام بتایا، اس امید پر کہ وہ ان کی ہجو کرے گا تو وہ اسے اس کی سزا دیں گے۔ اس طرح یہ واقعہ اخطل کا ستارہ چمکنے اور اس کا نام مشہور ہونے کا سبب بنا۔ وہ یزید کے بلاوے پر اس کے پاس آیا اور اپنی ایک نظم میں انصار کی ہجو کی، جس کے دو شعر یہ ہیں:

ذهبت قريش بالسماحة والندى    واللوم تحت عمائم الانصار

فدعوا المكارم لستمُ من اهلها    وخذوا مساحيكم بني النجّار

(عالی ظرفی اور فیاضی تو قریش کا شعار ٹھہرا اور ملامت انصار کی دستاروں میں رہ گئی۔
بڑے کاموں کا خیال چھوڑو کہ تم ان کے اہل نہیں ہو، اے بنی نجار، بہتر ہے تم اپنے رندے سنبھال لو)

انصار نے اپنی یہ ہجو سنی تو بہت برافروختہ ہوئے اور معاویہ کے پاس جا کر اخطل کی شکایت کی۔ انہوں نے ان سے شاعر کی زبان کاٹنے کا وعدہ کیا۔ لیکن یزید نے بیچ میں پڑ کر انہیں راضی کر لیا اور اخطل کو معافی دلا دی۔ بعد میں جب یزید خلیفہ ہوا تو اس نے اخطل کو اپنے پاس بلا لیا اور یزید کے بعد آنے والے اموی حکمرانوں نے بھی اس کی سرپرستی کی‘ خاص طور پر عبدالملک بن مروان نے‘ جو اخطل کو قبیلہ مضر اور اس کے شاعروں کے خلاف استعمال کرنے لگا‘ اس لیے کہ وہ اس کے سیاسی دشمنوں آل زبیر کی طرف ہو گئے تھے۔ چنانچہ اخطل نے عبدالملک کی مدح میں ایسے ایسے قصائد کہے جن کی نظیر اس زمانے میں کوئی دوسرا شاعر پیش نہ کر سکا۔ اس پر خلیفہ نے اخطل کو بہت سے انعامات سے نوازا اور اپنا مقرب بنا لیا اور اسے اجازت دے دی کہ وہ جب چاہے بلا روک ٹوک اس کے پاس آ جایا کرے۔ عبدالملک نے اسے ''شاعر الخلیفہ'' کا خطاب دیا اور ایک روایت کے مطابق ایک غلام اس کے ہمراہ کیا جو جابجا مجمع عام میں جا کر منادی کرتا تھا کہ ''یہ امیر المومنین کا شاعر ہے‘ یہ کل عرب کا شاعر ہے۔'' اخطل اب بے روک ٹوک عبدالملک کے پاس آتا تھا۔ وہ ریشمی عبا پہنے‘ گلے میں سونے کی صلیب لٹکائے دربار میں چلا آتا‘ اس حال میں کہ شراب اس کی داڑھی سے ٹپک رہی ہوتی۔ اہل اسلام کا دل اس پر بہت کڑھتا‘ لیکن وہ کیا کر سکتے تھے‘ اس لیے کہ وہ شاعر دربار تھا اور اسے خلیفہ کی پناہ حاصل تھی۔

جریر اور فرزدق کی باہمی چپقلش میں اخطل کی مداخلت کا قصہ یوں ہے کہ عبدالملک کے بھائی بشر بن مروان نے ایک روز جریر اور فرزدق کی موجودگی میں اخطل سے کہا کہ فرزدق اور جریر کے درمیان فیصلہ کرو۔ اخطل نے کہا: اے امیر! مجھے اس سے معاف رکھیے۔ بشر نے اصرار کیا تو اخطل کو کہنا پڑا۔ ''الفرزدق ینحت من صخرٍ و جریر یغرف من بحرٍ'' (فرزدق پتھر تراش کر مضمون باندھتا ہے اور جریر چشمے سے چلو بھر کے پانی پیتا ہے۔) اب جریر کو یہ فیصلہ پسند نہ آیا کہ اس میں فرزدق کے افضل ہونے کا اشارہ ملتا تھا۔ چنانچہ اس نے اخطل کی ہجو کہہ ڈالی اور اس میں کہا:

یا ذا الغباوة ان بشرا قدقضی　　　الا تجوز حکومة النشوان

(اے غبی انسان امیر بشر نے فیصلہ کیا ہے کہ نشہ کرنے والے کے لیے کوئی حکم لگانا جائز نہیں۔)

اخطل نے اس کا جواب دینے کی کوشش کی‘ لیکن بڑھاپے اور کمزوری کی وجہ سے بات نہ بن سکی۔ جریر نے اس بات کا اقرار کرتے ہوئے اپنے بیٹے سے کہا۔ ''میں نے اس کی ہجو ایسے وقت کی جب اس کے منہ میں ایک ڈاڑھ تھی۔ اگر اس کے منہ میں دو ڈھاڑیں ہوتیں تو وہ مجھے کچا چبا جاتا۔'' اخطل کو بنو امیہ کا قرب حاصل رہا‘ تا آنکہ عادل عمر بن عبدالعزیز نے اسے دور بھجوا دیا۔ اس کے بعد وہ کبھی دمشق

میں اور کبھی جزیرہ جا کے اپنے قبیلے میں رہنے لگا۔ وہ خلیفہ ولید بن عبدالملک کی خلافت کے اوائل میں ستر سال کی عمر کو پہنچ کر ۷۱۰ء میں فوت ہوا۔

**شاعری:** اخطل اپنے دور کے تین سربرآوردہ شعراء میں سے ایک تھا۔ دوسرے دو شاعر فرزدق اور جریر تھے۔ اکثر لوگوں کا اس امر پر اتفاق ہے کہ وہ اپنے معاصرین میں سے بہتر شعر کہنے والا تھا اور ان کے مقابلے میں اس کی شہرت دور دور تک پہنچی ہوئی تھی۔ لیکن لوگوں میں اس امر پر اختلاف ہے کہ ان تینوں میں سب سے بڑا شاعر کون تھا۔ سچ بات یہ ہے کہ ان میں سے ہر ایک میں برتری کا کوئی پہلو تھا اور کوئی نہ کوئی خاص بات تھی۔

اخطل کی خاص بات یہ تھی کہ اس کے مدحیہ قصائد فن کا بہت اعلیٰ نمونہ پیش کرتے ہیں۔ وہ صہبا اور شراب کا بیان بھی دوسروں سے بہتر کرتا ہے۔ نیز یہ کہ اس کی ہجو میں فحش اور بے حیائی کی باتیں نہیں ہوتیں۔ اس نے لمبی لمبی نظمیں کہیں' لیکن ان میں کہیں کوئی فضول اور معیار سے گری ہوئی بات نہیں کی۔ اخطل کے ہاں اگرچہ ملکۂ شعر فطری تھا' تاہم وہ زہیر کی طرح اپنے قصائد پر محنت بھی کرتا اور ان کی نوک پلک سنوارتا رہتا تھا۔ کہتے ہیں کہ بعض مدحیہ قصائد پر وہ سال سال بھر غور کرتا تھا اور کبھی ایسا ہوتا کہ اس کے کسی قصیدے میں نوے اشعار ہو جاتے تو وہ اس میں کاٹ چھانٹ کر کے صرف تیس اشعار باقی رہنے دیتا۔ البتہ اپنے خوش باش مزاج کی وجہ سے وہ صنف مرثیہ میں کچھ زیادہ نہ کر سکا۔ اسے دراصل اپنے آپ پر فخر تھا اور وہ سوائے اعشٰی کے اپنے آپ پر کسی کو فوقیت نہیں دیتا تھا' اسی لیے وہ اپنی شاعری میں اس کے اسلوب کی پیروی کرتا تھا۔ اخطل کے قصائد میں الفاظ کی شوکت' اسلوب کی کرّ وفر اور فکر و خیال کی آن بان پائی جاتی ہے۔ مدح و ہجو کے علاوہ اس کا خاص موضوع خمریات تھا۔ کیفیات شراب کے بیان میں اسے غیر معمولی مہارت حاصل تھی' اس لیے کہ شراب اس کی گھٹی میں پڑی تھی۔ کہتے ہیں کہ عبدالملک نے اسے مسلمان ہو جانے کی ترغیب دلاتے ہوئے گراں قدر مالی فوائد کی پیشکش کی۔ مگر صرف شراب کی خاطر اس نے ان فوائد کو قبول نہ کیا۔

اخطل کے ہاں صرف سات طویل قصائد ایسے ہیں جن میں وہ دوسرے دو شعراء سے فائق دکھائی دیتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ قدیم اہل علم اور راوی اسے ان دو کے برابر درجہ نہیں دیتے' اس لیے کہ شاعری کی جملہ اصناف میں اس نے اتنا نہیں کہا جتنا ان دو نے کہا ہے۔

**نمونۂ کلام:** اخطل کی مدح کا سب سے اعلیٰ نمونہ اس کا وہ قصیدہ ہے جو اس نے عبدالملک بن مروان کے لیے کہا۔



Scanned with CamScanner

نفسی فداء امیر المؤمنین اذا ابدی النواجذ یومٌ باسل ذکر
الخائض الغمرة المیمون طائره خلیفة اللہ یُستسقی به المطر
فی نبعة من قریش یعصبون بها ما ان یُوازی باعلی نبتها الشجر
حُشد علی الحق عیّا فُوا الخنا اُنُف اذا اَلمّت بهم مکروهة صبروا
شُمس العداوة حتی یستقاد لهم واوسع الناس احلاماً اذا قدروا
هم الذین یبارون الریاح اذا قلّ الطعام علی العافین او قتروا
بنی امیة نُعماکم مجلّلة تمّت فلا مِنّة فیها ولا کدرُ

(میری جان امیر المومنین پر فدا ہو' جب ایک بُرا اور سخت دن آنکھیں دکھانے لگے۔
وہ کسی جنگ میں شامل ہو تو اچھی قسمت اس کے ساتھ ہوتی ہے' اللہ کا ایسا خلیفہ جس کے وسیلے سے بارش مانگی جاتی ہے۔
وہ قریش کے اونچے شجر سے ہے جس کے گرد لوگ جمع رہتے ہیں' اس کی اونچی شاخوں میں کوئی چیز بھی اس شجر کا مقابلہ نہیں کر سکتی۔
حق کی پکار پر جمع ہونے والے' فحش باتوں سے نفرت کرنے والے' جب ان پر کوئی مصیبت پڑے تو صبر کرتے ہیں۔
دشمنی میں بہت تندخو' تا آنکہ ان کی اطاعت قبول کر لی جائے' اور جب قادر ہو جائیں تو سب لوگوں سے زیادہ بُردبار ہوتے ہیں۔
وہ ایسے ہیں جو ہواؤں سے بھی بازی لے جانا چاہتے ہیں' جب مانگنے والوں کے لیے کھانا نہ رہے' یا وہ تنگ دست ہو جائیں۔
اے بنی اُمیہ تمہاری نعمتیں سب کے لیے عام ہیں اور پایۂ کمال کو پہنچی ہوئی ہیں' چنانچہ ان میں نہ احسان جتانے کو دخل ہے اور نہ کسی قسم کے تکدر کو۔)

ہجو میں اخطل کے یہ اشعار بہت مشہور ہیں جو اس نے انصار کے خلاف کہے:

لعن الالٰہ بنی الیہود عصابةً بالجزع بین جُلاجلٍ وصِرار
قومٌ اذا هدر العصیرُ رأیتهم حُمرا عیونهم کجمر النار
ذهبت قریش بالمکارم والعُلی واللوم تحت عمائم الانصار
فذروا المعالیَ لستُمْ من اهلها و خذوا مساحیکم بنی النجار
واذا نسبت ابن الفریعة خلة کالجحش بین حمارة و حمار

(جلاجل اور صرار کے پہاڑوں کے درمیان جزع کے مقام پر بسنے والے اولاد یہود کے گروہ پر اللہ کی لعنت ہو۔
وہ ایسے لوگ ہیں کہ جب ان کی شراب میں جوش آتا ہے تو ان کی آنکھیں سرخ انگارہ ہو جاتی ہیں۔
اچھے کارنامے اور رفعت تو قریش کا شعار ٹھہرا' اور ملامت انصار کی دستاروں میں رہ گئی۔
تو اونچے کاموں کا خیال چھوڑو کہ تم اس کے اہل ہی نہیں ہو' اے بنی النجار' بہتر ہے کہ تم اپنے رندے سنبھال لو۔
اگر تم ابن الفریعہ (حسان بن ثابتؓ) کا نسب جاننا چاہو' تو یوں سمجھنا جیسے گدھے اور گدھی کے درمیان ان کا بچہ ہو۔)

اخطل کی ایک اور نظم ہے جس میں وہ جریر کی نونیہ نظم کا جواب دیتا ہے۔ اس میں وہ بنی دارم کی تعریف کرتا ہے اور جریر کی ہجو کرتا ہے۔ کہتا ہے:

مـابـالُ قـومٍ لا تـغـبُّ اذا تُهم — قُعس الظهور من الحقين بِطان
هـم هيّـجوا حربی' ومالهُمُ بها — لـو واجهتُم بـالـلّـقـاء' يـدان
حـرب امرئٍ مـا ان تـرثّ سلاحه — ابداً' ولا يـغـتـر بـالـحـدثـان
قبح الالـه بـنـی كـلـيـب' انهم — لا يـحـفـظـون محـارمَ الـجـيران
اجـريـرُ' انـک والـذی تسمُـولـه — كـاسيفةٍ فـخـرت بـحدج حصان
حُملت لـربّتـهـا' فـلـمـا عُـوليـت — نسلـت تـعـارضـهـا مع الاظعان
اتـعـدّمـاثـرةً' لـغيـرک فـخـرهـا — وسـنـاؤهـا فـی غـابـر الازمـان

(ان لوگوں کو کیا ہے کہ وہ تکلیف پہنچانے میں کبھی ناغہ نہیں کرتے' منحنی پشتوں والے' مشکیزے کے دودھ سے پیٹ پھلائے ہوئے۔
انہوں نے مجھے جنگ پر اکسایا اور اگر میں مقابلے پر آ جاتا تو وہ اس لڑائی میں کچھ بھی نہ کر سکتے۔
ایسے شخص سے جنگ کرنا چاہی جس کا اسلحہ کبھی بوسیدہ نہیں ہوتا' اور جو مصائب زمانہ سے کبھی غافل نہیں رہتا۔
اللہ بنی کلیب کو دور رکھے' یہ لوگ ہمسایوں کے حقوق کا بھی خیال نہیں کرتے۔
جریر' تم جس اونچے مقام پر پہنچنا چاہتے ہو اس کا معاملہ ایسا ہے جیسے کوئی لونڈی ایک باعفت خاتون کے کجاوے پر بیٹھنا چاہے

وہ اپنی مالکن کے ساتھ سوار کی گئی' لیکن جب اس کو اتارا گیا تو وہ بھاگ کر دوسرے سواروں کے ساتھ جا ملی۔
کیا تو موروثی خوبی کا نام لیتا ہے' جس پر گزرے زمانوں میں تمہارے سوا دوسرے لوگوں نے فخر کیا تھا اور اسے اپنے لیے رفعت سمجھا تھا۔)

اخطل نے ایک اُموی شاعر خالد بن عبداللہ کی مدح میں ایک نظم کہی' جس میں علاوہ دوسری باتوں کے اس نے کچھ اشعار شراب کے موضوع پر کہے' جو اس کی خمریات کی شاعری کے نمونے کے طور پر یہاں دیے جاتے ہیں:

| | |
|---|---|
| کانی غداۃ أنصعن للبین' مسلم | بضربۃ عنق' او غوی معذل |
| صریع مدام' یرفع الشرب رأسہ | لیحیا و قد ماتت عظام و مفصل |
| نھادیہ احیانا و حینا نجرّہ | وما کا دالا بالحشاشۃ یعقل |
| اذا رفعوا عظما تحامل صدرہ | وآخر' مما نال منھا' مُخبَّل |

(جب ان عورتوں نے جدا ہونے کا ارادہ ظاہر کیا' تو گویا میری گردن پر ضرب پڑی اور مجھے یوں لگا جیسے میں ملامت زدہ ہوں۔
ایسی شراب کا پچھاڑا ہوا' جس کا پینے والا جینے کے لیے سر اٹھاتا ہے' جبکہ اس کی ہڈیاں اور جوڑ جوڑ مر چکے ہوتے ہیں۔
کبھی ہم اسے اٹھا کر کھڑا کرتے ہیں اور کبھی گھسیٹ کے لے جاتے ہیں اور اس میں زندگی کی جو رمق باقی ہوتی ہے اسی سے وہ کچھ سنتا سمجھتا ہے۔
جب اس کی بڑی ہڈی کو سہارا دیتے ہیں تو اس کا سینہ سیدھا ہو جاتا ہے اور ایک دوسرا' جس نے وہی شراب پی ہے' دیوانہ ہو گیا ہے۔)

حکمت کے باب میں اخطل کا یہ شعر مشہور ہے:

| | |
|---|---|
| وان امرء اَلا ینتھی عن غوایۃ | اذاما اشتھتھا نفسہ لجھول |

(ایک شخص جب ایسی گمراہی سے باز نہ آئے جس کی اس کے نفس نے خواہش کی ہو' وہ پرلے درجے کا بے وقوف اور لاعلم ہے۔)

☆......☆......☆

# فرزدق (م ۷۲۸ء)

ابوفراس ہمام بن غالب قبیلہ بنوتمیم کی شاخ بنو دارم سے تھا۔ اموی دور کے تین اکابر شعراء میں وہ فخر کے موضوع پر سب سے بڑا شاعر سمجھا جاتا ہے۔ اس کے علاوہ اس کا شمار صف اول کے ان شعراء میں ہوتا ہے جنہوں نے مدح اور ہجو کے موضوع پر بہت کچھ کہا۔

وہ ۶۴۰ء میں حضرت عمرؓ کے دور خلافت میں بصرہ میں پیدا ہوا' جس کے آباد ہونے کے دن سے ہی اس میں اس کے آباء و اجداد اور قبیلے کے فصیح اور بادیۂ عرب کی خالص زبان بولنے والے لوگ بس گئے تھے۔ چنانچہ جب وہ ان لوگوں کے درمیان بڑا ہوا تو اس کے لہجے پر کسی قسم کا عجمی اثر نہیں تھا اور نہ اس کی زبان پر کوئی غیر فصیح لفظ چڑھا تھا۔ اس کا دادا صعصعہ عرب کا بڑا نامور آدمی ہوگزرا تھا۔ کہتے ہیں کہ جاہلیت میں کوئی عرب جب اپنی نومولودلڑکی کو زندہ درگور کرنے کا ارادہ کرتا تھا تو صعصعہ اس بچی کوخرید کر اسے زندہ رکھتا تھا۔ چنانچہ اس کا لقب ''محی الموءودات'' (زندہ دفنائی جانے والی بچیوں کو زندگی بخشنے والا) مشہور ہوگیا۔ فرزدق کا باپ غالب بھی بڑا معزز سردار تھا۔ فرزدق اپنے خاندان کے اس اونچے رتبے کی وجہ سے اپنی شاعری میں فخر کا اظہار کرنے لگا' اور اس میدان میں اس نے اپنے زمانے کے سب شعراء پر فوقیت حاصل کر لی۔

فرزدق کو اس کے باپ نے شاعری کی روایت کرنا سکھایا اور خود اسے بھی شعر کہنے کی تلقین کی' جس سے وہ جلد ہی نہ صرف شاعری کی روایت کرنے لگا بلکہ خود بھی نظمیں کہنے لگا' اور اس میں اس نے کافی نام پیدا کر لیا۔ فرزدق کا باپ ایک دفعہ اسے امیر المومنین حضرت علیؓ کی خدمت میں لے آیا۔ انہوں نے جب اس کے بارے میں پوچھا تو کہا کہ یہ میرا بیٹا ہے اور کم سنی کے باوجود بہت اچھے شعر کہنے لگا ہے۔ اس پر حضرت علیؓ نے فرمایا: اسے قرآن پڑھاؤ۔ یہ اس کے لیے بہت اچھا رہے گا۔ ان کی اس بات کو فرزدق نے پلّے باندھ لیا اور قرآن حفظ کرنے کا مصمّم ارادہ کر لیا۔ اس مقصد سے اس نے اپنے پاؤں میں بیڑی ڈال لی اور قسم کھائی کہ قرآن حفظ کرنے سے پہلے اس قید سے نہیں نکلے گا۔ چنانچہ اس نے یہ بیڑی اس وقت تک نہ کھولی جب تک باوجود اُمّی (اَن پڑھ) ہونے کے اس نے سارا قرآن حفظ نہ کر لیا۔

اس کے بعد وہ بصرہ و کوفہ کے حکام اور عمال کی مدح اور ہجو کرنے لگا۔ چنانچہ انہوں نے کبھی تو اس کو اپنے قریب کیا اور کبھی اپنے سے دور کر دیا۔ پھر وہ شام میں اموی خلفاء کی مدح کرنے اور ان سے انعام واکرام پانے لگا۔ اس نے خاص طور پر خلیفہ عبدالملک ابن مروان اور اس کی اولاد کی مدح میں نظمیں

کہیں۔ لیکن وہ چونکہ آل علیؓ سے عقیدت رکھتا تھا' اس لیے وہ ان کے ہاں زیادہ مقبولیت حاصل نہ کر سکا۔ فرزدق کا اصل جوہر شاعری میں اس وقت چمکا جب اس کی اس کے معاصر شاعر جریر کے ساتھ ہجو گوئی کا سلسلہ شروع ہوا۔ یہ ادبی جنگ دونوں شاعروں کے ملکۂ شعری کو جلا بخشنے کا سبب بنی۔ اس جنگ کا آغاز یوں ہوا کہ بعیث نامی ایک شاعر کے ساتھ جریر کی ہجو گوئی چل رہی تھی۔ فرزدق نے' جو جریر کو اپنا حریف سمجھنے لگا تھا' اس مقابلے میں بعیث کا ساتھ دیتے ہوئے جریر کے خلاف شعر کہہ ڈالے۔ اس کے بعد جو دونوں شاعروں کے درمیان ہجو گوئی کا سلسلہ شروع ہوا تو دس برس تک جاری رہا' جس میں ان دونوں نے ایک دوسرے کے خلاف خوب دل کی بھڑاس نکالی اور اکثر مواقع پر شائستگی کی حدود بھی پھلانگ گئے۔ فرزدق کے لیے جریر کی ہجو کرنا' اس لیے آسان رہا کہ اس کا اپنا خاندان اور حسب نسب بہت اعلیٰ تھا۔ اس کے آباء و اجداد جاہلیت میں ہی نہیں اسلام میں بھی سردار رہے تھے۔ اس کے مقابلے میں جریر کے آباء و اجداد کم تر درجے کے لوگ تھے اور قبائل میں ان کو کوئی بھی نہیں جانتا تھا۔ کہتے ہیں کہ اس بنا پر فرزدق نے تقریباً اسی شاعروں کو جریر کی ہجو کرنے پر اکسایا۔ لیکن ان ساری کوششوں کے باوجود وہ اس کا کچھ نہ بگاڑ سکا۔

فرزدق ایک تو اپنی ہجو میں بدگوئی اور بدنامی کرتا تھا اور فحش گالیاں استعمال کرتا تھا' نیز باعفت عورتوں پر تہمت لگاتا تھا۔ اس کے علاوہ وہ آوارہ مزاجی اور عیش کوشی کا دلدادہ تھا اور شعائر دین کی زیادہ پروا نہیں کرتا تھا۔ تاہم بڑھاپے میں وہ حضرت حسن بصریؒ کے پاس حاضر ہوا اور اپنے تمام غلط کاموں سے توبہ کر لی اور نیک اور پاکباز بن گیا۔ اس طرح اس کا خاتمہ بخیر ہوا۔

فرزدق جب اموی حکمرانوں کے پاس آتا جاتا تھا تو اس نے اپنے شیعہ ہونے کو اخفا میں رکھا ہوا تھا۔ لیکن آگے چل کر اس نے اپنے اس مذہب کو ظاہر کر دیا' حتیٰ کہ ولی عہد ہشام بن عبدالملک کے سامنے بھی۔ وہ یوں ہوا کہ ایک سال ولی عہد نے ملک کے دوسرے سرداروں کے ساتھ حج کیا' تو لوگوں کی زیادہ بھیڑ کی وجہ سے وہ حجرِ اسود کو بوسہ نہ دے سکا۔ مگر جب حضرت علی بن الحسینؓ (امام زین العابدین) طواف کرتے ہوئے وہاں پہنچے تو ہجوم چھٹ گیا اور لوگوں نے انہیں حجرِ اسود تک پہنچنے کا راستہ دے دیا۔ یہ دیکھ کر ہشام نے تجاہلِ عارفانہ سے کام لیتے ہوئے اور ان کی قدر گھٹانے کی کوشش کرتے ہوئے پوچھا کہ یہ شخص کون ہے؟ تو اس پر فرزدق جو وہاں موجود تھا بول اٹھا کہ میں جانتا ہوں' اور امام زین العابدین کی مدح میں ایک قصیدہ کہا جس کا مطلع تھا:

هذا الذی تَعرف البطحاءُ وطأتَه      والبیتُ یعرفه والحِلّ والحرمُ

(یہ وہ شخص ہے کہ وادئ مکہ اس کے قدم پہچانتی ہے، اور بیت اللہ اور حدود حرم کے باہر کا علاقہ سب اس سے آشنا ہیں۔)

یہ سن کر ہشام نے اسے قید کر دیا' لیکن بعد میں اسے چھوڑ دیا۔ فرزدق بصرے میں تقریباً نوے سال کی عمر کو پہنچ کر ۷۲۸ء میں فوت ہوا۔

**شاعری:** فرزدق چونکہ اپنے گھرانے اور قبیلے پر فخر کرتا تھا' اور اپنے آباء و اجداد کے کارناموں کا ذکر خلفاء کے سامنے کرنے سے بھی نہیں چوکتا تھا' اس لیے اس کی شاعری میں فخر کا موضوع غالب رہا اور فخر کی شاعری کے کچھ تقاضے ہوتے ہیں۔ چنانچہ یہ دیکھنے میں آتا ہے کہ اس کے ہاں پُرشکوہ الفاظ' شاندار اسالیب' لغت کے خالص بدوی اور نامانوس کلمات اور قدیم عرب کی تلمیحات کا غلبہ ہے اور ان سب باتوں نے اسے طبقۂ علماء کا پسندیدہ شاعر بنا دیا ہے۔ چنانچہ کہا گیا کہ اگر فرزدق کا کلام نہ ہوتا تو عربی زبان کا ایک تہائی حصہ ضائع ہو گیا ہوتا۔ لیکن پھر دوسری طرف اس کی شاعری میں' باوجود اس کے مزاج کی رنگینی کے' لطافت' نفاست اور گداز کی کمی ہے۔ اسی لیے ایک طویل عرصہ وہ اپنے کلام کی صعوبت اور کھردرے پن کے باعث کچھ بدمزہ رہا اور یہ خواہش کرتا رہا کہ کاش اس کی عیش کوشی کے مضامین کے لیے اس کے پاس جریر کی سی ملائمت ہوتی' اور جریر کی پاکبازی کے لیے میری صلابت اور صعوبت ہوتی۔ اس سے اخطل کی اس رائے کی تائید ہوتی ہے جو اس نے ان دو شاعروں کا موازنہ کرتے ہوئے دی تھی کہ فرزدق کا کلام ایسا ہے جیسے کوئی پتھر کو تراش کر کوئی صورت بنا رہا ہو اور جریر کا کلام ایسا ہے جیسے کوئی چشمے سے چلو بھر کے پی رہا ہو۔

فرزدق ہجو میں بہت بدکلام شاعر ہے۔ البتہ وصف میں وہ بہت اچھا ہے۔ مدح اس کی درمیانہ درجے کی ہے' اور مرثیہ میں وہ کوئی بات پیدا نہیں کر سکا۔

**نمونۂ کلام:** اپنی سخاوت' بہادری اور اعلیٰ نسبی پر فخر کرتے ہوئے کہتا ہے' اور اس میں جریر پر بھی چوٹ کر جاتا ہے:

| | |
|---|---|
| اذا اغبرّ آفاق السماء و كشّفت | بيوتاً وراء الحيّ نكباء حَرجَفُ |
| واصبح مبيضّ الصقيع كانه | على سَرَوَاتِ النيب قطن مندّف |
| ترى جارنا فينا بخير وان جنى | فلا هو ممايُنطف الجارَ يُنطَف |
| وكنا اذا نامت كليب عن القِرى | الى الضيف نمشي بالعبيط و نلحف |



Scanned with CamScanner

لنا العزۃ القعساء والعدد الذی | علیہ، اذا عُدّ الحصیٰ، یتحلّف
تری الناس ان سرنا یسیرون خلفنا | وان نحن أومأنا الی الناس وقفوا
وانک اذ تسعی لتدرک دارماً | لانت المُعنّیٰ یا جریر المکلّف

(جب آسمان کا افق گدلا ہو جائے اور ایک تیز آندھی قبیلے کے پیچھے والے گھروں کو ظاہر کر دے۔

اور سفید برف یوں لگے جیسے وہ اونٹوں پر لدی دھنی ہوئی روئی ہو۔

تو تم ہمارے ہمسایہ کو بخیریت پاؤ گے اور اگر اس نے کوئی زیادتی کی بھی تو اس پر ایسی تہمت نہیں لگائی جائے گی جو اسے مار ڈالے۔

جب کلیب والے مہمان نوازی میں غفلت کرتے تھے تو ہم مہمان کے پاس گوشت لے کے جاتے تھے اور اسے لحاف اُڑھاتے تھے۔

ہم اونچی شان والے ہیں اور تعداد میں اتنے ہیں کہ جب گنتی کی جائے تو اس کی کثرت کی قسم کھائی جا سکتی ہے۔

لوگوں کو دیکھو گے کہ جب ہم چلیں تو وہ ہمارے پیچھے چلتے ہیں اور اگر ہم انہیں اشارہ کریں تو وہ رک جاتے ہیں۔

جب تم بنو دارم کے مقام بلند پر پہنچنے کی کوشش کرو گے تو اے جریر! تمہیں اس میں بڑی دشواری ہو گی اور بڑی تکلیف اٹھانی پڑے گی۔)

سلیمان بن عبدالملک کی مدح کرتے ہوئے کہتا ہے:

کنا ننادی اللہ نسالہ | فی الصبح، والأسحار، والعصر
ان لا یمیتک او تکون لنا | انت الامام و والی الامر
فاجاب دعوتنا وأنقذنا | بخلافۃ المہدی من ضُرّ
یا ابن الخلائف، لم نجد احداً | یبقی لحزّ نوائب الدھر
انت الذی نعت الکتاب لنا | فی ناطق التوراۃ والزبر
کم کان من قسّ یخبّرنا | بخلافۃ المہدی او جِبر
جعل الالہ لنا خلافتہ | بُرء القروح وعصمۃ الجبر

(ہم اللہ کو پکارتے تھے اور سوال کرتے تھے، صبح کے ہنگام، رات کے آخری حصوں میں اور عصر کے وقت کہ تمہاری بڑی عمر ہو، تا کہ تم ہمارے امام اور ولی امر ہو۔



Scanned with CamScanner

تو اس نے ہماری دعا قبول کی اور ہمیں مہدی (یعنی سلیمان بن عبدالملک) کی خلافت کی صورت میں نقصان سے بچالیا۔

اے خلفاء کے بیٹے' ہم نے کوئی ایسا نہیں دیکھا جو مصائب زمانہ کی کاٹ کے سامنے ڈٹ جائے۔

تو ہی ہے جس کا وصف کتاب نے بیان کیا ہے' توارت اور زبور میں۔

کتنے ہی پادری تھے' یا احبار تھے جنہوں نے مہدی کی خلافت کی خبر ہمیں دی تھی

اللہ اس کی خلافت کو ہمارے زخموں کا مرہم اور ہماری حالتِ مجبوری میں پناہ بنائے۔)

جریر کی ہجو کرتے ہوئے فرزدق کہتا ہے:

فانک اذ تسعی لتدرک دارماً — لأنت المعنّی' یا جریرُ' المکلّف

أتطلب من عند النجوم و فوقها — بربق و عیر ظهره متقرِّف

أبی لجریر رهط سوء أذلة — وعرض لئیم للمخازی موقَّف

اذا ما احتبت لی دارم عندغایة — جریت الیها جَری من یتغَطْرف

کلانا له قوم هُم یُحلبونه — باحسابهم' حتی یُری من یُخلَّف

الی امدٍ حتی یزایل بیننا — ویو جعَ منا النَّخس من هو مُقرِف

(جب تم بنو دارم کے مقام بلند پر پہنچنے کی کوشش کرو گے' تو اے جریر! تمہیں اس میں بڑی دشواری ہو گی اور بڑی تکلیف اٹھانی پڑے گی۔

جو ستاروں سے بھی پرے ہیں' کیا تم ان تک پہنچنا چاہتے ہو' ایک رسی اور ایک گدھے کو لے کر' جس کی پیٹھ پر زخم ہیں۔

بُرے اور ذلیل اہل قبیلہ جریر کے باپ بنے اور ایک گھٹیا درجے کی عزت ان کی رہی' جس کے پیچھے ذلت و رسوائی ہے۔

جب بنو دارم منزل پر پہنچ کر میرے انتظار میں ہوتے ہیں' تو تم اس کی طرف بھاگ کے جاتے ہو کہ شاید تمہیں بھی عزت مل جائے۔

ہم میں سے ہر ایک کے اپنے اپنے لوگ ہیں جو اپنے حسب نسب سے اس کی مدد کرتے ہیں' تاکہ معلوم ہو کہ پیچھے رہ جانے والا کون ہے۔

ایک منزل کی طرف رواں' تاکہ مہمیز ہمیں آزار پہنچا کر ایک دوسرے سے الگ کر کے بتائے کہ ہم میں سے مخلوط ذات والا کون ہے۔)

فرزدق نے مدح میں جو سب سے عمدہ چیز کہی وہ امام علی بن الحسینؑ کی تعریف میں یہ اشعار ہیں:

هذا الذی تعرف البطحاء وطأته — والبیت یعرفه والحل والحرم
هذا ابن خیر عباد اللہ کلّھم — ھذا التقیّ النقیّ الطاھر العَلمُ
ولیس قولک : من ھذا؟ بضائرہ — العرب تعرف من، أنکرت والعجمُ
اذا رأتہ قریش قال قائلھا — الی مکارم ھذا ینتھی الکرم
یُغضی حیاءً و یُغضی من مھابتہ — فلا یکلّم الاحین یبتسم
یکاد یمسکہ عرفان راحتہ — رکن الحطیم اذا ماجاء یستلم
ینشق ثوب الدجی من نور غُرّتہ — کالشمس تنجاب عن اشراقھا الظُّلَم
من معشرٍ حبّھم دین و بغضھم — کفر، و قربھم مَنجیً و معتصم
ان عُدَّ أھلُ التقی کانوا أئمّتھم — أو قیل مَن خیرُ الارض؟ قیل ھُمُ

(یہ وہ شخص ہے کہ مکہ کی وادی اس کے قدم پہچانتی ہے اور بیت اللہ اور حدود حرم کے باہر کا علاقہ سب اس سے آشنا ہیں۔
یہ شخص بندگان الٰہی میں سے بہترین شخص کی اولاد ہے۔ یہ متقی، برگزیدہ، پاک اور ممتاز ومعروف انسان ہے۔
تمہارا یہ کہنا کہ یہ کون ہے؟ اسے نقصان نہیں پہنچا سکتا، اس لیے کہ جسے تو نہ پہچان سکا اسے سارا عرب وعجم پہچانتا ہے۔
جب قریش اس شخص کو دیکھتے ہیں تو ان کا کہنے والا کہتا ہے کہ بزرگی کی انتہا اس شخص کے قابل قدر افعال پر ہوتی ہے۔
وہ حیا کی وجہ سے نظر بچاتے ہیں اور ان کی ہیبت سے لوگ اپنی نگاہیں نیچی رکھتے ہیں۔ چنانچہ ان سے گفتگو اس وقت ہوسکتی ہے جب وہ مسکرا رہے ہوں۔
جب وہ رکن حطیم کو بوسہ دینے کے لیے آتے ہیں تو وہ گویا ان کا ہاتھ پہچان کر اسے پکڑ لیتا ہے۔
ان کے چہرے کے نور سے اندھیرا چھٹ جاتا ہے، جیسے سورج کے نکلنے سے تاریکیاں زائل ہو جاتی ہیں۔
وہ ان لوگوں میں سے ہیں جن کی محبت دین ہے، جن سے بغض رکھنا کفر ہے اور جن کا قُرب نجات اور پناہ کی جگہ ہے۔
اگر اہل تقویٰ کی بات ہو تو وہ ان کے امام ہیں۔ اگر کہا جائے کہ اہل زمین میں سب سے بہتر کون ہے، تو کہا جائے گا کہ "وہی" ہیں۔)

☆......☆......☆

# جریر (م ۷۲۸ء)

ابو حزرہ جریر بن عطیہ کا تعلق بنو تمیم کی شاخ بنو کلیب بن یربوع سے تھا۔ وہ یمامہ کے علاقے میں [illegible] پیدا ہوا اور صحرائی ماحول میں نشوونما پائی' جس کے اثر سے اس کے اندر زبان و بیان میں فصاحت اور وہ ان میں صحت و سلامتی پیدا ہوئی۔ ساتھ ہی شاعری میں بھی اس کی طبع رواں ہو گئی۔ جب اس نے دیکھا کہ شعر کہنے پر اسے اچھی قدرت حاصل ہو گئی ہے اور وہ لوگوں کے سامنے اپنا اظہار کر سکتا ہے تو وہ بصرہ آ گیا جہاں شاعر فرزدق رہتا تھا اور یہاں وہ امراء و روٴساء کی مدح کر کے انعام و اکرام پانے اور اپنے اہل خانہ کے لیے روزگار مہیا کرنے لگا۔ جریر نے جب دیکھا کہ بصرہ میں رہ کر فرزدق نے اپنی شاعری کے بل بوتے پر عیش و تنعم کے سامان جمع کر لیے ہیں اور اپنے لیے جاہ و عزت پیدا کر لی ہے حالانکہ وہ بھی اسی کی طرح قبیلہ بنو تمیم سے تھا' تو وہ اس سے حسد کرنے لگا اور اس کے دل میں خواہش پیدا ہوئی کہ وہ بھی مال و دولت جمع کر کے اپنی حالت بہتر کر لے۔ اس کے اہل قبیلہ نے بھی اس کے دل میں فرزدق کے مقابلے کا خیال پیدا کیا۔ چنانچہ جریر نے بصرہ میں قیام اختیار کر لیا' تا کہ اپنے حریف کے قریب رہ کر اس کا سامنا کرے اور وہاں سوق ''مربد'' میں آنے جانے لگا' جسے اس زمانے میں تقریباً وہی اہمیت حاصل تھی جو جاہلی دور میں سوق ''عکاظ'' کو تھی۔

رفتہ رفتہ جریر حجاج بن یوسف کی نظروں میں آ گیا جس نے اس کی سرپرستی کی اور حجاج کی مدح میں جریر نے جو متعدد نظمیں کہیں ان کی شہرت دور دور تک پھیل گئی۔ جب عبدالملک ابن مروان نے یہ نظمیں سنیں تو اس کو اپنے عامل سے جلن ہونے لگی۔ حجاج کو اپنے خلیفہ کے اس احساس کا پتا چلا تو اس نے جریر کو اپنے بیٹے محمد کے ساتھ دمشق بھیج دیا۔ جریر جب عبدالملک کے سامنے پیش ہوا تو خلیفہ اس کے ساتھ سرد مہری سے پیش آیا اور اس کا کلام سننے پر آمادہ نہ ہوا۔ لیکن جریر مختلف وسیلوں سے اموی خلیفہ تک پہنچنے کی کوشش کرتا رہا۔ آخر وہ اس میں کامیاب ہو گیا اور اس نے عبدالملک ابن مروان کی مدح میں ایک اعلیٰ درجے کا قصیدہ کہا جس کا مطلع تھا:

اتصحوام فؤادک غیر صاح ۔۔۔ عشیۃ ہمّ صحبک بالرواح؟

(کیا تم اپنے حواس میں ہو یا تمہارا دل ہوش میں نہیں آیا جس رات تمہارے ساتھیوں نے چلنے کا ارادہ کر لیا۔)

اس نظم میں جب اس نے یہ شعر کہا:

الستم خیرَ من رکب المطایا      وأندی العالمین بطون راح؟

(کیا آپ لوگ ان سب لوگوں سے بہتر نہیں ہو جو کبھی سواریوں پر بیٹھے اور تمہاری ہتھیلیاں کل عالم سے بڑھ کر سخی نہیں ہیں؟)

تو عبدالملک کے ہونٹوں پر تبسم پھیل گیا اور وہ بے اختیار کہہ اٹھا۔ "ہم ایسے ہی ہیں اور ہمیشہ سے ایسے ہی تھے" پھر اس نے جریر کو سو اونٹنیاں اور ان کے ساتھ آٹھ چرواہے انعام میں دیے۔ اس دن کے بعد اور خاص طور پر اخطل کے کمزور پڑ جانے کے بعد' جریر ہی اموی خلفاء کا اور خصوصاً عمر بن عبدالعزیز کا......سب سے پسندیدہ شاعر ہو گیا۔

لیکن محل میں جریر کا یہ تقرب اور قدر و منزلت اس کے حریفوں کے لیے سوہان روح ثابت ہوئی اور انہوں نے مل کر جریر کی ہجویں کہہ کر اسکے خلاف باقاعدہ ایک محاذ قائم کر دیا۔ ان شعراء کو فرزدق کی تائید و حمایت حاصل تھی اور ان کو اس بات سے بھی شہہ ملتی تھی کہ جریر کے قریبی آباء و اجداد بہت معمولی حیثیت کے اور کم منزلت لوگ تھے۔ پھر کچھ تماش بین بھی تھے جو اس قسم کے مقابلے بہت ذوق و شوق سے دیکھتے تھے۔ لیکن جریر اپنے ان تمام مخالفوں اور حریفوں کے سامنے' جن کی تعداد اسی تک پہنچی تھی' ڈٹ گیا اور سب پر غلبہ پا کر انہیں خاموش کر دیا' سوائے فرزدق اور اخطل کے جو اس کے مقابلے میں موجود رہے۔ جریر ان تمام ہجوگو شاعروں کے مقابلے میں اپنی بے پناہ قوت اظہار کے باعث فتح یاب ہوا ورنہ وہ ایک معمولی گھرانے کا آدمی تھا اور اس کے پاس فرزدق کی طرح فخر کرنے کے لیے آباء و اجداد کے کارناموں کا سرمایہ نہیں تھا۔ اغانی میں آتا ہے کہ ایک دفعہ ایک شخص نے جریر سے پوچھا: سب سے بڑا شاعر کون ہے؟ جریر نے کہا اُٹھو میں تمہیں بتاتا ہوں کہ سب سے بڑا شاعر کون ہے اور اس کو ساتھ لیے ہوئے وہ اپنے باپ عطیہ کے گھر میں داخل ہوا۔ اس وقت اس کے باپ نے ایک بھیڑ کو باندھ رکھا تھا اور اس کے تھن سے منہ لگا کر اس کا دودھ پی رہا تھا۔ جریر نے پکار کر کہا: ابا جان' ذرا باہر آئیں۔ اُس وقت ایک بدرُو بوڑھا اُٹھ کے سامنے آیا' جس کے کپڑے پھٹے پرانے تھے اور بھیڑ کا دودھ اس کی داڑھی سے بہہ رہا تھا۔ جریر نے اس شخص سے کہا: جانتے ہو یہ کون ہے؟ اس نے کہا: نہیں۔ جریر کہنے لگا: یہ میرا باپ ہے' یہ جانور کے تھن سے اس لیے دودھ پی رہا تھا کہ دودھ دوہنے کی آواز کہیں باہر تک نہ پہنچ جائے اور کوئی اس سے دودھ مانگنے نہ آ جائے۔ تو سب سے بڑا شاعر وہ ہے' جریر کہنے لگا' جس نے ایسے باپ کے ہوتے ہوئے اسی شاعروں سے فخر و سرفرازی میں مقابلہ کیا' ان کی ہجویں کہیں اور سب کو چت کر دیا۔

ذاتی زندگی میں جریر ایک دیندار اور پاکباز انسان تھا' لیکن جب وہ ہجو کہنے پہ آتا تو اس میں فحش



Scanned with CamScanner

گوئی سے بھی پرہیز نہیں کرتا تھا۔ حتیٰ کہ عفیف اور پاکدامن عورتوں پر غلط تہمت دھرنے سے بھی نہیں چوکتا تھا۔ ان ساری خرابیوں کے باوجود وہ نماز اور دُعا اور تسبیح کا پابند تھا۔ اس لیے اگرچہ اس کے دشمن بہت سے تھے' تاہم وہ اس کے کردار اور اس کی روزمرہ زندگی میں گناہ اور معصیت کی کوئی بات نہیں پا سکتے تھے۔ اکثر ایسا ہوتا کہ وہ ان پاکدامن خواتین پر غلط تہمت لگانے کے بعد اللہ سے مغفرت کا طلبگار ہوتا اور ان لوگوں کے سامنے ان کے اس تہمت سے مبّرا ہونے کا اقرار کرتا اور اپنے اس بے جا الزام پر معذرت کرتے ہوئے کہتا کہ جب ان خواتین کے مردوں نے اس پر ظلم کیا تو اس نے ان کے ظلم کا بدلہ لینے کے لیے ایسی باتیں کہہ دیں۔ بعض نوخیز شعراء محض اس لیے جریر کی ہجو کرتے تھے کہ اگر جواب میں وہ ان کی ہجو کر دے تو ان کا نام ہو جائے گا۔ چنانچہ بشار بن برد' جو آگے چل کر عباسی دور کا بہت نامور شاعر ہوا' کہتا ہے کہ میں نے اسی نیت سے جریر کی ہجو کہی تھی۔ لیکن اس نے مجھے لڑکا سمجھ کر نظر انداز کر دیا اور اس کا کوئی جواب نہ دیا۔

جریر کی ہجو ایسی کاٹ دار اور تباہ کن ہوتی تھی کہ جو بھی بدقسمتی سے اس کا نشانہ بنتا وہ صحیح سالم نہ رہ پاتا۔ اس کا اندازہ راعی الابل کے مشہور واقعے سے ہوسکتا ہے۔ راعی جو کوئی اتنا بڑا شاعر نہیں تھا' جریر نے اس کے قبیلے بنی نمیر کی مدح کی تھی' لیکن راعی نے علی الاعلان اپنی اس رائے کا اظہار کیا کہ فرزدق جریر سے بڑا شاعر ہے' حالانکہ فرزدق نے اس کے قبیلے کے خلاف شعر کہہ رکھے تھے۔ ایک دن جریر راعی کے پاس اس کے رویے کی شکایت کرنے گیا تو راعی نے' جو ایک خچر پر سوار تھا' اور اس کا بیٹا جندل بھی اس کے ساتھ تھا' اس کو کوئی جواب نہ دیا اور جندل نے باپ سے کہا کہ آپ کو بنوکلیب کے اس کتے سے کیا خوف یا کیا اُمید ہے کہ اس کے لیے آپ نے اپنے آپ کو روک رکھا ہے۔ اسی وقت اس نے باپ کے خچر کو کوڑا مارا تو وہ بڑی تیزی کے ساتھ جریر کو دھکا دے کر آگے بڑھا اور اس کی ٹوپی زمین پر گر گئی۔ راعی نے یہ دیکھ کر بھی کوئی پروا نہ کی اور اپنی راہ چل دیا۔ جریر نے ٹوپی اٹھا کر سر پہ رکھی اور جندل کو خطاب کر کے ایک شعر کہا جس کا مطلب یہ تھا کہ اے جندل تمہارا قبیلہ نُمیر تمہارے بارے میں کیا کہے گا جب میرا زہر میں بجھا ہوا تیر تمہارے باپ کے جسم کے پار ہوگا۔ غیظ وغضب سے بھرا ہوا جریر اپنے گھر واپس آیا اور کھجور کی شراب اور ایک چراغ منگوا کر اپنے کام میں لگ گیا۔ نماز عشاء کے بعد سے فجر تک وہ بہت کرب کے عالم میں شعر کہتا رہا اور بنونُمیر کے خلاف اسی اشعار کی ہجو کہہ کر دم لیا۔ جب اس نے نظم ختم کی تو ''اللہ اکبر'' کا نعرہ لگایا اور اس نظم کو لے کر سوق مربد آ گیا جہاں اسے اُمید تھی کہ راعی الابل بھی ہو گا اور فرزدق بھی۔ اس نے راعی کو سلام کیے بغیر نظم سنانی شروع کی۔ جریر بولتا جاتا تھا اور وہ دونوں راعی اور فرزدق' سر جھکائے اسے بڑی تشویش اور اذیت سے سن رہے تھے۔ جب وہ اس شعر پر

پہنچا کہ :

فغض الطرف انك من نُمير       فلا کعباً بلغت ولا کلابا

(پس نگاہیں نیچی کرکہ تو بنونمیر سے ہے نہ تو قبیلہ کعب کے مرتبے کو پہنچ سکا اور نہ کلاب کے)

تو راعی اُٹھا اور وہاں سے سیدھا گھر جانے کے لیے اپنے ساتھیوں سے کہنے لگا: زینیں کسو اور جلدی سے چلتے بنو جریر نے تمہیں ذلیل کر کے رکھ دیا ہے...... کچھ دن بعد راعی جب بصرہ کو چھوڑ کر اپنے قبیلے میں واپس آیا تو قبیلے والوں نے اسے لعنت ملامت کی کہ اپنے قبیلے نُمیر کو اس نے کس طرح ذلت کے گڑھے میں دھکیل دیا ہے۔ جریر کے اس ہجویہ شعر کا ایسا اثر اس قبائلی ماحول پر ہوا کہ بنونُمیر اپنے قبیلے کا نام بتاتے ہوئے شرمانے لگے۔

جریر اور فرزدق کے درمیان ہجوگوئی کا سلسلہ جو تقریباً نصف صدی تک چلتا رہا' اس کی ابتدا یوں ہوئی کہ جریر کے گھر والے اگرچہ غریب تھے' تاہم ان میں شعرگوئی کا شوق تھا اور قبیلے کے شعراء کے ساتھ مل کر ہجوگوئی کیا کرتے تھے۔ ایک دفعہ یوں ہوا کہ ان کے چچیرے خاندان کے ایک شاعر غسان السلیطی نے ان پر غلبہ پالیا اور جریر نے دیکھا کہ وہ اس کی قوم کی ہجو کر رہا ہے۔ چنانچہ اس کے لوگ اس کے گرد جمع ہو گئے۔ جریر نے غیرت میں آکر اس شاعر کی بہت بری طرح سے ہجو کی' جس کو سن کر اس کے اقارب بہت خوش ہوئے اور اس پر فخر کرنے لگے۔ اس طرح غسان اور جریر کے درمیان ہجوگوئی کا سلسلہ چل نکلا' جس میں جریر کا پلڑا ہمیشہ بھاری رہتا۔ یہ دیکھ کر بنی مجاشع کا ایک شاعر بعیث اس کی مدد کرنے لگا۔ بنی مجاشع قبیلہ بنوتمیم سے فرزدق کے اقرباء تھے۔ جریر نے غسان کے ساتھ بعیث کو بھی اپنی لپیٹ میں لے لیا اور بنی مجاشع کی عورتوں کے بارے میں بہت بُری بُری باتیں کیں۔ فرزدق اس وقت شاعری میں نامور ہو چکا تھا اور اس فن میں بڑے بڑے شاعروں کو پیچھے چھوڑ گیا تھا۔ لیکن بعیث اور جریر کے اس جھگڑے کے وقت اس نے ہجوگوئی سے تائب ہو کر اپنے آپ کو قید کر رکھا تھا اور قسم کھائی تھی کہ جب تک قرآن حفظ نہیں کر لے گا گھر سے باہر نہیں نکلے گا۔ مجاشع کی عورتوں کی جب جریر نے بدگوئی کی تو وہ فرزدق کے پاس آئیں اور اس کو ملامت کی کہ وہ اپنے گھر میں بیٹھ گیا ہے اور جریر ان کی عزتیں تار تار کر رہا ہے۔ اس پر فرزدق کو غیرت آئی۔ اس نے اپنے آپ کو قید سے آزاد کیا اور جریر کی ہجو کہی۔ اس دن کے بعد سے ان دونوں میں ہجوگوئی کا سلسلہ چل نکلا اور بعیث وغیرہ اب میدان سے ہٹ گئے۔ ہجوگوئی کے اس معرکے میں کوئی اسی کے قریب شاعر کود پڑے' جن میں اخطل بھی تھا۔ جریر نے اس مقابلے میں سب کو پچھاڑ دیا' سوائے فرزدق اور اخطل کے' جو اس کے سامنے ڈٹے رہے۔ جریر دس برس تک فرزدق کی ہجو کرتا رہا۔ وہ یمامہ میں رہتا تھا اور فرزدق بصرے میں تھا جہاں علمائے لغت و نحو اور

نقادانِ ادب رہتے تھے، جہاں راویوں کی کثرت تھی اور وہ اس کے شعر یاد کرتے اور سنایا کرتے تھے۔ چنانچہ یربوع نے جریر کو بصرہ بلا لیا تا کہ وہ یہاں رہ کر فرزدق کے دوبدو اس کی ہجو کرے اور اس کے کلام کو راوی اور ادیب لوگ سنیں۔ اس طرح جریر بصرے چلا آیا اور اکثر یہاں رہنے لگا۔ یہاں آ کر، جیسا کہ اوپر ذکر ہوا، جریر سوقِ مربد میں آنے جانے لگا۔ وہ فرزدق کی ہجو کرتا رہا اور ان کے درمیان شعری مقابلے ہوتے رہے۔ یہیں سے جریر کو عراق کے والیوں مثلاً عبدالملک کے بھائی بشر بن مروان اور حجاج بن یوسف کے ساتھ تعلق قائم کرنے کا موقع ملا۔ حجاج کے ساتھ تو اس کا تعلق اتنا بڑھا کہ خود عبدالملک بھی اس سے حسد کرنے لگ گیا۔

اخطل، فرزدق اور جریر کے درمیان ہجو گوئی کا ایک طویل سلسلہ چلا یہاں تک کہ اخطل نے انتقال کیا۔ اس کے بعد جریر کے سامنے صرف فرزدق رہ گیا اور ان دو شاعروں کے درمیان ہجو گوئی نے ''نقائض'' کی صورت اختیار کر لی، جن کا لوگوں میں بہت چرچا ہوا اور شعراء نے ان میں بڑی دلچسپی دکھائی۔ ان ہجویہ نظموں کو ''نقائض'' اس لیے کہتے تھے کہ پہلے ایک شاعر ایک نظم کہتا تھا تو دوسرا اس نظم کا اسی وزن اور قافیہ کا التزام کرتے ہوئے جواب دیتا تھا۔ آخر جب ہجو گوئی کے ان معرکوں پر کافی عرصہ گزر گیا تو فرزدق نے محسوس کیا کہ یہ سلسلہ اب ختم ہو جانا چاہیے۔ چنانچہ اس نے یہ سلسلہ ختم کر دیا اور توبہ کر لی اور پھر وفات پا گیا۔ فرزدق کے بعد جریر بھی کچھ مہینے ہی زندہ رہا اور ۷۲۸ء میں انتقال کر گیا۔ جریر کا دیوان چھپ چکا ہے۔

**شاعری:** علمائے ادب اور ائمہ نقد کا اس امر پر اتفاق ہے کہ اسلام کے زمانے میں عربی کے جو شاعر نمایاں ہوئے ان میں جریر، فرزدق اور اخطل سے زیادہ قادر الکلام کوئی نہیں تھا۔ اختلاف البتہ اس بات میں ہے کہ ان تینوں میں سے بڑا کون تھا۔ چنانچہ اس بارے میں ہر شخص کی اپنی پسند اور ترجیح ہے۔ جس شخص کو جذبۂ عشق کی نزاکت، حسیناؤں کے ساتھ اظہارِ محبت کا گداز، الفاظ کا حسن و جمال، اسلوب کی ملائمت اور شاعری کے گوناگوں موضوعات پر اظہارِ خیال پسند ہو، وہ جریر کو سب سے بڑا شاعر مانے گا۔ جس شخص کو کسی شاعر میں محسوس ہو کہ وہ فخر کی شاعری بہت اچھی کر لیتا ہے، اس کے الفاظ میں طنطنہ ہے، اس کے اظہار میں مشکل پسندی ہے اور شعر میں ملائمت کی بجائے صلابت ہے اور توانائی ہے، تو وہ فرزدق کو سب سے افضل سمجھے گا۔ اور جو بلاغتِ لفظ اور حسنِ بیان کے ساتھ ساتھ اس بات کو مدنظر رکھے کہ اعلیٰ درجے کی مدح کیا ہوتی ہے اور ہجو میں گہری چوٹ کیسے لگائی جاتی ہے۔ نیز یہ کہ شراب کی کیفیات اور پینے پلانے والوں کا احوال بہت عمدگی سے کیونکر نظم کیا جاتا ہے، تو وہ اخطل کو بہتر شاعر قرار دے گا۔ پھر کچھ لوگ ایسے بھی ہیں جو ان شعراء کا موازنہ کرتے ہوئے ایسے امور بیچ میں لے آتے ہیں جن کا ادب و



Scanned with CamScanner

فن سے کوئی تعلق نہیں ہوتا۔ چنانچہ حسب و نسب کو اہمیت دینے والے فرزدق کو سب سے اچھا مانتے ہیں۔ اور جو دیندار اور پاکیزہ کردار والے ہیں وہ جریر کی طرفداری کرتے ہیں اور میکی ادباء قدرتی طور پر اخطل کو ان سب سے آگے رکھتے ہیں۔ لیکن جہاں تک فن شعر کا تعلق ہے اس کے معاملے میں ان آراء کو زیادہ اہمیت نہیں دی جا سکتی۔ مشہور ادیب اور نقاد احمد حسن الزیات اس بحث کو بڑی خوبصورتی کے ساتھ چند سطروں میں سمیٹتے ہیں۔ وہ اپنی ''تاریخ الادب العربی'' میں جریر کا ذکر کرتے ہوئے کہتے ہیں:

''جریر میں نہ تو اخطل کی خباثت طبع تھی اور نہ اس کی مے نوشی۔ نہ اس میں فرزدق کی درشتی تھی اور نہ اس کا فسق و فجور۔ وہ شستہ مزاج اور نازک شعور کا مالک تھا۔ اس نے غلط طریقوں سے مال نہ جمع کیا اور وہ اپنے دین پر کاربند اور اچھے اخلاق کا مالک رہا۔ چنانچہ ان ساری باتوں کا اثر اس کی شاعری پر دکھائی دیتا ہے۔ اس کی شاعری میں اسلوب کی دلربائی ہے' عشقیہ شاعری کی حلاوت ہے' ہجو کی تلخی ہے' مرثیے کا گداز ہے' اور شاعری کے تمام موضوعات پر ماہرانہ اظہار خیال ہے۔ ان اسباب کی بنا پر وہ آسمان شاعری کا سب سے درخشاں ستارہ تھا اور ''شاعر'' کے وصف پر سب سے زیادہ پورا اترنے والا۔ جبھی اخطل اور فرزدق کے مقابلے میں اس کے مداح بھی زیادہ تھے۔ اس لیے کہ اخطل نے صرف مدح' ہجو اور خمریات میں اچھی شاعری کی تھی' اور فرزدق نے صرف فخر کی شاعری میں نام پیدا کیا تھا۔''

نمونۂ کلام: عبدالملک بن مروان کی مدح میں جریر نے جو پہلا قصیدہ کہا' اس کے چند شعر:

الستم خیر من رکب المطایا — وأندی العالمین بطون راح

و قوم قد سموت لهم' فدا نوا — بدهم فی مُلَملَةٍ رداح

ابحتَ حمی تهامة بعد نجدٍ — وما شیئ حمیت بمستباح

لکم شُم الجبال من الرواسی — وأعظم سیل معتلج البطاح

دعوت الملحدین ابا خُبَیب — جماحاً' هل شفیت من الجماح

فقد و جدوا الخلیفة هبر زیّاً — الفّ العیص لیس من النواحی

(کیا آپ لوگ ان سب لوگوں سے بہتر نہیں ہو جو کبھی سواریوں پر بیٹھے اور تمہاری ہتھیلیاں کل عالم سے بڑھ کر سخی نہیں ہیں۔

کتنے لوگ تھے جن پر آپ نے برتری حاصل کی تو وہ ایک لشکر کثیر کے ساتھ آپ کے فرماں بردار ہو گئے۔

نجد کے بعد آپ نے تہامہ کے ممنوعہ علاقے کو بھی مباح قرار دے دیا' لیکن جس چیز کی آ

حفاظت کریں اسے کوئی مباح قرار نہیں دے سکتا۔
آپ کے لیے ثابت و قائم اونچے پہاڑ ہیں اور وادیوں کی تمع ریت پر بہنے والے بڑے سیلاب ہیں۔
عبداللہ بن الزبیر! تو نے سرکشی کرتے ہوئے ملحدوں کو بلا لیا' تو کیا اس سرکشی سے تمہیں کچھ افاقہ ہو گیا ہے۔
انہوں نے خلیفہ کو خالص سونے کی مثل پایا' اچھے اصل درختوں کا ذخیرہ' اِدھر اُدھر کے درختوں کا نہیں۔)

اسی طرح خلیفہ عمر بن عبدالعزیزؒ کی مدح میں شاعر کہتا ہے :

انا لنرجُو اذا ما الغیثُ أخلفنا — من الخلیفة ما نرجو من المطر
نا ل الخلافةَ اذ کانت له قدراً — کما أتی ربَّه موسی علی قدَرِ
أ اذکر الجهدَ و البلوی التی نزلت — ام قد کفانی الذی بُلّغت من خبری
مازلت بعدک فی دارٍ تعرّقنی — قدعیٌّ بالحیّ اصعادی و منحدری
کم بالمواسم من شعثاءَ أرملةٍ — ومن یتیم ضعیف الصوت والنظر
یدعوک دعوةَ ملهوف کأنّ به — خَبُلاً من الجنّ او مسًّا من النُّشر
ممّن بعدَک تکفی فقدَ والده — کالفرخ فی العُش لم یدرج ولم یطر

(ہمارے ہاں جب بارش نہ ہو تو ہم خلیفہ سے اسی طرح کی اُمید رکھتے ہیں جو ہم بارش سے رکھتے ہیں۔
اس نے ٹھیک وقت پر خلافت سنبھالی' جس طرح موسیٰ اپنے رب کے پاس ٹھیک اندازے کے مطابق آیا تھا۔
کیا میں اس مشقت اور مصیبت کا ذکر کروں جو مجھ پر آئی' یا جو کچھ آپ کو میرے متعلق بتایا گیا وہی کافی ہے۔
میں آپ کے بعد ایک ایسی جگہ رہا جس کے مصائب نے مجھے کمزور کر دیا' یہاں تک کہ میں محلے میں چڑھنے اترنے سے بھی معذور ہو گیا۔
حج کے دنوں میں کتنی میلے بالوں والی بیوائیں ہوتی ہیں اور کتنے یتیم' نحیف آواز اور کمزور نگاہ والے!
آپ کو اس طرح پکارتے ہیں جیسے کوئی ستم رسیدہ ہو' کہ اس پر یا تو جنات کا اثر ہے' یا کسی تعویذ کا
ایسے لوگ آپ کو اپنے باپ کا بدل سمجھتے ہیں' کہ ان کی حالت گھونسلے کے چوزے کی ہوتی ہے جو

نہ بڑا ہوا ہے اور نہ اڑ سکتا ہے۔)

فرزدق کی ہجو کرتے ہوئے جریر کہتا ہے:

لقد ولدت ام الفرزدق مُقرفا — فجاءت بوزار قصیر القوادم
یوصّل حبلیه اذا جنّ لیله — لیرقی الی جاراته بالسلالم
لقد کان اخراج الفرزدق عنکم — طهوراً لمابین المصلّی ورالم
تعالَوا نُحاکمکم و فی الحق مُقنع — الی الغُرّ من اهل البطاح الاکارم
فان قریش الحق لم تتبع الهَوی — ولم یرهَبوا فی الله لومة لائم
اذکّر کم بالله من ینهل القنا — ویضرب کبش الجحفل المتراکم؟
وکنتم لنا الاتباع فی کل موقفٍ — وریشُ الذنابی تابع للقوادم
اذا عُدّت الایام أخزیت دارماً — و تُخزیک یا ابن القین' ایّام دارم

(فرزدق کی ماں نے ایک مخلوط النسل کو جنم دیا ہے' چھوٹے بازوؤں والے' گناہ کی پوٹ کو۔
جب رات پڑتی ہے تو اپنی رسیوں کو باندھ لیتا ہے تاکہ ان کے ذریعے چڑھ کر وہ اپنی ہمسایہ عورتوں تک پہنچ جائے۔
اگر فرزدق کو اپنے ہاں سے نکال دو تو یہ مسجد اور قلعۂ راقم کے درمیان سارے علاقے کے لیے باعث پاکیزگی ہوگا۔
آؤ ہم تمہارے معاملے میں اشرافِ مکہ سے فیصلہ کراتے ہیں' اور حق بات سے یقین تو حاصل ہوتا ہے نا۔
اس لیے کہ حق کا ساتھ دینے والے قریش کبھی خواہش کی پیروی نہیں کرتے اور نہ اللہ کے معاملے میں کسی ملامت کی پروا کرتے ہیں۔
میں تمہیں اللہ کی یاد دلا کر پوچھتا ہوں: کون ہے جو اپنے نیزوں کو سیراب کرتا ہے اور بڑے لشکر کے سردار کو مار گراتا ہے۔
تم لوگ ہر موقع پر ہمارے پیچھے چلنے والے تھے اور دُم کے پر بازوؤں کے پروں کے پیچھے ہی رہتے ہیں۔
جب ایام جنگ کا ذکر ہوگا تو تم بنو دارم کے لیے باعث شرم ہو گے' اور اے غلام زادے تمہیں دارم کے ایام بدنام کردیں گے۔)

جریر کی شاعری کا بہت عمدہ نمونہ وہ قصیدہ ہے جس میں وہ اپنی بیوی کا مرثیہ کہتا ہے۔ یہ مرثیہ اتنا

مشہور ہوا کہ فرزدق کی بیوی نوار کی موت پر بھی یہی پڑھا گیا۔ کہتا ہے:

| | |
|---|---|
| لولا الحیاء لهاجنی استعبار | ولزرت قبرک والحبیب یُزار |
| ولَهتِ قلبی اذ علتنی کبرة | و ذو و التمائم من بنیکِ صغارُ |
| لا یُلبث القُرناء ان یتفرقوا | لیلُ یکرُّ علیهمُ و نهارُ |
| صلیٰ الملائکةُ الذین تُخُیروا | والطیبون علیکِ والابرارُ |
| فلقد اراکِ کسیت أحسن منظرٍ | ومع الجمال سکینة ووقار |

(اگر شرم و حیا نہ ہوتی تو آنسوؤں کا بہہ نکلنا مجھے مضطرب کر دیتا اور میں تمہاری قبر کی زیارت کو ضرور آتا' کہ محبوب کی زیارت کی ہی جاتی ہے۔

تو نے میرے دل کو سرگشتہ کر دیا' جبکہ بڑھاپا مجھ پر طاری ہو گیا ہے اور تیری اولاد میں تعویذوں والے بچے ابھی چھوٹے ہیں۔

رات اور دن جو بار بار ان پر حملہ آور ہوتے ہیں وہ رفیقانِ حیات کو زیادہ ٹھہرنے نہیں دیتے' چنانچہ وہ بچھڑ جاتے ہیں۔

تیرے لیے دعا کریں وہ فرشتے جو برگزیدہ ہیں' اور پاک اور نیک لوگ!

میں دیکھ رہا ہوں کہ تو بہت خوبصورت لباس میں ہے' اور تمہارے حسن کے ساتھ اطمینان اور وقار کی کیفیت ہے۔)

بیوی کی موت پر گریہ و زاری اُس وقت کے عرب معاشرے میں شیوۂ مردانگی کے خلاف سمجھی جاتی تھی۔ فرزدق کے بعض اشعار میں یہی تصور پیش کیا گیا ہے۔ اس پس منظر میں دیکھیں تو جریر کے قصیدے کے پہلے شعر کی تاثیر بڑھ جاتی ہے۔ اس میں عورتوں کے بارے میں فرزدق کے کھردرے احساسات کے مقابلے میں جریر کی لطافتِ طبع نمایاں ہو کر سامنے آتی ہے۔ وہ اپنی رفیقۂ حیات کی جُدائی پر اپنے باطنی اضطراب کا اعتراف کرنے میں کچھ عار محسوس نہیں کرتا اور کہتا ہے کہ اگر لوگوں کے خود ساختہ تصورات کی شرم نہ ہوتی تو یہ اضطراب آنسوؤں کی صورت میں بہہ نکلتا اور میں تمہاری قبر کی زیارت کو آتا۔

شاعری کے ہر موضوع پر جریر کے کچھ اشعار ایسے ہیں جو اتنے مشہور ہوئے کہ ضرب المثل بن گئے۔ چنانچہ کہتے ہیں کہ غزلیہ شاعری میں عربوں نے جو سب سے اچھا شعر کہا وہ یہ ہے:

| | |
|---|---|
| ان العیونَ التی فی طرفها حَوَرُ | قتلننا لم یُحیین قتلانا |
| یصرعَن ذا اللُّب حتی لا حَراکَ به | و هُن أضعف خلق الله انسانا |

(ان سرمہ سا آنکھوں نے ہمیں مار ڈالا' اور پھر اُن مرے ہوؤں کو زندہ بھی نہ کیا۔
(ان سرمہ سا آنکھوں نے ہمیں مار ڈالا اچھی بھلی سمجھ والے کو اس طرح مار گراتی ہیں کہ وہ ہل بھی نہیں سکتا' حالانکہ وہ اللہ کی سب سے کمزور مخلوق ہیں۔)

اور مدح میں سب سے اچھا شعر جریر کا یہ کہنا ہے:

الستم خیرَ من رکب المطایا وانـدی العـالـمیـن بطونَ راح

(کیا آپ لوگ ان سب سے بہتر نہیں ہیں جو کبھی سواریوں پر بیٹھے اور آپ کی ہتھیلیاں کل عالم سے بڑھ کر سخی نہیں ہیں؟)

فخر کی شاعری میں سب سے عمدہ شعر یہ ہے۔

اذا غضبت علیک بنُو تمیم حسبت َالناس کلھم غِضابا

(جب بنوتمیم تم سے ناراض ہو جائیں تو تمہیں یوں لگے گا جیسے سب لوگ تم سے ناراض ہو گئے۔)

اور ہجو میں تو جریر کا یہ شعر ایسا ہے کہ اس نے پورے قبیلے کو شرم سے منہ چھپانے پر مجبور کر دیا:

فغُضّ الطرف انک من نمیر فلا کعباً بلغت ولا کِلابا

(نگاہیں نیچی کر لے کہ تو بنُونمیر کے قبیلے سے ہے' تو نہ قبیلہ کعب کے مقام کو پہنچ سکا نہ کلاب کے مقام کو۔)

اور سب سے سچا شعر جو عربوں نے کہا وہ جریر کا یہ شعر ہے:

انی لا رجو منک خیراً عاجلاً والنفسُ مُولَعة بحبّ العاجلِ

(میں آپ سے فوری بھلائی کی اُمید رکھتا ہوں اور انسان ہمیشہ فوری چیز کی خواہش کا اسیر ہوتا ہے۔)

اور طنز و استہزاء میں جریر کا یہ شعر بے مثال ہے:

زعم الفرزدق ان سیقتل مربعاً ابشر بطول سلامة یا مَربعَ

(فرزدق کا خیال ہے کہ وہ مربَع کو قتل کر دے گا' لو مربع اب تم لمبی سلامتی کی خوشی مناؤ۔)

جریر کے کمالات میں سے ایک یہ ہے کہ اس نے اخطل کے خلاف کہی گئی ایک ہی ہجو یہ نظم میں پہلے

مزاح کا اسلوب اختیار کیا اور پھر آگے چل کر سنجیدہ ہو گیا۔ اگر کوئی دوسرا شاعر اس طرح کا تجربہ کرتا تو کامیاب نہ ہوتا۔

☆......☆......☆

# صدر اسلام اور اموی دور کی نثر

اس عہد میں چونکہ ابھی لکھنے کا زیادہ رواج نہیں ہوا تھا' اس لیے شاعری کے علاوہ ادب کے جو نمونے اس دَور میں ملتے ہیں وہ زیادہ تر خطابت میں ملتے ہیں۔ اسلام کی دعوت جب شروع ہوئی اور پھر وہ اطراف عرب میں پھیلنے لگی تو خطابت کی ضرورت پڑنے لگی' اور اس ضرورت کو پورا کرنے کے لیے خطابت کے فن میں ترقی دیکھنے میں آئی۔ عام خیال یہ ہے کہ خطابت کو جو عروج اس عہد میں حاصل ہوا' اس کی مثال بعد میں کہیں نہیں ملتی۔

اس دور کے خطیبوں میں سب سے بلیغ اور سب سے مؤثر تو خود رسول اللہ ﷺ تھے' اور ان کے بعد ان کے صحابہ میں سے حضرت ابوبکر صدیقؓ، حضرت عمرؓ اور حضرت علی بن ابی طالبؓ نے بھی خطابت میں اعلیٰ نمونے پیش کیے۔ اسی زمانے میں سحبان وائل نے بطور خطیب کے ایسی شہرت پائی کہ ضرب المثل ہو گیا۔ اسی طرح زیاد بن ابیہ اور اموی عامل (گورنر) حجاج بن یوسف کے خطبے مشہور ہوئے۔

## محمد ﷺ (م ۶۳۲)

آنحضرتؐ کی پیدائش اور پرورش عرب کے سب سے زیادہ فصیح و بلیغ قبائل میں ہوئی تھی۔ آپ بنوہاشم میں پیدا ہوئے۔ قریش کے قبیلے میں بڑے ہوئے اور پھر بنو سعد کے قبیلے کی ایک خاتون نے آپ کو دودھ پلایا۔ بعد میں جب آپ پر وحی نازل ہونا شروع ہوئی تو آپ کی زبان سے اللہ کا کلام جاری ہونے لگا اور مسلسل تیئیس برس تک آپ اپنی زبان سے خدا کا پیغام اپنی قوم تک پہنچاتے رہے۔ ان سب باتوں نے مل کر آپ کو ایک ایسا خطیب اور مقرر بنا دیا کہ جس کی تقریر اپنے زورِ بیان اور خوبصورت ایجاز و اختصار کی وجہ سے سننے والوں کے دلوں میں اتر جاتی تھی اور ان پر بے پناہ اثر کرتی تھی۔ آنحضرتؐ نے متعدد موقعوں پر چھوٹے اور بڑے خطبے دیئے' جو احادیث اور سیرت کی کتابوں میں بکھرے ہوئے ملتے ہیں۔ اگرچہ آپ کے ان خطبوں کی تعداد بہت زیادہ ہونی چاہیے تھی' لیکن چونکہ

حدیثوں کی تدوین بہت بعد میں ہوئی' اس لیے یہ خطبے جو آنحضرتؐ کی عام گفتگو کے مقابلے میں طویل ہوتے تھے' پوری طرح محفوظ اور مدوّن نہ کیے جا سکے۔ تاہم آپ کے خطبات کی ایک بڑی تعداد احمد ذکی صفوت کی مرتب کردہ کتاب "جمهرة خطب العرب في عصور العربية الزاهرة" میں مل جاتی ہے۔

آنحضرتؐ کا اولین خطبہ جو تاریخ میں محفوظ ہے' اس میں آپ نے اپنی نبوت کا اعلان کرتے ہوئے قریش مکّہ اور عرب وعجم کو خطاب کرتے ہوئے فرمایا تھا:

ان الرائد لا يكذب اهله' والله لو كذبتُ الناس جميعاً ما كذبتكم ولو غررتُ الناس جميعاً ما غررتكم. والله الذى لا اله الا هو'. انى رسول الله اليكم خاصةً والى الناس كافةً. والله لتمو تُن كما تنا مون و لَتبعَثُنَّ كما تستيقظون ولتحاسَبُنَّ بما تعملون و لتجزَوُنَّ بالاحسان احساناً و بالسُّوء سوءً ا. وانها لَجنّة ابداً او النار ابدا.

(کوئی بھی خبر دینے والا اپنوں سے جھوٹ نہیں بولتا۔ خدا کی قسم اگر میں سب لوگوں سے جھوٹ بولتا تو بھی تم سے کبھی جھوٹ نہ بولتا۔ اور اگر میں دنیا والوں کو دھوکا دیتا تو تمھیں پھر بھی کبھی دھوکا نہ دیتا۔ قسم ہے اللہ کی جس کے سوا کوئی معبود نہیں' میں اللہ کا رسول ہوں جو تمہاری طرف خاص طور پر بھیجا گیا ہوں اور دوسرے تمام لوگوں کی طرف بھی۔ خدا کی قسم تم اسی طرح مر جاؤ گے جس طرح تم سوتے ہو' اور اسی طرح اٹھائے جاؤ گے جس طرح تم جاگتے ہو۔ پھر تم نے جو عمل کیے ان کا حساب لیا جائے گا۔ اچھے کاموں کا تمھیں اچھا بدلہ دیا جائے گا اور بُرے کاموں کا بُرا۔ اس کے بعد یا تو ہمیشہ کے لیے جنت ہوگی یا ہمیشہ کے لیے جہنم۔)

اس کے علاوہ آپ کا ایک مشہور خطبہ ہے جو آپ نے حجۃ الوداع کے موقع پر دیا۔ آپ نے ارشاد فرمایا:

ايها الناس! انما المؤمنون اخوة. ولا يحلّ لا مرئ مال اخيه الا عن طيب نفس منه. الا هل بلّغتُ؟ اللهم اشهد' فلا ترجعُنّ بعدى كفاراً يضرب بعضكم رقاب بعض' فانى قد تركت فيكم ما ان اخذ تم به لن تضلّوا بعدى : كتاب الله! الا هل بلّغتُ؟ اللهم اشهد' ايها الناس! ان ربكم واحد. وان اباكم واحد. كلكم لآدم و آدم من تراب. اكرمكم عندالله اتقا كم.

**ولیس لعربیَ علی عجمّی فضل الا بالتقوی. الاھل بلّغت؟ اللھم اشھد.**

**قالوا : نعم، قال فلیبلّغ الشاھدُ الغائبَ .**

(لوگو مومن آپس میں بھائی بھائی ہیں اور کسی شخص کے لیے اس کے بھائی کا مال حلال نہیں ہے جب تک وہ اپنی رضامندی سے نہ دے۔ کیا میں نے پیغام پہنچا دیا؟ اے خدا گواہ رہیو۔ تو تم میرے بعد پھر سے کافر نہ ہو جانا کہ ایک دوسرے کی گردن مارنے لگو۔ اس لیے کہ میں نے تمہارے لیے ایک ایسی چیز چھوڑی ہے کہ اگر تم نے اس پر عمل کیا تو میرے بعد کبھی گمراہ نہیں ہو گے۔ وہ کتاب اللہ ہے۔ کیا میں نے پیغام پہنچا دیا؟ اے خدا گواہ رہیو، لوگو تمہارا رب ایک ہے اور تمہارا باپ بھی ایک ہے۔ تم سب آدم سے ہو اور آدم مٹی سے تھے۔ اللہ کے نزدیک تم میں سب سے بہتر وہ ہے جو سب سے زیادہ متقی ہے۔ اور کسی عربی کو کسی عجمی پر فضیلت حاصل نہیں ہے، مگر صرف تقویٰ کے ساتھ۔ کیا میں نے پیغام پہنچا دیا؟ اے خدا گواہ رہیو، لوگوں نے کہا: ہاں آپ نے پیغام پہنچا دیا۔ آپ نے فرمایا تو جو بھی یہاں موجود ہے اسے چاہیے کہ وہ اس شخص کو یہ پیغام پہنچا دے جو یہاں موجود نہیں ہے۔)

ایک اور موقع پر آپؐ نے یہ خطبہ دیا، جس میں آپؐ نے دنیا کی بے ثباتی اور آخرت کی لازوال زندگی پر تبصرہ فرمایا:

**ایھا الناس! ان لکم معالِمَ، فانتھوا الی معالِمکم، وان لکم نھایۃً فانتھوا الی نھایتکم. فان العبد بین مخافتَین : اجلٍ قد مضی لا یدری ما اللہ فاعل فیہ. واجلٍ باق لا یدری ما اللہ قاضٍ فیہ. فلیأ خذ العبد من نفسہ لنفسہ. ومن دنیاہ لآخرتہ، ومن الشبیبۃ قبل الِکبرَ، ومن الحیاۃ قبل المَمات. فوالّذی نفس محمدٍ بیدہ ما بعد الموت من مُستعتَبٍ ولا بعد الدنیا من دار الا الجنّۃ والنار.**

(لوگو تمہارے لیے نشانات مقرر ہیں، پس تم ان نشانات تک پہنچ کر رک جاؤ اور تمہارے لیے ایک منتہیٰ ہے، پس تمہیں اپنے منتہا تک پہنچنا چاہیے۔ ایک بندہ ڈر کی دو منزلوں کے درمیان ہے۔ ایک منزل جو گزر چکی ہے، وہ نہیں جانتا کہ اللہ اس کے بارے میں کیا کرنے والا ہے، اور ایک منزل جو ابھی باقی ہے اور وہ نہیں جانتا کہ اللہ اس کے بارے میں کیا فیصلہ کرے گا۔ پس ایک بندے کو چاہیے کہ اپنے لیے خود اپنے عمل سے توشہ تیار کرے، اور اپنی دنیا سے اپنی آخرت

کے لیے سامان اکٹھا کرے۔ بڑھاپے سے پہلے جوانی کے وقت اور موت سے پہلے زندگی کی حالت میں۔ قسم اس ذات کی جس کے ہاتھ میں محمد کی جان ہے' موت کے بعد خوشنودی طلب کرنے کا کوئی موقع نہیں رہتا اور نہ دنیا کے بعد سوائے جنت یا دوزخ کے کوئی ٹھکانا ہے۔)

آنحضرتؐ کے ارشادات جوامع الکلم (الفاظ کے جامع) ہوتے تھے' یعنی پوری بات چند لفظوں میں ادا کر دیتے تھے۔ اس بارے میں جاحظ نے لکھا ہے کہ بعض الفاظ وکلماتِ نبوی ایسے ہیں جو آپ سے پہلے کسی عرب کی زبان پر وارد نہیں ہوئے تھے۔ مثلاً مجاہدینِ اسلام سے خطاب کرتے ہوئے آپؐ نے فرمایا: یا خیلَ اللہ ارکبی (اے اللہ کے گھوڑو' یا شہسوارو' سوار ہو جاؤ) یہ محاورہ آپ سے قبل کسی نے استعمال نہ کیا تھا۔ اسی طرح ایک موقع پر فرمایا: لا تنتطح فیہ عنزان (اس بات میں دو بکریاں سینگ نہیں ٹکراتیں' یعنی یہ بات جھگڑے کی نہیں ہے۔) پھر جنگ کی شدت کے بارے میں آپ نے فرمایا: الآن حَمِی الوطیس (اب تنور گرم ہو گیا ہے) ماتَ حتفَ انفہ (یعنی وہ بستر پر طبعی موت مرا) یہ بھی آپؐ ہی کا جملہ ہے جو بقول حضرت علیؓ انہوں نے پہلے کسی عرب سے نہ سنا تھا۔ ایک دفعہ اونٹوں کے کجاووں پر کچھ عورتیں سوار تھیں۔ اونٹوں والے نے حُدی گانا شروع کی تو اونٹ تیز تیز چلنے لگے۔ اس پر آپ نے اُسے آواز دے کر فرمایا: رِفقاً بالقوارِیر (یہ شیشے کے برتن ہیں' ان کو آرام سے لے جاؤ۔)

آپؐ کے جوامع الکلم میں سے ایک دو مثالیں اس طرح ہیں: آپ نے فرمایا: "رأس العقل بعد الایمان باللہ مداراۃ الناس (یعنی اللہ تعالیٰ پر ایمان لانے کے بعد عقل کی سب سے بڑی بات انسانوں کی دلجوئی کرنا ہے۔) پھر فرمایا: الا ادلکم علی خیر ما یکنز المرء؟ المرأۃ الصالحۃ' اذا نظر الیہا سَرَّتہ' واذا غاب عنہا حفظتہ فی مالہ و عرضہ (کیا میں تمہیں ایک انسان کے بہترین سرمائے کا پتا نہ بتاؤں؟ وہ سرمایہ ایسی نیک عورت ہے کہ اگر مرد اس کو دیکھے تو اس کا دل باغ باغ ہو جائے' اور اگر وہ اس سے دور چلا جائے تو وہ اس کے مال اور اس کی عزت کی حفاظت کرے۔

## ابوبکر صدیقؓ (م ۶۳۴ء)

خلیفۂ اول حضرت ابوبکر صدیقؓ بہت فصیح و بلیغ اور حاضر جواب تھے۔ اپنے خطاب میں وہ بہت طاقتور دلیلوں سے کام لیتے تھے' جس سے سننے والوں پر بہت گہرا اثر پڑتا تھا۔ سقیفہ میں انہوں نے جو خطبہ دیا وہ اس کی بین مثال ہے۔ ہوا یوں کہ جب آنحضرتؐ نے وفات پائی تو صحابہ کے درمیان اس امر پر اختلاف پیدا ہو گیا کہ آپ کے بعد مسلمانوں کا خلیفہ کون ہو گا۔ انصار کہتے تھے کہ یہ خلیفہ ان میں

سے ہوگا' قریش مہاجرین کا کہنا تھا کہ خلیفہ ان میں سے ہوگا۔ یہ نزاع اتنی بڑھی کہ اندیشہ ہونے لگا کہ اس سے کوئی فتنہ نہ پیدا ہو جائے۔ اس موقع پر ابوبکر صدیقؓ نے جو تقریر کی اس میں کہا:

ایھا الناس ! نحن المھاجرون و اوّل الناس اسلاماً واکرمھم احساباً و اُوسطھم داراً و اُحسنھم وجوھاً، واکثر الناس ولادة فی العرب و امسّھم رِحماً برسول الله صلی الله علیه وسلم اسلمنا قبلکم و قُدّمنا فی القرآن علیکم فقال تبارک و تعالیٰ : والسابقون الاوّلون من المھاجرین والانصار والذین اتبعوھم باحسان (التوبة ۹ : ۱۰۰) فنحن المھاجرون وأنتم الانصار' اخواننا فی الدین و شرکاؤ نا فی الفیئ و انصارنا علی العدوّ. آویتم و واسیتم. فجزاکم الله خیرا. فنحن الامراء وانتم الوزَرَاء . لا تدِین العربُ الاّ لھذا الحیّ من قریش. فلا تنفسوا علی اخوانکم المھاجرین ما منحم الله من فضله.

(لوگو! ہم مہاجرین ہیں۔ ہم سب سے پہلے اسلام لائے اور سب سے معزز نسب والے ہیں۔ ہم قبائل کے وسط میں رہنے والے ہیں۔ ان میں سب سے خوش شکل ہیں اور عرب میں سب سے زیادہ اولاد پیدا کرنے والے اور آنحضرتؐ کے ساتھ سب سے قریبی تعلق والے ہیں۔ ہم تم سے پہلے اسلام لائے اور قرآن میں ہمیں آپ لوگوں پر مقدم رکھا گیا۔ فرمایا: ''اور جن لوگوں نے ایمان لانے میں سبقت کی' مہاجرین میں سے بھی اور انصار میں سے بھی' اور جنھوں نے نیکوکاری کے ساتھ ان کی پیروی کی'' چنانچہ ہم مہاجرین ہیں اور تم انصار ہو اور دین میں ہمارے بھائی ہو اور مال غنیمت میں ہمارے حصہ دار ہو' دشمنوں کے مقابلے میں ہمارے مددگار ہو۔ آپ لوگوں نے ہمیں پناہ دی اور ہمیں اپنے برابر سمجھا۔ اللہ آپ کو اس کی جزا دے گا۔ چنانچہ ہم امیر ہیں تو تم وزیر ہو اور یہ جو عرب ہیں یہ صرف قبیلہ قریش کے آگے سرخم کرتے ہیں۔ پس تم اپنے مہاجر بھائیوں سے اُس بات پر حسد نہ کرو جو اللہ نے انہیں مرحمت فرمائی ہے۔)

اس تقریر کے آخر میں آپ نے کہا: یہ دیکھو ابوعبیدہؓ بن الجرّاح اور عمرؓ بن الخطاب موجود ہیں' ان میں سے جس کے ہاتھ پر چاہو بیعت کرلو۔ لیکن حضرت عمرؓ نے پیش دستی کر کے خود حضرت ابوبکرؓ کے ہاتھ میں ہاتھ دے دیا اور کہا: نہیں' ہم آپ کے ہاتھ پر بیعت کرتے ہیں' کیونکہ آپ ہمارے سردار اور ہم لوگوں میں سب سے بہتر ہیں' اور رسول اللہ ﷺ آپ کو سب سے زیادہ عزیز رکھتے تھے۔ اس انتخاب کو

سب لوگوں نے استحسان کی نگاہ سے دیکھا اور حضرت ابوبکرؓ کے ہاتھ پر بیعت کرنے کے لیے سب طرف سے ٹوٹ پڑے۔ یہ حضرت ابوبکرؓ کے اس خطبے کی تاثیر تھی، جس نے مسلمانوں کے درمیان پیدا ہونے والی ایک بڑی نزاع کو ختم کر دیا۔

## عمر بن الخطابؓ (م ۶۴۴)

آپ خلیفۂ ثانی تھے اور خلفاء میں وہ پہلے شخص تھے جنہیں امیر المومنین کا لقب دیا گیا۔ انہوں نے تاریخ میں ہجری تقویم کا آغاز کیا۔ متعدد شہروں کے بسانے کا بندوبست کیا اور انتظامی اور دفتری کاروبار کو مدوّن کرنے کا طریقہ رائج کیا۔ آپ کی بول چال بہت صاف اور واضح ہوتی تھی اور آپ جو کچھ بھی کہتے اس میں بڑی بلاغت ہوتی تھی۔ آپ کی رائے بڑی صائب تھی، اور کئی دفعہ ایسا ہوا کہ کسی مسئلے میں جب وحی نازل ہوئی تو اس نے حضرت عمرؓ کی رائے کی تائید کی۔ آپ دوسروں کے مقابلے میں اشعار کی روایت زیادہ کیا کرتے اور ان سے بہتر نقاد بھی تھے۔ ان کے خطبوں میں وہ خطبہ کافی اہم ہے جو آپ نے خلافت سنبھالنے کے وقت دیا تھا۔ آپ نے فرمایا:

یا ایھاالناس! انی داعٍ فأمنّوا . اللھم انی غلیظ فلیّنی لاھل طاعتک بموافقة الحق ابتغاء وجھک والدار الآخرہ. وارزقنی الغلظة والشدّة علی أعدائک واھل الدعارة والنفاق من غیر ظلم منّی لھم ولا اعتداء علیھم. اللّھم انی شحیح فسخّنی فی نوائب المعروف قصداً من غیر سرف ولا تبذیر ولا ریاء ولا سمعة...... اللّٰھم ارزقنی خفض الجناح ولین الجانب للمومنین. اللھم انی کثیرا الغفلة والنسیان فالھمنی ذکرک علی کل حال و ذکر الموت فی کل حین. اللّٰھم انی ضعیف عن العمل بطاعتک فارزقنی النشاط فیھا و القوۃ علیھا بالنیة الحسنة التی لا تکون الا بعزتک و توفیقک.

(اے لوگو میں دعا کرتا ہوں، آپ آمین کہیں۔ اے اللہ میں سخت مزاج ہوں، مجھے حق کی موافقت میں اپنے اہلِ طاعت کے لیے نرم کر دے۔ اس طرح کہ مجھے تیری رضا اور آخرت کی زندگی کا

خیال ہو۔ ہاں اپنے دشمنوں کے لیے اور فاجروں اور منافقوں کے لیے میرے اندر درشتی اور شدت پیدا کر دے' بغیر اس کے کہ میں ان پر ظلم کروں یا کوئی زیادتی کروں۔ اے اللہ میں ممسک مزاج ہوں' مجھے معروف کے کاموں کے لیے سخی کر دے' لیکن اعتدال کے ساتھ اور بغیر اسراف کے' جس میں کوئی دکھاوا یا نیک نامی مطلوب نہ ہو...... اے اللہ مجھے مومنین کے لیے نرم خو اور خوش مزاج بنا دے۔ اے اللہ مجھ سے غفلت اور نسیان بہت ہوتا ہے۔ اس لیے مجھے یہ توفیق دے کہ میں ہر حال میں تمہیں یاد رکھوں اور ہر آن موت کا خیال دل میں رکھوں۔ اے اللہ میں تمہاری اطاعت گزاری میں کمزور ہوں مجھے اس میں چستی عطا کر اور مجھے اس کی طاقت دے' اچھی نیت کے ساتھ' جو تیرے اعزاز اور توفیق کے بغیر حاصل نہیں ہو سکتی۔)

ایک اور خطبے میں حضرت عمرؓ فرماتے ہیں :

الا وانه قد خُيِّل اليَّ ان اقواماً يقرأون القرآن يريدون ما عند الناس. الا فاريدوا الله لقراء تكم واريدوه باعمالكم. فانما كنا نعرفكم اذ الوحي ينزل واذ النبي صلى الله عليه وسلم بين أظهرنا' فقد رُفع الوحي و ذهب النبيّ عليه السلام' فانما اعرفكم بما اقول لكم : الا فمن اظهر لنا خيرا ظننّا به خيرا وأثنينا به عليه. ومن أظهر لنا شرّاً ظننّا به شرّاً و أبغضنا عليه.

اقدعوا هذه النفوس من شهواتها فانها طُلَعةٌ' واياكم الاّ تقدعوها تنزع بكم الى شرّ غاية. ان هذا الحق ثقيل مرئ' وان الباطل خفيف وبئ. و ترك الخطيئة خير من معالجة التوبة.

(سنو مجھے خیال آیا ہے کہ کچھ لوگ ہیں جو قرآن اس لیے پڑھتے ہیں کہ جو کچھ لوگوں کے پاس ہے وہ حاصل کر سکیں۔ خبردار قرآن کی تلاوت میں صرف اللہ کا خیال رکھا کرو اور اپنے اعمال میں بھی اسی کی رضا چاہا کرو۔ ہم آپ لوگوں کو جانتے تھے جب وحی نازل ہوتی تھی اور آنحضرتؐ ہمارے درمیان موجود ہوتے تھے۔ اب وحی بھی آنا بند ہو گئی اور آنحضرتؐ بھی چلے گئے' تو اب تم لوگوں کو میں اسی بات سے جانوں گا جو میں تم سے کرنے لگا ہوں۔ اب جو بھی ہمارے بارے میں اچھا ظن رکھے گا تو ہم بھی اس کے لیے اچھا ظن رکھیں گے اور اس کی تعریف کریں گے۔ اور جو کوئی بھی ہمارے بارے میں بُرا ظن رکھے گا' ہم بھی اس کے لیے بُرا ظن ہی رکھیں گے اور اس بات پر اسے ناپسند کریں گے۔ اپنے ان نفسوں کی لگام کھینچو اور انہیں شہوات کی طرف نہ جانے دو


Scanned with CamScanner

کہ یہ بہت مشتاق ہوتی ہیں۔ اور ایسا نہ ہو کہ تم ان کو لگام نہ دو اور وہ تمہیں بہت بُری منزل کی طرف کھینچ لے جائیں۔ یہ جو حق ہے یہ بھاری تو ہے، لیکن اس میں ایک مزہ ہے اور باطل ہلکا تو ہے لیکن وبازدہ ہے۔ اور گناہ کا ترک کر دینا بہتر ہے بعد میں توبہ کی کوشش کرنے کے!)

## علی بن ابی طالبؓ (م ۶۶۱)

امیر المومنین حضرت علیؓ چوتھے خلیفہ راشد تھے۔ یہ آنحضرتؐ کے چچا کے بیٹے تھے اور ان کی دختر فاطمۃ الزہراؓ کے شوہر تھے۔ انہیں مسلم خطیبوں کا امام تسلیم کیا جاتا ہے۔

آپ رسول اللہؐ کے بعد سب سے زیادہ فصیح اللسان اور علم و زہد میں سب سے بڑھ کر تھے۔ اس کے ساتھ ساتھ وہ بہادر اور جری اتنے تھے کہ کبھی موت سے نہیں ڈرتے تھے۔ آنحضرتؐ کی مدینے کو ہجرت کے موقع پر آپ اپنی جان کو خطرے میں ڈال کر ان کے بستر پر سوئے رہے اور اس طرح ان کو مکّہ سے نکل جانے کا موقع فراہم کیا۔ آپ دین کی سمجھ بوجھ (تفقُّہ فی الدین) کے معاملے میں سند کا درجہ رکھتے تھے۔ حق کے معاملے میں کبھی رو و رعایت نہ برتتے۔ اپنے آپ پر انہیں کامل اعتماد حاصل تھا۔ خطابت و بلاغت اور قوت استدلال میں آنحضرتؐ کے بعد ان سے بڑھ کر کوئی نہ تھا۔ ان کی زبان سے حکمت اور دانائی کے موتی جھڑتے تھے اور ان کا وعظ دلوں کو گرماتا اور اس میں ہلچل پیدا کرتا تھا۔ وہ نہ صرف خطیب تھے، بلکہ ایک اعلیٰ درجے کے انشا پرداز بھی تھے۔

امیر المومنین کا کلام تین صورتوں میں ملتا ہے: اول خطبات (یعنی تقریریں) دوم: احکام، خطوط رسائل اور سوم: وعظ و حکمت کی باتیں۔ ان سب کو بعد میں آپ کی اولاد میں سے ایک شاعر الشریف الرضی نے ایک کتاب میں جمع کر دیا، جس کا نام ''نہج البلاغۃ'' رکھا۔ یہ صحیح ہے کہ اس مجموعے میں بہت سا کلام ایسا ہے جو حضرت علیؓ کا نہیں سمجھا جاتا اور اہل نظر کا خیال ہے کہ یہ باہر سے لا کر اس میں داخل کیا گیا ہے۔ تاہم کتاب کا خاصا حصہ حضرت علیؓ کے خطبات، رسائل اور مواعظ پر مشتمل ہے، اور یہ آسانی سے پہچانا جا سکتا ہے۔

آپ کے بعض خطبات کے نمونے درج ذیل ہیں۔ تحکیم کے بعد آپ نے جو خطبہ دیا وہ یہ ہے:

الحمدلله وان اتى الدهر بالخطب الفادح و الحدث الجلل، واشهد ان لا اله الا الله وحده لا شريك له، ليس معه اله غيره، وان محمداً عبده و رسوله صلى الله عليه وعلى آله. امابعد فان معصية الناصح الشفيق العالم

المجرّب تورث الحيرة و تعقب الندامة. و قد كنت امرتكم في هذه الحكومة امري و نخلت لكم مخزون رأيي، لو كان يطاع لقصير امر، فابيتم عليّ اباء المخالفين الجفاة والمنابذين العصاة، حتى ارتاب الناصح بنصحه، وضنّ الزند بقدحه، فكنت واياكم كما قال أخو هوازن :

امرتُم امري بمنعرَج اللّوى فلم يستبينوا النُصح الاضُحى الغد

(اللہ کی تعریف ہے، اگرچہ زمانہ ایک بڑی مصیبت اور ایک واقعۂ عظیم لے کے آیا ہے۔ میں گواہی دیتا ہوں کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں، وہ واحد ہے اس کا کوئی شریک نہیں اور محمدؐ اس کے بندے اور رسول ہیں۔ ان پر اور ان کی آل پر سلام ہو۔ اس کے بعد یہ ہے کہ ایک شفیق ہمدرد کی نافرمانی، جو عالم بھی ہے اور تجربہ کار بھی، حیرت کا باعث بنتی ہے اور ندامت میں مبتلا کرتی ہے۔ میں نے اس تحکیم کے معاملے میں اپنا حکم تمہیں دیا تھا اور اپنی سوچی سمجھی رائے تمہارے سامنے لا کے رکھی تھی۔ لیکن جیسا کہ ضرب المثل میں ہے : کاش کہ قصیر کی رائے پر چلا جاتا۔ چنانچہ تم لوگوں نے مجھ سے ایسے بغاوت کی جیسے سخت دل مخالفین اور نافرمان قطع تعلق کرنے والے کرتے ہیں۔ یہاں تک کہ ایک خیر خواہ اپنی خیر خواہی کے بارے میں شک کرنے لگا اور چقماق، اپنی آگ نکالنے سے رہ گیا۔ تو میں اور آپ لوگ ایسے تھے جیسا کہ قبیلہ ہوازن کے شاعر (درید بن الصمۃ) نے کہا:

میں نے ان کو وادی کے موڑ پر اپنا حکم سنایا تو وہ میری نصیحت کو دوسرے دن چاشت کے وقت جا کے سمجھ پائے۔)

ایک اور خطبے میں حضرت علیؑ فرماتے ہیں :

الا وان الخطايا خيلٌ شمس حُمل عليها اهلها، و خُلعت لُجُمها فتقحّمت بهم في النار، وان التقوى مطايا ذُلُل حُمل عليها اهلها وأُعطوا ازمتها فأوردتهم الجنة. حق و باطل. ولكلٍّ اهلٌ. فلئن امر الباطل فقديماً فعل. ولئن قلّ الحق فلربما ولعلّ. ولقلّما ادبر شيئ فاقبل. شُغل من الجنّة. والنار امامه. ساعٍ سريع نجا و طالب بطيئ رجا. و مقصّر في النار هوى. اليمين والشمال مَضلّة، والطريق الوسطى هي الجادة. عليها باقي الكتاب و آثار النبوّة و منها منفذ السنّة واليها مصير العاقبة.

(جان لو کہ گناہ ایسے سرکش گھوڑے ہیں جن پر ان کے مالک سوار ہیں اور ان کی لگامیں کھلی چھوڑی ہوئی ہیں' چنانچہ وہ انہیں دوزخ میں لے جا کے پہنچتے ہیں۔اور تقویٰ یوں ہے جیسے مسکین سواریاں' جن پر ان کے مالک سوار ہیں اور ان کی باگیں ان کے ہاتھ میں ہیں۔ چنانچہ وہ انہیں لیے ہوئے جنت میں جاتی ہیں۔ ایک حق ہوتا ہے' اور ایک باطل! ان میں سے ہر طرف کچھ لوگ ہیں۔ پس اگر باطل زیادہ ہے تو زمانہ قدیم سے ایسا ہی ہوتا آیا ہے اور اگر حق قلیل ہے تو غالباً اور شاید! اور کم ہی ایسا ہوتا ہے کہ کوئی چیز ایک دفعہ پیچھے ہٹ جائے تو پھر آگے آ جائے۔ جنت اور دوزخ جس شخص کے سامنے ہیں وہ ان سے غافل ہے۔ تیز دوڑنے والا نجات پا گیا اور سست رفتار طلبگار بس اُمید ہی کرتا رہا۔ اور جس نے بھی کوتاہی کی وہ دوزخ میں گر کے رہا۔ دائیں اور بائیں دونوں جانب ہلاکت ہے' درمیان کا راستہ ہی صحیح راستہ ہے۔ اسی پر کتاب اللہ اور نبوت کے آثار نظر آتے ہیں اور یہی سنت کا دروازہ ہے اور اسی پر آخرت کے انجام کا دارومدار ہے۔)

حضرت علی نے جو ہدایت نامہ اشتر نخعی کو مصر کی طرف روانہ کرتے وقت بھجوایا وہ عربی ادب کا ایک شاہکار ہے۔ اس کے ابتدائی جملے یوں ہیں:

هذا ما أمر به عبدالله علی امیر المؤمنین مالک بن الحارث الاشتر' فی عهده الیه حین ولاّه مصر جبایة خراجها و جهاد عدوّها و استصلاح اهلها و عمارة بلادها. أمره بتقوی الله و ایثار طاعته واتباع ما امر به فی کتابه: من فرائضه و سُنَنه التی لا یسعد احد الا باتباعها ولا یشقی الا مع جحودها واضاعتها' وان ینصر الله سبحانه بقلبه ویده و لسانه. فانه جلّ اسمه قد تکفّل بنصر من نصره و اعزاز من أعزّه' وأمره ان یکسر نفسه من الشهوات ویزعها عند الجمحات. فان النفس أمّارة بالسوء الا من رحم الله. ثم اعلم یا مالک انی قد و جّهتک الی بلاد قد جرت علیها دُوَل قبلک من عدل و جور' وان الناس ینظرون من امورک فی مثل ماکنت تنظر فیه من امور الولاة قبلک و یقولون فیک ما کنت تقول فیهم. وانما یُستدلّ علی الصالحین بما یجری الله لهم علی ألسن عباده. فلیکن أحبّ الذخائر الیک ذخیرة العمل الصالح' فاملک هواک وشحّ بنفسک عما لا یحلّ لک' فان الشحّ بالنفس الا نصاف منها فیما أحبّت او



Scanned with CamScanner

کرہت۔

(یہ وہ ہدایت نامہ ہے جو اللہ کے بندے علی امیر المومنین نے مالک بن الحارث الاشتر کو بھیجا' جب وہ اسے مصر کا والی بنا کے روانہ کر رہا تھا تا کہ وہ خراج وصول کرے' دشمنوں کے ساتھ جہاد کرے' اس کے باشندوں کی اصلاح کرے اور اس کے علاقوں کو آباد کرے۔ اسے حکم دیا کہ اللہ کا تقویٰ اختیار کرو اور اس کی اطاعت کو مقدم سمجھو اور اس نے اپنی کتاب میں جو حکم دیا ہے اس کی پیروی کرو' یعنی اس کے فرائض اور سنن' جن کے اتباع کے بغیر کوئی شخص سعادت حاصل نہیں کر سکتا اور جن سے انکار کر کے اور ان سے غفلت برت کے ہی ایک شخص بدبخت ہو جاتا ہے۔ اس کو ہدایت کی ہے کہ اپنے دل اور ہاتھوں اور زبان سے اللہ کی مدد کرے۔ اس لیے کہ اللہ عزوجل نے اس شخص کی مدد اپنے ذمے لی ہے جو اس کی مدد کرے اور ہر اس شخص کو عزت دے جو اس کی عزت کرے۔ نیز اسے ہدایت کی ہے کہ اپنے نفس کو خواہشات سے بچائے۔ اور جب وہ سرکش ہونے لگے تو اسے روک لے۔ اس لیے کہ نفس بُرے کاموں کا حکم دیتا ہے' سوائے ان کے جن پر اللہ کا رحم ہو۔ پھر جان لو مالک! کہ میں نے تمہیں ایسے ملک کی طرف بھیجا ہے جس پر تم سے پہلے عادل اور ظالم حکومتیں گزر چکی ہیں' اور لوگ تمہارے کاموں کو اسی نظر سے دیکھیں گے جس طرح تم اس سے پہلے اپنے والیوں کے کاموں کو دیکھتے تھے اور وہ تمہارے بارے میں اسی طرح اظہار خیال کریں گے جس طرح تم دوسروں کے بارے میں کرتے تھے اور صالح بندوں کا پتا تو اسی وقت چلتا ہے جب اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کی زبانوں پر ان کا نام لے آتا ہے۔ تو تمہاری سب سے اچھی پونجی نیک عمل کی پونجی ہونی چاہیے۔ پس اپنی خواہشات پر قابو پاؤ' اور جو تمہارے لیے حلال نہیں ہے اس سے اپنے نفس کو بچا کے رکھو۔ اس لیے کہ نفس کو سلامت رکھنے کے معنی ہیں اس کی پسند یا ناپسند کے معاملے میں اس سے انصاف کرنا۔)

☆......☆......☆

## سحبان وائل (م۶۷۳)

یہ زمانۂ جاہلیت میں قبیلہ وائل میں پیدا ہوا۔ جب اسلام نے ظہور کیا تو یہ اسلام لے آیا اور حضرت معاویہ سے تعلق قائم کیا' جنہوں نے اس کی کافی عزت افزائی کی۔ سحبان کو قدرت کی طرف سے سخن آرائی اور طلاقت و بلاغت میں بہرۂ وافر ملا تھا۔ وہ ایک آتش بیاں خطیب تھا۔ جب وہ بولنا شروع کرتا تو یوں لگتا جیسے پورا خطبہ اسے حفظ ہے اور وہ اپنی یادداشت سے بول رہا ہے۔ ایک دفعہ خراسان سے کوئی وفد






Scanned with CamScanner

آیا تو امیر معاویہ نے سحبان سے کہا کہ ان سے خطاب کرو۔ سحبان نے ظہر کی نماز کے بعد سے جو بولنا شروع کیا تو عصر کا وقت ہو گیا۔ اس پورے عرصے میں نہ وہ کھنکارا' نہ اسے کھانسی آئی' نہ وہ رُکا اور نہ اس کے بیان میں کوئی چیز حائل ہوئی۔ چنانچہ معاویہ نے اس سے کہا: ''انت أخطب العرب'' (تم عرب قوم کے سب سے بڑے خطیب ہو۔) سحبان کہنے لگا۔ ''والعجم والجن والانس'' (یہی نہیں' میں عجم اور جن وانس کا سب سے بڑا خطیب ہوں۔) اسی وجہ سے سحبان ضرب المثل ہو گیا۔ چنانچہ کہا جاتا ہے۔ ''هوأخطب من سحبان وائل۔'' (وہ شخص تو سحبان وائل سے بھی زیادہ بڑا مقرر ہے۔) لیکن عجیب بات ہے کہ سحبان کی اتنی شہرت کے باوجود اس کے خطبے جو ہم تک پہنچے ہیں وہ بہت قلیل تعداد میں ہیں۔ اس کی وجہ شاید یہ ہو کہ وہ کسی سیاسی مرتبے پر فائز نہیں تھا۔ اور مختلف گروہوں اور جماعتوں سے دور رہتا تھا۔ اس کی وفات معاویہ کی خلافت کے زمانے میں ہوئی۔

سحبان کے ایک خطبے کا نمونہ:

ان الدنيا دارُ بلاغٍ' والآخرة دارُ قرارٍ. أيها الناس فَخُذوا من دار ممرّكم الى دار مقرّكم. ولا تهتكوا استاركم عند من لا تخفى عليه اسراركم. واخرجوا من الدنيا قلوبكم قبل ان تخرج منها ابدانكم. ففيها حييتم و لغيرها خُلقتم. ان الرجل اذا هلك' قال الناس : ماترك؟ و قالت الملائكة : ماقدّم؟ فقدِّموا بعضاً يكون لكم ولا تخلّفوا كلّاً يكون عليكم.

(یہ دنیا ایک واسطے کی منزل ہے اور آخرت کا گھر ہے۔ اے لوگو' تم جس گھر سے گزر رہے ہو اس سے اُس گھر کے لیے جہاں تم جا کے رہو گے' سامان لے لو۔ اور جس سے تمہارے راز پوشیدہ نہیں ہیں اس پر اپنے ستر نہ کھولو۔ اس دنیا سے اپنے دلوں کو ہٹا لو' قبل اس کے کہ اس سے تمہارے جسم الگ ہو جائیں۔ بات یہ ہے کہ تم اس میں زندہ رہے' حالانکہ تم دوسری دنیا کے لیے پیدا کیے گئے تھے۔ جب کوئی شخص مر جاتا ہے تو لوگ پوچھتے ہیں وہ کیا چھوڑ گیا؟ فرشتے پوچھتے ہیں کہ اس نے آگے کیا بھیجا؟ پس اپنے لیے کچھ ایسا آگے بھیجو جو تمہارے کام آئے اور اپنے پیچھے سب کچھ ایسا نہ چھوڑ جاؤ جو تمہارے نقصان کا باعث ہو۔)

## زیاد بن ابیہ (م ۶۷۳)

یہ عرب قوم کے حد درجہ زیرک اور زود فہم سیاستدانوں' خطیبوں اور رہنماؤں میں سے تھا۔ اس کی

ولادت ایک کسی لونڈی سمیہ کے بطن سے ہوئی' جس کی شادی ایک رومی غلام عبید سے کر دی گئی تھی۔ وہ جب بڑا ہوا تو بہت ذی ہوش اور ادیب اور زیرک تھا۔ جب مسلمانوں کے امور سلطنت بڑھنے اور پھیلنے لگے تو قابل لوگوں کی ضرورت محسوس ہوئی۔ چنانچہ حضرت عمرؓ کی طرف سے بصرہ کے والی ابوموسیٰ اشعری نے زیاد کی خدمات حاصل کیں۔ اس کام میں زیاد کی قابلیت اور مہارت کھل کر سامنے آئی۔ پھر حضرت عمرؓ کے زمانے میں وہ مختلف کاموں میں اپنی خوش تدبیری اور زیرکی کا ثبوت دیتا رہا۔ آخر حضرت عمرؓ نے جب اسے اپنے کام سے معزول کیا تو کہا: ''میں نے اسے کسی کمزوری یا خیانت کی وجہ سے معزول نہیں کیا' بلکہ اس لیے کہ وہ لوگوں پر اپنی بے پناہ عقل کا بوجھ نہ ڈال دے۔'' لیکن اس کے باوجود خلیفۂ ثانی اپنے اہم مسائل میں زیاد سے مشورے لیتے رہے' اور وہ مسائل حل کرنے میں کسی قسم کی کوتاہی یا کمزوری کے بغیر ان کی مدد کرتا رہا۔ ایک دن زیاد نے مہاجرین اور انصار کے ایک مجمع کے سامنے ایک ایسی تقریر کی کہ ویسی تقریر کسی نے نہ سنی تھی۔ اس پر عمرو بن العاص بولے۔ ''یہ نوجوان بھی کیا چیز ہے۔ اگر اس کا باپ قریش میں سے ہوتا تو یہ اپنی لاٹھی سے پورے عرب کو اپنے آگے لگا دیتا۔'' ابوسفیان نے جب اس نوجوان کی یہ قابلیت دیکھی تو انہوں نے قریش کے سامنے یہ اعتراف کیا کہ زیاد ان کا بیٹا ہے۔ یہ اُن دنوں کی بات ہے جب وہ مشرک تھے۔ لیکن حضرت عمرؓ کے خوف سے وہ زیاد کو اپنا نسب نہ دے سکے۔

پھر جب حضرت علیؓ خلیفہ ہوئے تو ان کے خلاف فارس کی جو بغاوت ہوئی اسے فرو کرنے کے لیے انہیں ایک زیرک آدمی کی ضرورت پیش آئی۔ لوگوں نے زیاد کا نام لیا اور زیاد نے وہاں جا کر ایسے ایسے حربے استعمال کیے کہ اہل فارس آپس میں ہی لڑ پڑے اور بغاوت ختم ہو گئی۔ اس کے بعد بھی زیاد حضرت علیؓ کے مختلف کام انجام دیتا رہا اور جب خلیفہ شہید ہو گئے' تو معاویہ نے جو پہلے ہی زیادہ پر اپنی نظر رکھتے تھے اسے اپنے ہاں بلا لیا اور ابوسفیان کے اس اعتراف کی روشنی میں اس کے ساتھ بھائی کا رشتہ قائم کر لیا۔ چنانچہ اب وہ زیاد بن ابی سفیان کہلانے لگا۔ لیکن اس کے نسب کو کسی نے تسلیم نہ کیا اور اس وجہ سے وہ تاریخ میں زیاد بن ابیہ (اپنے باپ کا بیٹا زیاد) کے نام سے جانا گیا۔ معاویہ نے زیاد کی بے پناہ صلاحیت اور قابلیت کو دیکھتے ہوئے اسے دونوں عراقوں (یعنی بصرہ اور کوفہ) کا والی مقرر کر دیا' حالانکہ اس سے پہلے ان مراکز کے عہدے کبھی ایک جگہ جمع نہیں ہوئے تھے اور پھر ان کے ساتھ خراسان' بحستان اور سندھ اور بحرین اور عمان بھی شامل کر دیے۔ زیاد نے مملکت کے اس طویل و عریض علاقے کا انتظام اس طرح سنبھالا اور اسے ایسی خوش اسلوبی سے چلایا کہ ہر طرف امن و امان قائم ہو گیا۔ یہاں تک کہ اگر کسی مرد یا عورت کے ہاتھ سے کوئی چیز گر جاتی تھی تو اسے کوئی نہیں اٹھاتا تھا' اور اس کا مالک ہی اسے آ کر اٹھاتا تھا۔ زیاد کہتا تھا کہ ''اگر میرے اور خراسان کے درمیان ایک رسی بھی گم ہو جائے تو میں اس کے لے

جانے والے کو ڈھونڈ نکالوں گا۔'' اس کی وفات کوفہ میں طاعون کی وجہ سے ہوئی۔

زیاد بہت حاضر دماغ اور فصیح اللسان تھا۔ اس کے بارے میں جاحظ نے شعبی کا قول نقل کیا ہے کہ میں نے جب بھی کسی مقرر کو منبر پر بولتے ہوئے سنا اور وہ بہت اچھا بولا تو میری یہ خواہش رہی کہ اب وہ خاموش ہو جائے تا کہ اس کے بعد وہ کہیں بُرا نہ بولنے لگے' سوائے زیاد کے۔ اس لیے کہ وہ جتنا زیادہ بولتا تھا اس کی تقریر اتنا بہتر ہوتی جاتی تھی۔ یہ صحیح ہے کہ بنو امیہ کی حکومت جن ستونوں پر قائم ہوئی ان میں زیاد سب سے طاقتور ستون تھا۔

زیاد کا مشہور خطبہ وہ ہے جسے الخطبۃ البتراء کہا جاتا ہے۔ یعنی بے سر خطبہ' اس لیے کہ اس کے شروع میں اس نے عرب کے عام رواج کے مطابق اللہ کی تعریف نہیں کی تھی۔ اس نے کہا:

**أما بعد' فان الجهالة الجهلاء و الضلالة العمياء و الغَي المُوفى بأهله على النار مافيه سفهاؤكم و يشتمل عليه حلماؤ كم' من الامور التي ينبتّ فيها الصغير ولا يتحاشى عنها الكبير. كأنكم لم تقرأ وا كتاب الله ولم تسمعوا ما أعدّ الله من الثواب الكريم لأهل طاعته و العذاب العظيم لاهل معصيته' في الزمن السرمدى الذى لايزول. انه ليس منكم الامن طرفت عينه الدنيا و سدّت مسامعه الشهوات' و اختار الفانية على الباقية' ولا تذكرون انكم أحدثتم في الاسلام الحدث الذى لم تُسبقوا اليه' من تركم الضعيف يُقهر والضعيفة المسلوبة بالنهار لا تُنفَر......**

(سب سے بڑی نادانی اور اندھی گمراہی اور جہنم کی طرف لے جانے والی بے راہ روی وہ ہے جس میں تمہارے بے وقوف لوگ پڑے ہیں اور جو تمہارے متحمل مزاج افراد کا رویہ ہے۔ یعنی ایسے امور جن میں چھوٹے بہت آگے نکل جاتے ہیں اور جن سے بڑے بھی اجتناب نہیں کرتے۔ ایسا لگتا ہے جیسے تم لوگوں نے کتاب اللہ کو نہیں پڑھا اور نہ اس ثواب کے بارے میں سنا ہے جو اللہ نے اپنے فرماں برداروں کے لیے مہیا کیا ہے اور نہ اس دردناک عذاب کے بارے میں جو اس نے نافرمان لوگوں کے لیے تیار کر رکھا ہے۔ ہمیشگی کے ایسے زمانے میں جسے زوال نہیں آئے گا۔ تم میں سے کوئی ایسا نہیں ہے جس کی آنکھ کو دنیا نے پھیر نہ دیا ہو اور جس کے کان خواہشات نے بند نہ کر دیے ہوں اور جس نے باقی رہنے والی زندگی پر فانی زندگی کو ترجیح نہ دی ہو۔ اور تم یہ یاد نہیں کرتے کہ تم نے اسلام میں ایک نئی بات پیدا کی ہے جسے تم سے پہلے کوئی نہیں جانتا تھا۔''

یہ کہ ایک کمزور کو اس کے حال پر چھوڑ دیا جائے کہ کوئی اس پر غلبہ پالے اور ایک کمزور عورت کو دن دہاڑے لوٹ لیا جائے اور کوئی اس کی مدد کو نہ آئے.....)

# حجاج بن یوسف (م۷۱۴ء)

ابو محمد حجاج بن یوسف الثقفی، عرب کا ایک جابر گورنر ہونے کے علاوہ ایک اعلیٰ درجے کا سیاستدان اور سپہ سالار بھی تھا۔ اس نے اموی حکومت کی بنیاد مضبوط کی۔ اس کے ساتھ ساتھ وہ ایک فصیح و بلیغ مقرر بھی تھا۔

وہ ۶۶۱ میں گمنامی اور غربت کے ماحول میں پیدا ہوا۔ وہ اور اس کا باپ طائف میں بچوں کو پڑھاتے تھے۔ لیکن اس کے اندر اس پستی سے نکلنے کی آرزو مچلتی تھی۔ وہ اپنی ذہانت کے باعث خلیفہ عبدالملک بن مروان کے ایک مددگار رَوح بن زنباع کی نظروں میں آ گیا اور اس نے اسے اپنی پولیس میں بھرتی کر لیا۔ خلیفہ نے اپنی فوج میں کچھ بدنظمی دیکھی تو اس کا ذکر اس نے روح بن زنباع سے کیا۔ رَوح نے اس بارے میں حجاج کا نام لیا تو خلیفہ نے اسے فوج کی امارت سپرد کی۔ حجاج نے فوج کو باقاعدہ منظم کیا اور انہیں تابعداری کی طرف واپس لے آیا۔ اسی زمانے میں عبداللہ بن الزبیر حجاز میں لوگوں کو اپنی اطاعت کی طرف بلانے لگا تھا۔ خلیفہ نے اس بارے میں حکم دیا تو حجاج فوج لے کر اس کی طرف بڑھا اور مکّہ میں اس کا محاصرہ کر کے اس کو بالآخر قتل کر دیا اور اس کی حکمرانی ختم کر دی۔ اس سے حجاج تمام عرب میں مشہور ہو گیا اور خلیفہ عبدالملک بن مروان کے دل میں اس کی صلاحیت اور قابلیت کی دھاک بیٹھ گئی۔ چنانچہ اس نے حجاج کو عراق کا گورنر بنا کے بھیج دیا، جہاں ایک طرف شیعہ فرقے نے فتنہ کھڑا کر رکھا تھا اور دوسری طرف خوارج نے بغاوت کر رکھی تھی۔ حجاج نے وہاں جا کر ان کے ساتھ اتنی سختی کی اور اُن پر ایسے ایسے مظالم ڈھائے کہ جن کی مثال اس زمانے میں نہیں ملتی۔ اپنی اس کارروائی سے اس نے ان کی گردنیں جھکا دیں اور انہیں اپنا مطیع بننے پر مجبور کر دیا۔ چنانچہ وہ پھر سے مسلمانوں کی عام جماعت میں آ شامل ہوئے۔

حجاج کی اس کارروائی سے دو نتائج رونما ہوئے۔ ان میں سے ایک نتیجہ تو اچھا تھا کہ مسلمانوں کے بکھرے ہوئے گروہوں کو جمع کر کے ایک ہی جھنڈے تلے، یعنی عربی اور اموی خلیفہ کے جھنڈے تلے لے آیا گیا۔ لیکن دوسرا نتیجہ بہت مذموم تھا، وہ یوں کہ حجاج نے عرب قوم کو اس طرح سے ذلیل و خوار کیا، کہ اس ذلت کا تجربہ اسے پہلے کبھی نہیں ہوا تھا۔ اس کے اس وحشیانہ سلوک نے ان کی غیرت کو مسمار کر

دیا' ان کی آزادی چھین لی اور ان کی زبانیں گنگ کر دیں۔ چنانچہ اس کے بعد اس قوم نے جابر حکام کے سامنے اطاعت اور خضوع کا رویہ اپنا لیا اور عباسی حکومت کے عجمی وزراء اور امراء نے انہیں اس رویے پر مستحکم کر دیا۔

حجاج نے اپنی پوری زندگی عراق میں ہی گزاری اور عبدالملک بن مروان اور اس کے بیٹے ولید کی حکومت کے لیے ایسی بنیاد مہیا کی جس سے وہ ایک طرف تو مضبوط ہوئی اور دوسری طرف پھیلتی چلی گئی، یہاں تک کہ شام اور چین کے درمیان کا سارا علاقہ اس میں شامل ہو گیا۔ حجاج ۷۱۴ء میں عراق میں اپنے بسائے ہوئے شہر واسط میں فوت ہوا۔

حجاج اعلیٰ مرتبے اور قوت و اقتدار کا خواہشمند تھا۔ چنانچہ اسے حاصل کرنے کے لیے اس نے ظلم اور سختی کا طریقہ اختیار کیا' اور اپنی قوت اور زورِ بیان سے بہت اونچے عہدے پر پہنچ گیا۔ وہ ایک اعلیٰ درجے کا' شیوا بیان خطیب تھا۔ جب اس کی ان گوناگوں صلاحیتوں کی خبر اموی خلیفے تک پہنچی تو ایک دن اس نے اس سے کہا: ہر شخص کو اپنے عیوب کا علم ہوتا ہے' تو تمہارے اندر جو عیب ہیں وہ تم خود بتاؤ کہ کیا ہیں اور کوئی چیز نہ چھپاؤ۔ حجاج نے جواب دیا: ''میں بہت ضدی' بدمزاج اور حاسد انسان ہوں' اور اگر کسی صاحبِ اقتدار میں یہ صفات جمع ہو جائیں تو وہ کھیتیاں اُجاڑ دیتا ہے اور انسانی نسلوں کو تباہ کر دیتا ہے' لا یہ کہ لوگ اس کے مطیع ہو جائیں اور اس کے سامنے کبھی سر نہ اٹھائیں۔'' فصاحت کلام اور قوت استدلال میں اس زمانے کا کوئی آدمی شاید ہی حجاج کا مقابلہ کر سکتا ہو۔ مالک بن دینار نے اس کے بارے میں کہا: ''میں نے حجاج سے زیادہ اپنی بات منوانے والا کوئی نہ دیکھا۔ وہ منبر پر چڑھ کر اہل عراق پر کیے ہوئے اپنے احسانات گنوانے شروع کرتا تھا اور بتاتا کہ ان لوگوں نے کس طرح اس کے ساتھ بُرا سلوک کیا اور اس نے کس طرح انہیں معاف کر دیا۔ یہ سن کر مجھے لگتا کہ حجاج سچا ہے اور لوگ جھوٹے ہیں۔'' حالانکہ اس نے ایک لاکھ بیس ہزار افراد کو قید کر کے موت کے گھاٹ اتار دیا تھا اور جب وہ مرا ہے تو پچاس ہزار مرد اور تیس ہزار عورتیں اس کے قید خانوں میں محبوس تھیں۔

**حجاج کے خطبے کا نمونہ :** حجاج جب گورنر ہو کر عراق آیا تو ایک ایسا عمامہ باندھے ہوئے مسجد میں داخل ہوا جس نے اس کے چہرے کا کافی حصہ ڈھانپ رکھا تھا۔ وہ تلوار لٹکائے اور تیر کمان شانے پر باندھے ہوئے منبر پر چڑھا۔ کچھ دیر وہ خاموش رہا اور صرف دیکھتا رہا۔ لوگوں میں چہ میگوئیاں ہونے لگیں کہ بنو اُمیہ کو کیا سوجھی کہ اس طرح کے آدمی کو عراق کا والی بنا کر بھیج دیا ہے۔ اور ایک آدمی عمیر بن ضابی نے تو اس کی طرف پتھر پھینکنے کا ارادہ بھی کیا' لیکن لوگوں نے اسے روک دیا کہ دیکھیں کیا ہوتا ہے۔ جب حجاج نے لوگوں کی نگاہوں کو اپنی طرف مرکوز پایا تو اپنے چہرے پر جو عمامہ باندھا ہوا تھا وہ اتار دیا اور



Scanned with CamScanner

اٹھ کر بولنا شروع کیا:

انـا ابنُ جَلاَ و طَلاَّ ع الثـنـايـا　　　متـی اضـع الـعـمـامـة تعرفونی

(میں جو کہتا ہوں کھول کے کہتا ہوں اور رکاوٹوں کو سر کرنے والا ہوں۔ جب میں اپنا عمامہ اتاروں گا تو تم مجھے پہچان لو گے۔)

اس کے بعد اس نے کہا:

یا اهل الـكـوفة! انـی لأری رؤوساً قد أینعَتْ وحان قطافها وانی لصاجها. وکـانیّ انظر الی الدماء بین العمائم واللّحی...... انی والله یا اهل العراق ما یُقعقع لی بالشنان ولا یُغمز جانبی کتغماز التین. ولقد فُررت عن ذکاء، و فُتّشتُ عن تجربة . وان امیر المومنین أطال الله بقاء ه نثر کنانته بین یدیه فعجـم عیـد انها فوجدنی أمرَّ عودا وأصلبها مکسراً فرماکم بی . لا نکم طالما أوضعتم فی الفتنة واضطجعتم فی مراقد الضلال.

والله لا حـزمنکم حزم السّلمة ولأ ضربنکم ضرب غرائب الابل. فانکم لکـأهل قریة کانت آمنة مطمئنَةً یاتیها رزقها رغداً من کل مکان. فکفرت بـأنعم الله فأذاقها لباس الجوع والخوف بما کانوا یصنعون. وانی والله ما اقـول الاّ وفَیـتُ، ولا اهـمّ الا أمـضیـتُ ولا اخلق الا ضـربـت. وان امیر الـمومنین أمرنی باعطاء کم اعطیاتکم وان اوجّهکم لمحاربة عدوکم مع الـمهـلّـب بـن ابـی صـفـرة. وانی اقسم بالله لا اجد رجلا تخلّف بعد اخذ عطائه بثلاثة ایام الا ضربتُ عنقه.

(اے اہلِ کوفہ! میں کچھ سروں کو دیکھ رہا ہوں کہ وہ پک گئے ہیں اور ان کے کاٹنے کا وقت آ گیا ہے اور یہ کام میں کرنے والا ہوں اور میں عماموں اور داڑھیوں کے درمیان خون بہتا ہوا دیکھ رہا ہوں...... اے اہلِ عراق! مجھے کسی حربے سے چونکایا نہیں جا سکتا اور نہ انجیر کی طرح مجھے کچوکا دے کے پرکھا جا سکتا ہے۔ میری ذہانت کا امتحان لیا گیا اور میرے تجربے کی تحقیق کی گئی اور امیر المومنین نے خدا انہیں سلامت رکھے اپنی ساری ترکش کے تیر نکال کر اپنے سامنے رکھ دیے اور ہر

تیر کو دبا کر اس کی سختی اور نرمی کا اندازہ لگایا' تو انہوں نے دیکھا کہ میری لکڑی ان میں سب سے زیادہ طاقتور ہے اور توڑنے میں سب سے زیادہ سخت ہے' تو انہوں نے مجھے آپ کے خلاف استعمال کیا۔ اس لیے کہ آپ لوگ کافی عرصہ بغاوت کی راہ پر چلتے رہے اور گمراہیوں کے رویئے میں پڑے سوتے رہے۔

واللہ میں آپ لوگوں کے ساتھ سلمہ کے درخت والا سلوک کروں گا اور تمہیں بھاگتے ہوئے اونٹوں کی طرح ماروں گا۔ اس لیے کہ تم اس بستی کے لوگوں کی طرح ہو جو امن اور اطمینان سے پڑی تھی۔ اس کا رزق آسودگی کے ساتھ ہر طرف سے آتا تھا۔ پھر اس نے اللہ کی نعمتوں کا کفران کیا تو اللہ نے اسے اس کے عمل کے بدلے میں بھوک اور خوف کا مزا چکھایا۔ میں خدا کی قسم جو بھی کہتا ہوں اسے پورا کرتا ہوں اور کسی چیز کا بھی ارادہ کر لوں تو اسے کر کے چھوڑتا ہوں۔ میں کسی کپڑے کا اندازہ کر لوں تو اسے کاٹ دیتا ہوں۔ امیر المومنین نے مجھے تم لوگوں کے دینے کے لیے عطیے دیے ہیں اور کہا ہے کہ مہلب بن ابی صفرہ کے ساتھ تمہیں اپنے دشمنوں کے ساتھ لڑنے کے لیے بھیج دوں۔ میں اللہ کی قسم کھا کر کہتا ہوں کہ میں نے اگر کوئی ایسا آدمی دیکھا جو اپنا عطیہ وصول کر کے بھی تین دن تک پیچھے رہ گیا تو میں اس کی گردن اڑا دوں گا۔)

☆......☆......☆

## عربی زبان میں انشا پردازی کا ارتقاء

جیسا کہ اوپر ذکر ہوا' جاہلی دور میں عربی نثر ان خطبات' حکیمانہ اقوال اور ضرب الامثال میں محدود تھی جو اس زمانے کے اہلِ فصاحت و بلاغت اور کاہن اور رمّال قسم کے لوگوں سے سننے میں آتی تھیں۔ بعد میں جب اسلام کا ظہور ہوا تو اس نے عربوں کے سامنے قرآن کی صورت میں عربی نثر کا ایک ایسا دلآویز نمونہ رکھا جو ان کے لیے نیا تھا اور وہ اس کے سحر میں آ گئے۔ قرآن کا اصل مقصد چونکہ اللہ اور اس کے دین کی طرف لوگوں کو بلانا تھا اور عرب قوم کو بت پرستی اور کفر کی حالت سے نکال کر انہیں ایک خدا اور ایک رسول پر ایمان لانے کی ترغیب دینا تھا' اس لیے کافی عرصے تک لوگوں کا اس طرف خیال نہ گیا کہ قرآن ہدایت و اصلاح کا صحیفہ ہونے کے ساتھ ساتھ عربی نثر کا بھی ایک عمدہ نمونہ ہے' جس کو سامنے رکھ کر عربی نثر میں اپنے خیالات کا اظہار کیا جا سکتا ہے۔ قرآن کے بعد عربی نثر کے جو نمونے اس زمانے کے عرب معاشرے میں ملتے ہیں وہ خطبات اور تقریریں اور عہد نامے ہیں جو آنحضرتؐ ان کے صحابہ اور حکومتوں کے امراء اور حکام سے روایت ہوئے اور پھر وہ سیرت کی کتابوں اور احادیث اور تاریخ کے اوراق میں محفوظ ہو گئے۔ ان کے کچھ نمونے اور خطیبوں اور مقرروں کے حالات مختصراً اوپر پیش کیے گئے۔

اموی دور میں اب عربی زبان کی اس باقاعدہ نثر کا آغاز ہوتا ہے جو حکومت کے دفتری امور اور خراج و اموال کے حسابات رکھنے اور ان کو منظم کرنے کے لیے استعمال کی گئی۔ نیز یہ امراء و حکام اور ان کے عمالوں کے درمیان خط و کتابت کے کام آنے لگی۔ صدر اول میں تو عرب کے سربراہان اپنی طبیعت اور مزاج کے مطابق جو کچھ بھی کہیں لکھ کے بھیجنا چاہتے تھے اسے املاء کرا دیتے تھے یا خود لکھ دیتے تھے۔ بعد میں جب خلافت کا دائرہ وسیع ہونے لگا اور ہر طرف سے اموالِ غنیمت جمع ہونے لگے تو ان کا حساب کتاب رکھنے کی ضرورت پیش آئی اور حضرت عمرؓ نے اس کے لیے گوشوارے اور دستاویزیں تیار کرائیں' جن کے اندر سلطنت کے احوال قلم بند ہوتے تھے۔ اس طرح کے معاملات کا ریکارڈ ہر مفتوحہ ملک کی اپنی زبان میں رکھا جاتا تھا' یعنی عراق اور فارس کا فارسی میں' شام کا رومی زبان میں اور مصر کا قبطی زبان میں۔ لیکن رفتہ رفتہ خود عربوں نے اس کام میں مہارت حاصل کر لی اور وہ خراج کے حساب کتاب رکھنے اور دوسرے دفتری امور سرانجام دینے کے قابل ہو گئے۔ چنانچہ عبدالملک بن مروان اور اس کے بیٹے ولید کے زمانے سے یہ سارے کام اب عربی زبان میں ہونے لگے۔

پھر یہ ہوا کہ خلفاء پر مملکت کے کاموں کا بوجھ بڑھنے لگا' تو انہوں نے عرب اہل قلم اور موالی ادباء کو اپنا کاتب السر (سیکرٹری) رکھنا شروع کیا۔ ان میں سے بعض اہل اور تجربہ کار لوگوں نے مراسلات کے لیے فارس اور روم کے قاعدے اور طریقے رائج کیے اور مکتوب نویسی کا ایسا طرز قائم کیا جس نے اسے باقاعدہ ایک ہنر بنا دیا۔

اسی زمانے میں عبدالحمید الکاتب نے آ کر مکتوب نگاری میں کچھ مزید اصلاحات کیں اور اسے خوبصورت تراکیب اور شاعرانہ اسالیب بیان سے مزین کر کے بے حد موثر اور دلآویز بنا دیا۔

## عبدالحمید الکاتب (م ۷۴۹ء)

ابو غالب عبدالحمید بن یحییٰ شام کے ایک غریب عرب خاندان میں پیدا ہوا اور بنی عامر کے ساتھ بطور موالی کے منسوب ہوا۔ ہشام بن عبدالملک کے مولی اور سیکرٹری سالم سے اس نے انشاء کا ہنر حاصل کیا۔ پھر وہ بچوں کو پڑھانے کے کام میں لگا رہا اور اس سلسلے میں شہروں شہروں پھرا۔ آخر مروان بن محمد کی نظر اس پر پڑ گئی اور جن دنوں وہ آرمیڈیا کا گورنر تھا اس نے اسے اپنا سیکرٹری بنا لیا۔ چنانچہ اس نے گورنر کے لیے مراسلات لکھے' اپنے کام سے اسے مطمئن کیا اور اس طرح ان دونوں میں مودّت پیدا ہو گئی۔ پھر جب خبر آئی کہ اہلِ شام نے مروان کو خلیفہ چن لیا ہے اور اس کے ہاتھ پر بیعت کرنے

والے ہیں تو مروان شکرانے کے لیے سجدے میں گر گیا اور اس کے سب ساتھیوں نے بھی سجدۂ شکر ادا کیا، سوائے عبدالحمید کے! جب مروان نے اس سے پوچھا: تم نے سجدہ کیوں نہیں کیا تو اس نے جواب دیا: میں کیوں سجدہ کرتا، کیا اس لیے کہ آپ ہمارے ساتھ تھے، اور پھر اُڑ کر ہم سے دور چلے جائیں گے۔ مروان نے کہا: تم بھی ہمارے ساتھ ہی اُڑو گے۔ عبدالحمید نے کہا: اب میرے لیے سجدہ روا ہے، چنانچہ اس نے بھی سجدہ کر لیا۔ مروان نے عبدالحمید کو اپنی ریاست کا میر منشی اور محرر کاتب بنا دیا۔ جب اس کے گرد عباسیوں کے سیاہ جھنڈے پھڑ پھڑانے لگے اور ابو مسلم خراسانی اس کی طرف بڑھنے لگا تو مروان نے عبدالحمید الکاتب کو مشورہ دیا کہ وہ اُن لوگوں کے پاس جا کر ان سے مل جائے اور اس سے بے وفائی کا اظہار کرے۔ اور اس طرح سے وہ ان کے اندر رہ کر مروان کی مدد کرنے کی کوشش کرے۔ لیکن عبدالحمید نے یہ مشورہ نہ مانا اور اپنے خلیفہ کو چھوڑ کر جانے سے انکار کر دیا۔ کہنے لگا: میرے لیے سوائے صبر کے کوئی چارہ نہیں۔ پھر یا تو اللہ آپ کو فتح دے گا یا پھر آپ کے ساتھ میں بھی مارا جاؤں گا، اور یہ شعر پڑھا:

اسرّ وفاء ثم أظهر غدرةً فمن لی بعذرٍ یوسع الناس ظاهره

(میں اندر سے تو آپ کا وفادار ہوں، اور ظاہر یہ کروں کہ میں آپ کا غدار ہوں تو میرے لیے وہ کون سا عذر ہے جس کی وجہ سے لوگ میرا ظاہر قبول کر لیں گے۔)

چنانچہ وہ مروان کے ساتھ ہی رہا، حتیٰ کہ خلیفہ کو مصر میں قتل کر دیا گیا۔ اس کے بعد عبدالحمید نے بحرین آ کر اپنے دوست ابن المقفع کے ہاں پناہ لی۔ لیکن اس کی تلاش میں لوگ ادھر آ نکلے اور گھر میں داخل ہو کر پوچھنے لگے: تم میں سے عبدالحمید کون ہے؟ اس پر دونوں نے جواب دیا: "میں"! اس ڈر سے کہ اس کا ساتھی نہ پکڑا جائے۔ قریب تھا کہ سپاہی ابن المقفع کو پکڑ کر قتل کر دیں، عبدالحمید نے چیخ کر کہا: ٹھہر جاؤ، ہم دونوں کی خاص نشانیاں ہیں، تم میں سے کچھ لوگ جا کر ان نشانیوں کا پتا کر آئیں اور پھر تمہیں جسے مارنا ہو گا اسے مار دینا۔ وہ لوگ جا کر نشانیوں کا پتا کر آئے اور عبدالحمید الکاتب کو پکڑ لیا اور اسے قتل کر دیا۔

عبدالحمید الکاتب کا اسلوب تحریر بہت صاف ستھرا، پُر لطف اور شیریں ہے۔ وہ انسان کے شعور کو اپنی گرفت میں لے لیتا ہے اور اس کی عقل کو مسحور کر دیتا ہے۔ لوگوں کو اس کی تحریر کے مؤثر ہونے کا پتا تھا اس لیے جب مروان نے ابو مسلم خراسانی کو اپنی طرف مائل کرنے کے لیے خط لکھا تو اس نے اسے پڑھنے سے انکار کر دیا، اور اس ڈر سے کہ کہیں وہ اس کے اثر تلے نہ آ جائے، اسے پڑھے بغیر پھاڑ کر

پھینک دیا اور ایک چھوٹے سے پرچے پر مروان کو لکھ بھیجا کہ

محا السیفُ اسطار البلاغة وانتحی　　　علیک لیوث الغاب من کل جانب

(تلوار نے بلاغت کی سطریں مٹا ڈالیں اور تم پر جنگل کے شیر ہر طرف سے یلغار کر کے آئے ہیں۔)

نثر کے کچھ نمونے: مروان کے ساتھ عبدالحمید حالت شکست میں تھا، اس موقع پر وہ اپنے اہل خانہ کو لکھتا ہے:

اما بعد، فان الله تعالی جعل الدنیا محفوفة بالمکاره والشُرور. فمن ساعده الحظ فیها سکن الیها، ومن عضّته بنا بها ذمّها ساخطاً علیها. و شکاها مستزیداً لها. و قد کانت أذا قتنا افاویقَ استحلینا ها، ثم جمحت بنا نافرةً ورمحتنا مولّیةً. فملُح عذبُها و خشن لینها. فابعد تنا عن الاوطان و فرّقتنا عن الاخوان. فالدار نازحة والطیر بارحة. و قد کتبتُ والایام تزیدنا منکم بُعداً و الیکم و جداً. فان تتمّ البلیّة الی أقصی مدّتها یکن آخر العهد بکم وبنا، وان یلحقنا ظفر جارح من اظفار عدوّنا نرجع الیکم بذُل الاسار، والذُل شرّجار. نسأل الله تعالیٰ الذی یُعزّ من یشاء و یذلّ من یشاء ان یهب لنا ولکم الفة جامعة، فی دارِ آمنةٍ. تجمع سلامة الا بدان والادیان، فانه رب العالمین وأرحم الراحمین.

اس کے بعد یہ کہ اللہ تعالیٰ نے دنیا کو ایسا بنایا ہے کہ وہ مکروہات اور شر میں گھری ہوئی ہے۔ پس جس کی قسمت اچھی ہوگی وہ اس میں سکون سے رہے گا اور جسکو دنیا نے چرکا لگایا وہ اس پر ناراض ہو کر اس کی مذمت کرے گا، اور اس سے مزید کچھ لینے کے لیے اس کی شکایت کرے گا۔ اس نے ہمیں جمع کیا ہوا دودھ پلایا تھا جو ہمیں بہت میٹھا لگا۔ پھر وہ ہم سے سرکش ہوگئی اور ہمیں لات مار کر ایک طرف چل دی، تو اس میں جو چیز شیریں تھی وہ نمکین ہوگئی اور جو چیز نرم تھی وہ سخت ہو گئی۔ اس نے ہمیں اپنے وطنوں سے دور کر دیا، اور اپنے بھائی بندوں سے جدا کر دیا۔ اب گھر دور ہے اور علامات نحوست کی ہیں۔ میں نے آپ لوگوں کو ان دنوں خط لکھا تھا جب وقت کے ساتھ دُوری بڑھتی جاتی تھی اور میرا شوق آپ لوگوں کے لیے زیادہ ہوتا جاتا تھا۔ اب اگر یہ



Scanned with CamScanner

معیت اپنی آخری مدت تک جا کر ختم ہوتی ہے تو یہ ہمارے درمیان آخری رابطہ ہوگا اور اگر دشمن کا ناخن ہمیں زخمی کر دے گا تو ہم قید ہو کر تم لوگوں کے پاس آئیں گے اور ذلت کا ساتھ بہت بُرا ہے۔ اس لیے ہم اللہ تعالیٰ سے دعا کرتے ہیں' جو جسے چاہتا ہے عزت دیتا ہے اور جسے چاہتا ہے ذلیل کرتا ہے' کہ وہ ہمیں اور آپ کو باہم ملانے والا تعلق عطا کرے' ایک پُرامن گھر میں' جو ہمارے اجسام اور ہمارے عقائد کی سلامتی کا ضامن ہو' اس لیے کہ وہ جہانوں کا رب ہے اور سب سے زیادہ رحم کرنے والا ہے۔)

ایک شخص کے بارے میں سفارش کرتے ہوئے عبدالحمید الکاتب لکھتا ہے:

**حقُّ موصل کتابی علیک کحقِّه علیَّ. اذ جعلک موضعاً لامله ورآنی اهلاً لحاجته، فقد أنجزتُ حاجته فصدِّق أمله.**

(میرا یہ خط لے جانے والے کا تم پر وہی حق ہے جو اس کا مجھ پر ہے۔ اس لیے کہ اس نے تمہیں اپنی اُمید کی جا سمجھا ہے اور مجھے اپنی ضرورت پورا کرنے کا اہل جانا ہے۔ میں نے تو اس کی ضرورت پوری کر دی ہے' اب تم اس کی اُمید پر پورا اُترو۔)

اہل قلم اور انشا پرداز لوگوں کو نصیحت کرتے ہوئے کہتا ہے۔

**وایّاکم والکبر والسُّخف والعظمة، فانها عداوة مُجتلَبة من غیر إحنة. وتحابّوا فی الله عزّوجلَّ فی صناعتکم و تواصوا علیها بالتی هی ألیق لاهل الفضل والعدل و النُّبل من سلفکم. وان نبا الزمانُ برجل منکم فاعطفوا علیه و واسوه حتی یرجعَ الیه حالُه و یثوب الیه أمْره.**

(تکبر اور نادانی اور بڑائی سے بچو' اس لیے کہ یہ ساری باتیں بغیر کسی بغض و حسد کے دشمنی پیدا کرتی ہیں۔ اپنے اس ہنر میں اللہ کی خاطر ایک دوسرے سے محبت کرو' اور اس میں ایک دوسرے کو ایسی نصیحت کرو جو تمہارے ان اسلاف کے شایان ہو جو اہلِ فضل و عدل اور باوقار تھے۔ اور اگر آپ میں سے کسی پر بُرا وقت آ جائے تو اس پر توجہ کرو' اسے دلاسا دو' تا کہ وہ اپنی حالت کو واپس آ جائے' اور اس کے امور پہلے جیسے ہو جائیں۔)

☆......☆......☆

باب ۴

# عبّاسی دور

مسلم تاریخ کے عباسی دور کے متعلق چند ایک اہم باتیں ہیں جو شروع میں جان لینے کی ہیں: ایک تو یہ کہ یہ دور اسلام کا سنہری دور تھا۔ اس میں مسلمان تمدن اور سیاسی اقتدار کی ایسی بلندیوں تک پہنچے جہاں وہ نہ اس سے پہلے کبھی پہنچے تھے اور نہ بعد میں کبھی پہنچ سکے۔ دوسرے یہ کہ اس دور میں اسلامی فنون کو بہت فروغ حاصل ہوا۔ عربی شعر و ادب کی دنیا میں بڑی رونق رہی اور باہر کے ملکوں (یونان، ایران، ہند وغیرہ) کے علوم کا عربی زبان میں ترجمہ کیا گیا۔ جس سے عربی ذہن نے جلا پائی اور وہ سوچنے اور بحث کرنے کے قابل ہوا۔ تیسرے یہ کہ عباسیوں نے اہل فارس کی مدد سے امویوں سے حکومت چھینی تھی، جبھی ان کی خلافت کا مزاج ایرانی رہا اور انہوں نے بغداد کو اپنا دارالحکومت بنایا جو ایرانی سرحد کے قریب تھا، جبکہ ان سے پہلے اموی حکومت اپنے مزاج میں خالصۃً عربی تھی اور اس نے دمشق کو اپنا دارالخلافہ بنایا تھا جو بادیۂ عرب کی سرحد پر تھا۔ چوتھے یہ کہ اسی عباسی حکومت میں شعوبیت کی آواز بھی اٹھی جس کا مقصد یہ ثابت کرنا تھا کہ عرب قوم کسی بھی لحاظ سے عجمی قوموں سے بہتر نہیں ہے...... یہ چند امور جان لینے کے بعد اب ہم اس عباسی دور کے متعلق قدرے تفصیل سے بات کریں گے۔

اسلام کے اوائل زمانے اور پھر بنو اُمیہ کے عہد میں مسلمان زیادہ تر ملکی فتوحات میں مصروف رہے اور ان کی علمی و فکری سرگرمیاں امامت و خلافت کے گروہی جھگڑوں اور فقہی مذاہب کے باہمی اختلافات تک محدود رہیں۔ علمِ کلام کا ظہور اس عہد کے آخر میں کہیں جا کر ہوا...... لیکن جب خلافت عباسیوں کے ہاتھ میں آئی تو ملکی توسیعات کی طوفانی رفتار میں بہت حد تک کمی آ گئی۔ اب ضرورت اس بات کی تھی کہ اتنی بڑی سلطنت کا انتظام سنبھالا جائے اور اس میں امن و امان قائم کیا جائے۔ عباسیوں کو اُمویوں کے خلاف جو فتح و نصرت حاصل ہوئی تھی، اس میں ایرانیوں کا بہت بڑا ہاتھ تھا اور انہوں نے دریائے ژاب کے فیصلہ کن معرکے میں اُموی لشکر کو شکست دے کر دراصل جنگِ قادسیہ میں اپنی ہزیمت کا بدلہ چکایا تھا۔ چنانچہ اپنی اس حمایت کے بدلے میں ایرانیوں نے عباسی خلفاء کے دربار میں بڑا اثر و رسوخ پایا اور کلیدی اسامیوں کے علاوہ خود وزارتِ عظمیٰ کے عہدے پر بھی جا متمکن ہوئے۔ یہ ایرانی ایک بڑی تہذیب و ثقافت کے وارث تھے اور انتظامِ ملکی میں ایسی اعلیٰ درجے کی صلاحیتیں رکھتے تھے جو عرب لوگوں میں بہت کم پائی جاتی تھیں۔ چنانچہ یہی ایرانی وزراء، سیکرٹری (جنہیں اُن دنوں کاتب کہا جاتا تھا) اور



Scanned with CamScanner

عہدہ دار تھے جنہوں نے عباسی خلافت کو استحکام بخشا' اس کے مختلف انتظامی شعبے قائم کیے اور اس کے خراج اور ٹیکسوں کے کاروبار کو اس طرح منظم کیا کہ بیت المال میں دولت اور زر و جواہر کے انبار لگ گئے۔ شاہی خزانے کی یہ دولت جب تنخواہوں' معاوضوں اور انعامات و صدقات کی صورت میں عام رعایا کے اندر بھی گردش کرنے لگی تو ملک میں خوش حالی آ گئی۔ کھانے پینے' لباس اور آرائش میں سادگی کے بجائے عیش و تنعم نے رواج پایا' روزمرہ زندگی کا رنگ ڈھنگ بدلا۔ لوگوں کے پاس جب بنیادی ضروریات سے روپیہ پیسہ بچنے لگا تو وہ شغلِ مے نوشی کی طرف راغب ہوئے۔ شراب کے ساتھ اس کے لوازمات ...... یعنی عورت اور موسیقی ...... بھی چلے آئے اور بصرہ' کوفہ اور بغداد جیسے شہروں میں موسیقی اور لہو ولعب کی مجلسیں منعقد ہونے لگیں جن میں علاوہ دوسرے لوگوں کے شعرا' ادبا اور ابن المقفع جیسے اہل علم بھی شمولیت کرتے تھے۔ ان مجالس میں وقت کی بہترین شاعری' مغنیات کی زبان سے سنی جاتی' رقص و سرود ہوتا' لطیفہ گوئی اور چہلیں ہوتیں اور وہ سب رنگ رلیاں منائی جاتیں جن کے ذکر سے "کتاب الاغانی" کے صفحات بھرے پڑے ہیں۔

اُموی خلافت کے زمانے میں عام معاشرہ اپنے مزاج کے اعتبار سے عربی تھا اور بہت حد تک ان بیرونی اثرات سے بچا ہوا تھا جو عربوں کے عجمی قوموں کے ساتھ میل جول کے نتیجے میں ظاہر ہونے لگے تھے' لیکن عباسی خلافت کے آتے آتے عجمی قوموں اور خصوصاً ایرانیوں کے تہذیبی اور ثقافتی اثرات بڑی تیزی سے عربوں میں نفوذ کرنے لگے۔ علوم و معارف کا دائرہ وسیع ہوا اور اس میں منقولات (یعنی تفسیر' حدیث' فقہ) کے ساتھ ساتھ معقولات (طب' فلسفہ' نجوم وغیرہ) کا دروازہ بھی کھول دیا گیا جس کے نتیجے میں یونان سے فکر و فلسفہ چلا آیا اور ایران سے تاریخ' علمِ سیاست و آئین' مذہبی عقائد (مانی' زرتشت) ادب و حکایات (کلیلہ و دمنہ' ہزار افسانہ) جیسی چیزیں در آئیں' اور ہندوستان سے الٰہیات' حساب اور علم نجوم نے عربی اسلامی ثقافت میں راہ پائی۔ ثقافتوں کے اس امتزاج اور حکمت و فلسفہ کی اس گرم بازاری سے آزاد خیالی کی رو چلی جس سے ذہنوں پر مذہبی عقاید اور ایمانیات کا وہ تسلط نہ رہا جو پہلے تھا۔ لوگ اب خدا' کائنات' انسانی ارادہ و اختیار' قیامت اور سزا و جزا جیسے امور پر آزادی سے سوچنے لگے اور ان مسائل پر مسلمانوں کے اندر متعدد فرقے وجود میں آ گئے۔ جن سے اس وقت معتزلہ' قدریہ' جبریہ' اشعریہ' شیعہ اور مرجیہ جیسے فرقے موجود تھے۔ ان میں سے ایک فرقے (جبریہ) کا عقیدہ یہ تھا کہ اس زندگی میں انسان کے سب اعمال خدا کی مرضی اور علم کے تابع ہیں اس لیے وہ خود ان کا ذمہ دار نہیں ہے۔ ایک اور فرقہ (مرجیہ) کہتا تھا کہ ایمان کا تعلق دل سے ہے اور انسان کے اعمال اس کے ایمان پر اثر انداز نہیں ہو سکتے۔ یہ لوگ اس بات کے بھی قائل نہیں تھے کہ کفار ہمیشہ ہمیشہ کے لیے دوزخ میں رہیں گے۔



Scanned with CamScanner

ایک اور اہم رجحان' جو عربوں اور ایرانیوں کے تصادم کے نتیجے میں اُبھر کر سامنے آیا' وہ ''شعوبیت'' (مساواتِ اقوام) کا تھا۔ جب سے عربوں نے ایرانی علاقوں کو فتح کر کے اہلِ فارس کو زیر کیا تھا اور ان کی عورتوں کو لونڈیاں اور ان کے مردوں کو غلام بنایا تھا' یہ لوگ ایک مجروح احساس کے ساتھ عربوں کے خلاف ایک معاندانہ رویہ رکھنے لگے تھے۔ اُن کا خیال تھا کہ عربوں کو دوسری اقوام پر کوئی فضیلت اور برتری حاصل نہیں ہے۔ اگر وہ زمانہ قریب میں ایک بڑی سلطنت کے مالک ہو گئے تھے تو اُن سے پہلے قیصر وکسریٰ اور فراعنہ کی سلطنتیں بھی تو رہی تھیں اور اگر ان کے اندر اسلام آیا تھا تو وہ انہی کے لیے مخصوص کہاں تھا' وہ تو ساری دنیا کے لیے تھا۔ اور مذہب کی تاریخ میں عرب علاقوں کے اندر گنتی کے صرف چار پیغمبر آئے تھے' باقی ہزاروں پیغمبر دوسری قوموں میں سے بھیجے گئے تھے...... پھر ان بدوؤں کو تہذیب وثقافت سے کیا واسطہ تھا؟ وہ کیا جانتے تھے کہ ایک متمدن زندگی کیا ہوتی ہے؟ شعوبیت کی اس تحریک کا خاص میدان شعر وادب تھا۔ عربوں کی بدویانہ شاعری اور ان کے کلام میں لفظی شکوہ وجلال کے پیچھے معنی ومضمون کی سادگی و بے کیفی خاص طور پر ہدفِ تنقید بنتی تھی...... اسلام نے تو سب مسلمان قوموں کے درمیان برابری کا اصول قائم کیا تھا' لیکن اس راہِ اعتدال سے ہٹ کر ایک طرف وہ عرب تھے جو اپنے جیسا اس روئے زمین پر کسی دوسری قوم کو نہیں سمجھتے تھے اور دوسری طرف یہ شعوبی تھے جنھیں عربوں میں کسی قسم کی کوئی خوبی نظر نہ آتی تھی۔

یہ عباسی دور کے سیاسی' تمدنی اور معاشرتی حالات کا ایک جائزہ تھا۔ ہمارا مقصد چونکہ اس عہد میں عربی ادب اور اس میں ہونے والی تبدیلیوں کا سراغ لگانا ہے' اس لیے عربی زبان وادب میں عباسیوں کے عہد میں جو تغیرات واقع ہوئے ان کے بارے میں جب غور کیا جائے تو صورتِ حال یوں سامنے آتی ہے:

## ۱۔ عربی لغت کے مقاصد میں تغیرات:

۱۔ یہ مقاصد پہلے بہت سادہ اور زیادہ تر دینی امور سے متعلق تھے۔ اب ان مقاصد میں شرعی' عقلی اور لسانی علوم کی تدوین بھی شامل ہو گئی۔

۲۔ دوسری زبانوں سے جب عربی میں ترجموں کا کام ہونے لگا' تو نئی علمی اور فلسفیانہ اصطلاحات کے لیے عربی لغت کو اپنے اندر وسعت مہیا کرنی پڑی۔

۳۔ عجمی قوموں کے ساتھ اختلاط کے نتیجے میں بہت سے ہنر اور صناعتیں عرب معاشرے میں رواج پا گئیں۔ ان کے لیے عربی زبان کو الفاظ مہیا کرنے پڑے۔



Scanned with CamScanner

۴۔ جب مختلف علوم کی تدریس اور مذہبی فرقوں کے درمیان بحث و مباحثہ اور مناظرہ ہونے لگا تو ان خاص مقاصد کے لیے نئے عربی الفاظ اور محاورات وجود میں آئے۔

## ب۔ معانی اور افکار میں تغیرات:

۱۔ سیاسی اور معاشرتی انقلابات کے نتیجے میں فکری تحریکیں رونما ہوئیں اور اسلام کے اوائل زمانے کی فکری سادگی کے مقابلے میں لوگ اب گہرائی میں جا کر سوچنے اور مسائل کا تجزیہ کرنے لگے۔ اس سے معاشرے کے علمی حلقوں میں نئے نئے معانی اور نئے نئے افکار زیر بحث آنے لگے اور ایک عام علمی اور تحقیقی فضا قائم ہوئی۔

۲۔ فارسی زبان کے اثر سے عربی زبان میں مبالغہ آرائی، تکلف اور جاہ پرستی کے اسالیب راہ پا گئے۔ مثلاً خلفاء کے ناموں کے ساتھ القاب استعمال کیے جانے لگے (السفاح، المنصور، ذوالریاستین، رکن الدولہ وغیرہ) اور مکاتیب اور رسالوں میں سلاطین کو خطاب کرنے کا ایک خاص طریقہ وضع ہوا، جس میں ان کی بڑی تعریف ہوتی اور ان کی شخصیت کے لیے حضرت اور جناب کے الفاظ استعمال کیے جاتے۔

# عباسی دور میں عربی نثر

عباسی دور کے شروع میں نثر عبدالحمید الکاتب کے طریقے پر رہی، جس میں اختصار ہوتا تھا اور مبالغہ اور آرائش میں اعتدال برتا جاتا تھا، خصوصاً مکاتیب اور توقیعات (فیصلوں یا تنفیذی احکام) میں! اس لیے کہ یہ تحریریں خلفاء اور وزراء کے ملاحظہ کے لیے ہوتی تھیں اور ان کے پاس لمبی عبارتیں پڑھنے کا وقت نہیں ہوتا تھا۔ لیکن جب عربوں میں آسودگی اور خوشحالی آئی اور اہل فارس سے ان کا اختلاط بڑھا تو ان کی تحریروں میں پہلے جو ایجاز و اختصار ہوتا تھا اس کی جگہ عبارتوں کو بنانے سنوارنے اور لمبا کرنے کا رجحان پیدا ہو گیا۔ ایک ہی معنی کے لیے دو دو اور تین تین جملے استعمال کیے جاتے اور اس تکرار کو مضمون کے ابلاغ کے لیے مفید سمجھا جاتا۔ آگے جا کر جب خلافت میں کمزوری آ گئی اور دوسرے لوگ اس پر قابض ہو گئے تو عربی تحریر میں کمزوری راہ پا گئی اور اب زیادہ زور عبارت کی تزئین و آرائش کرنے اور اس کے لیے صنعت بدیع کے استعمال سے خوبصورت الفاظ استعمال کرنے کا طریقہ رائج ہو گیا۔ اس میں انہوں نے اتنا غلو کیا کہ عبارت کے معانی تو دب کے رہ گئے، البتہ اس کے مزین الفاظ اور جملے پڑھنے

والے کے سامنے رہے۔

عباسی دور کی نثر ایک طویل عرصے میں چار مختلف ادوار سے گزری جو حسب ذیل ہیں :

- پہلا دور ابتدا سے خلیفہ متوکل کے تخت نشین ہونے تک (۷۵۰ء۔۸۴۷ء)
- دوسرا دور متوکل کی خلافت سے بغداد میں بویہی حکومت کے قیام تک (۸۴۷ء۔۹۴۵ء)
- تیسرا دور بویہی خلفاء سے سلاجقہ کے دخول بغداد تک (۹۴۵ء۔۱۰۵۵ء)

اور چوتھا دور سلاجقہ سے سقوط بغداد تک (۱۰۵۵ء۔۱۲۵۸ء)

اس لیے اس کے نثر نگاروں کے چار طبقے اہل نقد ونظر نے متعین کیے ہیں جن کا تعلق کم و بیش انہی ادوار سے رہا۔

پہلے طبقے کا سربراہ ابن المقفع ہے۔ نثر میں اس کا طریقہ یہ تھا کہ ایک جملے کو کئی ٹکڑوں میں تقسیم کرتا تھا اور الفاظ کے جوڑے بنا کر ان کے درمیان تعلق قائم کرتا تھا۔ پھر یہ کہ وہ سادگی پسند تھا اور مضمون اور خیال کی ادائیگی کو زیادہ اہمیت دیتا تھا اور سجع بندی سے اجتناب کرتا تھا۔ وہ لکھنے والوں کو نصیحت کرتا تھا کہ اس طرح لکھو کہ ایک بے پڑھا آدمی بھی جب اسے سنے تو یہ سمجھے کہ ایسی بات تو وہ بھی کر سکتا ہے۔ پھر یہ کہ نامانوس اور اجنبی الفاظ استعمال کر کے یہ نہ سمجھو کہ اس سے عبارت بلیغ ہوتی ہے' بلکہ یہ ایک طرح کی بے بسی اور اظہار پر عدم قدرت ہوتی ہے۔ اس طبقے میں دوسرے لوگ یہ ہوئے : یعقوب بن داؤد' جعفر بن یحییٰ' حسن بن سہل' عمرو بن مسعدہ' سہل بن ہارون اور حسن بن وہب۔

دوسرے طبقے کا سرخیل جاحظ ہے۔ عبارت کی سلاست اور بلاغت میں اس کا طریقہ بھی پہلے طبقے جیسا ہی تھا۔ لیکن اس کا امتیازی وصف یہ تھا کہ وہ جملے کو چھوٹے چھوٹے ٹکڑوں میں بانٹ دیتا تھا' جو کبھی ہم قافیہ ہوتے اور کبھی بغیر قافیہ کے' یعنی مُرسَل۔ نیز وہ الفاظ اور جملوں میں بات کو لمبا کرتا تھا اور ایک معنی سے دوسرے معنی کی طرف نکل جاتا تھا۔ علاوہ ازیں وہ سنجیدگی میں ظرافت کا عنصر بھی شامل کر دیتا کہ پڑھنے والے کی اکتاہٹ دور ہو جائے۔ پھر وہ اپنی تحریر میں عقلی دلائل اور منطق سے بھی کافی کام لیتا تھا۔ اس طبقے کے افراد میں ابن قتیبہ' مبرّد اور ابراہیم صولی شامل ہیں۔

تیسرے طبقے کا قائد ابن العمید ہے۔ اس کا انداز تحریر دل میں گھر کرنے والا تھا اور انسان کے وجدان پر حاوی ہو جاتا تھا۔ اس لیے کہ یہ شاعری کے مانند ہوتا تھا' اس فرق کے ساتھ کہ اس میں وزن نہیں ہوتا تھا۔ یہ اہل یورپ کے کلاسیکی اسلوب کے مماثل تھا' اس لیے کہ اس کے کچھ قاعدے اور ضابطے تھے جن کا خیال رکھنا ضروری تھا۔ وہ ضابطے یہ تھے کہ عبارت میں بہت مختصر سجع ہونا چاہیے' تاریخ اور علوم

سے نوادر لے کر اس میں ڈالنے چاہئیں۔ نثر میں شعروں سے مثالیں دی جائیں اور خیال اور تشبیہ کو مکمل کر استعمال کیا جائے۔ اس کے رجال میں یہ لوگ مشہور ہوئے : صاحب بن عبادؔ وزیر مہلبیؔ، خوارزمیؔ، بدیع الزمان ہمذانیؔ، ثعالبی وغیرہ اور اس طبقے کے ادبی آثار میں مقامات آتے ہیں۔

چوتھے طبقے کا سردار القاضی الفاضل ہے۔ اس کے طریقے میں تیسرے طریقے کی طرح سجع اور بدیع کا استعمال تو ہوتا تھا، لیکن یہ لوگ علم بیان کی دوسری صنعتوں مثلاً توریہ اور جناس سے بہت کام لیتے تھے جس کی وجہ سے ان کی تحریر میں بناوٹ اور تکلف پیدا ہو جاتا تھا۔ الفاظ بہت آراستہ اور خوش نما ہوتے تھے، لیکن ان کے اندر جو مضمون اور خیال ہوتا تھا وہ بہت کمزور اور لاغر ہوتا تھا۔ اس کے رجال میں ابن الاثیر (مصنف المثل السائر) اور اصفہانی قابلِ ذکر ہیں۔

تاہم نثر نگاری کے یہ مختلف اسالیب لازماً اپنے اپنے زمانوں میں محدود نہیں تھے، بلکہ ایسا بھی ہوتا تھا کہ ایک ہی زمانے میں مختلف اسالیبِ نثر دیکھنے میں آتے۔ مثلاً جاحظ کے زمانے میں ابن عبدربہ نثر میں ابن المقفع کا مقلد تھا، اور ابن العمید کے زمانے میں الشریف الرضی امام علیؓ کے اسلوب کی تقلید کرتا تھا۔ لیکن یہ نثر نگار جو کچھ بھی لکھتے تھے اس پر ان کے اپنے زمانے اور حالات کی چھاپ ضرور ہوتی تھی۔

اب ہم عباسی دور کے چند بڑے نثر نگاروں کے حالات اور ان کی نثر کے نمونے مختصراً پیش کریں گے۔

## عباسی دور کے اہم نثار نگار

## ابن المقفعؒ (م ۷۵۹)

عبداللہ بن المقفع نسلاً فارسی تھا، لیکن اس نے پرورش عرب میں پائی۔ وہ تقریباً ۷۲۴ میں پیدا ہوا اور اس کی نشو و نما بصرے میں ایک کھاتے پیتے گھرانے میں ہوئی۔ اس کا والد مجوسی تھا جو حجاج بن یوسف کے لیے خراج اکٹھا کیا کرتا تھا۔ ایک دفعہ اس نے سلطان کے مال میں سے کچھ دبا لیا تو حجاج نے اسے اتنا مارا کہ اس کے ہاتھ کی ہڈی اتر گئی اور وہ مقفع (ٹوٹے ہوئے ہاتھ والا) کے نام سے مشہور ہوا۔ ابن المقفع کی تربیت اسلامی طرز پر ہوئی اور مسائلِ حیات سے آزاد ہونے کی وجہ سے اسے حصولِ علم کی خواہش ہوئی اور وہ یہ خواہش پوری کرنے میں لگ گیا۔ چنانچہ جب وہ بڑا ہوا تو اسے فارسی اور عربی دونوں زبانوں میں لکھنے کا ملکہ حاصل ہو گیا تھا۔ یہ دیکھ کر بنو امیہ کے دور میں داؤد ابن عمر نے اس سے

انشاء کا کام لیا اور پھر بنو عباس کے زمانے میں منصور کے چچا عیسیٰ بن علی نے اسے اپنا سیکرٹری مقرر کیا اور وہ اس کے ہاتھ پر اسلام لے آیا۔ واقعہ یوں ہے کہ ایک دن ابن المقفع اس سے کہنے لگا کہ ''اسلام میرے دل میں داخل ہو چکا ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ آپ کے ہاتھ پر اسلام لے آؤں۔'' اس پر عیسیٰ بن علی نے کہا: ٹھیک ہے، کل صبح میرے پاس آ جانا، وہاں سپہ سالار اور فوج کے افسر موجود ہوں گے تو تمہارے اسلام کے سب گواہ ہوں گے۔ اور پھر اسی رات ابن المقفع اس کے ساتھ کھانے میں شریک ہوا اور مجوسی طریقے کے مطابق کھاتے ہوئے اپنے حلق سے گھوں گھوں کی آوازیں نکالتا رہا۔ جب عیسیٰ نے اس کا سبب پوچھا تو ابن المقفع نے کہا: ''میں نے یہ پسند نہ کیا کہ میں ایک رات بغیر کسی مذہب کے گزار دوں۔'' دوسرے دن وہ عیسیٰ کے پاس آیا اور اپنے اسلام کا اعلان کیا اور اس کا نام عبداللہ رکھا گیا۔ اس سے قبل اس کا نام روزبہ تھا۔

بعض لوگوں نے یہ خیال ظاہر کیا کہ وہ متاعِ دنیا کی خاطر اسلام لایا تھا اور اس نے ایک دفعہ قرآن کے انداز میں کچھ لکھنے کی کوشش بھی کی تھی جس کی وجہ سے اس پر الحاد کا الزام لگا۔ پھر اس نے بعض زندیق لوگوں کی کتابوں کا ترجمہ کیا اور جب وہ ایک دفعہ ایک مجوسی آتش خانے کے پاس سے گزرا تو اس نے احوص کے یہ دو شعر پڑھے:

| | |
|---|---|
| یا بیت عاتکة الذی اتعزّل | حذر العِدی وبه الفؤاد موکّلُ |
| انی لامنحک الصدود و اننی | قسماً الیک مع الصدود لأمیل |

(اے عاتکہ کا گھر کہ جس سے میں دشمنوں کے ڈر سے بچ کے چلتا ہوں، حالانکہ میرا دل اس کو سونپا ہوا ہے۔
میں تم سے بے پروائی تو برتتا ہوں، لیکن قسم کھاتا ہوں کہ اس کے باوجود میرا جھکاؤ تمہاری طرف ہے۔)

ابن المقفع منصور کے چچاؤں عیسیٰ اور سلیمان کے پاس کام کرتا رہا، یہاں تک کہ وہ امان لکھنے کا واقعہ پیش آیا جو اس کو خلیفہ منصور کی طرف اس کے چچا عبداللہ کے لیے لکھنے کو کہا گیا۔ اس نے جب یہ عہد لکھا تو وہ خلیفہ کے حق میں کچھ زیادہ ہی سخت تھا۔ مثلاً اس میں یہ لکھا تھا کہ ''اگر امیر المومنین اپنے عم عبداللہ کو دھوکا دیں گے تو ان کی عورتوں کو طلاق ہو جائے گی۔ ان کے جانور پکڑ کر بند کر دیے جائیں گے۔ ان کے غلام آزاد ہو جائیں گے اور مسلمان، ان کی اطاعت سے بری الذمہ ہوں گے۔'' منصور کو یہ پڑھ کر بہت غصہ آیا اور اس نے بصرہ کے امیر سفیان بن معاویہ المہلبی کو اس کے قتل کا اشارہ دے دیا۔ وہ پہلے ہی ابن المقفع سے خار کھائے بیٹھا تھا کہ وہ بصرہ کے معززین کے سامنے اس کا مذاق اڑایا کرتا تھا۔ لوگ

کہتے تھے کہ اس کی ناک بہت بڑی ہے۔ چنانچہ جب بھی ابن المقفع اس کے پاس آتا تو کہتا۔ ''السلام علیکما'' (تم دونوں پر یعنی تم پر اور تمہاری ناک پر سلام ہو۔) بصرہ کے امیر کو اب موقع مل گیا تھا۔ اس نے اسے غنیمت جانا اور ابن المقفع کو آگ میں جلا کر مار ڈالا۔ اس وقت اس کی عمر چھتیس برس کی تھی۔

**ابن المقفع کا اخلاق اور علم:** ابن المقفع بہت ذہین، فصیح و بلیغ اور عربی اور فارسی زبانوں کے ادب پر عبور رکھتا تھا۔ جاحظ اس کے متعلق کہتا ہے: ''وہ زبان اور قلم کا دھنی اور ترجمے اور نئے نئے معانی پیدا کرنے اور کردار تخلیق کرنے میں ماہر تھا۔ وہ علم کلام کی بات تو کرتا تھا، لیکن اس میں وہ کوئی خاص بات پیدا نہ کر سکا۔''

کہا جاتا ہے کہ صحابہ کے بعد عربوں میں لغت کے عالم الخلیل سے زیادہ ذہین کوئی نہیں تھا اور عجمیوں میں ابن المقفع سے زیادہ ذہین کوئی نہیں تھا۔ ایک دفعہ یہ دونوں دوست اکٹھا ہوئے تو تین دن ایک دوسرے کے ساتھ باتیں کرتے رہے۔ جب وہ ایک دوسرے سے رخصت ہوئے تو الخلیل سے پوچھا گیا: تم نے ابن المقفع کو کیسا پایا؟ الخلیل نے جواب دیا: ''اس کے علم و ادب کا کوئی ٹھکانا نہیں ہے۔ لیکن اس کا علم اس کی عقل سے زیادہ ہے۔'' اسی طرح ابن المقفع سے پوچھا گیا: تم نے الخلیل کو کیسا پایا؟ اس نے جواب دیا۔ ''اس کے علم و ادب کا کوئی ٹھکانا نہیں، لیکن اس کی عقل اس کے علم سے زیادہ ہے۔'' ابن المقفع سے کسی نے پوچھا: تمہاری تربیت و تہذیب کس نے کی؟ تو اس نے جواب دیا: میں نے خود کی۔ وہ یوں کہ میں جب کسی دوسرے شخص میں اچھی بات دیکھتا تھا تو اس پر عمل کرتا تھا اور جب کسی میں بُری بات دیکھتا تھا تو اس سے اجتناب کرتا تھا۔ ابن المقفع اپنے تمام معاملات میں پاکباز، مہذب اور اپنے دوستوں کے ساتھ وفادار تھا۔ عبدالحمید الکاتب کے ساتھ اس کا واقعہ جو اوپر بیان ہوا اس کا بیّن ثبوت ہے۔

ابن المقفع عربی زبان کے نثر نگاروں کے طبقۂ اولیٰ سے تعلق رکھتا ہے۔ اس کی کتاب ''کلیلہ و دمنہ'' جس کے متعلق کہا جاتا ہے کہ اس نے اسے ایک ہندی دانشور بیدپائے کی کہانیوں کی کتاب کے فارسی ترجمے سے عربی زبان میں منتقل کیا تھا، عربی میں ایک اعلیٰ درجے کی ادبی کلاسیک کا درجہ رکھتی ہے اور عربی زبان میں حروفِ ربط و جار (Prepositions) کا صحیح استعمال سکھانے کے لیے یہ ایک بے مثل کتاب ہے۔ لیکن بعض دوسرے لوگوں کا خیال ہے کہ ابن المقفع کی کلیلہ و دمنہ کی زبان اتنی خالص اور شستہ اور بامحاورہ ہے کہ یہ ترجمہ ہو ہی نہیں سکتی۔ چنانچہ ان کا خیال ہے کہ اس نے ان کہانیوں کے فارسی ترجمے کو سامنے رکھ کر خود ہی اس طرح کی کہانیوں کی کتاب لکھ دی جو آج عربی ادب کا ایک شاہکار تسلیم کی جاتی ہے۔

"کلیلہ و دمنہ" کے علاوہ ابن المقفع نے دو رسالے "الادب الصغیر" اور "الادب الکبیر" لکھے جو اخلاق کے بارے میں اس کے فلسفیانہ افکار کا مجموعہ ہیں اور ان دونوں رسالوں کا اسلوب عربی نثر کا نہایت عمدہ نمونہ ہے۔ ان کے علاوہ اس نے خلیفہ منصور کے کہنے پر منطق کے موضوع پر کچھ کتابوں کے عربی میں ترجمے کیے، جن میں ارسطو کی تین کتابیں اور پور فائری کی ایساغوجی شامل ہیں، جن کا ترجمہ اس نے پہلوی زبان سے کیا کہ عربی کے علاوہ وہ یہی زبان جانتا تھا۔

## ابن المقفع کی نثر کا نمونہ:

لا یؤمننک شرّ الجاھل قرابة ولا جوار ولا الف، فان أخوف مایکون الانسان لحریق النار أقرب ما یکون منھا. و کذلک الجاھل ان جاورک انصبک، وان ناسبک جنی علیک، وان ألفک حمل علیک ما لا تطیق. وان عاشرک آذاک و أخافک مع انه عندالجوع سَبُع ضار و عند الشبع مِلک فظّ، و عندا الموافقة فی الدین قائد الی جھنّم. فأنت بالھرب منه أحق منک بالھرب من سَمّ الاساود، والحریق المخُوف والدین الفادح والداء العُیاء.

(رشتے داری، ہمسائیگی اور انسیت تمھیں ایک جاہل کے شر سے غافل نہ کر دے۔ اس لیے کہ ایک انسان کو آگ کا سب سے زیادہ خطرہ اس وقت ہوتا ہے جب وہ اس کے قریب ہو۔ اسی طرح ایک جاہل جب تمہارا ہمسایہ ہوگا تو تمھیں عاجز کر دے گا اور اگر وہ تمہارا ہم نسب ہوگا تو تم پر ظلم کرے گا۔ اگر وہ تم سے مانوس ہوگا تو تم پر ایسا بوجھ ڈال دے گا جو تم اٹھا نہیں سکو گے اور اگر تمہارے ساتھ مل جل کر رہے گا تو تمھیں تکلیف پہنچائے گا اور ڈرائے گا۔ یہ اس کے باوجود کہ جب وہ بھوکا ہو تو ایک درندہ ہوتا ہے اور جب وہ سیر ہو کر کھا لے تو ایک بدمزاج سلطان ہوتا ہے۔ اگر وہ دین کے معاملے میں تمہارے ساتھ موافقت کرے تو سیدھا جہنم کی طرف لے جائے۔ چنانچہ تمہارے لیے بہتر یہی ہے کہ تم اسی سے بھاگو بجائے اس کے کہ بڑے سانپوں کے زہر سے، خوفناک آگ سے، بوجھل قرض سے اور لاعلاج بیماری سے بھاگتے پھرو۔)

کان لی أخ أعظم الناس فی عینی. و کان رأس ماعظّمه فی عینی صغر الدنیافی عینه. کان خارجاً من سلطان بطنه. فلا یشتھی مالا یجد ولا یُکثر

اذا وجدَ. وکان خارجاً من سلطان لسانه فلا یتکلّم بما لا یعلم. ولا یُماری فی علم. وکان خارجاً من سلطان الجهالة. فلا یتقدّم ابداً الا علی ثقة بمنفعة. وکان أکثر دهره صامتاً. فاذا قال بذَّ القائلین. وکان ضعیفاً مستضعفاً، فاذا جدّ الجدّ فهو اللیث عادیا.

وکان لا یتبرّم ولا یتسخّط ولا یتشکّی ولا یتشهّی، ولا ینتقم من العدوّ ولا یغفل عن الولیّ، ولا یخصّ نفسه بشیئ دون اخوانه من اهتمامه وحیلته و قوته.

فعلیک بهذه الاخلاق ان أطقتها، ولن تُطیق. ولکن اخذ القلیل خیر من ترک الجمیع.

(میرا ایک بھائی تھا جو میری نظر میں لوگوں سے بہت بڑا تھا اور جس چیز نے اسے میری نظر میں بڑا بنایا وہ اس کی نظر میں اس دنیا کا حقیر ہونا تھا۔ وہ اپنے پیٹ کی مجبوری سے بچا ہوا تھا۔ چنانچہ جو اس کے پاس نہ ہوتا اس کی اسے خواہش نہ ہوتی اور جب اس کے پاس کوئی چیز ہوتی تو وہ اس کی زیادتی کا لالچ نہ کرتا۔ اس پر اس کی زبان کا بھی غلبہ نہیں تھا، چنانچہ وہ کوئی ایسی بات نہ کہتا جو وہ جانتا نہ ہو اور علم میں بحث و تکرار نہ کرتا۔ وہ جہالت کے اثر میں بھی نہیں تھا، چنانچہ وہ اسی وقت قدم آگے بڑھاتا جب اسے اس کے فائدے کا یقین ہوتا۔ وہ اکثر اوقات خاموش رہتا۔ جب بولتا تو بولنے والوں پر غالب آ جاتا۔ وہ ویسے تو کمزور تھا اور لوگ بھی اسے کمزور سمجھتے تھے لیکن جب کوئی سخت صورت حال پیدا ہو جاتی تو وہ شیر بن کر جھپٹ پڑتا۔

وہ اکتاتا نہیں تھا، نہ وہ ناراض ہوتا، نہ شکایت کرتا، نہ کسی چیز کی بہت خواہش کرتا، نہ دشمن سے انتقام لیتا، نہ اپنے دوست کے معاملے میں غفلت برتتا۔ نہ اپنے بھائیوں کو چھوڑ کر اپنے لیے کوئی چیز خالص کر لیتا اور اپنا سارا اہتمام، ساری تدبیر اور طاقت اپنے لیے ہی مخصوص رکھتا۔

پس اگر تمہارے لیے یہ ممکن ہو تو اسی طرح کے اخلاق اپناؤ اور یہ تمہارے لیے آسان نہیں ہوگا۔ لیکن سارا کچھ چھوڑ دینے سے بہتر ہے کہ انسان تھوڑا کچھ اخذ کر لے۔)

## جاحظ (م ۸۶۸)

ابوعثمان عمرو بن بحر الجاحظ، امام ادب، اعلیٰ پایے کا نثر نگار، متعدد کتابوں کا مصنف، نیز مذہبی اور سیاسی

مباحث اور معتزلی الٰہیات پر دلچسپ رسائل کا خالق اور اپنے زمانے کی ایک نادرۂ روزگار شخصیت!

جاحظ آٹھویں صدی عیسوی کی آخری دہائیوں میں بصرے میں پیدا ہوا۔ بصرہ، بغداد سے پہلے، اس زمانے میں علم و ادب کا مرکز تھا۔ اس کی جامع مسجد میں علماء، ادباء اور نحو و بلاغت کے اساتذہ جمع ہوتے جنہیں ''مسجدیین'' (مسجد میں وقت گزارنے والے) کہا جاتا تھا۔ جاحظ جسے قدرت کی طرف سے بے پناہ ذہانت اور عمدہ حافظہ عطا ہوا تھا اور اس کے ساتھ اسے پڑھنے اور سیکھنے کا شوق بھی تھا، وہ ان عالم و فاضل لوگوں کی مجالس میں بیٹھتا، ان کی باتیں سنتا اور علم حاصل کرتا۔ اسے پڑھنے کا اتنا شوق تھا کہ جو بھی کتاب اس کے ہاتھ لگتی اسے ختم کر کے ہی دم لیتا۔ اپنے اس شوق کی تکمیل کے لیے وہ کتب خانوں کے مالکوں (وراقین) سے ان کی دکانیں کرایے پر لے لیتا، اور وہاں بیٹھ کر ساری ساری رات کتابیں پڑھتا رہتا۔

پھر وہ بغداد چلا گیا اور تحصیلِ علم کا شوق وہاں کے اکابر علماء و ادباء کی مجلسوں میں بیٹھ کر پورا کیا۔ وہاں اس نے ابو عبیدہ، اصمعی اور ابو زید انصاری جیسے علماء سے لغت اور ادب اور روایتِ شعر میں کسب فیض کیا۔ نحو کی تعلیم اس نے مشہور نحوی اخفش سے حاصل کی، اور علمِ کلام معتزلی عالم اور مفکر ابو اسحاق نظام سے اخذ کیا۔ نظام ہی سے اس نے فلسفہ کے مبادی سیکھے، نیز سوچنے اور فکر کرنے اور روایتی عقائد و علوم کو عقلی سطح پر جانچنے کا طریقہ سیکھا۔ اس وقت عرب میں تین تہذیبیں اکٹھا ہو رہی تھیں۔ جاحظ نے عربی تہذیب و ثقافت کا اثر تو بصرے میں مربد کے اجتماعات اور مسجدیین کی مجالس سے لیا۔ یونانی تہذیب سے وہ علمائے کلام اور حنین بن اسحاق اور اس کے ساتھ دوسرے مترجمین کے ذریعے متعارف ہوا۔ اور فارسی تہذیب تک اس کی رسائی ابن المقفع کو پڑھ کر اور ابو عبیدہ کی تعلیم کے واسطے سے ہوئی۔ اس طرح اس نے اپنی تعلیم اور اپنے مطالعہ و مشاہدہ کے طفیل ان تینوں ثقافتوں (عربی، یونانی اور فارسی) کو اپنے اندر جذب کر لیا۔ اس نے اپنی اس ذہنی کاوش کی بدولت بہت سے علوم و فنون میں اچھی دستگاہ پیدا کر لی اور ادب میں ایسے مقام کو پہنچا جہاں کوئی اور نہ پہنچ سکا۔

بصرے میں رہ کر جاحظ نے علم و ادب کی مختلف اصناف میں لکھنا شروع کر دیا۔ اسے لوگوں کا یہ رویہ کچھ اچھا نہ لگا کہ ماضی کی ہر بات کو محترم سمجھا جائے اور قدیم لکھنے والوں کو سر آنکھوں پر بٹھایا جائے، جبکہ نئے لکھنے والوں کی طرف زیادہ توجہ نہ کی جائے اور نہ ان کے لکھے کو معتبر جانا جائے۔ چنانچہ لوگوں کے اس رویے کو دیکھ کر اس نے شروع شروع میں جو کچھ لکھا اسے ابن المقفع اور سہل بن ہارون کی تحریر بنا کر پیش کیا۔ تاکہ اس طرح وہ چل نکلے۔ یہ حیلہ اس زمانے میں عام تھا اور نئے لکھنے والے عموماً یہی کرتے تھے کہ اپنی ابتدائی تحریروں کو بڑے ادباء کے نام لگا دیتے تھے۔ خود جاحظ کے ساتھ بھی یہی ہوا کہ اس

کے بعد آنے والے ادباء اور تلامذہ نے اپنی بہت سی تحریروں کو جاحظ کی تصنیف بتایا اور اسے اسی طرح خو کر دیا۔ یہی وجہ ہے کہ آج جاحظ کی دو سو سے زیادہ تصانیف میں سے ایسی تصانیف جو زمانے کی دستبر سے بچ کر ہم تک پہنچی ہیں' ان میں سے بہت تھوڑے سے حصے کو چھوڑ کر باقی کتابوں کے متعلق یہ بات یقین سے کہنا بہت مشکل ہے کہ وہ واقعی جاحظ کی لکھی ہوئی ہیں۔

جاحظ نے اپنی عمر کا زیادہ عرصہ بصرے میں ہی گزارا اور تصنیف و تالیف کے کام میں منہمک رہا۔ لوگ اس کے اس مشغلے کو قدر کی نگاہ سے دیکھتے تھے اور اس کی ضروریات زندگی کسی نہ کسی طرح پوری ہوتی رہتی تھیں۔ امراء و حکام کے ہاں اس کی اچھی قدر و منزلت تھی اور دوسرے اکابر اور عمائدین بھی اس کی عزت کرتے تھے۔ عباسی خلفاء، مامون' معتصم' واثق اور متوکل کے عہد میں وہ کبھی کبھی بغداد بھی جاتا تھا اور بعد میں وہ محمد بن عبدالملک الزیات کا مصاحب بن گیا اور اس کی تینوں وزارتوں کے زمانے میں اس کے ساتھ رہا اور جب اس کے دن پھرے تو جاحظ بصرے چلا آیا اور باقی عمر یہیں گزار دی۔ عمر کے آخری حصے میں اس پر فالج کا حملہ ہوا جس میں وہ کافی عرصہ مبتلا رہا اور آخر ۸۶۸ میں اس نے ترانوے برس کی عمر میں انتقال کیا۔

جاحظ کا دادا ایک سیاہ فام غلام تھا جو بصرے کے ایک آدمی کے اونٹ چراتا تھا۔ اسی لیے جاحظ بھی بدصورت اور افسردہ رُو شخص تھا۔ اس کی آنکھوں کے بڑے بڑے ڈھیلے باہر کو اُبلے پڑتے تھے اسی لیے اسے ''جاحظ'' کا نام دیا گیا۔ جاحظ نے خود کہیں لکھا ہے کہ خلیفہ متوکل تک جب اس کی شہرت پہنچی تو ایک دفعہ اس نے اسے اپنے ہاں بلایا کہ اپنے بیٹے کی تعلیم اس کے سپرد کرے۔ لیکن جب اس نے جاحظ کو دیکھا تو اس کی صورت اسے اتنی بُری لگی کہ اس نے اپنا ارادہ بدل دیا' اور اسے دس ہزار درہم دے کر رخصت کر دیا۔ جاحظ دیکھنے میں جیسا بھی تھا' اس میں حس مزاح بہت زیادہ تھی۔ وہ اپنی سنجیدہ تحریروں میں بھی مزاح اور ظرافت کی چاشنی شامل کر کے انہیں دلچسپ اور پُرلطف بنا دیتا تھا۔ وہ روایتی آداب اور پرانی عادتوں اور وضعداریوں کے خلاف تھا اور ان کا مذاق اڑاتا رہتا تھا۔ لیکن اس میں کوئی شک نہیں کہ وہ اس کے ساتھ ساتھ بے حد ذہین' پُرظرافت' دلچسپ گفتگو کرنے والا اور ایک خیر خواہ انسان تھا۔ جاحظ کی یہ ظرافت اس کے مرض اور تکلیف کی حالت میں بھی کم نہ ہوئی۔

جاحظ کے بھانجے کی روایت ہے کہ ایک دفعہ متوکل نے حکم دیا کہ جاحظ کو بصرے سے اٹھا کر اس کے ہاں لایا جائے تو فتح بن خاقان نے کسی کو اس کام پر مامور کیا۔ اس نے آ کر دیکھا کہ فالج کے اثر سے جاحظ بہت نحیف ہو گیا ہے۔ اس پر جاحظ نے اس آدمی سے کہا۔ "ما یصنع بامرئ لیس بطائل ذی شق مائل و لعاب سائل و عقل زائل و لون حائل." (یعنی وہ خلیفہ ایک ایسے شخص کے ساتھ کیا

کرے گا جس میں کچھ بھی نہیں رہا۔ جس کے جسم کا ایک حصہ ایک طرف کو جھکا ہوا ہے، جس کے منہ سے لعاب بہتا ہے، جس کی عقل باقی نہیں رہی اور جس کا رنگ متغیر ہو چکا ہے۔'' ایک دفعہ مبرد اس کی عیادت کو آیا اور پوچھا کیا حال ہے۔ جاحظ نے جواب دیا: اس شخص کا کیا حال ہوگا جس کا آدھا دھڑ اتنا مفلوج ہے کہ اگر آرے سے بھی چیرا جائے تو اسے احساس نہ ہو، اور دوسرا حصہ اتنا حساس ہے کہ اگر اس کے قریب سے مکھی بھی اڑ کے گزر جائے تو اسے تکلیف ہوتی ہے۔ اور سب سے تلخ حقیقت تو یہ ہے کہ میں نوے سال سے اوپر ہو چکا ہوں۔'' اور پھر ایک شعر پڑھ کر سنایا:

أترجو ان تکون، وانت شیخ — کما کنت ایام الشباب
لقد کذبتک نفسک، لیس ثوب — خلیقٌ کالجدید من الثیاب

(کیا تو بڑھاپے کو پہنچ کر بھی یہ اُمید رکھتا ہے کہ تو اسی طرح ہو جیسے جوانی کے دنوں میں تھا۔
تمہارے نفس نے تم سے جھوٹ کہا...... ایک بوسیدہ کپڑا نئے کپڑے جیسا نہیں ہوتا۔)

**جاحظ کی عربی نثر اور اسلوب تحریر:** اس بارے میں مصر کے نامور ادیب احمد حسن الزیّات کہتے ہیں:

''میرے اس عاجز اور کوتاہ قلم میں یہ طاقت نہیں کہ اس نابغۂ عرب اور مشرق کے والٹیئر (Voltaire) کے متعلق یہ بتا سکے کہ اس کی تحریروں نے عربی ادب پر کتنا بے پناہ اثر ڈالا۔ مختصراً اتنا ہی کہہ سکتے ہیں کہ اپنے ہم عصروں کے مقابلے میں اس کا علم بہت زیادہ تھا، اس کی قوت استدلال بہت محکم تھی، اور کوئی بھی بحث ہوتی وہ اس کی انتہا تک پہنچتا تھا۔ وہ بے حد فصیح و بلیغ اور خوش بیان تھا۔ اس نے علم کلام سیکھا اور اسے یونان کے فلسفے کے ساتھ مزج کیا۔ مذہب توحید میں اس نے متکلمین سے الگ راہ نکالی اور اس کے طریقے کو طریقۂ جاحظیہ کہا گیا۔ اپنے وقت کے تمام علوم وفنون میں اس نے جو کچھ بھی لکھا ایک عالم اور محقق کی حیثیت سے لکھا۔ وہ پہلا عربی عالم ہے جس نے سنجیدگی اور ظرافت کو اکٹھا کیا۔ طرح طرح کے مسائل کو اپنی بحث کا موضوع بنایا۔ اپنی گوناگوں تصانیف میں اس نے حیوان، نباتات، اخلاق اور معاشرت سب پر اپنے نتائج فکر پیش کیے۔''

عربی ادب کی پوری تاریخ میں دو چار یا پانچ لکھنے والے ایسے ہوں گے جو بطور نثر نگار کے اس کے ساتھ شانہ ملا کر کھڑے ہو سکیں۔ اس لیے کہ جاحظ کی تحریر میں بہت سی چیزیں اکٹھا ہو گئی تھیں۔ اس میں بلاغت تھی، اس زمانے کا خالص عربی محاورہ اور روزمرّہ تھا، اس میں علم تھا، فلسفہ تھا، منطق تھی، مکالمے کے



Scanned with CamScanner

انداز کا طرزِ اظہار تھا، ظرافت اور لطافت تھی اور ایک بہت طاقتور ذہن کا تخلیقی عمل تھا۔ اسے مناظرہ اور استدلال پر ایسی قدرت حاصل تھی کہ وہ ایک ہی مسئلے پر دونوں طرف کے دلائل اس طرح پیش کرتا تھا کہ ہر دفعہ اس کی بات قابلِ یقین لگتی تھی۔ اس کا ایک نمونہ اس نے اپنی کتاب العثمانیہ میں یوں دیا کہ اسلام کے پہلے تین خلفاء کے برحق ہونے پر اس نے انتیس (۲۹) دلائل دیئے اور پھر کتاب العثمانیہ کی تردید میں ابوجعفر اسکافی کے نام سے تیس (۳۰) دلائل ایسے دیئے جو زیادہ مفصّل انداز میں ان انتیس دلائل کا جواب مہیا کرتے ہیں۔ کہنے کو یہ ابوجعفر اسکافی کا موقف ہے، لیکن اسے جس زبان اور اسلوب میں پیش کیا گیا ہے وہ خالصتاً جاحظ کا ہے اور یہ مقدمہ اتنی خوبی کے ساتھ جاحظ کے سوا کوئی اور نہیں لڑ سکتا تھا۔

بغداد میں تین دن جاحظ نے کاتب انشاء کے فرائض انجام دیئے۔ لیکن پھر یہ کام چھوڑ دیا۔ اس کے علاوہ اسے کوئی اور سرکاری عہدہ اس وقت کی حکومت کی طرف سے نہ ملا۔

جاحظ کی تصانیف میں دو سو کے نام گنے جاتے ہیں۔ لیکن ان میں سے صرف تیس اصلی یا اس سے غلط طور پر منسوب شدہ باقی بچے ہیں۔ پچاس کے قریب ایسی تصانیف ہیں جن کا کچھ حصہ مل جاتا ہے۔ لیکن پوری تصنیف کہیں نہیں ملتی۔ ان کو چھوڑ کر باقی ایک سو بیس صحیح یا منسوب تصانیف کا آج کوئی نشان نہیں ملتا۔

جاحظ کی بڑی تصانیف چار ہیں:

۱۔ البیان والتبیین: یہ عربی زبان کی منتخب ادبیات کا ایک مجموعہ (Anthology) ہے، جس میں قرآنی آیات بھی ہیں، احادیث بھی ہیں، شاعری بھی ہے، حکیمانہ اقوال بھی ہیں اور خطباء کی تقریریں بھی ہیں۔ اور ان سب معاملات میں وہ اپنی آراء کا اظہار بھی کرتا جاتا ہے۔

۲۔ کتاب الحیوان: یہ دراصل ایسے قصّوں کا انتخاب ہے جن کی بنیاد حیوانات پر رکھی گئی ہے اور جس میں بعض اوقات الہیات، فلسفہ، مابعد الطبیعیات، عمرانیات وغیرہ کے مباحث بھی چھیڑے جاتے ہیں۔ اس میں ایسے نظریات بھی دکھائی دیتے ہیں جو ابھی اپنی ابتدائی صورت میں تھے اور جن کے متعلق یہ کہنا ممکن نہیں کہ وہ کس حد تک جاحظ کے اپنے ذہن کی پیداوار ہیں۔ مثلاً ارتقائے انواع، آب و ہوا کے اثرات اور حیوانات کی نفسیات، یعنی وہ علوم جن کا نشوونما کہیں انیسویں صدی میں جا کر ہوا۔

۳۔ کتاب البخلاء : یہ کتاب انسانی کرداروں کا ایک نگار خانہ ہے اور عجمیوں کی ہجو کے ساتھ ساتھ انسان کی فطرت میں جو بخل ہے' اس کا ایسا تجزیہ ہے جس کی مثال عربی ادب میں نہیں ملتی۔ جاحظ کی قوت مشاہدہ' ہلکی پھلکی سی شگفتہ طبیعت' خوش مزاجی اور ہجو گوئی کے فطری میلان نے مل کر اسے اس بات کے لیے انتہائی موزوں بنا دیا تھا کہ معاشرے کی اور اس میں رہنے والے مختلف کرداروں کی عکاسی کرے۔ اس نے معاشرے کے مختلف طبقات (مثلاً معلموں' گویّوں' موسیقاروں' کاتبوں وغیرہ) کا خاکہ اڑانے میں اپنی پوری قابلیت اس کتاب میں صرف کر دی ہے۔

۴۔ رسائل : یہ کوئی ایک مجموعہ نہیں ہے بلکہ رسائل الجاحظ کے نام سے متعدد مجموعے دستیاب ہیں جن میں اس کے اہم مقالات مثلاً رسالۃ القیان' المعاد والمعاش' السّر و حفظ اللسان' الجدّ والهزل' فصل مابین العداوۃ والحسد' الرّد علی النصاری' رسالۃ فی مناقب الترک' کتاب استحقاق الامامۃ' فی النساء' رسالۃ فی بنی امیۃ' رسالۃ فی العباسیۃ' کتاب التربیع والتدویر وغیرہ شامل ہیں۔ ان میں سے بعض مقالات بذات خود رسائل اور مختصر کتابیں ہیں۔ یہ بات یقین کے ساتھ کہی جا سکتی ہے کہ جاحظ کے بیان اور اسلوب اور اس کے فکر وفن کا اعلیٰ نمونہ اگر دیکھنا ہو تو وہ اس کے رسائل میں ملتا ہے۔ جاحظ کے رسائل کا مطالعہ ہمیشہ ایک دلچسپ اور مفید(rewarding) مشغلہ ہے۔

## جاحظ کی نثر کے نمونے

انواعُ الغربان : ومن الغربان غُرابُ اللیل' وهو الذی ترک اخلاق الغربان وتشبّه باخلاق البوم. ومنها غُراب البین' و غراب البین نوعان : احدهما غربان صغار معروفة بالضعف واللوم' والآخر کل غراب یُتشاءُم به. وانما لزمه هذا الاسم لان الغراب' اذا بان اهل الدار للنجعة' وقع فی مرابض بیوتهم یلتمس و یتقمّم' فیتشاء مون به و یتطیرُّون منه' اذکان لا یعتری



Scanned with CamScanner

منازلهم الا اذا بانوا، فسموّه غراب البين، ثم كرهوا اطلاق ذلك الاسم له مخافة الزجر والطِيَرة، وعلموا انه نافذ البصر صافي العين، حتى قالوا "أصفى من عين الغراب"، كما قالوا "أصفى من عين الديک"، فسمّوه الأعور كنايةً، كما كنّوا طيرةً عن الأعمى فكنّوه ابا بصير، وبها اكتنى الاعشى بعدان عمي، ولذلک سمّوا الملدوغ والمنهوش سليماً، و قالوا للمهالک من الفيافي المفاوز، وهذا كثير.

(کوّوں کی اقسام: کوّوں میں ایک رات کا کوّا ہوتا ہے۔ وہ ایسا ہے کہ اس نے کوّوں کے اخلاق ترک کر دیے ہیں اور اُلّو کے اخلاق اپنا لیے ہیں۔ کوّوں میں ایک جدائی کا کوّا ہوتا ہے۔ یہ دو قسم کے ہوتے ہیں: ایک وہ جو چھوٹے کوّے ہوتے ہیں، کمزور اور ملامت زدہ، دوسرا ہر وہ کوّا ہوتا ہے جسے منحوس سمجھا جاتا ہے۔ اس کے ساتھ یہ نام اس لیے چپک گیا ہے کہ جب کسی حویلی کے مکین وہاں سے چل دیتے ہیں تو یہ ان کے گھروں کے باڑوں میں اترتا ہے اور کوڑے میں سے کچھ تلاش کرتا ہے، تو لوگ اسے نامسعود سمجھتے ہیں اور اس سے بُرا شگون لیتے ہیں۔ اس لیے کہ وہ ان کے گھروں میں تبھی آتا ہے جب وہ وہاں سے چل دیتے ہیں۔ اسی لیے اسے جدائی کا کوّا کہتے ہیں۔ پھر انہوں نے اسے یہ نام دینے کو اچھا نہ سمجھا، بدشگونی کے ڈر سے۔ انہیں معلوم تھا کہ اس کی نگاہ بہت تیز ہے اور آنکھ بہت صاف ہے۔ چنانچہ مثل مشہور ہے کہ "کوّے کی آنکھ سے بھی زیادہ صاف" جس طرح کہتے ہیں۔ "مرغے کی آنکھ سے بھی زیادہ صاف۔" پھر انہوں نے اس کا نام شگون کے لیے کانا رکھا۔ جیسے اندھے کا نام شگون کے لیے ابوبصیر (دیکھنے والے کا باپ) رکھتے ہیں۔ شاعر اعشٰی جب اندھا ہو گیا تو اسے بھی ابوبصیر کہا گیا۔ اسی لیے جسے سانپ نے کاٹ لیا ہو اسے شگون کے لیے سلیم (صحیح سالم) کہتے ہیں، اور جو ہلاک کر دینے والے صحرا ہوتے ہیں انہیں مفاوز (نجات کے راستے) کہا جاتا ہے اور اس طرح کی مثالیں بہت ہیں۔)

اپنے ایک دوست سے شکوہ کرتے ہوئے جاحظ کہتا ہے:

والله يا قُليب، لولا ان كبدي لي هواک مقروحة و روحي بک مجروحة لسا جلتک هذه القطيعة وما ددتک حبل المصارمة. وارجو الله ان يُدبل صبري من جفائک، فيرذک الى مودّتي وأنف القِلىَ راغم، قد طال العهد

بالاجتماع، حتی کدنا نتنا کر عند اللقاء.

(قلیب! خدا کی قسم اگر میرا جگر تمہاری محبت میں زخم خوردہ نہ ہوتا اور میری روح تمہاری وجہ سے گھائل نہ ہوتی تو میں اس قطع تعلق میں تم سے بڑھ جاتا اور تمہارے ساتھ رشتہ توڑنے کے اس سلسلے کو بڑھاتا۔ لیکن میں اُمید کرتا ہوں کہ اللہ تمہاری بے وفائی کے بدلے میں مجھے صبر دے دے اور تمہیں میری محبت کی طرف واپس لے آئے' اس طرح کہ نفرت کا جذبہ دب کے رہ جائے۔ ہمیں ملے ہوئے کافی عرصہ ہوگیا ہے' یہاں تک کہ ہم جب کبھی سامنے آتے ہیں تو ایک دوسرے کو پہچان نہیں پاتے۔)

کتاب کی خوبیوں کے بارے میں جاحظ کہتا ہے :

قد کنُت اعجَب من عیبک البعض بلا علمٍ' حتی عِبتَ الکُلّ بلا علم. ثم تجاوزت ذلک الی التشنیع. ثم تجاوزت ذلک الی نصب الحرب فعبت الکتاب. ونعم الذُخر و العُقدة هو...... و عبت الکتاب' ولا اعلم جاراً أبرّ ولا خلیطاً أنصفَ ولا رفیقاً أطوع ولا معلّما أخضع ولا صاحباً أظهر کفایة ولا أقلّ جنایة' ولا اقلّ املالاً و ابراماً ولا أحفل اخلاقاً ولا أقلّ خلافاً و اجراماً ولا أقلّ غیبة ولا أبعد من عَضِیهِۃٍ. ولا أکثر أعجوبة و تصرُّفاً ولا اقلّ تصلّفاً و تکلّفاً ولا أبعد من مِراءٍ ولا أترک لشغبٍ ولا أزهد فی جدالٍ ولا اکفّ عن قتال من کتاب.

(میں حیران ہوتا تھا کہ تم بعض کتابوں کو بغیر علم کے بُرا سمجھتے ہو۔ پھر تم سب کتابوں میں' بغیر علم کے' عیب دیکھنے لگے۔ پھر اس سے بھی آگے بڑھ کر تم کتابوں کی مذمت کرنے لگے اور اس سے اگلے قدم پر تم نے کتاب کے خلاف محاذ کھول دیا' حالانکہ کتاب انسان کی بہترین پونجی اور استحکام کا باعث ہوتی ہے...... تم نے کتاب کی بُرائی کی' حالانکہ میں نہیں سمجھتا کہ کوئی ہمسایہ اتنا نیک' کوئی ساتھی اتنا منصف مزاج' کوئی رفیق اتنا فرماں بردار' کوئی معلّم اتنا نرم خُو' کوئی مصاحب اتنا قابلیت والا اور اتنا کم قصور وار اور اتنا کم اُکتانے اور زچ ہو جانے والا ہو سکتا ہے' جتنا کتاب ہوتی ہے۔ اسی طرح میں نہیں سمجھتا کہ انسان کا کوئی ساتھی اتنا بااخلاق' اتنا کم مخالفت کرنے والا اور مجرم بنانے والا' اتنا کم غیبت کرنے والا اور جھوٹا الزام لگانے سے اتنا دور' عجوبہ کاری اور تدبیر میں اتنا بڑھا ہوا' بے فیض اور پُرتکلف ہونے سے اتنا دور' کٹ حجتی اور جھگڑے سے اتنا نفور' شور



Scanned with CamScanner

وشغب کو اتنا زیادہ ترک کرنے والا' بحث ونزاع سے اتنا کنارہ کش اور قتال سے اتنا ہاتھ روکنے والا ہوسکتا ہے جتنا کہ ایک کتاب ہوتی ہے۔)

## ابن العمید (م ۹۷۰)

الاستاذ الرئیس اور وزیر ابوالفضل محمد بن الحسین جو ابن العمید کے نام سے مشہور ہوا اور جس کا لقب کاتب المشرق (مشرق کا انشا پرداز) پڑا' آل بویہہ کی حکومت کا اہم ستون اور ان کے وزراء کا سردار تھا۔ ابن العمید کی اصل فارسی تھی اور وہ ایران کے شہر قُم کا باشندہ تھا۔ اس کا والد ایک اچھا صاحبِ قلم تھا جو بخارا کے بادشاہ کے لیے انشاء نگار(Writer) کا کام کرتا تھا۔ اس نے بیٹے کو ادب کی تعلیم دی' اسے لکھنا سکھایا اور علم سے مزین کیا۔ چنانچہ ابن العمید نے انشا پردازی میں مہارت حاصل کر لی۔ اور اس کے ساتھ فلسفہ اور علم نجوم سے بھی خاصی واقفیت بہم پہنچا لی۔ یہاں تک کہ اسے الاستاذ اور ''جاحظِ ثانی'' کہا جانے لگا۔ جب اس نے علم و ادب میں اعلیٰ مقام پیدا کر لیا اور ان امور میں اپنی استعداد بڑھالی تو وہ بخارا کو چھوڑ کر آل بُویہہ کے علاقے بلاد جبل میں آ گیا اور ان کی سلطنت میں مختلف امور کا نگران مقرر ہوا۔ وہ ترقی کے مدارج طے کرتا اور ایک سے ایک اعلیٰ عہدے پر فائز ہوتا رہا' یہاں تک کہ ۹۴۰ میں رکن الدولہ بن بویہہ کا وزیر بن گیا اور وزارت کی ذمہ داریوں اور حکومت کے امور سے بڑی قابلیت کے ساتھ عہدہ برآ ہوا۔ ابن العمید نے فیاضی میں برامکہ کا طرز عمل اختیار کیا۔ چنانچہ بغداد' شام اور مصر سے شعراء اور علماء اس کے دربار کا رُخ کرنے لگے اور وہ اور اس کے ساتھ صاحب ابن عبّاد اور وزیر مہلّبی اس زمانے میں ترقی کی روح رواں اور ادب کی سرگرمی کا مرکز بن گئے۔ شاعر متنبّی اپنے اعلیٰ مقام کے باوصف ابن العمید کی عزت وتکریم کرتا تھا اور اس سے مرعوب تھا۔ چنانچہ اس نے اس کی مدح میں کچھ نظمیں بھی کہیں۔ ان میں سے ایک نظم میں وہ کہتا ہے:

| | |
|---|---|
| من مبلغ الاعراب انی بعدها | شاهدت رسطا طالیس والاسکندرا |
| و سمعتُ بطلیموس دارس کتبه | متملِّکاً متبدِّیاً متحضّرا |
| ولقیت کل الفاضلین کانما | ردَّا لالٰهُ نفوسهم والاعصرا |

(بادیہ کے عرب کو کون یہ خبر دے گا کہ میں نے اُن کے بعد ارسطو اور سکندر کا مشاہدہ کیا۔
میں نے بطلیموس جیسے عالم (ابن العمید) کو اپنی کتابوں کا درس دیتے ہوئے سُنا۔ اس میں ملوکیت کی شان بھی تھی' بدّوؤں کی فصاحت بھی اور شہری زندگی کی ظرافت بھی۔

میں نے تمام اہل فضل سے ملاقات کر لی' گویا کہ خدا نے ان کو اور ان کے زمانوں کو ہمارے لیے (ابن العمید کی صورت میں) لوٹا دیا۔)

لیکن ابن العمید صحت کے معاملے میں کم نصیب رہا۔ اس پر مختلف بیماریوں نے حملہ کیا۔ وہ پہلے درد قولنج اور پھر گٹھیا میں مبتلا ہوا اور انہی تکلیفوں کی وجہ سے ۹۷۰ میں اللہ کو پیارا ہو گیا۔
عربی انشاء اور تحریر کے فن' نیز رسائل کی نگارش میں ابن العمید نے اتنا اونچا معیار قائم کیا کہ اس کے بارے میں یہ جملہ مشہور ہو گیا کہ "انشا پردازی عبدالحمید الکاتب سے شروع ہوئی تھی اور ابن العمید پر ختم ہو گئی۔"

**تحریر کا ایک نمونہ:** ابن العمید ایک شخص ابن بلکا کو رکن الدولہ کے خلاف عصیان کا رویہ اختیار کرنے پر کہتا ہے:

وزعمتَ أنک فی طَرف من الطاعة بعد ان کنت متوسّطَها. واذا کنت کذلک فقد عرفت حالَیها و حلبت شطرَیها : فنشدتک الله الاّ ماصدقتنی عما سألتک. کیف وجدتَ مازلت منه. و کیف تجدما صرت الیه؟ ألم تکن من الأوّل فی ظلٍّ ظلیل' و نسیم علیل و ریح بلیلٍ. وهواء غذيّ و ماء رويّ' و مهاد وطِيٍ' وکنّ کنینٍ ومکان مکین' و حصن حَصین' عززت به بعد الذلّة و کثرتَ بعد القلّة وارتفعتَ بعد الضَّعة' وأیسرت بعد المعسرة' وأثریت بعد المتربة؟ ففیم الآن انت من الامر؟ وما العوض عما عددتُ والخَلف مما وصفتُ وما استفدت حین أخرجت من الطاعة نفسک و نفضت منها کفّک و غمست فی خلافها یدک؟ وما الذی أظلّک بعد انحسار ظلها عنک؟ أظلّ ذوثلاث شعب' لاظلیل ولا یغنی من اللهب؟ قل نعم کذلک.

(تمہارا خیال ہے کہ تم اطاعت کے کنارے پر ہو' حالانکہ پہلے تم اطاعت کے اندر اور اس کے وسط میں تھے۔ اگر یہی بات ہے تو تم نے دونوں حالتوں کو جان لیا ہو گا اور ان کا تجربہ کر لیا ہو گا۔ میں خدا کا واسطہ دے کر تم سے پوچھتا ہوں اور تم مجھے سچ سچ بتاؤ گے کہ تم جس حالت سے پلٹے ہو اسے تم نے کیسا پایا؟ اور جس حالت میں آ گئے ہو اسے کیسا پایا؟ کیا پہلی حالت میں تم

ایک گھنے سایے تلے نہیں تھے کہ ہلکی ہلکی نسیم چلتی تھی' ہوا نمناک ہوتی تھی' پانی رواں رہتا تھا' اور بچھونا آرام دہ ہوتا تھا۔ پناہ کی جگہ پوشیدہ ہوتی تھی' اور مرتبہ اونچا ہوتا تھا' اور قلعہ محفوظ ہوتا تھا۔ ان سب باتوں نے تمہیں ذلت کے بعد عزت دی اور قلت کی جگہ کثرت سے نوازا۔ چنانچہ تم نچلی سطح سے اُٹھ کر اونچے مقام پر آ گئے اور تنگی ترشی کے بعد خوشحال ہو گئے۔ غربت کے بعد روپے پیسے میں کھیلنے لگے۔ تو اب تم کس حال میں ہو اور جو چیزیں میں نے اوپر گنوائی ہیں ان کے بدلے میں تمہیں کیا ملا ہے' اور جو میں نے بیان کیا اس کی جگہ کس چیز نے لی ہے۔ تم نے کیا فائدہ حاصل کیا اطاعت سے نکل کر اور اس سے اپنے ہاتھ جھاڑ کر اور اس کے مخالف ایک روپے میں اپنے ہاتھ ڈال کر۔ اس اطاعت کے سائے سے باہر آ کر تم پر کس چیز نے سایہ کیا ہے۔ کیا جہنم کے دھوئیں نے' جو نہ سایہ مہیا کرتا ہے اور نہ آگ سے بچاتا ہے؟ کہو ہاں ایسا ہی ہے۔)

## صاحب بن عبّاد (م ۹۹۵)

ابوالقاسم اسماعیل الصاحب بن عبّاد' آل بُویہ کا وزیر اور ان کا دبیر اور انشا پرداز تھا' جس نے عربی نثر میں سجع بندی اور رعایت لفظی (تجنیس) کو فروغ دیا۔

صاحب بن عبّاد قزوین کے صوبے طالقان کے مقام پر پیدا ہوا اور عالمِ لغت ابن فارس کی شاگردی اختیار کی۔ جوانی میں وہ ابن العمید کے پاس آیا اور اس کی صحبت اختیار کی اور اس سے کافی استفادہ کیا۔ اسی صحبت کی وجہ سے اس کا لقب الصاحب (ساتھی) پڑ گیا۔ آگے چل کر وہ مؤید الدولہ ابن بُویہ کا وزیر ہو گیا اور اس کے امور کی نگرانی کرنے کے ساتھ ساتھ سرحدوں کی حفاظت کا انتظام کیا۔ جب اپنے بھائی کے بعد فخر الدولہ حکمران ہوا تو صاحب نے استعفیٰ دے دیا۔ لیکن فخر الدولہ نے اس سے کہا: ''جیسے امارت میں ہم لوگوں کی وراثت چلتی ہے' اسی طرح وزارت میں بھی وراثت ہوتی ہے۔ اس لیے ہمیں چاہیے کہ ہم اپنے حق کی حفاظت کریں۔''

چنانچہ صاحب بن عباد کا اقتدار وسیع ہوا اور اس کے احسانات عام ہوئے۔ اس نے ادب اور علم کے لیے بہت اچھی فضا قائم کی' جس میں ادبا' متکلمین اور نوواردانِ ادب اپنے ذوق کی تسکین کرتے رہے۔ صاحب جب تک زندہ رہا بہت عزت و وقار کے ساتھ رہا اور نزدیک و دور اس کا حکم چلتا رہا۔ جب وہ فوت ہوا تو یہ سب کچھ ختم ہو گیا۔ لوگ اس کے جنازے کے انتظار میں اس کے محل کے باہر جمع ہوئے جن میں خود خلیفہ فخر الدولہ اور اس کے سپہ سالار شامل تھے۔ جب اس کی میت باہر آئی تو سب نے مل کر ایک نعرہ لگایا اور زمین کو بوسہ دیا۔ وہ اصفہان میں دفن ہوا۔



Scanned with CamScanner

صاحب میں اگرچہ کچھ غرور تھا اور وہ کافی خود پسند بھی تھا۔ تاہم اس کی مجلس کسی وزیر کی وہ آخری مجلس تھی جس میں علماء' قاری' انشا پرداز' مصنفین' متکلمین اور شیعہ سبھی ہوتے تھے اور اس کی مہمان نوازی اور داد و تحسین سے خرسند ہوتے تھے۔ صاحب بن عباد کو انشا پردازی میں عبدالحمید الکاتب کا ثانی کہا جاتا ہے۔ اس کے بعد اپنے علم و ادب کی بدولت کوئی شخص بھی امارت وخلافت میں اتنے اعلیٰ مقام تک نہ پہنچا اور نہ اپنی تحریر کی وجہ سے اتنی قدر و منزلت کا سزاوار سمجھا گیا۔ صاحب کو ادب و انشاء میں بدیع الزمان ہمذانی (صاحبِ مقامات) کے بعد لیکن خوارزمی سے پہلے سمجھا جاتا ہے۔ اپنی وزارت کی گوناگوں ذمہ داریوں کے باوجود صاحب نے تصنیف و تالیف کا کام بھی جاری رکھا۔ اس کی تصانیف میں سب سے اہم "کتاب المحیط" ہے جو لغت کے موضوع پر سات جلدوں میں ہے۔ اس کے علاوہ "کتاب الامالۃ" اور "الکشف عن مساوئ المتنبی" (متنبی کی شاعری کے نقائص کا اظہار) وغیرہ ہیں۔ صاحب بن عباد کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ اس نے ادباء کی بہت ہمت افزائی کی' علماء کو کام کرنے پر ابھارا اور ادب کی شمع کو روشن رکھا۔

صاحب بن عباد کی نثر کا نمونہ : قاضی ابو بشیر جرجانی کے ورود کی خبر سن کر کہتا ہے :

أحقّ ما قیل امر القادم' ام ظنّ کأمانی الحالم؟ لا والله بل هو درک العیان و انه ونیل المُنَی سیّان فمرحبًا ایها القاضی برا حلتک و رحْلِک' بل اهلابک و بکافة اهلک' و یاسرعة ما فاح نسیم مَسْراک! و وجد ناریح یوسف من ریّاک. فحُثّ المطی تُزل غُلّتی بُسقیاک و تُزح علّتی بُلقیاک. و قصّ علیّ یوم الوصول لنجعله عیداً مشرّفاً و نتّخذه موسماً و معرّفاً. وردّ الغلام أسرع من رَجْع الکلام. فقد أمرتُه ان یطیر علی جناح نسرٍ وان یترک الصّبا فی عقال و أسرٍ.

(کیا آنے والے کی خبر سچ ہے' یا خواب دیکھنے والے کی خواہش کی طرح نرا گمان ہے۔ واللہ نہیں' بلکہ وہ تو آنکھوں دیکھی بات ہے' اور وہ خبر اور تکمیل آرزو ایک ہی چیز ہیں۔ تو اے قاضی! آپ کی سواری اور آپ کے سفر کو' بلکہ آپ کو اور آپ کے سارے گھر والوں کو خوش آمدید! آپ کے آنے کی خبر کی خوشبو کتنی سرعت سے پھیلی۔ ہم نے آپ کے خوشگوار جھونکے میں یوسف کی مہک کا لطف پایا۔ بس اب سواریوں کو مہمیز کرو کہ ہم آپ کے دیدار سے اپنی پیاس بجھائیں اور آپ

سے ملاقات کر کے اپنی تکلیف دور کریں اور یہاں پہنچنے کے دن کی خبر مجھے دیجئے گا تا کہ ہم اُس دن کو عید کی طرح منائیں اور اسے ایک تہوار کا درجہ دیں۔ اور یہ خط پڑھ کر اس غلام کو اپنے جواب سے بھی پہلے بھیج دیں۔ اس لیے کہ میں نے اسے ہدایت کی ہے کہ عقاب کے پَر پر اُڑ کے جائے اور بادِ صبا کو اپنے پیچھے چھوڑ جائے۔)

## خوارزمی (۹۳۳)

ابوبکر محمد بن العباس الخوارزمی، انشا پرداز، شاعر، عالم لغت، ادیب، سیّاح، جو فخر خوارزم کے لقب سے یاد کیا جاتا ہے اور جس نے متعدد رسائل لکھے جو بہت مشہور ہیں۔

خوارزمی کے آباء و اجداد طبرستان کے تھے اور وہ خود خوارزم میں پیدا ہوا اور آغازِ شباب میں ہی اُسے چھوڑ کر علم اور روزگار کی تلاش میں نکل کھڑا ہوا۔ اس نے ملکوں ملکوں سفر کیا اور بہت سے بادشاہوں اور امراء کی خدمت کی۔ وہ سیف الدولہ کے پاس بھی آیا اور شام میں اس کے لیے کام کیا۔ پھر وہ اپنی بے قرار طبیعت اور شوقِ سفر کے باعث بخارا، نیشاپور اور بجستان کی طرف نکل گیا، حتیٰ کہ اصفہان میں صاحب بن عبّاد سے آ کر ملا۔ صاحب نے خوارزمی کا خیر مقدم کیا اور پھر اسے شیراز میں عضدالدولہ کے نام ایک خط دے کر اس کی طرف روانہ کیا۔ اس کا یہ سفر کامیاب رہا، اس لیے کہ اسے اس میں کافی مالی فائدہ حاصل ہوا اور وہ بہت کچھ کما کر اور اکٹھا کر کے نیساپور میں آ گیا اور اسی کو اپنا وطن بنا لیا۔ یہاں اس نے کچھ زمین اور جائیداد خرید لی اور اپنی مجالسِ درس اور مجالسِ دوستاں میں خوش و خرم زندگی بسر کرنے لگا۔ تاہم اپنے آخری زمانے میں اس نے اپنے آپ کو بدیع الزمان ہمذانی کے ساتھ ایک ادبی مقابلہ و مناظرہ میں الجھا لیا اور اس میں بُری طرح سے شکست کھائی۔ اس سانحے نے اس کی صحت پر بُرا اثر کیا۔ اس کی شہرت داغدار ہوئی اور اس واقعے پر ایک سال بھی نہ گزرا تھا کہ وہ ۹۹۳ میں انتقال کر گیا۔

خوارزمی جو کچھ بھی سنتا یا پڑھتا تھا اسے فی الفور یاد ہو جاتا تھا اور اس کا حافظہ ایسا تھا کہ ایک دفعہ جب وہ کوئی چیز یاد کر لیتا تو پھر اسے بھولتا نہیں تھا۔ اس معاملے میں اس کی شہرت دور دور تک پہنچی ہوئی تھی۔ کہتے ہیں کہ جب وہ ارّجان میں صاحب بن عباد سے ملنے آیا تو دربان نے اندر جا کر کہا کہ ایک ادیب آپ سے ملنا چاہتا ہے۔ وزیر نے کہا اس سے کہو کہ میں نے اپنے اوپر یہ لازم کیا ہے کہ میرے ہاں کوئی ایسا ادیب داخل نہیں ہو سکتا جسے عربی زبان کے بیس ہزار اشعار یاد نہ ہوں۔ دربان نے باہر آ کر یہ پیغام دیا تو خوارزمی نے کہا: ان سے پوچھو کہ بیس ہزار اشعار مردوں کے یا عورتوں کے؟ جب صاحب

تک یہ بات پہنچی تو وہ کہنے لگا: یہ ابوبکر خوارزمی کے سوا اور کوئی نہیں ہو سکتا۔
خوارزمی لغت اور نسب ناموں کے علم میں امام کا درجہ رکھتا تھا۔ عربوں کے بے شمار اشعار اسے ازبر تھے اور زبان کے اسرار اور ترکیبوں کے خواص کا وہ ماہر تھا۔ نثر نگاری میں وہ ابن العمید کے طبقے میں شمار ہوتا ہے اور بعض لوگ تو اسے صاحب بن عبّاد سے بھی بہتر نثر نگار مانتے ہیں۔

**خوارزمی کی نثر کا ایک نمونہ :** وہ اپنے ایک شاگرد کو اپنے ایک مختصر مکتوب میں لکھتا ہے:

**ان کنت أعزّک الله لا ترانا موضعاً للزیارة فنحن فی موضع الاستزارة. وان کنت تعتقد انک قد استوفیت ما کان لدینا' فسقط حقُّنا عنک و بقی حقک علینا' فقدیزور الصحیحُ الطبیبَ بعد خروجه من دائه' واستغنائه عن دوائه. وقد تجتاز الرعیّة علی باب الأمیر المعزول' فتتجمّل له ولا تعیّره عزلَه. ولو لم تزُرنا الاّ لتُرینا رجحانک' کما طالما رأینا نقصانک' لکان ذلک فعلاً صائباً و فی القیاس واجباً.**

(اللہ تمہیں عزت دے' اگر تمہارا خیال ہے کہ ہم ملاقات کے قابل نہیں ہیں' تو ہم تو ملاقات کے خواہاں ہیں اور اگر تم یہ سمجھتے ہو کہ تم نے ہمارے پاس جو کچھ تھا وہ سب لے لیا' چنانچہ ہمارا حق تم پر سے ساقط ہو گیا' لیکن تمہارا حق ہم پر باقی رہا' تو بات یہ ہے کہ ایک صحتمند آدمی اپنی بیماری سے شفا پا کر اور دوائی سے بے نیاز ہو کر بھی طبیب سے ملنے چلا جایا کرتا ہے اور کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ رعایا ایک معزول امیر کے دروازے پر چلی جاتی ہے اور اس کے ساتھ خوش اخلاقی سے پیش آتی ہے اور اس کی معزولی کو اس کے لیے عار نہیں قرار دیتی۔ اگر تم ہمارے ملنے سے اس لیے باز رہے کہ اپنا باوزن ہونا ظاہر کر سکو' جس طرح ہم اتنا عرصہ تمہارا بے وزن ہونا دیکھتے آئے' تو یہ ہمارے خیال میں ایک صحیح فعل تھا اور قیاس کے مطابق ضروری تھا۔)

## مقامات اور ان کے موجد ادباء

اب آگے عربی زبان کے دو ایسے ادباء کا ذکر ہے جنہوں نے عربی نثر میں ایک نئی صنف "مقامہ" ایجاد کی اور اسے ہر دلعزیز بنا کے رائج کیا۔ یہ ادباء بدیع الزمان ہمذانی اور حریری ہیں۔ اگرچہ یہ دونوں عربی انشاء اور ادب میں ماہر فن تھے اور انہوں نے عربی میں کچھ عمدہ مکاتیب بھی لکھے اور کچھ دوسری

تصنیفات بھی کیں، لیکن ان کے باقی سب کام ان کے مقامات کے مقابلے میں دب کر رہ گئے اور ان کی حیثیت ثانوی قرار پائی۔

صنف "مقامہ" کیا ہے؟ یہ ایک مختصر حکایت یا ڈرامائی واقعہ ہوتا ہے جس میں ایک کردار جسے ہم بطل (Hero) کہہ سکتے ہیں اپنے وقت کی ادبی، معاشرتی اور اخلاقی صورت حال پر لوگوں کے سامنے ایک ایسی ادبی زبان میں اظہار خیال کرتا ہے جو بہت خوبصورت، مسجع اور موزوں ہوتی ہے، جسے ایک راوی (Narrator) اس سے سن کر محفوظ کر لیتا ہے۔ یہ بطل ایک جگہ ٹک کر نہیں بیٹھتا، بلکہ یہ شہروں شہروں گھومتا ہے اور بازاروں میں اور محلوں اور چوراہوں میں اپنی حکایت سنانے کے لیے مجمع لگاتا ہے۔ اس کا حلیہ اور لباس بھی مسلسل تبدیل ہوتا رہتا ہے اور ہر دفعہ جب یہ اپنی حکایت ختم کر چکتا ہے اور لوگ اس کے ادب اور اس کی دانائی اور عقل و ظرافت کے سحر میں آ جاتے ہیں تو وہ راوی نمودار ہوتا ہے اور کہتا ہے: تم وہی شخص تو نہیں ہو جس نے فلاں مقام پر ایسی ہی حیرت انگیز باتیں کی تھیں۔

"مقامہ" کا موجد اور اسے سب سے پہلے عربی ادب میں متعارف کرانے والا بدیع الزمان ہمذانی ہی ہے۔ ہمذانی کے مقامات ادب اور فن کے اعتبار سے بہت اعلیٰ درجے کے ہیں۔ ہمذانی کا اتباع کرتے ہوئے تقریباً ایک سو سال بعد ایک اور عربی ادیب حریری نے بھی اسی طرح کے مقامات لکھے۔ لیکن جو بات اصل میں پیدا ہوئی تھی وہ نقل میں پیدا نہ ہو سکی۔

چنانچہ حریری کے مقامات بھی اگرچہ کافی مقبول اور متداول ہیں اور عموماً عربی ادب کے نصاب کی کتابوں میں شامل ہوتے ہیں لیکن یہ ہمذانی کے مقامات کے مقابلے میں دوسرے درجے کی چیز ہیں۔ ان دو فاضلوں کے بعد متعدد لوگوں نے "مقامات" لکھنے کی کوشش کی اور ان کے طرز اور اسلوب کی پیروی کرنے میں ایڑی چوٹی کا زور لگایا لیکن بات نہ بن سکی۔ اس لیے بعد کے ان مقامات کو زیادہ کوئی نہیں جانتا۔

## بدیع الزمان ہمذانی (م ۱۰۰۷)

ابوالفضل احمد بن حسین کی پیدائش اور نشوونما ہمذان میں ہوئی۔ اس نے عربی زبان و ادب میں اتنی استعداد بہم پہنچائی کہ وہ ایک اعلیٰ درجے کا انشا پرداز اور ایک عمدہ شاعر بن کے سامنے آیا۔ ذہین و فطین ہونے کے ساتھ ساتھ اس نے ایک غیر معمولی حافظہ پایا تھا۔ مقامات کی صنف رائج کرنے میں اسے پیشرو (Pioneer) کی حیثیت حاصل ہے، جس نے اپنے بعد آنے والے ایک دوسرے ادیب حریری

کے لیے نمونہ و مثال کا کام دیا۔

ہمذانی نے فارسی اور عربی دونوں زبانوں میں تعلیم حاصل کی۔ جب وہ اپنے شہر کے سب ادباء سے علم کر چکا تو وہاں سے چل کر صاحب بن عبّاد کے پاس آ گیا اور اپنی بقیہ تعلیم اس کے یہاں رہ کر پوری کی۔ اس کے بعد وہ جرجان چلا گیا اور وہاں سے نیساپور آ گیا' جہاں ایک مدت رہ کر اس نے چار سو مقامات املاء کرائے جن کا اسلوب شاندار اور ادب و انشا کا ایک اعلیٰ نمونہ تھا اور جن کی نثر عموماً مسجّع ہوتی تھی۔ پھر اس کے اور اس سے عمر میں بڑے ادیب خوارزمی کے درمیان بعض ادبی امور پر مقابلہ و مناظرہ چل نکلا۔ کسی کو خیال بھی نہیں تھا کہ ادب و نحو کے مسائل میں کوئی خوارزمی کے منہ آ سکتا ہے' لیکن ہمذانی نے اسے اس مقابلے میں شکست دے دی' جس کا خوارزمی کی صحت پر اتنا بُرا اثر پڑا کہ وہ اس سے جانبر نہ ہو سکا۔ اس کے بعد ہمذانی کے لیے راستہ صاف ہو گیا اور وہ حکمرانوں اور امراء کے ہاں آنے جانے لگا۔ اس نے ان کے مختلف مراکز کا دورہ کیا اور آخر میں افغانستان کے شہر ہرات کو اپنا وطن بنا لیا اور وہاں کے ایک معزز عالم کی بیٹی سے شادی کر لی۔ اس سے اس کے حالات بہت اچھے ہو گئے اور وہ امن و سکون میں رہنے لگا' یہاں تک کہ ۱۰۰۷ء میں اسے موت نے آ لیا۔

ہمذانی دیکھنے میں قبول صورت اور خوش مزاج تھا اور اس کے ساتھ بہت ذہین اور طاقتور حافظے کا مالک تھا۔ اس میں بے پناہ ظرافت اور تخلیقی قوت تھی۔ وہ جو کچھ بھی لکھتا یا املاء کراتا فی البدیہہ کراتا۔ اس کی عبارت آسان اور سلیس ہوتی تھی جس میں چھوٹے چھوٹے مسجّع جملے بڑی دلکشی پیدا کرتے تھے اور اسے پڑھ کر یوں لگتا تھا جیسے اسے لکھتے ہوئے ہمذانی نے کوئی مشقت نہیں کی' سب کچھ قدرتی انداز میں اس پر وارد ہوا ہے اور وہ اسے تحریر میں لے آیا ہے۔ اس کے حافظے کا یہ عالم تھا کہ وہ کسی کتاب کے اوراق پر ایک نظر ڈالتا تھا اور پھر اُسے اپنے حافظے سے' بغیر کسی ردّ و بدل کے' ہو بہو دُہرا دیتا تھا۔ اس کا ذہن اتنا تیز اور اس کا ذخیرۂ لغت اتنا فراواں تھا کہ اسے ایک فارسی نظم سنائی جاتی تو وہ ہاتھ کے ہاتھ اُس کا عربی نظم میں ترجمہ کر کے سنا دیتا۔ ان ساری باتوں کو دیکھتے ہوئے لگتا ہے کہ وہ اپنے وقت کا ادبی جینئس تھا' جس نے ادب کی ایک نئی صنف مقامات میں اور اپنے مکاتیب میں تخیّل و انشا پردازی کا بہت اعلیٰ نمونہ پیش کیا۔

ہمذانی کے مقامات میں ایک کردار ابوالفتح سکندری ہے جو شہر شہر اور گاؤں گاؤں گھومتا اور مجمع لگاتا ہے۔ (یہ دراصل بدیع الزمان خود ہے) وہ ہر دفعہ کسی نئے حلیے میں ہوتا ہے اور لوگوں کے ساتھ ایسی دانائی کی باتیں کرتا ہے اور ان کے سوالوں کے ایسے عالمانہ اور حکیمانہ جواب دیتا ہے کہ ایک اور کردار عیسیٰ بن ہشام جو عموماً اس کے تعاقب میں رہتا ہے اسے پہچان لیتا ہے اور اس ڈرامائی واقعے کے آخر

میں اس کے پاس آ کر کہتا ہے: تو ضرور ابوالفتح سکندری ہی ہے' لیکن تم نے یہ کیا روپ دھار رکھا ہے۔ ابوالفتح اسے کوئی گول مول جواب دیتا ہے اور پھر اپنا عصائے مسافرت اٹھا کر کسی اور طرف نکل جاتا ہے۔ ہمذانی کے ایک مقامہ کا نمونہ کچھ یوں ہے۔ اس مقامہ کا نام قریضیہ ہے۔

حدثنا عیسی بن هشام قال طرحتنی النوی مطارحها حتی اذا وطئتُ جرجان الأقصی...... جلسنا یوماً نتذاکر القریض وأهله و تلقاء نا شاب قد جلس غیر بعید یُنصت و کأنه یفهم و بسکت وکأنه لایعلم. حتی اذا مال الکلام بنا میله و جرَّ الجدالُ فینا ذیله' قال : قد أصبتم عُذَیقه و وافیتم جذیله' ولو شئتُ للفظتُ وأفضتُ ولجلوت الحق فی معرض بیان یُسمع الصّم و ینزل العصم. فقلتُ یا فاضل أُدنُ و قد منَّیتَ و هاتِ و قد أثنیتَ فدنا و قال : سلونی أجبکم واسمعوا أعجبکم فقلنا : ماتقول فی امرئ القیس؟ قال : هوأول من وقف بالدیار و عرصاتها واغتدی والطیرفی وکناتها و وصف الخیل بصفاتها. ولم یقل الشعر کاسباً ولم یجد القول راغبا...... قلنا : فما تقول فی النابغة؟ قال ینسب اذا عشق و یثلب اذا حنق ویمدح اذا رغب و یعتذر اذا رهب...... فقلنا : فما تقول فی زهیر؟ قال یُذیب الشعر والشعر یذیبه و یدعو القول والسحر یُجیبه قلنا : فما تقول فی طرفه؟ قال : هوماء الاشعار و طینتُها و کنز القوافی و مدینتها. مات ولم تظهر اسرار دفائنه ولم تفتح اغلاق خزائنه

قال عیسی بن هشام : فأنلته ما تاح وأعرض عنا و راح . فجلعتُ انفیه و أُثبته وکأنی اعرفه. ثم دلّتنی علیه ثنایاه فقلتُ : الا سکندری والله! ونهضتُ علی اثره ثم قبضتُ علی خصره و قلت : ألست ابا الفتح؟ "الم نُربّک فینا و لیداً و لبثت فینامن عمرک سنین" (القرآن) فایّ عجوز لک بُسرٌ من را؟ فضحک الیَّ و قال

ویحک هذا الزمان زور
فلا یغرّنّک الغرور

لا تلتزم حالة ولكن    دُر بالليالي كما تدور

(عیسیٰ بن ہشام نے ہم سے کہا: مجھے جب مسافرت نے دور جا کے پھینکا اور میں نے جرجان الاقصیٰ میں قدم رکھا...... تو ایک دن ہم بیٹھے شاعری اور شعراء کے موضوع پر باتیں کر رہے تھے اور ہمارے سامنے تھوڑے ہی فاصلے پر ایک نوجوان بیٹھا تھا جو ہماری باتیں غور سے سن رہا تھا جیسے انہیں سمجھ رہا ہو اور خاموش تھا جیسے اسے کوئی علم نہ ہو۔ حتیٰ کہ جب ہماری باتیں چل نکلیں اور ہمارے درمیان کچھ اختلاف اور جدل ہونے لگا تو اس نے کہا: آپ لوگوں نے مقصد حاصل کر لیا اور اس میں اصل تک بھی پہنچ گئے۔ اگر میں چاہتا تو کچھ بولتا اور تفصیل بیان کرتا اور حق کا اظہار اس اسلوب سے کرتا کہ جو بہرے انسان کو بھی سنائی دے اور جو نادر و نایاب چیز کو بھی عام بنا دے۔ تو میں نے کہا: اے فاضل ذرا قریب آ جا کہ تم نے ہمیں اُمید دلا دی ہے اور جو کچھ بھی کہنا ہے کہہ دے کہ تم نے اپنی تعریف بھی کر دی ہے۔ اس پر وہ قریب آ گیا اور کہنے لگا: مجھ سے پوچھیے میں جواب دوں گا اور میری بات سنیے جو اُمید ہے آپ کو اچھی لگے گی۔ ہم نے کہا: امرؤ القیس کے بارے میں آپ کیا کہتے ہیں؟ کہنے لگا وہ پہلا شاعر ہے جو محبوب کے چھوڑے ہوئے دیار اور ان کی حویلیوں پر کھڑا ہوا اور اتنا سویرے باہر نکلتا تھا کہ پرندے ابھی اپنے گھونسلوں میں ہوتے تھے۔ اس نے گھوڑوں کے اوصاف بیان کیے اور شاعری پیسہ کمانے کے لیے نہ کی اور نہ اس نے کسی لالچ میں کوئی بات سوچی۔ ہم نے کہا: تم نابغہ کے بارے میں کیا کہتے ہو؟ کہنے لگا: اسے جب عشق ہو جائے تو غزل کی شاعری کرتا ہے اور جب کسی پر ناراض ہو تو اس کے عیوب گنواتا ہے۔ جب اسے کچھ خواہش ہو تو مدح کرتا ہے اور جب اسے ڈر ہو تو اپنے شعروں میں معذرت کرتا ہے۔ ہم نے کہا: زُہیر کے بارے میں تمہارا کیا خیال ہے؟ جواب دیا: زہیر شاعری کو گھلاتا ہے اور شاعری اسے گھلاتی ہے۔ وہ آواز تو شعروں کو دیتا ہے لیکن جواب اسے ساحری دیتی ہے۔ ہم نے کہا: طرفہ کے بارے میں تمہارا کیا خیال ہے؟ کہنے لگا۔ وہ شاعری کا پانی بھی ہے اور مٹی بھی' اور قوافی کا خزانہ بھی ہے اور شہر بھی۔ وہ مر گیا اس حال میں کہ ابھی اس کے دفینوں کے راز باہر نہ آئے تھے اور اس کے خزانوں کے تالے بھی نہیں کھلے تھے......

عیسیٰ بن ہشام کہتا ہے: جو کچھ میرے پاس تھا میں نے اسے دے دیا۔ وہ ہم سے اٹھ کر چلتا بنا۔ اس کے جانے کے بعد مجھے اس کا چہرہ کبھی مانوس لگتا اور کبھی اجنبی۔ جیسے کہ میں اسے جانتا ہوں۔ پھر اس کے اگلے دانتوں سے میں نے اسے پہچان لیا۔

میں نے کہا: واللہ یہ تو اسکندری تھا۔ میں اس کے پیچھے بھاگا اور اس کی کمر پر ہاتھ رکھ دیا۔ میں نے کہا: تم ابوالفتح نہیں ہو؟ ''کیا ہم نے تمہیں بچپن میں نہیں پالا اور تم نے ہمارے درمیان اپنی عمر کے کئی سال نہیں گزارے۔'' (الشعراء ٢٦: ١٨) تو سُرّ من را میں تمہاری کون سی بوڑھی عورت

ہے؟ تو وہ مجھے دیکھ کر ہنسنے لگا اور یہ شعر پڑھے :
افسوس یہ زمانہ جھوٹ ہے' تو تمہیں کوئی چیز دھوکا نہ دے پائے۔
تم ایک حالت پر نہ رہو' بلکہ راتوں کے ساتھ ساتھ تم بھی چکر لگاتے رہو۔)

## حریری (م ۱۱۲۲)

محمد القاسم بن علی البصری قبیلہ بنی حرام سے خالص عرب تھا۔ ایک گاؤں مشان میں پیدا ہوا۔ بصرے میں جوان ہوا اور وہاں کے فاضل اساتذہ سے اس نے کسبِ فیض کیا۔ شروع زمانے میں وہ ریشم بیچا کرتا تھا یا ریشم تیار کرتا تھا' اس لیے حریری کے لقب سے مشہور ہوا۔ لیکن پھر اس کے اندر علم اور ادب کا ایسا شوق پیدا ہوا کہ اس نے وہ کام چھوڑ دیا۔ اس نے پوری یکسوئی کے ساتھ لغت اور ادب اور نحو کی تعلیم حاصل کی' یہاں تک کہ ان سب علوم میں وہ یگانہ روزگار ٹھہرا۔ عرب کے اسالیب بیاں اور ان کے احوال و اشعار کے علم میں اس کا شہرہ دور دور تک پھیل گیا۔ چنانچہ امراء اور حکام نے اسے اپنے قریب کیا اور ادباء اس کے ہاں جمع ہونے اور اس کے علم و ادب سے فائدہ اٹھانے لگے۔ حریری نے بدیع الزمان ہمذانی کے تتبع میں پچاس مقامات ترتیب دیے جن کے اندر اس نے لغت کا بہت سا مواد اور ادب کی مختلف اصناف اور عربوں کی ضرب الامثال اور حکیمانہ اقوال اور بعض نازک مسائل ایک مسجع عبارت کی صورت میں اکٹھا کر دیئے اور یہ مقامات تحریر کرتے ہوئے اس نے صنعت بدیع اور تجنیس کا بہت استعمال کیا۔ تا کہ ادب کے طالب علم عربی لغت اور ادب کے اسرار و رموز سے آگاہی حاصل کریں۔ لیکن اس سے ایک نقصان یہ ہوا کہ اس کے مقامات میں تصنع اور آورد نے راہ پالی اور ان میں وہ قدرتی پن اور صاف اور شستہ اظہارِ خیال نہ رہا جو ہمذانی کے مقامات کا خاصا تھا۔ حریری کے مقامات پڑھ کر یوں لگتا ہے کہ اسے ان کے موضوع اور مضمون سے زیادہ دلچسپی نہیں ہے' بلکہ وہ ان میں اپنے لغوی اور ادبی کمالات کا مظاہرہ کرنا چاہتا ہے۔

حریری کم رُو اور پستہ قد شخص تھا۔ وہ بخیل تھا اور عموماً میلے کپڑوں میں رہتا تھا۔ اس کی عادت تھی کہ سوچتے وقت وہ اپنی ڈاڑھی کے بال نوچتا۔ لیکن اللہ نے دوسری طرف اس میں کچھ خوبیاں بھی رکھ دی تھیں۔ وہ بہت بڑا ادیب تھا' دلچسپ اور پُر ظرافت باتیں کرتا تھا' فراخ دل تھا اور جہاں بھی ضرورت ہوتی حق کا اعتراف کرتا۔ چنانچہ اس کو دیکھنے کے مقابلے میں اس کی باتیں کرنا اور سننا بہتر تھا۔ اس بات کا حریری کو خود بھی احساس تھا۔ ایک دفعہ ایک شخص اس سے ادب سیکھنے آیا تو اس کی صورت دیکھ کر اس

سے بیزار ہو گیا۔ اس پر حریری نے اس سے کہا:

فاختر لنفسک غیری اننی رجل مثل المعیدی فاسمع بی ولا ترنی

(اپنے لیے کوئی اور آدمی چن لو اس لیے کہ میں تو ایسا آدمی ہوں جیسے معیدی تھا' پس میرے بارے میں سن لو لیکن مجھے دیکھو نہیں۔)

حریری کے مقامات میں ہیرو کا نام ابوزید سروجی ہے اور اس کی باتیں اور واقعات جو شخص سناتا ہے اس کا نام حارث بن ہمام ہے۔ اس کے علاوہ حریری کے مقامات کا تانا بانا تقریباً وہی ہے جو ہمذانی کے مقامات کا ہے' سوائے اس کے کہ ان میں تکلّف اور تصنّع اور آورد زیادہ ہے۔ دراصل حریری نے صنعتِ بدیع کو رواج دیا اور اس میں مبالغہ پیدا کیا۔ نیز الفاظ کی خوبصورتی اور تزئین پر زور دیا' یہاں تک کہ مضمون دب کر رہ گیا۔ اس طرزِ انشاء کو آگے چل کر القاضی الفاضل (م ۱۲۰۰) نے اختیار کر کے رائج کیا اور رفتہ رفتہ وہ ''فاضلی طریقہ'' کے نام سے جانا جانے لگا۔ مقامات کے علاوہ حریری کی کچھ اور تصانیف بھی ہیں مثلاً ''دُرّۃ الغواص فی اوہام الخواص'' جس میں اس نے اپنے اہلِ زمانہ کے بعض الفاظ اور تراکیب کی غلطیوں کی نشاندہی کی ہے۔ اسی طرح کتاب ''ملحۃ الاعراب فی النحو''۔ لیکن جس تصنیف کی وجہ سے حریری کی اتنی شہرت ہے وہ اس کے ''مقامات'' ہی ہیں۔ جو اس نے ہمذانی کے تتبع میں لکھے۔

حریری کے ایک مقامہ (بغدادیہ) کا ایک نمونہ:

اعلموا یا مآل الآمل و ثمال الا رامل' انی من سروات القبائل و سریّات العقائل. لم یزل اهلی وبعلی یحلّون الصدر و یسیّرون القلب' و یمطون الظهر و یولون الید. فلمّا أردی الدهرُ الأعضاد و فجع بالجوارح الأكباد. وانقلب ظهراً لبطن' نبا الناظر وجفا الحاجب' و ذهبت العین و فقدت الراحة' وصلد الزند و وهنت الیمین و ضاع الیسار' و بانت المرافق' ولم یبق لنا ثنیّة ولاناب. فمذا غبّر العیش الاخضر و ازورَّ المحبوب الأصفر' اسودّ یومی الابیض و ابیض نوری الاسود' حتی رثی لی العدوُّ الأزرق' فحبّذا الموت الأحمر.

(اے امید کرنے والے کی پناہ اور بیوگاؤں کے رکھوالو جان لو کہ میں قبائل کے معززین اور اونچی

میرے اہل و عیال اور میرا خاوند ہمیشہ صدر نشین رہے
شان والی شریف عورتوں میں سے ہوں۔ ہیں اور لوگوں کو سواریاں اور انعام دیتے رہے ہیں۔
ہیں اور فوجوں کے قلب میں جاتے رہے والوں کو ہلاک کر دیا اور زخموں سے جگر چھلنی کر دیے اور حالات
جب زمانے نے ساتھ دینے دیکھنے والوں نے منہ پھیر لیا اور خدام نے بے وفائی کی۔ آنکھ
بالکل اوپر نیچے ہو گئے تو ہمیں ہو گیا اور ناکامی کا سامنا ہوا۔ قسمیں اور عہد بھی کمزور پڑ گئے
دیکھنے سے معذور ہوئی اور آرام ختم پاس نہ کوئی جوان اونٹنی رہی اور نہ بوڑھی۔ چنانچہ جب سے سرسبز
اور منافع ختم ہو گئے اور ہمارے اور اس پہلی محبوب چیز (سونا) نے ہم سے رُخ پھیر لیا۔ اس
اور شاداب زندگی غبار آلود ہوئی اور میرے کالے بال سفید ہو گئے۔ یہاں تک کہ میرے کٹر دشمن
وقت سے میرا سفید دن سیاہ ہوا نے میرا مرثیہ کہا اور مجھے خون کی طرح سُرخ موت اچھی لگنے لگی۔)

☆......☆......☆

یہاں آگے بڑھنے سے پہلے عربی زبان کے دو اکابر ادباء کا ذکر مناسب ہو گا جو اس عباسی دور میں ہوئے اور جنہوں نے شاعری کے انتخاب اور اس کی تنقید اور علم و ادب کی متعدد شاخوں میں بہت قابل قدر کام کیا اور اپنے پیچھے ایسی تصانیف چھوڑیں جو آج کلاسیک کا درجہ رکھتی ہیں اور ہمارے تعلیمی اداروں کے نصاب میں ہمیشہ سے شامل چلی آتی ہیں۔ ان ادباء میں سے ایک کا نام ابن قتیبہ ہے اور دوسرے کا المبرّد! ان کے بارے میں یہاں مختصراً کچھ بتایا جائے گا۔

## ابن قُتیبہ (م ۸۸۹)

یہ کوفے میں پیدا ہوا اور آگے چل کر اس نے دینوَر میں قاضی کے فرائض انجام دیئے۔ اسی لیے اسے دینوری بھی کہا جاتا ہے۔ اس کے بعد یہ بغداد چلا گیا' جو اس زمانے میں علم و ادب کا مرکز تھا۔ وہاں اس نے اس کے شیوخ اور ائمہ سے علم حاصل کیا اور ایک بڑا ادیب اور عالمِ لغت بن کر نمایاں ہوا۔ وہ عرب لوگوں کے احوال اور ان کے ایام سے بخوبی واقف تھا۔ بغداد میں وہ ایک عرصے تک مدرّس رہا اور وہیں وفات پائی۔

وہ اپنے زمانے کے تقریباً تمام لغوی اور ادبی علوم پر حاوی تھا۔ اس نے اپنی تصانیف میں اس امر کی کوشش کی کہ لغوی اور شاعرانہ مواد کو جسے اُس وقت تک کوفے کے نحویوں نے جمع کیا تھا' بنا سنوار کر لوگوں کے سامنے پیش کرے۔ اس نے مذہبی بحثوں میں بھی حصہ لیا اور فلاسفہ کے شک آمیز رویے کے


Scanned with CamScanner

خلاف قرآن وحدیث کی حمایت بھی کی۔

ابن قتیبہ اپنے وقت کا ایک بڑا ادبی نقاد مانا جاتا ہے۔ وہ اپنی روایت میں سچا، فکر میں آزاد اور اپنی جنبہ میں بے لوث اور صاف گو تھا۔ اس نے بڑی جرأت کے ساتھ اپنا یہ نظریہ پیش کیا کہ یہ کوئی ضروری نہیں کہ پہلے زمانے کی (خصوصاً جاہلیت کی) شاعری ہر حال میں بہتر اور اونچے درجے کی ہو۔ شاعری کا اعلیٰ اور عمدہ ہونا کسی خاص زمانے کے ساتھ مخصوص نہیں ہو سکتا۔ چنانچہ اس نے عربی شاعری میں جو بھی خامیاں پہلے سے تھے یا اب پیدا ہو چکے تھے ان کی نشاندہی کی۔ اگرچہ اس کی بہت سی آراء کا انحصار کسی تجربے یا نظر کی گہرائی پر نہیں ہوتا۔ تاہم یہ اس کی جرأت اور اس کے ادبی ذوق کا اظہار ضرور ہوتی ہیں۔

ابن قتیبہ کا شمار عباسی دورِ خلافت کے بڑے انشا پردازوں میں ہوتا ہے۔ اس کی تحریر صاف ستھری، واضح اور ادبی چاشنی لیے ہوئے ہوتی ہے۔ اس کی تصانیف میں سے بعض کے نام یہ ہیں:

۱۔ عیون الاخبار: دس جلدوں میں اس کی یہ بڑی تصنیف متکلمانہ ادب کا ایک نمونہ ہے۔

۲۔ کتاب المعارف: یہ عیون الاخبار کا تکملہ ہے۔

۳۔ الشعر والشعراء: یہ عربی شاعروں کے حالات اور ان کی شاعری کے تنقیدی جائزے پر ایک اہم تصنیف ہے، جو ہماری دانش گاہوں کے نصاب میں ہمیشہ سے شامل چلی آتی ہے۔

۴۔ ادب الکاتب: یہ حکومت کے انشا نگار حضرات (Secretaries) کی رہنمائی کے لیے ہے۔

۵۔ الرد علی الشعوبیۃ

۶۔ فضل العرب والتنبیہ علی علومہا یہ دونوں کتابیں عجمی لوگوں کی آراء ونظریات کے مقابلے میں عربوں کا دفاع کرتی ہیں۔

۷۔ تاویل مشکل الحدیث۔

۸۔ غریب الحدیث۔ یہ کتابیں احادیث میں پائے جانے والے اختلافات کی مناسب تاویل کر کے انہیں رفع کرتی ہیں۔

ان سب تصانیف اور ان کے علاوہ دوسری تصانیف کو ملا کر ابن قتیبہ کی کل ۴۷ کتابوں کے نام ملتے ہیں۔ البتہ ایک کتاب ''الامامۃ والسیاسۃ'' ایسی ہے جو ابن قتیبہ کے نام منسوب کی جاتی ہے۔ لیکن یہ اس کی تصنیف نہیں ہے۔

# ابوالعباس المبرّد (م ۸۹۸)

ابوالعباس محمد بن یزید المبرّد۔ اپنے وقت کا امامِ ادب ولغت ونحو! بصرے میں پیدا ہوا اور وہیں مختلف اساتذہ سے علم حاصل کیا۔ آغازِ شباب میں اس نے مشہور نحوی سیبویہ کی ''الکتاب'' پر تنقید کی اور اس پر کچھ اعتراضات کیے، جن میں سے اکثر بے بنیاد ثابت ہوئے۔ چنانچہ اس نے اس پر معذرت کر لی۔ بعد ازاں وہ بغداد چلا گیا، جہاں درس وتدریس میں منہمک ہو کر ایک مصروف زندگی گزاری۔ دربارِ شاہی کی سرپرستی میں اس کا حریف ثعلب تھا، ان دونوں کی باہمی رقابت آگے چل کر اس مخالفت کا باعث بن گئی جو کوفہ اور بصرہ کے دبستانوں کے درمیان دیکھی جانے لگی۔ مبرّد نے بغداد میں ہی وفات پائی۔

مبرّد کی سب سے اہم اور بڑی تصنیف ''الکامل فی الادب'' ہے، جو قدیم نحویوں کے کام کا ایک مثالی نمونہ ہے۔ اس میں مبرّد بغیر کسی مقررہ ترتیب کی پابندی کے اور بغیر ابواب کے درمیان ربط کا خیال کیے لغت، ادب اور احادیث اور تاریخ کا مواد پڑھنے والے کے سامنے رکھتا چلا جاتا ہے۔ وہ ایک موضوع شروع کرتا ہے اور اس میں کوئی نحوی مسئلہ لے کر اس کی طرف نکل جاتا ہے اور اشعار سے استناد کرنے لگتا ہے، یا کوئی حکایت سنانے لگتا ہے اور پھر کافی دیر کے بعد اصل موضوع کی طرف واپس آتا ہے۔ اس کتاب میں 'باب الخوارج' جو خارجی تحریک کے احوال پر ہے خاص اہمیت کا حامل ہے۔ اس کے علاوہ مبرّد کی دوسری تصنیف وہ مجموعہ ہے جو کتاب المقتضب کے نام سے مشہور ہے۔ لیکن اس مجموعے کو زیادہ قبولِ عام اس لیے حاصل نہ ہو سکا کہ اس کا راوی ابن الراوندی ہے جو ملحد تھا۔ علاوہ ازیں مبرّد کی حسب ذیل تصانیف دستیاب ہیں:

- ☆ کتاب التعازی
- ☆ کتاب نسب عدنان وقحطان
- ☆ کتاب ما اتفق لفظہ واختلف معناہ من القرآن المجید
- ☆ کتاب المذکر والمؤنث
- ☆ کتاب الفاضل

ان میں سے چند ایک کتابوں کو ہمارے ملک کے فاضل عبدالعزیز میمنی نے طبع کرایا۔

''الکامل فی الادب'' کوئی شک نہیں کہ ایک بے ترتیب اور بے نظم کتاب ہے، جس میں ابواب و فصول کی تقسیم کی طرف زیادہ توجہ نہیں دی گئی۔ اس کے باوجود یہ کتاب علم کا بے بہا خزانہ ہے اور اسے

پڑھتے ہوئے انسان اس کے مضامین میں کھو جاتا ہے۔ الکامل کے متعلق عام خیال یہ ہے کہ اس نے عربی ادب کی کتابیں مرتب کرنے کے لیے راہ ہموار کی۔

ابن قتیبہ اور مبرّد کے ادب کے بارے میں ابن خلدون کا یہ قول مشہور ہے:

"سمعنا من شیوخنا فی مجالس التعلیم ان اصول فن الادب وأرکانه أربعة دوارین: وهی کتاب الکامل للمبّرد و ادب الکاتب لابن قتیبه و کتاب البیان والتبیین للجاحظ و کتاب النوادر لأبی علی القالی البغدادی. وماسوی هذه الاربعة فتبع لها و فروع منها."

(ہم نے تعلیم کی مجالس میں اپنے شیوخ سے سنا کہ عربی ادب کے اصول و ارکان چار مجموعے ہیں: یہ ہیں مبرّد کی "الکامل فی الادب" ابن قتیبہ کی "ادب الکاتب" جاحظ کی "البیان والتبیین" اور ابوعلی القالی کی "کتاب النوادر" (امالی)۔ ان چار مجموعوں کے علاوہ جو کچھ ہے وہ ان کے اتباع میں ہے اور انہی کی شاخ ہے۔)

☆......☆......☆

# دورِ عباسی کی شاعری

اموی حکومت کے زوال اور عباسی خلفاء کے اقتدار میں آ جانے سے جو سیاسی اور معاشرتی تغیرات واقع ہوئے ان کا اثر عربی نثر نگاری سے زیادہ عربی شاعری پر پڑا اس لیے کہ عربی شاعر خلفاء اور حکمرانوں اور وزیروں کے زیادہ قریب ہونے کی وجہ سے ان کے ماحول اور مزاج سے زیادہ متاثر ہوتے تھے۔ چنانچہ شاعری اب صحراؤں اور مٹی کے مکانوں اور خیموں سے نکل کر شہری زندگی کی رونق اور اس کے محلات اور باغات میں آ گئی اور اس کا لہجہ اور اسلوب بدل گیا۔ اس ساری تبدیلی میں ان کا رہنما جدید شاعری کا نمائندہ بشّار بن بُرد تھا۔

اس تبدیلی کا نتیجہ یہ ہوا کہ شاعری میں محبوبہ کے چھوڑے ہوئے کھنڈرات پر کھڑے ہو کر رونے اور اس کو یاد کر کے اس کے عشق میں نظم کی ابتدا کرنے کی جو روایت چلی آتی تھی وہ ختم ہو گئی اور اس کی جگہ نظم میں اب محلات کا ذکر ہونے لگا' زندگی کے لہو و طرب اور دوستوں کے ساتھ راگ رنگ کی محفلوں کا احوال بیان ہونے لگا۔ مغنّیات کے رقص و غناء اور کشتی میں بیٹھ کر ممدوح کی طرف سفر کرنے کی باتیں ہونے لگیں۔ یا پھر دوسرے مضامین کی جگہ شراب کے ذکر اور اس کے اوصاف اور اس سے لطف اندوز

ہونے کی کیفیتوں کے بیان نے لے لی۔ پھر اس پر اکتفا نہ کیا گیا' بلکہ کھنڈروں پر کھڑے ہو کر ہجر و فراق کا رونا رونے کی روایت کو طنز و تمسخر کا نشانہ بنایا جانے لگا۔

شاعری پر جو تبدیلیاں عباسی عہد میں ہوئیں ان کا احوال کچھ اس طرح ہے۔

## ا۔ شاعری کے مقاصد اور موضوعات میں تبدیلی

۱۔ اس عہد میں شاعری کو عصبیت اور نسبی مفاخرت کو بڑھاوا دینے' نیز اپنی پسند کے سیاسی' دینی اور علمی نقطہ ہائے نظر کو معاشرے میں فروغ دینے کے لیے استعمال کیا جانے لگا۔

۲۔ بہت سے شعراء کے کلام میں اصحابِ اقتدار کی خوشامد اور چاپلوسی دیکھنے میں آنے لگی۔ اس کا سبب یہ تھا کہ کسبِ معاش میں چونکہ مقابلے کی صورت کا سامنا تھا اس لیے روزی کمانے کا واحد ذریعہ یہی رہ گیا تھا کہ ایک دوسرے سے بڑھ چڑھ کر حکام و امراء کی مدح کر کے انعام و اکرام حاصل کیا جائے اور ایک دوسرے پر بازی لے جانے کی کوشش میں' اس میں ہر طرح کے مبالغے سے کام لیا جائے۔

۳۔ دینی پابندیوں کے کمزور پڑ جانے کی وجہ سے' نیز عجم سے آنے والے زندیق لوگوں کی آوارگی اور اوباشی کے اثر سے معاشرے میں فسق و فجور اور فحاشی اور بدکاری نے راہ پالی اور شاعر اس گناہ کی زندگی اور اس کی مہمات کا برملا اظہار کرنے لگا۔

۴۔ شراب نوشی اور امرد پرستی کو بعض شاعروں نے اپنی شاعری کا موضوع بنا لیا اور اپنی زندگی کے اس پہلو پر کھل کر اظہار خیال کر کے دوسروں کو بھی اس راہ پر لگانے کی کوشش کی۔

۵۔ باغات' محلّات' دوستانہ مجالس' قدرتی مناظر اور پرندوں اور مچھلیوں کے شکار بھی شاعری کا موضوع بنے۔

۶۔ اس کے ساتھ ساتھ دوسری طرف وعظ و نصیحت اور دنیا سے منہ موڑنے اور حکمت و دانائی اور اصلاحِ نفس کے موضوعات پر بھی شاعری کی گئی جو دراصل مذکورۂ بالا فاسقانہ شاعری کا ردِ عمل تھی۔

## ب۔ شاعری کے مضامین اور خیالات میں تبدیلی

۱۔ اس عہد کی شاعری میں خیالات اور افکار اب مربوط دکھائی دینے لگے۔ اس میں قدیم شاعری والی وہ بات نہ رہی کہ ایک شعر کا دوسرے شعر کے ساتھ کوئی ربط نہیں ہو پاتا تھا۔

۲۔ تشبیہ و استعارے اور حسن تعلیل میں خوبصورت خیالات اور تصورات سے جدت پیدا کی جانے لگی اور اپنے اظہار میں تخیل (Imagination) سے کام لیا جانے لگا۔

۳۔ تہذیب و تمدن کی وجہ سے شاعری میں نئے نئے معانی پیدا ہوئے اور اس میں فلسفیانہ افکار نے راہ پائی۔ اس لیے کہ اس دور کے اکثر شعراء دو جنسیتوں، دو زبانوں اور دو تہذیبوں کے پروردہ تھے اور ان کے اندر ان اضداد کے جمع ہو جانے سے ان کے خیالات و افکار میں بڑی تبدیلی آ گئی تھی۔ یونانی زبان سے جو تراجم عربی زبان میں ہوئے ان کا اثر عربی شاعری پر تو نہ پڑا لیکن عربوں کے مزاج، سوچنے کے انداز اور زندگی کے بارے میں ان کے نقطۂ نظر کو انہوں نے کافی حد تک بدل دیا۔

## ج۔ شاعری کی لفظیات اور اسلوب کی تبدیلی

۱۔ اس عہد کی شاعری میں نامانوس اور بدوی زندگی سے متعلق الفاظ کو بتدریج ترک کر دیا گیا۔

۲۔ عجمی الفاظ کو بھی، جہاں مناسب لگا، استعمال کیا جانے لگا۔

۳۔ شاعری کے اسالیب میں نفاست اور باریکی پیدا کی گئی اور اس کے ساتھ ساتھ عربی کے خالص محاورے اور وضاحتِ کلام کا بھی خیال رکھا گیا۔

۴۔ شاعری میں صنعتِ "بدیع" کو رائج کیا گیا اور اس کی مختلف انواع کو کثرت سے برتا گیا۔

☆......☆......☆

اب ہم عباسی دور کے مشہور اور اہم شعراء کا تذکرہ کریں گے۔ سب سے پہلے بغداد کے شعراء آئیں گے جو یہ ہیں: بشار بن برد، ابوالعتاہیہ، ابونواس، ابن الرومی، ابن المعتز، الشریف الرضی اور طغرائی۔ ان کے بعد شام کے شعراء آئیں گے جن کے نام یہ ہیں: ابوتمام، بحتری، متنبی، ابوفراس حمدانی اور ابوالعلاء معرّی۔

## بشار بن بُرد (م ۷۸۳)

ابومعاذ بشار بن بُرد نے اموی اور عباسی دونوں حکومتوں کا زمانہ پایا اور اس طرح کے سارے مخضرم شعراء میں وہ سب سے بڑا شاعر تھا۔ اسی طرح وہ شعرائے مولّدین یا محدثین (یعنی نئے زمانے کے شعراء) کا بھی سردار تھا۔ اس نے شاعری میں اختراع اور صنعتِ بدیع کو رواج دیا اور باوجود نابینا ہونے کے ادب اور بلاغت میں بلند مقام پر فائز رہا۔



Scanned with CamScanner

بشار کے آباء طخارستان کے فارسی لوگوں میں تھے۔ اس کے والدین بنی عقیل کے غلام تھے۔ وہ بصرے میں پیدا ہوا اور قبیلہ بنی عقیل میں پروان چڑھا۔ بصرے کے قریب ایک صحرائی علاقے میں کچھ بدو عرب خیموں میں رہتے تھے۔ بشار ان کے ہاں اکثر جایا کرتا اور ان کے ساتھ میل جول کے اثر سے وہ جب جوان ہوا تو بادیۂ عرب کی خالص زبان اور اس کے محاورے اور اس کی فصاحت و بلاغت سے پوری طرح لیس ہوگیا۔ چنانچہ وہ عربی ادب کی تاریخ میں آخری شاعر تھا جس کے کلام کو علمائے نحو و لغت سند مانتے تھے۔ وہ چھوٹی عمر ہی سے شعر کہنے لگا اور جب جوان ہوا تو خلفاء اور امراء کی مدح کرنے لگا۔ اگر وہ اسی راہ پر چلتا رہتا تو بڑے آرام کی اور آسودہ زندگی گزار سکتا تھا۔ لیکن اس نے اس کے ساتھ ہی ہجو کہنی شروع کر دی اور بغیر کسی شرم و حیا کے عورتوں کے ساتھ چھیڑ چھاڑ کرنے لگا۔ لوگوں نے اس بات کا بُرا مانا اور کنواری اور باعفت خواتین کی عزت کی خاطر اس کی موت کی تمنا کرنے لگے۔ مالک بن دینار نے کہا۔ ''اس شہر کے لوگوں کو فسق و فجور کی طرف لانے میں اس نابینا ملحد کے کلام سے بڑھ کر کوئی چیز نہیں۔'' کچھ لوگوں نے خلیفہ مہدی کے پاس جا کر اس کی ایک عشقیہ نظم سنائی تو وہ کہنے لگا۔ ''اس طرح کی شاعری ہی دلوں کو نرم کرتی اور مشکلات کو آسان کرتی ہے۔'' اس نے بشار کو بلا بھیجا اور اس کو تنبیہ کی کہ اگر آئندہ اس نے عشقیہ مضمون کا ایک شعر بھی کہا تو وہ اس کی روح فنا کر دے گا۔ اس کے بعد بشار جب بھی عشقیہ شعر کہتا تو ان کے اندر یہ بھی کہہ دیتا کہ مجھے خلیفہ نے ایسی باتوں کے اظہار سے منع کیا ہے اور پھر وہ اسی طرح دل لگی کی باتیں اور عورتوں کا ذکر اذکار کرتا چلا جاتا۔

جب بشار بے حیائی اور بے شرمی سے باز نہ آیا اور مہدی کی دھمکی نے اس پر کچھ اثر نہ کیا' نہ اسے لوگوں کی نفرت کی کوئی پروا ہوئی' تو مہدی کے پاس پھر سے اس کی شکایت کی گئی اور اس کے سارے کرتوت گنوائے گئے اور اتفاق یہ ہوا کہ انہی دنوں جب مہدی نے بشار کی ایک مدحیہ نظم پر اسے کوئی انعام نہ دیا تو شاعر نے اس کی ہجو کرتے ہوئے کہا:

بنی امیة هُبُّوا طال نومکم ۔۔۔ ان الخلیفة یعقوب بن داؤد

ضاعت خلافتکم یاقوم فالتمسوا ۔۔۔ خلیفة الله بین الزق والعود

(بنو امیہ' اب جاگو کہ بہت سو چکے۔ تمہارا خلیفہ اصل میں یعقوب بن داؤد (وزیر) ہے۔
لوگو آپ کی خلافت تو کہیں گم ہوگئی' پس خلیفہ کو سبُو اور سارنگی کے درمیان کہیں تلاش کرو۔)

جب خلیفہ نے اس کی یہ ہجو سنی تو اپنے پولیس افسر سے کہا کہ اسے کوڑے لگائے۔ اس حکم کی تعمیل میں بشار کو ستر کوڑے لگائے گئے' جن سے اس کی موت واقع ہوگئی۔

بشار نابینا پیدا ہوا تھا' اس لیے دنیا میں اس نے کچھ نہ دیکھا۔ لیکن عجیب بات ہے کہ اپنے شعروں میں وہ بعض مناظر کی ایسی تشبیہ لایا جو آنکھوں والوں سے بھی نہ بن پڑی۔ مثلاً جنگ کے متعلق اس کا ایک شعر ہے:

کانّ مثار النقع فوق رؤوسنا　　　واسیافنا لیلٌ تهاوی کواکبه

(ہمارے سروں پر چھایا ہوا غبار اور اس میں چلتی ہوئی تلواریں یوں لگتی تھیں جیسے رات ہو اور اس میں تارے ٹوٹ رہے ہوں۔)

وہ بھاری ڈیل والا اور طویل القامت تھا۔ اس کا چہرہ چیچک زدہ تھا اور آنکھوں کے ڈھیلے باہر کو اُبلے پڑتے تھے اور ان پر سرخ گوشت چڑھا ہوا تھا۔ چنانچہ وہ کافی بدصورت نابینا تھا۔ ایک دن ایک عورت نے اس سے کہا: تم اتنے بدشکل ہو پھر بھی نہ جانے لوگ تم سے کیوں ڈرتے ہیں؟ بشار نے کہا: شیر سے لوگ اس کے حسن کی وجہ سے تو نہیں ڈرتے۔ ایک دن ایک ادیب اس کے ہاں آیا تو بشار گھر کی دہلیز میں ایک بھینسے کی طرح لیٹا ہوا تھا۔ آنے والے نے کہا: "اے ابو معاذ یہ شعر کس کا ہے؟

انّ فی بُردیَّ جسماً ناحلاً　　　لو توکّأت علیه لانهدم

(میری چادروں کے اندر ایک کمزور جسم ہے' اگر تو اس کا سہارا لے تو وہ ڈھے جائے۔)

بشار نے کہا: میرا ہے۔ اس شخص نے کہا: تو یہ شعر کس کا ہے؟

فی حلتی جسم فتیً ناحل　　　لوهبّت الریحُ به طاحا

(میری پوشاک کے اندر ایک کمزور نوجوان کا جسم ہے۔ اگر اس پر ہوا بھی چل پڑے تو وہ ہلاک ہو جائے۔)

بشار نے کہا: یہ بھی میرا ہے۔ اس ادیب نے کہا: تم نے اتنا بڑا جھوٹ کس لیے بولا؟ بخدا میں تو یہ دیکھ رہا ہوں کہ اگر خدا وہ تمام آندھیاں بھیج دے جن سے اس نے پرانی قوموں کو ہلاک کیا تھا تو وہ تمہیں اپنی جگہ سے ہلا بھی نہ سکیں گی۔

بشار غیر معمولی طور پر ذہین' حاضر جواب' حساس' بدزبان' مسخرا اور بے شرم تھا۔ اس کے مذہبی اعتقادات سخت قابلِ اعتراض تھے۔ وہ مرنے کے بعد پھر سے دنیا میں واپس آنے پر ایمان رکھتا تھا اور وہ ابلیس کی اس رائے کو صحیح سمجھتا تھا کہ آگ مٹی پر مقدم ہے' چنانچہ اس نے اگر آدم کو سجدہ کرنے سے انکار کیا تو اپنے حساب سے وہ ٹھیک تھا۔ اس کا شعر ہے:

الأرض مُظلمة والنار مُشرقة          والنار معبودة مذ كانت النار

(مٹی تاریک ہے' اور آگ روشن ہے' آگ تو جب سے تھی تب سے اس کی عبادت ہوتی چلی آئی ہے۔)

بشار کی عادت تھی کہ جب شعر کہنے لگتا تو اپنے ہاتھوں کو رگڑتا' پھر کھانستا' پھر دائیں اور بائیں تھوکتا اور اس کے بعد شعر پڑھتا۔ وہ لوگوں سے بہت اکتاہٹ محسوس کرتا تھا اور کہتا تھا۔ ''اللہ کی تعریف ہے جس نے میری بینائی لے لی' تاکہ میں ناپسندیدہ لوگوں کو نہ دیکھ سکوں۔''

**شاعری:** جیسا کہ اوپر ذکر ہوا' بشار نے کم عمری میں ہی شعر کہنے شروع کر دیے تھے۔ اس نے شاعر جریر کا زمانہ دیکھا' اور اپنی جوانی کے دنوں میں اس کی ہجو کہہ ڈالی' اس خیال سے کہ اگر جریر نے اس کا جواب دیا تو وہ مشہور ہو جائے گا۔ لیکن جریر نے اسے نوعمر جان کر نظر انداز کر دیا۔ بشار نے سب سے پہلے ہجو میں مشقِ سخن کی۔ اس لیے کہ اس زمانے میں اس صنف کا بہت چرچا تھا۔ لیکن بعد میں اس نے شاعری کی تمام اصناف میں طبع آزمائی کی' بلکہ ان پر کچھ اضافے کیے۔ چنانچہ شاعری کے راوی اور نقاد اس امر پر متفق ہیں کہ وہ مولدین شعراء کا سرخیل ہے اور اس کی شاعری قدیم اور جدید کے درمیان ایک حدِّ فاصل (Watershed) ہے۔ ان کے نزدیک مولدین شعراء میں اسے وہی مقام حاصل ہے جو جاہلی شاعری میں امرؤ القیس کو تھا اور زمانۂ قریب کے محدثین شعراء میں بارودی کو رہا۔ اصمعی بشار کو اعشی اور نابغہ سے تشبیہ دیا کرتا تھا۔ اس لیے کہ اس کے کلام میں بھی کوئی ناہمواری دکھائی نہیں دیتی' نہ اس میں کوئی نامانوس الفاظ استعمال ہوتے ہیں اور نہ وہ الجھاؤ کا شکار ہوتی ہے۔ بشار کی شاعری کی سلاست' حسن اور شائستگی نے بصرہ کے نوجوانوں اور اخلاق باختہ لوگوں کو اپنا گرویدہ بنا لیا' اور عورتیں بھی اس کی شاعری کو پسند کرنے لگیں۔ چنانچہ وہ اس کے پاس جاتیں' اس سے گپ شپ کرتیں اور اس کی نظمیں گا کر سناتیں۔ بشار ان میں سے ایک لونڈی عبدہ پر مائل ہو گیا اور اس کے بارے میں عشقیہ اشعار کہہ کر اسے مشہور کر دیا۔

**نمونۂ کلام:** اپنے ایک قصیدے میں بشار اموی عامل ابن ابی ہبیرہ کی مدح کرتا ہے' جس نے خوارج کے سردار ضحاک کو ایک معرکے میں شکست دی تھی' اور اپنے ان اشعار میں وہ دوست کے ساتھ حسن سلوک کی نصیحت کرتا ہے:

اذا كنت في كل الامور معاتبا          صديقك لم تلق الذي لا تعاتبه

فعِش واحداً أو صِلْ اخاک فانّه — مقارف ذنبٍ مرّةً و مُجانبه
اذا انت لم تشرب مراراً على القذى — ظمئت' وایّ الناس تصفو مشاربه
ومن ذا الذی ترضی سجایاه کلها — کفی المرء نبلاً ان تُعَدَّ معایبه
اذا الملک الجبّار صعّر خدّه — مشینا الیه بالسیوف نعاتبه
رکبنا له جهراً بکل مثقّف — وأبیض تستقی الدماءَ مضاربه
بعثنا الهم موت الفجاءة اننا — بنو الموت' خفّاق علینا سبائبه
کأن مثار النقع فوق رؤوسنا — واسیافنا لیل تهاوی کواکبه

(اگر تم سب باتوں میں اپنے دوست کو ملامت کرنے لگو گے' تو تمہیں کوئی بھی ایسا نہ ملے گا جس کو تم ملامت نہ کرو۔

پس یا تو تم تنہا رہو' یا اپنے بھائی سے تعلق رکھو' اس لیے کہ وہ اگر کبھی گناہ کرتا ہے تو کبھی اس سے اجتناب بھی کرتا ہے۔

اگر تم پانی میں کوئی تنکا دیکھ کر اسے نہیں پیو گے تو پیاسے رہ جاؤ گے۔ ایسا کون ہے جس کے مشروب ہمیشہ مصفا ہوں۔

اور وہ کون ہے جس کی سب عادتیں بہت پسندیدہ ہوں' ایک انسان کی شرافت کے لیے اتنا ہی کافی ہے کہ اس میں گنتی کے کچھ عیب ہوں۔

جب ایک جابر سلطان تکبر سے اپنا رُخ بدل لیتا ہے تو ہم اس کے پاس تلواروں کے ساتھ جاتے ہیں اور اس کو بُرا بھلا کہتے ہیں۔

ہم اس کے پاس سیدھے کیے ہوئے نیزوں کے ساتھ گئے اور سفید تلواروں کے ساتھ جن کی دھار کو خون کی پیاس ہے۔

ہم نے ان کو ناگہانی موت بھیجی' ہم موت کے سپوت ہیں' اس کے جھنڈے ہمارے سروں پر لہراتے ہیں۔

جنگ کے وقت ہمارے سروں پر چھایا ہوا غبار اور اس میں چلتی ہوئی تلواریں یوں لگتی تھیں جیسے رات کا اندھیارا ہو اور اس میں تارے ٹوٹ رہے ہوں۔)

مشورہ' حکمت اور نصائح کے موضوع پر اس کے چند اشعار جو منصور کی ہجو کے سلسلے میں کہے گئے۔

اذا بلغ الرأیُ المشورةَ فاستعن — برأی نصیحٍ او نصیحة حازم
ولا تجعل الشوری علیک غضاضة — فان الخوافی قوّة للقوادم
وخلّ الهوینا للضعیف ولا تکن — نؤوماً فان الحزم لیس بنائم

فانک لا تستطرد الھمّ بالمنی — ولا تبلغ العلیا بغیر المکارم
وما قرع الاقوام مثل مشیَّعٍ — اریبٍ، ولا جَلّی العَمَی مثل عالمِ

(جب رائے کو مشورے کی ضرورت پڑ جائے تو کسی خیر خواہ کی رائے سے یا کسی پرعزم انسان کی نصیحت سے فائدہ اُٹھاؤ۔
مشورہ لینے کو اپنے لیے کوئی عیب کی بات نہ سمجھو اس لیے کہ پرندے کے چھوٹے پر ہی اس کے بڑے پروں کی طاقت بنتے ہیں۔
نرمی کا رویّہ کمزور انسان کے لیے ہی رہنے دو۔ تم البتہ جاگتے رہو۔ اس لیے کہ دُور اندیش لوگ کبھی سوتے نہیں ہیں۔
بات یہ ہے کہ تم فکر اور پریشانی کو خواہش سے نہیں دور کر سکتے اور اچھے کاموں کے بغیر تم اونچا مقام نہیں پا سکو گے۔
قوموں پر بہادر اور عقلمند ہی غالب آتے ہیں اور جہالت کی تاریکی کو عالم ہی دور کر سکتے ہیں۔)

## بشار کی عشقیہ شاعری کے کچھ نمونے

یا قوم أذنی لبعض الحیّ عاشقة — والاذن تعشق قبل العین احیانا
قالوا بمن لاتری تھذی؟ فقلتُ لھم — الأذن کالعین توفی القلب ماکانا

(اے لوگو! میرے کان محلے کی ایک ہستی پر عاشق ہیں اور بعض اوقات کان آنکھوں سے پہلے عاشق ہو جاتے ہیں۔
انہوں نے کہا جسے تم نے دیکھا نہیں اس کے بارے میں بہکی بہکی باتیں کرتے ہو۔ میں نے کہا کہ کان بھی آنکھ کی طرح ہوتے ہیں کہ جو بھی صورت حال ہو سب دل کو بتا دیتے ہیں۔)

اسی موضوع پر دوسری جگہ کہتا ہے:

لم یطُل لیلی ولکن لم انم — و نفی عنّی الکریٰ طیف الَمّ
نفّسی یا عبدُ عنّی واعلمی — اننی یا عبدُ من لحمٍ و دم
ان فی بردیّ جسماً ناحلاً — لو توکّاتِ علیہ لانھدم

(میری رات تو لمبی نہیں تھی لیکن میں سو نہیں سکا' میری نیند ایک خیال اُڑا کر لے گیا۔
اے عبدہ' میرے لیے آسانی پیدا کر' اتنا تو جان لے کہ میں گوشت اور پوست کا بنا ہوا ہوں۔
میری چادروں کے اندر ایک کمزور جسم ہے' اگر تو اس کا سہارا لے گی تو وہ ڈھے جائے گا۔)


Scanned with CamScanner

بشار کا ایک مشہور شعر ہے:

انا واللہ اشتھی سحر عینیک واخشی مصارع العشاق

(بخدا میں تمہاری آنکھوں کے سحر کا خواہشمند ہوں اور ڈرتا بھی ہوں کہ اس سے عاشق ہلاکت سے دوچار ہوتے ہیں۔)

## ابوالعتاہیہ (م ۸۲۶)

ابواسحاق اسماعیل بن القاسم، جس کا لقب ابوالعتاہیہ تھا اپنے وقت کا سب سے زیادہ موزوں طبع اور پرگو شاعر تھا۔ بہت آسان زبان میں شعر کہتا تھا اور بدیہہ گوئی میں سب سے آگے تھا۔ اس نے سب سے پہلے شعراء کے لیے وعظ اور زُہد اور دنیا سے کنارہ کشی کا موضوع رائج کیا اور حکمت و دانائی کے باب میں بہت کچھ کہا۔

ابوالعتاہیہ حجاز کے ایک گاؤں عین التمر میں پیدا ہوا اور کوفہ میں پروان چڑھا۔ شروع میں اس نے اپنے اہل خاندان کا پیشہ اختیار کیا جو مٹکے بنا کر بیچتے تھے۔ چنانچہ یہ بھی ایک عرصے تک پیٹھ پر مٹکوں کا ایک پنجرہ رکھ کر انہیں کوفے کی گلیوں میں بیچتا رہا۔ لیکن اس کے ساتھ اسے شاعری کا شوق بھی ہو گیا اور وہ ادب کی طرف میلان رکھنے لگا۔ وہ بڑی سہولت سے، بغیر کسی کوشش کے شعر کہنے لگا۔ بعض دفعہ تو یہ ہوتا کہ وہ کوئی بات کرتا تو وہ اتنی موزوں ہوتی کہ شعر کا ایک ٹکڑا لگتی۔ اسی لیے وہ اپنے بارے میں کہتا تھا کہ اگر میں چاہوں تو اپنی روزمرّہ کی تمام گفتگو شعروں میں کر سکتا ہوں۔ ابوالعتاہیہ شعر کہنے کے باوجود عروض سے قطعاً ناواقف تھا اور اس نے بعض ایسی بحروں میں شعر کہے جو اس سے پہلے کسی نے استعمال نہیں کی تھیں۔ جب اس سے کسی نے اس بارے میں بات کی تو ابوالعتاہیہ نے جواب دیا۔ "انا اکبرُ من العُروض" (میں عروض سے بہت اونچا ہوں۔) جب کوفہ کے دلدادگانِ ادب اور نوجوانوں نے اس کا ذکر سنا تو وہ اس کے پاس، جہاں مٹکے تیار ہوتے تھے، جانے لگے اور اس سے شعر سننے لگے۔ یہ سلسلہ جب آگے بڑھا تو ابوالعتاہیہ کی شاعری امراء اور بڑے لوگوں تک پہنچ گئی اور وہ شعراء کی مجالس اور خلفاء کے ایوانوں میں آنے جانے لگا۔

ابوالعتاہیہ مہدی کی خلافت کے اوائل میں بغداد آیا جو اس وقت علم و ادب کا مرکز تھا۔ خلیفہ کی مدح کر کے وہ اس کا نورِ نظر ہو گیا اور اس کے محل کی ایک لونڈی عتبہ کے عشق میں گرفتار ہوا۔ اس نے عتبہ

کے لیے کافی عشقیہ شاعری کی، حتیٰ کہ مہدی نے ارادہ کیا کہ وہ لونڈی شاعر کو بخش دے۔ لیکن عتبہ کو یہ شاعر پسند نہیں تھا، اس لیے اس نے خلیفہ کی منت سماجت کر کے اس سے جان چھڑائی۔ مہدی نے ابوالعتاہیہ کو کافی مال وزر دے کر عتبہ کا خیال اس کے دل سے بھلا دیا۔ جب مہدی کے بعد ہادی خلیفہ ہوا تو شاعر کے اخلاق اور خیالات میں کافی تبدیلی آ گئی اور وہ عتبہ کو بھول گیا۔ اس نے اب زہد وتقویٰ اختیار کیا اور موٹا جھوٹا پہننے لگا۔ اس کے ساتھ اس نے بعض علمائے کلام اور شیعہ اور جبریہ فرقوں کی مجالس درس میں بیٹھنا شروع کیا۔ لیکن وہ کچھ دن ان میں سے ایک کے ساتھ رہتا اور پھر اسے چھوڑ کر دوسرے فرقے کے ہاں چلا جاتا۔ اس کا اثر یہ ہوا کہ وہ عبادت اور زہد کی طرف مائل ہو گیا۔ جب ہارون الرشید کا دور آیا تو اس نے عشقیہ شاعری بالکل چھوڑ دی اور شاعری کو صرف زُہد اور دنیا سے کنارہ کشی اور موت کے ذکر تک محدود کر لیا۔ پھر اس پر ایسا وقت آیا کہ اس نے شعر کہنا ہی ترک کر دیا۔ جب ہارون الرشید نے اسے شعر کہنے پر مجبور کیا تو وہ پھر بھی نہ مانا۔ اس پر خلیفہ نے اسے ساٹھ چھڑیوں کی سزا دی اور اسے جیل میں ڈال دیا۔ کچھ عرصہ گزرنے کے بعد وہ بالآخر پھر سے شعر کہنے لگا اور ہارون الرشید اس کا ایسا دلدادہ ہوا کہ اسے سفر اور حضر میں اپنے ساتھ رکھتا اور اس کے لیے پچاس ہزار درہم کا وظیفہ بھی مقرر کر دیا جو انعامات کے علاوہ تھا جو اسے خلیفہ سے اور بعض امراء سے حاصل ہوتے تھے۔ ابوالعتاہیہ کی شہرت اب آسمان کو چھونے لگی۔ ایک طرف مغنیات اور مغنّی لوگ اس کا کلام گا گا کر سنانے لگے اور دوسری طرف عابد و زاہد لوگوں نے اس کی شاعری کو اپنے حسبِ حال پا کر اسے کافی رواج دیا۔ اور علماء اور راوی لوگوں نے اس کے کلام کو چُن چُن کر جمع کیا۔ ابوالعتاہیہ خلفاء ہارون، امین اور مامون کے زمانوں میں اسی طرح مقبول و ہردلعزیز رہا اور آخر ۸۲۶ میں اس نے اس دارِ فانی سے کوچ کیا۔

ابوالعتاہیہ کا رنگ سفید تھا اور بال کالے اور گھنگھریالے تھے، اس لیے وہ خاصا خوش شکل تھا۔ اس کے ساتھ وہ چرب زبان تھا اور اپنی سوچ اور خیالات میں عموماً متذبذب رہنے والا تھا۔ وہ اپنے عقیدے میں ایک جگہ جم کر نہیں رہ سکتا تھا اور اپنا مسلک بدلتا رہتا تھا۔ اپنی معاشی زندگی میں آسودہ اور خوشحال ہونے کے باوجود وہ طبعاً بخیل تھا اور اپنے آپ پر بھی اور اپنے اہل وعیال پر بھی، ہاتھ روک کر خرچ کرتا تھا۔

ابوالعتاہیہ نے عربی شاعری میں خاص طور پر دو چیزوں کو رواج دیا۔ ایک زندگی سے بیزاری اور موت کے خیال کو دوسرے صنعتِ سہل ممتنع کو۔ اس کے شروع زمانے کے قصائد کو چھوڑ کر جو عشق و محبت اور مدح وہجو کے باب میں ہیں، اس کی شاعری کے بہت بڑے حصے کا مرکزی خیال یہ ہے کہ یہ زندگی چند روزہ ہے اور دنیا کی یہ چہل پہل، یہ ساز وسامان اور عیش وعشرت، یہ سب مایا کا روپ ہے اور ایک دن ختم ہو کے رہ جائے گا۔ جب ایسا ہے تو انسان کو چاہیے کہ اپنے آپ کو حرص اور خواہش سے آزاد کرے اور



Scanned with CamScanner

موت اور فنا کے خیال میں رہے۔ اس مرکزی خیال کو اس نے اپنی شاعری کے ایک بڑے حصے میں' جسے "زہدیات" کا نام دیا جاتا ہے۔ بہت تواتر اور تکرار کے ساتھ پیش کیا اور اس کے لیے زبان و بیان کا انداز ایسا اختیار کیا کہ اس سے زیادہ سہل' زیادہ راست اور بے ساختہ انداز کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا۔ ابو العتاہیہ خود کہتا تھا کہ اس کی یہ شاعری چونکہ دربار کے لیے نہیں' بلکہ عام لوگوں کے لیے ہے' اس لیے اس نے اسے لوگوں کی عام بول چال کی سطح پر رکھا ہے۔

شاعری اور اس کے کچھ نمونے: زندگی کی بے حقیقتی کے بارے میں ابوالعتاہیہ کہتا ہے:

الم ترانما الدنیا حطام ۔ وان جمیع مافیھا غرور

(کیا تم نے نہیں دیکھا کہ یہ دنیا کاٹھ کباڑ ہے' اس میں جو کچھ ہے وہ سب دھوکا اور فریب ہے۔)

اس دنیا میں تخلیق و تعمیر کی لاحاصلیت کے بارے میں اس کا یہ شعر ایک کلاسیک کی شہرت رکھتا ہے:

لِدُوا للموت وابنُوا للخراب ۔ فکلّکُم یصیر الی تبابِ

(ہاں' بچے جنو' موت کے منہ میں دینے کے لیے اور بستیاں تعمیر کرو' اجڑنے کے لیے' کہ تم سب کو آخر میں ہلاک ہی ہونا ہے۔)

ایک اور جگہ وہ ہمیں موت کے خیال کی ترغیب اس طرح سے دیتا ہے:

کلّنا فی غفلة والموت یغدو و یروح

نُح علی نفسک یا مسکینُ ان کنتَ تنوح

لتموتَنّ' وان عُمرّتَ ما عُمرَ نوح

(ہم سب غافل ہیں اور موت ہمارے درمیان چلتی پھرتی ہے۔ اے کم نصیب! اگر تجھے نوحہ کرنا ہی ہے تو اپنے آپ کا کر' کہ چاہے تمہیں عمر نوح بھی عطا ہو جائے' ایک دن پھر بھی مر جانا ہے۔)

کتاب الاغانی میں آتا ہے کہ ایک دن خلیفہ ہارون الرشید کشتی پر سوار دجلہ کی سیر کر رہا تھا۔ ملاّحوں نے خلیفہ کی تفریح طبع کے لیے جب ابوالعتاہیہ کے اوپر کے یہ شعر گا کر سنائے تو وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔

تاہم عجیب بات ہے کہ متاع دنیا سے نفور اور موت کے اس ہمہ وقتی خیال (Obsession) کے

باوجود ابوالعتاہیہ کو آزاد خیال اور بدعقیدہ سمجھا گیا۔ کچھ لوگوں کو اعتراض تھا کہ اس نے اپنے شعروں میں موت اور فنا کا ذکر تو بہت کیا ہے، لیکن آخرت اور روزِ جزا کی بات نہیں کی، جب ایک مومن کے سارے دکھوں کا مداوا ہوگا اور اسے ایک ابدی عیش کی زندگی نصیب ہوگی۔ کچھ دوسرے لوگوں کی رائے یہ تھی کہ اس کا یہ زُہد اور ترکِ دنیا کا رویّہ ہندوستان کے بدھ مت سے متاثر ہے اور فکر و اندیشے کا یہ انداز اسلامی عقیدے سے ہٹ کر کوئی چیز ہے۔ ابوالعتاہیہ کی زندگی میں اگرچہ مانوی عقیدے کے کوئی آثار نہیں ملتے جس کی رُو سے خیر و شر اور نور و ظلمت کے خدا الگ الگ ہوتے ہیں، تاہم اس کے بعض شعروں سے ضرور متبادر ہوتا ہے کہ وہ خیر و شر کے دو متضاد جوہروں کے وجود کا قائل تھا۔ اس کا خیال تھا کہ خیر و شر کے یہ دونوں عناصر خدا نے انسان کے اندر جمع کر دیے ہیں اور ساتھ ہی یہ تعیّن بھی کر دیا ہے کہ ان میں سے کون غالب رہے گا۔ اس طرح وہ انسانی دائرے میں جبریت (Determinism) کا قائل دکھائی دیتا ہے۔ اس باب میں اس کے یہ دو شعر قابلِ ملاحظہ ہیں:

کلٌّ یدور علی البقاء مؤمِّلاً     وعلی الفناء تُدیرہ الأیّام

(ہر شخص بقاء کے مدار میں پُراُمید چلا جاتا ہے اور ادھر اسے تقدیر گھما کر فنا کے راستے پر لے آتی ہے۔)

یبکی و یضحک ذو نفس مصرَّفة     واللہ أضحکہ واللہ أبکاہ

(انسان، جس کے نفس کی باگیں کسی اور کے ہاتھ میں ہیں کبھی روتا ہے کبھی ہنستا ہے۔ اصل بات ہے یہ کہ اللہ ہی اسے ہنساتا اور اللہ ہی اسے رُلاتا ہے۔)

ابوالعتاہیہ میں بدیہہ گوئی کا جو ملکہ تھا وہ اس سے بعض اوقات کچھ زیادہ ہی کام لیتا تھا اور بہت کثرت سے شعر کہنے لگتا تھا۔ چنانچہ اس کے متعلق شاعری کے بڑے نقاد اصمعی نے کہا: ”ابوالعتاہیہ کی حویلی بادشاہوں کی حویلی کی طرح ہے۔ اس میں جواہر بھی ملتے ہیں، سونا بھی ملتا ہے اور اس کے ساتھ مٹی بھی ملتی ہے اور ٹھیکرے اور گٹھلیاں بھی۔“

**شاعری کے کچھ اور نمونے:** مہدی کی مدح کرتے ہوئے ابوالعتاہیہ کہتا ہے:

أتتہ الخلافةُ منقادةً     الیہ تجرّر اذیالھا

فلم تکُ تصلح الّا لہ     ولم یک یصلُح الّا لھا

ولو رامھا احد غیرہ     لزلزت الارض زلزالھا

ولولم تُطعه بَناتُ القلوب لما قبل الله أعمالها

(اس کے پاس خلافت سر جھکائے چلی آئی' اپنے دامن اپنے پیچھے کھینچتے ہوئے۔
تم اس کے لیے ہی موزوں تھے' اور وہ تمہارے لیے ہی موزوں تھی۔
اگر کوئی دوسرا اس کی خواہش کرتا' تو اس زمین پہ زلزلہ آ جاتا۔
اگر لوگ دل سے اس کی اطاعت نہ کریں گے تو اللہ ان کے عمل قبول نہیں کرے گا۔)

ہجو میں ابوالعتاہیہ نے ایک ایسی نظم ابوالفضل عبداللہ بن معن بن زائدہ کے خلاف کہی کہ اسے ذلیل کر کے رکھ دیا۔ اس نظم میں وہ اسے عورت بنا کر اس سے مخاطب ہوتا ہے۔ کہتا ہے:

قال ابن معن و جلا نفسه علی القرا بین من الأهل
أنا فتاة الحيّ من وائلٍ فی الشرف الباذخ والنُبلِ
مافی بنی شیبان' اهل الحِجیَ جارية واحدة مثلی
تکنی أبا الفضل' ومن ذارأی جارية تکنی ابا الفضل
قد نقّطت فی وجهها نقطةً مخافةَ العَین' من الکحُل
ان زُرتموها' قال حُجابُها نحن عن الزوّار فی شُغل

(اپنے آپ کو بادشاہ کے خواص کے سامنے پیش کرتے ہوئے ابن معن نے کہا:
میں وائل قبیلے کی بیٹی ہوں' جو اونچے شرف اور بڑے رتبے والا ہے۔
صاحبانِ عقل بنو شیبان میں مجھ جیسی ایک بھی لونڈی نہیں ہے۔
اس کی کنیت ابوالفضل ہے۔ کیا کسی نے ایسی لونڈی دیکھی ہے جس کی کنیت ابوالفضل ہو؟
اس نے اپنے چہرے پر کاجل کا ایک نقطہ لگا دیا ہے' تاکہ اسے نظر بد نہ لگ جائے۔
اگر تم اس سے ملنے جاؤ تو اس کے دربان کہتے ہیں کہ ہم ملنے والوں کی طرف توجہ نہیں دے سکتے۔)

عشقیہ شاعری میں ابوالعتاہیہ نے بہت کچھ کہا' جس میں اس کے یہ اشعار بہت مشہور ہیں:

عینی علی عتبة منهلّة بدمعها المنسکب السائل
کانها فی حسنها دُرّة أخرجها اليمُ الی الساحل
کأن فی فيها و فی طرفها سوا حراً أقبلن من بابل
لم يبق منّی حبها ماخلا حشاشة فی بدن ناحل

یامن رای قبلی قتیلا بکی    من شدۃ الوجد علی القاتل

(میری آنکھ عتبہ کی یاد میں بہنے والے آنسوؤں میں بھیگی ہوئی ہے۔
وہ اپنے حسن میں گویا ایک موتی ہے جسے سمندر نے ساحل پر اچھال دیا ہے۔
اس کے دہانے اور اس کی نگاہوں میں یوں لگتا ہے جیسے ان میں بابل کی جادوگرنیاں آ کے بس گئی ہوں۔
اس کی محبت نے میرے اندر سوائے ایک ناتواں جسم کی آخری سانسوں کے کچھ باقی نہیں رکھا۔
کیا کسی نے مجھ سے پہلے ایسا قتیل بھی دیکھا ہے جو محبت کی شدت میں اپنے قاتل کے لیے رویا ہو؟)

ابوالعتاہیہ نے حکمت اور دانائی کے باب میں بہت سے اشعار کہے جو اس کے کلام میں ادھر ادھر بکھرے ہوئے ملتے ہیں، مثلاً وہ کہتا ہے:

ترجو النجاۃ ولم تسلک مسالکھا    ان السفینۃ لا تجری علی الیبس

(تو نجات کی اُمید رکھتا ہے، حالانکہ تم نے اس کی راہیں اختیار نہیں کیں، کشتی کبھی خشکی پر تو نہیں چلا کرتی۔)

ان کان لا یُغنیک ما یکفیک    فکلُّ ما فی الارض لا یُغنیک

(جو تمہارے لیے کافی ہے اگر وہ تمہیں مستغنی نہیں کر سکتا، تو پھر دنیا میں جتنا کچھ ہے وہ سب تمہیں مستغنی نہیں کر سکتا۔)

## ابونواس (م ۸۱۴)

ابوالحسن ابن ہانی نام تھا، ابونواس کی کنیت خلف الاحمر کے کہنے پر اختیار کی، جو چاہتا تھا کہ یمن کے شرفاء کی طرح یہ بھی ذویزن اور ذونواس کی طرح کی کنیت اپنے لیے پسند کرے۔ ابونواس صاحب طرز شاعر تھا۔ وہ بیک وقت سنجیدہ بھی تھا اور پُر مزاح بھی۔ اس نے بڑی شہرت پائی اور اس کی شاعری دور دور تک پہنچی۔ بشار کے بعد جدید شاعری کا سرخیل وہی قرار پایا۔

ابونواس اہواز کے ایک گاؤں میں پیدا ہوا۔ وہاں سے یہ بصرہ آ گیا اور یہیں پروان چڑھا۔ پھر بغداد چلا گیا اور آخر وقت تک وہیں رہا۔ اس کا باپ آخری اموی خلیفہ مروان کی فوج میں تھا۔ جب

فوت ہوا تو ابونواس کی ماں نے تعلیم کی غرض سے بچے کو ایک مکتب میں داخل کرا دیا' جہاں اس نے قرآن پڑھا اور لکھنا پڑھنا سیکھا۔ تعلیم کے اثر سے اس کے اندر ادب و شعر کی طرف رغبت پیدا ہوئی۔ لیکن اس کی ماں نے جو طبعاً بہت بخیل اور تنگ نظر تھی' اسے ایک عطار کے ہاں ملازم رکھوا دیا' تا کہ گھر کی آمدنی میں اضافے کی صورت پیدا ہو۔ ابونواس دن کو عطار کی دکان پر عود اور اگربتی کی تیلیاں چھیلتا اور شام کو بصرے کی جامع مسجد کا رُخ کرتا اور وہاں مختلف شیوخ اور ادباء کے حلقوں میں بیٹھ کر قرآن و حدیث اور اس کے ساتھ ساتھ لغت اور شاعری کے درس سنتا۔ ابونواس نے ایک شاعر والبہ بن حباب کا ذکر سن رکھا تھا اور چاہتا تھا کہ کسی طرح اس کی صحبت میسر ہو تو اس سے فیض حاصل کرے۔ اتفاق یہ ہوا کہ ایک دفعہ والبہ اسی عطار کی دکان سے گزرا جہاں ابونواس کام کرتا تھا' تو اس نے اس نوجوان میں غیر معمولی ذہانت اور فہم و ادراک کی علامات دیکھیں۔ والبہ اس سے کہنے لگا کہ تمہارے اندر میں ایسے اوصاف دیکھ رہا ہوں جن کو تمہیں ضائع نہیں کرنا چاہیے۔ ابونواس نے اس کا نام پوچھا تو یہ جان کر کہ وہ والبہ ہے بہت خوش ہوا اور اس کے ساتھ بغداد چلا آیا۔ اس وقت اس کی عمر تیس برس کے لگ بھگ تھی۔ ابونواس نے وہاں والبہ کے ساتھ شعر و غنا اور ناؤ نوش کی ان محفلوں میں جانا شروع کر دیا جہاں خوبصورت لونڈیاں اور نرم و نازک ترک لڑکے ساقی گری پر مامور تھے۔ اس کے ساتھ اس نے مختلف شعراء کی صحبت اختیار کی اور علماء کی مجالسِ درس میں بیٹھتا رہا۔ یہاں تک کہ وہ اپنے معاصرین میں سب سے بڑا شاعر' سب سے زیادہ عالم و فاضل اور سب سے زیادہ مشہور ہو گیا۔ جب اس کی شہرت ہارون الرشید تک پہنچی تو اس نے اسے اپنی مدح کی اجازت دے دی۔ چنانچہ اس نے ہارون کی مدح کی اور اس کا مصاحب اور منظورِ نظر بن گیا۔ ہارون کے ہاں ابونواس کا یہ مقام تھا کہ جب بنو ہاشم اور فوج کے سردار اور ادباء اور اہلِ قلم اس کے پاس سے گزرتے اور وہ اپنی نشست پر دراز ہوتا تو وہ کسی کے لیے بھی نہ اُٹھتا۔ خلیفہ کے علاوہ وہ بعض صوبوں کے گورنروں کی مدح بھی کر لیا کرتا' جن میں سے ایک مصر کا گورنر خصیب تھا۔ اس کی مدح میں اس نے جو نظمیں کہیں ان کی روایت عراقیوں نے نہیں' صرف مصریوں نے کی۔ پھر وہ ہارون الرشید کے بیٹے امین کا ہو کر رہ گیا۔ چنانچہ اس نے امین کی صحبت اختیار کی اور اسی کی مدح کی۔ اس زمانے میں اس سے کوئی ایسی بات سرزد ہو گئی کہ اسے قید میں ڈالنا ضروری ہو گیا۔ چنانچہ اسے کچھ عرصے کے لیے زندان میں ڈال دیا گیا۔ جب وہ قید سے باہر آیا تو زیادہ عرصہ نہ گزرا کہ ۸۱۴ء میں اس کی موت واقع ہو گئی۔

**شخصیت اور صفات :** ابونواس خوش شکل' خوش مزاج' دلچسپ گفتگو کرنے والا' حاضر دماغ' فصیح و

بلغ، شراب کا رسیا اور مزاح و تمسخر کا دلدادہ تھا۔ اس میں وہ سب صفات موجود تھیں جو شراب نوشی کے ایک ساتھی (ندیم) میں ہونی چاہئیں، اور دین کے معاملات میں وہ بالکل غیر سنجیدہ تھا۔ لیکن اس کے باوجود اس میں انسان دوستی، ہمدردی اور رحم کا جذبہ موجود تھا۔ وہ اپنے تعلقات میں پُر خلوص اور باوفا تھا۔ خلیفہ امین کے ساتھ اس کی دوستی رہی۔ پھر جب امین پر زوال آیا اور اس کے سب دوسرے مصاحب اور مدح خواں اپنی وفاداریاں بدل کر مامون کے گرد جمع ہو گئے تو ابونواس نے اس کا ساتھ نہ چھوڑا۔ حالانکہ مامون نے کہہ رکھا تھا کہ اگر ایک دفعہ ابونواس میرے پاس آ جائے تو میں اسے اتنا کچھ دوں گا کہ اس نے اس کا تصور بھی نہ کیا ہو گا۔

ایک زمانے میں وہ ثقفی خاندان کی ایک لونڈی جنان کے عشق میں گرفتار ہوا اور اس کا دل جیتنے کے لیے اس نے بہت جتن کیے۔ لیکن وہ غالباً اس کی عیاشی کی وجہ سے، اس کی طرف مائل نہ ہوئی۔ محبت کے اس جذبے سے مجبور ہو کر ابونواس جنان کا ذکر اپنے شعروں میں کرنے لگ گیا۔ جب حالات یہاں تک پہنچ گئے تو ثقفی خاندان نے اپنے گھرانے کی بدنامی سے بچنے کے لیے جنان کی شادی کر کے اسے دور بھیج دیا۔ ابونواس کے متعلق بہت سی باتیں اس لونڈی جنان کے حوالے سے ہیں، جو شاعرہ تھی اور جسے ابو نواس دل سے چاہتا تھا۔

ابونواس کے متعلق ایک روایت یہ بھی ہے کہ اس نے پرانے دستور کے مطابق اپنی زبان دانی کو بہتر بنانے کے لیے کچھ زمانہ اہلِ بادیہ میں رہ کر گزارا۔ اس سے لغت میں اسے کافی ملکہ حاصل ہو گیا اور وہ اشعار اور اخبارِ عرب کی روایت کرنے لگا۔ اس کے متعلق کہا جاتا ہے کہ اس نے اس وقت تک شعر نہیں کہے جب تک اس نے مَردوں کو چھوڑ کر ساٹھ خواتین کے اشعار نہ یاد کر لیے۔ جاحظ کا اس کے متعلق کہنا ہے کہ میں نے زبان کا علم ابونواس سے زیادہ کسی میں نہ دیکھا اور نہ کسی کا لہجہ اتنا فصیح پایا جتنا اس کا تھا۔ ابونواس نے شاعری کے تمام موضوعات میں اظہارِ خیال کیا۔ لیکن وہ تمام شعراء سے اس بات میں ممتاز ہے کہ اس کی مزاحیہ شاعری فحش ہوتی تھی۔ البتہ وہ جو کچھ بھی کہتا صاف صاف کہتا۔ وہ اپنے مزاج اور اپنے ماحول کی بڑی سچی تصویر کھینچتا اور شراب کا بیان تو وہ اس طرح سے کرتا کہ بقول کسے ''اگر اسے حسن بصری اور ابن سیرین بھی سن لیتے تو وہ اس کی طرف کھنچے چلے آتے اور اس سے شغل کرتے۔'' مدح اس کی شاعری کا بہت تھوڑا حصہ ہے اور وہ زیادہ تر ہارون الرشید اور امین کے لیے ہے۔ لفظ و معنی کے انتخاب میں وہ بشار بن برد کا ثانی سمجھا جاتا ہے اور اکثر مواقع پر وہ بشار کا طرز اختیار کرتا ہے۔

ابونواس کے بارے میں یہ مشہور ہے کہ وہ اپنے کلام کی نوک پلک درست کیا کرتا تھا۔ جب وہ ایک نظم کہہ لیتا تو اسے رات بھر کے لیے رکھ دیتا۔ صبح اُٹھ کر اس پر نظر ثانی کرتا۔ اس میں سے بہت کچھ



Scanned with CamScanner

حذف کر دیتا اور جو اچھا ہوتا وہ رہنے دیتا۔ اسی لیے اس کی اکثر نظمیں طویل نہیں ہیں۔ اگرچہ اس کا خیال نازک ہوتا ہے اور مزاح کا پہلو لیے ہوئے ہوتا ہے، تاہم اس کی بندش پختہ اور اسلوب پُرشوکت ہوتا ہے۔ اس میں کافی نامانوس الفاظ بھی دیکھنے میں آتے ہیں۔ نیز اس نے اپنی شاعری میں ایسی نئی باتوں کو رواج دیا جن پر اہل دانش کو تو اعتراض ہوا، لیکن شعراء نے ان کو اپنا لیا۔ مثلاً اس کا فسق و فجور میں غیر ذمہ دارانہ رویہ اختیار کرنا، اپنے تئیں مزاح اور دل لگی کے حوالے کر دینا، عشقیہ شاعری میں کسی عورت کی بجائے مرد کو محبوب بنانا اور اسے اپنی خواہشات کا مرکز قرار دینا۔ کوئی شک نہیں کہ اس طرح کی شاعری کو عربی میں رواج دینے والا پہلا شخص ابونواس ہے۔

**شاعری:** ابونواس کی شاعری کے خاص موضوعات کیا ہیں؟ ان میں سرِ فہرست تو شراب ہے، جو شاعر کے لیے محض آسائشِ حیات نہیں، بلکہ لازمۂ حیات ہے، جس کے بغیر وہ اس زندگی کے دیے ہوئے دکھ جھیلنے کا تصور بھی نہیں کر سکتا۔ شراب کے بعد اس کا دوسرا موضوع 'غزل' ہے، یعنی وہ شاعری جس میں خوباں اور مہ وشاں کا ذکر اذکار ہو۔ ابونواس کے ہاں یہ غزل دو قسم کی ہے: ایک وہ جس میں اس کا موضوعِ سخن ایک عورت ہوتی ہے اور دوسری وہ جس میں اس کا مرکزِ توجہ ایک جادو جمال اور سبزہ آغاز اَمرد ہوتا ہے۔ اصطلاح میں اس دوسری قسم کی غزل کو ''الغزل الغلامی'' کہتے ہیں اور ناقدین اس امر پر متفق ہیں کہ ابونواس کے کلام میں ''الغزل الغلامی'' نہ صرف مقدار میں زیادہ ہے، بلکہ معیار میں بھی پہلی قسم کی غزل کے مقابلے میں اعلیٰ و افضل ہے۔ ابونواس کی شاعری کا ایک اور موضوع ''شعوبیت'' ہے۔ یہ اس ردِ عمل کا نام ہے جو دورِ عباسی میں عجمی اور خاص طور پر ایرانی قوموں میں عربوں کے قومی اور نسلی تفاخر کے خلاف بڑی شدت سے پیدا ہونے لگا تھا۔ ابونواس کو ماں کی طرف سے چونکہ ایران پسند رجحانات ملے تھے، جن کو بصرہ اور کوفہ کی سوسائٹی نے اور زیادہ محکم کر دیا تھا، اس لیے اس نے ادب اور شاعری کے میدان میں شعوبیت کا مظاہرہ کرتے ہوئے عربی قصیدے کی ہیئت اور اس میں شامل بعض موضوعات کا مذاق اڑایا۔ خاص طور پر قصیدے کی یہ روایت کہ اس کے آغاز میں شاعر محبوبہ کے چھوڑے ہوئے کھنڈرات پر کھڑے ہو کر آنسو بہاتا ہے، اس کے تمسخر کا خاص نشانہ بنی اور اس نے اس کے بارے میں کہا:

قل لمن یبکی علی رسمٍ درَس  واقفاً، ما ضرّ لو کان جلس

(وہ شاعر جو ایک ویرانے کے سامنے ''کھڑے ہو کر'' روتا آیا ہے، اس سے کہو کیا مضایقہ تھا اگر وہ بھی بیٹھ بھی جاتا۔)

پھر وہ عرب شعراء سے کہتا ہے: یہ تم کیا سلمیٰ، لُبنیٰ اور خنس کے پیچھے اپنی جان ہلکان کیے دے رہے ہو۔ چھوڑو سلمیٰ کو اور اس کی ویران حویلیوں کو اور کرخ میں کشید کی ہوئی اُس مے سے اپنی صبح کا آغاز کرو جس میں ایک شعلہ سا دہکتا ہے۔

مذہب کے معاملے میں ابونواس کہیں آزاد خیال ہے، کہیں غیر سنجیدہ اور کہیں ان عقائد و ایمانیات کا سرے سے منکر دکھائی دیتا ہے۔ اس موضوع پر اس کے اشعار دراصل اس کی مختلف مزاجی کیفیتوں یا خاص موقعوں اور مناسبتوں کی پیداوار ہیں۔ لیکن ان کے ساتھ ساتھ ایک اور رویہ جو اتنی ہی تکرار کے ساتھ اس کے کلام میں دیکھنے میں آتا ہے وہ اُس کا عفوِ خداوندی پر محکم ایمان ہے۔ واعظ، محتسب کے ساتھ اس کی ساری نزاع اس بات پر ہے کہ وہ لوگوں کو خدا کے عذاب سے کیوں ڈراتا ہے۔ اس کی بے پایاں رحمتوں کی امید کیوں نہیں دلاتا۔

یہ وہ چند موضوعات ہیں، یعنی شراب، معاملاتِ حسن و عشق، شعوبیت، مذہب کے بارے میں آزادہ روی اور عفوِ خداوندی پر ایمان، جو ابونواس کے کلام میں مرکزی حیثیت رکھتے ہیں۔ لیکن ان کے علاوہ اس نے مدح، ہجو اور شکاریات کے باب میں بھی بہت کچھ کہا ہے۔ ابونواس کا دیوان اس عربی ادب کی اوّلیں مثال ہے جس میں شکار کے متعلق نظموں (طردیات) کا ایک خاص باب شامل ہے۔ ان نظموں میں زیادہ تر شکاری کتوں، بازوں اور گھوڑوں اور اس کے ساتھ ساتھ شکار کیے جانے والے مختلف جانوروں کا بیان ہے۔ یہ سب کچھ رنگینی اور لطافتِ بیان کے اعتبار سے قابلِ توجہ ہے۔ جانوروں کے متعلق اُن بیانات میں جو قدیم عربی شاعری میں موجود ہیں ابونواس کو اس صنفِ سخن کے نمونے مل سکتے تھے۔ لیکن بظاہر اس نے اسے ایک مستقل صنف بنا دیا تھا۔ بعد میں ابن المعتز نے اس صنفِ شاعری کو مزید ترقی دی۔

**نمونۂ کلام:** اتفاق سے ابونواس کے دیوان کی سب سے پہلی نظم اس کے اسلوب کی ایک اعلیٰ جامع اور نمائندہ نظم ہے کہ مذکورہ بالا سب موضوعات ایک ہی نظم کے اندر سمٹ آئے ہیں۔ وہ اپنی محبت کے بارے میں اپنا دفاع کرتا ہے اور آخر میں معتزلی نظّام سے کہتا ہے کہ وہ خدا کی مغفرت کے بارے میں اتنے تشدد کا رویہ نہ رکھے، کہ یہ بات دین کے خلاف ہے۔

دع عنک لومی فان اللوم اغراء　　و داونی بالتی کانت هی الداء
صفراء لا تنزل الاحزانُ ساحتها　　لو مسّها حجر مسّته سرّاءُ
من کف ذاتِ حرٍ فی زیّ ذی ذکر　　لها محبّان: لوطیٌّ و زنّاء
قامت بابریقها، واللیل معتکر　　فلاح من وجهها فی البیت لألاء


Scanned with CamScanner

فارسلت من فم الا بريق صافيةً ‏ كانما اخذها بالعين اغفاء

رقّت عن الماء حتى ما يلائمها ‏ لطافةً و جفا عن شكلها الماء

فلو مزجت بها نوراً لمازجها ‏ حتى تولّد انوار و اضواء

دارت على فتية دان الزمان لهم ‏ فما يُصيبهم الا بما شاؤ وا

لتلك ابكى ولا ابكى لمنزلة ‏ كانت تحلّ بها هند و اسماء

حاشا لدرة ان تبنى الخيام لها ‏ وان تروح عليها الابل و الشاء

فقل لمن يدّعى فى العلم فلسفةً ‏ حفظت شيئاً و غابت عنك اشياء

لا تحظر العفوَ ان كنت امرأ حرجا ‏ فان حظركه بالدين.ازراء

(مجھے ملامت نہ کرو کہ ملامت آتشِ شوق کو بھڑکاتی ہے۔ میرا درماں اسی چیز سے کرو جو میرے لیے روگ بنی تھی۔

وہ زیتون رنگ، جس کے آنگن میں غموں کا نزول نہیں ہوتا' اگر اسے پتھر بھی چھو لے تو فرطِ طرب میں جھومنے لگے۔

میں نے اسے ایک ایسی دوشیزہ کے ہاتھ سے لیا جس کا اندام تو زنانہ تھا' لیکن جس نے لباس مردانہ زیب تن کیا تھا۔

چنانچہ اس کے عشاق دونوں طرح کے تھے : لڑکوں کا شوق رکھنے والے بھی اور عورتوں سے مطلب رکھنے والے بھی۔

وہ جب صراحی لے کر اٹھی تو رات اندھیری پڑ چکی تھی' لیکن اس کے رُخِ زیبا سے سارے آنگن میں ایک "چانن" ہو رہا تھا۔

صراحی کے منہ سے وہ ایسی شفاف چیز انڈیل رہی تھی کہ اسے محض ٹکٹکی لگا کر دیکھنے سے ہی انسان بے خود ہوا جاتا تھا۔

پانی کے مقابلے میں وہ ایک شیِ لطیف تھی' جبھی ان دونوں کا امتزاج نہیں ہو سکتا تھا اور پانی اس سے الگ دکھائی دیتا تھا۔

ہاں اگر تم اس میں سورج کی کرن ملاتے تو وہ حل ہو جاتی اور پھر اس مرکب سے نور کا سیلاب بہہ نکلتا۔

اس نے وہ شراب ان نجیلے نوجوانوں کو پیش کی جنھوں نے زمانے کو اپنے تابع کیا تھا' چنانچہ زمانہ ان سے اسی طرح پیش آتا جس طرح وہ چاہتے۔

(اے شاعرِ بادیہ) میں ایسی ہی کسی چیز کے لیے روتا ہوں' نہ کہ اس حویلی کے لیے جس میں کبھی ہند اور اسماء رہتی تھیں۔

اس ذِرخوش آب (شراب) کو خدا اس دن سے بچائے کہ اس کی خاطر بدو آ کر خیمے لگائیں اور اس کے دائیں بائیں اونٹ اور بکریاں منڈلاتی پھریں۔
وہ شخص جسے علم میں بڑی گہرائی کا دعویٰ ہے اس سے کہو: تم نے ایک چیز تو یاد رکھی اور بہت سی چیزوں سے بے خبر رہے۔ اگر تمہارا اپنا دل تنگ ہے تو عفوِ خداوندی کا راستہ تو نہ روکو۔ اس لیے کہ عفو کا راستہ روکنا دین کی بے قدری کرنا ہے۔)

ابونواس ایران میں ساباط کے مقام پر ایک قیام گاہ کو یاد کرتا ہے جہاں شاعر سے کچھ عرصہ پہلے ایرانی دوستوں کی ایک ٹولی آ کر رہی تھی۔ ابونواس جب وہاں سے گزرا تو وہ بھی اپنے دوستوں کے ساتھ تھا اور انہیں روک کر اس نے چند دن وہاں قیام کیا تھا۔ چنانچہ اس حویلی کے بارے میں کہتا ہے:

| | |
|---|---|
| و دار نَدَامی عطَّلوها وأدلجوا | بها اثر منهم جديد و دارسُ |
| مَسَاحب من جرّ الزقاق على الثرى | واضغاث ريحان : جنيّ و يابس |
| حبستُ بها صحبي فجدّدت عهدَهم | واني على امثال تلك لحابسُ |
| ولم أدرِ منهم غير ما شهدَت به | بشرقي ساباط الديار البسابسُ |
| أقمنا بها يوماً و يومين بعده | ويوم له يوم الترحُّل خامسُ |
| تدار علينا الراح في عسجدية | حبتها بانواع التصاوير فارسُ |
| قرار تها كسرى و في جَنَباتها | مهىً تدّريها بالقسي الفوارسُ |
| فللخمر ما زُرّت عليه جيوبهم | و للماء ما دارت عليه القلانس |

(قسم اُس حویلی یارانِ مے کی' جس میں سے انہوں نے اپنا سامان لپیٹا اور رات کو نکل کھڑے ہوئے لیکن ان کے نشان' نئے اور پرانے' وہاں باقی تھے۔
زمین پر شراب کے مٹکوں کی گھسیٹن اور پھولوں کی بکھری ہوئی پتیاں' جن میں سے کچھ سوکھ گئی تھیں اور کچھ نرم تھیں۔
میں نے اپنے دوستوں کو وہاں روک لیا اور ان جانے والے احباب کی یاد تازہ کی اور ایسی جگہوں پر میں ہمیشہ اپنے ساتھیوں کو روک لیا کرتا ہوں۔
ان کوچ کرنے والوں کے متعلق مجھے کچھ معلوم نہ ہو سکا' سوائے ان شہادتوں کے جو ساباط کے مشرق میں کھڑا یہ تنہا مکان اُن کے بارے میں دے رہا تھا۔
ہم وہاں ایک دن ٹھہرے اور اس کے بعد دو دن اور' پھر ایک اور دن کہ اس کے بعد ہماری روانگی کا دن پانچواں تھا۔

وہاں شراب ہمیں سونے کے گلاس میں پیش کی جاتی' جس پر ایرانی فن کاروں نے بوقلموں تصویریں نقش کی تھیں۔
جام کے پیندے میں کسریٰ تھا' اور اس کی دیواروں پر بھاگتے ہوئے ہرن تھے اور ان کے تعاقب میں نیزے تانے ہوئے سوار
اس گلاس کو جب بھرا جاتا تو ان سواروں کے گریبانوں تک تو شراب ہوتی اور اوپر ان کے کلاہوں تک پانی!)

عشق و محبت کے بارے میں اپنے رویے پر بات کرتے ہوئے ابونواس کہتا ہے :

انی عشقتُ وما بالعشق من باس — مامرٌ' مثل الهوی' شیئ علی رأسی
مالی و للناس' کم یلحوننی سفهاً — دینی لنفسی و دین الناس للناس
ما للعُداة اذا مازُرتُ مالکتی — کأنّ اُوجههم تُطلَیٰ بانقاس
الله یعلم ما ترکی زیارتکم — الا مخافة اعدائی و حرّاسی
ولو قدرتُ علی الاتیان جئتکمُ — سیعاً علی الوجه أو مشیاً علی الرأس
و قد قرأت کتاباً من صحائفکم — لا یرحم الله الّا راحم الناس

(میں نے عشق کیا اور عشق کرنا کوئی بُری چیز نہیں ہے۔ اس محبت جیسا تجربہ مجھے زندگی میں اور کسی چیز کا نہیں ہوا۔
مجھے لوگوں سے کیا سروکار اور وہ کیسی نادانی سے مجھے ملامت کرتے ہیں۔ میرا دین وایمان میرے لیے ہے اور لوگوں کا ان کے لیے۔
میرے دشمنوں کو کیا ہوا ہے کہ جب میں اپنی مالکہ سے ملتا ہوں تو ان کے چہرے یوں ہو جاتے ہیں جیسے ان پر سیاہی پھر گئی ہو۔
اللہ جانتا ہے کہ میں نے آپ کی طرف آنا اپنے دشمنوں اور دربانوں کے ڈر کی وجہ سے چھوڑا ہے۔
اگر میں آپ کی طرف آسکتا تو منہ کے بل بھاگ کے یا سر کے بل چل کے آتا۔
میں نے آپ کے آسمانی صحیفوں میں پڑھا ہے کہ جو شخص لوگوں پر رحم نہیں کرتا' اللہ بھی اس پر رحم نہیں کرتا۔)

اپنے دوست خلیفہ امین کی موت پر اس نے چند اشعار کا مرثیہ کہا جو اس کے خلوص کا آئینہ دار ہے :

طویٰ الموتُ ما بینی و بین محمد — ولیس لما تطوی المنیّة ناشر


Scanned with CamScanner

فلا وصلَ الاعبرة تستديمها — احاديث نفس ' مالها' الدهر' ذاكر
وكنت عليه احذر الموت وحده — فلم يبق لي شيئي عليه احاذرُ
لئن عُمرتْ دُور بمن لا احبّه — لقد عُمرت ممّن احبّ مقابرُ

(موت نے میرے اور محمد کے درمیان سب کچھ لپیٹ دیا۔ جسے موت لپیٹ دے اسے کوئی کھولنے والا نہیں ہے۔
اس کے ساتھ ملنے کی کوئی صورت نہیں سوائے آنسو کے' جسے دل کی وہ باتیں سنبھال کے رکھتی ہیں جن کا اب کوئی ذکر کرنے والا نہیں'
میں اس کے معاملے میں صرف موت سے ڈرتا تھا' اب کوئی چیز ایسی نہ رہی جس سے میں اس کے معاملے میں ڈروں۔
گھر اگر ان لوگوں سے آباد ہیں جن سے مجھے کوئی رغبت نہیں ہے' تو جن سے میں محبت کرتا ہوں ان سے اب قبریں آباد ہو گئی ہیں۔)

ابونواس سمجھتا تھا کہ اس زندگی کے بعد کسی نہ کسی شکل میں دوسری زندگی بھی ہو گی اور اگر اس میں خدا کی بخشش نصیب نہ ہوئی تو بڑی محرومی کی بات ہو گی۔ چنانچہ وہ اس بخشش کے لیے خدا سے دُعا کرتا ہے:

یارَبّ ان عظمت ذنوبی کثرة — فلقد علمتُ ان عفوک اعظم
ان کان لا یرجوک الا محسن — فبمن یلوذ و یستجیر المجرم؟
ادعوک ربّ کما اُمرت تضرّعا — فاذا رددت یدی فمن ذا یرحم؟
مالی الیک وسیلة الاّ الرجا — وجمیل عفوک' ثم انی مُسلم

(اے رب' اگرچہ میرے گناہ تعداد میں بہت زیادہ ہیں' لیکن میں جانتا ہوں کہ تیرا عفو ان سے بھی بڑھ کر ہے۔
اگر تیری بخشش کی امید صرف ایک نیکوکار ہی کو ہو تو ایک خطا کار کس کا دامن تھامے' کہاں پناہ ڈھونڈے؟
میرے رب' میں تجھے اسی طرح گڑگڑا کر پکارتا ہوں جیسا تو نے حکم دیا ہے' لیکن اگر تو نے ہی میرا ہاتھ جھٹک دیا تو اور کون مجھ پر رحم کھائے گا۔
تیرے حضور میرا ایک ہی وسیلہ ہے' امید کا اور تیرے حسن مغفرت کا۔ پھر یہ کہ میں جیسا بھی ہوں ایک مسلمان ہوں۔)

ابونواس کے دیوان کے آخری حصے میں ایک چھوٹی سی نظم ہے جو اس نے اپنے آخری ایّام میں کہا

تھی۔ اس نظم کو پڑھ کر لگتا ہے کہ اس نے بالآخر موت کے آگے ہتھیار ڈال دیئے تھے اور ایک نحیف اور حسرت بھرے لہجے میں کہہ رہا تھا:

دبّ فيّ السقامُ سفلاً و علواً — وأراني اموت عضواً فعضواً
ليس تمضى من لحظة لي الاّ — نقصتني بمرّها فيّ جزءاً
ذهبت جدّتي بحاجة نفسي — و تطلّبتُ طاعة الله نضواً
قد أسأنا كلّ الاساءة فاللّهم — صفحاً عنا و غفراً و عفواً

(مرض میرے اندر اوپر نیچے تک سرایت کر گیا ہے اور میں اپنا جوڑ جوڑ مرتا ہوا دیکھ رہا ہوں۔
اب کوئی گھڑی ایسی نہیں گزرتی جو میرے وجود کو اس کے کسی جزو سے محروم نہ کر دے۔
نئی جوانی تھی تو اپنے نفس کی اطاعت میں گزرتی تھی' اب ناتواں ہوا ہوں تو خدا کی اطاعت یاد آئی ہے۔
ہم نے ساری ہی برائیاں کر ڈالی ہیں۔ اے اللہ اب تو تیرے عفو اور درگزر پر نظر ہے۔)

مرض الموت میں انسان جسمانی طور پر اور روحانی طور پر کیا محسوس کرتا ہے اور کس طرح سوچتا ہے' یہ چھوٹی سی نظم اس کا ایک سچا اور عمدہ بیان ہے۔

## ابن الرّومی (م ۸۹۶)

ابوالحسن علی بن العباس بن جرجیس نام اور کنیت ابن الرومی۔ اس کا باپ جرجیس جو عبیداللہ بن علی کا غلام تھا' رومی نسل کا تھا اور اس کی ماں ایرانی نسل سے تھی۔ اس لیے شاعر کی کنیت ابن الرومی پڑی اور وہ اسی نام سے مشہور ہوا۔ ابن الرومی بہت پُرگو اور موزوں طبع تھا۔ اس نے عربی شاعری میں کئی جدّتیں کیں اور اس میں نئے نئے معانی نکالے۔ ایک جدّت اس کی یہ تھی کہ اس نے اپنی طویل نظموں میں بھی موضوع کی وحدت برقرار رکھی' جو اس سے پہلے عربی شاعری میں نہیں دیکھی جاتی تھی۔ شاعری کی دوسری اصناف کے علاوہ اس نے ہجویں بھی کہیں جو بہت تیز و تند اور رسوا کرنے والی ہوتی تھیں۔

ابن الرومی بغداد میں پیدا ہوا اور وہیں پلا بڑھا اور علم و ادب میں ترقی کی' یہاں تک کہ شعر کہنے لگا اور اس میں نمایاں ہو گیا۔ اس نے اپنے ہم عصر خلفاء کے ساتھ کوئی زیادہ تعلق قائم نہ کیا اور ان میں سے صرف معتضد کی مدح کی۔ البتہ بعض وزراء اور فوج کے سرداروں کی تعریف میں اس نے شعر کہے۔ لیکن

ان میں سے کسی نے اسے اپنے قریب نہ کیا اور نہ اُسے انعامات سے نوازا۔ اس کی وجہ یہ کہ اس کا دماغ کچھ پھرا ہوا تھا' اور وہ کسی حد تک گستاخ اور بدزبان تھا۔ اخلاقاً وہ تنگ مزاج تھا اور ہمیشہ لوگوں سے کچھ نہ کچھ مانگتا رہتا تھا۔ چنانچہ اس کی زندگی مفلسی اور محرومی میں بسر ہوئی۔ اس نے سختیاں جھیلیں اور رزق کی تنگی دیکھی۔ وہ ہمیشہ کسی نہ کسی وہم میں مبتلا رہتا تھا۔ لوگوں سے اس کی زیادہ نہیں بنتی تھی اور ان کی مخالفت بھی وہ ٹھیک سے نہیں کر سکتا تھا۔ وہ ہر بات میں بدشگونی دیکھتا تھا اور اسے بہت سی چیزوں میں نحوست اور بدحالی نظر آتی تھی۔ وہ جب شکوہ کرتا تو لوگ اس کی باتوں سے بیزار ہو کر منہ موڑ لیتے اور جب وہ روتا تو لوگ اس کی حالت دیکھ کر مسکرا دیتے۔ اپنے ہم عصر لوگوں میں رہتے ہوئے اس نے اپنے آپ کو اور بھی زیادہ تنہا اور اجنبی محسوس کیا جب اس نے دیکھا کہ اس کا مزاج اور میلان ان لوگوں کے مزاج اور میلان سے اتنا مختلف ہے کہ وہ اسے سمجھ ہی نہیں پاتے اور نہ وہ اس کی شاعری سے لطف اندوز ہو سکتے ہیں۔ بات یہ تھی کہ اس کا ادبی اور شاعرانہ رویہ اُن لوگوں کے ادب اور شاعری سے مختلف تھا' اور اس کی شاعری کے دمکتے ہوئے رنگ ان کی شاعری کے پھیکے' پیلے رنگوں سے مختلف تھے۔ ان لوگوں کے مقابلے میں ابن الرومی نے زندگی کو ایک نئی نظر سے دیکھا اور فن شاعری میں ایسی چیز کا ادراک کیا جس کا ادراک اس سے پہلے کے شاعروں نے نہیں کیا تھا......اس کی طبیعت اور ذوق نے اُن سب باتوں سے بیزاری کا اظہار کیا جن کی ان لوگوں کو عادت پڑی ہوئی تھی۔ اس کے اس سارے رویّے کا نتیجہ یہ ہوا کہ نہ خلافت کے ایوانوں میں اس کی کوئی پذیرائی ہوئی اور نہ اس کے ساتھ کے لوگوں نے اس کی کوئی زیادہ عزت و توقیر کی۔ یہاں تک کہ اس کی شاعری میں بھی وہ نقائص دیکھنے لگے اور اس کے ساتھ حقارت کا برتاؤ رکھا۔ یہ دیکھ کر ابن الرومی نے بالآخر فطرت (Nature) میں جا کے پناہ لی اور اس کے آزاد ماحول میں اس نے امن و سکون تلاش کیا۔ اس نے شاعر کی نظر سے نیچر کو یوں دیکھا جیسے وہ کوئی زندہ وجود ہو جس کا دل دھڑکتا ہو اور اس میں انسانیت کی روح آتی جاتی ہو اور وہ مختلف جذبات سے بھی دوچار ہوتی ہو۔ چنانچہ اس نے اپنے شعروں میں نیچر کی ایسی ہی تصویریں پیش کیں کہ مثلاً جب سورج غروب ہونے لگتا ہے تو چمن کے پھول اداس ہو جاتے ہیں اور زمین بعض دفعہ ایسا سنگھار کرتی ہے جیسے کوئی عورت سنگھار کر کے بیٹھے اور قدرت کی اس بے کراں وسعت میں کیسی کیسی آوازیں اور کیسے کیسے نغمے سنائی دیتے ہیں۔ ابن الرومی نے اس زندہ' دھڑکتی ہوئی فطرت کے نغمے گائے اور اس کی ایسی ایسی تصویریں پیش کیں کہ وہ فطرت کا ایک بے مثال شاعر بن گیا۔

ابن الرومی کی توہّم پرستی اور فال اور شگون میں اعتقاد کے قصے بہت مشہور ہیں۔ بعض لوگوں کا خیال ہے کہ اس کی اس توہّم پرستی اور شگون گیری کی وجہ اس کی اعصابی کمزوری تھی۔ وہ کھانے پینے کے

معاملات میں حریص اور پُر خور تھا۔ اسے اپنے گھر سے محبت تھی، مگر صاف ستھرا رہنے کی عادت نہ تھی۔ وہ عموماً میلا کچیلا رہتا اور اپنے گنجے پن کو چھپانے کے لیے ہر وقت پگڑی باندھے رہتا تھا۔ ابن الرومی مذہباً شیعہ تھا۔ اس کے اشعار میں اس کے عہد کی فکری ونظری تحریکوں مثلاً اعتزال، عدل وتوحید، قدر واختیار وغیرہ کے اشارات بھی موجود ہیں۔ جب اس کے دین وعقائد کو مشکوک نگاہوں سے دیکھا گیا تو اس نے چند اشعار میں توحید ورسالت پر ایمان کا اقرار کیا۔

ابن الرومی بڑا قادر الکلام اور پُر گو شاعر تھا۔ اسے غزل، مدح، ہجو، وصف وغیرہ اصناف سخن پر قدرت تھی۔ وہ اپنے عہد کا ممتاز ترین ہجو گو تھا۔ اس کی ہجو میں طوالت اور فحش نمایاں ہیں۔ لیکن اس کی مدح بلحاظ معیار اور کثرت اس کی ہجو پر فوقیت رکھتی ہے۔ بحتری جیسا شاعر بھی اس کی ہجو سے نہ بچ سکا، اگرچہ بعد میں اس نے اس کے ساتھ خوشگوار مراسم قائم کر لیے۔ ابن الرومی بڑے لمبے لمبے قصائد کہتا تھا، جن میں سے بعض تو تین سو سے بھی زائد اشعار پر مشتمل ہیں۔

ابن الرومی کی طبیعت میں بڑی اپج تھی۔ وہ معانی وافکار کی تولید وتخلیق اور اختراع میں بے نظیر شاعر تھا۔ الفاظ پر وہ معانی کو ترجیح دیتا تھا۔ عربی شاعری میں وہ منفرد حیثیت کا مالک ہے۔ اس کے الفاظ تو عربی ہیں، لیکن طبیعت ومزاج اور معانی وافکار سب غیر عربی ہیں۔ اس کے ہاں عجیب وغریب اشعار، نادر معانی اور نئے افکار کی کثرت ہے۔ اس کی شاعری کا ایک پہلو ہزل گوئی اور تمسخر بھی ہے۔ وہ شاعری میں مصوّری کرتا ہے اور الفاظ سے ایسی تصویر کشی اور رنگ آمیزی کرتا ہے جو حقیقی رنگوں اور شکلوں کو مات کر دیتی ہے۔ اس کی شاعری کی نمایاں خصوصیتیں جن کا اوپر ذکر ہوا، دو ہیں: ایک یہ کہ اس کے ہاں ہر قصیدہ ایک وحدت ہے، جس کے اشعار میں معنوی تسلسل موجود ہے، اور دوسرے یہ کہ وہ مناظرِ قدرت کا دلدادہ اور فطرت نگار شاعر ہے اور کائنات کی ہر حسین چیز کو پسند کرتا ہے۔

ابن الرومی کی شاعری کی ان گوناگوں خوبیوں کے باوجود اس کے تفصیلی حالات بہت کم ملتے ہیں۔ اس کے ایک دوست اور ایک ہم عصر نے اس کی زندگی کے حالات لکھے تھے، لیکن یہ دونوں کتابیں محفوظ نہ رہ سکیں۔ چنانچہ ابن الرومی کی زندگی کے حالات اس کی شاعری سے ہی اخذ ہوتے ہیں۔

ابن الرومی اپنے شعروں میں الفاظ سے زیادہ معانی کو اہمیت دیتا تھا۔ الفاظ سے اس کی بے اعتنائی نے اس کی شاعری کو عموماً خشک اور بے کیف بنا دیا اور اس میں وہ رونق اور غنائیت نہ رہی جو اس دور کے شعراء کے کلام میں ملتی ہے۔

خلیفہ معتضد کا وزیر ابوالحسین القاسم ابن الرومی کی ہجو سے ہمیشہ خائف رہتا تھا۔ کہتے ہیں کہ اس نے شاعر کے شر سے بچنے کے لیے اس کے کیک میں زہر ملا دیا۔ جب شاعر کو اس کا احساس ہوا تو وہ اٹھ کر

چل پڑا۔ وزیر نے کہا: کہاں جاتے ہو؟ ابن الرومی نے کہا: وہیں جہاں آپ مجھے بھیجنا چاہتے ہیں۔ اس کے بعد وہ اپنے گھر میں ہی رہا۔ بعض اہل تحقیق کے نزدیک اس کی موت کا باعث یہ ہوا کہ ایک طبیب نے غلطی سے بلاضرورت فصد کھول کر اس کی بیماری کو اتنا بڑھا دیا کہ وہ بالآخر اس کی موت کا باعث بن گئی۔ اس واقعے کی طرف اس کے ان شعروں میں اشارہ ملتا ہے۔

غلط الطبیب علیّ غلطةَ مُورد　　عجزت موارده عن الاصدار

والناس یلحون الطبیب و انما　　غلط الطبیب اصابة الاقدار

(طبیب نے میرے معاملے میں ایک غلط چیز لانے والے کی غلطی کی۔ اس نے جو جتن کیے ان کا کوئی نتیجہ برآمد نہ ہوا۔

لوگ ناحق طبیب کو ملامت کرتے ہیں، حالانکہ طبیب کی غلطی تو مقدر کی وجہ سے تھی۔)

نمونۂ کلام: ابن الرومی ایک نانبائی کو روٹیاں لگاتے ہوئے دیکھ کر اس کی تصویر اس طرح کھینچتا ہے۔

ما انس لا انس خبازاً مررتُ به　　یدحو الرقاقة مثل اللمح للبصر

مابین رویتها فی کفه کُرةً　　وبین رویتها قوراء کالقمر

الا بمقدار ما تنداح دائرة　　فی لجة الماء یُلقی فیه بالحجر

(میں ایک نانبائی کو کبھی نہ بھولوں گا جس کے پاس سے میں ایک دفعہ گزرا تھا۔ وہ آٹے کا پیڑا پل جھپکنے میں پھیلا لیتا تھا۔

اس پیڑے کے اس کے ہاتھ میں گیند کی طرح ہونے اور پھر اس کے چاند کی طرح گول ہو جانے میں بس اتنی دیر لگتی تھی۔

جتنی پانی کے تالاب میں پتھر ڈالیں تو اس کا دائرہ پھیلنے میں لگتی ہے۔)

ایک خوبصورت قدرتی منظر میں وہ زمین کے حُسن کو اس طرح بیان کرتا ہے:

أصبحت الدنیا تروق من نظر　　بمنظرٍ فیه جلاء للبصر

أثنت علی الله بآلاء المطر　　فالارض فی روض کافواف الحِبر

نیّرة النُّوّار، زهراء الزهر　　تبرّجت بعد حیاء و خفر

(دنیا ایسی ہوگئی کہ جو بھی دیکھتا اسے دلآویز لگتی، اس کا منظر ایسا تھا کہ اس سے آنکھیں روشن ہوتی



Scanned with CamScanner

تھیں۔
زمین نے اللہ کی ثنا کی کہ اس نے بارش کی نعمتیں عطا کیں، چمن میں زمین یوں لگ رہی تھی جیسے دھاری دار چادریں بچھی ہوں۔
اس کے سفید پھول چمکتے تھے، اس کے گلاب روشن تھے، زمین نے حیا اور شرم کو ایک طرف رکھ کر سنگھار کر لیا تھا، ایسا سنگھار جو ایک عورت مرد کے لیے کرتی ہے۔)

غروب ہوتے ہوئے سورج کے بیان میں اپنی ایک طویل نظم میں کہتا ہے:

وقد رنّقتْ شمس الاصيل و نفَّضت　　على الافق الغربىّ و رساً مُذَعذعا
ودَّعت الدنيا لتقضى نحبها　　وشوّل باقى عمرها فتشَعْشَعا
ولاحظت النُوّار و هى مريضة　　و قد وضعت خدّا الى الارض أضرعا
كما لاحظت عُوّادُه عينَ مدنَف　　توجّع من أوصابه ما توجّعا
وظلت عيون النّور تخضلّ بالنّدَى　　كما اغرورقت عين الشجىّ لتدمعا
وبيّن اغضاء الفراق عليهما　　كأنهما خلاّ صفاءٍ تودّعا
وقد ضربت فى خضرة الروض صفرة　　من الشمس فا خضرّا خضراراً مُشعشعا
واذكى نسيم الروض ريعان ظلّه　　و غنّى مغنّى الطير فيه، فسجّعا

(شام کے وقت کا سورج پیلا پڑ گیا اور مغربی افق پر اس نے زعفران کے پھول بکھیر دیے
دنیا کو اس نے الوداع کہا کہ آخری سانس لے لے اور اس کی تھوڑی سی عمر جو باقی رہ گئی تھی وہ بھی تمام ہوئی۔
اس نے سفید پھول کو دیکھا جو بیمار تھا اور اپنا گال عاجزی کے ساتھ زمین پر ٹکا دیا تھا۔
جیسے ایک بیمار کی آنکھ کو اس کی عیادت کرنے والے دیکھیں، جو اپنے درد کی وجہ سے کراہتا ہو۔
سفید پھول کی آنکھیں شبنم سے بھیگ گئیں، جیسے ایک غم کے مارے کی آنکھ رونے کے لیے بھر آئے۔
جدا ہونے کا اندھیارا ان دونوں (سورج اور دنیا) پر چھا گیا، گویا وہ باوفا دوست تھے جو ایک دوسرے کو رخصت کرنے لگے تھے۔
باغ کے سبزے میں جب سورج کی زردی ملی تھی تو ایک ایسا مخلوط رنگ بن گیا جس میں سبزی بھی تھی اور پیلاہٹ بھی۔
اور چمن کی بادِ نسیم نے اس کے سائے کو معطر کر دیا اور گانے والے پرندے نے اپنی خاص تال کے ساتھ گانا شروع کر دیا۔)

معاملاتِ حسن و عشق (غزل) کے باب میں ابن الرومی مغنیّہ وحید کے بارے میں کہتا ہے۔

يـا خـلـيـلّي! تيـمّتني وحيدُ — ففـؤادي بهـا مـعنّىً عميد
غـادةٌ' زانهـا من الـغـصـن قدّ — ومـن الـظبي مُقلتان وجيدُ
و زهاها من فرعها ومن الخدّين — ذاک الـسـواد والتـوريـد
فهـي بـردٌ بـخـدّهـا و سلام — وهـي لـلـعـاشـقين جهد جهيد
وغـريـر بـحسنها قال : صفها — قـلـت : امـران بيّن و شديد
يسهل القول انها أحسن الاشياء — طُـرا' ويـصـعـب التحديد
تتـجـلّى لـلـنـاظرين اليهـا — فشـقـيّ بـحسنهـا و سعيد

(دوستو! مجھے تو وحید نے اپنا بندۂ بے دام بنا لیا' اب میرا دل تکلیف میں ہے اور ملول ہے۔
نرم و نازک لڑکی' جس نے اپنے قد کا حسن شاخ سے لیا ہے اور اپنی آنکھوں اور گردن کا حسن ہرن سے۔
اور اس میں غرور پیدا کر دیا ہے اس کے بالوں کی سیاہی اور اس کے گالوں کے گلابی رنگ نے۔
پس جب وہ اپنا چہرہ سامنے کرے تو ٹھنڈک اور سلامتی ہوتی ہے' ویسے وہ عاشقوں کے لیے ایک تھکا دینے والی مشقت ہے۔
اس کے حسن کے ایک متوالے نے پوچھا: اس کا وصف تو بیان کرو۔ میں نے کہا دو چیزیں ہیں: ایک واضح ہے اور دوسری مشکل ہے۔
یہ کہنا تو آسان ہے کہ وہ تمام چیزوں سے زیادہ حسین ہے۔ لیکن وہ کس طرح حسین ہے اس کی تحدید نہیں کی جا سکتی۔
وہ اپنے دیکھنے والوں کے سامنے آتی ہے' تو بعض لوگ تو اس کے حسن کو دیکھ کر اپنے آپ کو نامراد محسوس کرتے ہیں اور دوسرے اپنے آپ کو خوش قسمت خیال کرتے ہیں۔)

اپنے منجھلے بیٹے کے مرثیے میں ابن الرومی کہتا ہے:

بكـاؤ كـما يشفي وان كان لايُجدي — فـجـودا' فقد أودى نظير كما عندى
تـوخـيّ حـمام الموت أوسط صبيتي — فلـلـه كيف اختـار واسطة العقد
طواه الـرّدى عنّـى فـأضحى مزارُه — بـعيداً عـلـى قـربٍ' قـريـباً على بُعد
ألـحّ عـلـيـه الـنـزف حتـى أحـالـه — الـى صـفـرة الجادى عن حمرة الورد
سـأ سـقيـک مـاء العين ما أسعدت به — وان كـانت السقيا من العين لاتجدى

محمدُ! ما شیئ توهّم سلوۃً
لقلبی، الا زاد قلبی من الوجد

(اے آنکھو! تمہارا رونا کوئی فائدہ تو نہیں دیتا لیکن دل ہلکا کرتا ہے، تو آنسو بہاؤ کہ تمہاری طرح کا ایک پیارا مجھ سے چلا گیا۔

موت نے میرے بچوں میں سے درمیان والے کو لے لیا۔ خدا کے لیے! اس نے ہار کے درمیان کا موتی کیسے چن لیا۔

موت اس کو مجھ سے لے گئی، تو اس کی زیارت قُرب کے باوجود دور ہوگئی، اور دوری کے باوجود قریب ثابت ہوئی۔

اس کا اتنا بہت سا خون نکل گیا کہ اس نے گلاب جیسی سرخی کو زعفران کی زردی میں بدل دیا۔

میں اپنی آنکھوں کے پانی سے تمہیں سیراب کروں گا، اگرچہ آنسوؤں سے سیراب ہونا کسی کو فائدہ نہیں پہنچاتا۔

بیٹے محمد! کوئی بھی ایسی چیز نہیں جو میرے دل کے لیے تسلی کا باعث سمجھی گئی ہو، اور اس نے میرے دل کو اور زیادہ غمزدہ نہ کردیا ہو۔)

بحتری کی ہجو کرتے ہوئے ابن الرومی کہتا ہے:

قد قلتُ اذ نحلوہ الشعر : حاش لہ
ان البروک بہ أولی من الخبب

البحتری ذنوب الوجہ نعرفہ
وھل رأیت ذنوب الوجہ ذا أدب؟

قبحاً لاشیاء یأتی البحتری بہا
من شعرہ الغثّ، بعد الکدّ و التّعب

کانما حین یُصغی السامعُون لہ
ممّن یمیّز بین النبع و الغَرب

رُقی العقارب او ھذر البناۃ اذا
أضحوا علی شعف الجدر ان فی صخبِ

و قد یجی بخلطٍ، فالنحُّاس لہ
و لا وائل ما فیہ من الذھب

(جب انہوں نے بحتری سے شعر منسوب کیے تو میں نے کہا کہ اس کے لیے دوڑنے سے بیٹھ رہنا بہتر ہے۔

بحتری کے چہرے پر، ہم جانتے ہیں، ڈاڑھی کی دُم ہے۔ کیا تم نے کسی دُم کے چہرے والے کو ادیب پایا ہے؟

کیا بُرے مضمون ہیں جو بحتری بڑی کوشش اور مشقت کے بعد اپنے بے مزہ شعروں میں لے کے آتا ہے۔

جب سننے والے اسے سنتے ہیں اور وہ اچھے بُرے کی پہچان رکھتے ہیں تو گویا اس کا کلام

بچھوؤں کے علاج کا کوئی منتر لگتا ہے' یا عمارتیں بنانے والے راج مزدوروں کا شور وشغب
بعض دفعہ وہ ملا جُلا کلام پیش کرتا ہے تو اس میں جو پیتل ہوتا ہے وہ اس کا ہوتا ہے اور جو سونا ہوتا
ہے وہ قدیم شاعروں کا ہوتا ہے۔)

اس نے شاعری میں جو نئے معانی پیدا کیے ان کا ایک نمونہ یہ ہے :

واذا امرؤ مدح امرأ لنواله — واطال فيه فقد اراد هجاءه
لولم يقدّر فيه بُعد المستقى — عند الورود لما أطال رشاءه

(اگر کسی نے کسی شخص کے عطیے پر اس کی تعریف کی اور اسے طول دیا تو گویا اس نے اس کی ہجو کہنی چاہی۔
اگر ممدوح کے پاس آ کر سیراب ہونے میں اتنی دیر نہ لگتی تو پانی لینے والا اپنی رسی کو اتنا طول نہ دیتا۔)

## ابن المعتز (م ۹۰۸)

امیر المومنین ابوالعباس عبداللہ' جو خلیفہ معتز باللہ کا بیٹا تھا' شاہی گھرانے اور خلافت کی آن بان میں پیدا ہوا۔ چنانچہ اس کی پرورش ناز ونعمت اور عزّت و شان کے ماحول میں ہوئی۔ وہ بڑا ہوا تو اس کی شخصیت میں بہت سی خوبیاں جمع ہوگئیں۔ وہ طبعًا شریف اور گہرا احساس رکھنے والا' خوبصورتی کا دلدادہ اور ادب اور موسیقی کا شوقین تھا۔ اس نے اپنے زمانے کے شیوخِ ادب مثلاً مبرّد اور ثعلب سے ادب میں تربیت حاصل کی اور منقول ومعقول علوم میں سے اکثر کی تحصیل کی۔ ادب اور خوش باشی کے مشاغل نے اسے محلاّتی سازشوں اور خلافت کی خواہشوں سے دُور رکھا۔ اس کے یہ چند اشعار اس کی شخصیت کے بارے میں بہت کچھ بتاتے ہیں۔

قليل هموم القلب الا للذّة — ينعّم نفساً آذنت بالتنقُّل
فان تطّلبه تقتنصه بحانة — والا ببستان و كرم مظلل
ولست تراه سائلا عن خليفة — ولا قائلاً من يُعزلون و من يلي
ولا صائحاً كالعير في يوم لذّة — يناظر في تفضيل عثمان أوعلي

(اس کے دل کے ارمان کم ہیں سوائے ایک لذت کے! وہ اپنے نفس کو جو حرکت اور سفر پر آمادہ

رہتا ہے خوش رکھتا ہے۔
اگر تو اس کی تلاش میں نکلے تو اسے ایک شراب خانے میں پائے گا' ورنہ ایک باغ میں' یا پھر انگور کی سایہ دار بیل کے نیچے۔
تو اسے کسی خلیفہ کے بارے میں سوال کرتا ہوا نہیں پائے گا' اور نہ یہ کہتا ہوا کہ کون معزول ہوئے اور کون ان کے بعد آیا۔
نہ ایک پُرلطف دن میں گدھے کی طرح آواز کرتے ہوئے اور اس سوال پر مناظرہ کرتے ہوئے کہ عثمان اور علی میں سے کون بہتر تھا۔)

لیکن اس کے ہوا خواہوں میں سے کچھ لوگوں نے جب خلیفہ مقتدر کو کمزور ہوتے اور ممالیک کو طاقت اپنے ہاتھ میں لیتے اور بُری سیاست کرتے ہوئے دیکھا تو انہوں نے اسے معزول کر دیا' اور اس کی جگہ ابن المعتز کو خلیفہ بنا دیا۔ لیکن اس کی خلافت ایک دن اور ایک رات سے زیادہ نہ چل سکی' اس لیے کہ مقتدر کے ساتھیوں نے اس کی شکست کو پسند نہ کیا اور ابن المعتز کے حامیوں اور مددگاروں کے خلاف جنگ کر کے مقتدر کو اپنی مسند پر واپس بٹھا دیا۔ خلیفہ ابن المعتز کو جب اس شکست کا پتا چلا تو وہ جصاص جوہری کے گھر میں روپوش ہو گیا۔ لیکن مخالفوں نے اسے ڈھونڈ نکالا اور خلیفہ مقتدر نے اسے اپنے خادم مونس کے حوالے کر دیا' جس نے اس کا گلا دبا کر اسے مار ڈالا۔ اور اس کی لاش کو ایک کپڑے میں بند کر کے اس کے اہل خانہ کو بھیج دیا۔

**شاعری:** ابن المعتز کی نشوونما جس ماحول میں ہوئی اس کا اثر اس کی شاعری پر نمایاں ہے۔ چنانچہ وہ آسان زبان اور نرم الفاظ استعمال کرتا ہے۔ اس کی طبیعت کی نرمی' حسنِ اخلاق اور صاف دلی کی وجہ سے اس کا اسلوب بہت واضح اور صاف ہے۔ اپنے شعروں میں وہ بلیغ استعارے اور خوبصورت تشبیہیں استعمال کرتا ہے' اور جس چیز کو بھی بیان کرتا ہے اس کی ہو بہو تصویر کھینچ کے رکھ دیتا ہے۔ اس کی وجہ یہ کہ ایک اعلیٰ تہذیبی ماحول کی وجہ سے اس کے ذہن میں خوبصورت چیزوں کے پیکروں اور نفیس خیالات اور تصورات کی ایک دنیا آباد تھی۔ ابن المعتز نے اپنی شاعری میں صنعتِ تشبیہ کو بہت برتا۔ چنانچہ وہ خود کہتا تھا کہ اگر میں ''جیسے'' کا لفظ بولوں اور اس کے بعد کوئی تشبیہ نہ لے آؤں تو خدا میری گویائی چھین لے۔ تشبیہ کے اس بکثرت استعمال نے اس کی شاعری میں تصنع کا رنگ پیدا کر دیا اور وہ روحانی سے زیادہ مادی چیز بن کے رہ گئی۔ پھر یہ کہ وہ اپنی نظم میں ایک موضوع تک محدود نہیں رہتا تھا۔ بلکہ اپنی طبع شاعر کو کھلی چھٹی دے دیتا تھا کہ ایک موضوع کو چھوڑ کر دوسرا اور پھر تیسرا موضوع اختیار کرتی چلی جائے۔ جب اس نے دیکھا کہ اس کے اندر وہ غیر معمولی شعری ملکہ (عبقریت) موجود نہیں ہے جس سے کام لے

کر وہ شاعری میں نئے نئے مضامین پیدا کر سکے' تو اس نے قدیم شعراء اور اپنے سے پہلے کے جدید شعراء کا طریقہ اپنانے کی کوشش کی۔ چنانچہ اس نے ویران آبادیوں' شکار کی تلاش اور گھوڑے اور بارش کے بیان (وصف) میں امرؤ القیس کو نمونہ بنایا اور شراب کے جام اور انگور کی بیل اور فرات کے پانیوں کے بیان میں اخطل کے نقشِ قدم پر چلا' اور مجالس ناؤ نوش اور شراب اور اس کے پیالوں اور شکار اور کتوں اور بازوں کے بیان میں اس نے ابونواس کی مثال سامنے رکھی۔ اگرچہ وہ ان شعراء میں سے جس کسی کی بھی پیروی کرتا تھا اس کے معیار اور مرتبے کو نہیں پہنچ پاتا تھا' تاہم وہ ان لوگوں سے جو کچھ بھی لیتا تھا' اسے اپنی خوبصورت تشبیہوں اور اچھی اور عمدہ تعبیروں سے بہت خوشنما چیز بنا دیتا تھا۔

ابن المعتز چونکہ اپنے لیے اور اپنے احساس کے اظہار کے لیے شعر کہتا تھا اور اسے کسی کی مدح یا ہجو کرنے کی ضرورت نہیں تھی اس لیے اس کی شاعری اس جھوٹ اور بناوٹ اور اس کم ظرفی اور اوچھے پن سے پاک ہے جو شاعروں کی مدح اور ہجو میں عام طور پر دیکھنے میں آتی ہے۔ اس کی شاعری میں اس کی جگہ فطرت (Nature) کے محاسن کا بیان ہے' مجالسِ دوستاں کا احوال ہے' شکار اور شکار کے جانوروں کے قصے ہیں' اور دوستوں اور ہم نشینوں کے ساتھ مراسلت ہے۔

ابن المعتز کو سلطنت کے کاروبار میں تو دلچسپی تھی نہیں' اس لیے اپنے خلیفہ بننے کے افسوسناک واقعے سے پہلے اسے متعدد کتابیں تصنیف کرنے کا موقع مل گیا۔ ادبی لحاظ سے تو اس کی اہم ترین تصنیف اس کا دیوان ہی ہے' جس کی تدوین سب سے پہلے ابوبکر محمد بن یحییٰ الصولی (م ۹۴۶ء) نے کی۔ ابن المعتز کا جو دیوان زمانہ قریب میں بیروت سے شائع ہوا' اس میں اس کی شاعری فخر' واردات عشق (غزل) مدح' ہجو' خمریات (شراب نوشی کے احوال) شکوہ شکایت' شکاریات' وصف و بیان' مرثیہ نگاری اور زہد و ادب کے سارے موضوعات کا احاطہ کرتی ہے۔

ابن المعتز کی نثر بھی اس کی شاعری سے کم نہیں تھی۔ چنانچہ اس کی تصانیف میں سب سے اہم ''کتاب البدیع'' ہے جو اس فن میں سب سے پہلی تصنیف سمجھی جاتی ہے۔ پھر اس کی کتاب ''مکاتبات الاخوان بالشعر'' نیز کتاب ''الجوارح والصید'' ہے۔ کتاب ''اشعار الملوک'' ہے اور کتاب ''طبقات الشعراء المحدثین'' ہے جو عربی ادبیات کی تاریخ میں بہت اہم ہے اور اس کے علاوہ کتاب ''الزھر والریاض'' ہے۔

نمونۂ کلام: ایک نظم میں شاعر اپنے دوست کے لیے اپنی وفا کا اظہار کرتا ہے:

وکم من خلیل لم امتّع بعهده ۔۔۔ وفیتُ له بالوُدّ فاجتاحه العُذر

فقدّمتُ صفحاً عنه یُوجب شکره ۔۔۔ وما کان لی منه جزاء ولا شکر

وذلک حظی من رجال أعزۃ | علیّ فان اھجرھم یکثر الھُجر
لھم خیر مالی حین یعتلّ مالھم | وسرعۃ نصری حین یعتذر النصر

(میرے کتنے دوست ہیں جن کے وعدوں سے میں فائدہ نہیں اُٹھا سکا۔ میں نے اپنی محبت کے ساتھ اس سے وفا کی' لیکن اس پر کوئی بہانہ غالب آ گیا۔
میں نے اس سے صرف نظر کیا جس پر اسے شکرگزار ہونا چاہیے تھا۔ لیکن اس کی طرف سے نہ کوئی بدلہ ملا' اور نہ شکریہ۔
جو لوگ مجھے عزیز ہیں ان کے ہاں میری قسمت یہی ہے اور اگر میں انہیں چھوڑ دوں تو میرے بارے میں بہت ناروا باتیں ہوں گی۔
جب ان کا مال کم پڑ جائے تو میرا سب سے اچھا مال انہی کا ہوتا ہے اور جب ان کو کہیں سے بھی مدد نہ ملے تو میری مدد فوراً انہیں ملتی ہے۔)

اپنے آپ پر فخر کرتے ہوئے ابن المعتز کہتا ہے:

لا اشرب الماء الا وھو منجرد | من القذی و لغیری الشّوبُ والرنقُ
عزمی حسام و قلبی لا یخالفہ | اذا تخاصم عزمُ المرء و الفَرَق
میتُ السرائر' ضحّاک علی حنق | مادام یعجز عن اعدائی الحنَق

(میں اُس وقت تک پانی نہیں پیتا جب تک وہ میل اور تنکوں سے پاک نہ ہو' جبکہ دوسرے میلا اور مخلوط پانی پیتے ہیں۔
میرا عزم تلوار کی طرح ہے اور میرا دل اس کے خلاف نہیں جاتا' جب انسان کے عزم اور ڈر کے درمیان کشمکش ہونے لگے۔
میں اپنے رازوں کو اپنے اندر دبا کے رکھتا ہوں اور غصے کی حالت میں قہقہے لگاتا ہوں' جبکہ میرے دشمن اس قابل ہی نہیں کہ ان کو کبھی غصہ آئے۔)

ابن المعتز کی عمدہ تشبیہات میں سے ہلال کے بارے میں اس کے یہ شعر ہیں:

أھلاً بفطر قد أنار ھلالُہ | فالأن فاغدُ الی المدام' و بکّرِ
وانظر الیہ کز ورقٍ من فضّۃ | قد أثقلتہ حمولۃٌ من عَنبر

(خوشا عید الفطر کہ اس کا ہلال چمک اُٹھا' اب تو جا اور شراب سے شغل کر اور کل سویرے نکل پڑنا۔
اس ہلال کی طرف تو دیکھو' جیسے چاندی کی کشتی ہو جس پر عنبر کا بوجھ لدا ہوا ہو۔)

اسی طرح کی ایک اور تشبیہ میں وہ کہتا ہے :

انظر الی حسن هلال بدا | یهتک من انواره الحندسا
کمنجل صیغ من فضّةٍ | یحصد من زهرا الدجی نرجسا

(نکلے ہوئے ہلال کے حسن کی طرف دیکھو جو اپنے نور سے اندھیرے کو دور کر رہا ہے۔
جیسے چاندی سے بنی ہوئی ایک درانتی' جو اندھیرے کے پھولوں میں سے نرگس کو کاٹ رہی ہے۔)

دیر عبدون کے راہب لوگوں کے لیے کہتا ہے :

سقی المطیرة ذاتَ الظلّ والشجر | و دیرَ عبدونَ هطّال من المطر
فطالما نبهّتنی للصبوح بها | فی غرّة الفجر' والعصفورُ لم یطر
اصوات رهبان دیر فی صلاتهم | سُود المدارع' نعارین فی السحر
مزنّرین علی الاوساط' قد جعلوا | علی الرؤوس اکالیلاً من الشعر

(موسلا دھار بارش سائے اور درختوں والی مطیرہ کی بستی اور دار عبدون کو سیراب کرے۔
کافی عرصہ' صبح کے وقت جبکہ پرندے ابھی آشیانوں میں ہوتے تھے مجھے صبح کی شراب کے لیے جگا دیتی تھیں۔
دیر میں عبادت کرتے ہوئے راہبوں کی آوازیں' جو سیاہ چغے پہنے صبح کے وقت بہت آہ و پکار کرتے تھے۔
وہ اپنی کمروں پر زُنّار باندھے ہوتے اور ان کے سروں پر اون سے بنے ہوئے تاج ہوتے)

خمریات کے باب میں ابن المعتزؔ کے چند اشعار :

هجم الشتاءُ و نحن بالبیداء | والقطر بلّ الارض بالانواء
فاشرب علی زهر الریاض' یشوبه | زهر الخدود' و زهرة الصهباء
من قهوة تُنسی الهموم و تبعث الشّوق | الذی قد ضلّ فی الاحشاء
تُخفی الزجاجة لونها فکأنّها | فی الکفّ' قائمة بغیر اناء

(جاڑوں کا موسم آیا تو ہم صحرا میں تھے اور بارش نے اپنی بوندوں سے زمین کو بھگو دیا تھا۔
ہم نے کہا تو پھر باغ کے پھولوں کو سامنے رکھ کر پیو' جن میں عارضوں کے گلاب اور شراب کی دمک ملی ہوئی ہے۔

ایک ایسی شراب جو غموں کو بھلا دیتی ہے اور اس شوق کو جگا دیتی ہے جو اندر کہیں دب کے رہ گیا ہے۔
شیشہ اس کے رنگ کو چھپا دیتا ہے اور وہ ہاتھ میں یوں لگتی ہے جیسے بغیر کسی جام کے قائم ہو۔)

معتضد کے وزیر ابوالقاسم عبیداللہ بن سلیمان کی موت پر شاعر کہتا ہے:

قد استوی الناس ومات الکمال — ونادت الایام : این الرجال
ھذا ابوالقاسم فی نعشہ — قوموا انظروا کیف تسیر الجبال

(لوگ ایک ہی قامت کے ہو کے رہ گئے ہیں اور کمال ختم ہو گیا ہے۔ زمانہ پکار اٹھا ہے کہ مردان کار کہاں ہیں۔
یہ ابوالقاسم ہے جس کی میت چلی جا رہی ہے' اٹھو دیکھو کہ پہاڑ کس طرح چلا کرتے ہیں۔)

## الشریف الرضی (م ۱۰۱۵)

ابوالحسن محمد بن الحسین الموسوی نے جس کا نسب امام موسیٰ کاظمؒ اور آگے حسین ابن علیؓ تک جاتا تھا' اپنی اس خاندانی نجابت کی وجہ سے الشریف الرضی الموسوی کا لقب پایا۔ وہ بغداد میں پیدا ہوا اور اپنے والد کے سایۂ عاطفت میں پروان چڑھا اور بچپن میں ہی کافی علم حاصل کر لیا۔ چنانچہ فقہ' علم فرائض اور لغت و نحو میں وہ عالم فاضل ہو گیا۔ وہ ابھی دس سال ہی کا تھا کہ اس نے شعر کہنے شروع کر دیئے اور جب اکتیس برس کا ہوا تو اپنے والد کی جگہ اشراف طالبیین کی نقابت کا منصب سنبھال لیا۔ پھر نقابت کے علاوہ وہ سارے امور بھی اس کے سپرد ہو گئے جنہیں اس کے والد سرانجام دیتے تھے' جن میں تنازعات کا فیصلہ کرنا اور لوگوں کے ساتھ حج کو جانا شامل تھے۔

وہ ایک عرصہ یہ امور سرانجام دیتا رہا' تا آنکہ خلیفہ القادر باللہ لوگوں کے اس الزام پر اس سے بدظن ہو گیا کہ اس کا جھکاؤ علوی فاطمی لوگوں کی طرف ہے۔ چنانچہ ان امور سے اسے فارغ کر دیا گیا اور اس نے باقی زندگی بڑی قناعت اور شرافت کے ساتھ گزاری اور ۱۰۱۵ میں انتقال کیا اور کرخ میں واقع اپنے گھر میں مدفون ہوا۔

الشریف الرضی بہت خوددار اور بلند حوصلہ انسان تھا۔ اس کے چہرے سے رعب و جلال ٹپکتا تھا۔ اس کا عزم تو اس سے یہ تقاضا کرتا تھا کہ وہ بہت اچھے اور اونچے کارنامے سرانجام دے۔ لیکن زمانے نے اسے ایسا کرنے میں کوئی مدد نہ کی۔ وہ اتنا راست باز تھا کہ اس نے کبھی کسی سے کوئی صلہ یا انعام نہ لیا۔



Scanned with CamScanner

اس کی یہ دیانت اور راست بازی یہاں تک پہنچی کہ اس نے وہ صلہ بھی لینے سے انکار کر دیا جو اس کے والد کو امراء اور حکام کی طرف سے ملا کرتا تھا۔ اسی طرح بنو بویہ نے بھی کوشش کی کہ وہ ان کی طرف سے صلہ کی رقوم قبول کرلے۔ لیکن وہ بھی اس میں کامیاب نہ ہوئے۔ الشریف الرضی نے اپنے ہاں ایک حویلی قائم کی جس کا نام اس نے "دارالعلم" رکھا۔ اس میں طلبہ پڑھنے کے لیے آتے تھے اور ان کی جو بھی مالی ضروریات ہوتی تھیں وہ شریف اپنی جیب سے پوری کرتا تھا۔

علوم میں اپنے تبحر اور اپنے تہذیبی شعور کے باوجود الشریف الرضی نے اپنی شاعری میں قدیم شعراء کا طرز اپنایا' جس میں الفاظ بلیغ و مؤثر اور معانی پُرشوکت ہوتے ہیں۔ چنانچہ اس کی شاعری بحتری کی شاعری سے کافی ملتی ہے۔ تاہم شریف کے ہاں فخر اور جوش و سرگرمی کا زیادہ غلبہ ہے' اور بحتری کی فضول گوئی اور بے شرمی سے اس کا کلام پاک ہے۔ ثعالبی کا کہنا ہے کہ "طالبیین میں اگرچہ کثرت سے شعراء ہوئے' لیکن وہ اگلے اور پچھلے سب شعراء سے بہتر شاعر ہے اور اگر میں یہ کہوں کہ وہ قریش کا سب سے بڑا شاعر ہے تو شاید میں حقیقت سے زیادہ دور نہیں ہوں گا۔" اس سے آگے وہ کہتا ہے۔ "اس زمانے کے شعراء میں' میں کسی ایسے شاعر کو نہیں جانتا جو شریف سے بہتر مرثیہ کہتا ہو۔" شریف کا شاعری میں تو اونچا مقام تھا ہی' اس کے ساتھ وہ نثر لکھنے پر بھی پوری طرح قادر تھا' اور مکتوب نگاری میں اسے خاص ملکہ حاصل تھا' اور اگر یہ صحیح ہے کہ حضرت علیؓ سے منسوب نہج البلاغہ کی تالیف میں اس کا ہاتھ تھا تو پھر یہ ماننا پڑے گا کہ وہ عربی نثر لکھنے والوں میں بہت اونچے مقام پر فائز تھا۔ اس لیے کہ قرآن اور حدیث کے بعد فصاحت و بلاغت میں نہج البلاغہ سے بہتر کوئی کتاب نہیں۔

الشریف الرضی کی جو تصانیف نثر میں ہیں' ان میں ایک کتاب معانی قرآن میں ہے اور دوسری قرآن کے مجازات میں۔ ان کے علاوہ اس کا ایک مجموعۂ مکاتیب ہے اور ایک شاعری کا دیوان۔ پھر کتاب نہج البلاغہ ہے۔ جو شریف نے حضرت علیؓ کے کلام سے مرتب کی۔ لوگوں کا خیال ہے کہ اس کا بڑا حصہ الشریف الرضی کے قلم سے ہے' اس لیے کہ اس میں صحابہ کے معاملے میں کچھ ناروا اور خلاف تہذیب زبان استعمال کی گئی ہے' نیز اس میں فلسفۂ اخلاق اور تمدن کے قوانین اور وصف و بیان کی نزاکت اور اظہار میں تکلف دیکھنے میں آتا ہے' جو اس زمانے کے مزاج کے ساتھ مطابقت نہیں رکھتے۔ اس لیے ظاہر ہے کہ الشریف الرضی نے جو کچھ بھی امام علیؓ سے منسوب تھا' چاہے وہ صحیح تھا یا مشکوک' لے کر اس کتاب میں جمع کر دیا۔

**نمونۂ کلام :** الشریف الرضی اپنی ایک نظم میں خلیفہ القادر باللہ کی تعریف کرتا ہے اور اس کی توجہ کا

ظاہر ہوتا ہے۔ یہ قصیدہ بحتری کے اس قصیدے کے انداز میں ہے جو اس نے خلیفہ متوکل کی مدح میں کہا:

للہ یومٌ اطلعتک بہ العُلی     عَلَماً یُزاول بالعیون و یُرشق

و برزت فی بُرد النبیّ و للھدی     نورٌ علی اسرار و جھک مُشرق

وکان دارک جنّۃ حصباؤھا     الجادیّ او انماطھا الاستبرق

فی موقف تُغضی العیونُ جلالۃً     فیہ ویعثر بالکلام المنطق

والناس اما راجع متھیّب     مما رأی، او طالع متشوّق

مالوا الیک محبّۃً فتجمّعوا     ورأوا علیک مھابۃً فتفرّقوا

ما بیننا یوم الفخار تفاوت     ابداً، کلانا فی المعالی مُعرق

الا الخلافۃ میّزتک، فاننی     انا عاطل منھا، وانت مطوّق

(کیسا دن تھا وہ جب رفعتوں نے تمہیں ایسا پرچم بنا کے ظاہر کیا جسے آنکھیں مسلسل دیکھتی رہیں۔
تو پیغمبر کی چادر میں ظاہر ہوا، تمہارے چہرے پر ہدایت کا چمکتا ہوا نور تھا۔
تمہارا گھر گویا جنت ہے جس کے سنگ ریزے زعفران ہیں اور جس کے غالیچے زربفت کے ہیں۔
تو ایسے مقام پر تھا کہ آنکھیں اس کی ہیبت سے جھکی جاتی تھیں اور بولنے میں زبان لڑکھڑاتی تھی۔
لوگوں میں کوئی ایسا تھا جو سامنے کا منظر دیکھ کر خوف سے پیچھے ہٹتا تھا اور کوئی ایسا تھا جو اسے دلچسپی سے دیکھے جاتا تھا۔
محبت کی وجہ سے تمہاری طرف مائل ہوئے تو جمع ہو گئے، لیکن جب انہوں نے تمہارے چہرے پر رُعب دیکھا تو منتشر ہو گئے۔
جب فخر کا موقع ہو تو ہمارے درمیان کوئی فرق نہیں ہوتا۔ ہم دونوں کارہائے نمایاں میں بڑا مقام رکھتے ہیں۔
سوائے خلافت کے کہ اس نے تمہیں امتیاز بخشا ہے، جبکہ میں اس کے بغیر ہوں اور تم اس کا ہار پہنے ہوئے ہو۔)

الشریف الرضی نے مرثیے کے باب میں کافی نظمیں کہیں، جن میں سے چند ایک یہ ہیں۔ امام حسینؑ کا مرثیہ ان اشعار سے شروع ہوتا ہے۔

کربلا! لا زلت کربا و بلا     مالقی عندک آل المصطفی؟

کم علی تُربک لمّا صُرِّعوا ... من دمٍ سال و من دمعٍ جری
کم حصانِ الذیل یروی دمعُها ... خدُّها عند قتیلٍ بالظما
تمسح التربَ علی اعجالها ... عن طُلَی نحرٍ و میل بالدّما
و ضیوفٍ لفلاۃٍ قفرۃٍ ... نزلوا فیها علی غیر قری

(کربلا! تو کرب (رنج و غم) اور بلا (مصیبت) ثابت ہوئی۔ آل مصطفیٰ تیرے وہاں کس عذاب سے گزرے۔
تیری زمین پر جب ان کو گرایا گیا تو کتنا خون بہا' اور کتنے آنسو جاری ہوئے۔
کتنی پاک دامن خواتین تھیں جن کے آنسو ایک پیاسے شہید کے غم میں ان کے چہروں پر رواں تھے۔
خون سے لتھڑے ہوئے سینے سے وہ جلدی جلدی مٹی پونچھتی تھیں۔
وہ کیسے مہمان تھے جو اک غیر آباد صحرا میں اس طرح آ کے اترے کہ ان کی کسی نے خاطر مدارات بھی نہ کی۔)

حیرہ سے گزرتے ہوئے شاعر آلِ منذر بن ماء السماء کے چھوڑے ہوئے دیار کو دیکھ کر ان کا مرثیہ کہتا ہے:

أین بانوکِ ایها الحِیرۃ البیضاءُ ... والموطنون منکِ الدیارا
والألی شقّقوا ثراکِ من العشب ... وأجروا خلالک الانهارا
المهیبون بالضیوف اذا هَبّت ... شمالاً والمُوقدون النارا
کلما باخ ضوءُ ها أقضموها ... بالقُبَیّاتِ مَندلیا و غارا
این عُقبانک الخواطفُ حلّقن ... وأبقین عندکِ الا وکارا
و رجال مثل الاسود' مشوافیک ... تداعوا قوائماً و شفارا
حبّذا أهلک المُحلّون اهلاً ... یوم بانوا' و حبّذا الدّارُ دارا
لم یکونوا الا کرکبٍ تأنیٔ ... برهۃ فی مناخہ' ثم سارا

(اے حسین حیرہ! وہ لوگ تمہیں چھوڑ کے کہاں چل دیئے' جنہوں نے تمہارے اندر اتنی بستیاں بسائی تھیں۔
وہ لوگ جنہوں نے تمہاری زمین میں ہل چلا کے پودے لگائے' اور اس کے بیچوں بیچ نہریں بہا دیں۔

جب ہوا شمال کی طرف چلتی تھی تو وہ مہمانوں کو آواز دیتے تھے اور آگ جلا لیتے تھے۔
جب جب اس کی روشنی ماند پڑتی تو وہ ثُبیات کے مقام پر اس کے اندر مندلی اور غار کی لکڑیاں ڈال کر اسے پھر سے جلا دیتے۔
وہ تمہارے جھپٹنے والے عقاب کیا ہوئے جو بہت اونچا اُڑتے تھے اور اپنے نشیمن تمہارے پاس چھوڑ جاتے تھے۔
اور وہ شیروں کی طرح کے جوانمرد' جو تمہارے اندر چلے پھرے' اور پھر گر گئے اور ختم ہو گئے۔
شاباش ہو تمہارے مہمان نواز لوگوں کو' جب وہ چلے گئے اور شاباش ہو ان حویلیوں کو وہ ایک قافلے کی طرح ہی تھے جو آیا اور تھوڑی دیر اس ماحول میں ٹھہر کے چل دیا)

شکوہ اور فخر کے باب میں شاعر کہتا ہے :

لأی حبیب یحسن الرأی والودّ — وأكثر هذا الناس ليس لهم عهدُ
أری ذمّیَ الايام مالا يضرها — فهل دافع عني' نوائبها' الحمد
وما هذه الدنيا لنا بمطيعة — وليس لخلقٍ' من مداراتها' بُدّ
أكل قريب لي بعيد بودّه؟ — وكل صديق بين أضلعه حقد
اذا قلَّ مال المرء قلّ صديقه — وفارقه ذاك التحنُّن والوُدُّ
زهدتُ و زهدی فی الحیاة لعلّةٍ — و حجّةُ من لا يبلغ الاملَ الزهد

(کسی دوست کے لیے انسان اچھی رائے اور محبت رکھے' جبکہ اکثر لوگوں کا حال یہ ہے کہ وہ اپنے وعدے پر قائم نہیں رہتے۔
میں اگر زمانے کو برا کہتا ہوں تو اس سے اسے کوئی نقصان نہیں پہنچتا اور اگر میں اس کی تعریف کروں تو کیا اس کی مصیبتیں مجھ سے ٹل جائیں گی؟
یہ دنیا ہمارے تابع فرمان نہیں ہے اور مخلوق کے لیے اس کی مدارات کرنے کے سوا چارہ نہیں۔
کیا میرا ہر عزیز اپنی محبت میں مجھ سے دور چلا گیا ہے اور کیا میرے ہر دوست کے سینے میں بغض بھرا ہے؟
جب انسان کے پاس مال کم ہو جائے تو اس کے دوست بھی کم ہو جاتے ہیں اور اُسے وہ پہلے والی محبت اور شفقت نہیں ملتی۔
میں نے زہد اختیار کیا تو زندگی میں میرا یہ رویّہ کسی سبب سے تھا۔ جب کوئی اپنا مقصد نہ پا سکے تو وہ زہد کے پیچھے پناہ لیتا ہے۔)


Scanned with CamScanner

عشقیہ شاعری (غزل) میں بھی شریف الرضی نے بعض عمدہ چیزیں کہی ہیں۔ ایک نمونہ:

یا طائر البان غِرِّ یداً علی فننٍ ماهاج نوحک لی' یا طائرَ البان

هل انت مُبلغ من هام الفؤاد به ان الطلیق یؤدی حاجةَ العانی

ضمانةٌ ' ماجنا ها غیر مقلته یوم الوداع' فیا شوقی الی الجانی

لولا تذکرّ ایام بذی سلمٍ و عندرامة' اوطاری و اوطانی

لما قدحتُ بنار الوجد فی کبدی ولا بللتُ بماء الدمع' اجفانی

(اے شجرِ بان کے طائر' جو ایک شاخ پر بیٹھے گا رہے ہو' تم یہ غمگین گیت میرے لیے کیوں گا رہے ہو۔
کیا تم اس کو جس میں میرا دل جا کے اٹکا ہے یہ پیغام دو گے کہ ایک آزاد ہی ایک اسیر کی ضرورت پوری کرتا ہے۔
یہ محبت؟ اس کا گناہ اس کی آنکھوں نے وداع والے دن کیا تھا' اور مجھے یہ گناہ گار کتنا عزیز ہے۔
اگر ذی سلم کے دنوں کی یاد نہ ہوتی' اور رامہ میں میری ضرورتیں اور میرے گھر نہ ہوتے
تو میں اپنے جگر میں محبت کی آگ نہ سلگاتا' اور نہ آنسوؤں کے پانی سے اپنی آنکھیں تر کرتا۔)

## طغرائی (م ۱۱۲۱)

مؤید الدین العمید ابواسماعیل بن علی طغرائی کے نام سے مشہور ہوا' جس کی نسبت اس کی شروع زندگی کے پیشے (طغریٰ لکھنے) سے ہے۔ وہ اصفہان میں ایک فارسی خاندان میں پیدا ہوا اور انشا پردازی اور شاعری میں ایسی مہارت پیدا کی کہ بے مثل کہلایا' اور بعضوں کا خیال ہے کہ مشرق میں اس جیسا نابغہ پھر پیدا نہ ہوا۔ بڑا ہو کر وہ آلِ سلجوق کے سلاطین کی پناہ میں آ گیا اور ان کی خدمت کرتا رہا' یہاں تک کہ وہ موصل میں سلجوقی سلطان مسعود کا وزیر بن گیا۔ طغرائی کو 'استاذ' کے نام سے پکارا جانے لگا اور اسے میرنشی کا لقب عطا ہوا۔ جب سلطان مسعود اور اس کے بھائی سلطان محمود کے درمیان ہمدان کے قریب جنگ چھڑی اور اس میں مؤخر الذکر کو فتح نصیب ہوئی تو اس نے طغرائی کو قید کر لیا۔ پھر اس کے وزیر نظام الدین نے خلیفہ کو طغرائی کے خلاف یہ کہہ کر بھڑکایا کہ وہ ملحد ہے۔ چنانچہ اس نے ۱۱۲۱ میں طغرائی کو قتل کروا دیا۔



Scanned with CamScanner

شاعری: طغرائی کی نظم میں اشعار کافی تعداد میں ہوتے ہیں۔ قافیہ مضبوط ہوتا ہے۔ الفاظ منتخب ہوتے ہیں اور اس میں فخر اور دانشوری کے موضوعات زیادہ ہوتے ہیں۔ طغرائی کی نثر بھی اسلوب کی توانائی اور تحریر کی پختگی میں اس کی شاعری کے مرتبے کی ہے۔ اس کی شاعری کا ایک بڑا دیوان ہے، جس میں زیادہ تر سلطان سعید اور نظام الملک کی مدح میں قصائد ہیں اور اس میں سب سے اچھی اور عمدہ چیز شاعر کا قصیدہ ''لامیۃ العجم'' ہے، جو عربی شاعری کا ایک غیر معمولی اور منتخب نمونہ سمجھا جاتا ہے۔ اس نے یہ قصیدہ بغداد میں کہا تھا اور اس میں وہ اپنی بے کاری کے دنوں میں زمانے پر اظہارِ افسوس کرتا اور دوستوں اور بھائیوں کا شکوہ کرتا ہے۔ اس قصیدے کی چھوٹی اور بڑی بہت سی شرحیں علمائے ادب نے کی ہیں۔

طغرائی کے قصیدہ 'لامیۃ العجم' کے کچھ اشعار:

اصالة الرأی صانتنی عن الخطل ۔۔۔ وحلیة الفضل زانتنی لدی العطل
مجدی اخیراً و مجدی اولا شَرَع ۔۔۔ والشمس راد الضُحی کالشمس فی الطُفَل
حُبّ السلامة یثنی همَّ صاحبه ۔۔۔ عن المعالی و یُغری المرءَ بالکسَل
فان جنحتَ الیه فاتخذ نفقاً ۔۔۔ فی الارض او سلّماً فی الجوّ و فاعتزل
ودع غمار العُلی للمُقدمین علی ۔۔۔ رکوبها و اقتنع منهنّ بالبلَل
رضا الذلیل بخفضِ العیش مسکنة ۔۔۔ والعزّ تحت رسیم الاینق الذُلل
ان العُلی حدّثتنی وهی صادقة ۔۔۔ فیما تحدّث : ان العزّ فی النقل
لو ان فی شرف المأوی بلوغ منیً ۔۔۔ لم تبرح الشمس یوماً دارةَ الحَمَل
أعلّل النفس بالآمال ارقبها ۔۔۔ ما أضیقَ العیش لولا فسحة الامل
لم ارتضِ العیش والایام مُقبلة ۔۔۔ وفکیف ارضی، و قد ولّت علی عَجَل
غالٰی بنفسی عرفانی بقیمتها ۔۔۔ فصُنتُها عن رخیص القدر مُبتَذل

(رائے کے محکم ہونے نے مجھے لغو و مہمل باتوں سے بچا لیا اور فضیلت میری سادہ شخصیت کے لیے زیور ثابت ہوئی۔

میری عزت و شان شروع میں بھی اور بعد میں بھی ایک جیسی رہی، کہ نصف النہار کا سورج بھی شام کے سورج کی طرح کا ہوتا ہے

سلامتی کی خواہش انسان کی ہمت کو بڑے کاموں سے باز رکھتی ہے اور اس میں سستی پیدا کر دیتی ہے۔

اگر تم سلامتی کی خواہش کے ہی ہو رہے، تو پھر زمین میں کوئی سرنگ تلاش کر لینا یا ہوا میں کوئی

سیڑھی لگا کر ایک طرف ہو جانا۔

عظمت کی بلند موجیں ان کے لیے چھوڑ دو جو اُن کے لیے کوشش کرتے ہیں۔ تم بس ان کے چھینٹوں پر قناعت کیے رہو۔

ایک چھوٹے انسان کا آرام کی زندگی پر قانع ہو جانا ایک طرح کی عاجزی ہے' عزت تو کام کرنے اور سدھائے ہوئے اونٹوں پر سفر کرنے میں ہے۔

شرف و عظمت نے مجھ سے کہا اور وہ اپنی بات میں سچی تھی کہ عزت تو ایک جگہ سے دوسری جگہ جانے میں ہے۔

اگر اونچی منزل پر پہنچ جانے ہی سے آرزو کی تکمیل ہوتی تو سورج کبھی برج حمل کو چھوڑ کے باہر نہ آتا۔

میں اپنے نفس کو ان آرزوؤں سے بہلاتا ہوں جن کا مجھے انتظار رہتا ہے۔ اگر امید کی فراخی بھی نہ ہوتی تو زندگی میں کتنی گھٹن ہوتی۔

میں نے زندگی کی خواہش تو اس وقت بھی نہ کی جب دن اچھے تھے۔ اب جبکہ وہ دن جلدی گزر گئے ہیں تو میں زندگی کی خواہش کیسے کر سکتا ہوں۔

میں نے جب اپنی ذات کی قیمت جان لی تو وہ میرے لیے گراں قدر ہو گئی' چنانچہ میں نے اس کو سستی اور گھٹیا چیزوں سے بچائے رکھا۔)

بڑھاپے میں بیٹا پیدا ہونے پر طغرائی نے کہا:

هذا الصغير الذی وافی علی کِبَرٍ أقرَّ عینی ولکن زاد فی فِکَری

سبع و خمسون لو مرّت علی حجرٍ لبان تاثیرها فی صفحة الحَجَر

(یہ چھوٹی سی جان جو میرے بڑھاپے میں آئی ہے۔ اس نے میری آنکھوں کو ٹھنڈک تو پہنچائی' لیکن میری فکروں میں اضافہ کر دیا۔

ستاون برس اگر پتھر پر بھی گزریں تو ان کی تاثیر اس کی سطح پر دکھائی دے جائے گی۔)

فخر کے موضوع پر شاعر کہتا ہے۔

أبی الله ان اسمو بغیر فضائلی اذا ما سما بالمال کل مسوّد

وان کرُمت قبلی اوائل أسرتی فانی بحمدالله مبدأ سؤددی

اذا لم یکن لی فی الولایة بسطةٌ یطول بها باعی و تسطو بها یدی

ولا کان لی حکم مطاع أجیزه فأُرغم اعدائی وا کبت حُسدّی



Scanned with CamScanner

فاعذرَ ان قصَّرت فی حق مجتدٍ | وآمن ان یعتادنی کیدُ معتدی
أأُکفَی، ولا اکفِی؟ وتلک غضاضة | اری دونها وَقع الحُسَام المهنَّد

(جب ہر سردار مال و دولت کی وجہ سے بڑا ہوا' تو اللہ نے میرے لیے یہی چاہا کہ میں اپنی فضیلتوں کے بغیر ترقی نہ کروں۔
اگر مجھ سے پہلے میرے اہل خاندان باشرف ہوئے تو بحمداللہ میں نے اپنے بلند رتبے کی ابتدا اپنے آپ سے کی۔
اگر کسی ولایت میں مجھے کوئی دسترس حاصل نہ ہو' جس سے میرا اختیار وسیع ہو اور مجھے کچھ غلبہ حاصل ہو۔
اور نہ میں کوئی ایسا حکم دے سکوں جسے تسلیم کیا جائے' جس سے میں دشمنوں کو دبا لوں اور اپنے حاسدوں کو ذلیل و رسوا کر دوں۔
اور اگر میں کسی مدد مانگنے والے کے حق میں کمی کروں تو مجھے معذرت کرنی پڑے اور میں یہ برداشت کرلوں کہ مجھ پر زیادتی کرنے والا بار بار مکر و فریب سے کام لے۔
تو کیا ایسے حالات میں دوسرے ہی میرے لیے کچھ کریں اور میں خود کچھ نہ کروں۔ یہ تو ایسی ذلت کی بات ہے کہ اس سے ایک کاٹ دار تلوار کا وار بھی کم ہے۔)

ایک قدرتی منظر کو بیان کرتے ہوئے طغرائی کہتا ہے:

وکانما الشمس المنیرة اذ بدت | والبدرُ یجنح للمغیب وما غرب
متحاربان : لذا مِجنّ صاغه | من فضّة، ولذا مجَنّ من ذهب

(چمکتا ہوا سورج جب نکلا' اور چاند غروب ہونے لگا' لیکن ابھی غروب نہ ہوا تھا۔
تو یہ دو ایسے لڑنے والے تھے' گویا ایک نے اپنی ڈھال چاندی سے بنائی تھی اور دوسرے نے سونے سے!)

☆......☆......☆

# شام میں شاعری اور شعراء

بنوامیہ کے عہد میں دمشق دارالخلافہ بھی تھا' افواج کا مرکز بھی اور اسلام کا قلعہ بھی۔ اس زمانے میں وہاں قلم سے زیادہ تلوار کو پوچھا جاتا تھا' اور کتاب سے زیادہ لشکر اور علم کی اہمیت تھی۔ سیاست اور حکومت کے مشاغل ادب اور شاعری کے لیے کوئی وقت بھی نہیں چھوڑتے تھے۔ ادب اور شاعری عراق اور حجاز


Scanned with CamScanner

میں جا کر پھلنے پھولنے لگی تھی اور وہیں شاعروں اور ادیبوں کا جمگھٹا ہوتا اور ان کی مجالس جمتی تھیں۔

بعد میں جب امویوں کی جگہ عباسیوں نے لے لی اور عربوں کے ساتھ ساتھ ایرانی بھی بکثرت دیکھے جانے لگے اور خلافت اور حکومت کے تمام امور دمشق کی بجائے بغداد میں سرانجام پانے لگے تو شام میں کچھ عرصے کے لیے ادب کی سرگرمی ماند پڑ گئی۔ اس کے بعد یہ ہوا کہ بنوحمدان نے حلب پر قبضہ کر لیا' اور بقول ثعالبی ''وہ ایسے حکمران اور امراء تھے جن کی زبان فصیح تھی اور جن کے ہاتھ کھلے تھے' اور ان میں سیف الدولہ کی امارت کا بڑا نام تھا اور وہ گویا ہار کا وسطی موتی تھا۔'' سیف الدولہ ادبی ذوق کے ساتھ ساتھ شاعری کا ملکہ بھی رکھتا تھا اور ہر اعتبار سے ایک قابل تعریف حکمران تھا۔ اس نے ادباء' شعراء اور علماء کے لیے اپنے دربار کے دروازے کھول دیئے تھے۔ کہتے ہیں کہ ادب اور علم اور شاعری کے عظماء اور اساطین جتنا اس کے ہاں جمع ہوئے وہ خلفاء کو چھوڑ کر اور کہیں جمع نہ ہوئے تھے۔

اہلِ شام کے ہاں شاعری کا جو اسلوب مقبول و مروّج تھا وہ بُحتری کا اسلوب تھا' جس میں بلیغ الفاظ اور فصیح اور سہل اسلوب کا زیادہ خیال رکھا جاتا ہے۔ جس میں بہت زیادہ گہرے معانی اور اظہار میں اختصار نہیں ہوتا۔ ثعالبی نے صاحب بن عبّاد سے سنا کہ وہ شاعری کا یہی اسلوب پسند کرتا تھا اور اسی سے محظوظ ہوتا تھا۔ شام کے لیے یہ بات بڑے فخر کی تھی کہ اس نے عربوں کو ابوتمّام' بحتری' متنبّی' ابو فراس حمدانی اور ابوالعلاء معرّی کی صورت میں شاعری کی سبقت لوٹا دی جو اس سے پہلے ایرانی نژاد لوگوں اور موالی کی اولاد میں چلی گئی تھی۔

اگلے صفحات میں شام کے ان شعراء کے مختصر حالات اور ان کا نمونہ کلام دیا جاتا ہے۔

## ابوتمّام (م ۸۴۵)

عربی شاعر اور جامعِ اشعار حبیب بن اوس الطائی' جس کی کنیت ابوتمّام تھی' دمشق سے کچھ فاصلے پر ایک گاؤں جاسم میں پیدا ہوا۔ اس کا باپ شام کے عجمی نصرانیوں میں سے تھا۔ جب اسلام لایا تو اپنا نام بدل کر اوس رکھ لیا اور قبیلہ طئی سے رشتۂ قرابت قائم کیا۔ چنانچہ اس کا بیٹا حبیب طائی کہلایا۔ ابوتمام مولّدین (جدید) شعراء کے دوسرے طبقے میں سرِ فہرست ہے' اور اُن تین شعراء میں سے ایک ہے جو اپنے زمانے میں شہرت کے اُوج پر پہنچے اور جن کی شاعری کو دوام حاصل ہوا۔ دوسرا شاعر بُحتری تھا اور تیسرا متنبّی!

ابوتمام کے باپ نے دمشق میں منتقل ہو کر پارچہ بافی کا پیشہ اختیار کیا تو ابوتمام بھی اس کام میں اس



Scanned with CamScanner

کا ہاتھ بٹانے لگا۔ جب وہ بڑا ہوا تو دمشق کو چھوڑ کر مصر چلا گیا اور وہاں ایک عرصے تک جامع فسطاط میں پانی پلانے کے کام پر مامور رہا۔ جامع مسجد علماء و ادباء کا مرکز تھی۔ وہیں ابوتمام میں علم و ادب کی طرف رغبت پیدا ہوئی۔ چنانچہ اس نے عربی زبان کا علم حاصل کیا۔ اس کا حافظہ چونکہ بہت اچھا تھا' اس نے قدیم و جدید عربی شاعری کا بہت بڑا حصہ یاد کر لیا اور پھر خود بھی شعر کہنے لگا۔ کچھ عرصے کے بعد وہ دارالخلافہ میں آ گیا اور یہاں اس نے اپنی شاعری میں خلیفہ معتصم کی مدح کی اور اس کا دل جیت لیا۔ اس کے علاوہ اس نے وزیر محمد ابن زیات اور اس کے دیوان رسائل کے مہتمم حسن بن وہب کی بھی مدح کی۔ وہ بغداد کے علاوہ دوسرے صوبوں میں بھی گیا اور ان کے حاکموں کی بھی مدح میں اچھے اچھے قصائد کہہ کے ان کا قُرب حاصل کیا۔ جس کے بعد وہ اسے اپنا دوست اور بھائی سمجھنے لگے اور اسے اپنی شاعری سے روزگار حاصل کرنے کی ضرورت سے آزاد کر دیا۔ ان سفروں میں ایک دفعہ ابوتمام نیشا پور کی طرف بھی گیا' لیکن وہاں کی سرد آب و ہوا اسے راس نہ آئی اور واپسی کے سفر میں برفباری کے باعث اسے ہمدان میں رکنا پڑا۔ یہاں اس نے فراغت سے فائدہ اٹھاتے ہوئے ابوالوفاء بن سلمہ کے کتب خانے کی مدد سے اپنا شہرۂ آفاق انتخابِ اشعار ''حماسہ'' مرتب کر لیا۔

امراء اور صوبوں کے حاکموں کے ہاں اس کی اس مقبولیت اور مرتبے کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہ جب تک زندہ رہا کوئی شاعر بھی اپنی شاعری سے ایک درہم نہ کما سکا۔ ابوتمام کے سرپرست اور خیر خواہ حسن بن وہب نے موصل کی ڈاک کا انتظام اس کے سپرد کیا جس پر اس نے دو سال کام کیا اور خلیفہ واثق کے زمانے میں اسی عہدے پر کام کرتے ہوئے وہ ۸۴۵ میں انتقال کر گیا۔

ابوتمام نے جب عربی ادب و شاعری کی تعلیم حاصل کی تو اس کے ساتھ ہی وہ یونانی فلسفے کی کتابوں کا مطالعہ بھی کرنے لگا' اور ان سے اس نے بہت کچھ اخذ کیا' جس سے اس کی سوچ اور فکر میں وسعت پیدا ہوئی۔ لیکن یہ سوچ اور فکر منظم نہ تھی' بلکہ مختلف سمتوں میں پھیلی ہوئی تھی اور اس میں کافی متناقض باتیں تھیں' جن کا اثر اس کی زندگی پر بھی اور اس کی شاعری میں بھی دکھائی دیتا ہے۔ ابوتمام میں ایک نادر قابلیت اور اپج تھی۔ اس کے خیال میں وسعت تھی۔ وہ اپنی شاعری میں کبھی تو خیال کی اعلیٰ بلندیوں تک جا پہنچتا اور پھر وہاں سے اترتا تو ایسے شعر کہنے لگتا جو مبہم ہوتے اور ان میں کوئی خوبصورتی دیکھنے میں نہ آتی۔ اس کی وجہ یہ کہ ابوتمام کو منطق، عقلی استدلال اور غیر مانوس کلام سے کافی رغبت ہو گئی تھی۔ اس کے ساتھ وہ بے اصولی اور من مانی بھی کر جاتا تھا اور اپنے شعروں میں تصنع اور بدیع اور خاص طور پر طباق (تقابل) اور تجنیس کا استعمال کرتا تھا' جس سے اس کے شعر گنجلک' کھردرے اور بدوضع ہو جاتے تھے۔ تاہم وہ پہلا شاعر ہے جس نے یونانی فلسفے کو عربی شاعری میں رواج دیا اور عربی زبان کو ایسے ایسے



Scanned with CamScanner

جدید معانی عطا کیے جن میں فکر کی گہرائی بھی ہے اور جذباتی تموّج بھی!

ابو تمام سانولے رنگ کا طویل القامت شخص تھا۔ فصیح اللسان اور بہت شیریں گفتگو کرنے والا۔ بے حد ذکی الحس اور حاضر جواب۔ کہتے ہیں اس کو صرف بحر رجز میں چودہ ہزار نظمیں یاد تھیں، علاوہ دوسرے قصائد اور قطعات کے، اس نے قدیم عرب شاعری کا جو انتخاب "حماسہ" کے نام سے کیا وہ اور اس کے علاوہ اس کی کتاب "فحول الشعراء" اس امر کی صداقت کے لیے کافی ہیں۔ اس کی ذہانت اور زود گوئی کا ایک واقعہ یوں ہے کہ جب اس نے احمد بن المعتصم کو اپنا سینیہ قصیدہ سنایا جس کا مطلع ہے کہ

مــافی وقـوفـک ســاعـةً مـن بــاس    تــقــضــی ذمــام الأربُـع الأدراس

اور قصیدہ کہتے کہتے اس شعر پر پہنچا کہ

اقــدام عــمــرو فـی سـمـاحة حـاتـم    فــی حــلــم أحـنـف فـی ذکـاء ایاس

(تمہارے اندر عمرو کی شجاعت اور حاتم کی سخاوت ہے، احنف کا علم ہے اور ایاس کی ذہانت ہے۔)

تو فلسفی ابو یوسف کندی نے کہا کہ "تم نے جو اوصاف بیان کیے ہیں، امیر ان سے کہیں زیادہ ہے۔ تم نے تو بس اتنا کیا ہے کہ اسے عرب کے عام لوگوں کے ساتھ ملا دیا ہے۔" یہ سن کر ابو تمام نے اپنا سر جھکایا اور پھر فی البدیہہ یہ اشعار کہے:

لا تـنـکـروا ضربی له من دونه    مثلاً شرودا فی الندی والباس
فـالـلـه قد ضرب الأقلَّ لنوره    مثلاً مـن الـمـشکاة والنبراس

(میں نے اگر اس کی سخاوت اور بہادری کی ایک بے ربط سی مثال دی ہے جو اس کے مرتبے سے کم ہے
تو اللہ نے بھی تو اپنے نور کے لیے چراغ دان اور قندیل کی کمتر سی مثال دی ہے۔)

جب اس سے قصیدہ لیا گیا تو اس میں یہ دو شعر نہیں تھے (جو اس نے وقت کے وقت کہہ دیے تھے) اس پر انہیں تعجب ہوا۔ فلسفی خلیفہ سے کہنے لگا: یہ جو کچھ بھی مانگے اسے دے دیا جائے۔ اس لیے کہ اس کی فکر اتنی تیز ہے کہ وہ اس کے جسم کو اس طرح کھا جائے گی جس طرح ہندی تلوار اپنی نیام کو کھا جاتی ہے اور یہ زیادہ عرصہ نہیں جیے گا۔

**شاعری:** جیسا کہ اوپر ذکر ہوا، ابو تمام نے یونانی علوم کے تراجم کا مطالعہ کیا، جس سے اس کی عقل

پختہ ہوئی اور اس کی قوت فیصلہ بڑھی اور ساتھ ہی اس کے خیال میں لطافت پیدا ہوئی، اس ثقافت سے اس نے شاعری میں ایسا طریقہ اختیار کیا جس میں سلیس عبارت سے زیادہ عمیق معانی کی اہمیت تھی۔ چنانچہ وہ ایسا شاعر ہے جس نے عقلی استدلال اور مخفی کنایوں کو اپنی شاعری میں بہت برتا، اور جب دیکھا کہ اس عبارت میں صفائی اور سلاست نہیں رہی تو اس کمی کو دور کرنے کے لیے اس نے مصنوعی طریقوں مثلاً جناس، طباق اور استعارہ سے کام لیا۔ یہ حربہ کبھی تو کامیاب رہا اور کبھی یہ ہوا کہ اس سے بھی بات نہ بن سکی۔ چنانچہ یہ مصنوعی تدبیریں اس کی شاعری کے چہرے پر چاند کے دھبے بن کے رہ گئیں۔ تاہم اس کے کلام میں ایک حصہ ایسا ضرور بچا رہ گیا ہے جس میں معانی کی ایسی جدّت ہے کہ وہ نہ ماضی کے شعراء کو کبھی سوجھی اور نہ بعد کے آنے والے اس تک پہنچ پائے۔ بالکل نئے خیالات، منتخب الفاظ اور ان کے ساتھ ضرب الامثال اور حکمت و دانائی کی باتیں۔ ان سب چیزوں نے عربی ادب کو باثروت کر دیا اور بعد کے آنے والوں کے لیے ایسا راستہ ہموار کیا جس پر متنبی اور ابوالعلاء معرّی جیسے شعراء چلے۔ ابوتمام کے فن پر فکر و دانش اتنی غالب تھی کہ یہ قول مشہور ہوا کہ ''ابوتمام اور متنبی اصل میں مفکر ہیں، شاعر تو بحتری ہے۔''

ابوتمام کے فنی مرتبے کے بارے میں لوگوں میں کافی اختلاف پایا گیا۔ بعض لوگ اس کی حمایت میں اتنے بڑھے کہ اسے پہلے اور بعد کے سب شعراء پر فضیلت دی، اور دوسرے لوگوں نے یہ کیا کہ اس کا اچھا کام لپیٹ کے ایک طرف رکھ دیا اور اس کا بُرا کام سامنے لے آئے۔ لیکن اس کے بارے میں غالب رائے وہی رہی جس نے اس کی شاعری کو قابلِ تعریف جانا۔

ابوتمام کے دیوان کے علاوہ اس کے دو انتخاب ''حماسہ'' اور ''فحول الشعراء'' ہیں، جن کے اندر اس نے جاہلی اور اسلامی دونوں ادوار کی نہایت ہی عمدہ اور بہترین شاعری جمع کر دی ہے۔ شاعری کا جو انتخاب خاص طور پر حماسہ میں دیکھنے میں آتا ہے اس کے متعلق عام خیال یہ ہے کہ ابوتمام اس انتخاب میں زیادہ بڑا شاعر لگتا ہے، بہ نسبت اپنی شاعری کے!

**نمونۂ کلام:** خلیفہ معتصم نے جب رومیوں کے شہر عموریہ پر حملے کا ارادہ کیا، تو منجموں نے اس کی مخالفت کرتے ہوئے اسے کچھ عرصے کے لیے ملتوی کرنے کا مشورہ دیا۔ لیکن معتصم نے اُن کے کہے کو نظرانداز کرتے ہوئے عموریہ پر حملہ کیا اور اسے فتح کر لیا۔ یہ معرکہ ابوتمام نے بھی دیکھا تھا۔ چنانچہ اس فتح کے بعد اس نے معتصم کی مدح میں ایک قصیدہ کہا، جس کے کچھ اشعار یہ ہیں:

السیف أصدق انباءً من الکتب     فی حدّہ الحدّ بین الجدّ و اللعب

بیض الصفائح لاسود الصحائف فی ... متونهن جلاء الشک والریب

والعلم فی شهب الارماح لامعة ... بین الخمیسین لا فی السبعة الشهب

أین الروایة؟ بل أین النجوم وما ... صاغوه من زخرف فیها ومن کذب

تخرصاً و احادیثاً ملفقة ... لیست بنبع اذا عُدّت ولا غرب

فتح الفتوح تعالی ان یحیط به ... نظم من الشعر او نثر من الخطب

فتح تفتح ابواب السماء له ... وتبرز الارض فی ابرادها القشب

یا یوم وقعة عموریة انصرفت ... عنک المنی خفّلاً معسولة الحلب

ابقیت جد بنی الاسلام فی صعد ... والمشرکین و دار الشرک فی صبب

لم یغز قوماً ولم ینهض الی بلد ... الا تقدمه جیش من الرعب

لو لم یقد جحفلاً یوم الوغی لغدا ... من نفسه وحدها فی جحفل لجب

(تلوار کتابوں سے زیادہ سچی خبر دیتی ہے اس کی دھار سنجیدگی اور کھیل کے درمیان حد قائم کر دیتی ہے۔

چوڑی سفید تلواریں' نہ کہ سیاہ صفحات' ان تلواروں کے چوڑے پھل ہی شک و تذبذب کو دور کر دیتے ہیں۔

علم نیزوں کے پھلوں میں ہوتا ہے جو لشکروں کے درمیان چمکتے ہیں' نہ کہ سات ستاروں میں۔

روایت کہاں ہے؟ اور ستارے کہاں ہیں؟ اور جو جھوٹ اور بناوٹ انہوں نے ان میں پیدا کی ہے وہ کہاں ہے؟

محض اندازے ہیں اور گھڑی ہوئی باتیں ہیں۔ نہ یہ نبع کا درخت ہیں (جس سے کمانیں بنائی جاتی ہیں) اور نہ غرب کا (جس سے تیر بنائے جاتے ہیں)

یہ فتحوں کی فتح تھی' ایسی کہ اس کا احوال نہ نظم کا کوئی شعر بیان کر سکتا ہے اور نہ کسی خطبے کی نثر۔

ایسی فتح کہ اس کے لیے آسمان کے دروازے کھل جاتے ہیں اور زمین اپنے نئے لباس میں ظاہر ہوتی ہے۔

اے عموریہ کی فتح کے دن! ہماری ساری خواہشیں اس دن پوری ہو گئیں اور ہم نے گویا شہد ملا ہوا دودھ پایا۔

تم نے اہل اسلام کی قسمت کو بلندیوں پر چڑھایا اور مشرکین اور ان کے مرکز کو نیچے ڈھلان میں دھکیل دیا۔

معتصم جب کسی قوم پر حملہ کرتا ہے اور کسی ملک پر چڑھائی کرتا ہے تو اس کے آگے آگے رعب



Scanned with CamScanner

اور بیت کا ایک لشکر ہوتا ہے۔
اور اگر وہ لڑائی والے دن کسی فوج کی قیادت نہ بھی کرے تو وہ اپنے آپ میں ایک لشکرِ جرّار ہوتا ہے۔)

ابوتمام نے ایک اور خوبصورت قصیدے میں محمد بن حُمید الطوسی کا مرثیہ کہا جو مامون کے زمانے میں موصل کا گورنر تھا۔ وہ بابک الخرمی کے مقابلے کے لیے فوج لے کر گیا' لیکن شکست سے دوچار ہوا۔ اس کے ساتھی تو پیچھے ہٹ گئے' لیکن وہ خود وہیں ڈٹا رہا اور بڑی شجاعت کا مظاہرہ کرتے ہوئے جان دی:

كذا فليجلّ الخطبُ و ليفدح الامرُ　　فليس لعين لم يفِض ماؤها عذرُ
تُوفيت الآمالُ بعد محمّدٍ　　وأصبح في شغل عن السَّفر السَّفْرُ
فتى كلما فاضت عيون قبيلة　　دَماً ضحكت عنه الاحاديث و الذكر
فتى مات بين الطعن و الضرب ميتةً　　تقوم مقام النصر اذ فاته النّصر
وما مات حتى مات مضرب سيفه　　من الضرب و اعتلّت عليه القنا السُّمر
تردّى ثياب الموت حُمراً فمادجا　　لها الليل الا وهى من سندس خضر

(یہ ایسا ہی ہے کہ مصیبت عظیم ہے اور معاملہ گمبھیر' اور جس آنکھ سے بھی اس پر آنسو نہیں بہا اس کے پاس کوئی عذر نہیں ہے۔
محمد کے بعد امیدیں مٹ کے رہ گئیں اور جو اس کی طرف سفر کرتے تھے وہ دوسرے کاموں میں لگ گئے۔
وہ ایسا جوانمرد تھا کہ جب قبیلے کی آنکھیں اس کے لیے خون کے آنسو روتی تھیں' تو اس کی باتوں اور اس کے احوال کا چرچا ہر طرف ہوتا تھا۔
ایسا جوانمرد کہ جب وہ نیزے اور تلوار کے زخم کھا کر مرا تو وہ اس وقت بھی فتح کے مقام پر کھڑا تھا' جبکہ فتح اس کے ہاتھ سے نکل گئی تھی۔
وہ اس وقت تک نہ مرا جب تک کہ اس کی تلوار کی دھار ضربیں کھا کر کند نہ ہو گئی اور اس پر دشمنوں کے نیزے ٹوٹتے نہ رہے۔
اس نے موت کے سرخ کپڑے پہنے اور جب ان پر سیاہ رات آ گئی تو وہ (جنت میں پہنچ کر) سبز اطلس میں بدل گئے۔)

ابوتمام کے ایک بہت عمدہ قصیدے کے چند شعر یہ ہیں:

غدت تستجير الدمعَ خوفَ نوى غدٍ　　وعاد قتاداً عندها كلُّ مرقد



Scanned with CamScanner

وانقذها من غمرة الموت أنه صدودُ فراقٍ لا صدود تعمُّد
فاجری لها الاشفاق دمعاً مورّداً من الدم یجری فوق خدٍ مورّد

(اس نے کل کی جدائی کے خوف سے آنسوؤں میں پناہ لینا چاہی اور ہر بستر اس کے لیے کانٹوں کی سیج بن کے رہ گیا۔
موت سے اس کو اس چیز نے بچالیا کہ یہ رُخ پھیرنا ارادۃً نہیں تھا بلکہ جدائی کی وجہ سے تھا۔
ڈر کی وجہ سے اس کے گلابی گالوں پر خون ملے ہوئے آنسو رواں ہو گئے۔)

وطن سے نکل کر باہر کی دنیا میں چلے جانے پر اکساتے ہوئے آگے کہتا ہے:

و طول مقام المرء فی الحیّ مُخلق لدیبا جتیہ فاغترب تتجدّد
فانی رایتُ الشمس زیدت محبّةً علی الناس ان لیست علیهم بسرمد

(انسان اگر اپنے قبیلے میں زیادہ عرصہ رہے تو اس کی صورت اور شخصیت بوسیدہ ہونے لگتی ہے۔
پس اسے چاہیے کہ گھر سے باہر نکلے تا کہ اپنے آپ کو نیا کر سکے۔
میں نے دیکھا کہ سورج کو لوگ اس لیے بھی پسند کرتے ہیں کہ وہ ہمیشہ ان کے سروں پر نہیں رہتا۔)

ابوتمام نے حکیمانہ اشعار بھی بہت کہے ہیں اور ان میں اپنی زندگی کا تجربہ بیان کیا ہے۔ مثال کے طور پر:

نقِّل فؤادک حیثُ شئتَ من الھوی ما الحُبّ الا للحبیب الأوّل
کم منزل فی الارض یالفہ الفتی وحنینہ ابداً لاوّل منزل

(محبت میں اپنے دل کو چاہے جس طرح بدل لو محبت تو پہلے محبوب کے لیے ہی رہے گی۔
زمین میں کتنے گھر ہیں جن سے انسان مانوس ہوتا ہے، لیکن اس کا شوق اور ولولہ ہمیشہ پہلے گھر کے لیے ہی ہوتا ہے۔)

اسی طرح وہ حاسدوں کی باتوں کے بارے میں کہتا ہے:

واذا أراد اللہ نشر فضیلة طُوِیت، أتاحَ لها لسانَ حسُود
لولا اشتعال النار فیما جاورَت ما کان یُعرف طیب عُرف العُود

(جب اللہ چاہتا ہے کہ کسی کی دبی ہوئی خوبیوں کی شہرت ہو تو اس کے لیے ایک حاسد کی زبان

پیدا کر دیتا ہے۔
اگر آگ پھیل کر قریب کی چیزوں تک نہ پہنچ جاتی تو عُود کی لکڑی کی خوشبو کا کیسے پتا چلتا۔)

وزیر ابن الزیات جو ایک مشہور انشا پرداز تھا' اس کی مدح میں نظم کہتے ہوئے قلم کی تعریف کرتا ہے:

لک القلم الاعلی الذی بشباتہ ... تُصاب من الامر الکُلَی والمفاصلُ
لہ الخلوات اللائی لولا نجیّھا ... لما احتفلت للملک تلک المحافلُ
لُعابُ الأفاعی القاتلات لعابُہ ... وأری الجَنَی اشتارتہ ایدٍ عواسلُ
لہ ریقۃ طَلّ' ولکنّ وقعھا ... بآثارہ فی الشرق والغرب وابلُ
فصیح اذا استنطقتہ وھو راکب ... وأعجم ان خاطبتہ وھو راجلُ

(تمہارا ایک ذی شان قلم ہے جس کی نوک سے کوئی بھی مسئلہ ہو اس کے سارے پہلو اور تفصیلات طے کر لی جاتی ہیں۔
اس کی خلوتیں ایسی ہوتی ہیں کہ اگر ان کے اپنے راز نہ ہوں' تو وہ مجالس امورِ مملکت ٹھیک طرح نہ چلا سکیں۔
اس کا زہر (دشمنوں کے لیے) قاتل سانپوں کا زہر ہوتا ہے اور وہ (دوستوں کے لیے) ایسا شہد ہوتا ہے جسے شہد اتارنے والے ہاتھ اتارتے ہیں۔
اس قلم سے جو نکلتا ہے وہ ہلکی پھوار کی طرح ہوتا ہے۔ لیکن اس کا اثر یہ ہے کہ مشرق اور مغرب میں جا کر وہ بارش بن جاتا ہے۔
اگر وہ ہاتھ پر سوار ہو اور تو اس سے خطاب کرے تو وہ فصیح ہوتا ہے' اور اگر وہ اترا ہوا ہو اور تو اس سے خطاب کرے تو وہ کوئی جواب نہیں دیتا۔)

## بُحتری (م ۸۹۷)

ابوعبادۃ الولید بن عبید خالص عرب تھا اور قبیلہ طی سے تھا۔ بُحتر اس کے کسی جدِّ امجد کا نام تھا۔ اس لیے بُحتری اس کا لقب پڑا۔ عام رائے کے مطابق اس عباسی دور میں ابونواس کے بعد بُحتری ہی مطلقاً "شاعر" کہلانے کا مستحق ٹھہرتا ہے۔ وہ حمص کے قریب منبج میں پیدا ہوا اور اس نے خالص عربی ماحول یعنی قبیلہ طی میں پرورش پائی۔ چنانچہ عربی فصاحت اس کی رگ رگ میں سما گئی۔ وہ ابھی نوجوان ہی تھا کہ یہ سالار الثغری کے ہاں ابوتمام سے متعارف ہوا اور اپنی خداداد صلاحیت کی وجہ سے اس کی توجہ حاصل کر



Scanned with CamScanner

لی اور اس سے کسبِ فیض کرنے لگا۔ ابوتمام اپنی شاعری میں صنعتِ بدلیع سے بہت کام لیتا تھا۔ بحتری نے بھی یہ طریقہ سیکھا' لیکن اس کو احتیاط سے برتا۔ اس کے علاوہ اس نے بہت سے علماء مثلاً ابوالعباس المبرّد سے بھی روایت کی۔ کافی عرصے تک بحتری ادب و شعر میں ابوتمام کا پروردہ رہا۔ وہ اسی طرح کی بات کرتا اور اسی کے نقش قدم پر چلتا۔ بحتری بھی چونکہ طائی تھا' اس لیے ابوتمام نے اس کی اچھی تربیت کی اور اس کی ہر طرح سے مدد کی۔ حتیٰ کہ ایک دن ایسا آیا کہ اس نے اس سے کہہ دیا۔ ''بیٹے! خدا کی قسم میرے بعد تم ہی امیر الشعراء ہو گے۔'' اور خدا نے اس کی یہ پیشگوئی پوری کر دی۔

بحتری اور ابوتمام جب بغداد آ گئے تو بحتری نے یہاں نامور فضلاء (خصوصاً ابن الاعرابی) کے حلقۂ درس میں شرکت کی۔ اس کے علاوہ وہ دارالخلافہ کے آداب سے آگاہی حاصل کرنے کی بھی کوشش کرتا رہا تاکہ جلیل القدر اشخاص کی مدح سرائی کر کے بالآخر خلیفہ کے دربار میں رسائی حاصل کرنے کے قابل ہو جائے۔ اس کے باوجود وزیر ابن الزیات کے یہاں اسے بہت زیادہ کامیابی حاصل نہ ہوئی اور اس نے اسے چھوڑ کر بغداد ہی میں مقیم اپنے قبیلے کے ایک سردار ابونہشل کی مدح میں چند قصائد کہے۔ اسی زمانے میں جب ابوتمام بغداد سے روانہ ہوا تو بحتری بھی عراق کو چھوڑ کر دوبارہ طائی سپہ سالار الثغری کے ہاں چلا آیا جو اس وقت موصل میں مقیم تھا۔

ابوتمام نے ۸۴۵ میں وفات پائی۔ اس کے بعد خلیفہ متوکّل کے تخت نشین ہوتے ہی بحتری دوسری دفعہ بغداد آ گیا اور ابن المنجم کی سفارش سے اسے وزیر الفتح بن خاقان کی نظرِ عنایت حاصل ہو گئی' جس کے ذریعے اس کی رسائی خلیفہ متوکّل کے دربار تک ہوئی اور یوں درباری شاعر کی حیثیت سے اس کی زندگی کا درخشندہ باب شروع ہوا۔

ابوتمام کی وفات کے بعد بحتری کی شاعری کا ہر طرف چرچا ہونے لگا اور اس کی شہرت دور دور تک پہنچی۔ وہ ادب اور شعرگوئی میں امام تسلیم کیا جانے لگا۔ بحتری عراق میں خلیفہ متوکّل اور فتح بن خاقان کی خدمت میں رہا۔ یہاں تک کہ ایک دن کسی مجلس میں وہ اس کی آنکھوں کے سامنے قتل کر دیے گئے۔ اس سانحے کے بعد وہ منبج چلا آیا۔ وہ کبھی کبھی بغداد اور سُرّ من را کے امراء کے ہاں چلا جاتا اور ان کی مدح کر لیتا۔ تا آنکہ ۸۹۷ میں وہ اپنے خالق سے جا ملا۔

بحتری اور اس کے اکثر رفقاء میں یہ امر مشترک ہے کہ انہیں ہمیشہ حصولِ زر کی خواہش رہی۔ چنانچہ وہ اس کے لیے جو بھی ذریعہ ہوتا استعمال کرتے۔ منفعتِ ذات اور حرص و طمع کا یہی جذبہ ہے جس نے بحتری کے اخلاقی کردار میں پختگی پیدا کرنے کی بجائے اسے ریاکاری کے راستے پر ڈال دیا۔ چنانچہ وہ اپنے سرپرست خلفاء کی بدلتی ہوئی مذہبی روش میں غلاموں کی طرح ان کا ساتھ دیتا رہا۔



Scanned with CamScanner

درباری شاعر بننے کا اعزاز حاصل کرنے کے بدلے اسے لازمی طور پر اس منصب کے دوسرے خواہشمندوں کی دشمنی مول لینی پڑی۔ گو معلوم ہوتا ہے کہ شیعی شاعر دعبل خزاعی سے اس کے مراسم اچھے تھے۔ دربارِ خلافت میں رسائی کی وجہ سے اسے اعیانِ سلطنت، وزیروں، سپہ سالاروں، والیانِ صوبہ، اہلِ دربار، شاہی کاتبوں اور علماء وفضلاء سے ارتباط کا موقع مل گیا۔ ان روابط کی بدولت اس نے کئی ایک سیاسی حقائق کے متعلق معلومات بھی حاصل کیں، جن کی صدائے بازگشت اس کے 'دیوان' میں سنی جا سکتی ہے، جس کی ادبی قدر و قیمت کے ساتھ ساتھ اس کی حیثیت ایک ناقابل انکار تاریخی دستاویز کی بھی ہے۔

بحتری اپنے ادب، فنی مرتبے اور نفاست فکر کے باوجود بہت میلا کچیلا رہتا تھا اور اپنے اور دوسروں کے معاملے میں بہت زیادہ بخیل تھا۔ وہ جب شعر پڑھتا تو بہت بُرا لگتا۔ کبھی وہ سر کو جنبش دیتا، کبھی شانے ہلاتا اور کبھی اپنی آستین سے اشارہ کرتا۔ پھر ہر شعر پر وہ رک جاتا اور اپنے آپ سے کہتا: ''بخدا بہت اچھا کہا ہے۔'' پھر وہ سامعین سے کہتا۔ ''آپ کو کیا ہو گیا ہے کہ آپ اَحسَنتَ نہیں کہتے۔ (یعنی 'بہت اچھے' نہیں کہتے) اس لیے کہ اس جیسا شعر تو کوئی بھی نہیں کہہ سکتا۔'' اس کے باوجود وہ منصف مزاج تھا اور جہاں اسے خوبی اور فضیلت نظر آتی وہ اس کا اعتراف کرتا، اور جو چیز اس کے پاس نہ ہوتی اس کا کبھی دعویٰ نہ کرتا۔ بعض لوگوں نے اس کی کوئی نظم سُنی تو کہا۔ ''تم ابوتمام سے زیادہ بڑے شاعر ہو۔'' بحتری نے جواب دیا۔ ''آپ کی اس بات سے نہ مجھے کوئی فائدہ پہنچ سکتا ہے اور نہ ابوتمام کو کوئی نقصان! بات یہ ہے کہ میں نے تو روٹی توڑنا بھی اسی سے سیکھا تھا۔ میں تو اس کا پیروکار ہوں اور اس کی پناہ میں رہنے والا ہوں۔'' ایک دوسرے موقع پر جب بحتری اور ابوتمام کا موازنہ کیا جا رہا تھا، خود بحتری کی اپنی رائے یہ تھی کہ اس کا بہترین کلام ابوتمام کے بہترین کلام سے کم درجے کا ہے، لیکن اس کے معمولی سے معمولی اشعار بھی ابوتمام کے بُرے اشعار سے بہتر ہوتے ہیں۔

**شاعری:** بحتری کا تخیل بہت زرخیز اور توانا تھا۔ جب وہ مادی چیزوں کو بیان کرتا تو ان کی ایسی تصویریں اتارتا جو بہت فنکارانہ اور رنگین ہوتیں۔ ان میں حرکت اور زندگی محسوس ہوتی اور وہ ایسے شعروں میں بیان ہوتیں جن میں ایک پُرلطف نغمگی اور خوبصورت ادائیگی پائی جاتی۔ یوں لگتا کہ وہ ایک طلائی زنجیر کے حلقے ہیں۔ لیکن باوجود اس امر کے کہ اس کی ساری تربیت ابوتمام کے ہاتھوں ہوئی تھی جس سے اس نے حکمت وفلسفہ کی باتیں بھی سنی تھیں، پھر ابن الرومی جیسے جدّت پسند شاعر کے ساتھ بھی اس کا ربط رہا..... باوجود ان باتوں کے وہ اس دور کی فکری ترقی اور بیداری، نیز ایرانی تہذیب اور اس کے اثرات سے الگ تھلگ رہا اور اپنے قدیم شعراء کے راستے پر چلتا اور انہی کے روایتی اسالیب کا اتباع کرتا رہا۔ اسی وجہ سے مشہور ادیب اور نقاد آمدی نے اس کے بارے میں کہا۔ ''بحتری شاعری میں بالکل بدوی

ہے۔ وہ موزوں طبع ہے اور اوائل شعراء کے طریقے پر چلنے والا ہے۔ اس نے شاعری کے خطِ مستقیم کو نہیں چھوڑا۔" تاہم بحتری کا سب سے بڑا کمال اور اعجاز یہ ہے کہ وہ اپنے خیال کے اظہار کے لیے بہت خوبصورت، ملائم اور مترنّم الفاظ کا استعمال کرتا ہے۔ اسی لیے ابن الاثیر نے اس کے بارے میں کہا کہ "اس نے شعر کہنے چاہے تھے اور نغمے سنانے لگ گیا" بحتری اپنے شعری مضامین کے لیے علم اور منطق کی طرف رجوع کرنے کی بجائے اپنے زرخیز تخیّل اور فطرت کے حسن سے استمداد کرتا ہے۔ اس طرح وہ شاعری کی وہ خوبصورتی اور رونق واپس لے آیا جو پچھلے کچھ عرصے میں کم ہونے لگی تھی۔ اسی چیز کو دیکھتے ہوئے متنبّی نے کہا کہ "میں اور ابوتمام مفکر ہیں، شاعر تو بحتری ہے۔" بحتری اپنے اس طبعی ذوق کی وجہ سے شاعری میں ایک خاص طرز کا مُوجد بن گیا، جس میں بلاغت کا حسن تھا، زبان کی چاشنی تھی اور الفاظ کی فصاحت تھی، اور اس میں وہ اپنے استاد اور مربّی ابوتمام سے ممتاز ہو گیا۔ اس کا یہ طرز اس کے معاصرین اور ان کے بعد آنے والے شعراء نے اپنایا اور یہ اہلِ شام کا طرزِ شاعری کہلایا۔ بحتری نے شعر کے تمام اصناف میں طبع آزمائی کی سوائے ہجو کے، کہ اس میں اس کا شعری سرمایہ کوئی زیادہ نہیں ہے۔ بحتری نے چونکہ بہت زیادہ کہا ہے اس لیے اس کے کلام میں کم تر درجے کی اور بھرتی کی چیزیں بھی شامل ہوگئی ہیں۔ اس کی شاعری کی امتیازی خصوصیت اعلیٰ درجے کی وہ مدح ہے جو اس نے خاص طور پر خلیفہ متوکّل اور دوسرے خلفاء اور وزراء کی کی اور اس میں بڑی مہارت سے ان کے اخلاق کی تصویر کشی کی۔ پھر اس کی وہ خلّاقیت ہے جو اس نے پرشکوہ محلّات اور شاندار عمارتوں کا وصف بیان کرنے میں دکھائی۔ مثلاً کسریٰ کے ایوان، خلیفہ متوکّل کے تالاب اور معتز باللہ کے محل کا احوال! بحتری کے قصائد عموماً حسن وعشق (غزل) کے موضوع سے شروع ہوتے ہیں۔ شاعری کے دیوان کے علاوہ بحتری کی ایک کتاب "معانی الشعر" کے نام سے ہے۔ نیز شاعر کا انتخاب ہے جسے "حماسۃ البحتری" کہتے ہیں۔ یہ ابوتمام کے حماسہ کی طرح کا ہے، سوائے اس کے کہ اس کے ابواب زیادہ ہیں اور اس میں ایسی شاعری شامل نہیں ہے جو سماعت پر گراں گزرے۔

بحتری کی شاعری کے حسن اور دلآویزی کو دیکھتے ہوئے مشہور نقّاد ابن رشیق القیروانی نے اسے "شیخ الصناعۃ الشعریۃ" (صنعت شاعری کا استاد) کا لقب دیا اور لوگوں نے اس کے اسلوب کی درخشانی کی مثالیں دینا شروع کیں، اور "بحتری کا درخشاں اسلوب" زبان زد خاص و عام ہوگیا اور وہ اہل شام کا طرزِ شاعری کہلایا۔

**نمونۂ کلام:** بحتری کا بہت عمدہ قصیدہ ایوانِ کسریٰ کے وصف میں ہے۔ یہ کسریٰ کے محل میں تھا، جو بحتری نے اس زمانے میں دیکھا جب وہ تاخت و تاراج ہو چکا تھا اور ایک حالتِ یاس میں تھا۔

چنانچہ اس نے اس کے بیان میں احساس و خیال سے بہت کام لیا۔

صنت نفسی عمّا یدنّس نفسی ۔۔۔ و ترفعتُ عن جدا کل جبسٍ
وتما سکتُ حین زعزنی الدھر ۔۔۔ التماساً منہ لتعسی و نکس
بلغ من صبابۃ العیش عندی ۔۔۔ طفّفتھا الایام تطفیف بخس
وکأن الزمان أصبح محمولاً ۔۔۔ ھواہ مع الأخس الأخسّ
وکان الایوان من عَجب الصُّنعۃ ۔۔۔ جوب فی جنب أرعن جِلس
یُظنّیَ من الکآبۃ، ان ۔۔۔ یبدو لعینی مصبّح او ممسّی
مزعجاً بالفراق عن اُنس الفٍ ۔۔۔ عزّ، او مرھقاً بتطلیق عرس
لیس یُدری، اُصُنع انس لجنّ ۔۔۔ سکنوہ، ام صُنع جنّ لانس
غیر انی اراہ یشھد ان لم ۔۔۔ یک بانیہ فی الملوک بنکس
فکانی اری المراتب والقومَ ۔۔۔ اذا ما بلغت آخر حسّی
وکان الوفود ضاحین حسری ۔۔۔ من وقوفٍ، خلفَ الزحام، و خُنس
وکان القیان وسط المقاصیر ۔۔۔ یُرجّحن بین حُوّ و لُعس

(میں نے اپنے نفس کو اس چیز سے بچایا جو اسے گندا کرتی ہے' اور ہر تنگ ظرف آدمی کا عطیہ قبول کرنے سے اپنے آپ کو بالاتر رکھا۔

اور جب مجھے حالات نے ہلا ڈالا' تب بھی میں اس سے اپنی مصیبت اور مرض میں مدد لینے سے باز رہا۔

میرے پاس جو بچا کھچا رزق موجود تھا اسے بھی زمانے نے گھٹا کر کم کر دیا۔

ایسا لگتا ہے کہ اس زمانے کا میلان و رغبت ایک سے بڑھ کر ایک خسیس انسان کی طرف ہے۔

ایوان اپنی عجیب وغریب اور گول تعمیر کے ساتھ ایسا لگتا ہے جیسے وہ ایک ڈھال ہو جسے ایک کاہل اور ناسمجھ انسان پہلو میں لٹکائے پھرتا ہو۔

اسے اداس دیکھ کر صبح کو یا شام کو آنے والے کی آنکھوں کو یوں لگتا ہے۔

جیسے وہ کسی محبوب اور عزیز انسان کے فراق میں مضطرب ہے' یا دلہن کو طلاق دینے کے بعد پریشان اور بے قرار ہے۔

پتا نہیں چلتا کہ یہ ایوان انسانوں نے جنات کے لیے بنایا جو اس میں رہتے تھے' یا جنات نے انسانوں کے لیے بنایا۔

تاہم مجھے لگتا ہے کہ یہ اس بات کی شہادت دے رہا ہے کہ اس کا بنانے والا بادشاہوں میں کوئی

کوتاہ ہمت تو نہیں تھا۔
جب میں اپنے تصور و خیال میں دور تک جاتا ہوں تو مجھے اس ایوان میں اہل مرتبہ اور دوسرے لوگ نظر آتے ہیں۔
گویا کہ آنے والے وفد دھوپ میں، مجمع کے پیچھے رہے ہوئے، تھکے ماندے کھڑے ہیں۔
اور گویا کہ محل کے گوشوں میں مغنیات پھرتی ہیں، جن کے ہونٹوں کی رنگت دیکھ کر انہیں ایک دوسرے پر ترجیح دی جاتی ہے۔)

بحتری کا اسی طرح کا ایک قصیدہ متوکل کے تالاب کے وصف میں ہے، کہتا ہے:

تنصبّ فیها و فود الماء معجلةً — کالخیل خارجة من حبل مُجریها
کأنما الفضّة البیضاء سائلةً — من السبائک تجری فی مجاریها
اذا علّتها الصبا أبدت لها حُبُکاً — مثل الجواشن مصقولا حواشیها
فحاجب الشمس احیاناً یضاحکها — وریّق الغیث احیانا یباکیها
اذا النجوم تراء ت فی جوانبها — لیلاً حسبت سماء رُکّبَت فیها

(اس میں پانی کے منہ زور دھارے اتنی سرعت سے گرتے ہیں جیسے گھوڑے اپنے دوڑانے والے کی رسی تڑا کر بھاگ نکلیں۔
اس کا پانی ایسا ہے جیسے ڈھلائی سے نکلی ہوئی سفید چاندی اس کے راستوں میں بہتی جاتی ہے۔
جب اس پر بادِ صبا چلتی ہے تو اس کی سطح پر لہریں بنا دیتی ہے۔ ایسی زرہ بکتروں کی طرح جن کے کنارے چمک دار ہوں
جب رات کو اس کے ہر جانب ستارے ظاہر ہوتے ہیں تو تمہیں ایسا لگتا ہے جیسے آسمان تالاب میں آ گیا ہے۔)

ایک دفعہ جب خلیفہ متوکل عید الفطر کے دن موصل میں آیا تو بحتری نے اس کی مدح میں کہا:

بالبرّ صُمت وانت أفضل صائم — وبسنّة اللـه الرضية تُفطر
فانعَم بیوم الفطر عیناً انه — یوم أغرّ من الزمان مشهّر
أظهرت عزّ الملک فیه بجَحُفلٍ — لجبٍ، یحاط الدین فیه و یُنصَر
فالخیل تصهل، والفوارس تدّعی — والبیض تلمع، والاسنّة تزهر
و الارض خاشعة، تمید بثقلها — والجوّ مُعتکر الجوانبِ أغبر
والشمس ماتعة، توقّدُ فی الضحی — طوراً و یُطفئها العجاج الأکدر

حتی طلعت بضوء وجهک فانجلت تلک الدُّجی، وانجاب ذاک العِثیَرُ
ورنا الیک الناظرون فاصبع یُومـا الیک بها، وعین تنظر
ذکروا بطلعتک النبّی فهلّلوا لمّا طلعتَ من الصفوف، و کبّرُوا
فلو ان مشتاقاً تکلّف فوق ما فی وُسعه لسعَی الیک المنبرُ

(تو نے نیکی کے ساتھ روزہ رکھا اور تو بہترین روزہ دار ہے' اور اللہ کے پسندیدہ طریقے پر اب افطار کرو گے۔
یہ یوم فطر تمہیں مبارک ہو۔ یہ دن سال کا سب سے خوبصورت اور شہرت والا دن ہے۔
تو نے اپنے اقتدار کی شان ایک پُر شور لشکر کی صورت میں ظاہر کی' جس سے دین کی حفاظت بھی ہوتی ہے اور نصرت بھی۔
چنانچہ گھوڑے ہنہناتے ہیں اور سوار اپنا نسب بتاتے ہیں اور تلواریں چمکتی ہیں اور نیزے جگمگاتے ہیں۔
زمین سہمی ہوئی اپنے بوجھ سے جھکی جاتی ہے اور فضا میں ہر طرف گدلا پن ہے اور وہ خاکستری ہے۔
سورج اوپر آ گیا ہے' اور کبھی تو دوپہر میں چمکنے لگتا ہے اور کبھی لشکر کا غبار اس کی روشنی کم کر دیتا ہے۔
حتیٰ کہ جب تو اپنے پُرنور چہرے سے ظاہر ہوا تو وہ تاریکی دور ہوگئی اور وہ غبار چھٹ گیا۔
اور دیکھنے والوں نے تمہاری طرف ٹکٹکی باندھ کے دیکھا' پھر کوئی انگلی تھی جو تمہاری طرف اٹھتی تھی اور کوئی آنکھ تھی جو تمہیں دیکھتی تھی۔
تمہارے چہرے سے انہوں نے پیغمبر کو یاد کیا اور کلمہ پڑھا اور جب تو صفوں سے باہر آیا تو انہوں نے کلمۂ تکبیر بلند کیا۔
اگر کوئی مشتاق وہ کچھ کرنا چاہتا جس پر وہ قادر نہیں تھا تو منبر چل کر تمہاری طرف آتا۔)

خلیفہ متوکل اور اس کے وزیر فتح بن خاقان کو جب قتل کیا گیا تو یہ منظر بحتری نے اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا۔ چنانچہ اس نے اس کے بعد متوکل کا مرثیہ کہا اور اس میں اس نے بغیر کسی خوف کے بہت کچھ بیان کر دیا:

تغیّر وجه الجعفری وانسه و قُوِّض بادی الجعفری و حاضره
تحمّل عنه ساکنوه فجاءةً فعادت سواء دُوره و مقابُره
اذا نحن زُرناه أجدّلنا الاسی و قد کان قبل الیوم یُبهج زائره

ولم أرمثل القصر اذ ربع سربه واذ ذُعِرت اطلاؤه وجآذره
واذ صیح فیه بالرحیل' فهُتکتْ علی عجلٍ استاره و ستائره
و وحشته حتی کأن لم یقُم به انیس' ولم تحسُن لعینٍ مناظره

(متوکل کے محل جعفری کا چہرہ بدل گیا اور اس میں جو تعمیر بدوی طرز کی تھی اور جو شہری طرز کی تھی سب منہدم کر دی گئیں
اس کے باسی اچانک اس کو چھوڑ کے چل دیئے اور اس کے اندر گھر اور قبریں ایک جیسی ہو گئیں۔
جب بھی ہم اس کو دیکھنے گئے' اس نے ہمارا غم تازہ کر دیا' حالانکہ اس سے پہلے یہاں کے زائر کا دل خوش ہوتا تھا۔
میں نے ایسا محل نہیں دیکھا جب اس کے رہنے والوں کو ڈرایا گیا اور ان کے بچوں اور ان کی ماؤوں کے دلوں میں خوف پیدا کیا گیا
جب کوچ کی آواز دی گئی تو جلدی جلدی میں اس کے پردے اور چلمنیں کھینچ لی گئیں۔
اور میں نے ایسی وحشت بھی نہ دیکھی۔ یوں لگتا تھا جیسے یہاں کوئی انسان نہیں رہا اور نہ کسی آنکھ کو اس کے مناظر کبھی اچھے لگے۔)

بحتری حلب کی ایک عورت علوہ کے عشق میں مبتلا ہو گیا تھا۔ چنانچہ اس کے لیے اس نے کچھ 'غزل' کی شاعری کی۔

یا علوَ لوشئت أبدلت الصدود لنا وصلاً ولا ن لصبٍ قلبک القاسی
هل لی سبیل الی الظّهران من حلب ونشوة بین ذاک الورد والآس
اذ اقبل الراحَ والایامُ مقبلةً من أهیفٍ خنث المِعطفین میَّاس
امدّ کفّی لاخذ الکاس من رشأٍ وحاجتی کلها فی حامل الکاس
ببرد انفاسه اشفی الغلیل اذا دنا ' فقرَّبها من حرّ انفاسی

(اے علوہ' اگر تو چاہے تو ہمارے ساتھ اس بے رُخی کو وصل میں بدل دے' اور ایک عاشق کے لیے تمہارا سخت دل نرم ہو جائے۔
کیا میں حلب کے اطراف میں ظہران آ سکتا ہوں' اور کیا میں تمہارے عارضوں اور سینے کے درمیان کیف و سرور حاصل کر سکتا ہوں۔
جب حالات اچھے تھے تو میں شراب پیتا تھا اس پتلی کمر اور نرم پچھاوے والی کے ہاتھوں سے' جو اترا کر چلتی تھی۔

میں ہرن کے بچے (یعنی علوہ) سے گلاس لینے کے لیے ہاتھ بڑھاتا تھا' حالانکہ میری ساری ضرورت تو وہی تھی جس نے گلاس ہاتھ میں لیا ہوا تھا۔
اس کے سانسوں کی ٹھنڈک سے میں اپنی محبت کی تپش بجھاتا تھا' جب بھی وہ میرے قریب آتی اور اپنی سانسیں میری سانسوں کی گرمی کے قریب لے آتی۔)

## متنبّی (م ۹۶۵)

ابوالطیب احمد بن الحسین المتنبی ، جس کی شاعری معانی آفرینی' حسن ادا' جدّتِ اسلوب' نادر تشبیہات واستعارات کے استعمال اور ضرب الامثال اور حکمت کی باتوں کی وجہ سے امتیازی حیثیت رکھتی ہے' اس دور کے تین بڑے شعراء (ابوتمام' بحتری' متنبّی) میں شمار ہونے والا آخری شاعر تھا' اور ایسا شاعر کہ فن شعر کی جن بلندیوں تک وہ پہنچا' اس کے بعد اور کوئی نہ پہنچ سکا۔ اس نے اپنے دل میں بڑی بڑی اُمنگیں اور آرزوئیں بسا رکھی تھیں اور اس کی ساری عمر انہی اُمنگوں کے لیے تگ و دو کرنے میں گزری۔ یہ مقاصد اسے زندگی کے ایک دور میں حاصل بھی ہوئے' لیکن پھر یہ اس سے چھن گئے۔

متنبّی کوفہ میں غریب ماں باپ کے گھر پیدا ہوا۔ اس کا باپ کوفے میں بہشتی تھا۔ متنبّی ابھی چھوٹا ہی تھا کہ اس کا باپ اسے شام لے گیا اور کبھی بادیہ میں اور کبھی شہروں میں اسے لیے لیے پھرا۔ اسے وہ بعض قبائل میں بھی لے کے گیا۔ کوفے میں متنبّی بعض ایسے مدارس میں داخل ہوا جہاں علوی اشراف کے بچے تعلیم پاتے تھے۔ یہاں اس نے عربی زبان' شاعری اور نحو کی تعلیم حاصل کی۔ اس کے ساتھ ہی وہ کتب خانوں کے مالکوں کے پاس بھی جانے اور ان کی کتابوں سے فائدہ اٹھانے لگا۔ لڑکپن ہی سے متنبّی کے چہرے پر غیر معمولی ذہانت کے آثار دکھائی دیتے تھے اور قوت حافظہ میں وہ بے مثل تھا۔ علم و ادب کے ساتھ اس کی رغبت اتنی بڑھ گئی کہ ورّاقین کے علاوہ وہ اپنے ہاں کے علماء اور ادباء سے بھی ملنے اور ان سے کسبِ فیض کرنے لگ گیا۔

پھر اس کا والد فوت ہو گیا۔ اس اثنا میں اگرچہ متنبّی نے لغت اور ادب کے علوم میں کافی دستگاہ پیدا کر لی تھی' تاہم اس نے محسوس کیا کہ لغت اور شاعری میں اس کا علم اس وقت تک مکمل نہیں ہوگا جب تک وہ کچھ عرصہ بادیۂ عرب میں جا کے نہ رہے۔ چنانچہ بیس برس کی عمر میں وہ بنو کلب کے بادیہ میں جا کر رہنے لگا اور ایک مدت ان کے درمیان رہ کر ان کو اپنے اشعار سناتا اور ان سے ایسی زبانی سیکھتا رہا جو بادیۂ عرب میں ابھی تک خالص اور بے میل چلی آتی تھی۔ اس طرح اس نے لغت کا ایک بڑا ذخیرہ اپنے



Scanned with CamScanner

ذہن میں جمع کر لیا' جس میں کچھ اجنبی اور نامانوس الفاظ اور محاورات بھی تھے۔

متنبی شروع ہی سے اپنے آپ کو بہت کچھ سمجھتا تھا۔ وہ بلند حوصلہ ہونے کے ساتھ ساتھ فضیلت اور برگزیدگی کی کسی اعلیٰ منزل تک پہنچنے کی آرزو اپنے دل میں رکھتا تھا۔ اس کے برخود غلط ہونے کی کیفیت کا اظہار اس سے یوں ہوا کہ ابھی وہ نوعمر ہی تھا کہ اس نے لوگوں سے اپنی خلافت کے لیے بیعت لینی شروع کر دی۔ اس کی اس حرکت کی خبر جب شہر کے والی تک پہنچی تو اس نے اسے گرفتار کر کے قید خانے میں ڈال دیا۔ قید خانے سے متنبی نے ایک قصیدہ لکھ کے بھیجا جس کے ایک شعر میں کہا کہ ابھی تو میں نابالغ ہوں اور آپ نے مجھ پر حد جاری کر دی۔ اس کے اس احتجاج پر والی نے اسے رہا کر دیا۔ لیکن جاہ و منزلت کی محبت اس کے دل سے نہ نکل سکی۔ یہاں تک کہ وہ بڑا ہو گیا۔ اس کے بعد جب وہ شام کی طرف گیا تو وہاں اس نے نبوت کا دعویٰ کر دیا اور لوگوں کے ایک گروہ کو اپنی شاعری اور زباندانی کے جادو سے اس فتنے میں مبتلا کر دیا۔ اس ضمن میں اس نے کچھ ایسی چیزیں بھی کہیں جن سے اس نے قرآن کا مقابلہ کرنا چاہا۔ جب اس کی اس حرکت کا شہرہ ہوا تو اخشیدی سلطنت کی طرف سے حمص کے امیر لولو نے اسے گرفتار کر لیا اور اس وقت تک اس کو باندھ کے رکھا جب تک اس نے اس دعویٰ سے توبہ نہ کر لی اور اس کے ساتھی اسے چھوڑ کر نہ چلے گئے۔

جب وہ دوسری مرتبہ قید خانے سے باہر آیا تو باوجود نہ چاہنے کے متنبی (مدّعیٔ نبوت) کا لقب اس سے چپک گیا۔ بعض لوگوں کا خیال ہے کہ اس کو جو قید میں ڈالا گیا تو وہ اس کے دعوائے نبوت کی وجہ سے نہیں تھا بلکہ ایک سیاسی بغاوت کی وجہ سے تھا (غالباً وہی جس کا اوپر ذکر ہوا) البتہ متنبی کا لقب اس کا یوں پڑا کہ بقول اس کے شاگرد ابن جنی کے' جب اس نے یہ شعر کہا کہ :

أنا فی أمۃ تدارکها الله      غریبٌ کصالح فی ثمود

(میں ایک ایسی اُمت میں ہوں جسے اللہ نے نوازا ہے' مگر ایسا اجنبی ہوں جیسے قوم ثمود میں صالح تھے۔)

تو لوگوں نے کہا کہ اس نے اپنے آپ کو ایک نبی کا مماثل قرار دیا ہے۔ چنانچہ اس دن سے وہ اسے متنبی (اپنے آپ کو نبی سمجھنے والا) کہنے لگے۔ ابن جنّی کا کہنا ہے کہ اگر اس نے باقاعدہ نبوت کا دعویٰ کیا ہوتا تو اس کے مخالف شعراء اور ادباء اس کے درپے ہو جاتے اور اس پر ایسے ایسے اعتراضات وارد کرتے کہ اسے ان سے جان چھڑانی مشکل ہو جاتی۔

اس کے بعد متنبی اپنی آرزوؤں کی تلاش میں دور دراز کے سفروں پر نکل کھڑا ہوا۔ اس کا زادِ راہ صرف اس کا صبر تھا اور اس کا ساز و سامان اس کی قوتِ ارادی اور حوصلہ تھا' جیسا کہ اس کے شعر سے ظاہر



Scanned with CamScanner

۴: وحیدٌ من الخلّان فی کل بلدةٍ　　　اذا عظم المطلوب قلّ المساعد
(ہر شہر میں دوستوں کے بغیر اکیلا ہوں۔ جب مقصد بڑا ہو تو مدد کرنے والے کم رہ جاتے ہیں۔)

یا ان شعروں سے:

ضاق صدری وطال فی طلب الرزق　　　قیامی و قلّ عنہ قعودی
ابداً اقطع البلاد و نجمی　　　فی نحوس و همّتی فی سعود

(میرا سینہ گھٹن کا شکار ہے اور رزق کی تلاش میں میرا قیام لمبا ہو گیا ہے اور بیٹھنا کم نصیب ہوتا ہے۔
میں شہر شہر گھومتا پھرتا ہوں۔ میرا ستارہ تو نحس کے برج میں ہے، لیکن میری ہمت بڑی سعید ہے۔)

وہ اسی طرح نگر نگر گھومتا رہا، یہاں تک کہ انطاکیہ کے والی ابوالعشائر کے پاس جا پہنچا اور اس کی مدح میں اشعار کہے۔ اس نے متنبی کی اچھی آؤ بھگت کی اور جب اتفاق سے حمدان کے امیر سیف الدولہ کا وہاں سے گزر ہوا تو ابوالعشائر نے متنبی کو اس کے سامنے پیش کیا اور اس کی تعریف کی اور ادب وشعر میں اس کے مقام سے اسے آگاہ کیا۔ سیف الدولہ نے بڑی عزت وتکریم کے ساتھ اسے اپنے پاس رکھ لیا۔ تاہم متنبی نے سیف الدولہ سے ملتے ہی اس کے سامنے کچھ شرطیں رکھیں۔ ایک یہ کہ وہ جب بھی اس کے سامنے شعر پڑھے گا، بیٹھ کر پڑھے گا، دوسری یہ کہ متنبی پر اس کے سامنے زمین کو بوسہ دینے کی پابندی نہیں ہوگی۔ چنانچہ سیف الدولہ کے دربار میں وہ ان شرائط کے ساتھ داخل ہوا۔ سیف الدولہ نے متنبی کو گھڑ سواری اور جنگجوئی کی تربیت دینے والوں کے پاس بھیج دیا، جنھوں نے اسے گھڑ سواری اور حملہ کرنے اور تلوار چلانے کے گُر سکھائے۔ یہ اس لیے کہ سیف الدولہ چاہتا تھا کہ متنبی جس طرح حالتِ امن میں اس کے ساتھ رہتا ہے، اسی طرح حالتِ جنگ میں بھی اس کے ساتھ رہے۔ سیف الدولہ نے شاعر کو اتنا دیا کہ اس کا دامن بھر دیا اور اسے دنیا کی تمام نعمتیں پوری طرح سے حاصل ہو گئیں۔ چنانچہ اس بارے میں وہ کہتا ہے:

ترکتُ السُّری خلفی لمن قلّ مالہ　　　وأنعلتُ افراسی بنعُماک عسجداً
وقیّدتُ نفسی فی هواک محبّةً　　　ومن وجد الاحسان قیداً تقیّدا

(میں نے شبانہ سفر اپنے پیچھے ان لوگوں کے لیے چھوڑ دیا جن کے ہاتھ تنگ ہیں اور تمہاری کرم فرمائیوں سے اپنے گھوڑوں کو سونے کے نعل لگائے۔



Scanned with CamScanner

میں نے تمہاری محبت میں اپنے آپ کو قید کر لیا اور اگر کوئی احسان کو قید جانے تو وہ خود قید ہو جاتا ہے۔)

سیف الدولہ کے پاس متنبی نو برس رہا اور اس سارے عرصے میں اس نے سوائے اُس کے کسی اور کی مدح نہ کی۔ اس نے سیف الدولہ کے بارے میں جو کچھ کہا' وہ اس کے پورے کلام کا ایک تہائی حصہ بنتا ہے۔ لیکن پھر حالات ایک جیسے نہ رہے اور بعض حاسدوں کے بھڑکانے کی وجہ سے ان دونوں کے درمیان کشیدگی پیدا ہو گئی۔ اس پر متنبی سیف الدولہ کو چھوڑ کر مصر کی طرف جا نکلا۔ وہاں اس نے امیرِ مصر کافور اخشیدی کی مدح کی' اس امید میں کہ وہ اس سے وہ کچھ حاصل کر لے گا جو وہ سیف الدولہ سے حاصل نہیں کر سکا تھا۔ اور کافور نے بھی اس سے وعدہ کر لیا کہ اسے کسی علاقے کا امیر یا والی بنا دے گا۔ لیکن وقت گزرنے پر جب کافور نے شاعر میں فخر و غرور اور تعلّی کے آثار دیکھے تو اپنے وعدے سے پھر گیا۔ اس پر اس کے حواریوں نے اسے ملامت کی تو کہنے لگا کہ بھائیو! جس نے آنحضرتؐ کے بعد نبوت کا دعویٰ کر دیا تو کیا وہ کافور کے بعد پوری مملکت پر قبضے کا دعویٰ نہیں کر دے گا۔ اصل میں متنبی کافور کو شروع دن سے ہی پسند نہیں کرتا تھا۔ اس نے اس امیر کی مدح میں جتنے بھی قصائد کہے ان کے بین السطور میں وہ ناپسندیدگی اور حقارت صاف پڑھی جا سکتی ہے جو وہ اس کی طرف محسوس کرتا تھا۔ اس نے کافور کی مدح میں پہلا ہی قصیدہ جو کہا اس کا مطلع تھا:

کفی بک داءً ان تری الموت شافیاً وحسبُ المنایا ان یکن امانیا

(تمہارے لیے یہ بیماری کافی ہے کہ تو موت کو شفا سمجھنے لگے اور موت کے لیے یہ کافی ہے کہ انسان اس کی تمنا کرنے لگے۔)

اس کے باوجود وہ کافور کی مدح میں قصائد کہتا رہا' اگرچہ ہر قصیدے کے آخر میں وہ شکوہ و شکایت اور تاکید و اصرار کے مضامین ضرور لاتا۔ جب ان باتوں کا کافور پر کوئی اثر نہ ہوا' جیسا کہ اس کے اس شعر سے ظاہر ہے:

أبا المسک! هل فی الکاس فضلٌ اناله فانی أغنّی منذحینٍ و تشرب

(اے ابوالمسک! کیا تمہارے جام میں کچھ بچ گیا ہے جسے میں لے لوں' اس لیے کہ میں گاتا جا رہا ہوں اور تم پیتے جا رہے ہو۔)

تو متنبی نے مصر سے نکل جانے کا عزم کر لیا۔ اس کے لیے اس نے پوری تیاری کر لی اور عید کی شب کو



Scanned with CamScanner

(وہ شوخ اور مغرور جس کو بارش نے سرخ زیور اور سبز ردا پہنا دی ہے۔
اس کے لئے گھٹاؤں کا پانی چاندی بن کے بہتا ہے۔ اور اس کے پہلوؤں میں چمکدار سونا بن کر جم جاتا ہے)

ایک چھوٹی سی ندی جو کسی مرغزار میں جا نکلتی ہے اور جس کے راستے میں کئی پیچ وخم اور متعدد مناظر آتے ہیں۔ اس کے بیان میں شاعر کہتا ہے:

للّہ نہر سال فی بطحاء — اشھی وروداً من لَمیٰ الحسناء
متعطّف مثل السوار کأنہ — والزھر یکنفہ مجرّ سماء
قدرقّ حتی ظُنّ قرصاً مُفرَغاً — من فضۃ فی بردۃ خضراء
و غدت تحفّ بہ الغصون کانھا — ھدب یحفّ بمقلۃ زرقاء
والماء أسرع جَرْیہ متحدّرا — متلوّیاً کالحیّۃ الرّقطاء
والریح تعبث بالغصون و قدجری — ذھب الاصیل علی لُجَین الماء

(کیا کہنے اس نہر کے جو کشادہ وادی میں بہتی ہے۔ اس کے پھولوں کا رنگ ایک حسینہ کے ہونٹوں کی رنگت سے زیادہ من پسند ہوتا ہے۔
کنگن کی طرح بل کھاتی ہوئی۔ گویا کہ وہ اپنے اردگرد پھولوں کے درمیان آسمان کی کہکشاں ہے۔
کبھی کبھی وہ تنگ ہو جاتی ہے تو لگتا ہے کہ وہ سبز چادر میں لپٹی چاندی سے ڈھلی ہوئی ایک گول ٹکیہ ہے۔
شاخیں اس پر ایسے جھک کے آتی ہیں جیسے وہ نیلی آنکھوں کے اوپر جھکی ہوئی پلکیں ہوں۔
پانی کی سب سے تیز رفتار وہ ہوتی ہے جب وہ نشیب میں اترتا ہے اور ایک چتکبرے سانپ کی طرح بل کھاتا ہوا جاتا ہے۔
ہوا شاخوں کے ساتھ کھیلتی ہے اور ڈھلتے سورج کا سونا پانی کی چاندی پر بہتا جاتا ہے)

پھر وہ ملک اندلس کی تعریف میں کہتا ہے۔

یا اھل اندلس للّہ درّکم — ماء و ظلّ و انھار و اشجار
ما جنۃ الخلد الافی دیارکم — ولو تخیّرتُ ھذی کنت اختار
لا تختشوا بعدھا ان تدخلوا سقراً — فلیس تُدخل بعد الجنّۃ النار


Scanned with CamScanner

(اے اہل اندلس' تم کتنے خوش نصیب ہو (کہ تمہارے ملک میں) پانی ہے' سایہ ہے' نہریں ہیں اور درخت ہیں۔
جنت الخلد تمہارے اس وطن میں ہی ہے' اگر مجھے اختیار دیا جاتا تو میں اسی ملک کو اپنے لئے چن لیتا۔
اس کے بعد تمہیں یہ پریشانی نہ ہو کہ تم کبھی جہنم میں داخل ہو گے۔ اس لئے کہ جنت کے بعد کوئی جہنم میں نہیں جاتا)

ایک دفعہ ایک خیالی صورت رات بھر اس کے ساتھ رہی' تو اس کے بارے میں شاعر کہتا ہے:

| | |
|---|---|
| ورداء ليل بات فيه معانقي | طيف ألمّ لظبية الوعساء |
| فجمعتُ بين رضابه و شرابه | و شربتُ من ريق و من صهباء |
| ولثمت في ظلماء ليلة وفرة | شفقا هناك لوجنة حمراء |
| والليلُ مشمطُ الذوائب كبرةً | خرف يدبّ على عصا الجوزاء |
| ثم انثنى والسكر يسحب فرعه | ويجرّ من طرب فضول رداء |
| نفّاحة الانفاس الا انها | حذرَ النوى خفّاقة الافياء |

(اور رات کے پردے میں میرے ساتھ لگ کر سویا' ایک خیالی وجود ریت کے ٹیلے کی ہرنی جیسا۔
میں نے اس کے لعاب دہن اور شراب کو ملا دیا' اور کبھی اس لعاب سے پیا اور کبھی شراب سے۔
میں نے رات کے گھنگھور اندھیرے میں سرخ گال کے شفق کو بوسہ دیا۔
وہ رات جس کی صبح ہونے والی تھی' بڑھاپے کی وجہ سے اپنے حواس میں نہ تھی اور برج جوزاء کی لاٹھی ٹیک کر چل رہی تھی۔
پھر وہ خیالی وجود دوہرا ہوا اور مست ہو کر اپنے بالوں میں ہاتھ پھیرنے لگا اور ترنگ میں آ کر چادر کے فالتو حصے کو کھینچنے لگا۔
وہ اونچے اونچے سانس لیتی تھی' لیکن جدائی کے ڈر سے اس کا دل سایوں کی طرح پھڑپھڑاتا تھا۔)

ابن خفاجہ شعراء کی اکثریت سے اس بارے میں مختلف ہے کہ اپنے قصیدے کی ابتدا اس نے کبھی تغزل اور عشقیہ مضامین سے نہیں کی۔ بلکہ اس کی اکثر نظمیں وصف نگاری سے شروع ہوتی ہیں۔ اگر اپنی شاعری میں تکلف اور آرائش بیان سے کام نہ لیتا تو وہ فطرت کے شعراء میں ممتاز ہوتا۔ تاہم اس کی شاعری منتخب الفاظ' خوبصورت عبارات اور نادر تشبیہات کی وجہ سے اپنا حسن رکھتی ہے' جسے پڑھ کر قاری



پڑھے ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا۔

## لسان الدین بن الخطیب (م ۱۳۷۴)

اندلس کا آخری بڑا ادیب اور شاعر ذوالوزارتین (دو وزارتوں والا) ابوعبداللہ لسان الدین ابن الخطیب ۱۳۱۳ میں غرناطہ میں پیدا ہوا۔ اس کے خاندان میں علم تھا' عزت تھی اور سرداری تھی۔ علماء سے اس نے عربی زبان کے علوم' نیز شریعت' فلسفہ' طب' ریاضی اور تاریخ میں تعلیم حاصل کی اور ان سب میں اپنے ہم عصر ادبائے اندلس کے مقابلے میں فوقیت حاصل کر لی۔ پھر اپنی شاعری اور ادب کی وجہ سے غرناطہ کے سلطان ابوحجاج یوسف کے ساتھ اس کا تعلق قائم ہوا۔ سلطان نے پہلے تو اسے اپنا سیکرٹری رکھا' پھر اپنا وزیر بنا لیا اور ملکی امور اسے سونپ دیئے' جس سے اس کا اثر و نفوذ بہت بڑھ گیا۔ اور اسے بڑی اہمیت حاصل ہو گئی۔ ابوحجاج کی وفات کے بعد اس کے بیٹے محمد الغنی نے بھی اسے وزارت کے منصب پر بحال رکھا۔ اسی اثناء میں حاسد اور بدخواہ لوگوں نے سلطان اور اس کے درمیان کشیدگی پیدا کر دی۔ یہ دیکھ کر لسان الدین بھاگ کر افریقہ چلا گیا۔ وہاں کے بادشاہوں نے پہلے تو اس کی عزت و تکریم کی۔ لیکن پھر کچھ ناخوشگوار واقعات کی وجہ سے انہوں نے اسے دشمنوں کے حوالے کر دیا' اور ان لوگوں نے اسے فاس میں قید میں ڈال دیا اور علماء کی ایک جماعت کو اکسایا کہ اس کے فلسفیانہ خیالات کی وجہ سے اس پر الحاد کا الزام لگائے۔ چنانچہ بعض شرارت پسند لوگ قید خانے کی دیوار پھاند کر اس تک پہنچ گئے اور اس کا گلا گھونٹ کر اسے مار دیا۔ ابن خلدون سے اول اول اس کی دوستی تھی لیکن جب وہ بھی غرناطہ آ گیا تو ابن الخطیب بعض لوگوں کی لگائی بجھائی کے نتیجے میں اس سے بگڑ گیا اور یہی بات ابن خلدون کی غرناطہ سے واپسی کا سبب بنی۔

لسان الدین ایک قابل نثر نگار تھا۔ سجع بندی اس کی طبیعت اور مزاج میں تھی۔ اس لئے بہت مسجع و مقفع نثر لکھتا تھا اور اندلس کے دوسرے اہل قلم کی طرح وہ بھی اپنے مکاتیب میں بہت طوالت سے کام لیتا تھا۔ اندلس والوں کی نثر عام طور پر تکلف و تصنع کا نمونہ ہوتی تھی۔ اہل مشرق کے خلاف یہ لوگ شاعری تو اپنے طبعی میلان سے کرتے تھے لیکن نثر میں بہت تکلف و آرائش سے کام لیتے تھے۔

لسان الدین کی شاعری نفیس الفاظ' پسندیدہ معانی اور قابل قبول بدائع و صنائع سے عبارت ہے۔ اس دور کے اندلس میں علم و ادب کی سربراہی اسی کو حاصل تھی۔ اس کی شاعری قادر الکلامی اور پختہ گوئی کا اچھا نمونہ ہے اور اس کے موشحات بھی لوگوں میں کافی مقبول رہے۔ ابن الخطیب کو تاریخ میں بھی کافی درک

تھا۔ چنانچہ اس میں اس کی ساٹھ تصانیف بتائی جاتی ہیں، جن میں سب سے اہم اور مشہور اس کی کتاب ''الاحاطہ فی تاریخ غرناطہ'' ہے۔ جو تین جلدوں میں غرناطہ کے رجال کی تاریخی دائرۃ المعارف ہے۔ اسی وجہ سے اسے ذو الوزارتین (دو وزارتوں والا) کہا گیا، یعنی ایک وزارت تلوار کی اور دوسری قلم کی' یا یوں کہیے کہ ایک وزارت حکومت و سیاست کی اور دوسری علم و ادب کی۔

**نمونۂ کلام:** ابن سہل کے موشح کے مقابلے میں اس نے جو موشح نظم کیا' اس میں وہ کہتا ہے:

جادک الغیث اذا الغیث ھمیٰ　　یا زمان الوصل بالاندلس
لم یکن وصلک الا حُلُماً　　فی الکری او خلسة المختلس

(تم پر بادل برسے جب بھی وہ گھر کر آئے۔ اے وہ دن جب اندلس کا وصل میسر تھا۔
تمہارا وصل ایک خواب ہی تھا جو سوتے میں دیکھا' یا وہ ایک جھپٹنے والے کی جھپٹ تھی)

ما لقلبی کلما ھبّت صبا　　عاده عید من الشوق جدید
کان فی اللوح له مکتتباً　　قوله : ان عذابی لشدید
جلب الھم له والوصبا　　فھو للاشجان فی جھد جھید
لاعج فی أضلعی قد اضرما　　فھی نار فی ھشیم الیبس
لم یدع فی مھجتی الاذماء　　کبقاء الصبح بعد الغلس

(میرے دل کو کیا ہوا ہے کہ جب بھی صبا چلے اس کا شوق پھر سے نیا ہو جاتا ہے۔
اس کے لئے لوح محفوظ میں یہ قول لکھا ہوا تھا کہ ''میرا عذاب بہت شدید ہوتا ہے۔''
اس نے اپنے لیے پریشانی اور دکھ درد جمع کر لیے' اب وہ خواہشوں کی وجہ سے بہت مصیبت میں ہے۔
میرے پہلوؤں میں اک آگ ہے جو بھڑک اٹھی ہے' ایسی آگ جو خشک بھوسی میں لگ جایا کرتی ہے۔
اس نے میرے دل میں بس زندگی کی رمق ہی چھوڑی ہے' جیسے اندھیرے کے بعد صبح کی ہلکی روشنی رہ جائے)

ایک موقع پر ابن الخطیب عیسائیوں کے خلاف امیر تیونس سلطان ابوعنان حفصی سے مدد مانگنے کے لئے ایک وفد کو ساتھ لے کر گیا اور اپنا مدعا نظم میں یوں بیان کیا:

خلیفةَ اللہ ساعد القدرُ　　علاک مالاح فی الدُجی قمرُ



ودافعت عنک کف قدرته　　ما لیس یستطیع دفعه البشر
وجھک فی النائبات بدر دجی　　لنا وفی المحل کفک المطر
والناس طرّاً بارض اندلس　　لولاک ما أوطنوا وما عمروا
وجملة الامر انه وطن　　فی غیر علیاک ماله وطرٌ
ومن به . مذ وصلت حبلهم　　ما جحدوا نعمة وما کفروا

(اے اللہ کے خلیفہ! تقدیر آپ کی رفعتِ شان کو اس وقت تک قائم رکھے جب تک اندھیرے میں چاند نکلتا ہے۔
اور اس کی قوت کا ہاتھ آپ کی ان آفات سے حفاظت کرے جن کو دور کرنا انسان کے بس میں نہیں ہے۔
مصائب میں آپ کا چہرہ ہمارے لئے اندھیرے کا چاند ہے اور خشک سالی میں آپ کا ہاتھ ہمارے لئے بارش ہے۔
ارض اندلس کے سارے لوگ' اگر آپ نہ ہوتے تو نہ وہ اس سرزمین کو وطن بناتے اور نہ اسے آباد کرتے۔
ساری بات یہ ہے کہ یہ ایسا وطن ہے کہ سوائے تمہاری عزت و سربلندی کے اس کا اور کوئی مقصود نہیں ہے۔
اور جو بھی اس میں بستے ہیں' جب سے تم نے ان سے تعلق قائم کیا ہے' انہوں نے نہ کسی نعمت کا انکار کیا ہے' نہ اسے جھٹلایا ہے)

ایک بار اس نے معتمد کی قبر پر کھڑے ہو کر کچھ شعر کہے تھے جن میں سے چند یہ ہیں:

قد زرت قبرک عن طوع باغمات　　رأیت ذلک من اولی المھمّات
لم لا ازورک یا أندی الملوک یداً　　ویا سراج اللیالی المدلھمّات
وأنت من لو تخطیٰ الدھر مصرعه　　الی حیاتی لجادت فیه ابیاتی

(میں اپنی خواہش سے اغمات میں تمہاری قبر پر حاضر ہوا۔ میرے لئے یہ میرا اولین فریضہ تھا۔
میں تمہاری زیارت کے لیے کیسے نہ آؤں اے سب سے سخی بادشاہ اور اندھیری راتوں کے چراغ۔
تو وہ ہے کہ اگر زمانہ تیرے انجام کو پھلانگ کر میری زندگی تک آ جاتا تو میں اس کی تعریف میں شعر کہتا۔)

اس وقت اسے یہ کہاں معلوم ہوگا کہ اس کا اپنا انجام معتمد سے کہیں زیادہ سنگین ہوگا۔ یہ سنگینی اور بھی بڑھ جاتی ہے جب ہم یہ سنتے ہیں کہ اس کے شاگرد ابن زمرک نے بھی اس سلسلے میں اس کے ساتھ غداری کی تھی۔

نثر کا نمونہ: شوق کے موضوع پر اس کا ایک مختصر خط ہے۔ ابن خلدون کے نام' جو خوب مسجع و مقفع ہونے کے باعث اس کے خاص طرز تحریر کی نمائندگی کرتا ہے۔ نمونے کے طور پر چند سطریں:

اما الشوق فحدّث عن البحر ولا حرج' واما الصبر فسل به ايّة درج.....
لكن الشدة تعشق الفرج' والمؤمن ينشق من روح الله والأرج. والى بالصّبر على إبَر الدّبُر' بل الضرب الهَبْر......

(رہی شوق کی بات تو یہ ایسا سمندر ہے جس کی کوئی تھاہ نہیں ہے۔ رہی صبر کی بات تو اس کے متعلق کسی بھی قاصد سے پوچھ لو...... لیکن شدت کو راحت کی خواہش ہوتی ہے اور مومن اللہ کی مہربانی اور اس کی خوشبو سے اپنا مشام معطر کرتا ہے۔ اور صبر ہو بھی تو کیسے۔ شہد کی مکھی کے ڈنک پر' یا ایک ایسی ضرب پر جو کاٹ کے رکھ دیتی ہے......)

☆......☆......☆

قرون وسطی کی عرب ثقافت میں اندلس کا عربی ادب ایک روشن باب ہے۔ یہ صحیح ہے کہ عرب ہسپانوی شاعروں کے ہاں مشرق کے عرب شعراء کی سی گہرائی اور فکر نہیں ملتی جو مثلاً ابوتمام' متنبی اور معری کے کلام میں دکھائی دیتی ہے۔ لیکن ان لوگوں کو مشرق والوں کے مقابلے میں اس اعتبار سے فوقیت حاصل ہے کہ ان کے ہاں خیال کی وضاحت' اظہار کی نفاست' ادائیگی کا حسن اور شاعرانہ تخیل زیادہ ہے اور ان کی زبان نسبتاً سادہ اور سلیس ہوتی ہے۔

سپین کی تاریخ میں عربی دور مغرب اور مشرق کے درمیان وسیع اور گہرے ادبی اثرات کے باہمی تبادلے کا دور ہے۔ اندلس کے واسطے سے ہی قدیم مشرقی' یونانی' اور عرب ثقافتی روایات یورپ تک پہنچیں۔ حقیقت یہ ہے کہ مشرق اور مغرب کے درمیان ثقافتی اور تہذیبی تبادلے میں ہسپانوی عربوں نے بیچ کے واسطے کا جو کردار ادا کیا اس کی اہمیت اتنی زیادہ ہے کہ اس کا صحیح اندازہ نہیں کیا جا سکتا۔ یہ تہذیبی تبادلہ عالمی تہذیب کی شکل میں بہت مفید اور بارآور ثابت ہوا۔

☆......☆......☆



# فاطمی دور

## مصر میں نثر نگاری اور شاعری

خلیفہ متوکل علی اللہ کے بعد عباسیوں کو زوال آ گیا۔ ان کے والیوں نے ان کی مملکت کے حصے بخرے کر دیئے۔ باغی ان کے بڑے علاقے پر قابض ہو گئے۔ اس لوٹ کھسوٹ میں علوی فاطمیوں نے بھی حصہ لیا اور ان کی مملکت سے یکے بعد دیگرے شمالی افریقہ اور پھر مصر' شام اور حجاز لے لئے۔

پہلے فاطمی خلیفہ نے ۹۰۹ میں قیروان میں حکومت قائم کی۔ پھر ان کے چوتھے خلیفہ المعزلدین اللہ نے اپنے سپہ سالار اور سیکرٹری جوہر صقلی کو ایک بڑا لشکر دے کر مصر کی طرف بھیجا۔ اس نے مصر فتح کر لیا اور وہاں اپنے سلطان کے لئے قصر کبیر اور اللہ کے لئے جامع الازہر کی بنیاد رکھی۔ پھر ان دونوں کے گرد ایک بڑی فصیل تعمیر کی اور یہاں قاہرہ کا شہر آباد ہوا جو فاطمیوں کا دارالسلطنت قرار پایا۔ مصر میں ۹۶۸ سے لے کر ۱۱۷۱ تک چودہ فاطمی خلفاء ہوئے اور آخر میں اس پر صلاح الدین کا غلبہ ہو گیا۔ ان زمانوں میں اسلامی مملکت میں تین علم لہراتے تھے۔ عباسیوں کا سیاہ علم بغداد میں' اندلسیوں کا سبز علم قرطبہ میں' اور فاطمیوں کا سفید علم قاہرہ میں۔ جہاں تک عربی علوم و آداب اور اسلامی تہذیب و ثقافت کے مظاہر کا تعلق ہے وہ اقتدار کے ان تینوں مراکز میں پھلتے پھولتے رہے۔ شعراء کی قدر دانی' علماء کی تائید و حمایت' مدارس کا قیام اور کتب خانوں کی توسیع...... ان سب میں ہارون الرشید اور مامون نے ایشیا میں' خلیفہ الناصر اور اس کے بیٹے حکم نے یورپ میں اور عزیز باللہ اور اس کے بیٹے حاکم نے افریقہ میں ایسے یادگار کام کیے کہ جن کے اثرات بعد کے زمانوں تک محسوس کیے گئے۔ عزیز باللہ نے اپنے محل میں جو خزانہ کتب تعمیر کیا' اس میں فقہ' نحو' حدیث' تاریخ اور دوسرے علوم پر ایک لاکھ کے قریب کتابیں تھیں۔ اسی طرح حاکم بامراللہ نے مامون کے "بیت الحکمۃ" کے نمونے پر "دارالحکمۃ" کی بنیاد رکھی جس میں ادباء' علماء' فقہاء' اطباء وغیرہ جمع ہوتے اور اس میں مباحثے کرتے اور ایک دوسرے کو اپنے نتائج فکر پیش کرتے۔ ادھر جامع الازہر میں جب ہر طرف سے علم کے طالبین کھنچ کھنچ کر آنے لگے تو تعلیم کا یہ ادارہ

رفتہ رفتہ ترقی کر کے سب سے بڑا اسلامی مدرسہ بن گیا' شہر قاہرہ بھی فاطمیوں کے عہد میں ترقی کی منازل طے کرتا رہا یہاں تک کہ گیارہویں صدی میں تہذیب وتمدن کے عروج پر پہنچ گیا۔ یہاں شاعروں کا بھی ایک طبقہ پیدا ہوا۔ لیکن انہوں نے بغداد کے شعراء کے آخری دور کے اسالیب کو اپنایا جن میں لفظی آرائش اور تصنع وتکلف زیادہ ہوتا تھا۔ البتہ اس دور میں بعض انشا پردازوں نے قدیم اسالیب نثر کو زیادہ کامیابی اور مہارت سے برتا' جن میں سے ایک مثال القاضی الفاضل کی ہے' جو دیار مصر کا بڑا کاتب انشا (سیکرٹری) تھا اور نثر کے چوتھے طریقے کا جسے ''طریقہ فاضلیہ'' کہا گیا سربراہ تھا۔ وہ اپنی جوانی میں فاطمی حکومت کے آخری زمانے میں مصر آیا۔ یہاں اس نے انشاء پردازی اور حکومتی کاروبار کی تربیت حاصل کی اور اس وقت کے بڑے بڑے قاضیوں اور سیکرٹریوں کے نائب کی حیثیت سے کام کرتا رہا۔ جب فاطمی حکومت کا زوال ہوا تو القاضی الفاضل نے صلاح الدین ایوبی کے وزیر کا عہدہ سنبھالا اور مملکت کے امور بڑی قابلیت کے ساتھ سرانجام دیے۔ وہ ابھی وزیر ہی تھا کہ صلاح الدین کی وفات ہو گئی۔ القاضی الفاضل نے اس کے بعد اس کے بیٹے عزیز کے لئے اور بعد ازاں اس کے بھائی افضل کے لئے وزیر کا کام کیا اور بالآخر ۱۲۰۰ میں انتقال کیا۔

یوں تو اس دور میں مصر میں بہت سے شعراء ہوئے۔ لیکن ان میں کمال الدین ابن النبیہ' ابن الفارض' ابن عربی اور بہاؤ الدین زہیر (یا البہاء زہیر) ایسے ہیں جو خاص ذکر کے قابل ہیں۔ ذیل میں ان کے مختصر حالات اور ان کے کلام کے کچھ نمونے دیے جاتے ہیں۔

## کمال الدین ابن النبیہ (م ۱۲۲۲)

اس شاعر کی نشوونما کے بارے میں کچھ زیادہ معلوم نہیں۔ بس اتنا پتا چلتا ہے کہ اس کی زندگی ایک دھیمے انداز میں بڑے سکون سے گزری۔ سیاست کا ان دنوں ہر طرف شور تھا' لیکن اس نے اپنے آپ کو اس سے بالکل الگ تھلگ رکھا۔ اس نے صرف ایوبی سلاطین کی مدح کی۔ پھر یہ الملک الاشرف موسیٰ کے ہاں پہنچا اور اس کے لئے سیکرٹری کا کام کیا۔ اس کا نصیبین میں بھی قیام رہا جہاں ۱۲۲۲ میں اس نے وفات پائی۔

ابن النبیہ کی شاعری میں برجستگی ہے' نکتہ طرازی ہے اور اسلوب میں نظم وترتیب ہے لیکن اس کے ساتھ ساتھ صنعت بدیع کا استعمال بہت زیادہ ہے۔ شاعر لفظی آرائش کے پیچھے جاتا ہے' لیکن اس کے شعر پڑھتے ہوئے ایسا نہیں لگتا کہ اس نے اس کی خاطر کوئی بڑی محنت کی ہے' یا تکلف کیا ہے۔ اس کی



شاعری کے تین ہی موضوع ہیں: ایک مدح جو سب کی سب ایوبی امراء کے لئے ہے' دوسرا تغزل اور تیسرا وصف نگاری' جو اس کے کلام میں علیحدہ تو نہیں دکھائی دیتے' البتہ اپنے مدیہ قصائد کے آغاز کے لئے شاعران سے کام لیتا ہے۔ حسن وعشق کی شاعری میں وہ محبوب کی شکل وصورت اور اس کے چشم وابرو کی تعریف تک ہی محدود رہتا ہے' اس سے آگے وہ قلبی احساس یا جذبے کی گہرائی تک نہیں جاتا۔

نمونۂ کلام: عباسی بادشاہ ناصرلدین اللہ کی مدح میں ابن النبیہ کہتا ہے

باکر صبوحک أهنى العيش باكره     فقد ترنّم فوق الغصن طائره
والليل تجرى الدرارى فى مجرّته     كالروض تطفو على نهر ازاهره
وكوكب الصبح نجّاب على يده     مخلّق تملأ الدنيا بشائره
خذمن زمانك ما أعطاك مغتنماً     وأنت ناهٍ لهذا الدهر آمرُه
فالعمر كالكاس تُستحلى اوائله     لكنه ربما مرّت أواخره

(صبح کی شراب سویرے پیا کرو کہ زندگی کا لطف اول وقت میں ہے' اور شاخ پر بیٹھے ہوئے طائر نے بھی سر نکالا ہے۔
اور رات کو چمکدار ستارے اس کی کہکشاں میں چلتے ہیں۔ جیسے ایک گلستان کہ اس کے پھول نہر پر تیرتے ہوں۔
اور صبح کا ستارہ اس کے لئے ایک پیغام رساں کی طرح ہے' اچھی مہک والا' جو دنیا میں بشارتیں بکھیر دیتا ہے۔
اپنے زمانے سے وہ کچھ لے لو جو وہ تمہیں غنیمت کے طور پر دے دے۔ ویسے تو تم ہی اس وقت کے حکم دینے والے اور منع کرنے والے ہو۔
عمر شراب کے جام کی طرح ہے جس کے پہلے جرعے بہت لذیذ ہوتے ہیں' لیکن اس کے آخری جرعے اکثر کڑوے ہوتے ہیں۔)

اس نظم میں غزل کے کچھ اشعار یوں ہیں:

ساق تكوّن من صبح ومن غسق     فابيضّ خدّاه واسودّت غدائره
سود سوالفه' لُعس مراشفه     نُعس نواظره' خُرس اساوره
مهفهف القد يندى جسمه ترفاً     مخضّر الخصر عل الردف وافره
تعلّمت بانة الوادى شمائله     وزوّرت سحر عينيه جآذره



Scanned with CamScanner

(ایک ساقی جس میں صبح کا رنگ بھی ہے اور شب کی تاریکی بھی۔ اس کے گال تو سفید ہیں' لیکن اس کے بالوں کے جوڑے سیاہ ہیں۔
اس کی گردن کے بال سیاہ ہیں' اس کے ہونٹ اندر سے سرخ ہیں' اس کی آنکھیں مخمور ہیں اور اس کے کنگن بے آواز ہیں۔
وہ نازک اندام ہے۔ اس کا جسم آسودہ حالی سے شاداب لگتا ہے' بہت ہی مختصر کمر والی اور نرم اور وافر پچھاوے والی۔
وادی میں بانہ کے درخت نے اس کی اچھی صفات اخذ کر لیں' اور نیل گائے کے بچوں نے اس کی آنکھوں کے سحر کا روپ بھر لیا)

## ابن الفارض (م ۱۲۳۴)

ابوحفص عمر بن علی' جو ابن الفارض کے لقب سے مشہور ہوا۔ ایک ایسا شاعر ہے جس نے اپنی شاعری میں عشق و محبت کے مضامین بیان کئے اور ایک ایسے محبوب کی بات کی جسے آپ چاہیں تو خدا قرار دے سکتے ہیں اور چاہیں تو کوئی خوبصورت انسانی وجود سمجھ سکتے ہیں۔

اس کے آباء و اجداد حماۃ سے تھے اور وہ خود قاہرہ میں پیدا ہوا۔ وہیں اس نے دینی علوم پڑھے اور لغت و ادب میں بڑی استعداد پیدا کی۔ وہ اپنے متعلق بتاتا ہے کہ وہ شروع دن سے ہی دنیا سے کنارہ کشی کرنے کا خواہشمند تھا۔ اس مقصد سے وہ اپنے والد سے اجازت لے کر مقطم پہاڑ کی وادی کے ایک کونے میں جا کر بسیرا کر لیتا' اور کئی کئی دن اور راتیں لوگوں سے الگ تھلگ رہ کر گزارتا۔ پھر وہ اپنے باپ کے پاس رہنے کے لئے مجبوراً شہر میں آ جاتا۔ کچھ دن آبادی میں بسر کرنے کے بعد اس کا دل پھر سے اسے مجبور کرتا کہ تنہائی اور خلوت میں چلا جائے۔ اس طرح اس نے کئی مرتبہ شہر اور جنگل کے درمیان آنا جانا رکھا۔ اس اثناء میں اس کے والد کو قضا کا منصب پیش کیا گیا' لیکن اس نے اسے قبول نہ کیا اور اپنے عہدے سے استعفیٰ دے کر وہ بھی عزلت کی زندگی گزارنے لگ گیا۔ کچھ عرصہ بعد جب وہ فوت ہوا تو ابن الفارض نے مستقل طور پر تجرد' لوگوں سے اجتناب اور زہد و تقشف کی زندگی گزارنی شروع کر دی۔ ایک دن ایک صوفی نے اسے مشورہ دیا کہ اگر وہ اپنے نفس کی تربیت کرنا چاہتا ہے تو مکے چلا جائے۔ چنانچہ وہ سفر کر کے مکۃ المکرمہ پہنچ گیا۔ وہاں اس نے پندرہ برس قیام کیا اور سب مقامات مقدسہ کی زیارت کر لی۔ اس کے بعد وہ قاہرہ واپس آ گیا۔ اب اس کی شخصیت میں زہد و تقویٰ کا ایسا نور جھلکنے لگا تھا کہ لوگ اس کے لیے عقیدت کا اظہار کرنے اور اس کا قرب حاصل کرنے کے لیے ایک دوسرے سے



سبقت لے جانے کی کوشش کرنے لگے۔ وہ اپنی درویشانہ اور صوفیانہ زندگی کے باوجود خوبصورت اور دلآویز شخصیت کا مالک تھا۔ اچھا صاف ستھرا لباس پہنتا' لوگوں سے میل ملاپ رکھتا اور اس کے ساتھ ساتھ رہن سہن میں بہت باوقار اور پرہیزگار رہتا۔ وہ جب شہر میں چلا جا رہا ہوتا تو لوگ اس کی طرف برکت اور دعا کے لئے ہجوم کر کے آتے۔ جب وہ کسی مجلس میں جاتا تو لوگ اس کے لحاظ کے مارے بات نہیں کرتے تھے۔ اسی طرح اس نے قاہرہ میں اپنی باقی زندگی لوگوں میں ہردلعزیز اور معزز و محترم شخصیت کی حیثیت سے گزار دی اور ۱۲۳۴ میں قاہرہ میں فوت ہوا اور جبل مقطم کی وادی میں دفن ہوا۔

ابن الفارض ایوبیوں کے دور میں پروان چڑھا تھا۔ یہ وہ زمانہ تھا کہ اس میں دو بالکل متضاد عوامل کام کر رہے تھے۔ ایک طرف مستقل حالت جنگ اور قحط اور اموات کی کثرت کی وجہ سے بعض لوگوں میں تصوف و تقویٰ کا رجحان پایا جانے لگا تھا' اور دوسری طرف فسق و فجور کا عالم تھا کہ لوگ ان بے سکون حالات میں چند روزہ زندگی اس طرح گزارنا چاہتے تھے کہ اس میں عیش و عشرت ہو' شراب نوشی ہو اور شہوت پرستی ہو۔ چنانچہ مصر میں اور اس کے باہر شاعر کے سامنے زندگی کے یہی دو راستے تھے۔ ایک وہ جس میں خدا کی رضا مطلوب تھی اور دوسرا وہ جس میں شیطان کے پیچھے چلنے کی خواہش تھی۔ ابن الفارض جس نے دینی تربیت پائی تھی اور اس کی نشوونما صوفیانہ طریقے پر ہوئی تھی اس کے لیے اس کے سوا کوئی چارہ نہ تھا کہ وہ شاعری میں پہلا راستہ یعنی طبقہ صوفیہ کا طریقہ اختیار کرے۔ انہی کے اشارات کی بات کرے' انہی کے مقامات بیان کرے اور شراب اور عشق و محبت کا ذکر اس طرح سے کرے کہ اس سے مقصود ذات الٰہی ہو۔ اس طرح ابن الفارض عربی زبان میں رمزیہ (Symbolic) شاعری کا پہلا اور اہم نمائندہ قرار پاتا ہے۔ شعراء میں وہ سب سے زیادہ اپنے کلام کی نوک پلک درست کرنے اور صنعت بدیع سے کام لینے والا ہے۔ تجنیس اور طباق کا وہ دلدادہ ہے۔ اور اپنے معاصرین میں سب سے زیادہ گہری شاعری کرنے والا! اس کے کلام میں نرمی اور نزاکت ہے اور ایسے مضامین ہیں جو ایک طرف زاہد اور صوفی کو مطمئن کرتے ہیں تو دوسری طرف ایک اوباش عاشق کو بھی! پہلا اس کے اندرونی معانی سے غرض رکھتا ہے اور دوسرا اس کے ظاہری معانی سے۔ چنانچہ ابن الفارض کا کلام صوفیہ اپنی مجالس ذکر میں پڑھ کر سناتے تھے اور عیاش اور بدکار لوگ اپنی ناؤ نوش کی محفلوں میں اسے گاتے تھے۔ ابن الفارض کے دیوان کی ایک شرح بورینی نے کی ہے' جو صرف ظاہری الفاظ سے غرض رکھتی ہے اور دوسری شرح جو صوفیانہ انداز میں کی گئی ہے وہ نابلسی کی ہے۔

ابن الفارض کی شاعری میں سب سے مشہور اس کی دو تائیہ نظمیں ہیں' جن میں ایک طویل ہے اور چھ سو اشعار پر مشتمل ہے۔ دوسری کم طویل ہے' جس میں تقریباً ایک سو تین اشعار ہیں۔ ان دونوں نظموں

میں صوفیہ کے مقاصد اور ان کے راز ہائے دروں کا ذکر ہے۔ اس لئے ان نظموں کو وہی صبر کے ساتھ پڑھ سکتا ہے جس میں یہ صوفیانہ گتھیاں سلجھانے کا حوصلہ ہو۔ بڑی نظم کے مطلع کے دو شعر ہیں:

نعم بالصبا قلبی صبا لأ حبّتی     فیا حبّذا ذاک الشذا حین هبّت
تذکّرنی العهد القدیم لانها     حدیثة عهد من أهیل موڈتی

(ہاں میرے دل میں میرے محبوبوں کے لئے اشتیاق ہے' کیسی اچھی ہے وہ تیز خوشبو جب وہ چلتی ہے۔
وہ مجھے گزرا زمانہ یاد دلاتی ہے' اس لئے کہ میرے اہل مودت کے ساتھ اس کا رشتہ حال ہی میں جڑا ہے)

ابن الفارض کی باقی شاعری صاف اور واضح ہے' اس میں حجاز اور اس میں رہنے والوں اور اس کے پہاڑوں اور بستیوں کو بڑے شوق اور حسرت سے یاد کیا جاتا ہے۔

**نمونہ کلام:** تغزل کے باب میں شاعر کہتا ہے:

لم أخلُ من حسدٍ علیک فلا تُضع     سهری بتشییع الخیال المُرجَف
واسأل نجوم اللیل' هل زار الکری     جفنی؟ وکیف یزور من لم یعرف

(تمہارے بارے میں میں حسد سے کبھی خالی نہیں ہوا۔ پس ایک غلط خیال اڑا کر میرے جگراتے کو خراب نہ کرو۔
رات کے ستاروں سے پوچھو' کیا نیند نے میری پلکوں کو چھوا بھی ہے؟ اور وہ آئے بھی کیسے جو میری نگاہوں کے لئے اجنبی ہے)

ایک اور جگہ کہتا ہے:

أعد ذکر من اهوی ولو بملام     فان احادیث الحبیب مدامی
کأن عذولی بالوصال مبشّری     وان کنت لم اطمع برد سلامی
صحیح علیل فاطلبونی من الضّنی     ففیها کما شاء النحول مقامی

(میرے محبوب کا مجھ سے ذکر کرو' چاہے ملامت کے ساتھ ہی کیوں نہ ہو' اس لئے کہ محبوب کی باتوں میں شراب کا نشہ ہوتا ہے۔
گویا کہ وصال پر مجھے ملامت کرنے والا' مجھے اس کی بشارت دے رہا تھا' اگرچہ میں نے تو یہ



بھی نہ چاہا کہ وہ میرے سلام کا جواب دے۔
میں صحیح بھی ہوں' علیل بھی' تو آپ لوگ مجھے ناتوانی میں ہی ڈھونڈیں' اس لئے کہ میں کمزوری کے باعث اسی حالت میں ہوں گا۔)

خمر کے موضوع پر شاعر کہتا ہے' اور اس میں کافی صوفیانہ علامات ہیں:

شربنا علی ذکر الحبیب مدامة     سکرنا بها من قبل ان یُخلق الکرْمُ
ولو لا شذاها ما اهتدیت لِحانها     ولولا سناها ما تصورّها الوهمُ
یقولون لی : صفها فانت بوصفها     خبیر' اجل عندی باوصافها علم
صفاء ولا ماء و لطف ولا هوا     و نور ولا نار' و روح ولا جسم
تقدّم کلّ الکائنات حدیثها     قدیماً ولا شکل هناک ولا رسم
وقالوا شربت الاثم' کلا وانما     شربتُ التی فی ترکها عندی الاثم
فلا عیش فی الدنیا لمن عاش صاحیاً     ومن لم یُمت سُکرا بها فاته الحزم
علی نفسه فلْیبک من ضاع عمره     ولیس له فیها نصیب ولا سهم

(محبوب کے ذکر پر ہم نے شراب پی اور اس کے نشے میں مست ہو گئے۔ قبل اس کے کہ انگور کی نسل پیدا کی جاتی۔
اگر اس کی خوشبو نہ ہوتی تو میں اس کے مے خانہ تک نہ پہنچ سکتا تھا۔ اور اگر اس کی چمک نہ ہوتی تو میرا خیال اس کا تصور بھی نہ کر سکتا۔
مجھ سے کہتے ہیں: اسے بیان کر کہ تو اس کے اوصاف سے واقف ہے۔ ہاں میرے پاس اس کے اوصاف کا علم تو ہے۔
وہ صاف و شفاف ہے' لیکن پانی نہیں۔ وہ لطیف ہے لیکن ہوا نہیں' وہ روشنی ہے لیکن آگ نہیں' وہ روح ہے لیکن جسم نہیں۔
اس کا ذکر ساری کائنات سے بھی پہلے چلا آتا ہے' لیکن اس کی نہ کوئی شکل ہے' نہ تصویر۔
انہوں نے کہا کہ تو نے گناہ یعنی شراب پی ہے۔ کبھی نہیں' میں نے تو وہ کچھ پیا ہے جس کے چھوڑنے میں گناہ ہے۔
اس دنیا میں اس کی کوئی زندگی نہیں جو ہوش میں رہ کر جیا' اور جو مدہوش ہو کر نہیں مرا وہ عاقبت اندیشی سے دور رہا۔
جس کی عمر ضائع ہو گئی اسے اپنے آپ پر ہی رونا چاہیے۔ اس لئے کہ اسے زندگی میں سے کوئی


Scanned with CamScanner

حصہ بھی نہ ملا۔)

## ابن العربی (م ۱۲۴۰)

ابن العربی کی پیدائش اگرچہ اندلس میں ہوئی تھی' لیکن پھر وہ مصر سے ہوتا ہوا حجاز آ گیا اور یہاں اس نے کافی طویل عرصہ گزارا۔ اس کے بعد وہ بغداد' موصل اور ایشیائے کوچک کی طرف نکل گیا اور آخرکار دمشق میں آ کر رہنے لگا اور یہیں وفات پائی۔ ابن العربی بنیادی طور پر ایک صوفی تھا اور مسلم صوفیہ میں وہ سب سے بڑا صوفی قرار دیا جاتا ہے اس کے ساتھ ساتھ وہ شاعر بھی تھا اور اس کی صوفیانہ شاعری کا مجموعہ "ترجمان الاشواق" کے نام سے مشہور ہے۔ شاعری میں اس نے جاہلی اور عباسی دور کے شعراء کا طرز اپنایا اور اس کے ساتھ اندلس کی صنف موشح کو بھی اپنی شاعری میں برتا۔ لیکن جہاں تک صوفیانہ شاعری کا تعلق ہے اس میں اس کا معاصر ابن الفارض جس کا اوپر ذکر ہوا' نہ صرف ابن العربی کے مقابلے میں' بلکہ تمام صوفی شعراء میں سب سے بڑا شاعر تسلیم کیا جاتا ہے۔

محی الدین ابن العربی الحاتمی الطائی اندلس کے شہر مرسیہ میں پیدا ہوا۔ آٹھ برس کی عمر میں وہ اشبیلیہ چلا آیا اور اپنے زمانے کے مشاہیر سے اس نے حدیث' فقہ اور دوسرے علوم پڑھے۔ ۱۲۰۱ء میں اس کے سفروں کا سلسلہ شروع ہوتا ہے' جو اسے پہلے حجاز' پھر بغداد' موصل اور ایشیائے کوچک تک لے گئے۔ حجاز میں اس نے سارا عرصہ مکہ مکرمہ کے جوار میں گزارا۔ وہ اپنے وطن اندلس واپس آنے سے پہلے ہی دمشق کے عرصہ قیام میں فوت ہو گیا۔ اس کی قبر وہاں جبل قاسیون کے دامن میں اسی کے نام کی ایک مسجد میں واقع ہے۔ فقہ کے معاملات میں وہ ظاہری مذہب کا پیرو تھا' لیکن صوفیانہ خیالات و تصورات میں وہ سراسر باطنی تھا۔ اس نے بے شمار کتابیں لکھیں جن کی تعداد دو سو کے قریب پہنچتی ہے۔ ان میں سے اس کی دو تصانیف "فتوحات مکیہ" اور "فصوص الحکم" نمایاں حیثیت رکھتی ہیں اور بہت مشہور ہیں۔ "فتوحات" بارہ جلدوں میں پانچ سو ساٹھ ابواب پر مشتمل ایک ضخیم کتاب ہے جس میں صوفیانہ علم و معرفت کا پورا نظام پیش کیا گیا ہے۔ اس کتاب کی تصنیف مکہ مکرمہ میں ہوئی۔ "فصوص الحکم" (حکمتوں کے نگین دان) ستائیس بڑے پیغمبروں کے وجود اور اہمیت کے بارے میں ہے۔ جو دمشق میں لکھی گئی۔ ابن العربی کی آخری تصانیف بہت مبہم اور عسیر الفہم ہیں۔ بالخصوص "فصوص" مبہم ترین ہے۔ اس کا اسلوب رمزیہ ہے اور بیان انتہائی اصطلاحی قسم کا۔ یہ بات بعید از قیاس نہیں کہ ابن العربی نے ان امور کو جنہیں بڑی سادگی اور سلاست سے بیان کیا جا سکتا تھا' جان بوجھ کر مبہم اور پیچیدہ بنانے کی کوشش کی۔ اور اس تدبیر سے اس



نے یہ خیال' راسخ العقیدہ اور راہ تصوف سے بے خبر لوگوں کی نظر سے اپنے وحدت الوجودی عقائد کو چھپانے کی کوشش کا ایک راستہ پیدا کیا۔ تاہم بہت سے علمائے دین نے ابن العربی کے بظاہر بے ادب اور کافرانہ اقوال کی وجہ سے اسے بدعتی قرار دیا اور اس کے اس طرح کے عقائد کو کہ مثلاً خدا انسان میں حلول کر سکتا ہے یا انسان خدا کے ساتھ مل کر اتحاد کی منزل پا سکتا ہے کفر اور گمراہی کے درجے میں رکھا۔ لیکن دوسری طرف ایسے جلیل القدر علماء بھی رہے جنہوں نے ابن العربی کے افکار و تصورات کا دفاع کیا۔ ان میں مجد الدین فیروز آبادی' جلال الدین سیوطی اور عبدالرزاق الکاشانی کا ذکر کیا جا سکتا ہے۔ متاخرین میں سے عبدالوہاب الشعرانی کے نام کا اضافہ کر لینا کافی ہے۔۔۔۔۔ حاصل کلام یہ کہ ابن العربی اپنی مخصوص فکر' اپنے تصورات اور اپنے خاص طرز اظہار کی وجہ سے پوری ملت اسلامیہ میں سب سے زیادہ متنازعہ (Controversial) شخصیت چلی آتی ہے۔ ایک طرف وہ لوگ ہیں جو اسے ولی کامل سمجھتے ہیں اور انہوں نے اسے "الشیخ الاکبر" کا لقب دیا ہے۔ ان کے خیال میں وہ علم باطنی میں ایسی سند تھا جس میں کلام ہی نہیں ہو سکتا۔ دوسری طرف ایک ایسا گروہ ہے جس کے نزدیک وہ بدترین قسم کا ملحد تھا۔ ان لوگوں میں رضی الدین بن الخیاط' ذہبی' ابن تیمیہ اور ابن ایاس شامل ہیں۔ لیکن ہمیں یہاں جس ابن العربی سے سروکار ہے وہ شاعر ابن العربی ہے' جس نے تصوف کی شاعری میں رمز و ایماء سے کام لیتے ہوئے بہت اچھے نقوش چھوڑے۔

ابن العربی نے اپنی شاعری میں چھوڑے ہوئے کھنڈرات' محبوب کی نقل مکانی' اونٹنی اور بادیہ عرب کے مقامات اور ناموں کا ذکر کیا ہے۔ اس میں اس کا طبعی میلان زیادہ تر قدرتی مناظر' کھیتوں اور باغات کی طرف دکھائی دیتا ہے۔ چنانچہ اگر ہم اس کا کوئی قصیدہ پڑھیں اور اس کے صوفیانہ معانی کو ایک طرف رکھ کر اس کے صرف ظاہری اور سامنے کے معانی کو لیں تو دلوں پر اس کا اچھا اثر پڑتا ہے۔۔۔۔۔ جو کچھ بھی ہو ابن العربی ایک زرخیز اور حساس طبیعت رکھنے والا وجود ہے' جو بیک وقت مفکر ہے۔ شاعر ہے' اعلیٰ ثقافت کا حامل ہے اور نفس کی گہرائیوں میں اترنے کا خاص ملکہ رکھتا ہے۔ کوئی شک نہیں کہ تصوف و عرفان کی دنیا کو ابن العربی نے اپنے افکار سے بہت متاثر کیا۔

**نمونۂ کلام:** ابن العربی کی وحدت الوجود ایک ایسا مذہب ہے جس نے تمام مذاہب کا احاطہ کر لیا ہے اور تمام اعتقادات کو اس طرح متحد کر دیا ہے جس طرح کہ واحد حقیقت مطلق تمام اشیاء کا احاطہ کر کے انہیں متحد کرتی ہے۔ اس خیال کو ابن العربی نے حسب ذیل شعر میں ظاہر کیا ہے۔



Scanned with CamScanner

صح عند الناس انی عاشق     غیر ان لم یعرفوا عشقی لمن

(یہ بات کہ میں عشق میں مبتلا ہوں لوگوں پر ظاہر ہے۔ لیکن وہ اس ذات سے بے خبر ہیں جس سے مجھے عشق ہے)

اور پھر اپنے دیوان "ترجمان الاشواق" کے ان اشعار میں:

لقد صار قلبی قابلاً کلَّ صورة     فمرعیً لغزلانٍ و دیرٌ لرُهبان
وبیتٌ لأوثان و کعبة طائف     والواح توراةٍ و مصحفُ قرآن
ادین بدین الحب انی توجّهتْ     رکائبه فالحب دینی و ایمانی
لنا اسوة فی بشر هند واختها     وقیسٍ و لیلیٰ ثم میّ و غیلان

(میرا دل ہر صورت کے لائق ہے۔ وہ غزالوں کے لئے چراگاہ ہے اور راہبوں کے لئے دیر ہے۔
وہ بتوں کا گھر بھی ہے اور طواف کرنے والے کا کعبہ بھی۔ اس میں تورات کی الواح (تختیاں) بھی ہیں اور قرآن کا مصحف بھی۔
میں محبت کے دین کا ماننے والا ہوں' چاہے اس کے مرکبوں کا رخ کہیں بھی ہو' اس لئے کہ محبت ہی میرا دین ہے اور ایمان ہے۔
ہمارے لئے نمونہ ہے بشر ہند میں اور اس کی بہن بثینہ میں' اور قیس و لیلیٰ میں اور میّ و غیلان میں کہ ان سب کا دین و ایمان بھی محبت ہی تھا)

عربی کی قدیم اور روایتی غزلیہ شاعری کے انداز میں ابن العربی کہتا ہے:

فیا حادی الاجمال ان جئت حاجراً     فقف بالمطایا ساعةً ثم سلِّم
وناد القباب الحمر من جانب الحمی     تحیّة مشتاق الیکم متیّم
فان سلَّموا فاهد السلام مع الصَّبا     وان سکتوا فارحل بهم و تقدم
الی نهر عیسی حیث حلّت رکابهم     وحیث الخیام البیض من جانب الفم
وناد بدعد والرباب و زینب     وهند و سلمی ثم لُبنی و زمزم
و سلهن هل بالحلبة الغادة التی     تریک سنا البیضاء عند التبسّم

(اے اونٹوں کے لئے حدی گانے والے' اگر تیرے سامنے زمین کی یا ذہن کی رکاوٹ آ جائے تو اپنی سواریوں کو ایک ساعت کے لئے روک لینا اور سلام کرنا۔
اور سرخ قبوں کو آواز دینا محفوظ مقام سے' اور کہنا کہ آپ کے مشتاق اور دیوانے کی طرف سے



آپ کو سلام ہے۔
پس اگر وہ جواب میں سلام کہیں تو اسے صبا کے حوالے کر دینا' اور اگر وہ خاموش ہو جائیں تو اپنی سواریوں کے ساتھ آگے چل دینا۔
نہر عیسیٰ کی طرف جہاں ان کے قافلے نے پڑاؤ کیا ہو گا اور جہاں نہر کے دہانے کی طرف سے ان کے سفید خیمے لگے ہوں گے۔
اور وہاں آواز دینا دعد کو' رباب کو' زینب کو اور ہند و سلمیٰ کو' پھر لبنیٰ اور زمزم کو۔
اور ان سے پوچھنا کہ کیا حلبہ میں وہ نرم و نازک لڑکی رہتی ہے جو جب مسکراتی ہے تو تمہیں لگتا ہے سورج کی روشنی ہو گئی ہے)

متنبی کی زمین میں ابن العربی کا ایک بہت عمدہ قصیدہ ہے' کہتا ہے:

بابی الغصون المائلات عواطفا     العاطفات علی الخدود سوالفا
المرسلات من الشعور غدائراً     اللیّنات معاقداً و معاطفا
الساحبات من الدلال ذلا ذلاً     اللأبسات من الجمال مطارفا
الباخلات بحسنهن صیانة     الواهبات تالداً ومطارفا
المونقات مضاحکا و مباسما     الطیّبات مقبّلا و مراشفا
الناعمات مجرّدا والکاعبات     منهّداً والمُهدیات ظرائفا
الخالبات بکل سحرٍ معجب     عند الحدیث مسامعاً ولطائفا
الساترات من الحیاء محاسناً     تسبی بها القلب التقیّ الخائفا

(قسم باپ کی' یہ کیسی شاخیں ہیں جو گالوں پر جھکی پڑتی ہیں اور گردن تک آتی ہیں۔
وہ بالوں کو لے کر چٹیا بناتی ہیں۔ وہ گرہ کی جگہ پر بھی اور اوڑھے جانے کی جگہ پر بھی نرم ہوتی ہیں۔
وہ ناز و نخرے میں اپنے دامن کھینچتی ہیں اور حسن کی چادر میں لپٹی رہتی ہیں۔
حفاظت کی خاطر وہ اپنے حسن کے معاملے میں بخیل ہوتی ہیں' لیکن اپنی نئی اور پرانی عنایات لوگوں کو عطا کرتی رہتی ہیں۔
وہ ہنس رہی ہوں یا مسکرا رہی ہوں بہت خوبصورت ہوتی ہیں' ان کا بوسے کا مقام اور ہونٹ بھی بہت پاکیزہ ہوتے ہیں۔
وہ جب کپڑے اتار دیں تو بے حد نرم ہوتی ہیں' اور ان کی چھاتیاں بڑے پستانوں والی نوخیز لڑکیوں کی طرح ہوتی ہیں' اور وہ انسان کو ہوشیاری اور زیرکی کی طرف اشارہ کرتی ہیں۔

وہ بات کرتے ہوئے اپنے عجیب وغریب جادو سے سننے والوں کے کانوں اور دلوں کو اپنے بس میں کر لیتی ہیں۔

حیا کی وجہ سے وہ اپنے ان محاسن کو چھپاتی ہیں جن سے وہ ایک متقی اور ڈرنے والے انسان کا دل اپنے قابو میں کر لیں)

اوپر ابن العربی کی کچھ نظموں کا لفظی ترجمہ پیش کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ اگرچہ ان نظموں کے الفاظ خوبصورت اور شاعرانہ تھے۔ لیکن ان سے قابل فہم معانی اخذ کرنے میں خاصی مشکل پیش آئی۔ اصل میں ان نظموں کے اصل اور صحیح معانی کا ادراک صرف حضرات صوفیہ کو ہی ہو سکتا ہے۔ ابن العربی کے دیوان "ترجمان الاشواق" کا جو خوبصورت ایڈیشن حال میں بیروت سے شائع ہوا ہے اس میں اس شاعر کی نظموں کے الفاظ اور مضامین کی جو تشریح نیچے فٹ نوٹس میں بہت تفصیل میں دی گئی ہے اس کا سمجھنا بھی ایک عام قاری کے بس میں نہیں ہے۔ وہ صرف ایک باعمل صوفی ہی سمجھ سکتا ہے۔

## البہاء زہیر (م ۱۲۵۸)

ابوالفضل بہاء الدین زہیر بن محمد المہلبی وزیر بھی تھا اور ایک انشا پرداز اور شاعر بھی! وہ اپنے سہل ممتنع کلام کے لئے مشہور ہوا۔ جس میں نازک غزلیہ مضامین بھی ہوتے تھے اور ایک دھیما عتاب بھی۔

وہ مکہ کے قریب وادیٔ نخلہ میں پیدا ہوا۔ پھر وہ مصر چلا آیا اور اپنی زندگی کا بیشتر حصہ اس نے یہیں گزارا۔ مصر میں اس کی نشوونما ہوئی اور اس نے شرعی علوم اور ادب کی تعلیم پائی۔ جب وہ جوان ہوا اور نثر ونظم اور انشا نگاری میں کچھ مہارت پیدا کر لی تو وہ سلطان صالح ایوبی کی خدمت میں حاضر ہوا اور شام اور جزیرہ کے سفر میں اس کے ساتھ رہا۔ جب سلطان صالح کے چچا زاد بھائی سلطان ناصر نے اس کے خلاف غلبہ پایا اور اسے شکست دے کر اسے قید کر لیا' تو معزول سلطان کے تمام سپہ سالار اور افواج اس کو چھوڑ کر اس کے چچا زاد بھائی سے جا ملیں۔ لیکن البہاء زہیر نے سلطان صالح کے ساتھ اپنا عہد وپیمان برقرار رکھا اور کسی دوسرے کی خدمت پر آمادہ نہ ہوا۔ وہ نابلس میں مقیم رہا' یہاں تک کہ حالات نے پلٹا کھایا اور ملک الصالح دیار مصر کی حکومت واپس لینے میں کامیاب ہو گیا۔ اس نے البہاء کو اپنی خدمت میں واپس بلا لیا اور اس کی دوستی اور وفاداری کی قدر کرتے ہوئے اسے اپنا وزیر اور رازداں بنا دیا۔ وہ اس کی رائے پر چلتا اور اس کے مشورے پر عمل کرتا۔ اور اس کے توسط اور سفارش سے اس نے بہت سے لوگوں کو نفع پہنچایا۔ حالات اسی طرح رہے' یہاں تک کہ سلطان صالح نے داعی اجل کو لبیک کہا۔ البہاء بھی



اب حکومت کا کاروبار چھوڑ کر اپنے گھر میں رہنے لگا۔ کچھ عرصے کے بعد قاہرہ میں ایک وبا پھوٹ پڑی' جس میں البہاء فوت ہو گیا۔ یہ وہی سال تھا جب بغداد پر تاتاریوں کا قبضہ ہوا تھا۔

بہاؤ الدین بہت اچھے اخلاق اور نرم طبیعت کا اور شیریں کلام تھا۔ اس کی یہ صفات اس کی شاعری میں بھی ظاہر ہوئیں۔ چنانچہ اس کی شاعری میں ایک نرم حلاوت پائی گئی۔ سننے والا جب اس کا کلام سنتا تو اس کی سہولت اور لطافت کی وجہ سے یہ سمجھتا کہ ایسا کلام وہ بھی کہہ سکتا ہے۔ لیکن جب وہ اس کی کوشش کرتا تو ناکام رہتا۔ البہاء کا شعر اس کی طبیعت سے پھوٹتا ہے' اس کے اندر سے برآمد ہوتا ہے۔ اور اس کے ماحول کی عکاسی کرتا ہے۔ وہ اس میں کسی کی تقلید نہیں کرتا اور اپنے شعور واحساس کے سوا کسی سے مدد نہیں لیتا۔ تغزل اور عتاب کے موضوع پر اس نے بہت عمدہ شاعری کی ہے۔ ان کے علاوہ دوسرے موضوعات میں اس نے کوئی قابل ذکر چیز پیدا نہیں کی۔ البہاء کے مضامین میں کوئی نئی بات یا کوئی بڑا تخیل دیکھنے میں نہیں آتا۔ اس کی شاعری میں بالکل عام اور سامنے کے مضامین ہوتے ہیں۔ لیکن وہ اپنے خوبصورت الفاظ اور اپنی کریم النفسی اور فیض رسانی سے ان میں تاثیر کی ایسی قوت بھر دیتا ہے جس سے وہ مضامین بلند پایہ بن جاتے ہیں۔

نمونہ کلام: ایک دفعہ البہاء جس کشتی میں سوار تھا وہ غرق ہو گئی۔ وہ خود تو بچ گیا لیکن اس کا سارا سازوسامان جاتا رہا۔ چنانچہ وہ حالات کے نشیب سے دل شکستہ آدمی (یعنی اپنے آپ) کو مخاطب کر کے کہتا ہے:

لا تعتب الدھر فی خطب رماک بہ — ان استرد فقدماً طالما وھبا

حاسب زمانک فی حالیٔ تصرّفہ — تجدہ اعطاک اضعاف الذی سلبا

واللہ قد جعل الایام دائرۃ — فلا تری راحۃ تبقی ولا تعبا

وراس مالک وھی الروح قد سلمت — لا تأسفنّ لشیٔ بعدھا ذھبا

ما کنت اول مقدوح بحادثۃ — کذا مضی الدھر لا بدعا ولا عجبا

فرب مال نما من بعد مرزأۃ — اما تری الشمع بعد القطف ملتھبا

(زمانہ جو تم پر مصیبت لایا ہے تو اسے معتوب نہ کرو۔ اگر اس نے کچھ لے لیا ہے تو بہت عرصے سے وہ دیتا بھی رہا ہے۔

اپنے زمانے کا دونوں حالتوں میں محاسبہ کرو گے تو دیکھو گے کہ اس نے جو کچھ سلب کیا ہے اس سے کئی گنا تمہیں دیا ہے۔

اللہ نے حالات میں پھیر رکھا ہے' چنانچہ نہ کوئی راحت ہمیشہ رہتی ہے اور نہ کوئی تکلیف۔
تمہاری سب سے قیمتی متاع تو روح ہے اور وہ سالم رہ گئی ہے' اس لئے کسی بھی جانے والی چیز پر افسوس نہ کرو۔
تم اس حادثے کا سب سے پہلا شکار نہیں ہو۔ زمانہ اسی طرح رہا ہے' اس میں نہ کوئی نئی بات ہے اور نہ تعجب کی چیز۔
بہت سا مال ایسا ہوتا ہے جو مصیبت کے بعد بڑھتا ہے۔ کیا تو نے دیکھا نہیں کہ شمع کٹنے کے بعد کیسے بھڑک اٹھتی ہے۔)

غزل کے موضوع پر کہتا ہے:

خلیلیّ أما هذه فديارهم — وأما غرامي فهو ما ترہان
خلیلیّ هذا موقف يبعث البكا — فماذا الذي بالدمع تنتظران
فيا ويح قلبي بالغرام أطعته — فمالي أراه في السلوّ عصاني
وانى وإياه كما قال قائل — رفيقك قيسي وأنت يماني

(میرے دو دوستو یہ جو گھر ہیں تو یہ ان کے دیار ہیں' اور میری جو محبت ہے تو اس کا حال تم دیکھ ہی رہے ہو۔
دوستو' یہ ایسی جگہ ہے جو رونے پر آمادہ کرتی ہے' تو آنسوؤں کو اب کس بات کا انتظار ہے!
اے کاش میں نے محبت کے معاملے میں دل کی بات سنی ہوتی۔ آج کیوں وہ صبر و تسلی کے معاملے میں میری بات نہیں سن رہا؟
میرا اور اس کا معاملہ ایسا ہے جیسا کسی کہنے والے نے کہا ہے کہ تمہارا دوست تو قیس قبیلے کا ہے اور تو یمانی ہے۔)

☆.....☆.....☆



# ترکی دور

## سقوطِ بغداد کے بعد قاہرہ نے بغداد اور قرطبہ کی جگہ کیسے سنبھالی

خلیفہ متوکل کے بعد بغداد میں عباسیوں کو زوال آ گیا۔ اس کی وجہ یہ کہ ایرانی اور ترک ایک دوسرے کے مدمقابل آ گئے' اور شیعہ اور اہل سنت کے درمیان اختلافات بڑھنے لگے۔ اس فضا میں خلافت کا رعب و دبدبہ جاتا رہا' اسے کئی طرح کے مصائب کا سامنا ہوا اور ہر طرف سے دشمنوں نے اسے گھیر لیا' اور پھر ہلاکو نے ۱۲۵۸ میں ایک بڑا حملہ کر کے اس کا اقتدار ختم کر دیا۔ ادھر اندلس میں بربر اور موالیوں کے غلبے کی وجہ سے اموی حکومت کمزور پڑ گئی۔ انہوں نے اسے چھوٹی چھوٹی ریاستوں میں تقسیم کر دیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ وہاں کی فرنگی طاقتوں کے لئے ان کو یکے بعد دیگرے نگل لینا آسان ہو گیا۔ چنانچہ انہوں نے ۱۴۹۲ میں اس کا بالکل ہی خاتمہ کر دیا۔ مصر اور شام میں فاطمیوں کی حکومت ایوبیوں کے ہاتھ میں چلی گئی۔ پھر یہ ممالیک کے قبضے میں آ گئی اور ان کے زیر اقتدار رہی' اور اس کے بعد ان دونوں پر ۱۵۱۶ میں عثمانی ترکوں کا قبضہ ہو گیا۔ چنانچہ آپ نے دیکھا کہ اندلس کی اموی حکومت کے زوال کے بعد کئی صدیوں تک عالم اسلام پر ایسا وقت آیا کہ اس میں کہیں کوئی عرب حکمران نہیں تھے اور نہ کہیں عربی جھنڈا لہراتا تھا۔ بلکہ ان کے ممالک اور جملہ تہذیبی آثار مغلوں' ترکوں' ایرانیوں اور پھر ہسپانویوں کی باہمی کشاکش اور چھینا جھپٹی کا ہدف (Object) بن گئے۔ ان لوگوں نے جو تہذیب سے عاری تھے بہت تخریب کاری کی' کتب خانوں کو جلا دیا' مدارس بند کر دیئے' رصدگاہوں کو گرا دیا۔ اور علماء کو تہ تیغ کر ڈالا۔ اگر ان حالات میں زمانے نے عربی زبان کو بھی زوال سے دوچار کر دیا ہوتا تو یہ کوئی بڑی بات نہ تھی۔ لیکن حوادث کے جبر اور حالات کی ناسازگاری کے باوجود عربی بلاد مغرب' مصر' شام' عراق اور جزیرہ نمائے عرب میں نہ صرف دین اور علوم کی زبان رہی' بلکہ حکومتوں اور امتوں کے درمیان بھی یہی رابطے کی زبان ٹھہری۔ اگر ترکوں کا غرور و تکبر اور ایرانیوں کا تعصب نہ ہوتا تو عربی آج سارے عالم اسلامی کی زبان ہوتی۔

عربوں کے زوال کے باوجود اگر یہ زبان باقی رہی تو اس کی وجہ قرآن حکیم اور جامع الازہر ہیں اور اس کے ساتھ مصر و شام کے وہ ایوبی اور ممالیک سلاطین ہیں جو ایران اور عراق پر چڑھ دوڑنے والے مغلوں کے مقابلے میں عربی زبان کے بڑے حامی، عربوں کے لئے جائے پناہ اور عرب علماء کے لئے معاون اور مددگار ثابت ہوئے۔ اس لئے کہ ایوبی اگرچہ نسلاً کرد تھے لیکن وہ عربی زبان بولتے تھے اور ادب عربی کا ذوق رکھتے تھے۔ چنانچہ ان میں بڑے شاعر، عالم اور مورخ پیدا ہوئے۔ نیز ان کے سائے میں ایسے جید اہل فضل و کمال ابھر کر سامنے آئے جنہوں نے عربی کے علوم کی شیرازہ بندی کی، اور ادب اور لغت میں قابل قدر تصنیفات کیں اور مجموعے مرتب کئے۔

ممالیک کے بعد جب حکومت اور اقتدار بنو عثمان کے ہاتھ میں آیا تو خلافت اب عباسی نہ رہی، بلکہ عثمانی ہو گئی اور اسلام کا دارالحکومت اب قاہرہ نہ رہا، بلکہ قسطنطنیہ ہو گیا اور سرکاری زبان عربی کے بجائے ترکی ہو گئی۔ چنانچہ عربی زبان میں باہر سے الفاظ داخل ہونے لگے اور دفاتر میں عربی اور ترکی کے درمیان مقابلہ بازی شروع ہو گئی۔ عربی کے نثری اور شعری اسلوب کو زوال آ گیا۔ علوم کے چشمے خشک ہو گئے۔ طبائع بجھ کے رہ گئیں اور ایسا لگتا ہے کہ ایک طویل عرصے تک اسلامی ممالک میں ہر طرف تاریکی چھائی رہی۔ لوگوں پر ایک طرح سے نیند کا غلبہ رہا اور وہ بالآخر اس وقت جاگے جب قاہرہ کے دروازوں پر نپولین بونا پارٹ کی توپیں گرجنے لگیں۔

اموی اور عباسی دور اور اس کے بعد فاطمی دور اور پھر ترکی دور میں جو مشاہیر اصحاب علم و فضل رہے، اور جنہوں نے عربی نثر میں اپنی وقیع اور جامع تصنیفات سے عربی ادب کو باثروت بنا دیا، ان کا ایک مختصر تذکرہ اور ان کی تصانیف کا تعارف اس سے اگلے باب میں پیش کیا جائے گا۔ اس سے پہلے البتہ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اس ترکی دور کے ان شعراء کا کچھ تذکرہ ہو جائے جو ادب و فن کی زبوں حالی کے اس دور میں پیدا ہوئے اور انہوں نے عربی شاعری میں فن کے اعلیٰ نمونے پیش کئے۔ یہ تین شاعر ہیں۔ بوصیری (قصیدہ بردہ والے)، صفی الدین الحلی اور ابن نباتہ۔

## بوصیری (م ١٢٩٥)

شرف الدین محمد بن سعید بن حماد الصنہاجی البوصیری ان کا پورا نام ہے۔ ان کا امتیاز ان کے دو نعتیہ قصیدے ہیں۔ ایک قصیدہ بردہ اور دوسرا ہمزیہ قصیدہ۔

یہ دلاص میں پیدا ہوئے، بوصیر میں پروان چڑھے اور پھر قاہرہ چلے آئے۔ یہاں انہوں نے عربی



علم و ادب کی تعلیم حاصل کی اور عربی میں سنجیدہ اور مزاحیہ دونوں موضوعات میں اچھے شعر کہنے لگے۔ انہوں نے انشا پردازی بھی کی اور دفتری امور میں منشی اور معتمد کی خدمات بھی انجام دیتے رہے۔ چنانچہ قاہرہ اور باہر کے علاقوں میں یہ کئی مناصب پر فائز رہے۔ اس کے ساتھ ساتھ یہ شاعری بھی کرتے رہے اور نعت کے موضوع پر انہوں نے جو شاعری کی وہ بہت پختہ ہونے کے ساتھ نہایت بلیغ اور خوبصورت تھی۔ جس میں انہوں نے صنعت بدیع کا کافی استعمال کیا۔ پھر یہ زہد و عبادت کی طرف مائل ہو گئے اور صوفیانہ طریقہ اختیار کر لیا۔

بوصیری کی شاعری کا بہت اعلیٰ و ارفع نمونہ البتہ ان کا قصیدہ بردہ ہے، جس کے متعلق لوگوں کا اتفاق ہے کہ یہ آنحضرت ﷺ کی مدح میں (یعنی نعت کے باب میں) کعب بن زہیر کے قصیدہ "بانت سعاد" کے بعد عربی زبان کی سب سے خوبصورت نظم ہے۔ اس قصیدے کے نظم ہونے کی کہانی یوں ہے کہ ایک دفعہ بوصیری پر فالج کا حملہ ہوا جس کے ان کے دھڑ کا ایک حصہ بالکل مفلوج ہو گیا۔ وہ بڑی تکلیف میں تھے اور روتے رہتے تھے۔ اس زمانے میں انہوں نے آنحضرت ﷺ کی مدح میں یہ قصیدہ کہا اور اللہ سے دعا کی کہ وہ انہیں اس مرض سے نجات دے۔ ایک رات سوئے تو خواب میں کیا دیکھا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لائے اور مریض کے جسم پر اپنا ہاتھ پھیرا اور اس پر ایک چادر ڈال دی۔ بوصیری جب صبح کو اٹھے تو وہ یہ دیکھ کر حیران رہ گئے کہ ان کی ساری تکلیف جاتی رہی تھی اور وہ بالکل بھلے چنگے ہو چکے تھے۔ اس واقعے کا ذکر جب گرد و پیش میں پھیلا تو اس قصیدے کا نام "قصیدہ بردہ" (چادر والا قصیدہ) پڑ گیا، اور رفتہ رفتہ لوگ اس نظم کے ساتھ کچھ کرامات وابستہ کرنے لگے اور صوفیہ حضرات کے ہاں یہ ایک خاص ذکر ٹھہرا۔

بوصیری کا قصیدہ بردہ دس ابواب پر مشتمل ایک خوبصورت طویل نظم ہے۔ اس میں صوفیانہ شاعری کی وہ زیریں لہر نہیں ہے جو مذہبی شاعری میں اکثر دیکھنے میں آتی ہے۔ اگرچہ قصیدہ بردہ میں شاعری کا معیار وہ نہیں ہے جو جاہلی دور کے، یا اموی اور عباسی دور کے بڑے شعراء کے ہاں ملتا ہے۔ لیکن بوصیری کے زمانے میں، جبکہ ادب و شعر کو ہر طرف زوال آ چکا تھا، بوصیری کا یہ قصیدہ اپنے حسن بیان اور مضامین کے اعتبار سے خوشگوار طور پر حیران کن ہے۔

**نمونۂ کلام:** قصیدے کا آغاز روایتی انداز میں ہجر و وصال اور محبت کے مضامین سے ہوتا ہے:

| | |
|---|---|
| أمن تذكر جيران بذي سلم | مزجت دمعاً جرى من مقلة بدم |
| ام هبت الريح من تلقاء كاظمة | أو أومض البرق في الظلماء من اضم |

| | |
|---|---|
| فما لعینیک ان قلت اکففا ھمتا | وما لقلبک ان قلت استفق یھم |
| أیحسب الصبّ ان الحبّ منکتم | ما بین منسجم منہ و مضطرم |

(کیا یہ ذی سلم کے ہمسایوں کی یاد ہے جس نے تیرے آنسوؤں کو لہو رنگ کر دیا ہے؟
یا کاظمہ کی طرف سے کوئی ہوا چلی ہے' یا اندھیری شب میں کوہِ اضم پر بجلی کا کوندا لپکا ہے
تیری آنکھوں کو کیا ہوا ہے کہ تو انہیں تھمنے کو کہے تو وہ اور زیادہ رواں ہوتی ہیں۔ اور تیرے دل پر
یہ کیسی آفت آئی کہ وہ تیرے سنبھالے نہیں سنبھلتا اور دیوانہ وار اٹھا پڑتا ہے۔
کیا عاشق کا یہ خیال ہے کہ باوجود اس کے بہنے والے آنسوؤں اور دل کی آہوں کے اس کی محبت
چھپی رہے گی؟)

آگے چل کر قصیدے میں نادر حکمت کی باتیں بیان ہوتی ہیں جن میں بدائع کا خوبصورت استعمال کیا جاتا ہے:

| | |
|---|---|
| والنفس کالطفل ان تُھملہ شبّ علی | حُبّ الرضاع وان تفطمہ ینفطم |
| فاصرف ھواھا و حاذر ان تولیہ | ان الھوی ما تولّی یُصم اویَصِم |
| وراعھا وھی فی الاعمال سائمۃ | وان ھی استحلت المرعی فلاتسم |
| کم حسّنت لذّۃ للمرء قاتلۃ | من حیث لم یدر ان السم فی الدّسم |
| واخشَ الدسائس من جوعٍ ومن شبعٍ | فرُبّ مخمصۃ شرٌّ من التُخم |

(نفس انسانی مانند ایک طفل کے ہے کہ اگر اسے اس کے حال پر چھوڑ دو تو وہ جوان ہونے تک دودھ کا رسیا رہے گا' لیکن اگر ایک دفعہ اس کا دودھ چھڑا دو تو وہ اس سے باز آ جائے گا۔
پس نفس کو اس کی خواہش سے روک اور اسے کہیں اپنا حاکم نہ بنا دے۔ ہوائے نفس جب غالب آ جاتی ہے تو وہ اسے یا تو مار ڈالتی ہے یا بالکل نکما کر دیتی ہے۔
جب یہ اعمال کی چراگاہ میں چر رہی ہو تو اس کی پوری پوری نگرانی کر اور اگر وہ چراگاہ کو خوشگوار سمجھنے لگے تو اسے مت چرنے دو۔
نفس کی خواہشوں کو اس طرح بنا سنوار کر پیش کرتا ہے جو اس کے لئے مہلک ہوتی ہیں۔ وہ نہیں جانتا کہ بعض دفعہ لذیذ کھانوں میں زہر ملا ہوتا ہے۔
بھوک اور سیری کی پوشیدہ خرابیوں سے ڈر' اس لئے کہ بسا اوقات بھوک شکم سیری سے زیادہ برا ثابت ہوتی ہے۔)

آنحضرت کی مدح میں بوصیری نے جو اشعار کہے ہیں ان میں سے بعض یہ ہیں:



| | |
|---|---|
| محمد سیّد الکونین والثقلین | والفریقین من عرب و من عجم |
| نبیّنا الآمر الناھی فلا أحد | أبرّ فی قول لا منہ ولا نعم |
| ھو الحبیب الذی تُرجی شفاعتہ | لکل ھولٍ من الاھوال مقتحم |
| دعا الی اللہ فالمستمسکون بہ | مستمسکون بحبلٍ غیر منفصم |
| فانسب الی ذاتہ ماشئت من شرف | وانسب الی قدرہ ماشئت من عظم |
| فان فضل رسول اللہ لیس لہ | حدٌ فیُعرب عنہ ناطق بفم |

(محمدؐ دو جہانوں کے اور جن و انس کے سردار ہیں۔ وہ عرب اور عجم دونوں فریقوں کے سردار ہیں۔
وہ ہمارے نبی ہیں' حکم دینے والے اور منع کرنے والے۔ پس امر و نہی کے بیان کرنے میں کوئی بھی ان سے زیادہ راست گو نہیں ہے۔
آپ خدا تعالیٰ کے وہ محبوب ہیں کہ مصیبتوں میں سے ہر سخت مصیبت میں آپ کی شفاعت کی توقع کی جاتی ہے۔
انہوں نے اللہ کی طرف بلایا۔ پس جو لوگ آپ کے دامن سے وابستہ ہیں۔ وہ ایک نہ ٹوٹنے والی رسی سے وابستہ ہیں۔
آپؐ کی ذات کی طرف جو کمال بھی تو چاہے منسوب کر لے اور ان کی قدر و منزلت کے بارے میں جو عظمت بھی تمہارے ذہن میں ہو قائم کر لو اس لئے کہ آنحضرت کی بزرگی کی کوئی حد نہیں ہے' تا کہ کوئی بولنے والا بیان کر سکے۔)

## صفی الدین الحلّی (م ۱۳۳۹)

صفی الدین ابوالبرکات عبدالعزیز بن علی الطائی الحلی جزیرہ نمائے عرب کا شاعر تھا۔ وہ فرات پر واقع ایک شہر حلہ میں پیدا ہوا اور وہیں پروان چڑھا اور ادب کی تحصیل کی۔ اس کے ساتھ اس نے شعر کہنے شروع کئے اور اس میں ایسا کمال دکھایا کہ اپنے وقت کا سب سے بڑا شاعر قرار دیا گیا۔ جب اس کے وطن میں امن و امان نہ رہا تو وہ ماردین کو ہجرت کر گیا اور وہاں ارتقیہ سلطنت کے ایک سلطان نجم الدین غازی کی مدح کی۔ ان لوگوں نے اس کا خوف دور کیا اور اسے اپنی پناہ میں لے لیا۔ یہاں اس نے ان کی مدح میں انتیس قصیدے کہے۔ ہر قصیدے میں انتیس اشعار تھے اور ہر شعر حروف تہجی کے ایک خاص حرف سے شروع ہوتا تھا اور اسی حرف پر ختم ہوتا تھا (یعنی وہی حرف اس شعر کی روی ہوتی تھی) یہ نظمیں "القصائد الارتقیات" کے نام سے مشہور ہوئیں۔ یہ الگ بھی شائع ہوئیں اور اس کے دیوان کے ساتھ

بھی۔

اس کے بعد صفی الدین اس سلطان کے بیٹے صالح شمس الدین کے پاس رہا۔ پھر اس نے حج کا سفر اختیار کیا اور واپسی پر مصر کی طرف چل دیا۔ جہاں اس نے سلطان ناصر بن قلاوون کی مدح کی۔ یہاں بادشاہ کے معتمد نے اس کو اپنا دیوان جمع کرنے کا مشورہ دیا۔ چنانچہ اس نے یہ دیوان بارہ ابواب پر مرتب کر کے جمع کیا۔

صفی الدین حلی کا شمار صنعت بدیع کے ائمہ میں ہوتا ہے' جنہوں نے اس میں نئی نئی چیزیں پیدا کیں اور اسے اپنے شعروں میں کسی تکلف کے بغیر استعمال کیا۔ اس نے شاعری کے تمام فنون میں طبع آزمائی کی۔ فصیح عربی میں بھی اور عامی عربی میں بھی۔ اس نے سنجیدہ شاعری بھی کی اور مزاحیہ بھی۔ اور پھر طویل قصیدوں کے ساتھ ساتھ اس نے مقطعات' موشحات' مخمسات' مشطرات' مواليا' زجل اور قوما ہر نوع کی شاعری میں اپنے جوہر دکھائے۔ دیوان کے علاوہ صفی الدین نے کچھ تصنیفات بھی کیں۔ اس کی شاعری عام طور پر بہت سہل ہوتی ہے۔ اس کے الفاظ فصیح اور اس کے مضامین بہت دل آویز ہوتے ہیں۔ سوائے اس شاعری کے جو وہ اپنے کمالات دکھانے کے لئے کرتا ہے۔ اس لئے کہ اس میں بات نہیں بن پاتی اور وہ سماعت پر گراں گزرتی ہے۔

**نمونہ کلام:** صفی الدین کی شاعری کا ایک اچھا نمونہ اس کا وہ نونیہ قصیدہ ہے جو اس نے اپنی جوانی میں کہا تھا' اور اس سے وہ شاید ابن زیدون کے نونیہ قصیدے کا جواب پیدا کرنا چاہتا تھا:

سل الرماح العوالي عن معالينا — واستشهد البيض هل خاب الرجا فينا

لما سعينا فما رقت عزائمنا — عما نروم ولا خابت مساعينا

يا يوم وقعة زوراء العراق وقد — دنّا الاعادي كما كانوا يدينونا

بضُمّرٍ ما ربطناها مسوّمة — الا لنغزو بها من بات يغزونا

وفتية ان نقل اصغوا مسامعهم — لقولنا او دعوناهم اجابونا

قوم اذا استخصموا كانوا فراعنة — يوماً وان حُكّموا كانوا موازينا

اذا ادّعوا جاءت الدنيا مصدّقةً — وان دعوا قالت الايام آمينا

لا يظهر العجز منا دون نيل منىً — ولو رأينا المنايا في امانينا

(اونچے نیزوں سے ہماری رفعتوں کے بارے میں پوچھو' اور تلواروں سے بھی گواہی لو' کیا ہم امیدوں پر پورے نہ اترے۔



جب ہم نے کوشش کی تو ہمارے عزائم ہمارے مقاصد کے مقابلے میں کمزور ثابت نہ ہوئے اور نہ ہماری مساعی ناکام رہیں۔

اے زوراء العراق کے معرکے والے دن' جب ہم نے دشمنوں کو زیر کر لیا' جیسے اس سے پہلے وہ ہمیں دبایا کرتے تھے۔

مقتر کے مقام پر ہم نے اپنے گھوڑوں کو اس لئے نشان لگا کے اور باندھ کے رکھا کہ ہم ان کو ساتھ لے کر ان سے لڑیں گے جو ہم سے لڑنے کے لئے آئیں گے۔

وہ ایسے جوان ہیں کہ جب ہم بات کریں تو وہ غور سے سنتے ہیں اور اگر ہم انہیں بلائیں تو وہ ہماری دعوت پر آتے ہیں۔

ہم ایسے لوگ ہیں کہ اگر ہماری دشمنی مول لی جائے تو ہم فرعون ہیں اور اگر ہمیں حکم بنایا جائے تو ہم انصاف کے میزان بن جاتے ہیں۔

جب وہ کوئی دعویٰ کرتے ہیں تو دنیا آ کے تصدیق کرتی ہے اور اگر وہ دعا کرتے ہیں تو زمانہ اس پر آمین کہتا ہے۔

آرزوؤں کے حصول کے راستے میں ہمارے اندر کوئی کمزوری نہیں ہوتی' اگرچہ ہمیں اپنی آرزوؤں کے راستے میں موت کے سائے دکھائی دیتے ہیں)

## ابن نباتہ (م ١٣٦٦)

شاعر اور ادیب' انشا پرداز اور مصنف جمال الدین محمد بن محمد' جو ابن نباتہ کے نام سے مشہور ہوا' ممالیک کے زمانے میں مصر کے شعراء کا سرخیل تھا۔ اس نے ابن زیدون کے رسالے کی شرح "سرح العیون" کے عنوان سے لکھی' اور صنعت توریہ (کسی شے کی حقیقت کو چھپا کر دوسری بات ظاہر کرنا) میں مشہور ادیب اور شاعر القاضی الفاضل کا صحیح جانشین ثابت ہوا۔

وہ سیف الدولہ حمدانی کے خطیب عبدالرحیم کی نسل سے تھا۔ اس کی پیدائش مصر میں فسطاط کے مقام پر ہوئی اور وہ قاہرہ میں پروان چڑھا۔ وہاں اس نے بڑے بڑے مشائخ اور اساتذہ سے علم و ادب کی تحصیل کی اور القاضی الفاضل کی شاعری اور رسائل کے مطالعے کا دلدادہ رہا۔ اور اس کے خاص اسالیب کو اس نے اپنا لیا' جن میں توریہ تھا اور توجیہ اور طباق (دو متقابل معانی کو یکجا کرنا) تھے اور ان ساری ادبی صنعتوں کو اس نے اس خوبی سے برتا کہ نثر و نظم میں وہ القاضی الفاضل کے بعد ان میں ماہر سمجھا گیا۔ پھر اس کی پیروی اس کے معاصرین میں سے بعض لوگوں نے کی' جیسا کہ صلاح الدین الصفدی



Scanned with CamScanner

اور زین الدین الوردی وغیرہ۔ ابن نباتہ کے بعد مصر و شام میں پھر کوئی شاعر ایسا نہ ہوا جو خیال کی لطافت، لہجے کی نرمی، عبارت کی مربوطی اور تمدنی مضامین کے استعمال میں اس کا مقابلہ کر سکتا۔

ابن نباتہ نے صنعت جناس کا زیادہ استعمال نہیں کیا۔ اواخر عمر میں وہ کچھ ذہنی انتشار کا شکار ہو کر محاسین کے محلے کے ایک ہسپتال میں داخل ہوا۔ اور وہیں ۱۳۶۶ میں وفات پا گیا۔

ابن نباتہ جس زمانے میں رہا وہ حوادث اور اضطراب کا زمانہ تھا۔ ادھر تاتاری حملوں کا خوف تھا اور اس پر مستزاد یہ کہ مصر میں ایسا قحط پڑا کہ بھوک کے مارے لوگ حرام جانور کھانے پر مجبور ہو گئے۔ ابن نباتہ جو کمزور اعصاب کا تھا ان حالات سے بہت متاثر ہوا اور اس کے اندر خوف بیٹھ گیا۔ چنانچہ اس کی شاعری پر اس نفسی کیفیت کا اثر صاف دکھائی دیتا ہے۔ اس کی شاعری میں قوت اور شجاعت کی باتیں نہیں ہوتیں، نہ وہ کسی کی ہجو کرتا ہے اور اگر وہ کسی پر عتاب بھی کرتا ہے تو بہت نرم اور ملائم لہجے میں۔ مثال کے طور پر وہ کہتا ہے۔

لئن ضاع مثلي عند مثلك انني ... لعمر المعالي عند غيرك اضيع
وما كان صعباً لو مننت بلفظة ... ترد بها عني الخطوب و تردع
وقلت امرؤ للشكر والاجر قابل ... وللبرّ فيه و الصنيعة موضع
ومغترب عن قومه و دياره ... اساعده والله يُعطي ويمنع

(اگر میری طرح کا انسان تمہاری طرح کے انسان کے ہاں ضائع ہو گیا، تو سرفرازیوں کی قسم وہ تمہارے علاوہ کسی اور کے ہاں اس سے بھی زیادہ ضائع ہو جاتا۔
کوئی ایسی مشکل بات تو نہ تھی کہ ایک لفظ کہہ کر مجھ پر احسان کر دیتے، اور اس سے میری پریشانیاں رفع کر دیتے۔
اور کہہ دیتے کہ یہ آدمی شکریے اور اجر کے لائق ہے اور اس کے اندر نیکی کا جذبہ بھی ہے اور کسی کے ساتھ بھلائی کرنے کا میلان بھی۔
یہ اپنے لوگوں اور اپنے وطن سے دور آیا ہوا ہے تو میں اس کی مدد کروں گا۔ اور ویسے تو اللہ ہی دینے والا اور روکنے والا ہے)

چنانچہ مظلومیت اور دست برداری ابن نباتہ کی شاعری میں ہر جگہ نمایاں ہیں۔ اس کے ہم عصر دوسرے شعراء کے ہاں اس زمانے کی زندگی کا کچھ احوال مل جاتا ہے اور وہ لوگ واقعات و حوادث کا تذکرہ بھی اپنے شعروں میں کر جاتے ہیں، لیکن ایسی کوئی چیز ابن نباتہ کے ہاں نہیں ملتی۔ یوں لگتے کہ وہ ایک تقلید پسند شاعر ہے اور قدیم شعراء کی طرح تغزل اور مدح کی شاعری کرتا جاتا ہے۔ چاہے اس کے



گرد کتنا شور و شغب ہو اور کتنے ہی فتنے اٹھ رہے ہوں، اسے صرف اپنا اور اپنے کنبے کا خیال رہتا ہے اور اس ضمن میں وہ محبت و شفقت کے جذبوں کا خوبصورت اظہار کرتا ہے۔

لیکن اپنے سارے انکسار اور عاجزی کے باوجود اسے اپنی شاعری کے حسن کا احساس ہے اور وہ اس پر فخر بھی کرتا ہے۔ چنانچہ اپنی نظموں میں اکثر وہ اپنی شاعرانہ صلاحیتوں کی بات کرتا ہے۔ مثلاً ایک قصیدے کے آخر میں کہتا ہے:

من مبلغ العُرب عن شعري و دو لته ... ان ابن عبّاد باق وابن زيدونا
حبّرتُها فيه زهراء المعاطف من ... أعلى وأنفس ما يُهدى المجيدونا
كأن الفاظها في سمع حُسّدها ... كواكب الرجم يحرقن الشياطينا

(عربوں کو میری شاعری اور اس کے موروثی سلسلے کے بارے میں کون بتائے گا کہ معتمد بن عباد بھی موجود ہے اور ابن زیدون بھی۔
میں نے اس کو اس اعلیٰ اور خوبصورت ترین پیرایہ سے آراستہ کیا ہے جو ہمارے بہترین سخنور ہمیں عنایت کرتے رہتے ہیں۔
میری شاعری کے الفاظ اس کے حاسدوں کے کانوں میں اس طرح پڑتے ہیں جیسے رجم کرنے والے سیارے شیاطین پر آگ برساتے رہتے ہیں)

ابن نباتہ نے اپنے زمانے میں ایک ادیب کی حالت زار پر بہت افسوس کیا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ موجودہ حالات میں ایک ادیب کو نہ تو کوئی مقام دیا جاتا ہے اور نہ اس کے فن کی کوئی قدر کی جاتی ہے۔ ممالیک کے زمانے میں دراصل قوم کی ساری توجہ علوم اور تصنیف و تالیف کے کاموں کی طرف ہو گئی تھی، اور شاعری کی طرف لوگ کم ہی دھیان دیتے تھے۔ چنانچہ ایک شاعر محض اپنی شاعری کے بل بوتے پر زندہ نہیں رہ سکتا تھا۔ اس صورت حال کا بیان ابن نباتہ سلطان ناصر کی مدح کرتے ہوئے یوں کرتا ہے:

وقالوا فلان رمَّ بالشعر عيشه ... فياليت اني ميّت لست اشعر
تصرّم أقصى العمر ادعوك للمُنى ... وارقب آفاق الرجاء وانظر
واصبر والايام تقتلني اسىً ... فها أنا في الدنيا قتيل مصبّر
ارى دون حظّي مسلكا متوعّراً ... اذا ما جرت فيه المُنى تتعثّر
ويخمر دمعي حين تصفّر وجنتي ... فالبس ثوب الهم وهو مشهّر
ولاذنب لي عند الزمان كما ترى ... سوى كلم كالروض تهمى و تبهر

(انہوں نے کہا کہ فلاں شخص نے شاعری کے ذریعے اپنی زندگی کو کچھ درست کر لیا ہے۔ کاش

میں مرجاتا اور یہ شاعری نہ کرتا۔

عمر کا بڑا حصہ اس میں گزرا کہ میں نے اپنی امنگوں کے لئے آپ کو آواز دی۔ اور امید کے آفاق پر نگاہ جمائے رکھی اور دیکھتا رہا۔

میں نے ایسی حالت میں صبر کیا ہے کہ زمانہ مجھے مارے ڈالتا ہے۔ اب دیکھ لو کہ میری حالت دنیا میں ایک مقتول اور مقید کی سی ہے۔

میرے سامنے ایک ایسا مشکل راستہ ہے کہ جب آرزوئیں اس پر چلتی ہیں تو گر گر پڑتی ہیں۔

میرا آنسو سرخ ہوجاتا ہے جب میرا چہرہ زرد ہو۔ اس وقت میں فکر و پریشانی کا لبادہ اوڑھ لیتا ہوں، جس کا حال سب پر آشکار ہوتا ہے

اور تم دیکھ ہی رہے ہو کہ دنیا کے نزدیک میرا گناہ اور کچھ نہیں سوائے ان الفاظ کے جو ایک چمنستان کی طرح خوبصورت بھی ہوتے ہیں اور روشنی بھی پھیلاتے ہیں)

☆.....☆.....☆



باب ۶

# عربی زبان میں علوم وفنون

## اُموی دور سے ترکی دور تک

بنو امیہ کے زمانے میں ادب و شاعری کو فروغ حاصل رہا، لیکن علوم کی طرف ان کی زیادہ توجہ نہ ہو سکی۔ اس لئے کہ وہ ایک طرف فتوحات میں مصروف تھے اور دوسری طرف مذہبی اور سیاسی گروہوں کی معاندانہ کارروائیوں نے انہیں سکون سے نہ بیٹھنے دیا۔ علوم میں انہوں نے صرف نحو، تفسیر، فقہ اور تدوین حدیث میں ابتدائی کام کیا، اور اس کے ساتھ دوسری قوموں کے علوم کا عربی میں ترجمہ کرنے کا آغاز کیا۔

لیکن علمی کاموں کا جو بیج اموی دور میں بویا گیا، اس کے ثمرات عباسی دور میں آ کر حاصل ہوئے۔

جہاں تک دوسری قوموں کے علوم کے ترجموں کا تعلق ہے۔ اس میں عباسی خلفاء میں سے دوسرے خلیفہ ابوجعفر المنصور نے پہل کی اور علم نجوم اور طب کی کتابوں کے ترجمے کرائے۔ آگے چل کر خلیفہ ہارون الرشید نے اس کام کو مزید وسعت دی۔ چنانچہ اس کے وقت میں طب، کیمیا، نجوم، الجبرا، علم نباتات اور حیوانیات کی کتابیں عربی میں منتقل کر لی گئیں۔ اس کے بعد مامون الرشید کے دور میں یہ علمی بیداری اور ترقی اپنے عروج کو پہنچ گئی۔ اس خلیفہ نے ارمینیا، سوریا، مصر اور دوسرے ممالک سے کتابوں کے انبار اونٹوں پر لدوا کر منگوائے اور دارالحکومت میں مترجمین کی جماعتوں کو ان کے ترجمے کے کام پر لگا دیا۔

چنانچہ اس وقت کے علوم وفنون میں کوئی بھی ایسا نہ رہا جس کا عربی زبان میں ترجمہ نہ کیا گیا ہو۔ ترجمے کے اس کام کے علاوہ اس عہد میں اپنے ہاں کے علوم میں بھی کافی کام ہوا اور مسلسل ہوتا رہا، چاہے وہ دینی علوم ہوں یا لغت و بیان اور عروض و قافیہ کے علوم ہوں۔ اس کے ساتھ اس دور کے مسلم اہل علم نے عملی علوم میں بھی ایجادات کیں اور مظاہر قدرت کی خالص علمی انداز میں توجیہ وتشریح کی۔ مثلاً انہوں نے مائع اور جامد اجسام کی حرکت کے قوانین مرتب کئے، وقت بتانے والی گھڑی ایجاد کی، جو ہارون الرشید نے فرانس کے بادشاہ شارلمان کو تحفے میں بھیجی۔ اسی طرح پنڈولم اور قطب نما کو متعارف کرایا، اور الجبرا کے علم میں کافی اضافے کر کے اسے ترقی دی۔ رصدگاہوں کا نظام قائم کیا اور سورج گرہن اور چاند گرہن کا ٹھیک ٹھیک حساب لگایا، وغیرہ۔ اس عباسی دور میں مدرسے اور کتب خانے قائم کئے گئے۔ ہارون الرشید



Scanned with CamScanner

نے حکم دیا تھا کہ جو بھی جامع مسجد بنائی جائے اس کے ساتھ ایک بڑا مدرسہ ضرور ہونا چاہیے۔ علم و ادب اور سائنس اور فنون کی یہ گرم بازاری اور ارتقا دولت عباسیہ کے زمانے تک کم و بیش جاری رہا۔ اس کے بعد جب تاتار کا غلبہ ہوا اور پھر ترکوں نے حکومت سنبھالی' تو علم کی یہ ساری ترقی اور نشوونما بہت حد تک رک گئی۔ لوگوں کا کام اب زیادہ تر یہ رہ گیا کہ اسلاف کی کتابوں کی شرحیں لکھیں اور ان کے خلاصے پڑھنے پر اکتفا کریں۔

عباسی دور کے متوازی اندلسی دور تھا' جو اس کے زوال کے سوا دو سو سال بعد تک رہا۔ اس کے بعد ایک دور فاطمیوں کا آیا' جو ایوبیوں اور ممالیک سے ہوتا ہوا بالآخر عثمانی ترکی دور پر ختم ہوا۔ تاریخ کے اس سارے طویل دور میں جو ۷۵۰ء میں عباسی دور کے آغاز سے لے کر ۱۷۹۸ء میں ترکی حکومت کے زوال تک ایک ہزار سال سے بھی زیادہ عرصے تک پھیلا ہوا ہے' عربوں کے ہاں مختلف علوم و فنون میں جو نشوونما ہوئی اور ان علوم میں جو ائمہ اور اساتذہ اور مشاہیر پیدا ہوئے۔ اور انہوں نے اپنی تصانیف کی صورت میں ان علوم میں تحقیق و تدوین کے جو خزانے عربی زبان و ادب کو دیے وہ ویسے تو ایک الگ کتاب کا موضوع ہے' لیکن عربی ادب کی کوئی تاریخ بھی ان کے ذکر کے بغیر مکمل نہیں کی جا سکتی۔ اس لئے اس باب میں کوشش کی جائے گی کہ سائنس اور فلسفے کے علوم کو چھوڑ کر دوسرے ادبی' لغوی' تاریخی اور دینی علوم میں' جو سماجی علوم (Humanities) کے تحت آتے ہیں' شروع سے آخر تک جو ارتقا ہوا اور ان میں جو اہم رجال پیدا ہوئے اور انہوں نے تصنیف اور جمع و تدوین کا جو کام کیا' اس کا ایک مختصر لیکن جامع تذکرہ کر دیا جائے۔ اس کے لئے یہ طریقہ اختیار کیا جائے گا کہ پہلے ایک خاص علم کا چند الفاظ میں تعارف پیش کیا جائے گا اور پھر اس میں جو علماء اور ائمہ پیدا ہوئے ان کے حالات اختصار کے ساتھ بیان کئے جائیں گے' اور اس کے ساتھ ان کی مشہور تصانیف کا ذکر ہو گا۔

## ۱۔ روایت ادب اور روایان ادب

قدیم زمانے میں چونکہ لکھنے کا رواج ابھی نہیں پڑا تھا۔ اس لئے جاہلی زمانے سے لے کر آگے تک شاعری اور ادب (خطبات' اقوال' امثال وغیرہ) کے محفوظ کرنے اور اسے آگے تک پہنچانے کا صرف ایک ہی طریقہ تھا کہ کوئی ان چیزوں کو یاد کرے اور پھر انہیں دوسروں تک پہنچانے کے لئے ان کی روایت کرے۔ ایسے لوگوں کو جو شعر و ادب کی اس طرح روایت کرتے تھے' راوی' (جمع رواۃ) کہا جاتا تھا۔ تمام جاہلی شاعری' بشمول معلقات (آویزاں نظمیں) اور اس کے بعد صدر اسلام اور اموی دور کا سارا شاعرانہ کلام اور خطبات اور اقوال و امثال ہم تک کبھی نہ پہنچ پاتے' اگر یہ راوی لوگ اس کو اپنے ذہنوں میں محفوظ



کر کے اس کی روایت نہ کرتے۔ چنانچہ عام دستور تھا کہ ہر بڑے شاعر کا کوئی نہ کوئی راوی ہوتا تھا' اور بعض صورتوں میں یہ راوی آگے چل کر خود بڑے شاعر بن کر سامنے آتے تھے۔ جیسا کہ مشہور جاہلی شاعر زہیر بن ابی سلمی پہلے اپنے سسر اوس بن حجر کا راوی تھا اور آگے چل کر وہ خود اکابر شعراء میں شمار ہوا۔ اسی طرح حطیہ' فرزدق اور جریر' ان سب بڑے شعراء کے راوی تھے' جن کے نام ہمیں معلوم ہیں۔

جاہلی اور اس کے بعد صدر اسلام اور بنو امیہ کی شاعری کے جو سب سے بڑے راوی ہوئے اور انہوں نے روایت ادب میں بڑا نام پیدا کیا وہ یہ پانچ تھے۔ حماد الراویہ' خلف الاحمر' اصمعی' ابوعبیدہ معمر بن المثنی اور ابوزید الانصاری۔ ذیل میں ان کا کچھ احوال بہت اختصار کے ساتھ دیا جاتا ہے۔

### حماد الراویہ (م ۷۷۲)

یہ کوفہ میں پیدا ہوا اور بغداد میں وفات پائی۔ اس کا باپ دیلمی تھا۔ حماد نے اپنے وسیع علم کی بدولت کافی شہرت حاصل کی۔ اس نے جاہلی اور اسلامی عہد کی شاعری اور ایام عرب کا بہت بڑا حصہ یاد کر رکھا تھا۔ اور اہل بادیہ کی خالص زبان پر اسے عبور حاصل تھا۔ چنانچہ ان دنوں اگر کسی شاعری یا شاعر کے مرتبے کا تعین کرنا ہوتا تھا تو حماد کو حکم بنایا جاتا تھا۔ جاہلی دور کے معلقات (در کعبہ پر آویزاں نظمیں) اسی نے جمع کی تھیں اور ان کی روایت کی تھی۔

### خلف الاحمر (م ۷۹۶)

یہ خود بصرے کا رہنے والا تھا' لیکن اس کے آباء و اجداد کا تعلق فرغانہ سے تھا۔ یہ بھی شاعری کے بڑے راویوں میں سے تھا اور شاعری کا نقاد ہونے کے ساتھ ساتھ خود بھی بہت اچھے شعر کہتا تھا۔ اس کی شاعری کا رنگ بالکل قدیم شعراء کا سا تھا۔ چنانچہ بعض لوگوں کا خیال ہے کہ کچھ نظمیں ایسی ہیں جو اس نے خود کہہ کر انہیں کسی بڑے جاہلی شاعر سے منسوب کر دیا' اور ان کے اعلیٰ معیار کی وجہ سے لوگوں کو بالکل پتا نہ چل سکا۔ اسی طرح کچھ لوگوں کا یہ بھی خیال ہے کہ جاہلی شاعر شنفری کی مشہور نظم "لامیۃ العرب" دراصل اسی کی تخلیق ہے۔ لیکن یہ خیال صحیح نہیں لگتا' اس لئے کہ لامیۃ العرب میں صحرا کی زندگی اور اس کے حیوانوں اور درندوں کا جو احوال بیان ہوا ہے وہ کوئی ایسا شاعر ہی نظم کر سکتا تھا جو خود بے خانماں ہو اور صحرا میں ان درندوں کے بیچ میں رہا ہو۔ ایک دوسرے بڑے راوی اصمعی نے بہت سی قدیم



Scanned with CamScanner

نظمیں خلف الاحمر سے سنیں اور پھر ان کی روایت کی۔

## اصمعی (م ۸۳۱)

ابوسعید عبدالملک نام تھا' اور دادا کے نام کی نسبت سے اصمعی کہلایا۔ اس نے بصرے میں مشہور لغوی اور نحوی الخلیل اور ابوعمرو بن العلاء سے تعلیم حاصل کی' اور خلف الاحمر سے روایت کی۔ خود اس کے تلامذہ میں سے ابوالفضل الریاشی' ابوعبیدہ اور بحستانی مشہور ہوئے۔ اصمعی نے بادیہ عرب کی خالص زبان سیکھی اور حفظ کی۔ اس کے علم و ادب کی شہرت کا سن کر خلیفہ ہارون الرشید نے اسے امین کا اتالیق مقرر کیا۔ اس کی تصنیفات میں ''کتاب خلق الانسان''۔ ''کتاب الخیل''۔ ''کتاب الابل''۔ ''کتاب الاضداد'' اور ایک شعری مجموعہ (Anthology) ''الاصمعیات'' مشہور ہیں۔ یہ بات صحیح ہے کہ اگر اصمعی نہ ہوتا تو ہم بہت سے عرب شعراء کی شاعری اور ان کے دیوانوں سے محروم رہ جاتے۔

## ابوعبیدہ معمر بن المثنی (م ۸۲۵)

یہ بصرے میں پیدا ہوا اور وہیں فوت ہوا۔ لغت و شعر کا بہت بڑا عالم تھا۔ اس نے ابوعمرو بن العلاء اور یونس بن حبیب سے اکتساب کیا۔ اور خود اس سے ابوعبید بن سلام' بحستانی اور شاعر ابونو اس نے استفادہ کیا۔ ابوعبیدہ نے عربوں کے حالات اور ان کے نسب ناموں سے متعلق بہت سی معلومات جمع کیں۔ پھر اموی دور کے دو شاعروں جریر اور فرزدق کے ادبی معرکوں اور ایک دوسرے کے خلاف کہی ہوئی ہجوؤں کا مجموعہ تیار کیا۔ یہ اپنے عقائد میں خارجی تھا' اور اس کی کتاب ''مثالب'' نے شعوبیہ کی تحریک کو یہ حوصلہ دیا کہ وہ عربوں کے خلاف ہتھیار اٹھائیں۔ اس کی متعدد کتابوں میں ''مجاز القرآن'' جو تفسیر کے موضوع پر ہے۔ نیز ''کتاب الخیل'' اور ''نقائض جریر والفرزدق'' مشہور ہیں۔

## ابوزید الانصاری (م ۸۳۱)

سعید بن اوس نام' نحو و لغت کا بڑا عالم تھا۔ اس نے ابوعمرو بن العلاء سے کسب علم کیا اور المفضل الضبی کی شاگردی اختیار کی۔ علم نحو میں یہ اصمعی اور ابوعبیدہ دونوں سے بڑا تھا اور اہل بصرہ کے ثقات میں



ان کا شمار ہوتا تھا۔ اس کی مطبوعہ تصانیف میں ''کتاب النوادر فی اللغۃ'' اور ''کتاب المطر'' مشہور ہیں۔

## ۲۔ علم نحو اور اس کے رجال

فتوحات کے نتیجے میں جب عربوں کے اقتدار کا دائرہ وسیع ہوا تو مملکت کے بعض حصوں مثلاً عراق میں عجمی لوگوں کی آبادی زیادہ ہونے لگی۔ یہ لوگ جب عربی زبان بولتے تو اس میں لحن کا ارتکاب کرتے (یعنی یہ زبان جس قاعدے سے بادیہ عرب میں بولی جاتی تھی اس سے ہٹ کر بولتے) لیکن جب قرآن کریم کے معاملے میں لوگوں سے سرزد ہونے لگا تو صورتحال سنجیدہ ہوگئی۔ چنانچہ اس امر کی ضرورت محسوس ہوئی کہ عربی زبان کے کچھ بنیادی قواعد اور اصول مقرر کئے جائیں' تاکہ لوگ ان قواعد کو ملحوظ رکھ کر عربی زبان بولیں۔ اس کام کی ابتدا ابوالاسود الدؤلی نے کی۔ جس نے ایک عام روایت کے مطابق حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے کہنے پر عربی زبان کے موٹے موٹے قواعد وضع کرنے کا بیڑا اٹھایا' اور سب سے پہلے اسم فعل اور حرف کا امتیاز قائم کیا اور فاعل اور مفعول کے اعراب کی صورتیں بتائیں۔ اس کام کو ابن اسحاق اور ہارون بن موسیٰ نے آگے بڑھایا اور عیسیٰ ابن عمر نے اس میں باقاعدہ تالیف کا آغاز کیا۔ نحو میں سب سے پہلا اور بڑا نام سیبویہ کا ہے جس نے اس پر ایک کتاب لکھی اور نحو کے ابواب قائم کئے۔ نحو کی نشوونما پہلے عراق کے مشہور شہر بصرہ میں ہوئی۔ اس کے بعد کوفہ کے لوگوں نے اس علم میں دلچسپی لینی شروع کی اور اس علم کی تعلیم اور تدوین میں وہ بصرہ والوں کا مقابلہ کرنے لگے۔ رفتہ رفتہ بصرہ اور کوفہ میں عربی نحو کے دو دبستان قائم ہو گئے۔ جن کے درمیان مقابلہ و مناقشہ کی گرما گرمی ہر وقت رہنے لگی۔ اختلاف کی وجہ یہ تھی کہ اہل بصرہ زبان کے قواعد کے معاملے میں سماع کے قائل تھے' یعنی ایک بات کو جس طرح عرب کے اہل بادیہ نے ادا کیا وہی زبان کا قاعدہ اور قانون ٹھہرا' جبکہ اہل کوفہ اس معاملے میں قیاس کو زیادہ اہمیت دیتے تھے۔ ان کے نزدیک زبان کے جو قواعد ایک دفعہ مقرر کر دیے گئے عربی بولنے والوں کو لازماً ان کی پیروی کرنی چاہیے۔ اور اس کے لئے بادیہ کے رہنے والوں کی طرف رجوع کرنے کی ضرورت نہیں۔ کوفہ والے چونکہ دارالحکومت بغداد کے نسبتاً زیادہ قریب تھے' اس لئے حکام اور عمائدین نے بھی نحو کے معاملے میں اہل کوفہ کو مقدم رکھا۔ پھر یہ ہوا کہ جوں جوں وقت گزرتا گیا' یہ دونوں مکاتب شہروں میں آ کر ایک دوسرے سے قریب ہوتے گئے' اور گیارہویں صدی کے آتے آتے نحو کے ان دونوں دبستانوں کے علماء اور اکابر منظر سے ہٹ گئے' اور ان کے حامی اور علم بردار بھی کمزور پڑ گئے۔ چنانچہ یہ نزاع بالآخر ختم ہوگئی۔ اور جن لوگوں نے عربی زبان میں تالیف و تصنیف کا کام شروع کیا انہوں نے بصری مذہب کی پیروی کی۔ البتہ جہاں کوئی اختلافی معاملہ درپیش ہوا وہاں انہوں



Scanned with CamScanner

نے کوئی مذہب کی طرف رجوع کیا۔

اس کے ساتھ نحو اور صرف نے ایک باقاعدہ علم کی صورت اختیار کی۔ کچھ لوگوں نے بڑی تفصیل کے ساتھ اس کے قواعد اور ضابطے مدون کئے اور اس موضوع پر ضخیم تصنیفات کیں۔ کچھ دوسرے لوگوں نے ان ضخیم کتابوں کا اختصار کیا اور نحو پر آسان اور مختصر رسالے لکھے' اور یہ سلسلہ وقت کے ساتھ ساتھ چلتا ہوا آج تک چلا آیا ہے۔

عربی نحو کے تعلق سے جو بڑے نام تاریخ میں آتے ہیں ان میں سے کچھ یہ ہیں: دبستان بصرہ کے ابوعمرو بن العلاء' الخلیل بن احمد' الاخفش الاکبر' سیبویہ' یونس بن حبیب' اور دبستان کوفہ کے معاذ الہراء' رؤاسی' کسائی' فراء' ابن الحاجب۔ قریب کے زمانوں میں ابن مالک اور ابن ہشام وہ ایسے نام ہیں جنہوں نے نحو کے باب میں بہت مستند اور حوالے کی تصنیفات کیں' جن کی طرف آج بھی رجوع کیا جاتا ہے اور وہ مدارس کے نصاب میں شامل ہیں۔ نحو کے تعلق سے زیادہ مشہور اور اہم رجال کا مختصر تذکرہ حسب ذیل ہے۔

## سیبویہ (م ۷۹۶ء)

ابوبشر عمرو بن عثمان شیراز کے قریب بیضاء میں پیدا ہوا اور وہیں فوت ہوا۔ اس کی ساری نشوونما بصرہ میں ہوئی۔ اس نے الخلیل بن احمد سے علم کی تحصیل کی۔ ایک دفعہ اس کو جب یہ حدیث املاء کرائی گئی کہ "لیس من اصحابی احد الا لوشئت لاخذت علیه لیس ابا الدرداء" تو سیبویہ یہ سن کر کہنے لگا "لیس ابو الدرداء" اس پر حماد نے اس سے کہا "سیبویہ تم نے لحن کیا۔ یہ استثناء کا معاملہ ہے۔ اس میں ابا الدرداء ہی صحیح ہے" سیبویہ نے جب یہ سنا تو عزم کیا کہ وہ زبان کے قواعد کا علم اس طرح حاصل کرے گا کہ اس سے کبھی لحن کی لغزش سرزد نہ ہو۔ چنانچہ اس نے نحو کا باقاعدہ علم حاصل کیا اور الخلیل بن احمد کی صحبت اختیار کی اور اس کے علاوہ اس نے یونس بن حبیب اور عیسیٰ بن عمر سے بھی کسب فیض کیا۔ یہاں تک کہ وہ علم نحو میں ماہر ہو گیا اور اس فن میں اس نے جو کتاب لکھی وہ ایسی جامع اور مستند ثابت ہوئی کہ وہ "الکتاب" (The Book) کے نام سے مشہور ہوئی۔

نحو میں یہ مقام حاصل کرنے کے بعد سیبویہ بغداد گیا اور وہاں برامکہ سے جا کے ملا۔ ان دنوں دوسرا نحوی کسائی ہارون الرشید کے بیٹے امین کا استاد تھا۔ یحییٰ بن خالد نے دونوں کو اکٹھا کیا اور آپس میں ان کا مقابلہ کرایا تو ایک جملے کے بارے میں ان دونوں کے درمیان اختلاف ہوا۔ سیبویہ کا کہنا تھا کہ یہ



"فاذا هو هي" ہونا چاہیے' جبکہ کسائی کی رائے تھی کہ یہ "فاذا هو ایاها" ہوگا۔ جب بادیہ عرب سے ایک خالص اعرابی کو بلا کر پوچھا گیا تو اس نے سیبویہ کو درست ٹھہرایا۔ لیکن امین نے کسائی کا ساتھ دیا' اس لئے کہ وہ اس کا استاد بھی تھا اور کوفی بھی تھا۔ یہ دیکھ کر سیبویہ بغداد کو چھوڑ کر شیراز کے قریب اپنے گاؤں میں واپس آ گیا' اور یہیں چالیس سے کچھ اوپر عمر میں وفات پائی۔

## کسائی (م ۸۰۵ء)

ابوالحسن علی بن حمزہ نحو میں اہل کوفہ کا امام تھا۔ کوفہ میں پروان چڑھا اور حمزۃ الزیات سے قرأت سیکھی' اور سات بڑے قراء میں سے ایک تسلیم کیا گیا۔ شاعری کے ساتھ اسے کوئی رغبت نہ تھی اور بڑی عمر کو پہنچ کر بھی وہ نحو میں کچھ نہیں جانتا تھا۔ ایک دفعہ جب وہ ایک لمبی سیر سے واپس آیا تو کہنے لگا "قد عییت" اس پر اس کے ایک ساتھی نے کہا' تم ہمارے ساتھ اٹھتے بیٹھتے ہو' پھر بھی لحن کرتے ہو۔ اگر تمہاری اس بات کا مقصد یہ تھا کہ تم تھک گئے ہو تو تمہیں "اعییت" کہنا چاہیے تھا۔ یہ سن کر وہ بہت شرمندہ ہوا۔ اور اس نے لغت اور نحو کا باقاعدہ علم حاصل کرنے کا تہیہ کر لیا۔ چنانچہ اس نے کوفہ کے نحویوں معاذ الہراء اور رواسی کی صحبت اختیار کی اور ان سے سارا علم حاصل کر لیا۔ پھر وہ بصرہ جا کر الخلیل بن احمد سے ملا اور اس کے علم سے مرعوب ہو کر اس سے پوچھا کہ "اتنا سارا علم آپ کو کیونکر حاصل ہوا؟" الخلیل نے جواب دیا کہ حجاز کی وادیوں سے اور نجد اور تہامہ سے! یہ سن کر کسائی نے بھی بادیہ عرب کا رخ کیا۔ وہاں ایک عرصہ بسر کیا اور بادیہ کے فصحاء کے ساتھ میل جول رکھا۔ اس طرح عربی زبان کا علم حاصل کرنے کے بعد جب وہ بغداد واپس آیا تو ہارون الرشید نے اسے امین کا اتالیق مقرر کیا۔ وہ اس عہدے اور قدر و منزلت پر رہا' پھر وہ رے چلا گیا اور وہیں اس نے وفات پائی۔ اس کی تصانیف میں "کتاب معانی القرآن" "کتاب النحو" اور "رسالة فی ما یلحن فیه العامة" مشہور ہیں۔

## فراء (م ۸۲۲ء)

ابوزکریا یحییٰ بن زیاد فراء کوفے میں پیدا ہوا اور کسائی سے تلمذ کیا۔ اس سے علم حاصل کر کے فارغ التحصیل ہوا تو بادیہ کے عربوں میں جا کے رہا اور ان سے لغت کا علم حاصل کیا۔ اس کے ساتھ ساتھ اس نے طبعی علوم' علم نجوم' اخبار عرب اور ان کے اشعار کے حفظ میں بھی خاص مقام پیدا کیا اور اپنے استاد کسائی سے آگے بڑھ گیا۔ کہتے ہیں اہل کوفہ میں سے فراء سے زیادہ کسی نے عربی زبان کی خدمت نہ

کی۔ ابو العباس ثعلب کا کہنا ہے "اگر فراء نہ ہوتا تو عربی زبان نہ ہوتی ' اس لئے کہ اس نے صحیح طرح سے اس علم کی تحصیل کی اور اس کے قواعد وضوابط بنائے۔ اگر وہ نہ ہوتا تو زبان کی حالت اچھی نہ ہوتی" اور ابوبکر الانباری کہتا تھا "اگر اہل بغداد اور اہل کوفہ میں عربی زبان کے علماء میں سے صرف کسائی اور فراء ہی ہوتے تو یہ ان کے لئے تمام لوگوں کے مقابلے میں فخر سے سر اونچا کرنے کی بات ہوتی۔" فراء نے جب لغت ونحو میں اعلیٰ مقام حاصل کر لیا تو وہ بغداد پہنچا جہاں کسائی نے اس کے وہاں رکنے کا انتظام کیا اور اپنے بعد نحو کی تعلیم کے لئے اسے اپنا جانشین مقرر کیا۔ جب مامون خلیفہ ہوا تو اس نے اپنے دونوں بیٹوں کی تعلیم کے لئے فراء کو مقرر کیا۔ اس کی شان یہ تھی کہ جب وہ کہیں جانے کے لئے اٹھنے لگتا تو دونوں شہزادے اس کی جوتیاں سیدھی کرنے کے لئے ایک دوسرے پر سبقت لے جانے کی کوشش کرتے۔ یہ جان کر ایک دفعہ مامون نے فراء سے پوچھا۔ "تمہارے خیال میں اس مملکت میں وہ کون ہے جس کی سب سے زیادہ عزت کی جاتی ہے؟" فراء نے جواب دیا "وہ خلیفہ کے سوا اور کون ہو سکتا ہے؟" مامون نے کہا "نہیں' سب سے زیادہ عزت والا شخص وہ ہے جس کی جوتیاں سیدھی کرنے کے لئے خلافت کے ولی عہد ایک دوسرے سے سبقت لے جانے کے لئے دوڑتے ہیں" فراء نے کہا "میں نے انہیں اس سے روکنے کا ارادہ کیا تھا' لیکن پھر انہیں اس لئے نہیں روکا کہ اس میں بھی ان کی تربیت کا ایک پہلو ہے" مامون نے کہا "اگر آپ ان کو اس سے روکتے تو میں آپ کو ملامت کرتا۔ اس لئے کہ جو کچھ وہ کرتے ہیں اس سے ان کے شرف میں کوئی کمی نہیں ہوتی ' بلکہ اس سے ان کی قدر و منزلت میں اضافہ ہوتا ہے۔ اور انسان چاہے کتنا بڑا ہو جائے وہ تین لوگوں سے بڑا نہیں ہو سکتا۔ اپنے سلطان سے' اپنے والدین سے اور اپنے استاد سے۔"

فراء کی کافی تصانیف ہیں۔ اس کا حافظہ اتنا قوی تھا کہ وہ اپنی کتابیں بجائے لکھنے کے املاء کرایا کرتا تھا۔ وہ سال کا زیادہ حصہ بغداد میں گزارتا۔ سال کے آخری دنوں میں وہ کوفے کی طرف نکل جاتا اور وہاں انہیں وہ کچھ بانٹتا جو اس نے بغداد میں اکٹھا کیا ہوتا۔ یہاں تک کہ ایک دفعہ مکہ جاتے ہوئے وہ راستے میں ہی فوت ہو گیا۔

فراء کی تصانیف میں "کتاب الحدود" اور "کتاب معانی القرآن" مشہور ہیں۔

## ابن الحاجب (م ۱۲۴۸)

یہ موخر زمانے کا نحوی ہے جو بالائی مصر کے علاقے اسنا میں پیدا ہوا اور بچپن میں ہی قاہرہ آ گیا'



یہاں اس نے قرآن حفظ کیا اور امام مالک کے مذہب پر فقہ کی تحصیل کی۔ قرآن کی قراتوں اور دوسرے علوم میں بھی استعداد پیدا کی۔ تاہم عربی زبان کا علم اس کا سب سے بڑا مشغلہ رہا۔ دمشق جا کر نحو کے موضوع پر نوٹس جمع کیے۔ پھر سکندریہ واپس آ گیا اور یہیں فوت ہوا۔

ابن الحاجب کی مصنفات میں نحو کے موضوع پر "الکافیہ" اور "الشافیہ" بہت مشہور اور متداول ہیں۔ ان کے علاوہ "الامالی النحویہ" (Grammatical Dictations) ہیں' اور پھر علم اصول وجدل میں اس کی مفصل کتاب "منتهى السؤل والامل" ہے' جو امام مالک کے مذہب پر ایک مفصل فقہی کتاب ہے' جس کا اختصار "مختصر ابن الحاجب" کے نام سے بہت مشہور ہے۔ اور مدارس میں شامل نصاب رہی ہے۔ اسی طرح اس کی ایک کتاب "جامع الامهات في الفقه" بھی اپنے موضوع کے لحاظ سے بہت اہم سمجھی جاتی ہے۔

اوپر جن علمائے نحو کا ذکر ہوا ان کے بعد میں آنے والے کم از کم دو نام بہت نمایاں اور اہم ہیں اور اس قابل ہیں کہ ان کا خصوصی ذکر کیا جائے۔ ایک "الفیه ابن مالک" کے مصنف ابن مالک اور دوسرے "شذور الذهب" کے مصنف ابن ہشام۔

## ابن مالک (م ۱۲۷۴)

ابوعبداللہ بن محمد' یہ اندلس کے شہر جیان میں پیدا ہوا۔ دمشق جا کر سخاوی سے اور حلب میں ابن یعیش سے نحو کی تعلیم حاصل کی۔ پھر اس نے دمشق میں عربی لغت کے مبادی کی تعلیم دی اور نحو میں وہ مقام پایا کہ قریب تھا کہ شہرت میں وہ سیبویہ کے مدمقابل ٹھہرے۔ اس کی تصنیف "الكافية الشافية" نحو کے موضوع پر ایک نظم ہے۔ جس کا اختصار اس نے "الفیہ" کی صورت میں کیا۔ اور "الفیہ ابن مالک" نحو کی بہت مستند اور متداول کتاب قرار پائی۔ اس کے علاوہ اس کی نظم "لامية الافعال" ہے' نیز "شواهد التوضيح و التصحيح لمشكلات الصحيح" ہے جو صحیح بخاری کے مشکل مقامات کی تشریح وتوضیح میں ہے۔

## ابن ہشام (م ۱۳۶۰)

جمال الدین عبداللہ بن یوسف' قاہرہ میں پیدا ہوا اور وہیں فوت ہوا۔ نحو اور لغت میں بہت شہرت

حاصل کی۔ بہت سے اساتذہ سے اس نے علم کی تحصیل کی اور ابن حیان اندلسی کی مجلس درس میں بیٹھا۔ نحو میں اس نے اہل موصل کا طریقہ اپنایا۔ اس کی تصنیفات میں "مغنی اللبیب عن کتب الاعاریب" نیز "شذور الذھب فی معرفة کلام العرب" اور "قطر الندی و بل الصدی" بڑی اہمیت کی حامل ہیں۔ تاہم ابن ہشام کی شہرت زیادہ تر اس کی کتاب "شذور الذھب" سے ہے جو نحو کے موضوع پر قریبی زمانے میں لکھی گئی سب سے مستند اور متداول کتاب ہے اور اس کی کئی شرحیں لکھی گئی ہیں۔

## ۳۔ علم لغت اور مؤلفین لغات

عربی زبان کے الفاظ کی حرکات کے معاملے میں جب لوگوں کا ملکہ بگڑنے لگا تو علمائے نحو نے اس کو درست کرنے کے لئے ضابطے اور قواعد بنائے۔ لیکن اس سے عربی لغت کے استعمال میں کوئی اصلاح واقع نہ ہوئی' بلکہ الفاظ کے معانی اور انکو صحیح طرح سے برتنے میں کمزوری کے آثار نظر آنے لگے۔ اس صورت حال کی اصلاح کے لئے ائمہ لغت آگے آئے اور انہوں نے انسان' اونٹ' گھوڑوں یا نباتات سے متعلق الفاظ کو چھوٹے چھوٹے کتابچوں میں جمع کرنا شروع کیا۔ پھر جب نحو اور لغت کے عالم اجل الخلیل بن احمد کا دور آیا تو اس نے "کتاب العین" لکھ کر عرب لغت کی تدوین کے کام کا آغاز کر دیا۔ کتاب العین میں ان سب الفاظ کے معانی کی تشریح کی گئی جو حلق سے نکلتے ہیں اور ان کے بعد وہ الفاظ جو زبان سے نکلتے ہیں اور آخر میں وہ جو دانتوں سے ادا ہوتے ہیں۔ یہ لغت چونکہ حرف عین سے شروع ہوتی تھی اس لیے اسے "کتاب العین" کہا گیا۔ الخلیل کے بعد ایک سو سال تک لغت میں کوئی کام نہ ہوا۔ یہاں تک کہ ابن درید نے آ کر کتاب العین اور دوسری کتابوں سے اخذ و استفادہ کر کے کتاب "الجمھرة" تصنیف کی اور اس کی ترتیب حروف تہجی پر رکھی۔ اس کے بعد ازہری نے کتاب "التھذیب" الخلیل کی ترتیب کے مطابق لکھی۔ پھر جوہری نے ادھر مشرق میں "الصحاح" تصنیف کی اور ادھر مغرب (اندلس) میں ابن سیدہ نے "المحکم" لکھی۔ ان کے بعد عربی کی جن معاجم کا نام مشہور ہوا اور وہ متداول بھی رہیں' ان میں ثعالبی کی "فقہ اللغہ" اور زمخشری کی "اساس البلاغة" ہیں۔

عربی لغت کی کتابوں میں جامعیت اور ثقہ اور مستند ہونے کے اعتبار سے جو کتابیں سب سے بلند درجہ رکھتی ہیں وہ ہیں: ابن منظور کی "لسان العرب" فیروز آبادی کی "القاموس المحیط" اور مرتضی زبیدی کی "تاج العروس" جو القاموس کی بہت ضخیم شرح ہے۔

مذکورہ بالا ائمہ لغت اور علماء میں سے چند ایک کا مختصر احوال ذیل میں دیا جاتا ہے۔



## الخلیل بن احمد (م ۷۸۴)

ابو عبدالرحمان الخلیل بن احمد الفراہیدی بصرے میں پیدا ہوا اور وہیں پروان چڑھا۔ نحو' قرأت اور حدیث کا علم اس نے عربی زبان کے ائمہ اور عمرو بن العلاء اور عیسیٰ ابن عمر جیسے اعلیٰ درجے کے راویان سے حاصل کیا۔ پھر وہ بادیہ عرب میں جا کے رہا اور فصیح زبان کے ساتھ ساتھ نامانوس الفاظ سے بھی واقفیت حاصل کی۔ یہاں تک کہ وہ عربی زبان کے علم میں اتنے اونچے مقام پر فائز ہو گیا جہاں اس کے بعد آج تک کوئی نہیں پہنچ سکا۔ اس سے سیبویہ اور بعض دوسرے ائمہ نحو و لغت نے استفادہ کیا۔ وہ ساری عمر روکھی سوکھی کھا کر بصرے میں ہی مقیم رہا۔ اور کبھی کسی سے کوئی امید نہ رکھی اور نہ اپنے آپ کو کسی کے سامنے گرایا۔ ایک دفعہ سلیمان بن علی نے اہواز سے اس کے پاس قاصد بھیجا کہ اس کے بیٹے کو تعلیم دے۔ الخلیل نے سلیمان کے قاصد کے سامنے ایک روکھی روٹی رکھتے ہوئے کہا "اسے کھاؤ' اس لئے کہ میرے پاس اس کے سوا کچھ نہیں' اور جب تک مجھے سوکھی روٹی میسر ہے مجھے سلیمان کی مدد کی ضرورت نہیں ہے۔" الخلیل کی موت کا واقعہ عجیب ہے۔ روایت ہے کہ اس نے کہا کہ میں اس طرح کا حساب مرتب کرنا چاہتا ہوں کہ اس کی مدد سے ایک لونڈی سبزی فروش کے پاس جائے تو وہ اس کا حق نہ مار سکے۔ وہ ایک مسجد میں اسی خیال میں ڈوبا ہوا داخل ہوا تو ایک ستون کے ساتھ اس بری طرح سے ٹکرایا کہ اس کے سر میں سخت چوٹ آئی اور وہ بالآخر اس تکلیف سے جانبر نہ ہو سکا۔

الخلیل بن احمد نحو' لغت اور قیاس کی تصحیح اور مسائل کے استنباط میں بہت اونچے مرتبے پر فائز تھا۔ نحو میں سیبویہ کی "الکتاب" اسی کے دیئے ہوئے درسوں سے اخذ کی ہوئی ہے۔ اس کے ساتھ وہ موسیقی کا علم بھی رکھتا تھا' اور نغموں سے اس واقفیت کی وجہ سے اس نے "علم عروض" ایجاد کیا اور شعر کے پندرہ اوزان ترتیب دیے۔ الخلیل پہلا شخص ہے جس نے عربی لغت کی تدوین کی اور عربی خط کو موجودہ صورت میں رائج کیا۔ "کتاب العین" کے علاوہ اس کی دوسری کتابوں میں "کتاب النغم"۔ "کتاب العروض"۔ "کتاب الشواھد"۔ "کتاب النقط والشکل" اور "کتاب الایقاع" کے نام آتے ہیں۔

## ابن درید (م ۹۳۳)

ابوبکر محمد بن الحسن بن درید بصرے میں پیدا ہوا' وہیں پروان چڑھا اور اس شہر کے علماء ریاشی اور عمانی سے علم حاصل کیا۔ پھر وہ فتنہ زنوج میں بصرے کو چھوڑ کر عمان چلا گیا اور وہاں بارہ سال رہ کر

بادیہ کے عربوں سے زبان اور شاعری سیکھی۔ بصرہ واپس آ کر وہ شاہ ابن میکال اور اس کے بیٹے کی مصاحبت اختیار کرنے کے لئے ایران چلا گیا۔ وہ دونوں اس وقت فارس کے والی تھے۔ ابن درید نے ان کے لئے لغت کی کتاب "الجمھرۃ فی اللغۃ" لکھی اور ایک نظم ""مقصورۃ"" میں ان کی مدح کی۔ انہوں نے اسے دیوان کا نگران مقرر کر دیا۔ چنانچہ ایران سے جو بھی مکاتیب لکھے جاتے وہ اس کے مشورے سے لکھے جاتے۔ جب میکال کے بیٹے فارس کی عملداری سے معزول کیے گئے اور وہ خراسان چلے گئے تو ابن درید بغداد آ گیا۔ یہاں وزیر ابن الفرات نے اس کی بڑی آؤ بھگت کی اور انعام سے نوازا۔ خلیفہ مقتدر نے اس کے علم و فضل کی شہرت سن کر اس کے لئے پچاس دینار کا وظیفہ مقرر کر دیا' جو اس کے گزارے کے لئے کافی تھا۔ چنانچہ وہ اطمینان کے ساتھ علم و ادب اور تالیف و تصنیف کے کاموں میں مصروف رہا' تا آنکہ فالج کے حملے میں بیمار ہو کر فوت ہو گیا۔

ابن درید عیش و طرب کا دلدادہ تھا۔ باقاعدہ شراب پیتا تھا۔ اس کے ہاتھ میں جو مال بھی آتا اسے لہو و لعب اور تحفوں میں خرچ کر ڈالتا۔ ایک دن ایک سائل اس کے در پر آیا تو اسے دینے کے لئے اس کے پاس کچھ بھی نہیں تھا۔ اس نے شراب کا مٹکا اٹھا کر اسے دے دیا۔ اس پر اس کے ایک عزیز نے اعتراض کیا تو جواب دیا: میرے پاس اور کچھ بھی تو نہیں تھا اور قرآن کی آیت پڑھی کہ لن تنالوا البر حتی تنفقوا مما تحبون (تم کبھی نیکی نہیں پا سکو گے جب تک تم اپنے محبوب مال میں سے خرچ نہ کرو۔ آل عمران ۳: ۹۲) اس کے بعد یہ ہوا کہ اسے کسی نے دس شراب کے مٹکے تحفے میں دے دیئے' تو ابن درید نے اپنے اس عزیز سے کہا: دیکھا ہم نے ایک مٹکا دیا تو دس ہمارے پاس آ گئے۔

ابن درید نے لغت' ادب اور علم انساب میں بہت اونچا مقام حاصل کیا' اور ان سارے علوم میں وہ الخلیل بن احمد کا جانشین ثابت ہوا۔ اس کے متعلق کہا گیا کہ وہ شعراء میں سب سے بڑا عالم اور فقیہ ہے' اور علماء و فقہاء میں سب سے بڑا شاعر ہے۔ اس نے اپنی کتابوں میں اس طرح کی نثر لکھی جو آگے چل کر مقامات کا پیش خیمہ ثابت ہوئی۔ اس کی شاعری میں بہترین چیز اس کا ""مقصورۃ"" ہے (یعنی چھوٹی الف کی ردی والی نظم) جس میں عربوں کے کافی حالات اور امثال اور حکیمانہ اقوال جمع کیے گئے ہیں۔ اس نظم کی بہت سے لوگوں نے شرح کی ہے اور بعض لوگوں نے اس کے نمونے پر نظمیں کہی ہیں۔

ابن درید اپنے مقصورہ میں کہتا ہے:

وانما المرء حدیث بعدہ     فکن حدیثا حسنا لمن وعی

واللوم للحر مقیم رادع     والعبد لا یردعہ الا العصا

وآفة العقل الهوى فمن علا     علی ھواہ عقلہ فقد نجا



(انسان اپنے بعد صرف ایک بات بن کر رہ جاتا ہے۔ پس اپنے یاد کرنے والوں کے لئے ایک اچھی بات ہو۔

ملامت ایک آزاد کو سیدھا کرتی اور باز رکھتی ہے' لیکن ایک غلام کو سوائے چھڑی کے کوئی چیز باز نہیں رکھ سکتی۔

انسان کی عقل کے لئے اس کی خواہش بڑی مصیبت ہے۔ جس کی خواہش پر اس کی عقل غالب آ گئی وہ نجات پا گیا)

## ابوعلی القالی (م ۹۶۷)

ابوعلی اسماعیل بن القاسم' مشہور عالم لغت' دیار بکر کے مقام مناز جرد میں پیدا ہوا۔ اس نے پہلے بغداد میں قیام کیا اور پھر اندلس کی طرف نکل گیا۔ بغداد میں اس نے ابن درید' ابن السراج' بجستانی' ابوبکر انباری اور کچھ دوسرے لوگوں سے تعلیم حاصل کی۔ جب وہ بغداد آیا تو ایسے رفقاء کے ساتھ تھا جن میں شہر قالی قالا کے لوگ تھے۔ چنانچہ لوگوں نے اسے ان کا ہم وطن سمجھا اور اس کا لقب القالی مشہور ہو گیا۔ ابوعلی نے قرطبہ میں بیٹھ کر درس دیا اور علم عربیت کو پھیلایا' اور وہیں فوت ہوا۔ اس کے شاگردوں میں ابوبکر زبیدی شامل ہے۔ ابوعلی کی سب سے عمدہ اور مشہور عالم تصنیف اس کے "امالی" (Dictations) ہیں' اس کے علاوہ "کتاب النوادر" اور "کتاب البارع فی اللغۃ" ہیں۔

موخر الذکر ایک بڑی لغت ہے' لیکن اس کے صرف بعض حصے ہی باقی رہ گئے ہیں۔

## ازہری (م ۹۸۰)

ابومنصور محمد بن احمد ہرات میں پیدا ہوا۔ علمائے لغت میں سے تھا۔ اپنے شہر میں محمد بن جعفر سے اور بغداد میں نفطویہ سے علم حاصل کیا۔ ایک دفعہ حج سے واپس آ رہا تھا کہ ہبیر کے مقام پر قرامطہ کے ہاتھ آ گیا۔ چنانچہ ایک طویل عرصے تک بادیہ عرب میں رہا۔ اس طرح کہ سرما کسی ایک قبیلے میں گزارتا تو بہار کسی دوسرے قبیلے میں۔ گرما کسی تیسرے قبیلے میں بسر کرتا تو خزاں کسی اور قبیلے میں۔ اس نے بادیہ کے اس قیام میں پھر کر عربی لغت میں مہارت حاصل کر لی۔ اس کی کتاب "التھذیب فی اللغۃ" لغت کی ایک اہم کتاب ہے' جو الخلیل کی "کتاب العین" کے طرز پر ہے۔

## جوہری (م ١٠٠٥)

ابونصر اسماعیل فاراب (ترکی) میں پیدا ہوا۔ اور نیشاپور میں فوت ہوا۔ عرب لغت کے مرتبین میں سے تھا۔ اس نے ایک زمانہ بادیہ کے قبائل میں خصوصاً ربیعہ اور مضر میں گزارا اور یوں لغت کے اصل چشموں سے سیراب ہوا اور اس کے بہت سے الفاظ کے معانی کی تحقیق کی۔ اس کے ساتھ ساتھ وہ ایک ماہر خطاط بھی تھا۔ اس نے نیشاپور میں لوگوں کو تعلیم دی۔ یہیں وہ مالیخولیا میں مبتلا ہوا تو ایک دن اپنے گھر کی چھت سے اپنے آپ کو نیچے گرا دیا۔ جوہری کی تصانیف میں سب سے مشہور "تاج اللغة و صحاح العربية" ہے جو "الصحاح" کے نام سے جانی جاتی ہے۔ یہ عربی زبان کی ایسی لغت ہے جس میں اس نے چالیس ہزار الفاظ جمع کئے ہیں۔ لیکن کہا جاتا ہے کہ اس کی یہ لغت غلطیوں اور سامحتوں سے مبرا نہیں تھی۔ چنانچہ اس کی موت کے بعد اس کے شاگرد ابراہیم بن صالح الوراق نے اس پر نظر ثانی کر کے اسے درست کیا۔ اب یہ ایک مستند عربی لغت سمجھی جاتی ہے۔

## ابن سیدہ (م ١٠٦٦)

علی ابن سیدہ اندلس کے شہر مریہ میں پیدا ہوا اور دانیہ میں اس کی وفات ہوئی۔ لغت اور ادب اور منطق میں عالم اجل تسلیم کیا گیا۔ اپنے باپ کی طرح وہ بھی نابینا تھا۔ اس کی تصانیف میں ایک تو "المحكم و المحيط الاعظم" ہے' جو الخلیل کی کتاب العین کی ترتیب کے ساتھ عربی کی ایک لغت ہے' اور دوسری جو زیادہ مشہور اور متداول ہے وہ "المخصص" ہے جو ایک ایسی لغت ہے جس میں الفاظ کو موضوعات کے اعتبار سے جمع کیا گیا ہے۔

## زمخشری (م ١١٤٤)

محمود بن عمر ابوالقاسم زمخشر میں پیدا ہوا۔ وہ لغت' نحو' بیان اور تفسیر میں اپنے وقت کا امام تھا۔ چونکہ مکہ مکرمہ کے قریب رہتا تھا اس لئے جار اللہ (اللہ کا ہمسایہ) اس کا لقب پڑا۔ عقائد میں معتزلی تھا۔ لغت میں اس کی سب سے مشہور اور متداول کتاب "اساس البلاغة" ہے۔ اس کے علاوہ اس کی تصانیف میں "الكشاف عن حقائق التنزيل" ہے جو قرآن کی مشہور تفسیر ہے۔ نیز "المفصل فی النحو" "کتاب



الفائق فی غریب الحدیث" "اطواق الذهب" اور "نوابغ الکلم" قابل ذکر ہیں۔

☆.....☆.....☆

اس زمانے کے ایک سو سال سے بھی زیادہ عرصہ بعد عربی لغت کی تدوین میں ایسے کام ہوئے جنہوں نے سب اگلے کاموں کو پیچھے چھوڑ دیا' اور زبان میں اب وہی حوالے اور استناد کی چیز بن گئے۔ یہ وہ کام ہیں جو مصر کے ابن منظور' شیراز (ایران) کے فیروز آبادی اور یمن کے مرتضیٰ زبیدی نے سرانجام دیے۔ ان اصحاب کا مختصر احوال ذیل میں دیا جاتا ہے۔

## ابن منظور (م ١٣١١)

جمال الدین محمد ابن مکرم' جو عربی زبان کی سب سے بڑی لغت "لسان العرب" کا مصنف ہے' قاہرہ کے ایک علمی گھرانے میں پیدا ہوا' اور اپنے وقت کے بڑے شیوخ سے اس نے تعلیم حاصل کی اور علوم و آداب میں اتنی استعداد بہم پہنچائی کہ وہ انشا نگاری کے دفتر میں تعینات ہو گیا۔ پھر اس نے کچھ عرصہ طرابلس المغرب میں قاضی کے عہدے پر کام کیا اور اس سارے عرصے میں وہ مطالعہ اور تصنیف و تالیف کے کام میں مصروف رہا' یہاں تک کہ اسے خالق کی طرف سے بلاوا آ گیا' اور وہ اپنی تصنیف کی پانچ سو کتابیں چھوڑ کر قاہرہ میں فوت ہو گیا۔

ابن منظور اپنے عقائد میں شیعہ تھا' لیکن رافضی نہیں تھا' جیسا کہ اس موضوع پر بات کرتے ہوئے اس کی لغت "لسان العرب" کے اسلوب سے متبادر ہوتا ہے۔ ابن منظور میں کوئی نئی بات پیدا کرنے کی زیادہ صلاحیت نہیں تھی۔ اس کا کام زیادہ تر پچھلی تصانیف کو جمع کرنے اور ان کا اختصار مرتب کرنے کا تھا۔ اس کے بارے میں صلاح الدین صفدی کا کہنا ہے کہ "مجھے ادب کی کتابوں میں کوئی ایسی کتاب معلوم نہیں جس کا ابن مکرم نے اختصار نہ کیا ہو۔"

**لسان العرب:** یہ وہ جامع اور ضخیم لغت ہے جس میں ازہری کی "تہذیب" ابن سیدہ کی "محکم" جوہری کی "صحاح" ابن درید کا "جمہرة" اور ابن الاثیر کی "نہایة" سب جمع ہو گئے ہیں۔ اسے ابن منظور نے الفاظ کے آخری حروف کی ہجائی ترتیب پر مرتب کیا۔ اور لغت کے الفاظ کے معانی بتاتے ہوئے قدیم راویوں کے نصوص' نیز ان معانی کے شواہد کے طور پر قرآن' حدیث' امثال اور اشعار سے استناد کیا ہے۔

ابن منظور کی دوسری تصانیف میں "مختصر الاغانی" "مختصر تاريخ بغداد" "مختصر

مفردات ابن البیطار" "مختصر العقد لابن عبدربہ" "مختصر زھرا لآداب" مختصر الحیوان للجاحظ" اور "مختصر الیتیمہ للثعالبی" شامل ہیں۔

## فیروز آبادی (م ۱۴۱۴)

ابو طاہر محمد بن یعقوب فیروز آبادی شیراز کے قریب کارزین کے مقام پر پیدا ہوا۔ وہ عربی لغات مرتب کرنے والے ائمہ میں سے ایک ہے۔ اس نے شیراز' واسط' بغداد اور دمشق میں تعلیم حاصل کی' اور قدس میں دوسروں کو درس دیا۔ جب وہ سفر کرتا تو کتابوں سے لدے ہوئے کئی اونٹ اس کے ساتھ ہوتے۔ اس کی تصانیف میں سب سے مشہور "القاموس المحیط" ہے' جو عربی زبان کی نہایت ہی عمدہ اور مستند لغت ہے اور عربی مدارس میں عام مستعمل رہی ہے۔

## مرتضی الزبیدی (م ۱۷۹۰)

عالم لغت اور محدث۔ اس کا تعلق یمن سے تھا' لیکن قاہرہ میں رہا اور وہیں وفات پائی۔ اس کی تصانیف میں زیادہ مشہور غزالی کی "احیاء علوم الدین" کی طویل شرح ہے جو اس نے کی۔ اس کا استعمال ہندوستان اور سوڈان میں بہت ہوا ہے۔ اس کی دوسری اتنی ہی اہم' لیکن زیادہ مشہور کتاب "تاج العروس" ہے جو فیروز آبادی کی لغت "القاموس المحیط" کی بہت مفصل شرح ہے اور بجائے خود ایک ضخیم لغت ہے۔

☆......☆......☆

## ۴۔ عربی زبان میں ادب و شعر کے مجموعے (Anthologies) اور مختارات (Selections)

اموی اور عباسی ادوار میں جب ادب و شعر کا ہر طرف چرچا ہوا' اور لوگ شاعروں کا کلام' خطیبوں کے خطبے اور ادیبوں کے اقوال اور امثال اور انشا پردازوں کے رسائل زبانی روایت کرنے لگے تو بعض دانشمند ادباء کو یہ خیال ہوا کہ اگر زبانی روایتوں کا یہ بے بہا ذخیرہ وقت گزرنے پر لوگوں کے ذہنوں میں محو ہو گیا تو عربی ادب کو اس سے کتنا بڑا نقصان ہوگا۔ یہ سوچ کر کچھ لوگوں نے ادب و شعر کی روایتوں کا انتخاب کر کے ان کو مجموعوں کی صورت میں ترتیب دینے کا بیڑا اٹھایا' اور یہ کام عباسی دور کے اوائل سے جو شروع ہوا تو آگے تک چلتا گیا۔ عربی زبان و ادب کے کم از کم تو مجموعے ایسے ہیں کہ ان کے بغیر عربی



زبان کا کوئی بھی کتب خانہ ایک معیاری کتب خانہ نہیں کہلایا جا سکتا۔ ذیل میں ان مجموعوں (Anthologies) اور ان کے مرتب کرنے والوں کا مختصر احوال درج کیا جاتا ہے۔

## "البیان و التبیین" للجاحظ (م ۸۶۸)

یہ عباسی دور کے سب سے بڑے ادیب جاحظ کی آخری کتاب ہے (جاحظ کے تعارف کے لئے دیکھئے صفحہ ۱۷۹) اس میں موضوعات کا ایسا تنوع ہے جس میں کوئی ترتیب نہیں ہے۔ اس میں قرآنی آیات بھی ہیں' احادیث بھی ہیں' ادب کے نوادر بھی ہیں اور ان کے علاوہ حکمت کی باتیں' خطبات اور نوادر بھی کچھ ہے۔ یہ کتاب جاحظ نے دراصل شعوبیت (یعنی عرب مخالف خیالات و افکار) کے رد میں ترتیب دی تھی۔ اس میں وہ یہ بتانا چاہتا ہے کہ بلاغت و ادب کے میدان میں عربوں کی فوقیت مسلم ہے۔ اس مجموعے میں جو مباحث ملتے ہیں وہ کچھ اس طرح کے ہیں: ۱۔ علم بیان' علم بلاغت اور ان کے قواعد۔ ۲۔ خطابت (یعنی فن تقریر) اور اس کے اصول۔ ۳۔ زبان کے عیوب مثلاً لکنت' لحن' تمتمہ وغیرہ۔ ۴۔ شاعری اور اس کے معیار۔ ۵۔ رسائل اور وصیتوں کے اعلیٰ نمونے ۶۔ بادیہ کے اعراب کے نوادر اور ان کے حالات وغیرہ۔ "البیان و التبیین" کی اہمیت ابن خلدون کے اس مشہور قول سے بھی جانی جا سکتی ہے کہ "ہم نے اپنے شیوخ سے سنا ہے کہ عربی ادب کے اصول اور اس کے ارکان چار دیوان (مجموعے) ہیں' اور وہ یہ ہیں: ابن قتیبہ کی "ادب الکاتب" المبرد کی "الکامل" جاحظ کی "البیان و التبیین" اور ابو علی القالی کی "کتاب النوادر"۔ ان چار کے سوا جو کچھ بھی ہے وہ انہی کے تتبع میں ہے اور انہی سے مستعار ہے"

## "ادب الکاتب" لابن قتیبہ (م ۸۸۹)

ابن قتیبہ (تعارف کے لئے دیکھئے صفحہ ۱۹۸) نے یہ کتاب عباسی حکومت کے وزیر ابوالحسن عبیداللہ بن یحیٰ کے لئے لکھی۔ یہ عربی لغت اور صرف اور نحو کے موضوع پر ایسی کتاب ہے جس سے عربی امت کے بہت سے علماء نے اکتساب کیا ہے اور اس نے انہیں بہت سی دوسری کتابوں سے مستغنی کر دیا ہے۔ قدیم زمانے سے ہی متعدد علمائے لغت نے اس کی شرح کی ہے اور اس پر حواشی لکھے ہیں۔ عربی ادب کے شائقین میں اس کتاب کی مقبولیت کا یہ عالم ہے کہ ضرورت پڑنے پر اس کتاب کا کوئی نسخہ مشکل ہی سے

دستیاب ہوتا ہے حالانکہ یہ علمائے مشرق اور مستشرقین کی کوششوں سے لائپزگ' لائیڈن اور مصر میں کئی مرتبہ شائع ہو چکی ہے۔

## "الکامل فی اللغة و الادب" للمبرد (م ۸۹۸)

یہ لغت و ادب کے موضوع پر ایک ایسا بحر ذخار ہے جس کے کناروں کا کوئی پتا نہیں۔ بغیر کسی ترتیب کے اور بغیر کسی عنوان کے ابو العباس المبرد اس میں لغت اور اس کے مسائل پر بحث کرتا چلا جاتا ہے۔ اس کے لئے مثلاً وہ آنحضرتؐ کا کوئی قول لے لیتا ہے اور اس میں جو مشکل الفاظ آئے ہیں ان کی تشریح کرنے لگتا ہے' اور اپنی بات کی تائید میں شعرائے عرب کے کلام سے شواہد پیش کرتا ہے۔ اس کتاب کا ایک چھوٹا سا مقدمہ ہے جس میں المبرد اس کے مضامین کے بارے میں کہتا ہے: "یہ کتاب جو ہم نے تالیف کی ہے یہ مختلف آداب کی جامع ہے۔ اس میں منثور کلام بھی ہے' شعر بھی ہے' مشہور زمانہ مثل بھی ہے اور دلوں پر اثر کرنے والی موعظت بھی ہے۔ اس میں ہم نے اچھے خطبوں کا بھی انتخاب کیا ہے اور ایسے مکاتیب کا بھی جو بلاغت کا اچھا نمونہ ہیں۔ ایسا کرتے ہوئے ہم نے دراصل یہ چاہا ہے کہ اس کتاب میں جو بھی مشکل بات ہو' یا کوئی گنجلک خیال ہو اس کی ہم وضاحت کریں اور اس میں اعراب (یعنی نحو وصرف) کے جو مسائل ہوں ان کی ہم ٹھیک طرح سے شرح کریں' تاکہ یہ کتاب مکتفی بالذات ہو' اور کسی کو اس کے بعد کسی اور طرف رجوع کرنے کی ضرورت نہ پڑے"

## "العقد الفرید" لابن عبدربه (م ۹۴۰)

ابو عمر احمد بن عبدربہ (احوال کے لئے دیکھیے صفحہ ۲۹۵) نے قرطبہ کے شہر میں رہتے ہوئے عربی زبان کے جتنے علوم سیکھے تھے' جن میں شاعری تھی' تذکرے تھے' نوادر تھے' تاریخ تھی اور اس کے ساتھ لغت اور نحو تھی' ان سب میں ان نے بڑا مقام حاصل کیا اور ان میں سے اکثر علوم کو اس نے حفظ کر لیا' اور پھر اس سارے ذخیرہ علم کا نچوڑ اس نے اپنی کتاب "العقد الفرید" میں ڈال دیا' جو چھ جلدوں میں ایک ضخیم مجموعہ ادب ہے۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ العقد الفرید عربی ادب کی سب سے عمدہ اور خوبصورت کتاب ہے۔ فائدے میں سب سے برتر' اپنے بیان میں سب سے سچی اور ترتیب اور تفصیل کے لحاظ سے بے



مثال اور قابل تقلید۔

اس کتاب کے بڑے حصے میں ابن عبدربہ نے مشرق کے حالات اور وہاں کے ادیبوں اور لکھنے والوں کے احوال جمع کر کے اپنے اہل وطن (یعنی اندلس والوں) کے سامنے رکھے ہیں۔ لیکن کتاب کی شہرت اور اس کا فائدہ مغرب تک محدود نہیں رہا۔ بلکہ اس نے مشرق میں پہنچ کر بھی ان کی ادبی کتابوں اور مجموعوں کے درمیان ایک قابل قدر جگہ بنائی' اور اہل ادب نے اسے بہت ذوق وشوق سے پڑھا۔ ابن عبدربہ نے اس کتاب میں صرف عرب کی روایات ہی نہیں لیں' بلکہ یونان' ایران اور ہندوستان کی کتابوں کے ترجموں کی صورت میں جو حکیمانہ مضامین اور موعظت کی باتیں اور نوادر موجود تھے ان سے بھی اس نے استفادہ کیا۔ کتاب کے ابواب مقرر کرنے میں بھی اس نے بڑی جدت سے کام لیا۔ وہ یہ کہ اس نے کتاب کو پچیس ابواب میں تقسیم کر کے اسے ایک ہار کی شکل دی۔ ہار کے ایک طرف بارہ موتی ہیں جن کے اس نے اس طرح کے نام رکھے ہیں: لؤلؤہ' فریدہ' زبرجدہ' جمانہ' مرجانہ' یاقوتہ وغیرہ' اور اسی نام کے موتی ہار کے دوسرے حصے میں مکرر صورت میں پروئے ہیں۔ مثلاً لؤلؤۃ ثانیہ' فریدہ ثانیہ' زبرجدہ ثانیہ وغیرہ اور ہار کے درمیان میں جو تیرھواں موتی ہے اس کا نام واسطہ ہے۔ کتاب کو اس طرح کے ابواب میں تقسیم کرنے کا یہ ایک نادر طریقہ ابن عبدربہ کو سوجھا' جس کی اس سے پہلے کوئی مثال نہیں ملتی۔ کتاب کا ہر باب ایک خاص موضوع کے بارے میں ہے اور اس موضوع پر مواد مہیا کرنے سے پہلے مرتب ایک مقدمے کی صورت میں کچھ تمہیدی کلمات کہتا ہے اور اپنی آراء کا اظہار کرتا ہے۔ ابواب کی تقسیم کچھ اس طرح سے ہے' مثلاً کتاب اللؤلؤة فی السلطان (غلبہ اور حکومت کے بارے میں) کتاب الفریدة فی الحروب (جنگوں کے بارے میں) کتاب الجوهرة فی الامثال (ضرب الامثال کے بارے میں) کتاب الواسطة فی الخطب' کتاب الدرة الثانیة فی ایام العرب ووقائعهم' کتاب الفریدة الثانیة فی الطعام و الشراب وغیرہ۔

العقد الفرید کی ایک اور خصوصیت یہ ہے کہ دوسرے مجموعوں کے مقابلے میں اس مجموعے کا مولف ابن عبدربہ اپنی شخصیت کے ساتھ زیادہ سامنے رہتا ہے۔ اس نے اپنی شخصیت کا اظہار اول تو اپنے خاص عمل انتخاب میں کیا ہے' جو اس کتاب میں دیکھا جا سکتا ہے۔ پھر ہر باب سے پہلے اپنے مقدمے میں بھی اور کتاب کے متن میں بھی جہاں جہاں وہ مناسب سمجھتا ہے اپنی آراء بھی پیش کرتا ہے اور تنقید بھی کرتا ہے۔ مثلاً ابن قتیبہ کی شعوبیت پر وہ تنقید کرتا ہے اور مبرد کے شعروں کے انتخاب کو وہ ٹھنڈا اور بے کیف قرار دیتا ہے۔

العقد الفرید پر ایک اعتراض یہ ہوا کہ اس میں صرف مشرق کے عربی ادب کا تذکرہ ہے' حالانکہ

چاہیے یہ تھا کہ اس میں اندلس کے عربی ادب اور اس کی نشوونما کا احوال بیان ہوتا۔ چنانچہ عباسی دور کے وزیر اور مشہور ادیب صاحب بن عباد کے متعلق یہ بات مشہور ہے کہ جب اس کو یہ کتاب پیش کی گئی تو اس نے اسے پڑھ کر دیکھا اور یہ کہہ کر واپس کر دی کہ "یہ تو ہمارا ہی مال ہے جو ہمیں لوٹایا گیا ہے۔ میرا خیال تھا کہ اس میں اندلس کے ادب کی باتیں ہوں گی' لیکن یہ تو ادھر کے ادب کی باتیں کرتی ہے۔ اس لئے اس کی ہمیں ضرورت نہیں ہے۔" لیکن یہ العقد الفرید کا نقص نہیں ہے۔ بات یہ ہوئی کہ اندلس میں کچھ لوگوں نے تو مقامی ادب کو جمع کرنے اور اسے مدون کرنے کا کام اپنے ذمے لیا' مثلاً الفتح بن خاقان نے "مطمح الانفس" میں' ابن بسام نے اپنی کتاب "الذخیرة" میں اور مقری نے "نفح الطیب" میں۔ لیکن کچھ دوسرے لوگوں نے مشرق کے ادب اور ادبی اور شعری روایات کو اندلس میں متعارف کرانے کا بیڑا اٹھایا۔ ان میں ابوعلی القالی تھا جس نے اندلس جا کر "الامالی" لکھی اور اسی مدرسہ کے ایک اور فرد ابن عبدربہ نے "العقد الفرید" مرتب کی۔

## کتاب "الامالی" تالیف ابی علی القالی (م ۹۶۷)

اندلس میں اموی خلیفہ عبدالرحمان الناصر نے' جسے علم و ادب اور شاعری سے کافی رغبت تھی' ارادہ کیا کہ اندلس میں عربی تہذیب کو رواج دینے کے لئے اہل مشرق میں سے کوئی مناسب ادیب اور فاضل بلایا جائے۔ اس غرض کے لئے خلیفہ کی نگاہ انتخاب ابوعلی القالی پر پڑی۔ جس کا باپ اموی خلیفہ عبدالملک بن مروان کا غلام رہا تھا۔ چنانچہ اس نے ابوعلی کو قرطبہ بلا لیا اور اپنے بیٹے حکم کو ہدایت کہ اس کا شایان شان استقبال کرے۔ ابوعلی نے بغداد میں پچیس برس رہ کر اساتذہ وقت سے حدیث' لغت' ادب اور نحو و صرف میں تعلیم حاصل کی تھی' اور ان میں کامل ہو گیا تھا۔ مورخین کا اس بارے میں اتفاق ہے کہ وہ اپنے وقت میں علوم کا سب سے بڑا حافظ تھا۔ ابوعلی القالی سے خلیفہ کے بیٹے حکم نے بھی تعلیم حاصل کی اور یہ اسی تعلیم کا اثر تھا کہ اس نے اندلس میں ایک نہایت عظیم الشان مکتبہ (لائبریری) قائم کیا۔ ابوعلی اندلس میں ۹۴۲ میں آیا تھا اور وہ قرطبہ میں اپنی وفات (۹۶۷) تک اپنا علم پھیلاتا رہا۔

ابوعلی کی سب سے مشہور کتاب "کتاب الامالی و الذیل والنوادر" ہے۔ نوادر کی کتاب دراصل "امالی" کا ضمیمہ ہے۔ امالی میں ابوعلی کا طریقہ یہ ہے کہ وہ کوئی نص۔ آیت قرآنی' حدیث' خبر یا نظم۔ لیتا ہے' جس میں کوئی اجنبی یا نامانوس لفظ ہوتا ہے' اور وہ اس نامانوس لفظ کی بہت تفصیل میں جا کر شرح کرتا ہے' اور اس شرح کے ضمن میں علم و ادب اور بلاغت کی باتیں بیان کرتا چلا جاتا ہے۔



ابوعلی کی دوسری تصانیف یہ ہیں: "کتاب المحدود و المقصود" "کتاب الابل ونتاجها" "کتاب حلی الانسان" "کتاب فعلت و افعلت" "کتاب تفسیر المعلقات السبع" اور "کتاب البارع فی اللغة" ہے جس کے متعلق کہا جاتا ہے کہ لغت میں ایسی کتاب نہیں لکھی گئی۔

## "کتاب الاغانی" لابی الفرج الاصفہانی (م ۹۶۷)

علی بن الحسین بن محمد بن احمد القرشی عرب مورخ اور ادیب اور شاعر تھا۔ اصفہان (ایران) میں پیدا ہوا۔ لیکن نسلاً وہ خالص عرب اور قریش میں سے تھا۔ اس کے باوجود وہ مذہباً شیعہ تھا۔ اس نے بغداد میں تعلیم حاصل کی اور اپنی عمر کا زیادہ حصہ وہیں گزارا۔ اسے آل بویہ اور خصوصاً ان کے وزیر مہلبی کی (جس کا وہ ندیم تھا) سرپرستی حاصل تھی۔ حلب میں سیف الدولہ حمدانی کے دربار میں اس کی بڑی آؤ بھگت رہی۔ اس نے ۹۶۷ میں بغداد میں وفات پائی۔ مرنے سے پہلے وہ دیوانگی میں مبتلا ہو گیا تھا۔

تنوخی کا بیان ہے کہ ابوالفرج کے ذہن میں مختلف علوم مستحضر رہتے تھے۔ وہ شعر بھی استادانہ کہتا تھا۔ بعضوں نے یہ بھی لکھا ہے کہ اسے جسم اور لباس کی صفائی کا مطلق خیال نہ تھا۔ اس کا شاہکار جس پر اس نے اپنے بیان کے مطابق' پورے پچاس سال صرف کئے "کتاب الاغانی" (نغموں کی کتاب) ہے' جس میں اس نے وہ سب اصوات یا نغمے یکجا کر دیئے ہیں جو معروف مغنیوں ابراہیم الموصلی' اسماعیل بن جامع اور فلیح بن العوراء نے خلیفہ ہارون الرشید کے حکم سے منتخب کئے اور جن پر آگے چل کر اسحاق بن ابراہیم الموصلی نے نظرثانی کی تھی۔ ابوالفرج نے اس مجموعے میں معبد اور ابن سریج اور کئی اور گویوں کے علاوہ خلفاء اور ان کے جانشینوں کے نغموں کا بھی اضافہ کیا' اور پھر ہر نغمے کے ساتھ اس کی دھن بھی بتائی۔ لیکن یہ سب باتیں اس کتاب کا وہ حصہ ہیں جس کی اہمیت نہایت کم ہے۔ بخلاف اس کے ابوالفرج نے ان شاعروں کے متعلق جن کے نغمے اس مجموعے میں شامل ہیں بڑی سیر حاصل معلومات مہیا کی ہیں اور ان کے حالات زندگی کے ساتھ ساتھ ان کے کلام کا بہت سا نمونہ بھی دیا ہے۔ اسی طرح مؤلفین نغمہ (Composers) کے حالات بھی تفصیل سے بیان کئے ہیں۔ وہ اس میں قدیم عرب قبائل' ان کے ایام' ان کی معاشرت اور موسیقاروں کے ماحول کا ذکر بھی تفصیل سے کرتا ہے۔ مختصر یہ کہ کتاب الاغانی کا مطالعہ کیجئے تو دور جاہلیت سے لے کر نویں صدی عیسوی تک پوری عربی ثقافت کے ایک پہلو کی تاریخ ہمارے سامنے آ جاتی ہے۔ مصنف نے ایک اور جہت سے بھی مفید کام کیا ہے' وہ یہ کہ عرب مصنفین کا اتباع کرتے ہوئے وہ ان قدیم مصنفوں کی تصنیفات سے بڑے طویل اقتباسات بھی دے دیتا ہے جو ہم

تک نہیں پہنچیں۔ اس لحاظ سے یہ کتاب عربی اسلوب نگارش کی گوناگوں تبدیلیوں کی تاریخ کے متعلق بھی ہمارا ایک عمدہ ماخذ ہے۔

چنانچہ اس امر پر اتفاق ہے کہ اس موضوع پر "الاغانی" جیسی کوئی اور کتاب تصنیف نہیں ہوئی' اور اس کے بعد ادب عربی میں جو کچھ بھی لکھا گیا اس کا سارا انحصار اسی پر تھا۔ اور اگر "کتاب الاغانی" نہ ہوتی تو جاہلیت' صدر اسلام اور بنوامیہ کے دور کے ادبی حالات کا بہت سا ذخیرہ ضائع ہو جاتا۔ یہ کتاب جب ابوالفرج حمدان کے سیف الدولہ کے پاس لے گیا تو اس نے اسے ایک ہزار دینار دیے اور اس سے معذرت بھی کی۔ عباسی عہد کا مشہور وزیر اور ادیب صاحب بن عباد پہلے جب سفر کرتا تھا تو تیس اونٹوں پر اس کی کتابیں لدی ہوتی تھیں۔ جب اس کو "کتاب الاغانی" مل گئی تو اسے ان ساری کتابوں کا بوجھ ساتھ لے جانے کی ضرورت نہ رہی۔

## "نہایة الارب فی فنون الادب" للنویری (م ۱۳۳۲)

شہاب الدین احمد بن عبدالوہاب البکری الکندی الشافعی ایک عرب وقائع نگار تھا جو ۱۲۷۹ میں بالائی مصر میں پیدا ہوا اور جس نے قاہرہ میں وفات پائی۔ وہ مملوکی عہد کی تین اہم ترین دائرۃ المعارف نوع کی کتابوں میں سے ایک کا مصنف تھا (دوسری دو تصانیف عمری اور قلقشندی کی ہیں) اس کا باپ ایک سرکاری انشانگار (کاتب) تھا۔ بیٹا بھی سلطان الملک الناصر (محمد بن قلاوون) کے عہد میں بڑے بڑے مناصب پر فائز رہا۔ وہ اس کا منظور نظر بھی تھا۔ کچھ عرصے تک وہ طرابلس الشام کا ناظر الجیش رہا' اور بعض مصری صوبوں میں ناظر الدیوان کے عہدے پر بھی کام کیا۔

اس کی یادگار تصنیف "نہایة الارب فی فنون الادب" جو الملک الناصر کو نذر کی گئی' اس کے انتظامی تجربے کا نچوڑ تھا۔ ابتدائی زمانے میں وہ محض منشی کے فرائض انجام دیتا تھا اور ادب کا مطالعہ اس نے کہیں بعد کے زمانے میں شروع کیا۔ اس کی خواہش تھی کہ اپنے دائرۃ المعارف میں وہ سارا علم جمع کر دے جس کی تحصیل ایک لکھنے والے کے لیے ناگزیر ہوتی ہے۔

یہ کتاب پانچ فنون میں منقسم ہے۔ ہر فن کی پانچ اقسام ہیں۔ ہر قسم میں متعدد ابواب ہیں' جن کی تعداد دو سے چودہ تک ہے۔ پہلا فن زمین و آسمان کے لیے مخصوص ہے' دوسرا فن انسان کے لیے' تیسرا نباتات کے لیے اور پانچواں تاریخ کے لیے وقف ہے۔ پانچویں فن کی آخری قسم جو اسلامی تاریخ کے بارے میں ہے تقریباً نصف تصنیف پر مشتمل ہے اور صرف اسی حصے کے تقریباً نو ہزار مطبوعہ صفحات ہیں۔



وقف حصوں اور جلدوں کی تاریخوں سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس نے اس کتاب کی تکمیل میں اپنی زندگی کے پورے بیس برس لگا دیے۔ معاصرانہ تاریخ کے لیے نویری کی اس کتاب کی اہمیت اول درجے کی ہے۔ دوسرے حصوں کے متعلق اس کی قدر و قیمت اس کے مآخذ پر منحصر ہے۔ عام طور پر اٹھارویں صدی عیسوی میں اور انیسویں صدی کے اوائل میں نویری کی تاریخ کے اس حصے کو جو زمانہ قبل اسلام سے متعلق ہے' بڑی اہمیت دی گئی۔

## "حیاۃ الحیوان" للدمیری (م ۱۴۰۵)

محمد بن موسی بن عیسی کمال الدین قاہرہ میں پیدا ہوا اور وہیں اس نے وفات پائی۔ شروع میں وہ اپنے آبائی شہر دمیرہ میں درزی کے کام سے کسب معاش کرتا تھا۔ پھر اس نے پیشہ ور عالم دین بننے کا فیصلہ کیا اور تحصیل علم کے لیے مشہور شافعی عالم بہاؤ الدین سبکی کے سامنے زانوئے تلمذ تہ کیا۔ اس کے علاوہ اس نے جمال الدین الاسنوی' الفیہ ابن مالک کے شارح ابن عقیل' برہان الدین القیراطی اور دوسرے علماء سے بھی درس لیا۔ یہاں تک کہ اسے فقہ' علوم حدیث' تفسیر' عربی علم اللسان اور معانی و بیان میں بڑی مہارت حاصل ہو گئی۔

جب دمیری کو متداول علوم اسلامیہ کی تدریس اور فتوی دینے کی اجازت مل گئی تو وہ بعض دینی درسگاہوں سے وابستہ رہا۔ اس نے تصوف کا ایک مسلک بھی اختیار کیا اور اپنی زاہدانہ زندگی کی وجہ سے مشہور ہوا۔ لوگ اسے صاحب کرامات سمجھنے لگے۔ زندگی میں اس نے چھ حج کیے اور آخری حج کے بعد اپنی وفات تک وہ قاہرہ میں ہی رہا۔

مصنف کی حیثیت سے دمیری اپنی کتاب "حیاۃ الحیوان" کی وجہ سے مشہور ہے جو علم الحیوانات کی دائرۃ المعارف ہے۔ اس کتاب کی بدولت مشرق اور مغرب دونوں میں اس کی شہرت ہوئی۔ کتاب کے دیباچے میں وہ لکھتا ہے کہ اس سے اس کا مقصد ان غلط خیالات کی اصلاح تھا جو جانوروں کے متعلق عموماً پڑھے لکھے لوگوں میں عام تھے۔ اس کتاب کی حیثیت عربی میں محض علم الحیوانات کی ایک مختصر تصنیف ہی کی نہیں' بلکہ وہ مسلم عوام کی متداول روایات و عقائد کا ایک مخزن بھی ہے۔ مصنف نے اپنے بیان کو اصل موضوع یعنی محض حیوانات ہی تک محدود نہیں رکھا' بلکہ بڑی تفصیل کے ساتھ ہر اس چیز کا حال لکھ دیا ہے جو جانوروں کے متعلق کسی طرح بھی کہی گئی ہو۔ علاوہ بریں وہ اپنا اصل موضوع چھوڑ کر دوسرے مباحث کی طرف بھی متوجہ ہو جاتا ہے' جن میں سب سے نمایاں اور اہم خلفاء کی تاریخ کا جائزہ ہے اور اس کی

پوری کتاب کا تقریباً تیرہواں حصہ ہے۔

اس کتاب کے مقالات حروف تہجی کی ترتیب کے لحاظ سے مرتب کیے گئے ہیں اور ترتیب میں حیوانات کے ناموں کے پہلے حروف کو پیش نظر رکھا گیا ہے۔ ہر مقالے میں مندرجہ ذیل مطالب سے بحث کی گئی ہے۔ (۱) ہر حیوان کے نام کے لسانی پہلو۔ (۲) حیوان اور اس کی عادات کی تفصیل (۳) حدیث کی کتابوں میں حیوانات کا ذکر (۴) بحیثیت غذا مختلف حیوانات کے حلال یا حرام ہونے کے متعلق مختلف مذاہب کی آراء (۵) حیوانات کے نام سے تعلق رکھنے والی ضرب الامثال (۶) ہر حیوان کے اعضاء اور اجزاء کے طبی اور دیگر خواص (۷) مختلف حیوانات کے خواب میں دکھائی دینے کی تعبیر۔ ان مقالوں میں جن مختلف جانوروں کا ذکر کیا گیا ہے ان میں بُراق بھی شامل ہے۔ مصنف چونکہ طبعیات کا ماہر نہیں تھا اس لیے اس نے کسی تنقید کے بغیر جانوروں کے ذکر میں وہمی اور خیالی باتوں کو بھی جگہ دی ہے۔ دمیری نے جانوروں کے متعلق ان تمام معلومات کو جن کی حیثیت روایتی ہے ایک ترتیب کے ساتھ جمع کر کے دوسروں تک پہنچا دیا ہے' اور ان معلومات کی بنیاد سینکڑوں مآخذ پر رکھی ہے' اور اس میں کوئی شک نہیں کہ ادب عربی میں یہ اپنی نوعیت کی پہلی تصنیف ہے' جس میں علاوہ اور باتوں کے طب نسبی (خاندانی امراض) اور علم النفس کے بارے میں بھی معلومات ملتی ہیں۔

## "صبح الاعشی فی صناعة الانشاء" للقلقشندی (م ۱۴۱۸)

شہاب الدین ابوالعباس احمد بن علی مصر کے علاقے قلیوب کے ایک مقام قلقشندہ میں پیدا ہوا۔ اور وہیں بعمر ۶۵ سال وفات پائی۔ وہ مصر کا نامور مورخ' ادیب' محقق اور ماہر انشا تھا۔ اس نے چھوٹی چھوٹی کتابوں کے علاوہ فن مقالہ نویسی اور انشا و ترسّل پر ایک کتاب لکھی جو خاص طور پر حکومت مصر کے اہل کاروں کے استعمال کے لیے مرتب کی گئی تھی۔ جس طرح ابن قتیبہ نے اپنی تصانیف "عیون الاخبار" اور بالخصوص "ادب الکاتب" میں لکھنے والوں کے طبقے کو اپنے زمانے کے تقریباً تمام ضروری علوم وفنون کا ایک قاموسی جائزہ لے کر معارف عامہ کی موٹی موٹی باتیں بتانے کی کوشش کی تھی' اسی طرح قلقشندی کی اس کتاب میں جو ۱۳۸۸ کے بعد لکھی گئی اور جس کا نام "صبح الاعشی فی صناعة الانشاء" ہے اس زمانے کے قریب قریب سارے علوم وفنون بڑے جامع طریقے پر اور بڑی منظم شکل میں موجود ہیں۔ نیز اس میں نہایت بیش قیمت معلومات ملتی ہیں۔ خصوصاً وہ جن کا تعلق مصر اور شام کی تاریخ اور جغرافیہ سے ہے۔

قلقشندی کی ایک اور تصنیف "نهاية الارب فی معرفة انساب العرب" بعثت نبوی کے زمانے



سے قبل کے عرب قبائل کی تاریخ اور ان کے انساب کے بارے میں ایک اہم کتاب ہے۔

☆.....☆.....☆

# علم تاریخ اور مشہور مؤرخین

اگرچہ ادب کے ساتھ تاریخ کا براہِ راست تعلق نہیں ہے' تاہم علم کی ایک شاخ (تاریخ) میں عربی نثر کے جو مختلف اسالیب اور نمونے دیکھنے میں آتے ہیں ان کے تعارف کے لئے عربی ادب کی تاریخوں میں علم تاریخ اور اس کے مشاہیر کا ذکر کرنے کی ایک عام روش چلی آتی ہے۔ چنانچہ اس موضوع پر یہاں کچھ باتیں مختصراً کہ دینا بے محل نہیں ہوگا۔

عربی زبان میں تاریخ نویسی کی ابتدائی شکل "مغازی" تھی جس میں غزوات کا ذکر ہوتا تھا اور ان کے زمانوں اور مواقع کے بارے میں قرآن اور حدیث سے جو معلومات ملتی تھیں ان کو جمع کیا جاتا تھا۔ اس کے بعد "فتوح" کا مرحلہ آیا۔ جس میں مسلمانوں کی فتوحات اور صلح و جنگ اور خراج اور جزیہ کے امور کا بیان ہونے لگا۔ پھر "طبقات" لکھے جانے لگے۔ یہ ان صحابہ وتابعین کے احوال کا ذکر کرتے تھے جو شریعت کے راوی ہوتے تھے اور ادب و شعر میں کلام کرتے تھے۔ پھر "انساب" کی باری آئی۔ یہ قریش اور دوسرے قبائل کے فائدے کے لیے لکھے جاتے تھے اور ان کا شجرہ نسب بیان کرتے تھے۔ اور آخر میں "ایام العرب" مدون کئے گئے جو ان زمانوں کی شاعری اور اس کے پس منظر کو اجاگر کرتے تھے۔ تاریخ نویسی سے قبل کے ان مراحل میں جن لوگوں نے شہرت حاصل کی وہ یوں ہیں: "مغازی" میں ابن اسحاق (م ۷۶۸) "فتوح" میں واقدی (م ۸۲۲) "طبقات" میں ابن سعد (م ۸۴۵) "انساب" میں کلبی (م ۸۱۹) اور "ایام العرب" میں اصمعی (م ۸۳۱)

عربی زبان میں باقاعدہ تاریخ لکھنے کا آغاز محمد بن جریر طبری (م ۹۲۲) سے ہوتا ہے' جس کی "تاریخ الامم والملوک" نے تاریخ نگاری کا راستہ متعین کر دیا' اور اس کے بعد مورخین نے اس کام کو آگے بڑھایا۔ عربوں کے ہاں تاریخ نگاری کے دو طریقے رائج رہے۔ ایک یہ کہ سنین کا ذکر کر کے ان میں ہونے والے واقعات کا بیان کیا جائے' چاہے وہ کہیں بھی واقع ہوئے ہوں اور ان کا آپس میں کوئی تعلق ہو یا نہ ہو۔ یہ طریقہ طبری' ابن الاثیر اور ابوالفداء نے اختیار کیا۔ اور دوسرا طریقہ یہ تھا کہ واقعات کا ذکر قوموں اور حکومتوں کے ضمن میں کیا جائے۔ یہ طریقہ مسعودی' ابن طقطقی اور ابن خلدون نے اپنایا۔

عرب قوم میں جو مشہور مؤرخین گزرے ہیں' ان کے اور ان کی کتابوں کے نام اس طرح ہیں:

| | | |
|---|---|---|
| ابن جریر طبری | (م ۹۲۲) | تاریخ الامم و الملوک |
| مسعودی | (م ۹۵۷) | مروج الذهب |
| ابن مسکویه | (م ۱۰۳۰) | تجارب الامم و تعاقب الهمم |
| ابن الاثیر | (م ۱۲۳۳) | الکامل فی التاریخ |
| ابوالفداء | (م ۱۳۳۱) | المختصر فی تاریخ البشر |
| ابن خلدون | (م ۱۴۰۶) | کتاب العِبرَ و دیوان المبتدأ و الخبر |

☆......☆......☆

## شرعی علوم: علم حدیث اور علم فقہ

**علم حدیث:** آنحضرتؐ نے اپنی زندگی میں جو کچھ بھی فرمایا اسے حدیث کہتے ہیں۔ آپ کی حیات مبارکہ میں صحابہ کرام یہ احادیث سنتے رہے اور اپنے سینوں میں محفوظ کرتے رہے...... آنحضرتؐ پر وحی کی صورت میں جو آیات نازل ہوتی تھیں انہیں تو آپؐ کے حکم سے لکھ لیا جاتا تھا۔ لیکن آپ کی احادیث کے لکھنے کا حکم نہیں تھا' اس خیال سے کہ یہ کہیں قرآن کی آیات کے ساتھ خلط ملط نہ ہو جائیں۔ چنانچہ احادیث آنحضرتؐ کی وفات کے بعد بھی زبانی روایت کی جاتی رہیں۔ لیکن پھر یہ ہوا کہ مسلمانوں میں ایک طرف مذہبی فرقے بنتے چلے گئے اور دوسری طرف ان کے درمیان سیاسی اختلافات پیدا ہونے لگے۔ ان حالات میں بعض موقع پرست لوگوں نے حدیثیں وضع کرنی شروع کر دیں' جن کا مقصد کسی عقیدے کی تائید کرنا یا کسی گروہ کو برحق ثابت کرنا ہوتا تھا۔ یہ رجحان بڑھتے بڑھتے جب خطرناک حدود تک پہنچ گیا تو خلیفہ عمر بن عبدالعزیز کو صحیح احادیث کے جمع کرنے اور انہیں لکھنے کا خیال آیا۔ ان کے بعد اس خطرے کے پیش نظر کہ احادیث کے راویوں کی موت کے ساتھ کہیں یہ احادیث بھی ان کے ساتھ دفن نہ ہو جائیں' عباسی خلیفہ ابوجعفر المنصور نے احادیث کی تدوین کا بیڑا اٹھایا۔ چنانچہ اس نے امام مالک بن انس (م ۷۹۵) کو اس بارے میں ہدایت کی تو انہوں نے صحیح احادیث کا پہلا مجموعہ ''موطا'' کے نام سے مدون کیا' جو حدیث اور فقہ کا امتزاج تھا۔ اس زمانے تک چونکہ احادیث کے نام سے بہت سی گھڑی ہوئی اور جھوٹی حدیثیں روایت کی جانے لگی تھیں' اس لئے بعض ائمہ نے احادیث کے اس سارے ذخیرے کو کھنگالنے اور اس کی جانچ پرکھ کر کے اس میں سے صحیح اور قابل اعتبار احادیث کو جمع کرنے کا کام اپنے



ذمے لیا' اور اس مقصد کے لئے انہوں نے بہت سخت قسم کے معیار (Criteria) مقرر کئے' اور ان معیاروں کا سختی کے ساتھ التزام کرتے ہوئے انہوں نے حدیث کے مجموعے مرتب کئے۔ ان مجموعوں میں سے چھ مجموعے ''صحاح ستہ'' (یعنی چھ صحیح کتابوں) کے نام سے مشہور ہوئے۔ یہ حسب ذیل ہیں۔

۱۔ صحیح بخاری: امام محمد اسماعیل بخاری (م ۸۷۰) نے سولہ سال کی محنت اور کاوش کے بعد یہ کتاب ''الجامع الصحیح'' مرتب کی۔ اس میں نو ہزار حدیثیں درج کیں جنہیں انہوں نے چھ لاکھ حدیثوں کی چھان پھٹک کے بعد جمع کیا۔ اس مجموعے میں تین ہزار حدیثیں ایسی ہیں جو تکرار کے ساتھ مختلف ابواب میں بیان ہوئی ہیں۔

۲۔ صحیح مسلم: امام مسلم بن الحجاج (م ۸۷۴) نے تین لاکھ حدیثوں کی چھان بین کے بعد اپنی یہ کتاب مرتب کی۔ صحیح بخاری کے بعد یہ حدیث کی سب سے صحیح کتاب مانی جاتی ہے۔

۳۔ سنن ابن ماجہ: ابوعبداللہ ابن ماجہ (م ۸۸۷)

۴۔ سنن ابوداود: ابوداود السجستانی (م ۸۸۹)

۵۔ جامع الترمذی: ابوعیسیٰ الترمذی (م ۸۹۲)

۶۔ سنن النسائی: عبدالرحمان النسائی (م ۹۱۵)

☆.....☆.....☆

ان کے علاوہ مسند احمد بن حنبل (م ۸۵۵) بھی حدیث کا ایک صحیح مجموعہ قرار دیا جاتا ہے۔ اس طرح موطا امام مالک کے ساتھ یہ کل آٹھ کتابیں ہیں جو حدیث کی صحیح کتابیں شمار ہوتی ہیں۔ جن کی بہت سی شرحیں اور خلاصے لکھے گئے ہیں' اور دینی مدارس میں ان کی تعلیم دی جاتی ہے۔ ان آٹھ کتابوں کے علاوہ بھی احادیث کے کچھ اور مجموعے ہیں' جو اتنے مشہور نہیں ہیں' لیکن ان سے استفادہ ضرور کیا جاتا ہے۔

**علم فقہ:** اس علم کی نشوونما تو صدر اسلام کے عہد میں ہوئی۔ لیکن اس کی تدوین و تصنیف بنو عباس کے عہد میں جا کر ہوئی۔ مدینہ اس وقت فقہاء اور محدثین کا مرکز تھا۔ جب عراق میں عباسی حکومت قائم

ہو گئی تو اس کے لوگوں میں فقہ کا رواج ہوا اور ان میں ایک گروہ ایسا سامنے آیا جس نے شریعت کے معاملات میں اہل حجاز کا طریقہ چھوڑ کر نیا طریقہ اختیار کیا۔ حجاز کے فقہاء شرعی احکام کی بنیاد نصوص پر رکھتے تھے (یعنی کسی آیت یا حدیث کی بنیاد پر) اور اس معاملے میں قیاس سے بالکل رجوع نہیں کرتے تھے۔ ان کے رہنما اس معاملے میں امام مالک بن انس (م ۷۸۵) تھے۔ ادھر عراق میں فقہاء چونکہ روایت کو اہمیت دیتے تھے اور احادیث سے اتنی واقفیت نہیں رکھتے تھے' وہ فقہ کے مسائل کے لئے قیاس سے کام لینے لگے۔ ان معاملات میں وہ اپنی رائے رکھتے تھے۔ اور ان کے سربراہ امام ابوحنیفہ النعمان (م ۷۶۷) تھے۔ عباسی خلیفہ منصور نے سیاسی مصلحتوں کے تحت عراق کو حجاز پر اور بغداد کو مدینے پر ترجیح دی۔ چنانچہ اس نے ابوحنیفہ کو بغداد بلا لیا اور ان کے فقہی مذہب کو عراق' ایران' خراسان' ہندوستان' چین اور ترکی تک پھیلا دیا۔ اور مالکی مذہب حجاز' مغرب اقصیٰ اور اندلس تک محدود ہو گیا۔ پھر محمد بن ادریس الشافعی (م ۸۲۰) آئے۔ وہ یوں تو مالک کے پیروکار تھے۔ لیکن جب وہ عراق گئے تو ابوحنیفہ کے اصحاب سے قیاس کے مسائل سیکھے اور ان دونوں مذاہب کے بین بین ایک اور مذہب کی بنیاد رکھی۔ پھر وہ مصر چلے گئے اور وہاں جا کر اپنے مذہب کی تنقیح کی اور اسے درست کر کے وہاں رائج کیا۔ ان کے بعد احمد بن حنبل (م ۸۵۵) آئے۔ انہوں نے حدیث شافعی سے سیکھی اور قیاس بعض حنفی علماء سے اخذ کیا' اور ایک اور فقہی مذہب کی تشکیل کی۔ جو نجد اور بحرین میں پھیلا۔ اس مذہب میں حدیث کے اتباع کا اہتمام زیادہ تھا اور فروع میں کافی شدت برتی جاتی تھی۔

فقہ کے یہ چاروں مذاہب: مالکی' حنفی' شافعی اور حنبلی مسلم امت میں آج تک رائج ہیں اور زندگی کے روزمرہ مسائل میں انہی میں سے کسی ایک یا دوسرے مذہب پر عمل کیا جاتا ہے۔ جو لوگ ان فقہی مذاہب میں سے کسی مذہب کی پیروی کرتے ہیں وہ مقلد کہلاتے ہیں' اور جو ان فقہی مذاہب میں سے ایک یا دوسرے کی پابندی کرنے کی بجائے اپنے مسائل براہ راست حدیث اور سنت نبوی کی روشنی میں حل کرنا چاہتے ہیں' ان کو غیر مقلد کہا جاتا ہے۔ ان کا دوسرا نام اہل حدیث ہے۔

☆.....☆.....☆

## عربی ادب میں قصے اور حکایات

قصہ یا حکایت انسان کی ذہنی تفریح کے لئے ہمیشہ ایک دل پسند اور موثر ذریعہ رہی ہے۔ آج کے دور کا افسانہ اور ناول اس کی ترقی یافتہ اور خالص ادبی معیاروں پر پورا اترنے والی صورتیں ہیں۔ دنیا کے بیشتر ممالک میں زمانہ قدیم سے ان کہانیوں اور داستانوں کا سراغ ملتا ہے۔ جو انسان بچپن میں اپنے بڑوں کی زبانی سنتا تھا اور پھر بڑا ہو کر ان محفلوں میں بھی سنتا تھا جو گھروں محلوں اور چوپالوں پر جمتی تھیں۔ ایک زمانے تک تو ان کی روایت زبانی ہوتی رہی' پھر ان کہانیوں کو قلم بند کیا جانے لگا' اور مغرب میں خاص طور پر اچھے لکھنے والوں نے ان کی طرف توجہ کی اور رفتہ رفتہ اس فن کو ترقی دے کر آگے بڑھایا۔ عربوں کے ہاں قصہ اور کہانی کہنے کی ریت شروع سے ہی نہیں پنپ سکی۔ اس کی کئی وجوہات ہو سکتی ہیں۔ مثلاً یہ کہ جاہلی دور اور اس کے بعد اسلامی اور اموی دور تک عربوں کے ہاں نثر میں اظہار خیال کا کوئی زیادہ رواج نہیں تھا' اور حکایت اور داستان چونکہ نثر میں ہوتی ہے اس لئے اس کی طرف عربوں نے توجہ نہ کی۔ نثر میں ان کے ہاں شروع کے زمانوں میں صرف خطبے' مواعظ' حکمت کی باتیں اور ضرب الامثال ہی سننے میں آتی تھیں۔ دوسری وجہ یہ کہ حکایت اور داستان کے لئے تصور و خیال (Imagination) کو کام میں لانا پڑتا ہے' اور واقعات کا تانا بانا اور کرداروں کی حرکات و سکنات اپنے ذہن سے گھڑ کر بیان کرنی پڑتی ہیں۔ عربوں کا ذہن اس چیز کے لئے بنا ہی نہیں تھا۔ ان کے ہاں اگر کچھ واقعات بیان کرنے کا عمل شروع بھی ہوا تو وہ "ایام العرب" کی صورت میں تھا۔ یعنی زمانہ جاہلیت میں مختلف قبائل کے درمیان طویل جنگیں ہوتی رہتی تھیں' ان کا آنکھوں دیکھا حال اور ان کے حقیقی واقعات کا بیان۔ اس بیان میں زبان اور محاورے کے کمالات تو ہوتے تھے' لیکن تخیل و تصور کا کوئی دخل نہیں ہوتا تھا۔

عربی زبان میں قصوں اور کہانیوں کے سب سے پہلے نمونے ان ترجموں کی صورت میں سامنے آتے ہیں جو عرب ادیبوں نے ہندی ایرانی مآخذ سے کیے تھے۔ مثلاً ابن المقفع کی "کلیلہ و دمنہ" جو پہلے ہندوستان سے ایران میں آئی اور پھر فارسی زبان سے عربی میں منتقل کی گئی۔ اسی طرح ایرانی کتاب "ہزار افسانہ" جو عربی کی الف لیلہ و لیلہ کے مآخذ میں سے ہے' اور الف لیلہ میں شامل بہت سی کہانیاں اسی سے لی گئی ہیں۔

جب عربوں کے ہاں خوشحالی آئی اور خلافت اور حکومت کی ذمہ داریوں کا بہت سا بوجھ عجمی وزیروں اور عہدہ داروں نے سنبھال لیا تو خلفاء اور امراء اپنا فارغ وقت راتوں کو باتیں کرنے اور ایک دوسرے کو کہانیاں سنانے میں گزارنے لگے۔ ان کی اس ضرورت کو پورا کرنے کے لئے ان کے ساتھی اور مصاحب ایک دوسرے سے بڑھ کر قصے اور حکایات جمع کر کے یاد کرنے لگے۔ اس کے بعد نویں اور دسویں صدیوں کے ادباء نے یہ کہانیاں اور داستانیں وضع کرنی شروع کیں۔ تاکہ انہیں امراء و خواص کو سنا کر ان کا دل بہلایا جا سکے۔ ان کی دیکھا دیکھی دوسری طرف عوام الناس اور کھاتے پیتے اور فارغ لوگوں کو بھی

یہ ضرورت محسوس ہوئی کہ ان کے ہاں شادیوں پر‘ میلوں میں اور دوسرے موقعوں پر ان کو بھی کہانیاں سنا کر محظوظ کیا جائے۔ یہ ضرورت اور زیادہ بڑھ گئی جب عباسی دور کے اواخر میں سلاجقہ اور مغلوں کے مظالم نے عالم اسلام کو ہر طرف مصائب و آفات سے دوچار کر دیا۔ چنانچہ ان لوگوں کی ضرورت پوری کرنے کے لئے داستان گوؤں کا طبقہ وجود میں آیا۔ انہوں نے عام لوگوں کو انواع و اقسام کی کہانیاں سنانی شروع کیں جو انہوں نے اس مقصد سے جمع کی تھیں۔ یہ بہادروں اور سورماؤں کی کہانیاں تھیں‘ جنات اور روحوں کے قصے تھے۔ جادوگروں کی کارروائیوں کا احوال تھا‘ اور دوسری اس طرح کی عجیب و غریب باتیں جو ان لوگوں نے کئی نسلوں اور زمانوں سے سن سن کر اکٹھا کی تھیں‘ اور جو تاجروں اور مسافروں نے دنیا کے ملکوں کا سفر کر کے جمع کی تھیں۔ ان کہانیوں میں مبالغہ بھی ہوتا تھا اور من گھڑت باتیں بھی ہوتی تھیں۔ اس کے بعد یہ ہوا کہ ان کہانیوں اور داستانوں کو جو اب تک سینہ بہ سینہ چلی آ رہی تھیں بعض لوگوں نے جوں کا توں‘ بغیر کسی ضابطے کے‘ جمع کر کے لکھ لیا اور کہانیوں اور داستانوں کا یہ ذخیرہ صدیوں تک نسل در نسل چلتا رہا۔ حتیٰ کہ جن لوگوں نے انہیں مدون کیا تھا ان کے نام بھی کسی کو یاد نہ رہے۔ ان قصوں میں جو خاص طور پر مشہور ہوئے۔ ان کے نام کچھ یوں ہیں:- عنترہ کا قصہ (یا سیرت عنترہ)‘ بو ہلال کا قصہ‘ سیف بن ذی یزن کا قصہ‘ امیرۃ ذات الہمۃ (بہادر شاہزادی) کا قصہ‘ ظاہر بیبرس کا قصہ‘ علی الزیبق مصری کا قصہ‘ فیروز شاہ کا قصہ وغیرہ! ان کہانیوں پر غور کرنے سے لگتا ہے کہ یہ گیارہویں‘ بارہویں اور تیرہویں صدیوں میں لکھے گئے۔ ان میں سے بعض کا زمانہ صلیبی جنگوں کے چھڑنے کا زمانہ ہے‘ اور بعض کا سقوط بغداد کے بعد کا۔ یہ امر کہ یہ سب قصے مصر میں لکھے گئے اس بات سے عیاں ہے کہ ان میں جو واقعات بیان کیے گئے ہیں ان کے مقامات مصر میں ہیں۔ اور ان کے اشخاص کے نام بھی مصری ہیں۔

ان میں سب سے مشہور اور ہر دلعزیز عنترہ کا قصہ شجاعت اور عشق و محبت کے واقعات پر مشتمل ہے۔ عنترہ یوں تو زمانہ جاہلیت کا ایک مشہور شاعر تھا اور وہ معلقات کے سات بڑے شعراء میں سے ایک ہے۔ لیکن اس کے کردار کا جو خاص وصف اس کی ہمت‘ شجاعت اور جنگجوئی کی صورت میں مشہور ہوا‘ اور پھر اپنی چچازاد بہن "عبلہ" سے اس کا والہانہ عشق! اس کو لے کر اس پر افسانوں اور داستانوں کی اتنی تہیں چڑھا دی گئیں کہ کچھ صدیاں گزرنے پر عنترہ حقیقی سے زیادہ ایک داستانی وجود بن کے رہ گیا‘ جو ایک طرف تو سورماؤں کا سورما ہے۔ جس سے دشمنوں کی جان جاتی ہے اور دوسری طرف وہ بے پناہ محبت کرنے والا عاشق ہے اور اس کی محبوبہ عبلہ اپنے حسن و جمال اور اپنی جوانی و رعنائی میں آسمان سے اتری ہوئی کوئی حور ہے۔ ایک قصہ جو اتنی صدیوں تک مسلسل سنایا گیا ہو اس میں کئی تبدیلیوں اور اضافوں اور



کاٹ چھانٹ کا ہونا ناگزیر تھا۔ چنانچہ عنترہ کے قصے کی بھی کئی روایتیں (Versions) مروج رہیں اور ان کے یورپی زبانوں میں ترجمے ہوئے‘ جن میں سے ایک روایت میں عنترہ کا انجام یوں بتایا گیا ہے کہ ایک لڑائی میں اس کے ایک دشمن نے جب دھوکے سے اس پر زہر میں بجھے ہوئے نیزے سے حملہ کیا تو وہ بہت زخمی ہو گیا اور اسے اپنا انجام قریب نظر آنے لگا۔ اس نے اپنے لشکر کو جو آگے گیا ہوا تھا پیچھے بلا لیا اور اپنے خیموں میں واپس جانے کے لئے کہا‘ اور وہ خود ایک گھوڑے پر سوار ایک نیزے سے ٹیک لگائے کھڑا رہا۔ کچھ دیر بعد وہ وہیں مر گیا‘ لیکن دشمن یہ سمجھتے رہے کہ وہ زندہ ہے اور اس کے ڈر کے مارے وہ دور ہی رہے اور اس کے ساتھیوں سے کوئی تعرض نہ کیا‘ یہاں تک کہ وہ بحفاظت واپس چلے گئے۔ کافی دیر کے بعد ان لوگوں کو شک ہوا کہ عنترہ اتنی دیر سے جو گھوڑے پر سوار ہے کہیں زندہ بھی ہے یا نہیں۔ انہوں نے اس کے گھوڑے کی طرف ایک پتھر پھینکا تو وہ بدکا‘ جس سے عنترہ کا نیزہ گر گیا اور وہ نیچے آ رہا۔ اس وقت دشمن کو پتا چلا کہ اس نے جان دیتے ہوئے بھی کتنی بہادری کا کارنامہ انجام دیا اور اپنے ساتھیوں کو دشمنوں سے بچا لے گیا۔ اس قصے کا یہ انجام فرانس کے شاعر لامرتین کو بہت پسند تھا اور وہ اس کے لئے سراپا ستائش تھا۔ یونانی ادبیات میں Eliad (الیاڈ) ایک بہت بڑا رزم نامہ (Epic) ہے۔ عربی میں اس معیار کا رزم نامہ تو کوئی نہیں‘ لیکن بعض لوگوں کا خیال ہے کہ اگر عربی زبان میں کوئی رزم نامہ ہوتا تو عنترہ کا قصہ عربی زبان کی Eliad (الیاذۃ العرب) کہا جانے کا حقدار تھا۔

☆.....☆.....☆

## الف لیلہ و لیلہ (Thousand and One Nights)

حکایات کی یہ کتاب عربی زبان میں تفریح کا ایک ایسا خزانہ ہے جس کی مثال دنیا کی دوسری زبانوں میں مشکل سے ہی ملے گی۔ حکایتوں‘ داستانوں اور مہم جوئی کے قصوں پر مشتمل یہ کتاب کسی خاص وقت اور زمانے کی تصنیف نہیں ہے اور نہ اس کا کوئی ایک معلوم مصنف ہے‘ بلکہ یہ ایسی عجیب و غریب کتاب ہے جو کئی صدیوں کے عمل نمو (Evolution) کے بعد اپنی موجودہ صورت تک پہنچ پائی ہے۔ یہ عوامی ادب کی کتاب ہے جس نے مختلف ملکوں اور تہذیبوں کی داستانی روایات کو اپنے دامن میں سمیٹا ہے۔

اغلب خیال یہی ہے کہ الف لیلہ اہل ایران کی کہانیوں کی ایک مختصر کتاب "ہزار افسانہ" سے ماخوذ ہے‘ جس کی بنا انہوں نے چار کرداروں پر رکھی تھی: بادشاہ‘ وزیر‘ وزیر کی بیٹی شہرزاد اور اس کی لونڈی دنیا زاد۔ عربوں نے تیسری صدی ہجری (نویں صدی عیسوی) کے آخر میں فارسی سے اس کتاب کا ترجمہ عربی


Scanned with CamScanner

میں کیا اور پھر وقت کے ساتھ ساتھ اس پر اضافے کرتے چلے گئے یہاں تک کہ اس کا ابتدائی فارسی اور ہندی حصہ بالکل دب کے رہ گیا۔ اس کتاب کی اصل اور ترکیبی کہانی (Frame Story) ہندی طرزِ حکایت کا نمونہ ہے جسے ایرانیوں نے اپنا لیا۔ یہ کہانی مختصراً یوں ہے کہ شہریار ایک ظالم بادشاہ ہے جو ہر روز نئی شادی کرتا ہے۔ لیکن وہ عورتوں سے اتنی نفرت کرتا ہے کہ ایک رات گزارنے کے بعد وہ اپنی ملکہ کو صبح ہوتے ہی قتل کر دیتا ہے۔ اس کے اس ظالمانہ رویے سے اس کی رعایا بے حد پریشان رہنے لگتی ہے۔

یہاں تک کہ ایک دن وزیر کی بیٹی شہرزاد بادشاہ کی اصلاح کے ارادے سے اس سے شادی کرتی ہے اور اس کی ملکہ بنتی ہے۔ ملکہ شہرزاد روزانہ رات کے پچھلے حصے میں ایک کہانی بادشاہ کو سنانا شروع کرتی ہے اور جب پیچیدہ سحر نمودار ہونے لگتا ہے تو وہ کہانی میں سے کہانی پیدا کر کے حالات کو ایسے موڑ پر لے آتی ہے کہ بادشاہ کو باقی کہانی سنے بنا چین نہیں پڑتا۔ چنانچہ وہ ملکہ کو ایک رات کی مہلت دیتا ہے تا کہ وہ دوسری رات کہانی ختم کر سکے۔ لیکن ملکہ ہر رات اسی طرح کہانی میں سے کہانی نکالتی چلی جاتی ہے۔ اس طرح ہوتے ہوتے ایک ہزار اور ایک راتیں بیت جاتی ہیں اور جب آخری رات کہانی ختم ہوتی ہے تو بادشاہ ملکہ شہرزاد کا احسان مند ہوتا ہے اور اپنی اس ظالمانہ روش سے باز آ جاتا ہے۔

جیسا کہ اوپر ذکر ہوا الف لیلہ میں مختلف تہذیبوں کی داستانی روایات ہیں۔ چنانچہ کتاب کا پہلا حصہ جو زیادہ تر فارسی اور ہندی کہانیوں کے ترجمے پر مشتمل ہے اس پر ہندی قصہ گوئی کے اثرات واضح طور پر دکھائی دیتے ہیں۔ ایک قصے میں سے دوسرا قصہ نکالنا دراصل قدیم ہندی قصہ گوئی کا خاص انداز تھا۔ ہندی قصہ گوئی کے اسی اسلوب کو اپنا کر اہلِ ایران نے اپنی کہانیاں تصنیف کیں اور انہی کہانیوں نے بعد ازاں عربی میں منتقل ہو کر الف لیلہ کی صورت اختیار کی۔ الف لیلہ کے اس ابتدائی حصے کی کہانیوں کے کرداروں کے نام فارسی ہیں (شہرزاد، شہریار، شہر زمان، اردشیر، حیات النفوس، قمر الزماں بن شہر زمان، شہزادی بدور وغیرہ)

الف لیلہ کا دوسرا حصہ جسے بغدادی اور خالص عربی حصہ کہنا چاہیے زیادہ تر عرب کے داستان گوؤں کی اپنی تخلیق ہے۔ کتاب کے اس مقامی حصے میں پڑھنے والے کو خلیفہ ہارون الرشید کے بغداد کی سوسائٹی اور اس کے اعلیٰ اور وسطی طبقوں کی ایک اجلی اور قابلِ فہم تصویر نظر آتی ہے جو ایک فصیح اور معیاری زبان اور شیریں لہجے میں پیش کی گئی ہے۔ کتاب کا یہ حصہ تقریباً دسویں اور گیارہویں صدی عیسوی میں ترتیب پایا۔ علی بن بکار اور شمس النہار، انس الوجود اور ورد الاکمام، قصہ سوتے جاگتے کا، ابوالحسن عیش پرست، قصہ تین بہنوں کا اور تین گداگروں کا، نیز سندباد کی حکایات...... یہ اس حصے کی مشہور اور خصوصی کہانیاں ہیں۔

کتاب کا تیسرا حصہ وہ ہے جس کی تالیف و تشکیل مصر کے بازاروں میں پانچ سو سال کے عرصے میں



تام ہوتی ہے۔ کتاب کا یہ حصہ وسعت اور ضخامت میں پچھلے دونوں حصوں سے زیادہ، موضوع کے اعتبار سے واقعہ و حقیقت کے قریب، لیکن زبان و ادب کے اعتبار سے فروتر ہے۔ جنگ و جدل، مہم جوئی، طلسمات، جادو، جنات، پریاں اور تقدیر وغیرہ اس حصے کے موضوع ہیں۔

الف لیلہ کی دریافت کا سہرا فرانس کے موسیو انطون گلان کے سر جاتا ہے جو استنبول میں فرانسیسی سفارت خانے میں سیکرٹری تھا۔ اس کے ہاتھ پہلے بعض مشرقی مخطوطات میں سے سندباد کی کچھ کہانیاں لگیں اور پھر حلب کے ایک باشندے سے اسے کہانیوں کی کتاب الف لیلہ کی چار جلدیں مل گئیں۔ گلان نے ان سب کہانیوں کا فرانسیسی میں ترجمہ کیا جو اتنا مقبول ہوا کہ دوسری یورپی زبانوں میں بھی ان غرابت آمیز (Exotic) کہانیوں کے ترجمے ہو گئے۔ ایک سو سال تک الف لیلہ کی یہی کہانیاں یورپ میں پڑھی جاتی رہیں۔ پھر جب نپولین مصر آیا تو اس کے ساتھ آنے والے ادباء اور سکالروں نے اس امر کا سراغ لگا لیا کہ الف لیلہ دراصل ایک بڑی ضخیم کتاب ہے اور اب تک اس کی جن کہانیوں کا ترجمہ ہوا ہے وہ اس کا ایک چوتھائی حصہ ہیں۔ اس کے بعد الف لیلہ کے مکمل اور مستند نسخوں کی تلاش شروع ہوئی اور جب کچھ صحیح اور قابلِ استناد نسخے اس مکمل کتاب کے دستیاب ہو گئے تو ان کے انگریزی زبان میں اچھے اور مستند ترجمے ہوئے جن میں ایڈورڈ ڈبلیو لین، جان پین اور سر رچرڈ برٹن کے ہر دلعزیز اور معتبر ترجموں کے بعد ایک اور عمدہ ترجمہ انڈریو لینگ نے انیسویں صدی کے اختتام سے پہلے کر لیا۔ الف لیلہ کا جو ترجمہ سر رچرڈ برٹن نے کیا ہے وہ تیرہ جلدوں میں ہے اور اس میں مترجم نے جو فٹ نوٹس جگہ جگہ دیے ہیں وہ بہت مفید اور معلومات افزا ہیں۔

اہلِ یورپ کے نزدیک عربی حکایات کی اس کتاب "الف لیلہ و لیلہ" کی اہمیت کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ اس میں ہمیں عرب تاریخ کے مختلف زمانوں میں عرب سوسائٹی کے روزمرہ رہن سہن اور طرزِ معاشرت کے مطالعے کا موقع ملتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ یہ کتاب ان کے ہاں ہمیشہ سے بحث و تحقیق کا موضوع چلی آتی ہے۔

☆......☆......☆

## باب ۷

# عربی ادب کا موجودہ دور

## (انیسویں صدی کے آغاز سے بیسویں صدی کی دوسری دہائی تک)

اٹھارویں صدی کے اواخر تک آتے آتے عرب اسلامی مملکت سکڑ کر اب صرف عراق، شام، جزیرہ نمائے عرب، مصر، سوڈان اور المغرب تک محدود ہو کے رہ گئی تھی۔ لیکن عربی زبان جو پچھلے پانچ سو سال سے زوال و انحطاط کا شکار چلی آتی تھی، اس کے لیے قدرت نے یہ چاہا کہ اسے اس دور میں ایک نئی زندگی عطا کی جائے۔ یہ زندگی اسے مصر میں ملی۔ مصر اس زمانے میں دستوری طور پر تو عثمانی سلطنت کے زیر نگیں تھا، لیکن عملاً اس پر ممالیک کا تسلط تھا۔ ۱۷۹۸ میں فرانس کے نپولین بونا پارٹ نے مصر پر حملہ کیا اور اس پر غلبہ پالیا۔ اس کے ساتھ اہل علم کا جو گروہ آیا تھا انہوں نے جنگ کے ہنگاموں سے الگ رہ کر مصر میں تہذیب کا بیج بونے کے لیے کام کیا۔ اس سلسلے میں انہوں نے یہاں دو مدرسے قائم کیے، دو اخبار جاری کیے، ایک تھیٹر کی بنیاد رکھی، ایک مجمع علمی (علمی اکادمی) کی تنظیم کی اور ایک چھاپہ خانہ لگا دیا۔ ان سارے اقدامات کا اثر یہ ہوا کہ مصر کی فضا پر جو اندھیارا چھایا ہوا تھا وہ چھٹنا شروع ہوا اور لوگوں نے دیکھا کہ اب وہ ایک نئی زندگی کے جلو میں نئی انیسویں صدی میں پہنچ گئے ہیں، جہاں ان کے سامنے مغرب اس طرح کھڑا ہے جیسے کوئی عاقل و ہوشمند انسان ایک بے زبان حیوان کے سامنے کھڑا ہو۔ اس تبدیلی پر باقی دنیا تو حیرت زدہ ہوئی لیکن خدیوی خانوادے کے سربراہ محمد علی الکبیر کو اس پر کوئی تعجب نہ ہوا۔ اس نے یہ سمجھ لیا کہ مغرب میں جو تہذیب اور تمدن ہے وہ سب کچھ علم کی بدولت ہے اور ان کے انتظام و انصرام اور فوجی تنظیم کی وجہ سے ہے۔ چنانچہ اس نے مصر میں تعلیم کو عام کرنے کا منصوبہ بنایا۔ اس کے لیے اس نے فوجی تعلیم و تربیت اور دوسرے علوم کے لیے مدارس قائم کیے اور لوگوں کو پکڑ پکڑ کر ان میں بھیجا۔ نیز اس کام پر فرانس کے سکالروں کے ایک گروہ کو مامور کیا۔ پھر ان مدارس سے پڑھ کر نکلنے والوں کو اس نے اعلیٰ تعلیم کے لیے فرانس بھیجا۔ ۱۸۲۶ میں وہ لوگ جب تعلیم حاصل کر کے واپس آئے تو تعداد میں ۴۴ تھے۔ انہوں نے آتے ہی ان سارے علوم میں ترجمہ و تالیف اور تعلیم کا کام اپنے ذمے لے لیا۔ اس کے بعد بھی تعلیم کے لیے وفد یورپ بھیجے جاتے رہے جو عموماً جامع ازہر سے ہوتے



تھے۔ پھر آگے چل کر قاہرہ میں زبانوں کا مدرسہ قائم ہوا اور اس کے ساتھ ہی ایک دارالترجمہ کا قیام عمل میں آیا اور فرانسیسی چھاپے خانے کی جگہ ایک نئے مصری چھاپے خانے نے لے لی۔ ادھر لبنان میں امیر بشیر الشہابی نے وہ سب کچھ کیا جو مصر میں محمد علی نے کیا تھا۔ اس کی اعانت امریکی اور فرانسیسی عیسائیوں کے مبلغوں نے کی، اور مدارس اور چھاپے خانے قائم کیے، کتابیں لکھیں، رسالے شائع کیے، ڈرامے کی تعلیم دی اور اس ساری کارروائی میں ان کا پورا اعتماد عربی زبان پر قائم رہا۔ چنانچہ مصر اور لبنان نے مل کر زبان اور علوم کی ترقی کے لیے بڑا کام کیا۔ یورپ کی علمی کتابوں کے ترجمے کیے گئے اور عربی کتابیں چھاپی گئیں، جس سے عربی زبان کے تن مردہ میں زندگی کی لہر دوڑ گئی۔ لیکن عربی ادبیات اور علوم تاحال گوشۂ گمنامی میں ہی رہے۔ اس لیے کہ محمد علی کو دوسرے کاموں نے مصروف رکھا اور اس کے عہد میں دفاتر کی زبان بدستور ترکی اور عربی کا آمیزہ ہی رہی۔ یہ سلسلہ یونہی چلتا رہا، یہاں تک کہ خدیوی اقتدار ۱۸۶۳ میں اسماعیل کے پاس آ گیا۔ اس نے وہ سب مدارس جو اس کے پیش رو خدیو عباس اور خدیو سعید نے بند کر دیے تھے، پھر سے کھول دیے اور ان پر کچھ اور مدارس کا اضافہ کیا۔ انجینئرنگ، ڈاکٹری، دفاع اور دوسرے علوم کے لیے درسگاہیں قائم کیں اور یورپ کو وفود بھیجنے کا سلسلہ جو معطل ہو گیا تھا پھر سے جاری کر دیا۔ خدیوی لائبریری قائم کی۔ جب ملک میں امن و سکون ہوا تو غیر ملکی لوگ جن میں علماء اور ادباء بھی تھے، تجارت اور دوسری ضروریات کے لیے مصر آنے لگے۔ ان کے ساتھ ارتباط اور اختلاط کے نتیجے میں چھاپہ خانے عام ہوئے، مدارس کی تعداد میں اضافہ ہوا، صحافت کو فروغ حاصل ہوا، علوم کے ترجمے ہونے لگے جس کا اثر یہ ہوا کہ یورپی تہذیب کے اثرات بڑھنے لگے۔ چنانچہ ذہنوں میں وسعت آنے لگی، زبان ترقی کی راہ پر گامزن ہوئی اور ادبیات میں بھی زندگی کی لہر دوڑ گئی۔

پھر مصر ۱۸۸۲ میں انگریزی استعمار کے نیچے آ گیا۔ انگریزوں نے آ کر ترقی کی ساری رفتار روک دی اور تعلیم کو دوسری نہج پر ڈال دیا۔ یورپ کو وفود بھیجنے کا سلسلہ ختم کر دیا۔ السنہ (زبانوں) کی تعلیم کا مدرسہ بند کر دیا۔ عربی زبان کو پیچھے کر کے ساری تعلیم انگریزی زبان میں دی جانے لگی اور تعلیم کا مقصد صرف یہ رہ گیا کہ حکومت کے لیے کارندے تیار کیے جائیں نہ کہ امت کے لیے قابل افراد۔ لیکن مصری قوم نے پیچھے ہٹنے سے انکار کر دیا اور ان کے زعماء اپنی زبان عربی کی بالادستی کے لیے اٹھ کھڑے ہوئے اور اپنی نئی نسلوں کی تعلیم کا ذمہ خود لے لیا۔ مدارس میں عربی زبان لوٹ آئی اور یورپ کو پھر سے وفود بھیجے جانے لگے۔ اسی زمانے میں جمال الدین افغانی کی شخصیت نمودار ہوئی اور اس کی تعلیمات کا اثر یہ ہوا کہ ۱۸۸۲ میں عرابی پاشا کی تحریک اٹھی اور "مصر، مصریوں کے لیے" کا نعرہ بلند ہوا۔ عرابی پاشا کی مسلح تحریک خدیو توفیق خود تو نہ روک سکا، لیکن انگریزوں کی مدد لے کر اس نے اس تحریک کو دبا دیا۔ رفتہ رفتہ ۱۹۱۹ میں

انگریزوں کے فوجی تسلط کے خلاف آزادی کی جنگ ایک دفعہ پھر بھڑک اٹھی اور اس کی آواز اتنی بلند ہوئی کہ پورے عالم میں سنی گئی۔ اس جدوجہد کے نتیجے میں مصر نے ۱۹۲۳ میں ایسا دستور حاصل کر لیا جس میں اس کے حق خود ارادی کا کافی حصہ اسے مل گیا۔ آزادی کی یہ کشمکش جاری رہی اور ۱۹۳۶ میں ایک معاہدے کے تحت مصر کو مزید آزادی اور اختیار حاصل ہوا۔ اور جب ۱۹۴۵ میں دوسری عالمی جنگ ختم ہوئی تو مصر نے اس معاہدے میں تبدیلی کا مطالبہ کر دیا۔ دوسری جنگ عظیم کے خاتمے پر حالات میں ایک بڑی تبدیلی یہ ہوئی کہ برطانوی حکومت نے فلسطین میں اسرائیلی مملکت قائم کر دی۔ اس سے عربوں کی قومی تحریک کو بہت بڑا دھچکا لگا اور عرب اقوام اس نئی مملکت کے خلاف اٹھ کھڑی ہوئیں لیکن ۱۹۴۸_۱۹۴۹ میں ان کو اس نوزائیدہ مملکت کے خلاف ناکامی ہوئی اور مصر کے شاہ فاروق کو اس ناکامی کا ذمہ دار ٹھہرایا گیا۔ ملک میں شاہی خاندان اپنی بدعنوانیوں اور شاہ خرچیوں کی وجہ سے بہت غیر ہردلعزیز ہو گیا اور آخر ۲۲ جولائی ۱۹۵۲ کو شاہ فاروق کو معزول کر کے مصر میں جمہوریہ کے قیام کا اعلان کر دیا گیا۔

شام اور لبنان پر فرانس کا مستقل قبضہ پہلی جنگ عظیم کے بعد ہوا۔ اس زمانے میں یہودیوں اور عیسائیوں نے اپنے مدرسے الگ قائم کیے، تعلیم روز بروز پھیلنے لگی، مزید برآں ایک بڑی تعداد طلبہ کی فرانس، انگلستان اور روس کا قصد کرنے لگی۔ اس تعلیمی جدوجہد کا ثمرہ یہ ملا کہ ملک میں تعلیم یافتہ نوجوانوں کی ایک بڑی تعداد پیدا ہو گئی۔ اس تعلیمی جدوجہد کے سلسلے میں فرانسیسی اور امریکی مشنریوں کے ادارے خاص طور پر قابل ذکر ہیں اور ملک کی تعلیمی وادبی ترقی بڑی حد تک انہی کی مرہون منت ہے۔ ۱۸۲۰ میں بیروت میں ایک امریکی کالج کھولا گیا، جس نے آگے چل کر باقاعدہ ایک یونیورسٹی (الجامعۃ الامریکیۃ) کی صورت اختیار کر لی۔ تعلیم یافتہ نوجوانوں نے عربی ادبیات کی طرف توجہ دی۔ قدیم معیاری ذخیرے کو کھنگالا گیا۔ کلاسیکی شاعری کو پھر سے رواج دیا گیا۔ ابن رشد، ابن سینا اور ابن خلدون کی کتابیں پڑھی جانے لگیں۔ اس طرح لبنان اور شام میں ایک نئے عربی ادب کے لیے زمین تیار ہو گئی۔ لبنان کے عیسائی اس عربی تجدید میں پیش پیش تھے۔ ان کے یازجی اور بستانی خاندانوں نے اس فن میں بڑی خدمات انجام دیں۔

بطرس بستانی نے ۱۸۶۰ میں عربی کا پہلا ہفتہ وار اخبار جاری کیا۔ ۱۸۷۵ میں عربی دائرۃ المعارف (انسائیکلو پیڈیا) کا کام شروع کیا جو اس کی بے وقت وفات کے باعث ادھورا رہ گیا۔ اس کام میں سلیم بستانی، نجیب بستانی اور سلیمان بستانی بھی اس کے ساتھ شریک تھے۔ بطرس بستانی نے علاوہ ازیں عربی زبان کی پہلی جدید ڈکشنری "محیط المحیط" کے نام سے شائع کی۔ سلیمان بستانی نے ہومر کی ایلیڈ (Eliad) کا عربی نظم میں کامیاب ترجمہ کیا جو "الیاذہ ھومیروس" کے نام سے مشہور ہے۔ سلیمان بستانی کا لکھا



ہوا الیاذہ کا مقدمہ عربی زبان میں ابن خلدون کے مقدمے کے بعد دوسرا مقدمہ شمار کیا جاتا ہے۔

یازجی خاندان میں ناصیف یازجی، ابراہیم یازجی اور وردہ بنت ناصیف یازجی انیسویں صدی کے ممتاز ادیبوں میں شمار کیے جاتے ہیں۔ ناصیف یازجی کو عربی زبان وادب سے عشق تھا۔ اس کا بیٹا ابراہیم یازجی اپنے دور میں لغت کا امام تھا۔ اس نے بازاری اور اخباری زبان پر سخت تنقید کی اور لوگوں کو صحیح زبان لکھنے پر آمادہ کرنے کے لیے اپنے لغوی تنقیدی مضامین کا مجموعہ "لغۃ الجرائد" شائع کیا۔

ان کے علاوہ دوسرے مسیحی علماء اور ادباء کی خدمات عربی زبان وادب کے لیے اتنی اہم اور وقیع ہیں کہ آج تک ان کا جواب پیدا نہیں کیا جا سکا۔ ان میں ایک الأب لویس شیخو (م ۱۹۲۷) تھا جس نے عربی رسالہ "مشرق" جاری کیا اور پچیس سال تک اس کی ادارت سنبھالی۔ اس کی اہم تصنیف "مجانی الادب فی حدائق العرب" ہے جو عربی زبان کے سارے قدیم ادب کا ایک عمدہ انتخاب ہے جس میں عرب شعراء اور ادباء کا ضروری تعارف بھی کرایا جاتا ہے۔ اس کے علاوہ اس کی تصانیف میں "علم الادب" اور "شعراء النصرانیہ" شامل ہیں۔ اسی کا معاصر ایک دوسرا فاضل الأب معلوف الیسوعی (م ۱۹۳۶) تھا جس نے تیس برس تک عربی جریدہ "البشیر" نکالا اور اس کے ساتھ اس کی سب سے اہم اور عظیم الشان تصنیف "المنجد فی اللغۃ" ہے جس کا لغت پر مشتمل حصہ (قسم اللغۃ) ۱۹۰۸ میں شائع ہوا اور قسم الاعلام (مشاہیر کے سوانحی تعارف) کا دوسرا حصہ ۱۹۵۶ میں ایک اور فاضل الأب فردینان توتل الیسوعی نے شائع کیا۔ ان دونوں حصوں پر مشتمل الیسوعی اصحاب کی یہ لغات "المنجد" جامع اور مستند ہونے کے ساتھ ساتھ آج پورے عرب میں سب سے زیادہ استعمال کی جانے والی لغات ہے۔ عربی کالجوں اور یونیورسٹیوں کی تعلیم میں اس کے بغیر چارہ نہیں۔ دو حصوں پر مشتمل اس نئی "المنجد" کی مانگ کا یہ عالم ہے کہ آج سے تیس سال پہلے ۱۹۷۳ میں اس کا اکیسواں ایڈیشن شائع ہوا تھا۔

## عربوں کی بیداری کے وسائل

جیسا کہ اوپر ذکر ہوا، فرانسیسی تسلط اور اس کے نتیجے میں پروان چڑھنے والے محمد علی کے جذبۂ آزادی کا اثر یہ ہوا تھا کہ مصر اور لبنان کے آفاق پر مغرب کی جانب سے آنے والی علم کی روشنی پھیل گئی۔ چنانچہ ان دونوں ملکوں نے اس روشنی میں ترقی کرنی شروع کی۔ اس روشنی کے پیچھے وہ وسائل تھے جن کو محمد علی اور اس کے وارثوں نے فوج کو ترقی دینے، حکومت کا کاروبار منظم کرنے اور عوام کی تربیت کرنے کے لیے براہ راست یا بالواسطہ طور پر استعمال کیا۔ ان وسائل میں سے اہم یہ تھے:



Scanned with CamScanner

### ۱۔ مدارس

محمد علی نے ابتدا میں فوجی تعلیم، ڈاکٹری اور جسمانی کھیلوں کیلیے مختلف سطحوں پر مدارس قائم کیے۔ اس کے بعد ان مدارس میں اضافہ ہوتا گیا اور طبیہ کالج، مدرسۂ آلسنہ (Languages) اور مدرسۂ دارالعلوم قائم ہوئے۔ جب السنہ کے مدرسے سے مترجم پیدا ہونے لگے تو رفاعہ بے طہطاوی کی زیر نگرانی باقاعدہ ترجمے کا شعبہ قائم کیا گیا، جس نے جدید علوم میں مختلف مغربی کتابوں کا عربی میں ترجمہ کیا۔ پھر دارالعلوم کی بنا ڈالی گئی اور اس میں عربی زبان کے علوم میں خصوصی تعلیم دی جانے لگی۔ اس ادارے کے اساتذہ اکثر جامع ازہر کے لائق شیوخ ہوتے تھے اور کوئی شک نہیں کہ عربی زبان و ادب کی ترقی میں اس دارالعلوم نے بڑی خدمات انجام دیں اور آگے جا کر ۱۹۴۶ء میں یہ کلیۃ الآداب (Arts College) کے ساتھ ضم کر دیا گیا۔

### ۲۔ مغرب کو وفود کی ترسیل اور مغربی زبانوں کی تعلیم

پہلے محمد علی پاشا اور اس کے بعد اسماعیل پاشا نے مغربی ممالک کو اعلیٰ تعلیم کے لیے وفود بھیجنے کی جو پالیسی اختیار کی وہ عربوں کی بیداری اور ذہنی ترقی کے لیے بہت کارگر ثابت ہوئی۔ یہ وفد جو بارہ سال کی مدت کے لیے بھیجے جاتے تھے جب تعلیم حاصل کر کے وطن واپس آتے تھے تو اپنی نئی سوچ اور زندگی کے بارے میں ترقی پسندانہ نقطۂ نظر کی وجہ سے مقامی فضا کو متاثر کرتے تھے اور جدید علوم کی تعلیم میں اچھے معاون ثابت ہوتے تھے۔ اسی طرح مغربی زبانوں فرانسیسی اور انگریزی کی تعلیم جب مصر و شام میں حکومت اور انجمنوں کے مدارس، نیز مسیحی راہبوں اور مبلغوں کی درسگاہوں میں لازمی قرار دی گئی تو اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ مغرب کے علوم و افکار سے ان کے سوچنے اور اظہار خیال کے طریقوں سے عرب لوگوں کو آگاہی ہوئی اور ان کے سامنے مطالعہ و مشاہدہ کے آفاق کھل گئے، ان کی سوچ اور فکر میں تبدیلی آئی۔ جس کا اثر یہ ہوا کہ انہوں نے نثر میں بھی اور شاعری میں بھی نئے نئے اسالیب اختیار کیے اور پھر یورپی زبانوں سے ترجمہ کی بدولت عربی زبان کی ثروت میں اضافہ ہوا اور اس میں کئی طرح کے علوم و فنون کا ذخیرہ منتقل ہو گیا۔

### ۳۔ جامع ازہر

ازہر جس کا شمار دنیا کی قدیم ترین یونیورسٹیوں میں ہوتا ہے، اسے جوہر صقلی نے قاہرہ کی بنیاد رکھنے



کے فوراً بعد ہی ۹۶۹ میں قائم کیا۔ اس مدرسے کا مقصد شعائر دینی کی تعلیم دینا تھا۔ اس کے لیے اطراف عالم سے فقہ اور علوم کے ماہرین بلا کر یہاں لائے گئے۔ اس میں پہلے شیعی فقہ اور علوم کی تعلیم دی جاتی تھی اور لغت و نحو کے مسائل پر لیکچر دیے جاتے تھے۔ پھر جب فاطمیوں کی حکومت ختم ہوئی اور ۱۱۷۱ء میں مصر پر صلاح الدین ایوبی کا غلبہ ہوا تو وہ چونکہ اہل سنت میں سے تھا اس نے یہاں شیعی فقہ کی جگہ شافعی فقہ کو رواج دیا اور اس کے ساتھ امام ابو حنیفہ کی فقہ بھی پڑھائی جانے لگی، اس لیے کہ بغداد میں خلفاء اسی مذہب کے پیرو تھے۔ لیکن پھر صلاح الدین نے ازہر میں چاروں فقہی مذاہب کی تعلیم کی اجازت دے دی۔ اس کے بعد ممالیک کے عہد میں بھی جامع ازہر اپنی اسی راہ پر چلتی رہی اور عربی لغت اور اسلامی علوم کو جہاں تک ہو سکا زمانے کی دستبرد سے محفوظ رکھا۔ پھر جب مصر پر فرانسیسی غلبے کے بعد محمد علی کے زمانے میں ترقی کی لہر چلی اور مغرب کی علمی ترقی سے استفادے کی کوششیں ہونے لگیں تو جامع ازہر میں اس کے قدیم طریقۂ تعلیم کے باوجود بہت سے فارغ التحصیل نوجوان مغرب کی طرف بھیجے جانے والے وفود میں شامل کیے گئے۔ تاکہ وہ وہاں جا کر اپنی قدیم دینی تعلیم کے ساتھ مغرب کی نئی تعلیم اور نئے طریقوں سے آگاہی حاصل کریں۔ ثقافتوں کے اس تبادلے کا نتیجہ یہ ہوا کہ ۱۸۸۷ء میں حکومت نے جامع ازہر کی اصلاح کا فیصلہ کیا اور باوجود کچھ مشکلات اور رکاوٹوں کے اس میں کچھ نئے علوم داخل کیے گئے۔ پھر شیخ محمد عبدہ نے ازہر کی اصلاح کا بیڑا اٹھایا اور روایت پرست طبقے کی مخالفتوں اور مزاحمتوں کے علی الرغم اسے ترقی دے کر نئے راستے پر ڈالا۔ اس ترقی اور اصلاح کے بعد ازہر نے عربی زبان و ادب اور دوسرے اسلامی علوم کی ترقی اور نشوونما میں بہت اہم کردار ادا کیا ہے۔ بیسویں صدی کے نصف اول میں عرب دنیا میں جتنے بھی بڑے ادیب اور عالم اور مصنف منظر عام پر آئے ان کی اکثریت مصر کی اسی جامع ازہر سے پڑھ کر نکلی تھی۔

### ۴۔ جامعۂ مصریہ (Egyptian University)

انیسویں صدی کے اواخر میں انگریزوں کی خاص تعلیمی پالیسی کے ردعمل میں کچھ آزادی پسند لوگوں نے ۱۹۰۶ء میں جمع ہو کر ایک ایسی قومی یونیورسٹی قائم کرنے کا فیصلہ کیا جو ملک کی تعلیمی ضروریات کو پورا کر سکے۔ اس کے لیے انہوں نے اہل خیر سے مالی امداد کی درخواست کی اور یہ امداد حاصل ہونے پر ۱۹۰۸ء میں قومی یونیورسٹی قائم کر دی گئی۔ اس کی خاطر یورپ سے اہل علم کا ایک گروہ منگوایا گیا اور مصر کے ممتاز اور منتخب ادباء اور دانشوروں کو جمع کیا گیا، جنہوں نے یونیورسٹی کے طالب علموں کو آداب و فنون اور فلسفے پر لیکچر دینے کا سلسلہ شروع کیا۔ یورپ سے جو علماء آئے ان میں دو نامور مستشرق جویدی اور ملینو بھی شامل تھے۔ انہوں نے عربی ادب اور اس کی تاریخ کے مطالعے کے لیے ایک نیا واضح طریقہ طلبہ اور

اساتذہ کے سامنے رکھا۔ ١٩٢٥ میں اس جامعہ کو مصر کی وزارت تعلیم نے اپنے انتظام میں لے لیا اور اس یونیورسٹی میں لاء کالج، میڈیکل کالج، انجینئر نگ کالج، زراعتی کالج اور کامرس کالج کے ساتھ ساتھ فارمیسی اور دندان سازی کے شعبوں کا بھی اضافہ کیا گیا۔ پھر اس کا نام بدل کر جامعۂ فوادِ اول رکھ دیا گیا۔ جب تعلیم کی ضرورت اور بڑھی اور طلبہ کی تعداد زیادہ ہونے لگی تو اسکندریہ میں جامعۂ فاروق کے نام سے اسی طرح کی ایک اور یونیورسٹی قائم کر دی گئی اور اس میں کوئی شک نہیں کہ ان دو یونیورسٹیوں اور ان کے ساتھ جامع ازہر نے علم و ادب کو ترقی دینے اور عربی ثقافت کی روشنی پھیلانے میں، نیز ماضی کو حال کے اور مشرق کو مغرب کے قریب لانے میں بہت ہی قابلِ قدر کام کیا۔

## ۵۔ چھاپے خانے

عربی ممالک میں چھاپے خانے جب بھی قائم ہوئے ان میں طباعت حروف سے (یعنی ٹائپ کے طریقے پر) ہی ہونے لگی۔ عربی زبان کا پہلا چھاپہ خانہ احمد فارس الشدیاق کا "مطبعۃ الجوائب" آستانہ (ترکی) میں قائم ہوا۔ عرب ممالک میں سب سے پہلے لبنان کے مسیحی راہبوں نے سترہویں صدی کے اوائل میں ایک چھاپہ خانہ نصب کیا۔ پھر ١٨٤٨ میں انہی لوگوں نے ایک بڑے چھاپے خانے "المطبعۃ الکاثولیکیۃ" (کیتھولک پریس) کی بنیاد رکھی۔ اس چھاپے خانے نے قدیم عربی مخطوطات اور ان کے علاوہ ہر طرح کی علمی اور ادبی کتابیں چھاپنے کا جو کام ماضی میں انجام دیا اور اب تک دے رہا ہے۔ وہ عظیم الشان ہے۔ مصر میں پہلا چھاپہ خانہ ١٧٩٨ میں نپولین کے ساتھ آیا، جس کا ایک خاص مقصد تھا اور وہ نپولین کے ساتھ ہی واپس چلا گیا۔ اس کی جگہ محمد علی پاشا نے ١٨٢١ میں ایک چھاپہ خانہ بولاق پریس کے نام سے قائم کیا جو اب تک چل رہا ہے۔ لیکن اب اس میں صرف نصاب کی کتابیں اور حکومت کی منشورات اور احکام اور قانونی کتابیں شائع ہوتی ہیں۔ اس اثنا میں مصر میں بہت سے جدید طرز کے چھاپے خانے قائم ہو گئے جنہوں نے علوم وفنون اور ادب وشعر کی اشاعت میں بہت نمایاں اور قابلِ تحسین کام کیا ہے۔

## ۶۔ صحافت

عرب ملکوں کی بیداری اور ان کی علمی وفکری پیش رفت میں عربی اخبارات اور رسالوں نے بڑھ چڑھ کر حصہ لیا اور معاشرے پر اپنے اثرات کی وجہ سے وہ آج بھی بہت اہم ہیں۔ مصر کے روزنامے "الاھرام" اور "المقطم" نے صحافت کا ایک اعلیٰ معیار پیش کیا اور ادب وشعر کی دنیا میں "الرسالہ" اور "الثقافہ" جیسے ہفتہ وار رسالوں نے نئے لکھنے والوں کے لیے ایک میدان مہیا کر دیا۔ احمد حسن



الزیات کے "الرسالہ" کے صفحات پر کئی نو وارد لکھنے والے ایسے آئے جو ادیب بن کر نکلے۔ اسی طرح ماہانہ رسالوں "المقتطف" "الھلال" "الکاتب المصری" اور "الکتاب" نے مصر میں اور "الادیب" نے بیروت میں اپنے صفحات خالص علمی، ادبی اور ثقافتی مضامین اور نئی شاعری کے لیے وقف کیے اور عربی ادب اور شاعری کے عمدہ نمونے پیش کیے۔ دمشق کی علمی اکیڈمی "المجمع العلمی" نے بھی اپنا ایک ماہوار رسالہ جاری کیا، جس کی خصوصیت یہ رہی کہ اس میں عربی کے چوٹی کے ادبا، علماء اور محققین کے مفصل مقالات شائع ہوتے تھے۔ چنانچہ اس رسالے نے عربی علوم وآداب کی جو خدمت پچھلی نصف صدی سے بھی زیادہ عرصے میں انجام دی ہے وہ بے پناہ ہے۔ اس نے اپنے صفحات میں علم وتحقیق کا ایسا قیمتی ذخیرہ مہیا کیا ہے جو مغرب میں مستشرقین کے کسی بڑے سے بڑے علمی رسالے کے سامنے فخر کے ساتھ رکھا جا سکتا ہے۔

## ۷۔ ادبی اکیڈمیاں (Literary Academies)

دمشق کی "المجمع العلمی" (علمی اکیڈمی) جس کا اوپر ذکر ہوا ١٩١٩ میں قائم کی گئی۔ اس کا مقصد عربی علوم وآداب میں زندگی کی روح پھونکنا اور علمی موضوعات میں بحث وتحقیق کے طریقوں کا نمونہ پیش کرنا تھا۔ اس اکیڈمی نے جدید اصطلاحوں کے عربی ترجموں کا کام بھی اپنے ذمے لیا، نیز دفتری زبان کی اصلاح کے لیے بھی کام کیا۔ اسی طرح کی ایک اکیڈمی "مجمع فواد الملکی للغۃ العربیۃ" (عربی زبان کے لیے شاہ فواد کی اکیڈمی) مصر میں بھی قائم ہوئی۔ اس کے مقاصد میں عربی زبان کی سلامتی کے لیے اور اس کی ترقی کی خاطر مناسب اصلاحات کرنا، نئے حالات کو سامنے رکھ کر ایک بڑی لغت تیار کرنا، مصر میں متفرق مقامی عربی لہجوں کو منظم کرنا اور ہر وہ قدم اٹھانا رہا جو عربی زبان کی ترقی اور تجدید کے لیے ضروری ہو۔

☆.....☆.....☆

اوپر کے یہ تمام وسائل شرق اوسط کے ممالک خصوصاً مصر و لبنان میں علمی بیداری اور ثقافتی نشوونما کے لیے بہت مفید اور کارگر ثابت ہوئے۔ خصوصیت کے ساتھ ان ملکوں سے یورپ کو تعلیم کے لیے جو وفود بار بار بھیجے جاتے رہے ان کی وجہ سے ان عرب ملکوں میں قدیم روایات کی تاریکیاں چھٹنے لگیں اور جدید علوم وفنون کی روشنیاں ہر طرف پھیلنے لگیں۔ ان ممالک میں چونکہ انگریزوں اور فرانسیسیوں کا غلبہ زیادہ لمبے عرصے تک نہ رہا تھا اس لیے یہاں انگریزی یا فرانسیسی زبان ذریعۂ تعلیم کے طور پر رائج نہ ہو

سکی اور ذریعہ تعلیم یہاں شروع سے آخر تک عربی ہی رہا۔ اس سے عربی زبان کو یہ فائدہ ہوا کہ اس نے ہر طرح کے علوم وفنون کو اپنے دامن میں سمیٹا اور سائنسی ترقی اور اس سے پیدا ہونے والی نئی اصطلاحات اور لفظیات سے بھی کامیابی کے ساتھ عہدہ برآ ہوئی۔ اور سب سے بڑھ کر یہ کہ یہ نہ صرف قومی زبان بن کے رہی بلکہ اس نے سرکاری زبان کی حیثیت بھی حاصل کی جو آج تک اسے حاصل ہے۔ اس کے مقابلے میں برصغیر ہندوستان میں یہ ہوا کہ یہاں انگریزوں کا تسلط پورے نوے سال تک قائم رہا۔ انہوں نے یہاں انگریزی کو نہ صرف تعلیم کی پہلی زبان کے طور پر رائج کیا بلکہ اسے سرکاری زبان کا درجہ بھی دیے رکھا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ یہاں لوگ انگریزی زبان تو سیکھ گئے اور اس کے لٹریچر اور اس کے علوم وفنون سے بھی آگاہی حاصل کر لی لیکن یہاں کی مقامی زبانیں (اردو اور ہندی) پس منظر میں چلی گئیں۔ اگر ہم پاکستان کی بات کریں تو اردو کو یہاں وہ اہمیت حاصل نہ ہو سکی جو شرق اوسط میں عربی زبان کو حاصل رہی اور اسے سرکاری زبان کا درجہ تو آج نصف صدی سے زیادہ عرصہ گزرنے پر بھی حاصل نہیں ہو سکا۔ اسباب چاہے کچھ بھی ہوں' اس میں کوئی شک نہیں کہ عربی زبان میں تصنیف وتالیف کی جو وسعت اور ہمہ گیری ہے اور اس کی طباعت اور پیکنگ کا جو معیار ہے اس میں اردو زبان یقیناً اس کا مقابلہ نہیں کر سکتی۔

عرب دنیا میں جدید دور کی شروعات اور عربوں کی بیداری اور ترقی کے عوامل کے بارے میں جتنا کچھ کہنا ضروری تھا وہ کہا جا چکا۔ اب وقت آ گیا ہے کہ قارئین کو عربی کے موجودہ دور کے ان اہل قلم اور ادباء اور شعراء کا مناسب تعارف کرایا جائے جن کی نثری اور شعری تخلیقات کی وجہ سے ہی ادب وفن کی دنیا میں رونق اور گہما گہمی رہی ہے اور جنہوں نے ان میدانوں میں ایسے کارنامے انجام دیے ہیں جو ادب کی تاریخ کا حصہ بن گئے ہیں۔ اس تعارف میں پہلے اہل قلم اور ادباء کا مختصراً ذکر کیا جائے گا اور اس کے بعد شعراء کا۔ پچھلی ایک ڈیڑھ صدی کے ادب کا چونکہ بہت تھوڑا حصہ اس برصغیر میں پہنچا ہے اس لیے صرف انہی رجال اور ان کے کاموں کا ذکر کیا جائے گا جو ہمارے ہاں کسی حد تک معروف ہیں اور ان میں سے بعض کی کتابیں یہاں دستیاب چلی آئی ہیں۔ اس موجودہ دور کے آخر میں زمانہ قریب کا وہ جدید دور آتا ہے جو دوسری عالمی جنگ کے خاتمے کے بعد شروع ہوتا ہے اور اب تک چلا جاتا ہے۔ اس نئے دور میں عربی ادب نے ارتقا کی بہت سی اہم منزلیں طے کی ہیں۔ اس میں عربی ادب افسانے اور ناول کے اس فن سے آشنا ہوا ہے جو پچھلی کئی صدیوں سے مغرب میں رائج ہے۔ اس میں عربی شاعری نے روایتی اور پابند نظم کو چھوڑ کر آزاد نظم کو پوری طرح اپنا لیا ہے اور اس میں وہ علامت نگاری سے بھی کام لینے لگی ہے۔ اس کے ساتھ اس نے ڈرامے اور تھیٹر کے فن میں بھی خاصی پیش رفت کی ہے۔ عربی زبان



میں تخلیق کی جانے والی فکشن (ناول اور افسانہ) اس لحاظ سے خوش قسمت ہے کہ یورپی زبانوں میں ترجموں کی بدولت وہ مغرب میں خاصے پیمانے پر متعارف ہو چکی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ مصر کے معاصر ناول نگار نجیب محفوظ کو اس کے کام کی اہمیت اور اعلیٰ معیار کے پیش نظر نوبل انعام دیا گیا جو مغرب میں ایک بڑا ادبی اعزاز سمجھا جاتا ہے۔---- چنانچہ اس باب کے آخری حصے میں عربی ادب کے اس نئے اور ترقی پسند دور کی کچھ نمایاں خصوصیات پر بات کی جائے گی اور کچھ نئے ادباء اور شعراء کا تعارف کرایا جائے گا۔

## اہل قلم اور ادباء

### جمال الدین افغانی (م ۱۸۹۷)

ان کا نام برصغیر کے لوگوں کے لیے اجنبی نہیں ہے اس لیے کہ یہ دو مرتبہ ہندوستان آئے تھے۔ جب وہ دوسری دفعہ آئے تو انگریزی حکومت نے انہیں یہاں زیادہ عرصہ نہ رہنے دیا۔ یہاں کے لوگ انہیں عربی اہل قلم اور خطیب کی حیثیت سے کم اور امت اسلام کے ایک رہنما اور مصلح کی حیثیت سے زیادہ جانتے ہیں' جن کا مطمح نظر مسلم ملکوں کی مغربی استعمار سے آزادی اور اس کے ساتھ پورے عالم اسلام کا اتحاد (Pan Islamism) تھا' جس کے لیے وہ ملکوں ملکوں پھرے اور حکومتوں کی مخالفتوں کی وجہ سے کہیں ٹک کر نہ بیٹھ سکے۔

جمال الدین افغانستان میں کابل کے نواح اسعد آباد میں پیدا ہوئے۔ انہوں نے کابل میں مختلف علوم وفنون میں تعلیم پائی۔ اس کے بعد وہ اپنے خاندان کے ساتھ پہلے ایران گئے اور یہاں چار سال رہ کر مزید تعلیم حاصل کی۔ پھر وہ ہندوستان کی طرف نکل گئے اور یہاں ایک برس سے کچھ زیادہ قیام کیا اور بعض جدید علوم سے روشناس ہوئے۔ پھر وہ حج کے لیے مکہ معظمہ چلے گئے۔ اس کے بعد ان کے سفروں کا ایک طویل سلسلہ ہے۔ وہ ایک ملک میں جاتے ہیں اور کچھ ہی عرصے میں وہاں سے نکال دیے جاتے ہیں اور دوسرے ملک کا رخ کرتے ہیں۔ ۱۸۷۱ میں جب انہیں ترکی سے نکالا گیا تو وہ مصر آ گئے۔ یہاں انہوں نے اپنا ایک حلقہ قائم کر لیا جس میں علم کے متلاشیان آ کر توحید اور فلسفہ اور قومی امور جیسے موضوعات پر ان کے لیکچر سنتے تھے۔ افغانی کی گفتگو اور خطابت کا اثر ایسا تھا کہ جو بھی ان کے حلقے میں آتا وہ ان کی مقناطیسی شخصیت اور ان کے افکار کے سحر تلے آ جاتا اور امت مسلمہ کی اصلاح کا جذبہ اس

کے دل میں موجزن ہو جاتا۔ مصر میں عرابی پاشا کی تحریک کی حمایت کرنے کے الزام میں افغانی کو آٹھ سال بعد مصر سے بھی نکال دیا گیا۔ وہ ہندوستان آ گئے اور یہیں انہوں نے اپنے ایک پمفلٹ "رد دہریین" میں سرسید احمد خاں پر کچھ الزام عائد کیے۔ ان کے گرد چونکہ لوگ جمع ہونے لگے تھے اس لیے انگریزی حکومت نے ان سے خطرہ محسوس کرتے ہوئے انہیں چلے جانے کا حکم دیا۔ ہندوستان سے نکل کر وہ پہلے لندن گئے اور پھر پیرس آ گئے۔ یہاں ان کے ساتھ شیخ محمد عبدہ بھی آ ملے۔ پیرس میں ان لوگوں نے اپنا انقلابی اور پرجوش رسالہ "العروۃ الوثقی" نکالا' جس میں انگریزوں کی مخالفت میں مضامین لکھے جاتے تھے اور پان اسلامزم کی تحریک کی حمایت کی جاتی تھی۔

جمال الدین افغانی کئی دوسرے ملکوں میں پھرنے کے بعد بالآخر استنبول واپس آ گئے اور یہیں ٹھوڑی کے سرطان کی وجہ سے ان کی موت واقع ہو گئی۔

جمال الدین عرب نہیں تھے اور عربی زبان و ادب میں بھی انہوں نے کوئی خصوصی تعلیم حاصل نہیں کی تھی۔ اس لیے جو زبان وہ لکھتے تھے اس میں فصاحت کا کوئی اونچا معیار نہیں پایا جاتا تھا اور بعض دفعہ الفاظ و محاورات کے استعمال میں ان سے مسامحت بھی ہو جاتی تھی' لیکن عربی میں جو تقریریں وہ کرتے تھے یا جو لیکچر وہ دیتے تھے وہ ایسے دلآویز عربی لہجے میں ہوتے تھے کہ سیدھا دل میں اتر جاتے اور سننے والوں کو مسخر کر لیتے تھے۔ انہوں نے خود تو ادب تخلیق نہ کیا' لیکن اپنی شخصیت اور اپنی تلقین و تبلیغ سے انہوں نے کچھ ایسے لوگوں کو متاثر کیا جو آگے چل کر بڑے ادیب اور قومی رہنما بن کر ابھرے۔ اس لحاظ سے وہ ایک ادیب تو نہ تھے البتہ ادیب گر تھے۔ ادب میں ان کا ایک انقلابی نظریہ یہ تھا کہ عربی تحریر میں بجائے لفظ و محاورے کی تزئین و آرائش کے مطالب و مضامین کی سادگی اور وضاحت پر زور دینا چاہیے تا کہ جو بات بھی کہی جائے وہ سننے والوں کی سمجھ میں آئے اور ان پر اثر کرے۔ جمال الدین افغانی کی تصنیف صرف ایک رسالہ ہے "ابطال مذهب الدهريين و بيان مفاسدهم" یہ رسالہ انہوں نے فارسی میں لکھا تھا اور عربی میں اس کا ترجمہ شیخ محمد عبدہ نے کیا۔

## شیخ محمد عبدہ (م ۱۹۰۵)

مصر کے مشہور مفکر' مصلح' عالم اور عربی زبان کے بڑے ادیب اور انشا پرداز' بلکہ جدید ادبی بیداری



کے بانیوں میں سے ایک' جن کے افکار و نظریات نے پورے دنیائے اسلام کو متاثر کیا۔

ابتدا میں وہ تعلیم کے لیے طنطا کی مسجد میں بھیجے گئے' لیکن یہاں کی تعلیم سے وہ مطمئن نہ ہوئے اور قاہرہ کی جامع ازہر میں جا کر تعلیم پانے لگے۔ یہاں کے نصاب تعلیم میں زندگی کی روح مفقود تھی اور پڑھانے والے شیوخ قدیم متون کی شرحوں اور حاشیوں پر اکتفا کرتے تھے۔ محمد عبدہ کو علمی اور فکری غذا جمال الدین افغانی کے فیضِ صحبت سے ملی۔ انہوں نے ازہر سے سندِ عالمیت حاصل کر کے اس میں پڑھانا شروع کر دیا۔ وہ ازہر میں منطق' فلسفہ اور توحید جیسے علوم کی تعلیم دیتے تھے۔ بعد ازاں وہ مصر کے دارالعلوم میں تاریخ کے استاد مقرر ہوئے تو انہوں نے مقدمہ ابن خلدون پر کئی مفید لیکچر دیئے اور طلبہ کو قوموں کے عروج و زوال کے فلسفے سے آشنا کیا۔ اس کے بعد وہ حکومت کے سرکاری اخبار "الوقائع المصرية" کے مدیر بنے اور اس میں ادبی' اجتماعی اور اصلاحی مقالات شائع کرتے رہے۔ عرابی پاشا کی شورش میں ان پر اس کی حمایت کا الزام لگا اور وہ ملک بدر کر دیئے گئے۔ مصر سے نکل کر وہ بیروت آئے۔ اسی زمانے میں انہیں جمال الدین افغانی کا دعوت نامہ ملا اور وہ پیرس جا کر ان سے ملے اور ایک شعلہ نوا رسالہ "العروة الوثقى" نکالنا شروع کیا جس کا مقصد صحیح دینی عقائد کی اشاعت کے علاوہ تمام مسلم ممالک میں اتحاد و اتفاق پیدا کرنا تھا۔ العروۃ الوثقیٰ کے صرف اٹھارہ شمارے نکلے تھے کہ انگریزوں نے اس کا داخلہ مصر اور ہندوستان میں بند کرا دیا۔ نتیجتاً رسالہ بند کرنا پڑا۔ محمد عبدہ ایک دفعہ پھر بیروت چلے آئے اور یہاں کے زمانۂ قیام میں انہوں نے حضرت علیؓ کی "نہج البلاغہ" اور "مقامات ہمدانی" کی شرح لکھی۔ تقریباً ساڑھے تین سال کی جلاوطنی کے بعد وہ مصر میں واپس آئے اور انہیں ابتدائی دیوانی عدالتوں کا قاضی مقرر کیا گیا۔

شیخ محمد عبدہ کی زندگی کا بڑا مقصد ازہر کی اصلاح اور ترقی تھا۔ انہوں نے خدیو مصر کی تائید و حمایت سے اس کی اصلاح کا بیڑا اٹھایا اور اس میں علاوہ دوسری بہت سی اصلاحات کے اس کے نصاب میں حساب' الجبرا' تاریخ اسلام اور سائنسی مضامین شامل کیے۔ عربی ادب کی تعلیم کے لیے مبرد کی "الکامل" اور "دیوان الحماسة" جیسی معیاری کتابیں مقرر کی گئیں۔ اس کے کچھ عرصہ بعد خدیو مصر نے شیخ محمد عبدہ کو مصر کا مفتی اعظم مقرر کر دیا۔ مصر کے علاوہ ساری دنیائے اسلام سے ان کے پاس استفتاء آتے تھے اور وہ ان کا جواب دیتے تھے۔ ان میں تین فتوے بہت مشہور ہوئے' جن میں سے ایک میں انہوں نے فتویٰ دیا کہ ڈاک خانوں کے سیونگ بنکوں کی امانتوں پر منافع وصول کرنا جائز ہے۔

یورپ کے فضلاء اور مصر کے عیسائی اہل قلم جب اسلام پر بیجا حملے کرتے تو محمد عبدہ دین کی حمایت میں سینہ سپر ہو جاتے۔ فرانس کے وزیر خارجہ ہانوتو اور عیسائی رسالے "الجامعة" کے مدیر فرح انطون کے

جواب میں انہوں نے مدلل مضامین لکھے جو بعد میں "الاسلام والنصرانیة مع العلم والمدنیة" کے نام سے کتابی صورت میں شائع ہوئے۔ شیخ محمد عبدہ کی مقبولیت اور شہرت نے ان کے بہت سے حاسد پیدا کر دیئے اور ان لوگوں نے جن میں علمائے ازہر پیش پیش تھے ان کے خلاف سازشیں شروع کر دیں۔ ان حالات سے تنگ آ کر انہوں نے ازہر کی انتظامی کمیٹی سے استعفیٰ دے دیا۔ اس پر پورے عالم اسلام میں احتجاج ہوا اور ہندوستان سے نواب محسن الملک نے رسالہ "المنار" میں خدیو مصر کے نام ایک مکتوب شائع کر کے مسلمانانِ ہند کے جذبات کی ترجمانی کی۔ شیخ محمد عبدہ یورپ جانے کے لیے اسکندریہ میں مقیم تھے کہ سرطان کے مرض میں مبتلا ہو کر راہیِ ملک عدم ہوئے۔

محمد عبدہ نے قرآن کی تفسیر کا ایک نیا طریقہ نکالا جس سے قرآن کی آیات کے مطالب کو عقل و فلسفے کے تقاضوں کے قریب لانے کی کوشش کی گئی۔ اس طرح کی کوشش ان سے پہلے ابن سینا اور ابن رشد نے بھی کی تھی۔

شیخ محمد عبدہ فصاحت و بلاغت اور ملکۂ انشا پردازی میں اپنے معاصرین پر فائق تھے۔ عربی فصاحت میں ان پر حضرت علیؓ کی "نہج البلاغہ" کا اثر تھا جس کی شرح انہوں نے لکھی تھی۔ وہ مصر کی جدید ادبی بیداری کے معماروں میں سے تھے۔ ان کے قلم نے عربی زبان کو ادبی' اخلاقی اور سیاسی مضامین کے بیان کی قوت بخشی۔ ان کا درس ادبی ہوتا تھا جس سے ذوقِ سلیم کی پرورش ہوتی اور اسلوب بیان میں سادگی' صفائی اور اثر انگیزی ہوتی تھی۔ ان کے درس سے ان کے شاگرد محمد رشید رضا' مشہور مقرر اور سیاسی رہنما سعد زاغلول' ادیب احمد تیمور' شاعر محمد حافظ ابراہیم' ادیب اور افسانہ نگار مصطفیٰ لطفی المنفلوطی اور عبدالرحمان البرقوقی نے پورا فائدہ اٹھایا اور آئندہ دنوں میں مصر کی ادبی' علمی اور سیاسی دنیا میں بڑا نام پیدا کیا۔

شیخ محمد عبدہ کے بعد ان کے شاگرد خاص محمد رشید رضا نے اپنے رسالہ "المنار" کے ذریعے ان کے دینی اور اصلاحی افکار کی روشنی ساری دنیائے اسلام میں پہنچائی۔ جامعۂ ازہر کی اصلاح کی تکمیل ان کے شاگرد شیخ مصطفیٰ المراغی کے ہاتھوں ہوئی' ان کے اصلاحی خیالات کی ترجمانی ان کے درسوں کے فیض یافتہ شامی لیڈر امیر شکیب ارسلان کرتے رہے اور سیاسی میدان سعد زاغلول نے سنبھالا اور بالآخر مصر کو آزادی سے ہمکنار کیا۔

محمد عبدہ کی تصنیفات میں "رسالة التوحید" مشہور ہے' جس کے کئی زبانوں میں ترجمے ہو چکے ہیں۔ نیز پارۂ عم کی تفسیر اور اس کے علاوہ "الاسلام والنصرانیة مع العلم والمدنیة" ان کی اہم کتابیں ہیں۔ پھر ان کی دو شرحیں ہیں: ایک نہج البلاغہ پر اور دوسری مقامات ہمدانی پر۔

شیخ محمد عبدہ چونکہ بڑے پایہ کے نثر نگار تھے' اس لیے ان کی نثر کا ایک نمونہ درج ذیل ہے۔ بعض



شامی علماء نے ان کو منصب افتاء پر فائز ہونے پر مبارکباد دی تو اس کے جواب میں محمد عبدہ لکھتے ہیں اور اس میں وہ ان مخالفتوں کا ذکر کرتے ہیں جو اصلاح کے راستے میں انہیں قدیم شیوخ کی طرف سے پیش آ رہی ہیں:

اما قومی فا بعد هم عنی اشدهم قرباً منی. وما ابعد الانصاف منهم و یظنون بی الظنون. بل یتربصون بی ریب المنون' تسرعاً منهم فی الاحکام و ذهاباً مع الاوهام و ولعاً بکثرة الکلام و تلذذاً بلوک الملام. اقول فلا یسمعون' و ادعو فلا یستجیبون و اعمل فلا یهتدون' و اریهم مصالحهم فلا یُبصرون —

(رہے میرے قبیلے کے لوگ تو وہ جتنا زیادہ میرے قریب ہیں اتنا مجھ سے دور ہیں۔ ان سے انصاف کی توقع ہی نہیں کی جا سکتی۔ وہ میرے بارے میں ہر طرح کے ظن و گمان سے کام لیتے ہیں' بلکہ میرے خلاف زمانے کے حوادث کا انتظار کرتے رہتے ہیں۔ اپنی آراء میں جلد بازی سے کام لیتے ہیں اور ہمیشہ وہم کے پیچھے جاتے ہیں۔ انہیں بہت بولنے کا شوق ہے اور ملامت کرنے میں وہ بڑی لذت محسوس کرتے ہیں۔ میں ان سے بات کرتا ہوں تو وہ سن کے نہیں دیتے۔ میں انہیں بلاتا ہوں تو وہ جواب نہیں دیتے۔ میں خود عمل کرتا ہوں تو وہ اس سے رہنمائی حاصل نہیں کرتے۔ میں انہیں ان کے فائدوں اور مصلحتوں سے آگاہ کرتا ہوں تو وہ بصیرت حاصل نہیں کرتے.....)

## محمد رشید رضا (م ۱۹۳۵)

بیسویں صدی کے مشہور مُصلح عالم' قرآن مجید کے مفسر' عربی زبان کے ممتاز انشا پرداز' خطیب اور اتحاد اسلامی کے داعی اور نقیب' طرابلس الشام کے ایک گاؤں میں پیدا ہوئے۔ طرابلس کے مدرسہ اسلامیہ سے عقلی اور ادبی علوم کے ساتھ ساتھ حدیث و فقہ کی تعلیم بھی حاصل کی۔ وہ فارغ اوقات میں بیروت کے اخبار کے لیے مضامین لکھا کرتے اور کبھی کبھی شعر بھی کہہ لیتے۔ اس اثنا میں انہیں سید جمال الدین افغانی اور شیخ محمد عبدہ کے "العروة الوثقی" کے بعض شمارے مل گئے۔ ان کے مطالعے سے انہیں فکر و نظر کے نئے راستے دکھائی دیئے اور انہیں جمال الدین سے ملاقات کا شوق پیدا ہوا۔ لیکن ان کے انتقال کی وجہ سے سید رشید رضا کی یہ آرزو پوری نہ ہو سکی۔ اس دوران میں مفتی محمد عبدہ ایک دفعہ طرابلس الشام گئے تو رشید رضا ان سے مل کر ان کے خیالات کے گرویدہ ہو گئے اور کچھ عرصے بعد ان سے قریب رہنے کے

لیے طرابلس کو چھوڑ کر قاہرہ آ گئے۔ یہاں مفتی محمد عبدہ کے ساتھ ان کی رفاقت روز بروز بڑھتی چلی گئی۔ سید رشید رضا نے صحیح اسلام کی دعوت اور مسلمانوں کے اصلاح کے لیے ۱۸۹۸ میں رسالہ "المنار" جاری کیا' جو ۱۹۳۵ تک برابر نکلتا رہا۔ اس رسالے میں مسلمانوں کی دینی اور دنیاوی فلاح پر مضمون ہوتے تھے' ان کی معاشی و سیاسی بدحالی پر تبصرے ہوتے تھے اور مدارس عربیہ کے نصاب تعلیم کی اصلاح پر زور دیا جاتا تھا' اسلام پر غیر مسلموں کے اعتراضات کا جواب دیا جاتا تھا اور سب سے بڑھ کر یہ کہ اس میں شیخ محمد عبدہ کی تفسیر قرآن کے اجزاء بالالتزام چھپتے تھے۔

سید رشید رضا نے مسلمانوں کے فائدے کے لیے کئی تجاویز پیش کیں۔ مثلاً ایک یہ کہ انجمن الجامعہ الاسلامیہ قائم کی جائے جس میں تمام مسلمانوں کو متحد کیا جائے اور عثمانی سلطان کی سرپرستی میں ریاست ہائے متحدہ امریکہ کی طرح تمام مسلم ممالک کا ایک وفاق بنایا جائے جس کے تمام ممالک اندرونی نظم و نسق میں خود مختار ہوں۔ لیکن مصر کے قوم پرستوں نے اس کی مخالفت کی اور یہ تجویز کامیاب نہ ہو سکی۔ سید رشید رضا بھی ازہر کے طریقۂ تعلیم کے علاوہ سرکاری نظام تعلیم پر نکتہ چینی کرتے رہتے تھے۔ ان کا خیال تھا کہ وہی علماء اسلام کی اچھی طرح تبلیغ کر سکتے ہیں جو قدیم و جدید دونوں علوم سے بہرہ ور ہوں۔ ۱۹۰۸ میں ترکی میں نوجوانوں کے انقلاب کے بعد سید رشید رضا نے ایک دارالعلوم کے قیام کا خیال پیش کیا اور اس غرض کے لیے ایک سال تک قسطنطنیہ میں ٹھہرے رہے لیکن حکومت نے دارالعلوم کے قیام کے لیے ایسی شرائط عائد کر دیں کہ جنہیں وہ قبول نہ کر سکے اور ان کا یہ خواب ۱۹۱۲ میں کچھ عرصہ کے لیے مصر میں صورت پذیر ہو کر بالآخر ناکامی سے دوچار ہوا اور ختم ہو گیا۔

مدرسۃ دارالدعوۃ والارشاد کے قیام کے سلسلے میں سید رشید رضا اور مولانا شبلی کے درمیان خط و کتابت ہوتی رہتی تھی۔ چنانچہ انہوں نے مولانا شبلی کی دعوت پر ہندوستان کا دورہ کیا اور لکھنؤ پہنچ کر ۶ اپریل ۱۹۱۲ کو ندوۃ العلماء کے اجلاس کی صدارت کی اور عربی زبان میں ایک نہایت ولولہ انگیز اور فصیح تقریر کی' جس سے سماں بندھ گیا۔ بعد کے زمانے میں وہ زیادہ تر تصنیف و تالیف میں منہمک اور "تفسیر المنار" کی تکمیل میں مصروف ہو گئے۔ وہ ابھی سورۂ یوسف پر ہی تھے کہ پیغام اجل آ پہنچا۔ وہ سلطان ابن السعود سے مل کر قاہرہ آ رہے تھے کہ موٹر کار میں حرکت قلب بند ہو جانے سے انتقال کر گئے۔

عربی ادب میں سید رشید رضا کا مقام یہ تھا کہ وہ صحیح اور بلیغ عربی نثر لکھتے تھے اور مضامین چاہے دینی ہوں یا اصلاحی' ان کی عربی نثر میں ادبی چاشنی پائی جاتی تھی۔ اس کے ساتھ وہ اچھے شاعر بھی تھے۔ ان کی آخری نظم مقصورہ رشیدیہ ہے جو انہوں نے مقصورہ ابن درید کے جواب میں لکھی تھی۔ اس میں چار سو سے زائد اشعار ہیں جن میں مسلمانوں کی اصلاح کے متعلق اپنے خیالات کو نظم کا جامہ پہنایا ہے۔



سید رشید رضا نے ہزاروں صفحات لکھے' لیکن ان کی علمی زندگی کا اہم کارنامہ "تفسیر المنار" ہے۔ اس تفسیر کا آغاز تو مفتی محمد عبدہ نے سید رشید رضا کی استدعا پر کیا تھا اور یہ المنار میں شائع ہوتی رہی۔ تاہم مفتی محمد عبدہ کے انتقال (۱۹۰۵) کے بعد اس تفسیر کا سلسلہ سید رشید رضا نے جاری رکھا اور یہ تفسیر زمانہ حال کی ضرورتوں کے پیش نظر لکھی۔ لیکن جیسا کہ اوپر ذکر ہوا وہ یہ تفسیر صرف سورۂ یوسف تک ہی لکھ پائے تھے کہ موت کا پیغام آ گیا۔ اس کے علاوہ ان کی دوسری مشہور تصنیف "تاريخ الاستاذ الامام الشيخ محمد عبده" ہے جو تین ضخیم جلدوں میں ہے۔ پھر ان کی کتاب "الوحی المحمدی" ہے' جس کا ہندوستان میں ان کے شاگرد عبدالرزاق ملیح آبادی نے اردو میں ترجمہ کر کے کلکتہ سے شائع کیا۔ علم کلام و مناظرہ میں ان کا ایک رسالہ "شبهات النصارى و حجج الاسلام" ہے۔ اسی طرح ایک رسالہ "نداء للجنس اللطيف" (صنف لطیف کے نام پیغام) ہے جس میں اسلام میں حقوق نسواں' تعدد ازدواج' غلامی' پردہ اور طلاق کے مسائل پر حکیمانہ گفتگو کی گئی ہے۔

## قاسم امین (م ۱۹۰۸)

قاسم امین ایک انقلابی تھا جس نے بیسویں صدی کے آغاز میں مسلم عورت کی آزادی کے حق میں آواز اٹھائی۔ یہ وہ زمانہ تھا جب شرق اوسط کے ملکوں میں عورتوں کو نہ تو تعلیم دی جاتی تھی اور نہ معاشرے میں ان کے کوئی حقوق تسلیم کیے جاتے تھے۔ مسلمان عورتیں اول تو گھر سے باہر نکلتی ہی نہ تھیں اور اگر نکلتی بھی تھیں تو پوری طرح سے پردے میں ڈھکی ہوتی تھیں۔ قاسم امین کی ابتدائی تعلیم تو قاہرہ میں ہوئی لیکن بعد میں اس نے پیرس جا کر اپنی تعلیم مکمل کی۔ وہاں سے واپس آ کر اس نے محکمۂ انصاف میں ملازمت کی اور ترقی کر کے کورٹ آف اپیل کا مشیر مقرر ہو گیا اور اپنی وفات تک اسی عہدے پر رہا۔ پیرس اور یورپ کی زندگی میں قاسم امین نے جو کچھ دیکھا اس سے اس نے بڑا اثر لیا' خاص طور پر عورت کی زندگی کے معاملے میں اس نے وہاں کے حالات اور اپنے ہاں کے حالات میں بہت تفاوت دیکھا۔ وہ ایک ذہین' صاحب عقل اور حساس انسان تھا۔ یہاں اس نے مسلم عورت کو دیکھا کہ علم اور آزادی سے محروم ہے اور پردہ اس کے اور امور زندگی میں اس کی شرکت کے درمیان حائل ہو گیا ہے۔ چنانچہ اس صورت حال کی اصلاح کے لیے اس نے "تحرير المراة" (عورت کی آزادی) کے عنوان سے ایک کتاب لکھی' جس میں اس نے عورت کی تعلیم اور پردے سے نجات کی ضرورت پر زور دیا اور اس کے لیے شریعت' تاریخ' معاشرتی قوانین اور امر واقع سے دلائل جمع کر کے پیش کیے۔ قاسم امین کی اس کتاب پر بہت لے

دے ہوئی۔ بعض خواص نے تو اس کی تائید کی' لیکن زیادہ تر لوگوں نے اس کی مخالفت کی اور اس کی کتاب پر سخت اعتراضات کیے۔ تاہم قاسم امین پر ان تمام مخالفتوں کا کوئی اثر نہ ہوا اور اس نے ایک دوسری کتاب "المرأة الجديدة" (جدید عورت) لکھ دی' جس میں اس نے اپنے مخالفین کے اعتراضات کا جواب دیا۔

قاسم امین کی استعداد عربی زبان میں کوئی زیادہ نہیں تھی اور نہ اس کا عربی اسلوب اتنا طاقتور تھا۔ بلکہ وہ فرانسیسی زبان اور اس کے آداب پر زیادہ عبور رکھتا تھا۔ چنانچہ اس کی تحریروں میں فرانسیسی زبان اور محاورے کا اثر دیکھا جا سکتا ہے۔ البتہ وہ عربی میں جو کچھ بھی لکھتا تھا وہ بہت واضح اور صاف ہوتا تھا اور اس سے وہ اپنا مطلب پوری طرح ادا کر دیتا تھا۔

قاسم امین کی اہمیت اس وجہ سے ہے کہ عربی زبان میں اس نے پہلی دفعہ انقلابی افکار و آراء پیش کیے اور جن لوگوں نے اس کی مخالفت کی ان کو دلائل سے قائل کرنے کی کوشش کی۔ وہ اپنے اس مشن میں چاہے اپنی زندگی میں کامیاب نہ ہوا ہو لیکن اس کے نظریات وقت گزرنے پر قابل قبول ہوتے چلے گئے اور عورتوں کی زندگیوں میں بہت سی تبدیلیوں کا پیش خیمہ ثابت ہوئے۔

## جرجی زیدان (م ۱۹۱۴)

ایک عیسائی عرب فاضل' صحافی' مؤرخ اور ادیب' ۱۸۶۱ میں بیروت میں پیدا ہوا۔ وہ ایک غریب عیسائی گھرانے میں پیدا ہوا تھا اس لیے اسے باقاعدہ تعلیم میسر نہ آ سکی۔ لیکن اپنی ذاتی محنت اور کوشش سے اس نے بہت سے علوم میں دسترس حاصل کر لی۔ اس کے بعد وہ مصر چلا گیا۔ ۱۸۸۴ میں جو مہم گورڈن (Gordon) کی مدد کے لیے بھیجی گئی تھی' اس میں اس نے ترجمان کے فرائض ادا کیے۔ بعد ازاں وہ بیروت لوٹ آیا اور کچھ عرصہ (۱۸۸۶) لندن میں بسر کرنے کے بعد قاہرہ میں مستقل سکونت اختیار کر لی۔ یہاں چند سال معلمی کی اور پھر اخبار "المقتطف" میں ملازم ہو گیا۔

زیدان نے تصنیف کا کام لسانیات کے موضوع سے شروع کیا اور الفلسفة اللغوية کے نام سے ایک کتاب لکھی۔ لیکن اس میں کوئی خاص بات نہ دیکھی گئی۔ اس کے بعد وہ تاریخی تصانیف اور درسی کتابوں کی طرف متوجہ ہو گیا۔ چنانچہ اس نے تاريخ مصر الحديث' التاريخ العام' تاريخ اليونان و الرومان' تاريخ انكلترا وغیرہ کتابیں لکھیں۔ اس نے "انساب العرب القدماء" بھی تحریر کی۔ لیکن ان تمام تصانیف کو کوئی مقبولیت حاصل نہ ہو سکی۔



۱۹۱۴ میں اس کا مشہور تاریخی ناول "المملوک الشارد" (مفرور غلام) شائع ہوا جس کا ترجمہ جرمن زبان میں ہوا۔ اس سے پہلے ۱۸۹۲ میں اس نے اپنے ادبی مجلے "الهلال" کا آغاز کیا اور پھر اس زمانے سے لے کر اپنی موت تک ساری زندگی اسی کے لیے وقف کر دی۔ وہ بڑی محنت اور سرگرمی سے کام کرتا رہا۔ مزید برآں وہ ہر سال ایک نیا ناول اور ایک عام پسند تعلیمی کتاب لکھ لیتا تھا۔ رفتہ رفتہ "الهلال" کی اشاعت عربی رسالوں میں سب سے زیادہ ہو گئی اور زیدان کا نام بھی ایک ناول نگار اور مؤرخ کی حیثیت سے نہ صرف بلاد عربیہ بلکہ مشرق کے تمام اسلامی ملکوں میں مشہور ہو گیا۔

اس کے بائیس ناولوں میں سے زیادہ تر کا موضوع عربوں کی فتوحات سے لے کر عہد ممالیک تک اسلام کی ابتدائی تاریخ ہے۔ یہ ناول اس لیے اہم ہیں کہ ان سے تاریخ کا موضوع مقبول عام ہو گیا۔ یہ آسان اور رواں زبان میں لکھے گئے ہیں اور ان کا انداز رومانی اور جذباتی ہے۔ تقریباً وہی انداز جو انگریزی زبان میں سر والٹر سکاٹ کے ناولوں کا ہے۔ اس کے دیگر قابل ذکر تاریخی ناول یہ ہیں : شجرات الدر' فتاة غسان' الحجاج ابن يوسف' الامين و المامون' شارل و عبدالرحمان' احمد بن طولون' فتح الاندلس' ابو مسلم الخراساني وغیرہ۔

زیدان کی تاریخی تصنیفات میں سب سے زیادہ اہمیت "تاريخ التمدن الاسلامي" (۵ جلدیں) کو حاصل ہے۔ اس کتاب کی بنیاد اس نے گولڈ زیہر' کریمر اور دوسرے مستشرقین کی تصانیف پر رکھی۔ اگرچہ اس میں عربی مآخذ اور جدید مشرقی زندگی کے متعلق مصنف کی ذاتی معلومات کی بدولت بہت کچھ اضافے بھی ہوئے۔ ہمارے ملک کے مولانا شبلی نے جرجی زیدان کی اس تاریخ کو غور سے پڑھا تو اس میں انہیں مصنف کا زاویہ نظر یہ دکھائی دیا کہ کسی طرح مسلمانوں کی اموی حکومت اور خاص طور پر عربوں کے کردار کو ایک منفی رنگ میں پیش کیا جائے۔ چنانچہ شبلی نے اس پر ایک مفصل ریویو عربی زبان میں لکھا اور اس کا اردو ترجمہ قدرے اختصار کے ساتھ اپنے رسالہ "الندوہ" میں ۱۹۱۰ میں شائع کیا' جس میں جرجی زیدان کی پھیلائی ہوئی بہت سی غلط فہمیوں کا مدلل جواب دیا۔

بلاد مشرق کے لیے جرجی زیدان کی آخری بڑی تصنیف "تاريخ آداب اللغة العربية" (۴ جلدوں میں) ہے۔ یہ عربی زبان میں پہلی کتاب ہے جو یورپی اصولوں کو مد نظر رکھ کر لکھی گئی۔ عربی ادب کی اس تاریخ کے لیے جرجی زیدان نے بروکلمان اور ہوار (Huart) سے بہت کچھ استفادہ کیا۔ اگرچہ بعض اہل نظر کے نزدیک اس نے یورپی مآخذ کو جس طرح سے استعمال کیا اس میں تنقید کی بہت گنجائش ہے۔ یورپ کے علمی اور تحقیقی نقطۂ نظر سے بہرحال اس کی چوتھی جلد سب سے زیادہ اہم ہے کہ اس میں انیسویں صدی کے عربی ادب کا اچھا خاصا جائزہ لیا گیا ہے۔

جرجی زیدان کوئی محقق نہیں تھا اور نہ وہ عربی زبان کا کوئی بڑا ادیب تھا' تاہم یورپی طریق کار سے واقفیت کی بدولت اس سے بلادِ عربیہ میں ایک نئے دور کا آغاز ہوتا ہے۔ اس نے متعدد اور مختلف قسم کے مباحث کو لوگوں تک پہنچایا اور عربوں کو تلقین کی کہ یورپ کے ارتقا یافتہ طریق کار اور علوم قطعیہ کے علاوہ اس کی تاریخ اور ادب پر بھی توجہ کریں۔ علم و حکمت کی دنیا میں اس کی حیثیت کسی انقلابی کی نہیں۔ اس کی تصانیف (خصوصاً تاریخ التمدن الاسلامی) پر جو تیز و تند تنقید کی گئی' وہ شاید ساری کی ساری حق بجانب نہ ہو۔ بیسویں صدی کے ربع اول کی علمی و ادبی فضا کو سامنے رکھیے تو دیکھا جا سکتا ہے کہ اس میں جرجی زیدان کتنا فعال اور متحرک تھا۔ بہرصورت جدید عربی ادب اور معاشرے کی تاریخ میں اس کا نام فراموش نہیں کیا جا سکتا۔ وہ عربی میں "الهلال" جیسے مقبول اور ہردلعزیز رسالے کا بانی اور مدیر تھا۔ تاریخ' لغت' ادب اور انسانی سوسائٹی پر اس نے قابل قدر تصانیف کیں اور مشرق میں ناول نگاری کے فن کی ابتدا کی۔ یہ ایسے میدان ہیں جن میں اس کی کارگزاری کو کسی صورت نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔

## مصطفیٰ لطفی المنفلوطی (م ۱۹۲۴)

بہت عمدہ نثر نگار اور اچھا شاعر مصطفیٰ لطفی اسیوط کی تحصیل میں واقع ایک مقام منفلوط میں ۱۸۷۶ میں پیدا ہوا۔ اس کے خاندان میں علم تھا اور عزت و شرافت تھی۔ اس نے مدرسے میں قرآن حفظ کیا اور ازہر میں جا کر تعلیم پائی' جہاں ادب کے مضامین سے اسے خاص دلچسپی رہی۔ پھر اس نے شیخ محمد عبدہ کی مجالس درس و ارشاد میں باقاعدہ جانا شروع کیا اور بڑے بڑے ادباء کی صحبت سے فائدہ اٹھایا۔ اپنے باپ کی نگرانی کے باوجود اس نے عربی زبان و ادب کے علاوہ دوسرے علوم کی طرف زیادہ توجہ نہ کی۔ چنانچہ وہ اشعار یاد کیا کرتا' ادب کی روایات اور نوادر جمع کرتا' شعر کہتا اور خطوط لکھا کرتا۔ تا آنکہ ازہر میں اس کی جودتِ طبع اور اس کی تحریر کے خوبصورت اسلوب کا چرچا ہونے لگا۔ شیخ محمد عبدہ نے ان صلاحیتوں کو دیکھتے ہوئے اسے اپنے قریب کر لیا اور اس کے لیے نہ صرف ادب میں بلکہ زندگی میں بھی ایک لائحہ عمل تجویز کیا۔ شاعری کو چھوڑ کر اب اس نے نثر لکھنے کی طرف توجہ کی۔ اس کے لیے وہ دلکش انداز میں لکھے ہوئے قصے اور داستانیں پڑھا کرتا' اس سے آگے بڑھا تو وہ "کتاب الاغانی" کے مطالعے میں لگ گیا اور اس میں سے اس نے فصیح و بلیغ اور دل پر اثر کرنے والی عبارتوں کا انتخاب کیا اور پھر اسی انداز کو اپناتے ہوئے وہ رسالوں میں مضامین لکھنے لگا' جنہیں لوگ بڑے شوق سے پڑھتے اور ان پر داد دیتے۔

شیخ محمد عبدہ کے ساتھ اپنے تعلق کی وجہ سے منفلوطی سعد پاشا زغلول کے بھی قریب ہو گیا' اور ان



دونوں اکابر کے ساتھ اپنی قربت کی وجہ سے "المؤید" کے مدیر کی نظروں میں آ گیا۔ چنانچہ منفلوطی کے ادیب بننے میں یہ تینوں بڑے مل کر ایک اہم عنصر ثابت ہوئے۔

منفلوطی ابھی ازہر میں پڑھتا تھا کہ ایک روایت کے مطابق اس نے خدیو عباس حلمی ثانی کی ہجو لکھی اور وہ ایک ہفتہ وار جریدے میں شائع ہو گئی۔ اس کی پاداش میں اسے قید کرنے کا حکم صادر ہوا اور منفلوطی نے کچھ عرصہ قید خانے میں گزارا۔ شیخ محمد عبدہ کی وفات پر وہ مغموم اور مایوس ہو کر اپنے گاؤں چلا گیا۔ کچھ عرصے بعد قاہرہ واپس آ کر "المؤید" میں لکھنے لگا۔ پھر مختلف سرکاری مناصب پر رہنے کے بعد آخر میں اسے پارلیمنٹ میں کوئی دفتری عہدہ مل گیا' جس پر وہ کام کرتا رہا' تا آنکہ عمر کی پانچویں دہائی میں اس نے انتقال کیا۔

مصطفیٰ لطفی المنفلوطی پاکستان میں بہت جانا پہچانا نام ہے' اس لیے کہ اس کے افسانوں کی کتاب "العبرات" (آنسو) ایم اے عربی کے نصاب میں غالباً تیس برس سے بھی زیادہ عرصے کے لیے لگی رہی۔ اسی کے ساتھ معاشرتی موضوعات پر اس کے مقالات اور خاکوں کا مجموعہ "النظرات" بھی ایم اے کے طالب علموں کے لیے بطور اضافی مطالعے کے مقرر ہوا۔ یوں لگتا تھا جیسے ایم اے عربی کا نصاب بنانے والوں کی نظر میں جدید عربی ادب کی ابتدا بھی منفلوطی سے ہوئی تھی اور اتنا بھی ایہ ٹھیک ہے کہ عربی ادب کی تاریخ میں منفلوطی ایسے مرحلے میں آیا جب سلیس اور خوبصورت عربی نثر کے نمونے کم کم نظر آتے تھے۔ اس زمانے میں عام طور پر عربی نثر کے دو نمونے لوگوں کے سامنے تھے: ایک القاضی الفاضل کا مسجع و مقفع اور پُر تکلف اسلوب' اور دوسرا ابن خلدون کا سادہ اور بے رنگ اسلوب۔ منفلوطی نے اپنی عربی نثر میں ان دونوں اسالیب سے اجتناب کرتے ہوئے ایسا طرز اپنایا جس میں ابن خلدون کی صفائی اور سلاست تو تھی ہی' اس کے ساتھ اس میں ادبی چاشنی اور شعریت کا ایسا امتزاج تھا جس سے نثر کا یہ نمونہ بہت خوبصورت اور دلچسپ لگتا تھا۔

منفلوطی مغربی تعلیم سے بالکل بے گانہ رہا' جس کی وجہ سے نہ اس نے مغرب میں رائج ادب کے نمونے دیکھے اور نہ وہاں کے افسانوں اور ناولوں سے اسے کوئی آگاہی ہوئی۔ اس نے عربی میں جو افسانے لکھے وہ مشرق کی رومانیت اور جذباتیت میں ڈوبے ہوئے تھے۔ اس کے بیشتر افسانے ان مظلوم کرداروں کے بارے میں ہوتے تھے جن پر ان کا معاشرہ بہت ستم توڑتا تھا اور اکثر افسانوں میں یہ کردار بالآخر اپنی جان سے گزر جاتے تھے۔ ہمارے ہاں اس طرح کی کہانیوں کی وجہ سے راشد الخیری کو مصورِ غم کا خطاب دیا گیا۔ عرب دنیا میں مصطفیٰ لطفی المنفلوطی صحیح معنوں میں مصورِ غم تھا۔ "العبرات" کی اکثر کہانیوں کو پڑھتے ہوئے نوجوان آنکھوں میں اگر آنسو آ جاتے ہوں تو کوئی تعجب کی بات نہیں۔ منفلوطی

کی ان کہانیوں میں یا تو بالکل سفید کردار تھے یا بالکل سیاہ۔ ان کے بین بین بھورے (Grey) رنگ کے کردار بالکل نہیں تھے۔ کہانیوں کی اس خصوصیت کو ابراہیم عبدالقادر المازنی نے اپنی کتاب "الدیوان" میں سخت تنقید کا نشانہ بنایا۔ دوسری کتاب "النظرات" میں منفلوطی کے ان مقالات اور خاکوں کی ایک اہم بات یہ تھی کہ وہ جس طرح سے اپنے خیالات کا اظہار کرتا تھا اس میں اسلام، جدیدیت پسندی، کلاسیکی ورثے کی اہمیت کا شعور اور خلاف مغرب جذبات ہوتے تھے۔ خیالات و تصورات کا یہ نہج بیسویں صدی کے ابتدائی برسوں کے ساتھ خاص تھا...... منفلوطی کے لکھے ہوئے خاکوں اور کہانیوں کی ایک خصوصیت یہ رہی کہ وہ مستقبل میں ناول کی روایت کے ارتقاء میں ایک اہم قدم ثابت ہوئے۔

منفلوطی کی ادبی حیثیت کے قائم و دائم رہنے کی راہ میں دو رکاوٹیں حائل ہوئیں۔ ایک یہ کہ اپنی بات دوسروں تک پہنچانے کے لیے اس میں طاقتور اظہار کی کمی تھی اور دوسرے یہ کہ اس کی تعلیم بہت محدود تھی۔ قوتِ اظہار کی کمی کی وجہ یہ تھی کہ منفلوطی کو عربی لغت سے زیادہ واقفیت نہیں تھی اور نہ عربی ادب میں اس کو بصیرت حاصل تھی۔ اسی لیے اس کی تحریر میں زبان و بیان کی غلطی بھی راہ پا جاتی ہے اور غیر ضروری اظہار بھی۔ نیز لفظوں کا غلط جگہ استعمال بھی دیکھنے میں آتا ہے۔ رہا تعلیم کا محدود ہونا تو اس کی وجہ یہ کہ اس نے نہ مشرق کے علوم کی تحصیل کی اور نہ مغرب کے علوم کے ساتھ اس کا کوئی راست تعلق قائم ہو سکا۔ اس لیے اس کی فکر پر سطحیت، سادگی اور رومانیت کا غلبہ رہا۔

منفلوطی کی تصانیف میں ایک تو "النظرات" ہے جو اس کے ان مقالات کا مجموعہ ہے۔ جو اس نے تنقید، معاشرتی امور اور وصف و بیان اور کہانیوں کے موضوعات پر "المؤید" میں لکھے تھے۔ دوسری "العبرات" جو اس کے طبع زاد اور ترجمہ شدہ افسانوں کا مجموعہ ہے۔ پھر "مختارات منفلوطی" ہے جس میں اس نے قدیم لوگوں کے اشعار اور ان کے اقوال کو جمع کیا ہے۔ پھر اس نے بعض فرانسیسی ادبا کی چیزوں کے تراجم اپنے دوستوں سے حاصل کر کے انھیں اپنے خوبصورت ادبی اسلوب میں ڈھالا اور اس طرح عربی ادب کی ثروت میں اضافہ کیا۔

☆......☆......☆

بیسویں صدی کے درمیانی عرصے میں مصر کے ادبی افق پر جو شخصیات نمایاں رہیں اور انھوں نے علم اور ادب اور تنقید میں بہت وقیع اور باقی رہ جانے والا کام کیا' ان میں چار نام خصوصیت کے ساتھ قابلِ ذکر ہیں: احمد امین' طٰہٰ حسین' احمد حسن الزیات اور عباس محمود العقاد۔ یہ چاروں ادبی شخصیات ایسی ہیں کہ ان کا نام ہمارے لیے اجنبی نہیں ہے اور یہاں جو حلقے عربی زبان و ادب کی تعلیم سے متعلق ہیں وہ ان کے



ناموں اور کاموں سے واقف ہیں۔ احمد امین نے فجر الاسلام' ضحیٰ الاسلام اور ظہر الاسلام کے عنوانات سے اسلام کے شروع زمانے سے لے کر عباسی دور کے آخر تک کی تمدنی اور معاشرتی تاریخ لکھی' جو مسلم دنیا میں اپنی طرز کی پہلی تاریخ ہے اور اپنے اندر معلومات کا ایک بیش بہا خزانہ لیے ہوئے ہے۔ اس کا اردو زبان میں ایک اچھا اور معیاری ترجمہ ہونا ابھی باقی ہے۔ طٰہٰ حسین نے تاریخ' ادب' تنقید' سیرت' تاریخ اسلام اور تعلیم کے موضوعات پر متعدد کتابیں لکھنے کے ساتھ ساتھ چھ ناول بھی عربی زبان کو دیے۔ اس کی متعدد کتابوں خصوصاً "الایام" (خود نوشت سوانح) اور "علی هامش السیرة" (سیرت کے حاشیے پر) سے اردو قارئین ترجموں کی وساطت سے واقف ہیں۔ طٰہٰ حسین نے ایک عمدہ مضمون علامہ اقبال پر بھی لکھا تھا۔ احمد حسن الزیات نے اپنے ہفتہ وار ادبی مجلے "الرسالة" کے صفحات پر متعدد ادیب پیدا کیے۔ وہ قوی ادیب تھا اور اس کی کتاب "تاریخ الادب العربی" پاکستان میں ایم۔اے عربی کے نصاب میں ایک معاون کتاب کی حیثیت سے داخل چلی آتی ہے۔ اس کتاب کے علاوہ زیات نے اپنے فصیح و بلیغ عربی اسلوب میں ادب و تنقید پر متعدد کتابیں لکھیں اور دو کتابوں کے فرانسیسی زبان سے عربی میں ترجمے بھی کیے۔ عباس محمود العقاد بنیادی طور پر شاعر تھا۔ اس نے جدید طرز کی شاعری کرنے کے ساتھ ساتھ ابراہیم عبدالقادر المازنی کے ساتھ مل کر اپنے زمانے کی پرانی طرز کی شاعری پر کڑی تنقید کی۔ لیکن اس نے اس کے ساتھ نثر میں بھی بہت کچھ لکھا اور سیاست سے لے کر فلسفۂ الٰہیات اور سیرت کے موضوعات پر کتابیں اور رسالے لکھے۔ اسلامی سیرت پر اس کی کتابیں "عبقرية محمد" اور "عبقرية الصديق" اور اس طرح کی دوسری کتابیں سیرت نگاری کا ایک نیا انداز سامنے لاتی ہیں۔ ان میں سے بعض کا غالباً اردو میں ترجمہ ہو چکا ہے۔ ان چاروں اساطین ادب کے کچھ مختصر حالات دینے کے بعد موجودہ دور کی عربی شاعری اور جدید شعراء کا مناسب تعارف کرایا جائے گا۔

## احمد امین (م ۱۹۵۴)

مصری فاضل اور مصنف' قاہرہ میں پیدا ہوا۔ جامع ازہر اور مدرسۃ قانون شرعی میں تعلیم پانے کے بعد وہ مصری عدالتوں میں بطور قاضی کام کرتا رہا۔ ۱۹۲۶ میں اس کا تقرر قاہرہ یونیورسٹی کے اساتذہ میں ہو گیا' جہاں وہ ۱۹۲۶ سے ۱۹۳۶ تک عربی ادبیات کا استاد رہا۔ ۱۹۴۷ میں وہ عرب لیگ کے شعبۂ ثقافت کا ناظم مقرر ہو گیا۔ احمد امین لجنة التاليف و الترجمة و النشر (تالیف و ترجمہ و اشاعت کی انجمن) کے بانیوں اور سرگرم ترین ارکان میں سے تھا۔ اس انجمن کے لیے اس نے قدیم عربی کتابوں اور تاریخ

ادب کی عام تصانیف کی دوسرے لوگوں کے ساتھ مل کر تصحیح و اشاعت کی۔ اس کی سب سے عالمانہ اور اہم تصنیف آٹھویں سے دسویں صدی عیسوی کے تمدن اسلامی کی تاریخ ہے جو تین حصوں میں ہے: فجر الاسلام (ایک جلد) ضحیٰ الاسلام (تین جلدیں) اور ظہر الاسلام (چار جلدیں)۔ یہ تصنیف اس حیثیت سے قابل توجہ ہے کہ اس میں پہلی مرتبہ موجودہ زمانے کی مسلم عرب تاریخ نویسی میں بڑے پیمانے پر تنقید و تحقیق کا طریقہ استعمال کیا گیا ہے۔ ۱۹۳۳ سے وہ احمد حسن الزیات کے ہفتہ وار ادبی مجلہ "الرسالة" میں شریک کار رہا اور پھر ۱۹۳۹ میں اس نے اسی طرح کے ایک اور رسالے "الثقافة" کی ادارت کے فرائض انجام دیئے۔ اس کے ان ادبی معاشرتی اور دوسرے موضوعات پر مقالوں کو جو ان رسالوں میں شائع ہوتے رہے بعد میں جمع کر کے کتاب "فیض الخاطر" (۸ جلدیں) کی صورت میں شائع کیا گیا۔ احمد امین کی دوسری تصانیف میں اس کی خودنوشت سوانح "حیاتی" خاص طور پر قابل ذکر ہے۔

## طٰہٰ حسین (م ۱۹۷۳)

عالم عرب کا نہایت ممتاز اور مشہور و معروف ادیب، نقاد اور انشاپرداز جس کی شخصیت بیسویں صدی کے ایک بڑے حصے کی ادبی دنیا پر چھائی رہی اور اس نے اس دور کی کئی نسلوں کو اپنے علم، اپنے افکار، اپنی تنقید اور اپنے خوبصورت اور سحر طراز نثری اسلوب سے متاثر کیا۔

وہ مصر کے ایک چھوٹے سے گاؤں میں پیدا ہوا۔ اس کا والد ایک شوگر کمپنی میں ملازم تھا۔ وہ چھ سال کا تھا کہ آشوب چشم کے باعث اس کی آنکھوں کی بینائی متاثر ہوئی اور غلط علاج کی وجہ سے وہ ہمیشہ کے لیے نور بصارت سے محروم ہو گیا۔ نو سال کی عمر میں اس نے قرآن حفظ کر لیا اور تیرہ سال کی عمر میں قاہرہ آ کر جامع ازہر میں چھ سال نحو، اصول فقہ، منطق، فلسفہ اور ادب کی تعلیم پائی۔ اس کو سب سے زیادہ علمی فیض شیخ علی المرصفی سے پہنچا، جو مدرسہ کے اوقات کے علاوہ شوقین طلبہ کو زمخشری کی المفصل، دیوان الحماسہ اور مبرد کی الکامل کا درس دیا کرتے تھے۔

۱۹۰۸ میں جامعۂ مصریہ قائم ہوئی تو طٰہٰ حسین جامعہ کے لیکچروں میں شرکت کرنے لگا۔ اس وقت مشہور اطالوی مستشرقین جیدی اور نللینو وہاں مختلف مضامین کا درس دیا کرتے تھے۔ طٰہٰ حسین ان مغربی اساتذہ کے نئے خیالات و نظریات سے بہت متاثر ہوا۔ اسی اثنا میں اس نے فرانسیسی زبان و ادب سے بھی واقفیت پیدا کر لی تھی۔ جامعۂ مصریہ سے فراغت کے بعد اس نے ابوالعلاء معرّی کی شاعری اور فلسفۂ زندگی پر "ذکری ابی العلاء" لکھ کر ڈاکٹریٹ کی سند حاصل کی۔ ۱۹۱۵ میں اسے اعلیٰ تعلیم کی خاطر فرانس



بھیجا گیا۔ وہاں سوربون میں اس نے ابن خلدون کے معاشرتی فلسفے پر ایک کتاب لکھ کر ڈاکٹریٹ حاصل کی۔ قیام پیرس کے دوران میں اس نے ایک فرانسیسی خاتون سے شادی کر لی جس نے حد درجہ محبت، وفاداری اور دلسوزی سے اس کی خدمت کی اور لکھنے پڑھنے میں اس کی مددگار و رفیق بنی رہی۔ ۱۹۱۹ میں وہ تحصیل علم کے بعد مصر آ گیا اور جامعۂ مصریہ میں قدیم (یونانی و رومانی) تاریخ کا درس دینے لگا۔ ۱۹۲۵ میں وہ کلیۃ الآداب (آرٹس کالج) میں تاریخ ادب عربی کا استاد مقرر ہوا۔ ۱۹۲۶ میں اس نے کتاب "فی الشعر الجاهلی" شائع کی، جس میں اس نے جاہلی شاعری کے بارے میں یہ عجیب رائے پیش کی کہ اس کا ایک بڑا حصہ بعد کے لوگوں کا گھڑا ہوا ہے، جسے بعض اغراض کے تحت قدیم شعراء سے منسوب کر دیا گیا ہے۔ اس بات پر بہت سے ادیب اور نقاد برہم ہوئے اور اخباروں اور رسالوں میں طٰہٰ حسین کے خلاف تشنیع و مذمت کا ایک طوفان کھڑا ہو گیا۔ چنانچہ حکومت کو مداخلت کر کے اس کی اشاعت روک دینی پڑی، اور طٰہٰ نے ضروری حک و اضافہ کے بعد اسی تصنیف کو دوبارہ "فی الأدب الجاهلی" کے عنوان سے شائع کیا۔ ۱۹۳۲ء میں وفد پارٹی برسر اقتدار آئی تو طٰہٰ حسین کو جامعۂ اسکندریہ کا وائس چانسلر مقرر کیا گیا۔ ۱۹۵۰ میں وفد پارٹی نے دوبارہ وزارت بنائی تو وزارت تعلیم کا قلمدان طٰہٰ حسین کے حصے میں آیا۔ اس نے اپنے زمانۂ وزارت میں مصر بھر میں ثانوی تعلیم مفت اور عام کر دی۔ اس نے اسیوط میں یونیورسٹی کے قیام کا منصوبہ بنایا، ایتھنز یونیورسٹی میں عربی زبان کی چیئر (Chair) قائم کرائی اور حکومت کو شیکسپیئر کے ڈراموں کے عربی ترجمے کرانے کی ضرورت اور اہمیت کی طرف توجہ دلائی۔ ۱۹۵۱ میں اس کو حکومت کی طرف سے پاشا کا خطاب دیا گیا۔ ۱۹۵۲ میں فوجی انقلاب کے بعد وہ کچھ گوشہ نشین سا ہو گیا لیکن اس کی علمی اور ادبی سرگرمیوں میں کوئی فرق نہ آیا۔ وہ مجمع اللغة العربية (قاہرہ) اور المجمع العلمی العربی (دمشق) کا اعزازی رفیق تھا۔ میڈرڈ اور کیمبرج یونیورسٹیوں نے اسے ڈاکٹر آف لٹریچر کی اعزازی ڈگریاں عطا کیں۔ نیز علمی اور تعلیمی معاملات میں اس کی رائے ہمیشہ وقیع سمجھی گئی۔

ڈاکٹر طٰہٰ حسین فرانسیسی ادب و ثقافت کا بھی شیدائی تھا۔ اسے فرانسیسی زبان پر بڑی قدرت حاصل تھی اور اس کے ایک معتدبہ ادبی ذخیرے کو اس نے عربی زبان میں منتقل کیا۔ کسی زمانے میں وہ حریتِ فکر حد سے بڑھی ہوئی روشن خیالی اور مخصوص معتقدات کی وجہ سے بدنام تھا۔ لیکن آخری عمر میں اس میں سلامت روی، اعتدال اور توازن پیدا ہو گیا۔

طٰہٰ حسین کی شہرت و مقبولیت کا راز اس کے سحر طراز اسلوب بیان میں مضمر ہے۔ اس کے قلم میں بلا کی روانی ہے۔ وہ ایک طرزِ نگارش کا بانی ہے جس کی سلاست، طلاوت، صحتِ زبان اور قدیم عربی کا حسن مسلّم ہے۔ اس کی تحریر میں بعض دفعہ جملوں کی غیر معمولی طوالت اور ایک ہی لفظ یا جملے کی تکرار بھی ذوق

سلیم پر گراں گزرتی ہے۔ لیکن یہ خامیاں زیادہ تر اس کے ہفتہ وار کالموں میں دیکھنے میں آتی ہیں' جن پر کچھ صحافیانہ انداز غالب ہوتا تھا۔ طٰہٰ حسین نے اپنی زندگی میں کئی ادبی معرکے لڑے۔ اس کا معرکہ مصری کے دوسرے بڑے ادیب مصطفیٰ صادق الرافعی کے ساتھ مشہور ہے جو کافی عرصے تک چلتا رہا۔ رافعی عربی زبان کا بہت مقتدر ادیب اور عربی ادب و تاریخ کا عالم ہونے کے ساتھ ساتھ اسلامی اقدار اور روایات کا حامی تھا۔ طٰہٰ حسین کی طرف سے جب اسلام کے بارے میں یا عربی ادب کی قدیم روایت اور تاریخ کے بارے میں یا معاصر ادب کے بارے میں کچھ بے تکے اور مغرب پرستانہ خیالات کا اظہار ہوتا تھا تو مصطفیٰ صادق الرافعی اسے آڑے ہاتھوں لیتا تھا اور اپنے طاقتور اور فصیح و بلیغ اسلوب سے اس کے خیالات کی دھجیاں اڑا دیتا تھا۔ رافعی کے مقابلے میں طٰہٰ حسین کا رویہ گریز کا تھا اور وہ اکثر اوقات جواب دینے کے بجائے خاموشی میں ہی اپنی خیریت سمجھتا تھا۔ لیکن یہ بات ماننی پڑے گی کہ طٰہٰ حسین کے اس عافیت پسندانہ رویے نے بالآخر رافعی کو یہ سلسلہ ختم کرنے پر مجبور کر دیا۔ اس لڑائی میں طٰہٰ حسین کو تو کوئی نقصان نہ پہنچا۔ اگر کچھ نقصان پہنچا ہوگا تو مصطفیٰ صادق الرافعی ہی کو پہنچا ہوگا۔

طٰہٰ حسین کی تصانیف کا جائزہ مختلف عنوانات کے ذیل میں یوں لیا جا سکتا ہے:

۱۔ نقد ادب میں: ذکری ابی العلاء' تجدید ذکری ابی العلاء' فی الادب الجاھلی' مع المتنبی' فصول فی الادب والنقد' حافظ و شوقی' حدیث الاربعاء (بدھ کے روز کے ادبی کالم)' من حدیث الشعر و النثر' من ادبنا المعاصر (دونوں ادبی اور تنقیدی مقالات کے مجموعے)

۲۔ تاریخ و سوانح میں: الأیام (خود نوشت' دو حصوں میں) علی ھامش السیرۃ (تین جلدوں میں) الفتنۃ الکبری کے جامع عنوان کے تحت: عثمان' علی و بنوہ' الشیخان نیز مرآۃ الاسلام

۳۔ ناول: دعاء الکروان' الحب الضائع' ادیب' احلام شھرزاد' شجرۃ البؤس اور الوعد الحق۔ یہ آخری ناول عہد رسالت کے ان فدائیان اسلام کے درد انگیز حالات کے بارے میں ہے جنھوں نے کفار قریش کے مظالم و شدائد کا صبر و استقلال کے ساتھ مقابلہ کیا۔

۴۔ تعلیم: مستقبل الثقافۃ فی مصر: اس میں مصر کے نظام تعلیم پر بے لاگ تبصرہ اور اصلاح کی تدبیر ہے۔

ان کے علاوہ طٰہٰ حسین کے اور بے شمار کام ہیں جن کا احاطہ بہت مشکل ہے۔ مثلاً ایک کام ابّا



ابوالفرج اصفہانی... ابوالحمل حمدی کی تجرید الاغانی (جو پانچ جلدوں میں کتاب الاغانی کا اختصار ہے) کو ایڈٹ کر کے شائع کیا۔ آج اصل کتاب الاغانی کی بیس جلدیں پڑھنے کے لیے کسی کے پاس وقت نہیں ہے۔ ان حالات میں تجرید الاغانی جیسی کتاب کا میسر ہونا بہت غنیمت ہے۔

طٰہٰ حسین ذہنی طور پر معتزلہ کے افکار سے بھی متاثر تھا۔ اس لیے اسے معتزلہ کے علمی آثار کی جستجو رہتی تھی۔ اس کی رہنمائی اور نگرانی میں قاضی عبدالجبار المعتزلی (م ۱۰۲۴) کی گراں قدر تصنیف "المغنی" جو معتزلی عقائد و افکار کی دائرۃ المعارف ہے' بیس جلدوں میں شائع ہوئی۔

طٰہٰ حسین کا انتقال ۱۹۷۳ء میں ہوا اور عرب دنیا نے اس کی موت کا کافی سوگ منایا۔

## احمد حسن الزیات (م ۱۹۶۸)

احمد حسن الزیات نے جامع ازہر میں اسی زمانے میں تعلیم پائی جب طٰہٰ حسین بھی وہاں زیر تعلیم تھا۔ اس نے آگے چل کر مشہور ہفتہ وار ادبی پرچہ "الرسالۃ" جاری کیا۔ ان دونوں کی یہ رفاقت عمر بھر قائم رہی جو بالآخر عزیزانہ تعلقات پر منتج ہوئی۔ زیات کو عربی لغت میں بے پناہ ملکہ حاصل تھا اسی لیے اس کو لغوی ادیب کہا جاتا ہے۔ یعنی ایسا ادیب جس کی تحریر میں لغت عرب پر کامل دسترس کا اظہار ہوتا ہے۔ زیات کے لکھنے کا ایک مخصوص انداز تھا۔ وہ عام طور پر مُزدوج جملے لکھتا تھا' یعنی دو دو تین تین جملے ایک ہی وزن میں اور عموماً ہم قافیہ۔ اپنے ہفتہ وار ادبی مجلے "الرسالۃ" سے اس نے جدید عربی ادب کی بہت خدمات انجام دیں اور بہت سے نئے لکھنے والوں نے اس کے رسالے میں لکھنا شروع کیا تو رسالے کی شہرت اور زیات کی نگرانی کی بدولت بڑے ادیب بن کر نکلے۔ وہ جامعہ امریکیہ میں ادب کا پروفیسر بھی رہا اور رسالے کی ادارت کے ساتھ ساتھ ادب' تنقید اور تاریخ کے موضوعات پر قابل قدر کتابیں لکھیں اور فرانسیسی زبانوں سے کچھ کتابوں کے ترجمے بھی کیے جو کافی مقبول ہوئے۔

**تصانیف:** "تاریخ الادب العربی": یہ درسی کتاب ہے اور اس کی مقبولیت کا یہ عالم ہے کہ ۱۹۴۷ء تک اس کے دس ایڈیشن شائع ہو چکے تھے۔ "فی اصول الادب"، "من الادب الفرنسی" (یہ فرانسیسی نظموں اور افسانوں کا ترجمہ ہے) "دفاع عن البلاغۃ"، "آلام فرتر" (یہ جرمن شاعر گوئٹے کے ناول Sorrows of Werther کا ترجمہ ہے جو زیات نے فرانسیسی زبان سے کیا)۔ "رفائیل" یہ بھی ایک فرانسیسی روزنامچے کا ترجمہ ہے۔ ان سب کے علاوہ "وحی الرسالۃ" (تین جلدوں میں) کے

اندر اس نے اپنے وہ سب مقالات جمع کر دیے جو اس نے "الرسالۃ" کے صفحات پر لکھے تھے۔

## عباس محمود العقاد (م ۱۹۶۴ء)

ادیب، شاعر، نقاد، مترجم اور سیاسی مقالہ نگار۔ عقاد نے کوئی باقاعدہ تعلیم حاصل نہ کی، بلکہ جو علم بھی حاصل کیا، اپنے شوق اور محنت سے حاصل کیا۔ عقاد کو ادب کے ساتھ طبعی علوم میں بھی دلچسپی تھی۔ چنانچہ یہ کوئی تعجب کی بات نہیں کہ وہ نفسیاتی تجزیے میں دلچسپی لینے لگا اور یہ دیکھنے لگا کہ اس کا ادب پر کیونکر انطباق کیا جا سکتا ہے، مثلاً مشہور کلاسیکی شاعر ابن الرومی کے مطالعے میں! عربی ناول میں اس کی جو عطا ہے اس میں بھی یہی انداز نظر ہے۔ چنانچہ اپنے ناول "سارة" کے تعارف میں وہ خود اس طرف اشارہ کرتا ہے کہ "سارة" یا تو نفسیاتی تجزیے کا ناول ہے یا پھر یہ ایک بیانیہ انداز کا تجزیہ ہے۔

کسی تعلیمی سند کے بغیر ہونے کے باوجود عقاد ایک ممتاز ادیب تھا۔ وہ جدید طرز کا بہت عمدہ شاعر تھا اور اس کے ساتھ ادب کا ایک اچھا نقاد بھی۔ اس نے اپنے معاصر ادیب ابراہیم عبدالقادر المازنی کے ساتھ مل کر اپنے زمانے کی پرانی شاعری پر کڑی تنقید کی۔ اس نے اگرچہ مسلم شخصیات کی سیرت پر بھی کتابیں لکھیں، لیکن اس نے سیاسی ادب لکھنے والوں میں کافی اہمیت حاصل کی۔ اس کے ساتھ اس نے سیاسی مقالات بھی بڑی تعداد میں لکھے۔ ایک زمانے میں مصر میں کوئی ایسا اخبار نہیں تھا جس میں عقاد کے مقالے نہ چھپتے ہوں۔ وہ پارلیمنٹ کا رکن بھی بنا، اور کئی ادبی کتابیں تصنیف کیں۔ عقاد ایک بسیار نویس اہل قلم تھا۔ اس کی کتابوں کی تعداد ساٹھ تک پہنچتی ہے۔ اتنا زیادہ لکھنے کے دو نقصان ہوتے ہیں ایک تو اس سے تحریر کا اعلیٰ معیار قائم نہیں رہ سکتا، اور دوسرے یہ کہ ساٹھ کتابوں کے مصنف کے بارے میں یہ فیصلہ کرنا مشکل ہو جاتا ہے کہ ادب وعلم کی دنیا میں اس کا اصل میدان کیا ہے۔ عقاد کے ساتھ بھی کچھ ہوا ہے۔

عقاد کی سیاست کسی خاص اصول یا نظریے پر مبنی نہیں تھی۔ اسے جہاں بھی فائدہ دکھائی دیتا وہاں شامل ہو جاتا اور اپنے قلم کی طاقت سے بہت فائدہ اٹھاتا۔

عقاد کی تصانیف کا احاطہ تو مشکل ہے، البتہ اس کی مشہور کتابوں میں مندرجہ ذیل کا نام لیا جا سکتا ہے: "دیوان العقاد" (شاعری) "کتاب الفصول الثلاثة" "ابن الرومی" "عبقریة محمد" "عبقریة الصدیق" "مجموع المقالات" "حیاۃ سعد" وغیرہ!

اوپر زیادہ تر مصر کے ادباء اور اہل قلم کا ذکر ہوا۔ لیکن بیسویں صدی میں صرف یہی لوگ ہی جدید



عربی ادب کے نمائندہ نہیں تھے، بلکہ ان کے علاوہ شام، لبنان اور عراق میں دوسرے کئی ادباء اور اصحاب قلم بھی رہے جنہوں نے عربی نثر میں قدماء کی فصاحت و بلاغت کے ساتھ ساتھ اس میں ایسی سلاست، شگفتگی اور تازگی پیدا کی کہ عربی نثر مغربی زبانوں کی نثر سے آنکھ ملانے لگی۔ ان ادیبوں اور انشا پردازوں میں امیر شکیب ارسلان، محمد کرد علی، عبدالقادر مغربی، ابن ناصر الدین، یعقوب صروف، محمد شکری الآلوسی وغیرہ شامل ہیں۔ امیر شکیب ارسلان نے ایک انگریز مصنف کی کتاب پر جو مفصل حواشی لکھے ان سے اس کی کتاب "حاضر العالم الاسلامی" مرتب ہو گئی، جو چار جلدوں میں بیسویں صدی کی ابتدائی دہائیوں کی اسلامی دنیا کے حالات کا ایک عمدہ اور بھرپور جائزہ ہے۔ اس کے علاوہ اس نے "الحلل السندسیة فی الاخبار والآثار الاندلسیة" کے عنوان سے اندلس کی تاریخ بھی لکھی۔ امیر شکیب ارسلان نے اپنی زندگی کا ایک بڑا حصہ جلا وطنی کی حالت میں سوئٹزر لینڈ میں گزارا، اور وہیں بیٹھ کر وہ اپنے مقالات لکھ لکھ کر عرب دنیا کو بھجواتا رہا۔ شکیب ارسلان کی نثر میں آبشار کی سی روانی ہے۔ اس نے اپنے خاص اسلوب سے جدید عربی نثر کو ایک ایسے اعلیٰ مقام پر پہنچا دیا کہ جس کی وجہ سے اسے بجا طور پر کاتب الشرق الاکبر (مشرق کے سب سے بڑے انشا پرداز) کا خطاب دیا گیا۔

## جدید عربی شاعری

جیسا کہ اوپر ذکر ہوا اٹھارہویں صدی میں جب عرب قوم ہر جگہ محکومی اور غلامی کے سائے منڈلانے لگے تو ان کی تخلیقی قوتیں مرجھا کے رہ گئیں اور ادب وشعر کی دنیا میں ہر طرف جمود چھا گیا۔ اس جمود کو توڑنے کے لئے قدرت نے فرانس کے نپولین بوناپارٹ کو بھیجا۔ اس نے آ کر مصر پر صرف سیاسی غلبہ ہی حاصل نہ کیا، بلکہ اس کے ساتھ اس کی علمی و تہذیبی زندگی میں بھی ایک حرکت اور سرگرمی پیدا کر دی۔ بڑی تعداد میں مدارس کھولے گئے، تعلیم و تعلم کا چرچا ہوا، یورپ کو وفد جانے لگے۔ یورپ سے وفد آنے لگے۔ علمی بیداری کی یہی وہ فضا تھی جس میں عربی زبان میں واضح طور پر شاعری کے ایک نئے دور کا آغاز ہوا، اور شعر وسخن کی روٹھی ہوئی دیوی ایک بار پھر عربوں کی طرف مائل بہ کرم ہوئی۔ عربی شاعری کے اس دور احیاء میں محمود سامی البارودی اسی مقام پر ہے جہاں قدیم عربی شاعری میں امرؤ القیس تھا۔ اس کے بعد مصر کے اسماعیل صبری، احمد شوقی اور حافظ ابراہیم، عراق کے جمیل صدقی الزہاوی اور معروف الرصافی اور شام کے خلیل مطران اس روایت کو آگے بڑھاتے ہیں۔ شوقی کے ہاں پہنچ کر عربی شاعری کو وہ آہنگ، وہ الہامی کیفیت اور وہ فنی معراج نصیب ہوتی ہے جو گویا متنبی (م ۹۶۵) پر ختم ہو کے رہ گئی تھی



Scanned with CamScanner

اور یہ کہنا بالکل صحیح ہے کہ متنبی سے لے کر شوقی تک درمیان کی ایک ہزار سالہ زمانی وسعت میں اس کی سی قامت کا شاعر کہیں دیکھنے میں نہیں آتا۔

یہاں کچھ اہم جدید شعراء کا تعارف کرانے سے پہلے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ جدید عربی شاعری پچھلے ڈیڑھ دو سو سال میں جن ارتقائی مراحل اور جن تبدیلیوں سے گزری ہے ان کا ایک سرسری سا خاکہ پیش کر دیا جائے' تاکہ مختلف وقتوں میں نمایاں ہونے والے شعراء کو ان مراحل سے منسوب کیا جا سکے۔

۱۔ شاعروں کا پہلا گروہ نو کلاسیکی شعرا کا ہے۔ اس میں وہ شعراء آتے ہیں جنہوں نے عربی زبان کی اس کلاسیکی شاعری کا احیاء کیا جو عباسی دور میں اوج کمال کو پہنچی ہوئی تھی اور اس میں اپنے زمانے اور اپنے حالات کے مطابق نئی چیزیں داخل کیں۔ اس گروہ میں مصر کے محمود سامی البارودی' احمد شوقی' حافظ ابراہیم اور عراق کے جمیل صدقی الزہاوی اور معروف الرصافی آتے ہیں۔

۲۔ دوسرا گروہ قبل رومانیوں (Pre-romantics) کا ہے۔ اس میں شاعر خلیل مطران آتا ہے جو پیدا تو لبنان میں ہوا تھا لیکن بعد میں مصر آ گیا تھا۔ پھر "دیوان گروپ" ہے جس میں عبدالرحمان شکری' ابراہیم عبدالقادر المازنی اور عباس محمود العقاد شامل ہیں۔ ان لوگوں نے اپنے آپ کو مدرسة التجدید (جدت پسند سکول) کہا اور اپنے سے پہلی نسل کی شاعری کو اپنی کتاب "الدیوان" میں تنقید کا نشانہ بنایا۔ یہ تینوں اصحاب شاعر بھی تھے اور اس کے ساتھ ساتھ انہوں نے نثر میں بھی بہت کچھ لکھا۔ اور مازنی اور عقاد کی شہرت تو زیادہ تر بطور نثر نگار کے ہوئی۔

۳۔ تیسرا گروہ رومانی شعرا (Romantics) کا ہے۔ ان میں احمد زکی ابوشادی اور اپالو گروپ کے شعراء علی محمود طہٰ' ابراہیم ناجی' ابوشبکہ اور ابوالقاسم الشابی شامل ہیں۔ یہ شعراء عقاد اور مازنی کے بجائے دراصل شامی مصری شاعر خلیل مطران کی ایک ارتقائی صورت تھے' اور خلیل مطران سے واضح طور پر متاثر تھے۔ چنانچہ خلیل نے ان کی شاعری پر تعارفی مضامین بھی لکھے تھے۔ ان شعراء کو اپالو گروپ کا نام اس لئے دیا گیا کہ ابوشادی نے ایک سوسائٹی اپالو کے نام سے قائم کی تھی جس کا وہ ایک طرح سے بانی تھا اور ناجی اس کا نائب صدر تھا۔ رومانیت کی روح جو مہجر کی شاعری میں محسوس کی جانے لگی تھی (مہجر کے شاعر وہ لوگ تھے جو عرب ممالک سے ہجرت کر کے امریکہ اور لاطینی امریکہ چلے گئے تھے) وہ ۱۹۳۰ء اور ۱۹۴۰ء کی دہائیوں میں اکثر عرب



ممالک میں تخلیق کی جانے والی شاعری میں نفوذ کرنے لگی تھی۔

۴۔ چوتھا گروہ مہجر کے شعراء کا تھا جو جیسا کہ اوپر ذکر ہوا لبنان و شام سے تعلق رکھنے والے ایسے لوگ تھے جو اپنے وطن میں اقتصادی اور معاشرتی حالات کی ناسازگاری سے دل برداشتہ ہو کر بیسویں صدی کے اوائل میں شمالی اور جنوبی امریکہ میں جا بسے تھے۔ اپنے حالات سے مجبور ہو کر یہ لوگ ہجرت تو کر گئے اور اپنے وطن سے بہت دور ایک اجنبی ماحول میں اجنبی لوگوں کے درمیان جا کر بس بھی گئے' لیکن وطن کی یاد ان کے دل سے کبھی نہ نکل سکی۔ اس زمانے میں لمبے سفر کا واحد ذریعہ سمندری سفر تھا۔ اس لئے یہ لوگ آسانی سے اپنے وطن کا پھیرا بھی نہیں لگا سکتے تھے۔ ان حالات میں انہوں نے ادبی سرگرمیوں کا سہارا لیا اور شاعری کرنے اور نثر لکھنے لگے۔ اس شاعری کی زیریں رو اپنے وطن کی یاد اور گھر کو لوٹنے کا جذبہ تھا۔ اس لئے انہوں نے نثر اور نظم میں جو کچھ بھی لکھا اس پر رومانیت غالب تھی۔ اس گروہ کے شعراء میں: جبران خلیل جبران (اگرچہ اس نے زیادہ کام نثر کی صورت میں کیا) میخائیل نعیمہ' ایلیا ابوماضی' رشید ایوب' الیاس فرحات اور رشید سلیم الخوری وغیرہ مشہور ہوئے۔

۵۔ رومانیت کا ردعمل: دو عالمی جنگوں کا درمیانی زمانہ رومانی شاعری کا زمانہ تھا۔ اس طرح کی شاعری کی دلچسپی کا مرکز فرد تھا' نہ کہ معاشرہ! اور معاشرے کے بارے میں اس شاعری کا رویا نظریاتی اور مثال سازی کے انداز کا تھا۔ لیکن جنگ عظیم دوم کے خاتمے پر عرب دنیا کے حالات میں اتنی عظیم اور ہمہ گیر تبدیلی رونما ہوئی کہ رومانی شاعری اپنی ساری خوبصورتی اور لذت آمیزی کے باوجود بے وقت کی راگنی محسوس ہونے لگی۔ جنگ کے بعد دو ایسے سانحے رونما ہوئے جنہوں نے عرب قوم کی ساری سائیکی کو ہلا کر رکھ دیا۔ ایک ۱۹۴۸ء کا المیہ فلسطین' جس نے عرب حکومتوں کی بنیادی سیاسی کمزوریوں اور بدعنوانیوں کو بے نقاب کر دیا' اور دوسرا ۱۹۵۲ء کا مصری انقلاب' جو دراصل فلسطینی جنگ میں عربوں کی شکست کا نتیجہ تھا۔ ان دونوں واقعات نے اس وقت کی شاعری کا موضوع' سوچنے کا انداز اور خود شاعری کی ہیئت کو بدل کر رکھ دیا۔ اب شاعری میں التزام (Commitment) کی بات ہونے لگی' اور اچھی اور بامعنی شاعری وہی سمجھی جانے لگی جو کسی نہ کسی مقصد کے ساتھ وابستہ (Committed) ہو' چاہے وہ مقصد عربی قومیت کو تقویت دینا ہو' یا روسی کیمونزم کی وکالت کرنا' یا اور کچھ نہیں تو ایک لادینی طرز کی آزاد خیالی کا پرچار! اس گروہ میں جن شعراء نے اپنے فن کے اعلیٰ معیار کی وجہ سے نام

پیدا کیا ان میں عبدالوہاب البیاتی، صلاح عبدالصبور، احمد عبدالمعطی حجازی، نازک الملائکہ، ایڈونس (علی احمد سعید) یوسف الخال، خلیل حاوی اور بدر شاکر السیاب نمایاں ہیں۔

پھر انہی ملتزم (Committed) شعراء میں فلسطین کے رہنے والے وہ شعراء آتے ہیں جو شعراء المقاومت (مزاحمت کے شعراء) کہلاتے ہیں۔ ان میں محمود درویش، سمیح القاسم اور توفیق زیاد ممتاز ہیں۔ خاص طور پر پہلے دو شعراء محمود درویش اور سمیح القاسم ارض فلسطین سے تعلق رکھنے اور وہاں سے نکالے جانے کی وجہ سے عرب قارئین میں کافی ہر دلعزیز ہوئے۔

جدید عربی شاعری کے سفر کے ان نشانات راہ کا خاکہ اس لئے پیش کیا گیا کہ جدید عرب شاعروں کو پڑھتے ہوئے قاری یہ جان سکے کہ وہ شاعری کے کس دور اور کس مرحلے سے تعلق رکھتے ہیں، اور اپنے زمانے میں ان کی اہمیت کیا رہی، اور انہوں نے شاعری میں اپنی طرف سے کیا حصہ ڈالا۔

اب ہم پیچھے چلتے ہیں اور جدید شاعری کے بعض اہم نمائندوں کا مختصر تعارف کراتے ہیں۔

## محمود سامی البارودی (م ۱۹۰۴ء)

ایک نقاد کا قول ہے کہ اگر امرؤ القیس کا کمال یہ تھا کہ اس نے جاہلی شاعری میں قصیدے کی ابتداء کی اور اس کے مضامین کا ایک خاص نہج قائم کیا، اور بشار کا کمال یہ تھا کہ اس نے شاعری کو ترقی دی اور اس کو نئے موضوعات سے آشنا کیا تو بارودی کو اس بات کا کریڈٹ جاتا ہے کہ اس نے عربی شاعری کے مردہ جسم میں روح دوڑائی اور اس کا رنگ روپ سنوارا۔

بارودی قاہرہ میں پیدا ہوا۔ اس نے عسکری مدرسے میں تعلیم پائی اور فوج میں ملازم ہو گیا اور اس میں ترقی کرتے کرتے میجر جنرل کے عہدے تک جا پہنچا۔ لیکن اس عسکری پیشے کے ساتھ ساتھ اس کو کم عمری ہی سے شاعری اور ادب پڑھنے کا بھی بہت شوق رہا۔ چنانچہ اپنے ادبی ذوق کی تسکین کے لئے اس نے عباسی دور کے ابن المعتز، ابوفراس ہمدانی، الشریف الرضی، طغرائی اور دوسرے قادر الکلام شعراء کو بہت پڑھا۔ اس مطالعے سے اس میں شاعری کا شوق پیدا ہوا اور اس کے لئے اس نے ان شعراء کے طرز کو سامنے رکھا اور انہی کے اسالیب کے مجموعی اثر سے اس نے اپنی شاعری کو بہت خوبصورت اور پرشوکت اسلوب عطا کیا۔ بارودی کی شاعری کو پڑھتے ہوئے لگتا ہے کہ انسان موثر عباسی دور کا کلام پڑھ رہا ہے۔ عرابی پاشا کی بغاوت میں بارودی کو بھی ملوث کیا گیا اور باقی لوگوں کے ساتھ اسے جلاوطن کر کے جزیرہ سراندیپ (سیلون) بھیج دیا گیا، جہاں اس نے سترہ برس گزارے۔ اس عرصے میں اس نے ایک تو



انگریزی زبان پڑھ لی، دوسرے کچھ نظمیں بھی کہہ ڈالیں۔ آخر خدیو عباس نے اس پر ترس کھاتے ہوئے اسے رہائی دے دی۔ واپس آ کر اس نے پانچ سال بڑھاپے کے امن و سکون میں گزارے۔ اس دوران میں کتابوں کا مطالعہ کیا، دوستوں سے گپ شپ کی اور کچھ مشق سخن بھی کی۔ آخر میں اس کی بینائی جاتی رہی اور وہ ۱۹۰۴ء میں انتقال کر گیا۔

بارودی کا کلام قدماء کی طرح بدیع کے تکلفات سے پاک ہے۔ اس کا اسلوب جمیل ہے، الفاظ فصیح ہیں اور مضامین عالی شان ہیں۔ اس کے کچھ اشعار کا نمونہ یہ ہے۔ جو ہجر کے موضوع پر ہیں۔

زدوا علیّ الصبی من عصری الخالی — وھل یعود سواد اللمة البالی

لم یدر من بات مسروراً بلذته — الی بنار الاسی من ھجرہ صالی

غبتم فاظلم یومی بعد فرقتکم — وساء صنع اللیالی بعد اجمال

(میرے گزرے ہوئے زمانے سے مجھے بچپن لوٹا دو، اور کیا اجڑے ہوئے بالوں کی سیاہی لوٹ کے آ سکتی ہے۔

جو اپنی لذتوں میں مسرور پڑا رہا ہے اسے یہ خبر بھی نہ ہوگی کہ میں اس کے فراق میں کیسے کیسے عذاب سے گزر رہا ہوں۔

آپ چلے گئے تو میرے دن بھی آپ کی جدائی کے بعد تاریک ہو گئے، اور زمانے کا سلوک بھی جو کبھی اچھا تھا، اب برا ہو گیا)

جلاوطنی سے واپس آنے کے بعد جب شاعر قصر جزیرہ سے گزرا تو اسماعیل کے عہد کو یاد کر کے اس نے کچھ اشعار کہے:

ھذہ الجزیرۃ فانظر ھل تری احداً — ینأی بہ الخوف او یدنو بہ الطمع

فلا مجیب یرد القول عن نبأ — ولا سمیع اذا ناديت یستمع

لو کان للمرء فکر فی عواقبه — ما شاب اخلاقه حرص ولا طمع

(یہ وہی جزیرہ ہے، دیکھو کہ اس میں اب بھی کوئی ہے جو خوف کی وجہ سے دور رہے یا کسی طمع میں قریب آ جائے۔

مگر اب کوئی جواب دینے والا نہیں ہے اور نہ کوئی ایسا ہے کہ تو اسے پکارے تو وہ تمہاری پکار سن لے۔

اگر انسان کو اپنے انجام کی فکر ہوتی تو اس کے اخلاق حرص اور طمع سے کبھی خراب نہ ہوتے)

## اسماعیل صبری (م ۱۹۲۳)

اسماعیل صبری مصر میں پیدا ہوا۔ اور مدارس میں تعلیم کے مختلف مرحلوں سے گزرنے کے بعد "مدرسة الادارة" تک جا پہنچا جو بعد میں قانون کی تعلیم کا مدرسہ بن گیا۔ وہ جب اٹھارہ سال کا ہوا تو ان دنوں طلبہ کا ایک رسالہ "روضة المدارس" شائع ہونے لگا' جس میں رفاعہ بک' شیخ حسین مرصفی (بارودی کے استاد) اور عبداللہ فکری جیسے اکابر ادباء لکھتے تھے۔ صبری اس رسالے کے مطالعے میں دلچسپی لیتا رہا اور جب وہ کچھ نظمیں کہنے کے قابل ہوا تو اس رسالے میں چھپنے بھی لگا۔ اس کے بعد وہ فرانس چلا گیا' جہاں اس نے اپنی قانون کی تعلیم مکمل کی۔ واپس آ کر اس نے محکمہ انصاف میں ملازمت اختیار کی۔ اور اس میں ترقی کرتے کرتے پہلے النائب العام (پبلک پراسیکیوٹر) کے عہدے تک پہنچا اور اس کے بعد وہ انتظامی شعبے میں منتقل ہو کر سکندریہ کا گورنر لگ گیا۔ پھر وہ محکمہ انصاف کا سیکرٹری تعینات ہوا اور ساٹھ برس کی عمر کو پہنچ کر اس سے ریٹائر ہو گیا۔

ملازمت سے فارغ ہونے کے بعد اسماعیل صبری گھر میں مقیم ہو گیا۔ جہاں وہ آنے والوں کے ساتھ ادب اور شاعری کے موضوع پر گفتگو کرتا' اور اپنے افکار و احساسات کو شعروں میں ڈھال کر ان کے سامنے پیش کرتا۔ رفتہ رفتہ اس کا گھر ادب و فن کا ایک مرکز بن گیا' جہاں شاعر لوگ آ کر اپنا کلام سناتے اور وہ اس پر ایک ناقد کی حیثیت سے اپنی رائے دیتا اور اس کی اصلاح اور تہذیب کرتا۔ اس سے لوگ اسے استاد ماننے لگے اور شعر و ادب میں اسے اولیت کا مقام دینے لگے۔ پھر وہ دل کے عارضے میں مبتلا ہو گیا' جس کا اس نے کچھ عرصہ مقابلہ کیا' اور آخر ۶۹ برس کی عمر میں اس بیماری میں انتقال کیا۔

اسماعیل صبری میں شعر کہنے کا ملکہ فطری تھا جس سے وہ جوانی میں ہی شعر کہنے لگ گیا۔ فرانس کی تعلیم نے اس کی صلاحیتوں اور اس کی فکر و احساس کو جلا بخشی۔ چنانچہ اس کا ملکہ شعری پختہ ہوا اور اس کی شاعری میں لطافت' حسن اور ایجاز کی اعلیٰ ترین خوبیاں پیدا ہو گئیں' اور وہ اپنے معاصر شعراء میں سب سے ممتاز نظر آنے لگا۔ اللہ نے اس کو ذوق سلیم اور موسیقی سے آشنا کان عطا کیے تھے۔ وہ اپنی شاعری کے معاملے میں خود بڑا ناقد تھا اور اس میں کافی رد و بدل اور اصلاح کرتا رہتا تھا' اور جب تک وہ پوری طرح اس کے ذوق سلیم کو مطمئن نہ کر دیتی وہ اسے لوگوں کے سامنے پیش نہ کرتا۔ بقول مطران اسماعیل صبری صرف اس وقت شعر کہتا جب کوئی واقعہ اس کے دل پر اثر کرتا۔ یا کوئی خبر اس کو سوچنے پر مجبور کرتی' یا وہ کوئی اچھی کتاب پڑھ لیتا اور وہ جو کچھ بھی کہنا چاہتا چند شعروں میں ہی کہہ دیتا۔

غزل کے موضوع پر اس نے ایک نظم کہی جس کے بارے میں لوگوں کا خیال ہے کہ وہ دراصل نی



کے بارے میں تھی۔ اس کے چند اشعار یوں ہیں:

| | |
|---|---|
| ان هذا الحسن كالماء الذى | فيه للانفس رى وشفاء |
| لاتذودى بعضنا من ورده | دون بعض و اعدلى بين الظماء |
| وابسمى' من كان هذا ثغره | يملأ الدنيا ابتساماً و ازدهاء |

(یہ حسن ایسا آب شیریں ہے جو روحوں کو سیراب کرتا اور انہیں شفا بخشتا ہے۔
اس پر وارد ہونے کے لئے ہم میں سے بعض کو نہ روکو' بلکہ سب پیاسوں کے درمیان انصاف کرو
اور مسکراؤ' اس لئے کہ جس کو خدا نے ایسا دہن دیا ہو وہ دنیا کو مسکراہٹوں اور فخر و ناز سے بھر دیتا ہے)

خدا کو مخاطب کر کے کہتا ہے:

| | |
|---|---|
| يا عالم الاسرار حسبى محنة | علمى بانك عالم الاسرار |
| اخلق برحمتك التى تسع الورى | الا تضيق باعظم الاوزار |

(اے رازوں کے جاننے والے میرے لیے یہ جاننا ہی بڑی آزمائش ہے کہ تو سب رازوں کا جاننے والا ہے
تمہاری رحمت جو پوری کائنات پر پھیلی ہوئی ہے اس سے یہی امید ہے کہ اس کا دامن بڑے گناہوں پر بھی پردہ ڈال دے گا)

## احمد شوقی (م ۱۹۳۲)

اپنے عہد کا مشہور ترین شاعر' جس کی شاعری بہت عمدہ خیال اور زرخیز فکر کا مرقع تھی۔ شعراء کا رہنما اور ان کا امیر' اور نئی ادبی بیداری کا امام اور قائد..... اس نے صغر سنی ہی سے شعر کہنے شروع کیے اور اس میں مہارت پیدا کر لی۔ اس نے شاعری کے تمام پہلوؤں اور موضوعات میں اپنے فن کے اعلیٰ نمونے پیش کئے۔ اس نے ہر مقصد کی خاطر شاعری کی اور اس میں کمال کا اظہار کیا۔ آخر میں اپنی شاعری میں کچھ ایسی نئی چیزیں داخل کیں' جن سے عربی شاعری آشنا نہیں تھی۔ مثلاً اس نے رزمیہ شاعری (Epic) میں "دول العرب" اور "وادی النیل" جیسی طویل نظمیں پیش کیں۔ پھر وہ تمثیلی شاعری کی طرف آیا اور اس میں مصرع کلیوبطرہ' مجنون لیلیٰ' قمبیز' علی الکبیر' عنترہ' اور الست هدی جیسے ڈرامے پیش کئے اور اس

تجدید کے ساتھ وہ گویا مکمل عربی شاعر بن گیا۔ شاعری میں یہ جدتیں نہ اس سے پہلے کسی شاعر نے کی تھیں اور نہ اس کے بعد آنے والے شعراء اس معیار پر پورا اتر سکے۔ اس کے معاصر شعراء نے اس کی اس سبقت اور بلند مرتبے کا اعتراف کیا اور دور دور کے ممالک سے چل کر اس کے پاس آئے۔ اس کی تکریم کی اور اس کے ہاتھ پر بیعت کی۔ اس موقع پر ایک بڑے جلسے میں اس کے دوست اور دست راست حافظ ابراہیم نے کہا:

امیر القوافی قد اتیت مبایعاً　　　وهذی وفود الشرق قد بایعت معی

(اے قوافی کے بادشاہ میں تمہارے ہاتھ پر بیعت کرنے آیا ہوں اور بلادِ مشرق کے یہ سارے وفد بھی میرے ساتھ بیعت میں شامل ہیں)

احمد شوقی قاہرہ میں پیدا ہوا اور وہیں پلا بڑھا۔ اس کے والد نے اپنی آبائی جائیداد ضائع کر دی تو شوقی کو اس کی نانی نے پالا' جو خدیو اسماعیل کے محل میں خاص خادمہ تھی۔ ابتدائی تعلیم کے بعد اس نے دو سال مدرسۃ الحقوق (قانون کے مدرسے) میں گزارے۔ پھر خدیو توفیق نے اسے قانون اور ادب کی تعلیم کے لئے فرانس بھیج دیا' جہاں دو سال اس نے منبلیہ اور دو سال پیرس میں تعلیم حاصل کی۔ واپس آ کر اس نے خدیو کی مصاحبت اختیار کر لی۔ پہلی جنگ عظیم میں انگریزوں نے خدیو کو مصر کی حکومت سے معزول کر دیا تو شوقی سے بھی ملک چھوڑنے کے لئے کہا گیا۔ اس نے سپین میں بارسلونا کو اپنے اور اپنے اہل و عیال کے قیام کے لئے منتخب کیا۔ امن قائم ہونے پر وہ مصر واپس آ گیا۔ اب اس نے بجائے محلات سے تعلق رکھنے اور ان کے لئے شعر کہنے کے' عوام کی طرف توجہ کی اور اپنی شاعری اور نغموں سے ان کے شعور کی ترجمانی کی' ان کے تاریخی کارناموں کو سراہا اور ان کی جدوجہد کی تائید کی۔ اس سے نہ صرف مصر بلکہ پوری دنیائے عرب نے اس کی شاعری اور اس کے عظیم مقاصد کا خیر مقدم کیا۔ چنانچہ اس کے اعزاز میں مصر کے شاہی اوپیرا میں بہت بڑا جلسہ منعقد ہوا جس میں مصر اور باہر کے عرب ملکوں سے وفود آ کر اس میں شامل ہوئے۔ شوقی اسی طرح شاعری میں وحی و الہام سے سرفراز ہوتا رہا۔ تا آنکہ ۱۹۳۲ء میں اسے موت کا پیغام آ گیا۔

شاعری: معانی' اسلوب اور ہیئت' شاعری کے ان بنیادی ارکان میں سے ہر ایک میں شوقی نے ایسے تجربے کیے جن کی مثال اس سے پہلے کی شاعری میں نہیں ملتی۔ جس زمانے میں اقبال سرزمین اندلس کے ایک مقام پر گزرا ماضی کے تصور میں کھو گیا تھا۔

آبِ روانِ کبیر! تیرے کنارے کوئی　　　دیکھ رہا ہے کسی اور زمانے کا خواب



تقریباً اسی زمانے میں شوقی دمشق کی تازہ تباہی کو دیکھ کر کہہ رہا تھا:

بالامس کنت علی الزهراء اندبهم　　　والیوم دمعی علی الفیحاء هتان

(کل میں اندلس کے قصر زہرا میں گزرا اسلاف کا نوحہ کرتا تھا اور آج میری آنکھیں دمشق کی زبوں حالی پر اشک بار ہیں)

عربی شاعری میں مدح اور قصیدہ گوئی اس سے پہلے سلاطین و امراء کے لئے خاص ہوتی تھی' اور مرثیے اور نوحے بھی افراد و شخصیات کے لئے کہے جاتے تھے۔ لیکن یہ شہر آشوب اور قوموں اور رہنماؤں کے نوحے اور قصیدے اس قومی و وطنی شاعری کا عنصر بنے جسے شوقی اور اس کے معاصرین نے آ کر رواج دیا۔ اپنے اسی قصیدے کے مقطع میں شاعر کہتا ہے:

والشعر مالم یکن ذکری و عاطفة　　　او حکمة' فهو تقطیع و اوزان

(شاعری میں جب تک یاد ماضی نہ ہو' جذبہ اور تڑپ نہ ہو' حکمت و دانائی کی باتیں نہ ہوں تو وہ شاعری کیا ہوئی۔ ایک عروضی مشق کی صورت رہ گئی)

یہ تین چیزیں' یعنی یاد ایام' جوش جذبات اور حوادث زمانہ سے عبرت پذیری گویا اس قومی و وطنی شاعری کے اجزائے ترکیبی ٹھہرے جس کا سرخیل شوقی تھا۔

شوقی اپنے پہلے دور میں مصری قومیت کا شاعر تھا۔ لیکن اپنی شاعری کے دوسرے دور میں۔ یعنی یورپ کی جلاوطنی سے واپس آ کر وہ اس مقامیت سے بلند ہو کر شرق اوسط کا شاعر بن جاتا ہے' اور اہل مشرق کے پرشوکت ماضی اور ان کے عظیم اسلاف کے گن گا گا کر انہیں اس بات پر ابھارتا ہے کہ وہ مغرب کے مقابلے میں اپنے آپ کو ہیچ نہ جانیں' بلکہ اٹھ کر آزادی اور ترقی کی راہ میں دوسری قوموں کے ہم قدم چلنے کی کوشش کریں۔ مشرق کا اتحاد اور مشرقیت' یہ شوقی کا نعرہ تھا' اگرچہ اس کے شاعرانہ مجلس کے تذکرے میں "مغرب" کا لفظ کھوستا سا لگتا ہے۔ اپنے ایک قصیدے میں وہ شامیوں سے خطاب کرتے ہوئے کہتا ہے۔

نصحت و نحن مختلفون داراً　　　ولکن کلنا فی الهم شرق

(میں نے یہ خیر خواہی کی باتیں کی ہیں' دواں حالے کہ ہمارے وطن ایک نہیں ہیں' لیکن ہم سب اپنے دکھ درد میں مشرقی تو ہیں)

غور کیجئے تو یہ ایک محدود دائرے میں وہی احساس ہے جو آج کی افریشیائی تحریک کے پیچھے کارفرما نظر آتا ہے۔

عربی شاعری کے موضوع اور ہیئت کے باب میں شوقی کے تجربے اس سے بھی زیادہ اہم ہیں۔ اس نے اپنے تخلیقی سرمائے سے عربی شاعری کے اس بڑے نقص کی تلافی کی جو اس میں شاعری کی دو اہم اصناف یعنی رزمیہ نظم اور منظوم تمثیل کے نہ ہونے کی وجہ سے پایا جاتا تھا۔ دنیا کی ہر بڑی اور مکمل شاعری میں ان دونوں اصناف کے اچھے نمونے ضرور دیکھنے میں آتے ہیں۔ لیکن شوقی سے پہلے عربی شاعری ان دونوں اصناف سے بالکل تہی دامن تھی۔ جیسا کہ اوپر ذکر ہوا شوقی نے آ کر "وادی النیل" اور "دول العرب" جیسی طویل نظمیں کہیں۔ ان میں سے اول الذکر کے اندر وہ مصر میں عہد فراعنہ سے لے کر اپنے زمانے تک کے بڑے بڑے واقعات کو منظوم داستان کی ایک لڑی میں پروتا چلا جاتا ہے اور عربی میں ہر لحاظ سے ایک کامیاب شاہ نامہ (Epic) پیش کرتا ہے۔ اسی طرح منظوم ڈرامے میں بھی شوقی نے متعدد فن پارے عربی زبان کو دیے۔ "قلوپطرہ کا زوال" "مجنون لیلیٰ" "علی الکبیر" اور "عنترہ" اس سلسلے کے کچھ مقبول نام ہیں۔

شاعری کے کچھ نمونے: اپنی ایک نظم میں شوقی دمشق کا وصف بیان کرتے ہوئے کہتا ہے۔

| | |
|---|---|
| آمنت باللہ و استثنیت جنتہ | دمشق روح و جنات و ریحان |
| قال الرفاق و قد ہبت خمائلہا | الارض دار لہا (الفیحاء) بستان |
| جری و صفق یلقانا بہا (بردی) | کما تلقاک دون الخلد رضوان |
| دخلتہا و حواشیہا زمردۃ | والشمس فوق لجین الماء عقیان |
| والحور فی (دمر) او حول (ہامتہا) | حور کواشف عن ساق وولدان |
| و (ربوۃ) الواد فی جلباب راقصۃ | الساق کاسیۃ والنحر عریان |

(میں اللہ پر ایمان لایا ہوں اور اس کی جنت کو مستثنیٰ کر کے کہتا ہوں کہ دمشق نسیم کا جھونکا ہے'
باغات ہیں اور معطر سبزہ ہے۔
جب اس کے گھنے باغ لہرا کر سامنے آئے تو ساتھیوں نے کہا یوں سمجھو کہ زمین ایک حویلی ہے۔
جس میں فیحاء (دمشق) ایک گلستان ہے۔
اس میں بردی کی نہر جاری تھی جس سے ہمارا اس طرح سامنا ہوا جیسے تم خلد میں داخل ہونے سے پہلے رضوان سے ملو۔
میں اس میں داخل ہوا تو دیکھا کہ اس کے اطراف زمرد کی طرح سبز ہیں اور سورج پانی کی چاندی کے اوپر سونے کی طرح دمکتا ہے۔ اور اس کے مضافات دمر اور ہامہ میں سرو کے درخت یوں کھڑے ہیں جیسے پنڈلیاں ننگی کیے جنت کی حوریں ہوں اور غلمان ہوں۔



اور وادی کا مقام ربوہ ایک رقاصہ کا لباس پہنے ہوئے لگتا ہے جس کی پنڈلی تو ڈھکی ہوئی ہے لیکن سینہ ننگا ہے)

غزل کے موضوع پر شوقی کہتا ہے۔

| | |
|---|---|
| اللہ فی الخلق من صب ومن عانی | تفنی القلوب و یبقی قلبک الجانی |
| صونی جمالک عنا إنا بشر | من التراب' وھذا الحسن روحانی |
| او فابتغی فلکاً تاویہ ملکا | لم یتخذ شرکاً فی العالم الفانی |
| اذا تبسم ابدی الکون زینتہ | وان تنفس ابدی طیب ریحان |

(مخلوق خدا میں جو عاشق اور مجبور ہیں ان کے بارے میں خدا سے ڈرو۔ ان کے دل تو فنا ہو جاتے ہیں اور تمہارا ظالم دل باقی رہتا ہے۔
اپنے حسن کو ہم سے بچا کے رکھو کہ ہم مٹی سے بنے ہوئے انسان ہیں۔ جبکہ تمہارا یہ حسن سراسر روحانی ہے۔
یا پھر کسی فلک میں پہنچ کر ایسے فرشتے کی طرح رہو' جو اس عالم فانی میں کسی طرح کے پھندے میں نہیں الجھا۔
وہ جب ہنستا ہے تو یہ کائنات اس کے حسن کا اظہار بن جاتی ہے اور جب وہ سانس لیتا ہے تو دنیا پھولوں کی مہک سے بھر جاتی ہے)

شوقی کے بعض اشعار جو ضرب المثل کی طرح مشہور ہو گئے:

| | |
|---|---|
| وانما الامم الاخلاق ما بقیت | فان ھم ذھبت اخلاقھم ذھبوا |

(قومیں اپنے اخلاق کی بدولت ہی زندہ رہتی ہیں۔ جب ان کے اخلاق نہ رہیں تو وہ بھی مٹ جاتی ہیں)

| | |
|---|---|
| واذا اصیب القوم فی اخلاقھم | فاقم علیھم ماتماً وعویلا |

(کسی قوم کے اخلاق ہی بگڑ جائیں تو پھر اس کے لئے ماتم اور گریہ و زاری کا اہتمام کرو)

| | |
|---|---|
| اعلمت اشرف او اجل من الذی | یبنی وینشی انفساً و عقولا |
| قم للمعلم وفہ التبجیلا | کاد المعلم ان یکون رسولا |

(کیا تم نے ایک ایسے شخص سے زیادہ عزت و شرف والا انسان دیکھا ہے جو انسانی نفوس اور ذہنوں کی تعمیر کرتا اور انہیں پروان چڑھاتا ہے۔

استاد آ جائے تو اٹھ کر اس کی تعظیم بجا لاؤ۔ اس لئے کہ استاد کا مرتبہ رسول کے قریب جا پہنچتا ہے۔)

## حافظ ابراہیم (م ۱۹۳۲)

حافظ ابراہیم ان پانچ بڑے شعراء میں سے ہے جن کے ہاتھوں عربی شاعری کا احیاء اور تجدید عمل میں آئی۔ دوسرے شاعر بارودی' شوقی' صبری اور خلیل مطران تھے۔ وہ مصر میں اسیوط کے علاقے میں پیدا ہوا۔ ابھی دو سال کا تھا کہ والد کا سایہ اس کے سر سے اٹھ گیا۔ اس کی ماں اسے قاہرہ لے آئی۔ یہاں اسکے ماموں نے اس کی کفالت کی' اور وہ نچلے درجے کے مختلف مدارس میں تعلیم پاتا رہا۔ اس کا ماموں پھر اسے طنطا لے گیا جہاں ابراہیم نے کچھ سال بے کاری میں گزارے۔ اس زمانے میں وہ صرف مطالعہ کرتا رہتا یا شاعری سے دل بہلاتا۔ حافظ ابراہیم کے ذہن پر یتیمی اور مایوسی کا جو اثر شروع دن سے پڑا وہ کبھی زائل نہ ہوا۔ چنانچہ وہ زندگی سے بیزار رہنے لگا اور لوگوں کے ساتھ میل جول میں اسے کوئی دلچسپی نہ رہی۔ وہ اپنی تقدیر کا شکوہ کرتا اور ان دنوں وہ جو شعر بھی کہتا وہ اس کی اس نفسی کیفیت کا ترجمان ہوتا۔ آگے چل کر اسے عسکری مدرسے میں داخل ہونے کا موقع ملا۔ اس میں تعلیم پا کر وہ فوج کا سپاہی بن گیا۔ فوج سے وہ پولیس کے محکمے میں منتقل ہوا۔ اور ایک دفعہ پھر فوج میں چلا گیا' جہاں اس کی ڈیوٹی سوڈان میں لگی۔ سوڈان پر مصر نے لارڈ کچنر کی قیادت میں حملہ کیا تھا۔ حافظ ابراہیم کافی عرصہ سوڈان میں سخت بیزاری کی حالت میں رہا اور مصر واپس آنے کی کوشش کرتا رہا۔ جب وہ اس میں ناکام ہوا تو دوسرے فوجیوں کے ساتھ وہ بھی بغاوت میں شریک ہو گیا۔ جس کی وجہ سے اس پر مقدمہ چلا اور پہلے تو اس کی تنخواہ آدھی کر دی گئی اور اس کے بعد اسے پنشن پر بھیج دیا گیا۔

واپس آ کر حافظ کی زندگی ایک بے معنی انداز میں گزرنے لگی۔ دن کو وہ ایک قہوہ خانے سے اٹھ کر دوسرے قہوہ خانے میں جا بیٹھتا اور راتوں کو مختلف مجالس میں شریک ہوتا رہتا۔ اسی زمانے میں وہ شیخ محمد عبدہ کی مجلس ارشاد میں بھی جانے لگا۔ اس حلقے کے لوگ چونکہ ان دنوں انگریزوں سے کچھ امیدیں وابستہ کرنے لگے تھے' حافظ ابراہیم نے ملکہ وکٹوریہ کا مرثیہ کہا اور ایک نظم ایڈورڈ ہفتم کی تاجپوشی پر اور ایک لارڈ کرومر کو الوداع کہنے کے لئے کہی۔ لیکن اس کے بعد اس نے اپنی شاعری کو قوم کے لئے وقف کر دیا۔ شیخ محمد عبدہ کے قرب اور اس کے اثر و رسوخ سے اسے یہ فائدہ ہوا کہ حشمت پاشا وزیر تعلیم نے اسے مصری لائبریری کے ادبی حصے کا سربراہ مقرر کر دیا۔ پھر وہ اس لائبریری کا ڈائریکٹر تعینات ہوا اور اس



عہدے پر رہ کر ۱۹۳۲ء میں ریٹائر ہوا اور اسی سال فوت بھی ہو گیا۔

**شاعری:** حافظ ابراہیم اپنے زمانے میں اول درجے کا شاعر مانا جاتا تھا۔ وہ بات کا سچا اور خیر اندیش انسان تھا۔ اس کی شاعری فصیح الفاظ' پرشکوہ عبارت' محکم بندش' خوبصورت اور درخشاں طرز عمل اور مضبوط قوافی کا ایک عمدہ امتزاج تھی۔ شاعری کے لئے حافظ کے کان بہت حساس تھے اور وہ خوبصورت شاعری کا بہت اعلی ذوق رکھتا تھا۔ اسے عربی ادب کے سب پچھلے زمانوں کے اسے منتخب اور بہترین اشعار یاد تھے کہ اس میں کوئی بھی اس کے ساتھ شانہ ملا کے کھڑا نہیں ہو سکتا تھا۔ وہ ان شعراء میں سے تھا جو شعری رونق اور الفاظ کے حسن کو سب سے زیادہ اہمیت دیتے ہیں اور معانی و مضامین کی اہمیت ان کے نزدیک ثانوی ہوتی ہے۔ چنانچہ حافظ اپنے شعروں کے الفاظ کی تراش خراش اور محاورہ اور بندش کی چستی پر زیادہ توجہ دیتا تھا اور جب وہ شعر کہنے کا ارادہ کرتا تو ان آراء و افکار کی طرف متوجہ ہوتا جو اس وقت لوگوں کے ذہنوں پر چھائے ہوئے ہوتے' یا معاشرے میں گردش کر رہے ہوتے' یا اخبارات کے کالموں کا موضوع ہوتے۔ وہ ان پر کچھ عرصہ اپنے انداز میں سوچ بچار کرتا رہتا' اور پھر اپنے خوبصورت اور چست شعری اسلوب میں ڈھال کر دنیا کے سامنے لے آتا۔ چنانچہ سیاسی اور معاشرتی حالات' زندگی کے مختلف مظاہر' قدیم قسم کی روایات و رسومات حافظ ابراہیم کی شاعری کا غالب موضوع بنی رہیں۔ حافظ کا دیوان تین جلدوں میں شائع ہوا۔ اس کے علاوہ اس نے کچھ نثری کتابیں بھی لکھیں۔ لیکن ان کی زیادہ اہمیت نہیں ہے۔

**نمونہ کلام:** عربی زبان شکوہ کناں ہے کہ اسے اپنے لوگوں نے جائز مقام نہیں دیا۔ حافظ اس کی زبان سے کہتا ہے۔

رجعت لنفسی فاتہمت حصاتی ... ونادیت قومی فاحتسبت حیاتی

رمونی بعقم الشباب ولیتنی ... علمت فلم اجزع لقول عداتی

ولدت و لما لم اجد لعرائسی ... رجالاً واکفاء وأدت بناتی

وسعت کتاب اللہ لفظا و غایة ... وما ضقت عن آی بہ وعظات

فکیف اضیق الیوم عن وصف آلة ... وتنسیق اسماء لمخترعات

اری لرجال الغرب عزا ومنعة ... وکم عز اقوام بعز لغات

اتوا اهلهم بالمعجزات تفننا ... فیا لیتکم تاتون بالکلمات

(میں نے اپنے آپ کی طرف رجوع کیا اور اپنی عقل پر تہمت لگائی۔ میں نے اپنی قوم کو پکارا اور ساتھ ہی اپنی زندگی کا حساب لیا

انہوں نے مجھے بے ثمر جوانی کا طعنہ دیا۔ کاش میں واقعی بانجھ اور بے ثمر ہوتی اور اپنے دشمنوں کی بات سن کر پریشان نہ ہوتی۔

میں نے بیٹیاں جنیں اور جب دیکھا کہ میری ان دلہنوں کے لئے موزوں بر نہیں ملتے تو میں نے انہیں دفن کر دیا۔

میں نے کتاب اللہ کے الفاظ اور مقاصد کو اپنے دامن میں لیا' اور اس کی آیات اور نصائح کے لئے میرا دامن کبھی تنگ نہ ہوا۔

تو آج میں کیسے کسی آلے کے وصف سے' یا نئی ایجادات کے نام مرتب کرنے میں پیچھے رہ سکتی ہوں۔

میں اہل مغرب میں عزت اور طاقت دیکھتی ہوں۔ اپنی زبان کو عزت بخش کر قومیں کیسے خود بھی باعزت ہو جاتی ہیں۔

وہ تو اپنے لوگوں کے لئے کوئی معجزات لے کے آئے' کاش آپ لوگ الفاظ ہی بنا پاتے)

ایک اور نظم میں حافظ عورتوں کے موضوع پر کہتا ہے:

من لی بتربیة النساء فانها — فی الشرق علة ذلک الاخفاق
الام مدرسة اذا اعددتها — اعددت شعبا طیب الاعراق
انالا اقول دعوا النساء سوافرا — بین الرجال یجلن فی الاسواق
یدرجن حیث اردن لا من وازع — یحذرن رقبته ولا من واق
کلا ولا ادعوکم ان تسرفوا — فی الحجب و التضییق والا رهاق
فتوسطوا بین الحالتین وانصفوا — فالشر فی التقیید و الاطلاق
ربوا البنات علی الفضیلة انها — فی الموقفین لهن خیر وثاق

(کون ہے جو عورتوں کی تربیت کا ذمہ لے اس لئے کہ عورت ہی مشرق میں ساری ناکامی کا سبب ہے۔

ماں ایک درسگاہ ہوتی ہے۔ اگر تم اسے تیار کر لو تو تم ایک ایسی نسل تیار کر لو گے جس کی اصل صحیح اور پاکیزہ ہوگی۔

میں نہیں کہتا کہ عورتوں کو مردوں کے درمیان بے پردہ چھوڑ دو کہ وہ بازاروں میں گھومتی پھریں۔

جہاں بھی چاہیں پہنچ جائیں' نہ کسی کی نگرانی کا ان کو ڈر ہو اور نہ کسی حفاظت کرنے والے کا خیال۔

بالکل نہیں' لیکن میں آپ سے یہ بھی نہیں کہتا کہ آپ اس کے پردے میں اسراف سے کام لیں



اور زندگی اس کے لئے تنگ اور مشکل بنا دیں۔

پس آپ ان دونوں حالتوں کے بین بین رہیں اور انصاف سے کام لیں' اس لئے کہ ساری خرابی بالکل قید کر کے رکھنے اور بالکل کھلا چھوڑ دینے میں ہے۔

بیٹیوں کو نیکی کی تربیت دیں کہ یہ ان کے لئے دونوں حالتوں میں ایک اچھی روک ثابت ہوگی۔)

## جمیل صدقی الزہاوی (م ۱۹۳۶)

## علم کا شاعر

عراق کے دو بڑے اور اہم شاعروں میں سے ایک' دوسرا شاعر معروف الرصافی تھا۔ ان دونوں کا لوگ اسی طرح مقابلہ وموازنہ کرتے تھے جس طرح مصر میں احمد شوقی اور حافظ ابراہیم کا کرتے تھے۔

یہ عراق کے کرد خاندان سے تھا۔ اس کے والد اور بڑے بھائی دینی علوم اور فقہ اور قضاء سے متعلق تھے۔ انہوں نے چاہا کہ زہاوی بھی انہی کی طرح ان علوم سے سروکار رکھے اور عربی ادب اور شاعری کی طرف نہ جائے۔ لیکن زہاوی نے شاعری اور فلسفے سے شغف رکھا اور زندگی میں ان لوگوں سے مختلف راستہ نکالا۔ اس نے جدید طرز کی تعلیم تو حاصل نہ کی لیکن ترکی اور عربی زبانوں میں ترجموں کی وساطت سے اسے آزاد خیالی اور جدید سائنسی طرز فکر سے خاصی دلچسپی پیدا ہو گئی' جو ساری عمر اس کے ساتھ رہی۔ زہاوی اگرچہ کوئی یورپی زبان نہیں جانتا تھا' لیکن اس نے ترکی اور فارسی زبانوں میں مہارت حاصل کی تھی اور اس سے کام لے کر اس نے عمر خیام کی رباعیات کا عربی میں ترجمہ کیا۔

زہاوی نے عام شعراء کی طرح اپنی زندگی بے کاری میں نہ گزاری' بلکہ وہ ہمیشہ کچھ اہم امور سرانجام دیتا رہا۔ شروع میں بغداد کی تعلیمی کمیٹی کا رکن مقرر ہوا' پھر اسے سرکاری چھاپے خانے کا منتظم بنایا گیا۔ اس کے بعد وہ ایک سرکاری رسالے کو ایڈٹ کرنے پر مامور ہوا۔ آگے چل کر وہ کورٹ آف اپیل کا رکن منتخب ہوا۔ زہاوی کی شہرت کا سن کر ترک خلیفہ نے اسے آستانہ بلا بھیجا۔ لیکن اس کے تنقیدی رویے نے اسے زیادہ دیر وہاں نہ ٹکنے دیا۔ پھر جب عثمانی دستور کا اعلان ہوا تو پہلے تو وہ سرکاری ادارے میں اسلامی فلسفے کا مدرس مقرر ہوا۔ پھر دارالفنون میں عربی ادبیات کا مدرس تعینات ہوا۔ جب وہ بغداد واپس آیا تو قانون کے مدرسے میں اسے شریعت کا استاد لگایا گیا۔ اور آخر میں وہ عراق کی پارلیمنٹ کا ایک رکن منتخب ہوا۔ ان مختلف مناصب پر رہنے اور مختلف نوعیت کے فرائض انجام دینے کے باوجود زہاوی نے شاعری اور



Scanned with CamScanner

مطالعے کے ساتھ اپنے شغف میں کوئی کمی نہ آنے دی۔ اس کے زمانے میں سیاسی تبدیلیاں ہوتی رہیں۔ پہلی جنگ عظیم میں ترکوں کو شکست ہوئی اور عراق میں فیصل کی بادشاہت قائم ہوئی۔ تاہم زہاوی اور اس کی طرح کے سوچنے، سمجھنے اور شاعری کرنے والے لوگ ان سیاسی ہنگاموں سے الگ تھلگ رہے۔ کچھ عرصے کے لئے شاہ فیصل اول نے اسے مجلس اعیان کا ممبر مقرر کیا، لیکن اپنی شاعری کے جرات مندانہ لہجے اور اپنی رائے کے کھلے اظہار کے باعث وہ زیادہ عرصہ وہاں نہ رہ سکا۔ جس کا اسے بعد میں افسوس رہا۔ اور وہ ۱۹۳۶ء میں بغداد میں فوت ہو گیا۔

جمیل صدقی الزہاوی کی ایک بڑی خصوصیت یہ ہے کہ اس نے اپنی شاعری کو تعلیم کا ذریعہ بنایا۔ اس نے اپنی جوانی میں علوم طبعیہ اور فلسفے کا جو مطالعہ کیا تھا، اپنی تیز ذہانت کے طفیل وہ ان علوم کی گہرائی میں اترا، اور وہاں اسے جو کچھ حاصل ہوا اس پر اس نے کتابیں لکھیں، اور یہی نہیں بلکہ ان علوم کو اپنی شاعری کا موضوع بھی بنایا۔ چنانچہ اس نے دو کتابیں "الکائنات" اور "تعلیل الجاذبیۃ" کے نام سے لکھیں۔ اس طرح اس کے ہاں شاعری صرف جذبہ و احساس کا اظہار نہ رہی، بلکہ یہ جدید فکر اور اس کی علمی معلومات کا اظہار بھی بن گئی۔ اپنی نظم "مساحۃ العقل" میں وہ زمین، سورج اور کائنات کے اس نظام کے بارے میں خالص سائنسی انداز میں بات کرتا ہے:

لا تـقـبل الاجـرام عـداً　　　كـلا ولا الابـعـاد حـداً
الـعـقـل يـرجـع خـائـبـاً　　　عـنـهـا وان لـم يـال جـهـداً

(اجرام فلکی کا احصاء ممکن نہیں ہے اور نہ ان کے درمیان فاصلوں کی کوئی حد ہے
عقل جب ان کے بارے میں سوچتی ہے تو نامراد لوٹتی ہے۔ اگرچہ وہ اپنی اس کوشش میں کوئی کمی نہیں کرتی)

زمین کی گردش کے بارے میں کہتا ہے:

فـتـطـوف مـثـل فـراشـة　　　لاقـت بـجـنـح الـلـيـل وقـداً
و يـدور محـورهـا تـوجـه　　　نـحـو نـور الـشـمـس خـداً
لـولا دلـيـل الـجـذب مـا　　　مـلـكـت بـهـذا السـعـي رشـداً

(پس زمین ایک پتنگے کی طرح طواف کرتی ہے جس نے رات کے ایک حصے میں آگ پالی ہو۔
اور اپنے محور کے گرد گھومتی ہے، اپنا چہرہ سورج کی روشنی کی طرف رکھتے ہوئے۔
اگر کشش ثقل کی رہنمائی نہ ہوتی تو اپنی اس حرکت میں وہ سیدھی راہ نہ پا سکتی)



اسی طرح اپنی ایک اور نظم "سلیل القرد" (بندر کی اولاد) میں وہ ڈاروِن کے نظریہ ارتقا کی بات کرتا ہے۔ جس کے بارے میں اس کا خیال تھا کہ یہ بدیہیات میں شامل ہو چکا ہے۔ اس لئے اس پر بحث کرنا بے سود ہے۔ کہتا ہے:

عاش في الغاب القرد دهرا طويلا　　　قبل ان يلتقى للرقي سبيلا
ولـد الـقـرد قبل مليون عام　　　بشـراً فـارتقى قليلا قليلا
اي شيء الـم بـالقرد حتى　　　هجر الغاب نجله والقبيلا
انـه لولا العقل كان ضعيفا　　　وعـلـيـه الحياة عبئاً ثقيلا
وعلى رجليه مشى بعدان سار　　　عـلـى اربـع زمـنـا طـويلا

(جنگل میں بندر ایک طویل عرصے تک رہا۔ پیشتر اس سے کہ اسے ترقی کا راستہ ملتا
بندر دس لاکھ سال پہلے پیدا ہوا۔ ایک انسان کی صورت میں اور آہستہ آہستہ ترقی کرتا رہا
کس چیز نے بندر کو مجبور کیا کہ وہ جنگل کو چھوڑ دے اور اپنی اولاد اور قبیلے سے دور ہو جائے؟
اگر عقل نہ ہوتی تو وہ کمزور ہوتا اور زندگی اس کے لئے ایک بھاری بوجھ ہوتی
آخر وہ دو ٹانگوں پر چلنے لگا، بعد اس کے کہ وہ ایک طویل زمانہ چار ٹانگوں پر چلتا رہا تھا)

زہاوی کا سب سے بڑا کام اس کی طویل نظم "ثورۃ فی الجحیم" ہے، جسے وہ خود بھی اپنی بہترین تخلیق قرار دیتا تھا اور اس کے زمانے کے دوسرے شعراء بھی۔ اس نظم کا خیال اس نے معری کے "رسالۃ الغفران" سے لیا، اور اسی طرح کی ایک تخیلی تخلیق کی۔ اس نظم میں شاعر نے ایک مختصر اور پرزور طریقے پر اپنا سارا فلسفہ حیات بیان کر دیا ہے، اور بتایا ہے کہ اسے عقل پر اور انسان کی عزت و حرمت پر کامل یقین ہے۔ نیز وہ ہر قسم کے توہمات کو رد کرتا ہے۔ زہاوی نے عورتوں کے حقوق کے بارے میں بھی ایک مضمون لکھا اور اسے مصری رسالے "المؤید" میں شائع کیا۔ اس مضمون کو پڑھ کر لوگ بہت بگڑ گئے۔ انہوں نے زہاوی پر الزام لگایا کہ اس نے شریعت پر حملہ کیا ہے اور عراق کے گورنر کے پاس پہنچ کر اسے قانون کے مدرسے (لاء سکول) کے استاد کی ملازمت سے برطرف کر دیا جائے۔ زہاوی کی ایک خود نوشت تحریر سے پتا چلتا ہے کہ شاہ فیصل نے اسے ملک الشعراء بنانے کا ارادہ ظاہر کیا تھا، جس کے ساتھ اچھی خاصی تنخواہ بھی ہوتی تھی۔ لیکن زہاوی اس پر آمادہ نہ ہوا۔ وہ ایک تنخواہ دار مدح کرنے والے شاعر کی سطح پر نہیں اترنا چاہتا تھا۔


Scanned with CamScanner

# معروف الرصافی (م ۱۹۴۵)

## انسانیت کا شاعر

عراقی شاعر اور ادیب' اپنی زندگی کے بیشتر حصے میں وہ تدریس کے شعبے سے منسلک رہا۔ عراق میں اس کے اور جمیل صدقی الزہاوی کے درمیان مقابلہ بازی اور ہجوگوئی کا سلسلہ چلتا رہتا تھا۔ رصافی امت مسلمہ کی حالت کی اصلاح اور عالم میں اس کا اتحاد چاہتا تھا۔ وہ اپنے ''دیوان'' کی وجہ سے مشہور ہوا۔ اس نے نثر میں بھی تصانیف کیں جن میں "نفح الطيب فى الخطابة و الخطيب" اور "محاضرات فى الادب العربى" قابل ذکر ہیں۔

ایک عرب نقاد نے کہا کہ اگر رصافی جدید تعلیم سے بھی بہرہ ور ہوتا تو اس کا جو شعری ملکہ تھا اس سے وہ عرب شاعری کا رخ ہی بدل دیتا۔ وہ ایک معمولی خاندان سے تھا۔ اس کا باپ پولیس میں ملازم تھا اور اکثر گھر سے دور رہتا۔ چنانچہ اس کی تربیت اس کی ماں نے کی۔ بغداد کے ایک قرآنی مدرسے میں ابتدائی تعلیم کے بعد وہ ایک فوجی سکول میں داخل ہوا۔ لیکن تین سال بعد تربیت مکمل کرنے سے پہلے ہی اسے چھوڑ دیا۔ اس کے بعد وہ بعض مذہبی مدارس میں جاتا رہا جہاں اس نے عربی زبان اور دوسرے روایتی مضامین کی تعلیم حاصل کی' اور ایک عرصہ محمود شکری الآلوسی کا شاگرد رہا۔ اس کے بعد اس نے بغداد کے ایک سرکاری سکول میں عربی کے استاد کے طور پر کام کیا اور یہاں ۱۹۰۸ تک رہا۔ عثمانی دستور کے اعلان کے بعد اسے استنبول بلایا گیا کہ ایک اخبار "سبيل الرشاد" کے مدیر کے فرائض انجام دے۔ استنبول میں بھی وہ عربی کا استاد رہا اور پھر عثمانی پارلیمنٹ میں عراق کے نمائندے کے طور پر اس کا رکن بھی رہا۔ استنبول میں اس کا قیام اس کی زندگی کا سب سے اچھا زمانہ تھا۔ یہیں اس نے ایک ترکی خاتون سے شادی بھی کی۔ جنگ عظیم کے خاتمے پر وہ استنبول کو چھوڑ کر بجائے بغداد آنے کے پہلے دمشق پہنچا اور بعدازاں یروشلم آ گیا' جہاں وہ معلمین کے ٹریننگ کالج میں عربی ادب کا استاد رہا۔ اس زمانے میں وہ ایک بڑی مایوسی سے دوچار ہوا۔ وہ یوں کہ شریف حسین نے جب عربوں کے نام پر عثمانیوں کے خلاف جنگ کا اعلان کیا تو رصافی نے جو پان اسلامزم کا حامی تھا شریف حسین کے اس رویے کی سخت مخالفت کی۔ اس چیز نے بغداد کے شاہ فیصل کو اس پر ناراض کر دیا۔

بالآخر ۱۹۲۱ میں وہ عراقی حکومت کی دعوت پر بغداد واپس آیا' اور اس کے بعد وہ تعلیم' سیاست اور صحافت کے میدانوں میں متعدد مناصب پر کام کرتا رہا۔ ۱۹۲۸ میں اس نے استاد کی ملازمت سے استعفیٰ



دے دیا اور ایک گمنامی کی زندگی بسر کرتا رہا۔ اپنی پنشن کی محدود آمدنی کو اس نے تمباکو کی ایک چھوٹی سی دکان کھول کر پورا کرنے کی کوشش کی۔ آخر میں وہ ایک تنہا اور نادار شخص کی حیثیت میں مر گیا۔

دنیا کے ادب اور شاعری میں انسانیت کے بارے میں بہت کچھ کہا گیا ہے۔ انسانیت کے ماننے والے چاہتے ہیں کہ اس دنیا میں باہمی روابط ایک ہی سطح پر ہوں۔ نہ کوئی سفید ہو' نہ سیاہ' نہ مشرقی ہو' نہ مغربی' نہ مسلم ہو نہ مسیحی! انسانیت عربی شاعری کا موضوع کبھی نہیں رہی' سوائے ابوالعلاء معری کی لزومیات کی شاعری کے! اس جدید زمانے میں جب عرب شعراء نے دیکھا کہ اہل یورپ نے عربی اور مشرقی قوموں کے سیاسی حقوق ماننے سے انکار کر دیا ہے۔ اور ان کی آزادی اور عزت کی بھی ان کی نگاہ میں کوئی قدر نہیں رہی' تو انہوں نے اپنی آزادی اور باعزت زندگی کے لئے آواز اٹھائی۔ ان کے ساتھ رصافی نے بھی کہا:

| | |
|---|---|
| اذالم يعش حرا بموطنه الفتى | فسمّ الفتى ميتاً و موطنه قبرا |
| احريتى الى اتخذتك قبلة | اوجه وجهى كل يوم لها عشرا |

(اگر ایک شخص اپنے وطن میں بھی آزاد نہ ہو تو اسے مردہ قرار دو اور اس کے وطن کو قبر سمجھو۔
کیا یہ میری آزادی ہے کہ میں نے تمہیں قبلہ بنا لیا ہے جس کی طرف میں دن میں دس دفعہ اپنا رخ کرتا ہوں۔)

اس زمانے میں کچھ لوگوں نے دیکھا کہ ایک جماعت ہے جو مذہبی قومیت کی بات کرتی ہے' چنانچہ انہوں نے اسے ختم کرنے اور وہ دیوار توڑنے پر اصرار کیا جو ایک امت کے افراد کے درمیان تفرقہ پیدا کرے' خاص طور پر مسلمانوں اور عیسائیوں کے درمیان جو ایک ہی وطن سے تعلق رکھتے تھے۔ اس بارے میں رصافی نے کہا:

| | |
|---|---|
| اما آن ان تنسى من القوم اضغان | فيبنى على اس المواخاة بنيان |
| اما آن ان يرمى التخاذل جانباً | فتكسب عزا بالتنا صرا وطان |
| علام التعادى لاختلاف ديانة | وان التعادى فى الديانة عدوان |
| اذا جمعتنا وحدة وطنية | فماذا علينا ان تعدد اديان |

(کیا اب وقت نہیں آیا کہ لوگوں کے درمیان بغض اور کینہ ختم کر دیا جائے اور بھائی چارے کی بنیاد پر عمارت کھڑی کی جائے۔
کیا وقت نہیں آیا کہ ایک دوسرے سے دست کش ہونے کے رویے کو خیر باد کہا جائے اور ملک ایک دوسرے کے ساتھ کھڑے ہو کر عزت حاصل کریں۔

مذہب کے اختلاف پر یہ ایک دوسرے سے عداوت کیا معنی؟ مذہب کی بنا پر عداوت رکھنا تو
زیادتی ہے۔
جب ہم سب کو ایک وطن کی وحدت نے جمع کر دیا ہے تو اگر مذہب مختلف بھی ہوں تو ہمیں اس
سے کیا نقصان ہوگا؟)

رصافی کے کلام سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ اپنے لئے نہیں بلکہ اپنے ہم وطنوں کے لئے جینا چاہتا تھا اور اس سے بھی آگے بڑھ کر تمام انسانیت کے لئے۔ اس اعتبار سے رصافی کے دل میں نازک انسانی احساسات موجزن رہتے ہیں جو اس کے دیوان میں جگہ جگہ اظہار پاتے ہیں۔ وہ فقراء اور بے بس افراد کے ساتھ انسانی ہمدردی اور توجہ کا خواہاں تھا۔ اسی لئے وہ عورتوں کو ان کے حقوق دینے کی دعوت دیتا۔ وہ چاہتا تھا کہ عورت کے راستے سے وہ تمام رکاوٹیں دور کر دی جائیں جو اس کی ترقی اور اس کے اپنے پاؤں پر کھڑے ہونے کی راہ میں حائل ہیں۔ وہ عورت کو طلاق دینے کا بہت مخالف تھا اور عورت کو اس کے قصور کے بغیر طلاق دینے کو اس کے لئے بہت اہانت کی بات سمجھتا تھا۔ اس کی نظم "المطلقة" (طلاق یافتہ عورت) اس سماجی برائی کے بارے میں بہت عمدہ نظم ہے۔ اس میں وہ کہتا ہے۔

| | |
|---|---|
| وطلقها على جهل ثلاثاً | كذلك يجهل الرجل الغضوب |
| وافتى بالطلاق طلاق بت | ذوو فتيا تعصبهم عصيب |
| فبانت عنه لم تأت الدنايا | ولم يعلق بها الذام المعيب |
| فظلت وهي باكية تنادى | بصوت منه ترتجف القلوب |

(مرد نے اس کو انجانے میں تین طلاقیں دے دیں' ایک مغلوب الغضب مرد اسی طرح انجان رہتا ہے۔
اس طلاق کے بائن ہونے کا ان لوگوں نے فتویٰ دیا جو عورت کے معاملے میں بہت سخت تعصب رکھتے ہیں۔
اس بے چاری سے اگرچہ کوئی برا فعل صادر نہ ہوا اور نہ اس میں کوئی عیب پایا گیا' لیکن وہ اپنے مرد سے الگ ہو گئی۔
وہ روتی رہی اور ایسی آواز سے اضطراب کو پکارتی رہی جو دلوں کو ہلا کر رکھ دے۔)

یہ ہمدردی اور دلسوزی صرف مسلم بیواؤں اور یتیموں کے لئے ہی نہیں ہے' بلکہ ارمن قوم کے ان یتیم بچوں اور بیواؤں کے لئے بھی وہ اسی طرح کڑھتا ہے جن پر ترک قوم نے "ظلم" کی سازش کے بعد ظلم کے پہاڑ توڑ دیے تھے۔ اپنی ایک اور نظم "ام الیتیم" (یتیم کی ماں) میں ماں مریم کو مخاطب کرتے ہوئے



کہتا ہے:

| | |
|---|---|
| امريم ان الله لاشك ناقم | من القوم في قتل النفوس المحرم |
| فليس بدين كل ما يفعلونه | ولكنه جهل وسوء تفهم |

(اے مریم کوئی شک نہیں کہ اللہ ان لوگوں سے ضرور بدلہ لے گا جو جانوں کو بے جا قتل کرتے ہیں
اس لئے کہ جو کچھ وہ کرتے ہیں وہ دین نہیں ہے' بلکہ وہ جہالت ہے اور فہم و دانش کی خرابی ہے)

تاہم ان نظموں میں جذباتیت کچھ زیادہ ہی دکھائی دیتی ہے جو مصطفیٰ لطفی المنفلوطی کی دل بھری اور رلانے والی کہانیوں کی یاد دلاتی ہے۔ ایک دوسرے مصری شاعر حافظ ابراہیم کی طرح رصافی کو بھی قدرتی آفات کے بیان کرنے میں دلچسپی تھی۔ اس کے شعری مجموعے کے ایڈیٹر نے ایک الگ حصہ ان نظموں کے لئے رکھا تھا جو رصافی نے آتش زنی کے واقعات اور غربت اور بیماری سے متعلق سانحات پر کہی تھیں۔ زہاوی کی طرح رصافی نے بھی عراقی شاعری کی زبان کو سادہ بنا دیا' خاص طور پر اپنی سیاسی اور معاشرتی نظموں میں۔ رصافی کے مرثیوں میں موضوع اور پیکر تراشی میں کچھ کچھ روایتی انداز کی جھلک دکھائی دیتی ہے' اور اس کے کلام میں نہ صرف عباسی شعراء (مثلاً متنبی اور معری) کے لفظ و محاورے کی گونج سنائی دیتی ہے' بلکہ جاہلی شعراء طرفہ اور سموئل کا سا انداز بھی دیکھنے میں آتا ہے۔ رصافی نے متنبی اور معری میں سے ہر ایک پر پوری پوری نظم لکھی تھی۔ معری کے بارے میں وہ اپنی نظم میں کہتا ہے کہ "وہ صرف عرب شاعر نہیں تھا' بلکہ پوری انسانیت کا شاعر تھا۔" چنانچہ یہ امر دلچسپی سے خالی نہیں کہ جب وہ بغداد کے قید خانے پر ایک نظم کہتا ہے تو اس میں جاہلی محاورہ اور تشبیہ شامل کر دیتا ہے' درآں حالیکہ وہ نظم بالکل جدید زبان میں قید خانے کی غلاظت اور کثافت اور آلودگی کا ایک واضح اور ہو بہو (Graphic) نقشہ پیش کرتی ہے۔

آخر میں طلاق کے موضوع پر اس کے کچھ شعر آج کی صورت حال میں برمحل لگتے ہیں۔

| | |
|---|---|
| غلوتم في دياناتكم غلوا | يضيق بمثله الشرع الرحب |
| اراد الله تيسيراً وانتم | من التعسير عندكم ضروب |

(تم لوگوں نے اپنے دین میں اس طرح غلو سے کام لیا کہ اس کی کشادہ دامن شریعت میں کوئی گنجائش نہیں ہے۔
اللہ نے تو آسانیاں چاہی تھیں اور تم لوگوں نے طرح طرح کی مشکلات زندگی میں پیدا کر دیں۔)



Scanned with CamScanner

# خلیل مطران (م ۱۹۴۹)

خلیل مطران ان شاعروں کی صف اول میں تھا جنھوں نے آزادی کے گیت گائے اور اس کے ترانے لکھے۔ وہ ۱۸۷۲ میں لبنان میں پیدا ہوا۔ اس وقت وہاں کی فضا پر ترکی استبداد کا اثر تھا۔ کچھ عرصے بعد عبدالحمید نے خلافت سنبھالی تو اس ظلم و جبر میں اور اضافہ ہو گیا۔ مدحت پاشا اور کچھ نوجوان ترکوں کی ایک جماعت نے اسے راہ راست پر لانے کی کوشش کی' لیکن اس نے ان کی ایک نہ چلنے دی اور جو بھی اس کے راستے میں آیا اس کو سخت سزا دی۔ ان حالات کو دیکھ کر بہت سے لوگ ملک چھوڑ کر فرانس اور سوئٹزر لینڈ چلے گئے اور وہاں جا کر اپنی قوم کے بارے میں سوچنے لگے کہ اس کا کیا انجام ہو گا۔ خلیل مطران نے جب اپنے وطن کی یہ حالت دیکھی کہ وہ کس طرح سلطان عبدالحمید کے ظلم و استبداد کے بوجھ تلے دبا ہوا ہے تو اس کی زبان پر شعر جاری ہو گئے اور کچھ ہی عرصہ بعد وہ اپنے شعروں میں اس ظلم و جبر کے خلاف احتجاج کرنے لگا۔ جب عثمانی خلیفہ کو اس کا علم ہوا تو اس کے آدمیوں نے خلیل مطران کے گھر پر چھاپہ مارا' لیکن انہیں وہاں سے کوئی ایسا مواد نہ ملا جس سے شاعر کو گرفتار کر کے قید میں ڈالا جا سکے۔ چنانچہ انہوں نے اسے چھوڑ دیا' لیکن اس پر نگرانی شروع کر دی۔ مطران کے گھر والوں نے جب یہ حالات دیکھے تو اسے اپنی تعلیم کی تکمیل کے لئے پیرس بھیج دیا۔ وہاں اس کے بعض ترک نوجوانوں کے ساتھ روابط قائم ہوئے۔ لیکن وہ وطن واپس آنے کی بجائے جنوبی امریکہ کے ہجر کی طرف جانے کا سوچنے لگا' اور اس مقصد سے اس نے ہسپانوی زبان بھی سیکھنی شروع کر دی۔ لیکن تھوڑے ہی عرصے میں وہ اتنی دور ہجرت کرنے کے خیال سے باز آیا اور مصر کی طرف ہجرت کرنے کو ترجیح دی۔ چنانچہ ۱۸۹۲ میں وہ مصر آ گیا۔ جہاں اس سے پہلے اس کے وطن سے بہت سے آزادی پسند لوگ پہنچے ہوئے تھے۔

خلیل مطران کے دیوان میں اس کے زمانہ شباب کے باغیانہ اشعار میں سے کچھ بھی نہیں ہے۔ اس نے مصلحت اس میں سمجھی کہ اس طرح کے اشعار کو جن میں اس کے سیاسی جذبات کا اعلان تھا حذف کر دے۔ ایسے معاملات میں وہ احتیاط پر یقین رکھتا تھا اور تقیہ کا مذہب اختیار کئے ہوئے تھا۔ جدید شاعری میں جس طرح مطران نے تقیہ پر عمل کیا اس طرح کسی اور شاعر نے نہ کیا۔ وہ اپنی جوانی کے زمانے سے ہی استبداد کے خلاف لڑنا چاہتا تھا' لیکن احتیاط اور تقیہ کی اس پالیسی کے ہوتے ہوئے وہ یہ کیونکر کر سکتا تھا۔ اس کا حل اس نے یہ نکالا کہ تاریخ کو پردہ بنائے اور اس پردے کی آڑ میں وہ جو کچھ بھی کہنا چاہتا ہے کہے۔ چنانچہ ظاہر میں وہ تاریخی موضوع پر نظم کہتا تھا لیکن باطن میں قوموں کی غصب شدہ آزادی کی بات کرتا تھا۔ اسی طرح کی ایک نظم اس نے فرانس کے جرمنی پر حملے کے بارے میں لکھی' جس میں جرمنی



کو شکست ہوئی۔ اس شکست کا جو اثر جرمن لوگوں پر ہوا اسے بیان کرتے ہوئے وہ ذہن میں اپنے وطن کے لوگوں کو رکھتا ہے جو عثمانی استبداد کے سامنے بے بس تھے۔

واقام اصحاب البلاد مآتماً ۔۔۔ وکسوا علی القتلی ثیاب حداد
ناحت عرائسهم علی ازواجها ۔۔۔ والامهات بکت علی الاولاد
واشتد حزنهم ولم یک مجدیاً ۔۔۔ من بعد فقد اجة و بلاد

(ملک کے لوگوں نے ماتم کا اہتمام کیا اور مقتول افراد کو ماتمی لباس پہنایا
ان کی دلہنوں نے اپنے شوہروں پر نوحے کیے اور مائیں اپنی اولاد پر گریہ کناں ہوئیں۔
وہ شدید غم میں مبتلا تھے' لیکن اس کا اس وقت کوئی فائدہ نہیں تھا' جب اپنے محبوب افراد اور اپنا ملک دونوں نہ رہے)

پھر یہ ہوتا ہے کہ وہی جرمنی جسے شکست ہوئی تھی کچھ عرصے کے بعد اپنی قوت مجتمع کر کے فرانس پر حملہ کرتا ہے اور فرانس کے ظالم اور جابر اپنے زخم چاٹتے رہ جاتے ہیں۔ مطران اب اپنی بے عزتی کا بدلہ لینے والے جرمنوں کے بارے میں کہتا ہے:

فاستعصموا بالصبر لم تکالفوا ۔۔۔ ولتحرر و امن رق الاستعباد
وتاهبوا للثار والاحقاد فی ۔۔۔ اکبادهم کالبیض فی الاغماد
واستفتحوا باریس فاستو فوابها ۔۔۔ اوتارهم وشفوا اصدی الاکباد
کل بمسعاه یفوز ومن ینب ۔۔۔ عنه الحوادث لم یفز بمراد

(انہوں نے صبر کا دامن تھاما اور ایک دوسرے کے ساتھ مل کے کھڑے ہوئے اور غلامی کے طوق سے آزاد ہو گئے۔
وہ بدلہ لینے کے لئے تیار ہوئے۔ ان کے دلوں میں نفرت اس طرح بیٹھ گئی تھی جس طرح تلواریں اپنی نیاموں میں لیٹی ہیں۔
انہوں نے پیرس فتح کر لیا اور اپنے سارے ارمان نکال لئے' اور جگر کی گرمی کو ٹھنڈا کیا۔
ہر کوئی اپنی کوشش سے ہی کامیاب ہوتا ہے اور جو ہر بات حوادث پر چھوڑ دے وہ مراد نہیں پا سکتا)

جیسا کہ اوپر ذکر ہوا خلیل مطران نے اپنی شاعری میں صراحت کے ساتھ استبداد کے خلاف کچھ نہ کہا' اور جو بات بھی کہی چھپا کر کہی۔ لیکن اس کا ایک قطعہ ایسا ہے جس میں وہ آزادی اظہار کو دبانے والے انگریزوں کے قانون مطبوعات کے خلاف کھل کر بات کرتا ہے' اور کہتا ہے

کسروا الاقلام هل تکسیرها ۔۔۔ یمنع الایدی ان تنقش صخرا

قطعوا الايدی وهل تقطعها     يمنع الاعين ان تنظر شزرا

(انہوں نے قلمیں تو توڑ دیں، لیکن کیا ان کے توڑ دینے سے ہاتھ پتھر پر نقش و نگار نہیں بنا سکتے
انہوں نے ہاتھ کاٹ دیئے، لیکن ہاتھوں کے کٹنے سے آنکھوں کو حقارت کی نظر ڈالنے سے تو نہیں
روکا جا سکتا)

خلیل مطران ایک ہشت پہلو شخص تھا۔ اس نے بہت سے میدانوں میں امتیاز حاصل کیا، صحافت میں، مالیات میں، تجارت میں، زراعت میں، اور پھر سب سے بڑھ کر شاعری میں۔ مصر میں آنے کے بعد اس نے مشہور اخبار "الاہرام" میں صحافی کے طور پر کام کرنا شروع کیا۔ پھر اس نے کچھ اپنے رسالے نکالے، جو زیادہ عرصہ نہ چلے۔ پھر وہ تجارت اور سٹہ بازی کی طرف چلا گیا، جہاں اس نے کافی دولت جمع کر لی۔ لیکن ایک بدقسمت سودے میں وہ اپنی تمام جائیداد ہار گیا، جس نے اسے مایوسی میں مبتلا کر دیا۔ خوش قسمتی سے وہ جلد ہی خدیو کی زرعی سوسائٹی میں سیکرٹری لگ گیا۔ جہاں اس نے اپنی اچھی کارکردگی کی وجہ سے کافی عزت اور شہرت کمائی۔ کافی برس مطران نیشنل تھیٹر کمپنی کا ڈائریکٹر بھی رہا۔ یہاں کام کرتے ہوئے اس نے مصری تھیٹر کے مقاصد کو بہت فائدہ پہنچایا۔ بطور شاعر کے خلیل مطران کو ۱۹۱۳ء میں اور پھر ۱۹۴۷ میں باقاعدہ خراج عقیدت پیش کیا گیا۔ اس نے "شاعر القطرین" (دو ملکوں یعنی لبنان اور مصر کے شاعر) کا نام پایا، اور طہٰ حسین نے ایک دفعہ اس کے بارے میں کہا کہ "وہ جدید عربی شاعری کا رہنما ہے اور تمام معاصر شعراء کا استاد ہے۔"

خلیل مطران نے اچھی شاعری کے لئے کچھ رہنما اصول اپنے ہم عصروں کو دیئے۔

پہلا یہ کہ ایک نظم میں وحدت ہونی چاہیے، یعنی شروع سے آخر تک وہ ایک ہی موضوع کے بارے میں ہو۔

دوسرا یہ کہ نظم میں سب سے زیادہ اہمیت معنی و مضمون کی ہونی چاہیے۔ لفظ و محاورے کی آرائش پر اس کے بعد دھیان دینا چاہیے۔

تیسرا یہ کہ تصور و خیال کا عام اور معمولی نہ ہونا اور مضمون کا بھی پامال نہ ہونا اچھی شاعری کے لئے ضروری ہیں۔

پہلی جنگ عظیم کے خاتمے پر استعماری طاقتوں نے عثمانی علاقوں کو آپس میں تقسیم کر لیا۔ فرانس نے لبنان اور شام لے لئے، انگریزوں نے فلسطین اور عراق پر قبضہ کر لیا۔ پورا عالم عربی اب ان طاقتوں کے نیچے آ گیا۔ خلیل مطران اس صورت حال پر بہت جز بز ہوا اور اپنی باغیانہ فکر کو اس نے اپنی ایک طویل نظم "نیرو" کا موضوع بنایا۔ اس طرح اس نے استعماری طاقتوں کے خلاف کچھ کہنے کے لئے پھر تاریخ کی



آڑ لی۔ اس نظم میں اس نے "نیرو" کے ظلم و جبر کے لئے ان عوام کو ذمہ دار ٹھہرایا جنہوں نے اس کی بہت عزت و تکریم کر کے اسے اپنے سر پہ بٹھا لیا تھا۔ وہ گویا اپنے اہل وطن پر یہ الزام لگانا چاہتا تھا کہ انہوں نے ہی اپنے اوپر استعمار کی یہ لعنت مسلط کی۔ اس نظم کے کچھ اشعار یوں ہیں:

ذلک الشعب الذی آتاه نصرا     هو بالسبة من "نیرون" احری

ای شیء کان "نیرون" الذی     عبدوه؟ کان فظ الطبع غرا

صنعوه من قواهم مابه     صار طاغوتا علیهم او اضرا

(وہی قوم جس نے اسے فتح دلائی وہ اب نیرو کی طرف سے اہانت کے مستحق ٹھہرے۔
نیرو آخر کیا تھا جس کو وہ پوجتے تھے؟ وہ ایک مغرور اور بدمزاج شخص ہی تو تھا۔
انہوں نے اسے اپنی ایسی قوتوں سے نوازا، جس سے وہ ان پر سرکش آمر بن گیا بلکہ اس سے بھی
کوئی بُری چیز)

☆---☆---☆

## عربی ادب میں فکشن (افسانہ، ناول، ڈرامے) کا رواج

افسانے کی قدیم اور روایتی شکل قصہ یا حکایت ہے۔ قدیم عربی ادب میں قصے یا کہانی کو ادب کی ایک صنف کے طور پر کبھی اختیار نہ کیا گیا۔ جاہلی زمانے میں قصے کا وجود "ایام العرب" میں ملتا ہے جو قبائل کی باہمی جنگوں کے احوال کا بیان ہوتا تھا، اور جو تاریخ میں محفوظ چلا آیا ہے۔ پھر قرآن کریم میں لوگوں کو عبرت دلانے کے لئے انبیاء کے قصے بیان ہوئے اور بتایا گیا کہ کس طرح بعض انبیاء کی قوموں نے ان کے ساتھ اچھا سلوک نہ کیا۔ ان کی دعوت سے انکار کیا اور اپنے اس رویے کی پاداش میں عذاب سے دوچار ہوئیں۔ اس ضمن میں حضرت یوسف علیہ السلام کا قصہ بھی ایک مکمل سورت کی شکل میں بیان ہوا۔ قرآن میں یہ قصہ جس طرح بیان ہوا ہے وہ آج کے افسانے کے بہت قریب ہے۔ لیکن تعجب ہے کہ قرآن کی ان حکایات اور کہانیوں کا نمونہ سامنے ہوتے ہوئے بھی عربوں میں قصہ گوئی کی کوئی تحریک پیدا نہ ہو سکی۔

عربوں کے ہاں قصوں اور کہانیوں کا رواج تیسری صدی ہجری میں ان ترجموں کی بدولت پڑا جو عجمی قوموں ایران اور ہندوستان کی کہانیوں کے عربی زبان میں کئے گئے۔ ان میں ایک کتاب "کلیلہ و دمنہ" تھی جو ہندوستان سے ایران آئی اور پھر فارسی زبان سے عربی کے مایہ ناز ادیب ابن المقفع نے اس کا

عربی میں ترجمہ کیا۔ اسی طرح کتاب "الف لیلہ ولیلہ" بھی شروع میں ایران کی کہانیوں کی ایک چھوٹی سی کتاب "ہزار افسانہ" سے عربی میں ترجمہ ہوئی۔ اور عرب میں آ کر اس پر اتنے اضافے کئے گئے کہ یہ حکایتوں، داستانوں اور مہم جوئی کے قصوں کی ایک ایسی ضخیم کتاب بن گئی، جو اپنے ترجموں کی بدولت پوری دنیا میں تفریح کا ایک بڑا خزانہ ثابت ہوئی، یہاں تک کہ دوسری زبانیں اس کا جواب پیدا کرنے سے قاصر رہیں۔

لیکن جہاں "کلیلہ و دمنہ" جانوروں کی حکایات پر مشتمل قدیم طرز کی ایک ادبی کتاب رہی، وہاں "الف لیلہ ولیلہ" کو عوامی ادب (Folk Gore) کے کھاتے میں ڈال دیا گیا اور اس کا شمار ادب عالیہ میں بھی نہ ہو سکا۔

## عربی افسانہ

افسانے کی صنف نے یورپ اور مغربی دنیا میں انیسویں صدی میں ظہور کیا۔ سر والٹر سکاٹ، واشنگٹن ارونگ، ایڈگر ایلن پو، بالزاک، موپاساں، چیخوف اور دوسرے لوگوں نے اپنے فنکارانہ طرز حکایت نویسی سے اس کو ادب کی ایک باقاعدہ صنف کے طور پر منوایا اور اسے پڑھنے والوں میں ہر دلعزیز بنا دیا۔ جب بیسویں صدی آئی تو اس صنف میں کچھ اور لوگوں نے تجربے کئے، اور انگلینڈ میں سمرسٹ مام اور کیتھرین مینسفیلڈ اور امریکہ میں شیروڈ اینڈرسن، ایف سکاٹ فٹز جیرالڈ اور ارنسٹ ہیمنگوے نے مختصر کہانی یا افسانے کو ترقی دے کر ادبی اظہار کی ایک موثر اور نہایت فنکارانہ صورت عطا کر دی۔

انیسویں صدی میں جب عرب ادباء کا یورپ سے واسطہ پڑا تو وہ افسانے کی اس صورت سے آشنا ہوئے، اور یہ انہیں بہت اچھی لگی۔ یہ لوگ ابتدا میں ان قصوں کا عربی میں ترجمہ کرنے لگے۔ لیکن یہ ترجمہ اصل کے مطابق نہیں ہوتا تھا، بلکہ اسے عربی کی صنف مقامات کے اسلوب میں ڈھالا جاتا تھا اور ان کہانیوں کی فضا بھی مصر کے مقامی حالات کے مطابق رکھی جاتی تھی۔ نیز ان میں کسی حد تک عوامی زبان بھی استعمال کی جاتی تھی، تاکہ مصر کے قاری کے لئے یہ ایک مانوس چیز ہو اور وہ اس سے لطف اندوز ہو سکے۔ اس طرح کے ترجمے شروع میں رفاعۃ الطہطاوی نے کئے۔ لیکن بعد میں فصیح عربی لکھنے والوں میں سے حافظ ابراہیم اور مصطفیٰ لطفی المنفلوطی نے بھی یورپی افسانوں کے ترجمے کئے۔ یہ ترجمے اگرچہ فصیح زبان میں ہوتے تھے، تاہم یہ اصل کے مطابق نہیں ہوتے تھے، بلکہ ان میں اصل کہانی کے بنیادی خطوط ہی سامنے رکھے جاتے تھے اور پوری کہانی کو مصری فضا اور مصری محاورے میں ڈھال دیا جاتا تھا۔ منفلوطی نے اپنی کتاب "العبرات" میں کچھ کہانیاں تو یورپی زبانوں سے ترجمہ کیں، لیکن کچھ کہانیاں



خود بھی لکھیں۔ چنانچہ منفلوطی کی ان کوششوں کو عربی افسانے کا آغاز قرار دیا جا سکتا ہے۔

مغربی افسانے کی طرز پر اگر عربی زبان میں کسی نے سب سے پہلے کسی حد تک کامیاب افسانہ لکھا تو وہ محمود تیمور تھا، جس کے ۱۹۱۷ میں لکھے ہوئے افسانے "فی القطار" (گاڑی میں) کو باوجود کچھ خامیوں کے جدید معنوں میں باقاعدہ افسانہ قرار دیا گیا۔ پھر پہلی جنگ عظیم کے بعد کے زمانے میں یکے بعد دیگرے بہت سے افسانہ نگار منظر عام پر آنے لگے، اور اس گروہ نے اپنی تخلیقات سے مصری ادب میں اس فن کی بنیادیں رکھ دیں۔ ان لوگوں کے میدان میں آ جانے سے صنف افسانہ میں تخلیقی سرگرمی زیادہ ہو گئی اور یوں لگا کہ اس وقت کے سیاسی اور معاشرتی ماحول میں جو خرابیاں اور بے اعتدالیاں نفوذ کر گئی تھیں ان کو بے نقاب کرنے اور ان پر تنقید کرنے کا منصب افسانے نے اپنے ذمے لے لیا تھا، اور اس زمانے کی شاعری اس صورتحال سے تقریباً لاتعلق تھی۔ افسانوں کی اس مقبولیت کو دیکھتے ہوئے اخبارات اور رسائل نے بھی ان کے لئے اپنے صفحات وا کر دیئے، اور افسانے ان جرائد و رسائل میں بڑی باقاعدگی سے چھپنے لگے۔ شروع کے اس مرحلے میں یہ سب افسانہ نگار چونکہ مغربی تعلیم سے آراستہ تھے اور ان میں سے کچھ مغرب میں بھی رہے تھے، اس لئے ان کے افسانے زیادہ تر مغربی افسانوں سے ماخوذ اور متاثر ہوتے تھے، اور اس امر کا اعتراف خود افسانہ نگار بھی کرتے تھے۔ مثلاً محمود تیمور نے کہا کہ وہ فرانس کے موپاساں سے متاثر ہے، اور اس کے بعض افسانوں میں جو واقعیت (Realism) دکھائی دیتی ہے وہ فرانس ہی کے زولا سے لی ہوئی ہے۔ اسی طرح ایک دوسرے افسانہ نگار محمود طاہر لاشین نے صاف صاف یہ اقرار کیا کہ اس نے اپنے متعدد افسانوں کا خیال روس کے چیخوف سے لیا ہے۔ لیکن اس کے یہ معنی بھی نہیں کہ افسانہ نگاروں کی یہ کھیپ ہمیشہ غیر ملکی ادب پر انحصار کرتی رہی۔ بلکہ ان کے اندر جو انفرادی سوچ اور ذاتی احساس تھا اس کو کام میں لاتے ہوئے انہوں نے بالکل اوریجنل افسانے بھی لکھے۔ جن میں سے اکثر وہ تھے جو اپنے موضوع عرب ممالک کی داخلی زندگی اور معاشرے کے روزمرہ واقعات سے حاصل کرتے تھے، اور غیر شعوری طور پر انسانی نفسیات کا مطالعہ بھی پیش کرتے تھے۔ اوپر جن افسانہ نگاروں کا ذکر کیا گیا، ان میں سے بعض کے نام مع ان کے مجموعوں کے حسب ذیل ہیں۔

۱۔ عیسیٰ عبید کا "احسان ھانم"
۲۔ شحاتہ عبید کا "درس مولم"
۳۔ محمود تیمور کے نو مجموعے "الشیخ جمعہ" سے لے کر "فرعون الصغیر" تک
۴۔ محمود طاہر لاشین کا "سخریۃ الناس" اور "یحکی ان"
۵۔ نجیب محفوظ کا "همس الجنون" جو اس کا اولین مجموعہ تھا۔

وہ بات کرتے ہوئے اپنے عجیب و غریب جادو سے سننے والوں کے کانوں اور دلوں کو اپنے بس میں کر لیتی ہیں۔

حیا کی وجہ سے وہ اپنے ان محاسن کو چھپاتی ہیں جن سے وہ ایک متقی اور ڈرنے والے انسان کا دل اپنے قابو میں کر لیں)

اوپر ابن العربی کی کچھ نظموں کا بلفظی ترجمہ پیش کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ اگرچہ ان نظموں کے الفاظ خوبصورت اور شاعرانہ تھے۔ لیکن ان سے قابل فہم معانی اخذ کرنے میں خاصی مشکل پیش آئی۔ اصل میں ان نظموں کے اصل اور صحیح معانی کا ادراک صرف حضرات صوفیہ کو ہی ہو سکتا ہے۔ ابن العربی کے دیوان "ترجمان الاشواق" کا جو خوبصورت ایڈیشن حال میں بیروت سے شائع ہوا ہے اس میں اس شاعر کی نظموں کے الفاظ اور مضامین کی جو تشریح نیچے فٹ نوٹس میں بہت تفصیل میں دی گئی ہے اس کا سمجھنا بھی ایک عام قاری کے بس میں نہیں ہے۔ وہ صرف ایک باعمل صوفی ہی سمجھ سکتا ہے۔

## البہاء زہیر (م ۱۲۵۸)

ابوالفضل بہاء الدین زہیر بن محمد المہلبی وزیر بھی تھا اور ایک انشا پرداز اور شاعر بھی! وہ اپنے سہل ممتنع کلام کے لئے مشہور ہوا۔ جس میں نازک غزلیہ مضامین بھی ہوتے تھے اور ایک دھیما عتاب بھی۔

وہ مکہ کے قریب وادیٔ نخلہ میں پیدا ہوا۔ پھر وہ مصر چلا آیا اور اپنی زندگی کا بیشتر حصہ اس نے یہیں گزارا۔ مصر میں اس کی نشوونما ہوئی اور اس نے شرعی علوم اور ادب کی تعلیم پائی۔ جب وہ جوان ہوا اور نثر و نظم اور انشا نگاری میں کچھ مہارت پیدا کر لی تو وہ سلطان صالح ایوبی کی خدمت میں حاضر ہوا اور شام اور جزیرہ کے سفر میں اس کے ساتھ رہا۔ جب سلطان صالح کے چچا زاد بھائی سلطان ناصر نے اس کے خلاف غلبہ پایا اور اسے شکست دے کر اسے قید کر لیا' تو معزول سلطان کے تمام سپہ سالار اور افواج اس کو چھوڑ کر اس کے چچا زاد بھائی سے جا ملیں۔ لیکن البہاء زہیر نے سلطان صالح کے ساتھ اپنا عہد و پیمان برقرار رکھا اور کسی دوسرے کی خدمت پر آمادہ نہ ہوا۔ وہ نابلس میں مقیم رہا' یہاں تک کہ حالات نے پلٹا کھایا اور ملک الصالح دیار مصر کی حکومت واپس لینے میں کامیاب ہو گیا۔ اس نے البہاء کو اپنی خدمت میں واپس بلا لیا اور اس کی دوستی اور وفاداری کی قدر کرتے ہوئے اسے اپنا وزیر اور رازداں بنا دیا۔ وہ اس کی رائے پر چلتا اور اس کے مشورے پر عمل کرتا۔ اور اس کے توسط اور سفارش سے اس نے بہت سے لوگوں کو نفع پہنچایا۔ حالات اسی طرح رہے' یہاں تک کہ سلطان صالح نے داعیٔ اجل کو لبیک کہا۔ البہاء بھی



اب حکومت کا کاروبار چھوڑ کر اپنے گھر میں رہنے لگا۔ کچھ عرصے کے بعد قاہرہ میں ایک وبا پھوٹ پڑی' جس میں البہاء فوت ہو گیا۔ یہ وہی سال تھا جب بغداد پر تاتاریوں کا قبضہ ہوا تھا۔

بہاؤ الدین بہت اچھے اخلاق اور نرم طبیعت کا اور شیریں کلام تھا۔ اس کی یہ صفات اس کی شاعری میں بھی ظاہر ہوئیں۔ چنانچہ اس کی شاعری میں ایک نرم حلاوت پائی گئی۔ سننے والا جب اس کا کلام سنتا تو اس کی سہولت اور لطافت کی وجہ سے یہ سمجھتا کہ ایسا کلام وہ بھی کہہ سکتا ہے۔ لیکن جب وہ اس کی کوشش کرتا تو ناکام رہتا۔ البہاء کا شعر اس کی طبیعت سے پھوٹتا ہے' اس کے اندر سے برآمد ہوتا ہے۔ اور اس کے ماحول کی عکاسی کرتا ہے۔ وہ اس میں کسی کی تقلید نہیں کرتا اور اپنے شعور و احساس کے سوا کسی سے مدد نہیں لیتا۔ تغزل اور عتاب کے موضوع پر اس نے بہت عمدہ شاعری کی ہے۔ ان کے علاوہ دوسرے موضوعات میں اس نے کوئی قابل ذکر چیز پیدا نہیں کی۔ البہاء کے مضامین میں کوئی نئی بات یا کوئی نیا تخیل دیکھنے میں نہیں آتا۔ اس کی شاعری میں بالکل عام اور سامنے کے مضامین ہوتے ہیں۔ لیکن وہ اپنے خوبصورت الفاظ اور اپنی کریم النفسی اور فیض رسانی سے ان میں تاثیر کی ایسی قوت بھر دیتا ہے جس سے وہ مضامین بلند پایہ لگتے ہیں۔

نمونہ کلام: ایک دفعہ البہاء جس کشتی میں سوار تھا وہ غرق ہو گئی۔ وہ خود تو بچ گیا لیکن اس کا سارا ساز و سامان جاتا رہا۔ چنانچہ وہ حالات کے نشیب سے دل شکستہ آدمی (یعنی اپنے آپ) کو مخاطب کر کے کہتا ہے:

لا تعتب الدهر في خطبٍ رماك به ... ان استردّ فقدماً طالما وهبا
حاسب زمانك في حاليّ تصرّفه ... تجده أعطاك اضعاف الذي سلبا
والله قد جعل الايام دائرة ... فلا ترى راحة تبقى ولا تعبا
ورأس مالك وهي الروح قد سلمت ... لا تأسفنّ لشئ بعدها ذهبا
ما كنت اول ممدوح بحادثة ... كذا مضى الدهر لا بدعا ولا عجبا
ورب مال نما من بعد مرزأة ... اما ترى الشمع بعد القطف ملتهبا

(زمانہ جو تم پر مصیبت لایا ہے تو اسے معتوب نہ کرو۔ اگر اس نے کچھ لے لیا ہے تو بہت عرصے سے وہ دیتا بھی رہا ہے۔

اپنے زمانے کا دونوں حالتوں میں محاسبہ کرو گے تو دیکھو گے کہ اس نے جو کچھ سلب کیا ہے اس سے کئی گنا تمہیں دیا ہے۔

اللہ نے حالات میں پھیر رکھا ہے' چنانچہ نہ کوئی راحت ہمیشہ رہتی ہے اور نہ کوئی تکلیف۔
تمہاری سب سے قیمتی متاع تو روح ہے اور وہ سالم رہ گئی ہے' اس لئے کسی بھی جانے والی چیز پر افسوس نہ کرو۔
تم اس حادثے کا سب سے پہلا شکار نہیں ہو۔ زمانہ اسی طرح رہا ہے' اس میں نہ کوئی نئی بات ہے اور نہ تعجب کی چیز۔
بہت سا مال ایسا ہوتا ہے جو مصیبت کے بعد بڑھتا ہے۔ کیا تو نے دیکھا نہیں کہ شمع کٹنے کے بعد کیسے بھڑک اٹھتی ہے)

غزل کے موضوع پر کہتا ہے:

| | |
|---|---|
| خلیلیّ أما هذه فدیارهم | وأما غرامی فهو ما تریان |
| خلیلیّ هذا موقف یبعث البكا | فماذا الذی بالدمع تنتظران |
| فیا ویح قلبی بالغرام أطعته | فمالی اراه فی السلوّ عصانی |
| وانی وایّاه كما قال قائل | رفیقك قیسی وانت یمانی |

(میرے دو دوستو یہ جو گھر ہیں تو یہ ان کے دیار ہیں' اور میری جو محبت ہے تو اس کا حال تم دیکھ ہی رہے ہو۔
دوستو' یہ ایسی جگہ ہے جو رونے پر آمادہ کرتی ہے' تو آنسوؤں کو اب کس بات کا انتظار ہے!
اے کاش میں نے محبت کے معاملے میں دل کی بات نہ سنی ہوتی۔ آج کیوں وہ صبر و تسلی کے معاملے میں میری بات نہیں سن رہا؟
میرا اور اس کا معاملہ ایسا ہے جیسا کسی کہنے والے نے کہا ہے کہ تمہارا دوست تو قیس قبیلے کا ہے اور تو یمانی ہے۔)

☆.....☆.....☆



# ترکی دور

## سقوطِ بغداد کے بعد قاہرہ نے بغداد اور قرطبہ کی جگہ کیسے سنبھالی

خلیفہ متوکل کے بعد بغداد میں عباسیوں کو زوال آ گیا۔ اس کی وجہ یہ کہ ایرانی اور ترک ایک دوسرے کے مدمقابل آ گئے' اور شیعہ اور اہل سنت کے درمیان اختلافات بڑھنے لگے۔ اس فضا میں خلافت کا رعب و دبدبہ جاتا رہا' اسے کئی طرح کے مصائب کا سامنا ہوا اور ہر طرف سے دشمنوں نے اسے گھیر لیا' اور پھر ہلاکو نے ۱۲۵۸ میں ایک بڑا حملہ کر کے اس کا اقتدار ختم کر دیا۔ ادھر اندلس میں بربر اور موالیوں کے غلبے کی وجہ سے اموی حکومت کمزور پڑ گئی۔ انہوں نے اسے چھوٹی چھوٹی ریاستوں میں تقسیم کر دیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ وہاں کی فرنگی طاقتوں کے لئے ان کو یکے بعد دیگرے نگل لینا آسان ہو گیا۔ چنانچہ انہوں نے ۱۴۹۲ میں اس کا بالکل ہی خاتمہ کر دیا۔ مصر اور شام میں فاطمیوں کی حکومت ایوبیوں کے ہاتھ میں چلی گئی۔ پھر یہ ممالیک کے قبضے میں آ گئی اور ان کے زیر اقتدار رہی' اور اس کے بعد ان دونوں پر ۱۵۱۶ میں عثمانی ترکوں کا قبضہ ہو گیا۔ چنانچہ آپ نے دیکھا کہ اندلس کی اموی حکومت کے زوال کے بعد کئی صدیوں تک عالم اسلام پر ایسا وقت آیا کہ اس میں کہیں کوئی عرب حکمران نہیں تھے اور نہ کہیں عربی جھنڈا لہرا تا تھا۔ بلکہ ان کے ممالک اور جملہ تہذیبی آثار مغلوں' ترکوں' ایرانیوں اور پھر ہسپانویوں کی باہمی کشاکش اور چھینا جھپٹی کا ہدف (Object) بن گئے۔ ان لوگوں نے جو تہذیب سے عاری تھے بہت تخریب کاری کی' کتب خانوں کو جلا دیا' مدارس بند کر دیئے' رصدگاہوں کو گرا دیا۔ اور علماء کو تہ تیغ کر ڈالا۔ اگر ان حالات میں زمانے نے عربی زبان کو بھی زوال سے دوچار کر دیا ہوتا تو یہ کوئی بڑی بات نہ تھی۔ لیکن حوادث کے جبر اور حالات کی ناسازگاری کے باوجود عربی بلاد مغرب' مصر' شام' عراق اور جزیرہ نمائے عرب میں نہ صرف دین اور علوم کی زبان رہی' بلکہ حکومتوں اور امتوں کے درمیان بھی یہی رابطے کی زبان ٹھہری۔ اگر ترکوں کا غرور و تکبر اور ایرانیوں کا تعصب نہ ہوتا تو عربی آج سارے عالم اسلامی کی زبان ہوتی۔

عربوں کے زوال کے باوجود اگر یہ زبان باقی رہی تو اس کی وجہ قرآن حکیم اور جامع الازہر ہیں اور اس کے ساتھ مصر و شام کے وہ ایوبی اور ممالیک سلاطین ہیں جو ایران اور عراق پر چڑھ دوڑنے والے مغلوں کے مقابلے میں عربی زبان کے بڑے حامی، عربوں کے لئے جائے پناہ اور عرب علماء کے لئے معاون اور مددگار ثابت ہوئے۔ اس لئے کہ ایوبی اگرچہ نسلاً کرد تھے لیکن وہ عربی زبان بولتے تھے اور ادب عربی کا ذوق رکھتے تھے۔ چنانچہ ان میں بڑے شاعر، عالم اور مورخ پیدا ہوئے۔ نیز ان کے سائے میں ایسے جید اہل فضل و کمال ابھر کر سامنے آئے جنہوں نے عربی کے علوم کی شیرازہ بندی کی، اور ادب اور لغت میں قابل قدر تصنیفات کیں اور مجموعے مرتب کئے۔

ممالیک کے بعد جب حکومت اور اقتدار بنو عثمان کے ہاتھ میں آیا تو خلافت اب عباسی نہ رہی، بلکہ عثمانی ہو گئی اور اسلام کا دارالحکومت اب قاہرہ نہ رہا، بلکہ قسطنطنیہ ہو گیا اور سرکاری زبان عربی کے بجائے ترکی ہو گئی۔ چنانچہ عربی زبان میں باہر سے الفاظ داخل ہونے لگے اور دفاتر میں عربی اور ترکی کے درمیان مقابلہ بازی شروع ہو گئی۔ عربی کے نثری اور شعری اسلوب کو زوال آ گیا۔ علوم کے چشمے خشک ہو گئے۔ طبائع بجھ کے رہ گئیں اور ایسا لگتا ہے کہ ایک طویل عرصے تک اسلامی ممالک میں ہر طرف تاریکی چھائی رہی۔ لوگوں پر ایک طرح سے نیند کا غلبہ رہا اور وہ بالآخر اس وقت جاگے جب قاہرہ کے دروازوں پر نپولین بونا پارٹ کی توپیں گرجنے لگیں۔

اموی اور عباسی دور اور اس کے بعد فاطمی دور اور پھر ترکی دور میں جو مشاہیر اصحاب علم و فضل رہے، اور جنہوں نے عربی نثر میں اپنی وقیع اور جامع تصنیفات سے عربی ادب کو باثروت بنا دیا، ان کا ایک مختصر تذکرہ اور ان کی تصانیف کا تعارف اس سے اگلے باب میں پیش کیا جائے گا۔ اس سے پہلے البتہ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اس ترکی دور کے ان شعراء کا کچھ تذکرہ ہو جائے جو ادب و فن کی زبوں حالی کے اس دور میں پیدا ہوئے اور انہوں نے عربی شاعری میں فن کے اعلیٰ نمونے پیش کئے۔ یہ تین شاعر ہیں۔ بوصیری (قصیدہ بردہ والے)، صفی الدین الحلی اور ابن نباتہ۔

## بوصیری (م ۱۲۹۵)

شرف الدین محمد بن سعید بن حماد الصنہاجی البوصیری ان کا پورا نام ہے۔ ان کا امتیاز ان کے دو نعتیہ قصیدے ہیں۔ ایک قصیدہ بردہ اور دوسرا ہمزیہ قصیدہ!

یہ دلاص میں پیدا ہوئے، بوصیر میں پروان چڑھے اور پھر قاہرہ چلے آئے۔ یہاں انہوں نے عربی



علوم اور ادب کی تعلیم حاصل کی اور عربی میں سنجیدہ اور مزاحیہ دونوں موضوعات میں اچھے شعر کہنے لگے۔ انہوں نے انشا پردازی بھی کی اور دفتری امور میں منشی اور معتمد کی خدمات بھی انجام دیتے رہے۔ چنانچہ قاہرہ اور باہر کے علاقوں میں یہ کئی مناصب پر فائز رہے۔ اس کے ساتھ ساتھ یہ شاعری بھی کرتے رہے اور نعت کے موضوع پر انہوں نے جو شاعری کی وہ بہت پختہ ہونے کے ساتھ نہایت بلیغ اور خوبصورت تھی۔ جس میں انہوں نے صنعت بدیع کا کافی استعمال کیا۔ پھر یہ زہد و عبادت کی طرف مائل ہو گئے اور صوفیانہ طریقہ اختیار کر لیا۔

بوصیری کی شاعری کا بہت اعلیٰ و ارفع نمونہ البتہ ان کا قصیدہ بردہ ہے، جس کے متعلق لوگوں کا اتفاق ہے کہ یہ آنحضرتؐ کی مدح میں (یعنی نعت کے باب میں) کعب بن زہیر کے قصیدہ "بانت سعاد" کے بعد عربی زبان کی سب سے خوبصورت نظم ہے۔ اس قصیدے کے نظم ہونے کی کہانی یوں ہے کہ ایک دفعہ بوصیری پر فالج کا حملہ ہوا جس کے ان کے دھڑ کا ایک حصہ بالکل مفلوج ہو گیا۔ وہ بڑی تکلیف میں تھے اور روتے رہتے تھے۔ اس زمانے میں انہوں نے آنحضرتؐ کی مدح میں یہ قصیدہ کہا اور اللہ سے دعا کی کہ وہ انہیں اس مرض سے نجات دے۔ ایک رات سوئے تو خواب میں کیا دیکھا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لائے اور مریض کے جسم پر اپنا ہاتھ پھیرا اور اس پر ایک چادر ڈال دی۔ بوصیری جب صبح کو اٹھے تو وہ یہ دیکھ کر حیران رہ گئے کہ ان کی ساری تکلیف جاتی رہی تھی اور وہ بالکل بھلے چنگے ہو چکے تھے۔ اس واقعے کا ذکر جب گرد و پیش میں پھیلا تو اس قصیدے کا نام "قصیدہ بردہ" (چادر والا قصیدہ) پڑ گیا، اور رفتہ رفتہ لوگ اس نظم کے ساتھ کچھ کرامات وابستہ کرنے لگے اور صوفیہ حضرات کے ہاں یہ ایک خاص ذکر ٹھہرا۔

بوصیری کا قصیدہ بردہ دس ابواب پر مشتمل ایک خوبصورت طویل نظم ہے۔ اس میں صوفیانہ شاعری کی وہ زیریں لہر نہیں ہے جو مذہبی شاعری میں اکثر دیکھنے میں آتی ہے۔ اگرچہ قصیدہ بردہ میں شاعری کا معیار وہ تو نہیں ہے جو جاہلی دور کے، یا اموی اور عباسی دور کے بڑے شعراء کے ہاں ملتا ہے۔ لیکن بوصیری کے زمانے میں، جبکہ ادب و شعر کو ہر طرف زوال آ چکا تھا، بوصیری کا یہ قصیدہ اپنے حسن بیان اور مضامین کے اعتبار سے خوشگوار طور پر حیران کن ہے۔

نمونۂ کلام: قصیدے کا آغاز روایتی انداز میں ہجر و وصال اور محبت کے مضامین سے ہوتا ہے:

أمن تذكر جيران بذى سلم — مزجت دمعاً جرى من مقلة بدم

ام هبت الريح من تلقاء كاظمة — أو أومض البرق فى الظلماء من اضم

فما لعینیک ان قلت اکففا ھمتا — وما لقلبک ان قلت استفق یھم
أیحسب الصبّ ان الحبّ منکتم — ما بین منسجم منہ و مضطرم

(کیا یہ ذی سلم کے ہمسایوں کی یاد ہے جس نے تیرے آنسوؤں کو لہو رنگ کر دیا ہے؟
یا کاظمہ کی طرف سے کوئی ہوا چلی ہے' یا اندھیری شب میں کوہ اضم پر بجلی کا کوندا لپکا ہے
تیری آنکھوں کو کیا ہوا ہے کہ تو انہیں تھمنے کو کہے تو وہ اور زیادہ رواں ہوتی ہیں۔ اور تیرے دل پر یہ کیسی آفت آئی کہ وہ تیرے سنبھالے نہیں سنبھلتا اور دیوانہ وار اٹھا پڑتا ہے۔
کیا عاشق کا یہ خیال ہے کہ باوجود اس کے بہنے والے آنسوؤں اور دل کی آہوں کے اس کی محبت چھپی رہے گی؟)

آگے چل کر قصیدے میں نادر حکمت کی باتیں بیان ہوتی ہیں جن میں بدیع کا خوبصورت استعمال کیا جاتا ہے:

والنفس کالطفل ان تُھملہ شبّ علی — حُب الرضاع وان تفطمہ ینفطم
فاصرف ھواھا و حاذر ان تولیہ — ان الھوی ما تولیٰ یُصم اویَصِم
وراعھا وھی فی الاعمال سائمۃ — وان ھی استحلتِ المرعی فلاتسم
کم حسّنت لذۃ للمرء قاتلۃ — من حیث لم یدر ان السم فی الدّسَم
واخشَ الدسائس من جوعٍ ومن شبعٍ — فربّ مخمصۃ شرٌ من التُّخم

(نفس انسانی مانند ایک طفل کے ہے کہ اگر اسے اس کے حال پر چھوڑ دو تو وہ جوان ہونے تک دودھ کا رسیا رہے گا' لیکن اگر ایک دفعہ اس کا دودھ چھڑا دو تو وہ اس سے باز آ جائے گا۔
پس نفس کو اس کی خواہش سے روک اور اسے کہیں اپنا حاکم نہ بنا دے۔ ہوائے نفس جب غالب آ جاتی ہے تو وہ اسے یا تو مار ڈالتی ہے یا بالکل کما کر دیتی ہے۔
جب یہ اعمال کی چراگاہ میں چر رہی ہو تو اس کی پوری پوری نگرانی کر اور اگر وہ چراگاہ کو خوشگوار سمجھنے لگے تو اسے مت چرنے دو۔
نفس کی خواہشوں کو اس طرح بنا سنوار کر پیش کرتا ہے جو اس کے لئے مہلک ہوتی ہیں۔ وہ نہیں جانتا کہ بعض دفعہ لذیذ کھانوں میں زہر ملا ہوتا ہے۔
بھوک اور سیری کی پوشیدہ خرابیوں سے ڈر' اس لئے کہ بسا اوقات بھوک شکم سیری سے زیادہ بری ثابت ہوتی ہے۔)

آنحضرتؐ کی مدح میں بوصیری نے جو اشعار کہے ہیں ان میں سے بعض یہ ہیں:



محمد سیّد الکونین والثقلین — والفریقین من عرب و من عجم
نبیّنا الآمر الناھی فلا احد — أبرّ فی قول لا منہ ولا نعم
ھو الحبیب الذی تُرجی شفاعتہ — لکل ھولٍ من الاھوال مقتحم
دعا الی اللہ فالمستمسکون بہ — مستمسکون بحبلٍ غیر منفصم
فانسب الی ذاتہ ماشئت من شرف — وانسب الی قدرہ ماشئت من عظم
فان فضل رسول اللہ لیس لہ — حدٌ فیعرب عنہ ناطق بفم

(محمدؐ دو جہانوں کے اور جن و انس کے سردار ہیں۔ وہ عرب اور عجم دونوں فریقوں کے سردار ہیں۔
وہ ہمارے نبی ہیں' حکم دینے والے اور منع کرنے والے۔ پس امر و نہی کے بیان کرنے میں کوئی بھی ان سے زیادہ راست گو نہیں ہے۔
آپ خدا تعالیٰ کے وہ محبوب ہیں کہ مصیبتوں میں سے ہر سخت مصیبت میں آپ کی شفاعت کی توقع کی جاتی ہے۔
انہوں نے اللہ کی طرف بلایا۔ پس جو لوگ آپ کے دامن سے وابستہ ہیں۔ وہ ایک نہ ٹوٹنے والی رسی سے وابستہ ہیں۔
آپؐ کی ذات کی طرف جو کمال بھی تو چاہے منسوب کر لے اور ان کی قدر و منزلت کے بارے میں جو عظمت بھی تمہارے ذہن میں ہو قائم کر لو اس لئے کہ آنحضرت کی بزرگی کی کوئی حد نہیں ہے' جسے کوئی بولنے والا بیان کر سکے)

## صفی الدین الحلّی (م ۱۳۳۹)

صفی الدین ابوالبرکات عبدالعزیز بن علی الطائی الحلی جزیرہ نمائے عرب کا شاعر تھا۔ وہ فرات پر واقع ایک شہر حلہ میں پیدا ہوا اور وہیں پروان چڑھا اور ادب کی تحصیل کی۔ اس کے ساتھ اس نے شعر کہنے شروع کئے اور اس میں ایسا کمال دکھایا کہ اپنے وقت کا سب سے بڑا شاعر قرار دیا گیا۔ جب اس کے وطن میں امن و امان نہ رہا تو وہ ماردین کو ہجرت کر گیا اور وہاں ارتقیہ سلطنت کے ایک سلطان نجم الدین غازی کی مدح کی۔ ان لوگوں نے اس کا خوف دور کیا اور اسے اپنی پناہ میں لے لیا۔ یہاں اس نے ان کی مدح میں انتیس قصیدے کہے۔ ہر قصیدے میں انتیس اشعار تھے اور ہر شعر حروف تہجی کے ایک خاص حرف سے شروع ہوتا تھا اور اسی حرف پر ختم ہوتا تھا (یعنی وہی حرف اس شعر کی ردی ہوتی تھی) یہ نظمیں "القصائد الارتقیات" کے نام سے مشہور ہوئیں۔ یہ الگ بھی شائع ہوئیں اور اس کے دیوان کے ساتھ

بھی۔

اس کے بعد صفی الدین اس سلطان کے بیٹے صالح شمس الدین کے پاس رہا۔ پھر اس نے حج کا سفر اختیار کیا اور واپسی پر مصر کی طرف چل دیا۔ جہاں اس نے سلطان ناصر بن قلاوون کی مدح کی۔ یہاں بادشاہ کے معتقد نے اس کو اپنا دیوان جمع کرنے کا مشورہ دیا۔ چنانچہ اس نے یہ دیوان بارہ ابواب پر مرتب کر کے جمع کیا۔

صفی الدین حلی کا شمار صنعت بدیع کے ائمہ میں ہوتا ہے' جنہوں نے اس میں نئی نئی چیزیں پیدا کیں اور اسے اپنے شعروں میں کسی تکلف کے بغیر استعمال کیا۔ اس نے شاعری کے تمام فنون میں طبع آزمائی کی۔ فصیح عربی میں بھی اور عامی عربی میں بھی۔ اس نے سنجیدہ شاعری بھی کی اور مزاحیہ بھی۔ اور پھر طویل قصیدوں کے ساتھ ساتھ اس نے مقطعات' موشحات' مخمسات' مشطرات' موالیا' زجل اور قوما ہر نوع کی شاعری میں اپنے جوہر دکھائے۔ دیوان کے علاوہ صفی الدین نے کچھ تصنیفات بھی کیں۔ اس کی شاعری عام طور پر بہت سہل ہوتی ہے۔ اس کے الفاظ فصیح اور اس کے مضامین بہت دلآویز ہوتے ہیں۔ سوائے اس شاعری کے جو وہ اپنے کمالات دکھانے کے لئے کرتا ہے۔ اس لئے کہ اس میں بات نہیں بن پاتی اور وہ سماعت پر گراں گزرتی ہے۔

نمونہ کلام: صفی الدین کی شاعری کا ایک اچھا نمونہ اس کا وہ نونیہ قصیدہ ہے جو اس نے اپنی جوانی میں کہا تھا' اور اس سے وہ شاید ابن زیدون کے نونیہ قصیدے کا جواب پیدا کرنا چاہتا تھا:

| | |
|---|---|
| سل الرماح العوالی عن معالینا | واستشهد البیض هل خاب الرجا فینا |
| لما سعینا فما رقت عزائمنا | عما نروم ولا خابت مساعینا |
| یا یوم وقعة زوراء العراق وقد | دنا الاعادی کما کانوا یدینونا |
| بضمّر ما ربطنا ها مسوّمة | الا لنغزو بها من بات یغزونا |
| وفتیة ان نقل اصغوا مسامعهم | لقولنا او دعونا هم أجابونا |
| قوم اذا استخصموا کانوا فراعنة | یوماً وان حکّموا کانوا موازینا |
| اذا ادّعوا جاءت الدنیا مصدّقة | وان دعوا قالت الایام آمینا |
| لا یظهر العجز منا دون نیل منیً | ولو رأینا المنایا فی امانینا |

(اونچے نیزوں سے ہماری رفعتوں کے بارے میں پوچھو' اور تلواروں سے بھی گواہی لو' کیا ہم امیدوں پر پورے نہ اترے۔



جب ہم نے کوشش کی تو ہمارے عزائم ہمارے مقاصد کے مقابلے میں کمزور ثابت نہ ہوئے اور نہ ہماری مساعی ناکام رہیں۔

اے زوراء العراق کے معرکے والے دن' جب ہم نے دشمنوں کو زیر کر لیا' جیسے اس سے پہلے وہ ہمیں دبایا کرتے تھے۔

ضمر کے مقام پر ہم نے اپنے گھوڑوں کو اسی لئے نشان لگا کے اور باندھ کے رکھا کہ ہم ان کو ساتھ لے کر ان سے لڑیں گے جو ہم سے لڑنے کے لئے آئیں گے۔

وہ ایسے جوان ہیں کہ جب ہم بات کریں تو وہ غور سے سنتے ہیں اور اگر ہم انہیں بلائیں تو وہ ہماری دعوت پر آتے ہیں۔

ہم ایسے لوگ ہیں کہ اگر ہماری دشمنی مول لی جائے تو ہم فرعون ہیں اور اگر ہمیں حکم بنایا جائے تو ہم انصاف کے میزان بن جاتے ہیں۔

جب وہ کوئی دعویٰ کرتے ہیں تو دنیا آ کے تصدیق کرتی ہے اور اگر وہ دعا کرتے ہیں تو زمانہ اس پر آمین کہتا ہے۔

آرزوؤں کے حصول کے راستے میں ہمارے اندر کوئی کمزوری نہیں ہوتی' اگرچہ ہمیں اپنی آرزوؤں کے راستے میں موت کے سائے دکھائی دیتے ہیں)

## ابن نباتہ (م ۱۳۶۶)

شاعر اور ادیب' انشا پرداز اور مصنف جمال الدین محمد بن محمد' جو ابن نباتہ کے نام سے مشہور ہوا' ممالیک کے زمانے میں مصر کے شعراء کا سرخیل تھا۔ اس نے ابن زیدون کے رسالے کی شرح "سرح العیون" کے عنوان سے لکھی' اور صنعت توریہ (کسی شے کی حقیقت کو چھپا کر دوسری بات ظاہر کرنا) میں مشہور ادیب اور شاعر القاضی الفاضل کا صحیح جانشین ثابت ہوا۔

وہ سیف الدولہ حمدانی کے خطیب عبدالرحیم کی نسل سے تھا۔ اس کی پیدائش مصر میں فسطاط کے مقام پر ہوئی اور وہ قاہرہ میں پروان چڑھا۔ وہاں اس نے بڑے بڑے مشائخ اور اساتذہ سے علم و ادب کی تحصیل کی اور القاضی الفاضل کی شاعری اور رسائل کے مطالعے کا دلدادہ رہا۔ اور اس کے خاص اسالیب کو اس نے اپنا لیا' جن میں توریہ تھا اور توجیہ اور طباق (دو متقابل معانی کو یکجا کرنا) تھے اور ان ساری ادبی صنعتوں کو اس نے اس خوبی سے برتا کہ نثر و نظم میں وہ القاضی الفاضل کے بعد ان میں ماہر سمجھا گیا۔ پھر اس کی پیروی اس کے معاصرین میں سے بعض لوگوں نے کی' جیسا کہ صلاح الدین الصفدی

اور زین الدین الوردی وغیرہ۔ ابن نباتہ کے بعد مصر و شام میں پھر کوئی شاعر ایسا نہ ہوا جو خیال کی لطافت' لہجے کی نرمی' عبارت کی مربوطی اور تمدنی مضامین کے استعمال میں اس کا مقابلہ کر سکتا۔

ابن نباتہ نے صنعت جناس کا زیادہ استعمال نہیں کیا۔ اواخر عمر میں وہ کچھ ذہنی انتشار کا شکار ہو کر نحاسین کے محلے کے ایک ہسپتال میں داخل ہوا۔ اور وہیں ۱۳۶۶ میں وفات پا گیا۔

ابن نباتہ جس زمانے میں رہا وہ حوادث اور اضطراب کا زمانہ تھا۔ ادھر تاتاری حملوں کا خوف تھا اور اس پر مستزاد یہ کہ مصر میں ایسا قحط پڑا کہ بھوک کے مارے لوگ حرام جانور کھانے پر مجبور ہو گئے۔ ابن نباتہ جو کمزور اعصاب کا تھا ان حالات سے بہت متاثر ہوا اور اس کے اندر خوف بیٹھ گیا۔ چنانچہ اس کی شاعری پر اس نفسی کیفیت کا اثر صاف دکھائی دیتا ہے۔ اس کی شاعری میں قوت اور شجاعت کی باتیں نہیں ہوتیں' نہ وہ کسی کی ہجو کرتا ہے اور اگر وہ کسی پر عتاب بھی کرتا ہے تو بہت نرم اور ملائم لہجے میں۔ مثال کے طور پر وہ کہتا ہے۔

لئن ضاع مثلی عند مثلک اننی　　　لعمر المعالی عند غیرک اضیع
وما کان صعباً لو مننت بلفظة　　　ترد بها عنی الخطوب و تردع
وقلت امرؤ للشکر والاجر قابل　　　وللبرّ فیه و الصنیعة موضع
ومغترب عن قومه و دیاره　　　أساعده والله یُعطی ویمنع

(اگر میری طرح کا انسان تمہاری طرح کے انسان کے ہاں ضائع ہو گیا' تو سرفرازیوں کی قسم وہ تمہارے علاوہ کسی اور کے ہاں اس سے بھی زیادہ ضائع ہو جاتا۔
کوئی ایسی مشکل بات تو نہ تھی کہ ایک لفظ کہہ کر مجھ پر احسان کر دیتے' اور اس سے میری پریشانیاں رفع کر دیتے۔
اور کہہ دیتے کہ یہ آدمی شکریے اور اجر کے لائق ہے اور اس کے اندر نیکی کا جذبہ بھی ہے اور کسی کے ساتھ بھلائی کرنے کا میلان بھی۔
یہ اپنے لوگوں اور اپنے وطن سے دور آیا ہوا ہے تو میں اس کی مدد کروں گا۔ اور ویسے تو اللہ ہی دینے والا اور روکنے والا ہے)

چنانچہ مغلوبیت اور دست برداری ابن نباتہ کی شاعری میں ہر جگہ نمایاں ہیں۔ اس کے ہم عصر دوسرے شعراء کے ہاں اس زمانے کی زندگی کا کچھ احوال مل جاتا ہے اور وہ لوگ واقعات و حوادث کا تذکرہ بھی اپنے شعروں میں کر جاتے ہیں' لیکن ایسی کوئی چیز ابن نباتہ کے ہاں نہیں ملتی۔ یوں سمجھئے کہ وہ ایک تقلید پسند شاعر ہے اور قدیم شعراء کی طرح تغزل اور مدح کی شاعری کرتا جاتا ہے۔ چاہے اس کے



گرد کتنا شور و شغب ہو اور کتنے ہی فتنے اٹھ رہے ہوں' اسے صرف اپنا اور اپنے کنبے کا خیال رہتا ہے اور اس ضمن میں وہ محبت و شفقت کے جذبوں کا خوبصورت اظہار کرتا ہے۔

لیکن اپنے سارے انکسار اور عاجزی کے باوجود اسے اپنی شاعری کے حسن کا احساس ہے اور وہ اس پر فخر بھی کرتا ہے۔ چنانچہ اپنی نظموں میں اکثر وہ اپنی شاعرانہ صلاحیتوں کی بات کرتا ہے۔ مثلاً ایک قصیدے کے آخر میں کہتا ہے:

من مبلغ العُرب عن شعری و دو لته　　　ان ابن عبّاد باق وابن زیدونا
حَبرتُها فیه زهراء المعاطف من　　　اعلی وانفس ما یُهدی المجیدونا
کان الفاظها فی سمع حُسّدها　　　کواکب الرجم یحرقن الشیاطینا

(عربوں کو میری شاعری اور اس کے موروثی سلسلے کے بارے میں کون بتائے گا کہ ابن عباد بھی موجود ہے اور ابن زیدون بھی۔
میں نے اس کو اس اعلیٰ اور خوبصورت ترین پیراہن سے آراستہ کیا ہے جو ہمارے بہترین سخنور ہمیں عنایت کرتے رہتے ہیں۔
میری شاعری کے الفاظ اس کے حاسدوں کے کانوں میں اس طرح پڑتے ہیں جیسے رجم کرنے والے سیارے شیاطین پر آگ برساتے رہتے ہیں)

ابن نباتہ نے اپنے زمانے میں ایک ادیب کی حالت زار پر بہت افسوس کیا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ موجودہ حالات میں ایک ادیب کو نہ تو کوئی مقام دیا جاتا ہے اور نہ اس کے فن کی کوئی قدر کی جاتی ہے۔ ممالیک کے زمانے میں دراصل قوم کی ساری توجہ علوم اور تصنیف و تالیف کے کاموں کی طرف ہو گئی تھی' اور شاعری کی طرف لوگ کم ہی دھیان دیتے تھے۔ چنانچہ ایک شاعر محض اپنی شاعری کے بل بوتے پر زندہ نہیں رہ سکتا تھا۔ اس صورت حال کا بیان ابن نباتہ سلطان ناصر کی مدح کرتے ہوئے یوں کرتا ہے:

وقالوا فلان رمّ بالشعر عیشه　　　فیالیت انی مِتّ لست اشعر
تصرّم اقصی العمر ادعوک للمُنی　　　وارقب آفاق الرجاء وانظر
واصبر و الایام تقتلنی اسیً　　　فها انا فی الدنیا قتیل مصبّر
اری دون حظی مسلکا متوعراً　　　اذا ماجرت فیه المُنی تتعثّر
ویحمر دمعی حین تصفر وجنتی　　　فالبس ثوب الهم وهو مشهّر
ولا ذنب لی عند الزمان کما تری　　　سوی کلم کالروض تبهی و تبهر

(انہوں نے کہا کہ فلاں شخص نے شاعری کے ذریعے اپنی زندگی کو کچھ درست کر لیا ہے۔ کاش

میں مر جاتا اور یہ شاعری نہ کرتا۔

عمر کا بڑا حصہ اس میں گزار کر میں نے اپنی امنگوں کے لئے آپ کو آواز دی۔ اور امید کے آفاق پر نگاہ جمائے رکھی اور دیکھتا رہا۔

میں نے ایسی حالت میں صبر کیا ہے کہ زمانہ مجھے مارے ڈالتا ہے۔ اب دیکھ لو کہ میری حالت دنیا میں ایک مقتول اور مقید کی سی ہے۔

میرے سامنے ایک ایسا مشکل راستہ ہے کہ جب آرزوئیں اس پر چلتی ہیں تو گر گر پڑتی ہیں۔

میرا آنسو سرخ ہو جاتا ہے جب میرا چہرہ زرد ہو۔ اس وقت میں فکر و پریشانی کا لبادہ اوڑھے لیتا ہوں' جس کا حال سب پر آشکار ہوتا ہے

اور تم دیکھ ہی رہے ہو کہ دنیا کے نزدیک میرا گناہ اور کچھ نہیں سوائے ان الفاظ کے جو ایک چمنستان کی طرح خوبصورت بھی ہوتے ہیں اور روشنی بھی پھیلاتے ہیں)

☆.....☆.....☆



باب ۶

# عربی زبان میں علوم وفنون

## اُموی دور سے ترکی دور تک

بنو اُمیہ کے زمانے میں ادب و شاعری کو فروغ حاصل رہا' لیکن علوم کی طرف ان کی زیادہ توجہ نہ ہو سکی۔ اس لئے کہ وہ ایک طرف فتوحات میں مصروف تھے اور دوسری طرف مذہبی اور سیاسی گروہوں کی معاندانہ کارروائیوں نے انہیں سکون سے نہ بیٹھنے دیا۔ علوم میں انہوں نے صرف نحو' تفسیر' فقہ اور تدوین حدیث میں ابتدائی کام کیا' اور اس کے ساتھ دوسری قوموں کے علوم کا عربی میں ترجمہ کرنے کا آغاز کیا۔

لیکن علمی کاموں کا جو بیج اموی دور میں بویا گیا اس کے ثمرات عباسی دور میں آ کر حاصل ہوئے۔ جہاں تک دوسری قوموں کے علوم کے ترجموں کا تعلق ہے۔ اس میں عباسی خلفاء میں سے دوسرے خلیفہ ابوجعفر المنصور نے پہل کی اور علم نجوم اور طب کی کتابوں کے ترجمے کرائے۔ آگے چل کر خلیفہ ہارون الرشید نے اس کام کو مزید وسعت دی۔ چنانچہ اس کے وقت میں طب' کیمیا' نجوم' الجبرا' علم نباتات اور حیوانیات کی کتابیں عربی میں منتقل کر لی گئیں۔ اس کے بعد مامون الرشید کے دور میں یہ علمی بیداری اور ترقی اپنے عروج کو پہنچ گئی۔ اس خلیفہ نے ارمینیا' سوریا' مصر اور دوسرے ممالک سے کتابوں کے انبار اونٹوں پر لدوا کر منگوائے اور دارالحکومت میں مترجمین کی جماعتوں کو ان کے ترجمے کے کام پر لگا دیا۔ چنانچہ اس وقت کے علوم وفنون میں کوئی بھی ایسا نہ رہا جس کا عربی زبان میں ترجمہ نہ کیا گیا ہو۔ ترجمے کے اس کام کے علاوہ اس عہد میں اپنے ہاں کے علوم میں بھی کافی کام ہوا اور مسلسل ہوتا رہا' چاہے دینی علوم ہوں یا لغت و بیان اور عروض و قافیہ کے علوم ہوں۔ اس کے ساتھ اس دور کے مسلم اہل علم نے عملی علوم میں بھی ایجادات کیں اور مظاہر قدرت کی خالص علمی انداز میں توجیہہ و تشریح کی۔ مثلاً انہوں نے مائع اور جامد اجسام کی حرکت کے قوانین مرتب کئے' وقت بتانے والی گھڑی ایجاد کی' جو ہارون الرشید نے فرانس کے بادشاہ شارلمان کو تحفے میں بھیجی۔ اسی طرح پنڈولم اور قطب نما کو متعارف کرایا' اور الجبرا کے علم میں کافی اضافے کر کے اسے ترقی دی۔ رصدگاہوں کا نظام قائم کیا اور سورج گرہن اور چاند گرہن کا ٹھیک ٹھیک حساب لگایا' وغیرہ۔ اس عباسی دور میں مدرسے اور کتب خانے قائم کیے گئے۔ ہارون الرشید

نے حکم دیا تھا کہ جو بھی جامع مسجد بنائی جائے اس کے ساتھ ایک بڑا مدرسہ ضرور ہونا چاہیے۔ علم و ادب اور سائنس اور فنون کی یہ گرم بازاری اور ارتقا دولت عباسیہ کے زمانے تک کم و بیش جاری رہا۔ اس کے بعد جب تاتار کا غلبہ ہوا اور پھر ترکوں نے حکومت سنبھالی' تو علم کی یہ ساری ترقی اور نشوونما بہت حد تک رک گئی۔ لوگوں کا کام اب زیادہ تر یہ رہ گیا کہ اسلاف کی کتابوں کی شرحیں لکھیں اور ان کے خلاصے پڑھنے پر اکتفا کریں۔

عباسی دور کے متوازی اندلسی دور تھا' جو اس کے زوال کے سوا دو سو سال بعد تک رہا۔ اس کے بعد ایک دور فاطمیوں کا آیا' جو ایوبیوں اور ممالیک سے ہوتا ہوا بالآخر عثمانی ترکی دور پر ختم ہوا۔ تاریخ کے اس سارے طویل دور میں جو ۷۵۰ء میں عباسی دور کے آغاز سے لے کر ۱۷۹۸ء میں ترکی حکومت کے زوال تک ایک ہزار سال سے بھی زیادہ عرصے تک پھیلا ہوا ہے' عربوں کے ہاں مختلف علوم و فنون میں جو نشوونما ہوئی اور ان علوم میں جو ائمہ اور اساتذہ اور مشاہیر پیدا ہوئے۔ اور انہوں نے اپنی تصانیف کی صورت میں ان علوم میں تحقیق و تدوین کے جو خزانے عربی زبان و ادب کو دیے وہ ویسے تو ایک الگ کتاب کا موضوع ہے' لیکن عربی ادب کی کوئی تاریخ بھی ان کے ذکر کے بغیر مکمل نہیں سمجھی جا سکتی۔ اس لئے اس باب میں کوشش کی جائے گی کہ سائنس اور فلسفے کے علوم کو چھوڑ کر دوسرے ادبی' لغوی' تاریخی اور دینی علوم میں' جو سماجی علوم (Humanities) کے تحت آتے ہیں' شروع سے آخر تک جو ارتقا ہوا اور ان میں جو اہم رجال پیدا ہوئے اور انہوں نے تصنیف اور جمع و تدوین کا جو کام کیا' اس کا ایک مختصر لیکن جامع تذکرہ کر دیا جائے۔ اس کے لئے یہ طریقہ اختیار کیا جائے گا کہ پہلے ایک خاص علم کا چند الفاظ میں تعارف پیش کیا جائے گا اور پھر اس میں جو علماء اور ائمہ پیدا ہوئے ان کے حالات اختصار کے ساتھ بیان کئے جائیں گے' اور اس کے ساتھ ان کی مشہور تصانیف کا ذکر ہو گا۔

## ا۔ روایت ادب اور روایان ادب

قدیم زمانے میں چونکہ لکھنے کا رواج ابھی نہیں پڑا تھا۔ اس لئے جاہلی زمانے سے لے کر آگے تک شاعری اور ادب (خطبات' اقوال' امثال وغیرہ) کے محفوظ کرنے اور اسے آگے تک پہنچانے کا صرف ایک ہی طریقہ تھا کہ کوئی ان چیزوں کو یاد کرے اور پھر انہیں دوسروں تک پہنچانے کے لئے ان کی روایت کرے۔ ایسے لوگوں کو جو شعر و ادب کی اس طرح روایت کرتے تھے 'راوی' (جمع رواۃ) کہا جاتا تھا۔ تمام جاہلی شاعری' بشمول معلقات (آویزاں نظمیں) اور اس کے بعد صدر اسلام اور اموی دور کا سارا شاعرانہ کلام اور خطبات اور اقوال و امثال ہم تک کبھی نہ پہنچ پاتے' اگر یہ راوی لوگ اس کو اپنے ذہنوں میں محفوظ



کرکے اس کی روایت نہ کرتے۔ چنانچہ عام دستور تھا کہ ہر بڑے شاعر کا کوئی نہ کوئی راوی ہوتا تھا' اور بعض صورتوں میں یہ راوی آگے چل کر خود بڑے شاعر بن کر سامنے آتے تھے۔ جیسا کہ مشہور جاہلی شاعر زہیر بن ابی سلمیٰ پہلے اپنے سسر اوس بن حجر کا راوی تھا اور آگے چل کر وہ خود اکابر شعراء میں شمار ہوا۔ اسی طرح حطیئہ' فرزدق اور جریر' ان سب بڑے شعراء کے راوی تھے' جن کے نام ہمیں معلوم ہیں۔

جاہلی اور اس کے بعد صدر اسلام اور بنو امیہ کی شاعری کے جو سب سے بڑے راوی ہوئے اور انہوں نے روایت ادب میں بڑا نام پیدا کیا وہ یہ پانچ تھے۔ حماد الراویہ' خلف الاحمر' اصمعی' ابوعبیدہ معمر بن المثنیٰ اور ابوزید الانصاری۔ ذیل میں ان کا کچھ احوال بہت اختصار کے ساتھ دیا جاتا ہے۔

### حماد الراویہ (م ۷۷۲)

یہ کوفہ میں پیدا ہوا اور بغداد میں وفات پائی۔ اس کا باپ دیلمی تھا۔ حماد نے اپنے وسیع علم کی بدولت کافی شہرت حاصل کی۔ اس نے جاہلی اور اسلامی عہد کی شاعری اور ایام عرب کا بہت بڑا حصہ یاد کر رکھا تھا۔ اور اہل بادیہ کی خالص زبان پر اسے عبور حاصل تھا۔ چنانچہ ان دنوں اگر کسی شاعری یا شاعر کے مرتبے کا تعین کرنا ہوتا تھا تو حماد کو حکم بنایا جاتا تھا۔ جاہلی دور کے معلقات (در کعبہ پر آویزاں نظمیں) اسی نے جمع کی تھیں اور ان کی روایت کی تھی۔

### خلف الاحمر (م ۷۹۶)

یہ خود بصرے کا رہنے والا تھا' لیکن اس کے آباء و اجداد کا تعلق فرغانہ سے تھا۔ یہ بھی شاعری کے بڑے راویوں میں سے تھا اور شاعری کا نقاد ہونے کے ساتھ ساتھ خود بھی بہت اچھے شعر کہتا تھا۔ اس کی شاعری کا رنگ بالکل قدیم شعراء کا سا تھا۔ چنانچہ بعض لوگوں کا خیال ہے کہ کچھ نظمیں ایسی ہیں جو اس نے خود کہہ کر انہیں کسی بڑے جاہلی شاعر سے منسوب کر دیا' اور ان کے اعلیٰ معیار کی وجہ سے لوگوں کو بالکل پتا نہ چل سکا۔ اسی طرح کچھ لوگوں کا یہ بھی خیال ہے کہ جاہلی شاعر شنفریٰ کی مشہور نظم "لامیۃ العرب" دراصل اس کی تخلیق ہے۔ لیکن یہ خیال صحیح نہیں لگتا' اس لئے کہ لامیۃ العرب میں صحرا کی زندگی اور اس کے حیوانوں اور درندوں کا جو احوال بیان ہوا ہے وہ کوئی ایسا شاعر ہی نظم کر سکتا تھا جو خود بے خانماں ہو اور صحرا میں ان درندوں کے بیچ میں رہا ہو۔ ایک دوسرے بڑے راوی اصمعی نے بہت سی قدیم

نظمیں خلف الاحمر سے سنیں اور پھر ان کی روایت کی۔

## اصمعی (م ۸۳۱)

ابوسعید عبدالملک نام تھا' اور دادا کے نام کی نسبت سے اصمعی کہلایا۔ اس نے بصرے میں مشہور لغوی اور نحوی الخلیل اور ابوعمرو بن العلاء سے تعلیم حاصل کی' اور خلف الاحمر سے روایت کی۔ خود اس کے تلامذہ میں سے ابوالفضل الریاشی' ابوعبیدہ اور بجستانی مشہور ہوئے۔ اصمعی نے بادیہ عرب کی خالص زبان سیکھی اور حفظ کی۔ اس کے علم و ادب کی شہرت کا سن کر خلیفہ ہارون الرشید نے اسے امین کا اتالیق مقرر کیا۔ اس کی تصنیفات میں ''کتاب خلق الانسان''۔ ''کتاب الخیل''۔ ''کتاب الابل''۔ ''کتاب الاضداد'' اور ایک شعری مجموعہ (Anthology) ''الاصمعیات'' مشہور ہیں۔ یہ بات صحیح ہے کہ اگر اصمعی نہ ہوتا تو ہم بہت سے عرب شعراء کی شاعری اور ان کے دیوانوں سے محروم رہ جاتے۔

## ابوعبیدہ معمر بن المثنیٰ (م ۸۲۵)

یہ بصرے میں پیدا ہوا اور وہیں فوت ہوا۔ لغت و شعر کا بہت بڑا عالم تھا۔ اس نے ابوعمرو بن العلاء اور یونس بن حبیب سے اکتساب کیا۔ اور خود اس سے ابوعبید بن سلام' بجستانی اور شاعر ابونو اس نے استفادہ کیا۔ ابوعبیدہ نے عربوں کے حالات اور ان کے نسب ناموں سے متعلق بہت سی معلومات جمع کیں۔ پھر اموی دور کے دو شاعروں جریر اور فرزدق کے ادبی معرکوں اور ایک دوسرے کے خلاف کہی ہوئی ہجووں کا مجموعہ تیار کیا۔ یہ اپنے عقائد میں خارجی تھا' اور اس کی کتاب ''مثالب'' نے شعوبیہ کی تحریک کو یہ حوصلہ دیا کہ وہ عربوں کے خلاف ہتھیار اٹھائیں۔ اس کی متعدد کتابوں میں ''مجاز القرآن'' جو تفسیر کے موضوع پر ہے۔ نیز ''کتاب الخیل'' اور ''نقائض جریر والفرزدق'' مشہور ہیں۔

## ابوزید الانصاری (م ۸۳۱)

سعید بن اوس نام' نحو ولغت کا بڑا عالم تھا۔ اس نے ابوعمرو بن العلاء سے کسب علم کیا اور المفضل الضبی کی شاگردی اختیار کی۔ علم نحو میں یہ اصمعی اور ابوعبیدہ دونوں سے بڑا تھا اور اہل بصرہ کے ثقات میں



اس کا شمار ہوتا تھا۔ اس کی مطبوعہ تصانیف میں ''کتاب النوادر فی اللغۃ'' اور ''کتاب المطر'' مشہور ہیں۔

## ۹۔ علم نحو اور اس کے رجال

فتوحات کے نتیجے میں جب عربوں کے اقتدار کا دائرہ وسیع ہوا تو مملکت کے بعض حصوں مثلاً عراق میں عجمی لوگوں کی آبادی زیادہ ہونے لگی۔ یہ لوگ جب عربی زبان بولتے تو اس میں لحن کا ارتکاب کرتے (یعنی یہ زبان جس قاعدے سے بادیہ عرب میں بولی جاتی تھی اس سے ہٹ کر بولتے) یہ لحن جب قرآن کریم کے معاملے میں لوگوں سے سرزد ہونے لگا تو صورتحال سنجیدہ ہو گئی۔ چنانچہ اس امر کی ضرورت محسوس ہوئی کہ عربی زبان کے کچھ بنیادی قواعد اور اصول مقرر کئے جائیں' تاکہ لوگ ان قواعد کو ملحوظ رکھ کر عربی زبان بولیں۔ اس کام کی ابتدا ابوالاسود الدؤلی نے کی۔ جس نے ایک عام روایت کے مطابق حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے کہنے پر عربی زبان کے موٹے موٹے قواعد وضع کرنے کا بیڑا اٹھایا' اور سب سے پہلے اسم فعل اور حرف کا امتیاز قائم کیا اور فاعل اور مفعول کے اعراب کی صورتیں بتائیں۔ اس کام کو ابن اسحاق اور ہارون بن موسیٰ نے آگے بڑھایا اور عیسیٰ ابن عمر نے اس میں باقاعدہ تالیف کا آغاز کیا۔ نحو میں سب سے پہلا اور بڑا نام سیبویہ کا ہے جس نے اس پر ایک کتاب لکھی اور نحو کے ابواب قائم کئے۔ نحو کی نشوونما پہلے عراق کے مشہور شہر بصرہ میں ہوئی۔ اس کے بعد کوفہ کے لوگوں نے اس علم میں دلچسپی لینی شروع کی اور اس علم کی تعلیم اور تدوین میں وہ بصرہ والوں کا مقابلہ کرنے لگے۔ رفتہ رفتہ بصرہ اور کوفہ میں عربی نحو کے دو دبستان قائم ہو گئے۔ جن کے درمیان مقابلہ و مناقشہ کی گرماگرمی ہر وقت رہنے لگی۔ اختلاف کی وجہ یہ تھی کہ اہل بصرہ زبان کے قواعد کے معاملے میں سماع کے قائل تھے' یعنی ایک بات کو جس طرح عرب کے اہل بادیہ نے ادا کیا وہی زبان کا قاعدہ اور قانون ٹھہرا' جبکہ اہل کوفہ اس معاملے میں قیاس کو زیادہ اہمیت دیتے تھے۔ ان کے نزدیک زبان کے جو قواعد ایک دفعہ مقرر کر دیئے گئے عربی بولنے والوں کو لازماً ان کی پیروی کرنی چاہیے۔ اور اس کے لئے بادیہ کے رہنے والوں کی طرف رجوع کرنے کی ضرورت نہیں۔ کوفہ والے چونکہ دارالحکومت بغداد کے نسبتاً زیادہ قریب تھے' اس لئے حکام اور عمائدین نے بھی نحو کے معاملے میں اہل کوفہ کو مقدم رکھا۔ پھر یہ ہوا کہ جوں جوں وقت گزرتا گیا' یہ دونوں مکاتب شہروں میں آ کر ایک دوسرے سے قریب ہوتے گئے' اور گیارہویں صدی کے آتے آتے نحو کے ان دونوں دبستانوں کے علماء اور اکابر منظر سے ہٹ گئے' اور ان کے حامی اور علم بردار بھی کمزور پڑ گئے۔ چنانچہ یہ نزاع بالآخر ختم ہو گئی۔ اور جن لوگوں نے عربی زبان میں تالیف و تصنیف کا کام شروع کیا انہوں نے بصری مذہب کی پیروی کی۔ البتہ جہاں کوئی اختلافی معاملہ درپیش ہوا وہاں انہوں

نے کوئی مذہب کی طرف رجوع کیا۔

اس کے ساتھ نحو اور صرف نے ایک باقاعدہ علم کی صورت اختیار کی۔ کچھ لوگوں نے بڑی تفصیل کے ساتھ اس کے قواعد اور ضابطے مدون کئے اور اس موضوع پر ضخیم تصنیفات کیں۔ کچھ دوسرے لوگوں نے ان ضخیم کتابوں کا اختصار کیا اور نحو پر آسان اور مختصر رسالے لکھے' اور یہ سلسلہ وقت کے ساتھ ساتھ چلتا ہوا آج تک چلا آیا ہے۔

عربی نحو کے تعلق سے جو بڑے نام تاریخ میں آتے ہیں ان میں سے کچھ یہ ہیں: دبستان بصرہ کے ابوعمرو بن العلاء' الخلیل بن احمد' الاخفش الاکبر' سیبویہ' یونس بن حبیب' اور دبستان کوفہ کے معاذ الہرّاء' رؤاسی' کسائی' فراء' ابن الحاجب۔ قریب کے زمانوں میں ابن مالک اور ابن ہشام دو ایسے نام ہیں جنہوں نے نحو کے باب میں بہت مستند اور حوالے کی تصنیفات کیں' جن کی طرف آج بھی رجوع کیا جاتا ہے اور وہ مدارس کے نصاب میں شامل ہیں۔ نحو کے تعلق سے زیادہ مشہور اور اہم رجال کا مختصر تذکرہ حسب ذیل ہے۔

## سیبویہ (م ۷۹۶)

ابوبشر عمرو بن عثمان شیراز کے قریب بیضاء میں پیدا ہوا اور وہیں فوت ہوا۔ اس کی ساری نشوونما بصرہ میں ہوئی۔ اس نے الخلیل بن احمد سے علم کی تحصیل کی۔ ایک دفعہ اس کو جب یہ حدیث املاء کرائی گئی کہ "لیس من اصحابی احد الا لوشئت لاخذت علیه لیس ابا الدرداء" تو سیبویہ یہ سن کر کہنے لگا "لیس ابوالدرداء" اس پر حماد نے اس سے کہا "سیبویہ تم نے لحن کیا۔ یہ استثناء کا معاملہ ہے۔ اور اس میں ابـاالـدرداء ہی صحیح ہے" سیبویہ نے جب یہ سنا تو عزم کیا کہ وہ زبان کے قواعد کا علم اس طرح حاصل کرے گا کہ اس سے کبھی لحن کی لغزش سرزد نہ ہو۔ چنانچہ اس نے نحو کا باقاعدہ علم حاصل کیا اور الخلیل بن احمد کی صحبت اختیار کی اور اس کے علاوہ اس نے یونس بن حبیب اور عیسیٰ بن عمر سے بھی کسب فیض کیا۔ یہاں تک کہ وہ علم نحو میں ماہر ہو گیا اور اس فن میں اس نے جو کتاب لکھی وہ ایسی جامع اور مستند ثابت ہوئی کہ وہ "الکتاب" (The Book) کے نام سے مشہور ہوئی۔

نحو میں یہ مقام حاصل کرنے کے بعد سیبویہ بغداد گیا اور وہاں برامکہ سے جا کے ملا۔ ان دنوں دوسرا نحوی کسائی ہارون الرشید کے بیٹے امین کا استاد تھا۔ یحییٰ بن خالد نے دونوں کو اکٹھا کیا اور آپس میں ان کا مقابلہ کرایا تو ایک جملے کے بارے میں ان دونوں کے درمیان اختلاف ہوا۔ سیبویہ کا کہنا تھا کہ یہ



"فاذا ھو ھی" ہونا چاہیے' جبکہ کسائی کی رائے تھی کہ یہ "فاذا ھو ایاھا" ہوگا۔ جب بادیہ عرب سے ایک بادیہ نشین اعرابی کو بلا کر پوچھا گیا تو اس نے سیبویہ کو درست ٹھہرایا۔ لیکن امین نے کسائی کا ساتھ دیا' اس لئے کہ وہ اس کا استاد بھی تھا اور کوفی بھی تھا۔ یہ دیکھ کر سیبویہ بغداد کو چھوڑ کر شیراز کے قریب اپنے گاؤں میں واپس آ گیا' اور وہیں چالیس سے کچھ اوپر عمر میں وفات پائی۔

## کسائی (م ۸۰۵)

ابوالحسن علی بن حمزہ نحو میں اہل کوفہ کا امام تھا۔ کوفہ میں پروان چڑھا اور حمزۃ الزیات سے قرأت سیکھی' اور سات بڑے قراء میں سے ایک تسلیم کیا گیا۔ شاعری کے ساتھ اسے کوئی رغبت نہ تھی اور بڑی عمر کو پہنچ کر بھی وہ نحو میں کچھ نہیں جانتا تھا۔ ایک دفعہ جب وہ ایک لمبی سیر سے واپس آیا تو کہنے لگا "لقد عییت" اس پر اس کے ایک ساتھی نے کہا: تم ہمارے ساتھ اٹھتے بیٹھتے ہو' پھر بھی لحن کرتے ہو۔ اگر تمہاری اس بات کا مقصد یہ تھا کہ تم تھک گئے ہو تو تمہیں "اعییت" کہنا چاہیے تھا۔ یہ سن کر وہ بہت شرمندہ ہوا۔ اور اس نے لغت اور نحو کا باقاعدہ علم حاصل کرنے کا تہیہ کر لیا۔ چنانچہ اس نے کوفہ کے نحویوں معاذ الہراء اور رواسی کی صحبت اختیار کی اور ان سے سارا علم حاصل کر لیا۔ پھر وہ بصرہ جا کر الخلیل بن احمد سے ملا اور اس کے علم سے مرعوب ہو کر اس سے پوچھا کہ "اتنا سارا علم آپ کو کیونکر حاصل ہوا؟" الخلیل نے جواب دیا کہ حجاز کی وادیوں سے اور نجد اور تہامہ سے! یہ سن کر کسائی نے بھی بادیہ عرب کا رخ کیا۔ وہاں ایک عرصہ بسر کیا اور بادیہ کے فصحاء کے ساتھ میل جول رکھا۔ اس طرح عربی زبان کا علم حاصل کرنے کے بعد جب وہ بغداد واپس آیا تو ہارون الرشید نے اسے امین کا اتالیق مقرر کیا۔ وہ اس عہدے اور قدر و منزلت پر رہا' پھر وہ رَے چلا گیا اور وہیں اس نے وفات پائی۔ اس کی تصانیف میں "کتاب معانی القرآن" "کتاب النحو" اور "رسالۃ فی ما یلحن فیہ العامۃ" مشہور ہیں۔

## فرّاء (م ۸۲۲)

ابوزکریا یحییٰ بن زیاد فرّاء کوفے میں پیدا ہوا اور کسائی سے تلمذ کیا۔ اس سے علم حاصل کر کے فارغ التحصیل ہوا تو بادیہ کے عربوں میں جا کے رہا اور ان سے لغت کا علم حاصل کیا۔ اس کے ساتھ ساتھ اس نے طبعی علوم' علم نجوم' اخبار عرب اور ان کے اشعار کے حفظ میں بھی خاص مقام پیدا کیا اور اپنے استاد کسائی سے آگے بڑھ گیا۔ کہتے ہیں اہل کوفہ میں سے فراء سے زیادہ کسی نے عربی زبان کی خدمت نہ

کی۔ ابو العباس ثعلب کا کہنا ہے "اگر فراء نہ ہوتا تو عربی زبان نہ ہوتی ' اس لئے کہ اس نے صحیح طرح سے اس علم کی تحصیل کی اور اس کے قواعد وضوابط بنائے۔ اگر وہ نہ ہوتا تو زبان کی حالت اچھی نہ ہوتی" اور ابوبکر الانباری کہتا تھا "اگر اہل بغداد اور اہل کوفہ میں عربی زبان کے علماء میں سے صرف کسائی اور فراء ہی ہوتے تو یہ ان کے لئے تمام لوگوں کے مقابلے میں فخر سے سر اونچا کرنے کی بات ہوتی۔" فراء نے جب لغت ونحو میں اعلیٰ مقام حاصل کر لیا تو وہ بغداد پہنچا جہاں کسائی نے اس کے وہاں رکنے کا انتظام کیا اور اپنے بعد نحو کی تعلیم کے لئے اسے اپنا جانشین مقرر کیا۔ جب مامون خلیفہ ہوا تو اس نے اپنے دونوں بیٹوں کی تعلیم کے لئے فراء کو مقرر کیا۔ اس کی شان یہ تھی کہ جب وہ کہیں جانے کے لئے اٹھنے لگتا تو دونوں شہزادے اس کی جوتیاں سیدھی کرنے کے لئے ایک دوسرے پر سبقت لے جانے کی کوشش کرتے۔ یہ جان کر ایک دفعہ مامون نے فراء سے پوچھا۔ "تمہارے خیال میں اس مملکت میں وہ کون ہے جس کی سب سے زیادہ عزت کی جاتی ہے؟" فراء نے جواب دیا "وہ خلیفہ کے سوا اور کون ہو سکتا ہے؟" مامون نے کہا "نہیں' سب سے زیادہ عزت والا شخص وہ ہے جس کی جوتیاں سیدھی کرنے کے لئے خلافت کے ولی عہد ایک دوسرے سے سبقت لے جانے کے لئے دوڑتے ہیں" فراء نے کہا "میں نے انہیں اس سے روکنے کا ارادہ کیا تھا' لیکن پھر انہیں اس لئے نہیں روکا کہ اس میں بھی ان کی تربیت کا ایک پہلو ہے" مامون نے کہا "اگر آپ ان کو اس سے روکتے تو میں آپ کو ملامت کرتا۔ اس لئے کہ جو کچھ وہ کرتے ہیں اس سے ان کے شرف میں کوئی کمی نہیں ہوتی' بلکہ اس سے ان کی قدر ومنزلت میں اضافہ ہوتا ہے۔ اور انسان چاہے کتنا بڑا ہو جائے وہ تین لوگوں سے بڑا نہیں ہو سکتا۔ اپنے سلطان سے' اپنے والدین سے اور اپنے استاد سے۔"

فراء کی کافی تصانیف ہیں۔ اس کا حافظہ اتنا قوی تھا کہ وہ اپنی کتابیں بجائے لکھنے کے املاء کرایا کرتا تھا۔ وہ سال کا زیادہ حصہ بغداد میں گزارتا۔ سال کے آخری دنوں میں وہ کوفے کی طرف نکل جاتا اور وہاں انہیں وہ کچھ بتاتا جو اس نے بغداد میں اکٹھا کیا ہوتا۔ یہاں تک کہ ایک دفعہ مکہ جاتے ہوئے وہ راستے میں ہی فوت ہو گیا۔

فراء کی تصانیف میں "کتاب الحدود" اور "کتاب معانی القرآن" مشہور ہیں۔

## ابن الحاجب (م ۱۲۴۸)

یہ موخر زمانے کا نحوی ہے جو بالائی مصر کے علاقے اسنا میں پیدا ہوا اور بچپن میں ہی قاہرہ آ گیا'



جہاں اس نے قرآن حفظ کیا اور امام مالک کے مذہب پر فقہ کی تحصیل کی۔ قرآن کی قراتوں اور دوسرے علوم میں بھی استعداد پیدا کی۔ تاہم عربی زبان کا علم اس کا سب سے بڑا مشغلہ رہا۔ دمشق جا کر نحو کے موضوع پر نوٹس جمع کیے۔ پھر سکندریہ واپس آ گیا اور یہیں فوت ہوا۔

ابن الحاجب کی مصنفات میں نحو کے موضوع پر "الکافیہ" اور "الشافیہ" بہت مشہور اور متداول ہیں۔ ان کے علاوہ "الامالی النحویہ" (Grammatical Dictations) ہیں' اور پھر علم اصول دجدل میں اس کی مفصل کتاب "منتهى السؤل والامل" ہے' جو امام مالک کے مذہب پر ایک مفصل فقہی کتاب ہے' جس کا اختصار "مختصر ابن الحاجب" کے نام سے بہت مشہور ہے۔ اور مدارس میں شامل نصاب رہی ہے۔ اسی طرح اس کی ایک کتاب "جامع الامهات فی الفقه" بھی اپنے موضوع کے لحاظ سے بہت اہم سمجھی جاتی ہے۔

اوپر جن علمائے نحو کا ذکر ہوا ان کے بعد میں آنے والے کم از کم دو نام بہت نمایاں اور اہم ہیں اور اس قابل ہیں کہ ان کا خصوصی ذکر کیا جائے۔ ایک "الفیه ابن مالک" کے مصنف ابن مالک اور دوسرے "شذور الذهب" کے مصنف ابن ہشام۔

## ابن مالک (م ۱۲۷۴)

ابوعبداللہ بن محمد' یہ اندلس کے شہر جیان میں پیدا ہوا۔ دمشق جا کر سخاوی سے اور حلب میں ابن یعیش سے نحو کی تعلیم حاصل کی۔ پھر اس نے دمشق میں عربی لغت کے مبادی کی تعلیم دی اور نحو میں وہ مقام پایا کہ قریب تھا کہ شہرت میں وہ سیبویہ کے مدمقابل ٹھہرے۔ اس کی تصنیف "الكافية الشافية" نحو کے موضوع پر ایک نظم ہے۔ جس کا اختصار اس نے "الفیہ" کی صورت میں کیا۔ اور "الفیہ ابن مالک" نحو کی بہت مستند اور متداول کتاب قرار پائی۔ اس کے علاوہ اس کی نظم "لامیة الافعال" ہے' نیز "شواهد التوضيح والتصحيح لمشكلات الصحيح" ہے جو صحیح بخاری کے مشکل مقامات کی تشریح وتوضیح کرتا ہے۔

## ابن ہشام (م ۱۳۶۰)

جمال الدین عبداللہ بن یوسف' قاہرہ میں پیدا ہوا اور وہیں فوت ہوا۔ نحو اور لغت میں بہت شہرت

حاصل کی۔ بہت سے اساتذہ سے اس نے علم کی تحصیل کی اور ابن حیان اندلسی کی مجلس درس میں بیٹھا۔ نحو میں اس نے اہل موصل کا طریقہ اپنایا۔ اس کی تصنیفات میں "مغنی اللبیب عن کتب الاعاریب" نیز "شذور الذھب فی معرفة کلام العرب" اور "قطر الندی و بل الصدی" بڑی اہمیت کی حامل ہیں۔ تاہم ابن ہشام کی شہرت زیادہ تر اس کی کتاب "شذور الذھب" سے ہے جو نحو کے موضوع پر قریبی زمانے میں لکھی گئی سب سے مستند اور متداول کتاب ہے اور اس کی کئی شرحیں لکھی گئی ہیں۔

## ۳۔ علم لغت اور مولفین لغات

عربی زبان کے الفاظ کی حرکات کے معاملے میں جب لوگوں کا ملکہ بگڑنے لگا تو علمائے نحو نے اس کو درست کرنے کے لئے ضابطے اور قواعد بنائے۔ لیکن اس سے عربی لغت کے استعمال میں کوئی اصلاح واقع نہ ہوئی' بلکہ الفاظ کے معانی اور انکو صحیح طرح سے برتنے میں کمزوری کے آثار نظر آنے لگے۔ اس صورت حال کی اصلاح کے لئے ائمہ لغت آگے آئے اور انہوں نے انسان' اونٹ' گھوڑوں یا نباتات سے متعلق الفاظ کو چھوٹے چھوٹے کتابچوں میں جمع کرنا شروع کیا۔ پھر جب نحو اور لغت کے عالم اجل الخلیل بن احمد کا دور آیا تو اس نے "کتاب العین" لکھ کر عرب لغت کی تدوین کے کام کا آغاز کر دیا۔ کتاب العین میں ان سب الفاظ کے معانی کی تشریح کی گئی جو حلق سے نکلتے ہیں اور ان کے بعد وہ الفاظ جو زبان سے نکلتے ہیں اور آخر میں وہ جو دانتوں سے ادا ہوتے ہیں۔ یہ لغت چونکہ حرف عین سے شروع ہوتی تھی اس لیے اسے "کتاب العین" کہا گیا۔ الخلیل کے بعد ایک سو سال تک لغت میں کوئی کام نہ ہوا۔ یہاں تک کہ ابن درید نے آ کر کتاب العین اور دوسری کتابوں سے اخذ و استفادہ کر کے کتاب "الجمھرة" تصنیف کی اور اس کی ترتیب حروف تہجی پر رکھی۔ اس کے بعد ازہری نے کتاب "التھذیب" الخلیل کی ترتیب کے مطابق لکھی۔ پھر جوہری نے ادھر مشرق میں "الصحاح" تصنیف کی اور ادھر مغرب (اندلس) میں ابن سیدہ نے "المحکم" لکھی۔ ان کے بعد عربی کی جن معاجم کا نام مشہور ہوا اور وہ متداول بھی رہیں' ان میں ثعالبی کی "فقہ اللغة" اور زمخشری کی "اساس البلاغة" ہیں۔

عربی لغت کی کتابوں میں جامعیت اور ثقہ اور مستند ہونے کے اعتبار سے جو کتابیں سب سے بلند درجہ رکھتی ہیں وہ ہیں: ابن منظور کی "لسان العرب" فیروز آبادی کی "القاموس المحیط" اور مرتضی زبیدی کی "تاج العروس" جو القاموس کی بہت ضخیم شرح ہے۔

مذکورہ بالا ائمہ لغت اور علماء میں سے چند ایک کا مختصر احوال ذیل میں دیا جاتا ہے۔



## الخلیل بن احمد (م ۷۸۲)

ابو عبدالرحمان الخلیل بن احمد الفراہیدی بصرے میں پیدا ہوا اور وہیں پروان چڑھا۔ نحو قرأت اور حدیث کا علم اس نے عربی زبان کے ائمہ اور عمرو بن العلاء اور عیسیٰ ابن عمر جیسے اعلیٰ درجے کے راویان سے حاصل کیا۔ پھر وہ بادیہ عرب میں جا کے رہا اور فصیح زبان کے ساتھ ساتھ نامانوس الفاظ سے بھی واقفیت حاصل کی۔ یہاں تک کہ وہ عربی زبان کے علم میں اتنے اونچے مقام پر فائز ہو گیا جہاں اس کے بعد آج تک کوئی نہیں پہنچ سکا۔ اس سے سیبویہ اور بعض دوسرے ائمہ نحو و لغت نے استفادہ کیا۔ وہ ساری عمر روکھی سوکھی کھا کر بصرے میں ہی مقیم رہا۔ اور کبھی کسی سے کوئی امید نہ رکھی اور نہ اپنے آپ کو کسی کے سامنے گرایا۔ ایک دفعہ سلیمان بن علی نے اہواز سے اس کے پاس قاصد بھیجا کہ اس کے بیٹے کو تعلیم دے۔ الخلیل نے سلیمان کے قاصد کے سامنے ایک روکھی روٹی رکھتے ہوئے کہا "اسے کھاؤ' اس لئے کہ میرے پاس اس کے سوا کچھ نہیں' اور جب تک مجھے سوکھی روٹی میسر ہے مجھے سلیمان کی مدد کی ضرورت نہیں ہے" الخلیل کی موت کا واقعہ عجیب ہے۔ روایت ہے کہ اس نے کہا کہ میں اس طرح کا حساب مرتب کرنا چاہتا ہوں کہ اس کی مدد سے ایک لونڈی سبزی فروش کے پاس جائے تو وہ اس کا حق نہ مار سکے۔ وہ ایک مسجد میں اسی خیال میں ڈوبا ہوا داخل ہوا تو ایک ستون کے ساتھ اس بری طرح سے ٹکرایا کہ اس کے سر میں سخت چوٹ آئی اور وہ بالآخر اس تکلیف سے جانبر نہ ہو سکا۔

الخلیل بن احمد نحو' لغت اور قیاس کی تصحیح اور مسائل کے استنباط میں بہت اونچے مرتبے پر فائز تھا۔ نحو میں سیبویہ کی "الکتاب" اس کے دیئے ہوئے درسوں سے اخذ کی ہوئی ہے۔ اس کے ساتھ وہ موسیقی کا علم بھی رکھتا تھا' اور نغموں سے اس واقفیت کی وجہ سے اس نے "علم عروض" ایجاد کیا اور شعر کے پندرہ اوزان ترتیب دیے۔ الخلیل پہلا شخص ہے جس نے عربی لغت کی تدوین کی اور عربی خط کو موجودہ صورت میں رائج کیا۔ "کتاب العین" کے علاوہ اس کی دوسری کتابوں میں "کتاب النغم"۔ "کتاب العروض"۔ "کتاب الشواھد"۔ "کتاب النقط والشکل" اور "کتاب الایقاع" کے نام آتے ہیں۔

## ابن درید (م ۹۳۳)

ابوبکر محمد بن الحسن بن درید بصرے میں پیدا ہوا' وہیں پروان چڑھا اور اس شہر کے علماء ریاشی اور سجستانی سے علم حاصل کیا۔ پھر وہ فتنہ زنج میں بصرے کو چھوڑ کر عمان چلا گیا اور وہاں بارہ سال رہ کر



Scanned with CamScanner

بادیہ کے عربوں سے زبان اور شاعری سیکھی۔ بصرہ واپس آ کر وہ شاہ ابن میکال اور اس کے بیٹے کی مصاحبت اختیار کرنے کے لئے ایران چلا گیا۔ وہ دونوں اس وقت فارس کے والی تھے۔ ابن درید نے ان کے لئے لغت کی کتاب "الجمهرة فی اللغة" لکھی اور ایک نظم "مقصورة" میں ان کی مدح کی۔ انہوں نے اسے دیوان کا نگران مقرر کر دیا۔ چنانچہ ایران سے جو بھی مکاتیب لکھے جاتے وہ اس کے مشورے سے لکھے جاتے۔ جب میکال کے بیٹے فارس کی عملداری سے معزول کیے گئے اور وہ خراسان چلے گئے تو ابن درید بغداد آ گیا۔ یہاں وزیر ابن الفرات نے اس کی بڑی آؤ بھگت کی اور انعام سے نوازا۔ خلیفہ مقتدر نے اس کے علم و فضل کی شہرت سن کر اس کے لئے پچاس دینار کا وظیفہ مقرر کر دیا' جو اس کے گزارے کے لئے کافی تھا۔ چنانچہ وہ اطمینان کے ساتھ علم و ادب اور تالیف و تصنیف کے کاموں میں مصروف رہا' تا آنکہ فالج کے حملے میں بیمار ہو کر فوت ہو گیا۔

ابن درید عیش و طرب کا دلدادہ تھا۔ باقاعدہ شراب پیتا تھا۔ اس کے ہاتھ میں جو مال بھی آتا اسے لہو و لعب اور تحفوں میں خرچ کر ڈالتا۔ ایک دن ایک سائل اس کے در پر آیا تو اسے دینے کے لئے اس کے پاس کچھ بھی نہیں تھا۔ اس نے شراب کا مٹکا اٹھا کر اسے دے دیا۔ اس پر اس کے ایک عزیز نے اعتراض کیا تو جواب دیا: میرے پاس اور کچھ بھی تو نہیں تھا اور قرآن کی آیت پڑھی کہ لن تنالوا البر حتی تنفقوا مما تحبون (تم کبھی نیکی نہیں پا سکو گے جب تک تم اپنے محبوب مال میں سے خرچ نہ کرو۔ آل عمران ۳: ۹۲) اس کے بعد یہ ہوا کہ اسے کسی نے دس شراب کے مٹکے تحفے میں دے دیئے' تو ابن درید نے اپنے اس عزیز سے کہا: دیکھا ہم نے ایک مٹکا دیا تو دس ہمارے پاس آ گئے۔

ابن درید نے لغت' ادب اور علم انساب میں بہت اونچا مقام حاصل کیا' اور ان سارے علوم میں وہ الخلیل بن احمد کا جانشین ثابت ہوا۔ اس کے متعلق کہا گیا کہ وہ شعراء میں سب سے بڑا عالم اور فقیہ ہے' اور علماء و فقہاء میں سب سے بڑا شاعر ہے۔ اس نے اپنی کتابوں میں اس طرح کی نثر لکھی جو آگے چل کر مقامات کا پیش خیمہ ثابت ہوئی۔ اس کی شاعری میں بہترین چیز اس کا "مقصورة" ہے (یعنی چھوٹی الف کی ردی والی نظم) جس میں عربوں کے کافی حالات اور امثال اور حکیمانہ اقوال جمع کیے گئے ہیں۔ اس نظم کی بہت سے لوگوں نے شرح کی ہے اور بعض لوگوں نے اس کے نمونے پر نظمیں کہی ہیں۔

ابن درید اپنے مقصورہ میں کہتا ہے:

| | |
|---|---|
| وانما المرء حدیث بعده | فکن حدیثا حسنا لمن وعی |
| واللوم للحر مقیم رادع | والعبد لا یردعه الا العصا |
| وآفة العقل الهوی فمن علا | علی هواه عقله فقد نجا |



(انسان اپنے بعد صرف ایک بات بن کر رہ جاتا ہے۔ پس اپنے یاد کرنے والوں کے لئے ایک اچھی بات بنو۔
ملامت ایک آزاد کو سیدھا کرتی اور باز رکھتی ہے' لیکن ایک غلام کو سوائے چھڑی کے کوئی چیز باز نہیں رکھ سکتی۔
انسان کی عقل کے لئے اس کی خواہش بڑی مصیبت ہے۔ جس کی خواہش پر اس کی عقل غالب آ گئی وہ نجات پا گیا)

## ابوعلی القالی (م ۹۶۷)

ابوعلی اسماعیل بن القاسم' مشہور عالم لغت' دیار بکر کے مقام منازجرد میں پیدا ہوا۔ اس نے پہلے بغداد میں قیام کیا اور پھر اندلس کی طرف نکل گیا۔ بغداد میں اس نے ابن درید' ابن السراج' بجستانی' ابوبکر انباری اور کچھ دوسرے لوگوں سے تعلیم حاصل کی۔ جب وہ بغداد آیا تو ایسے رفقاء کے ساتھ تھا جن میں شہر قالی قلا کے لوگ تھے۔ چنانچہ لوگوں نے اسے ان کا ہم وطن سمجھا اور اس کا لقب القالی مشہور ہو گیا۔ ابوعلی نے قرطبہ میں بیٹھ کر درس دیا اور علم عربیت کو پھیلایا' اور وہیں فوت ہوا۔ اس کے شاگردوں میں ابوبکر زبیدی شامل ہے۔ ابوعلی کی سب سے عمدہ اور مشہور عالم تصنیف اس کے "امالی" (Dictations) ہیں' اس کے علاوہ "کتاب النوادر" اور "کتاب البارع فی اللغة" ہیں۔
موخر الذکر ایک بڑی لغت ہے' لیکن اس کے صرف بعض حصے ہی باقی رہ گئے ہیں۔

## ازہری (م ۹۸۰)

ابومنصور محمد بن احمد ہرات میں پیدا ہوا۔ علمائے لغت میں سے تھا۔ اپنے شہر میں محمد بن جعفر سے اور بغداد میں نفطویہ سے علم حاصل کیا۔ ایک دفعہ حج سے واپس آ رہا تھا کہ ہبیر کے مقام پر قرامطہ کے ہاتھ آ گیا۔ چنانچہ ایک طویل عرصے تک بادیہ عرب میں رہا۔ اس طرح کہ سرما کسی ایک قبیلے میں گزارتا تو بہار کسی دوسرے قبیلے میں۔ گرما کسی تیسرے قبیلے میں بسر کرتا تو خزاں کسی اور قبیلے میں۔ اس نے بادیہ کے ان قبائل میں پھر کر عربی لغت میں مہارت حاصل کر لی۔ اس کی کتاب "التهذیب فی اللغة" لغت کی ایک اہم کتاب ہے' جو الخلیل کی "کتاب العین" کے طرز پر ہے۔



Scanned with CamScanner

## جوہری (م ۱۰۰۵)

ابونصر اسماعیل فاراب (ترکی) میں پیدا ہوا۔ اور نیشاپور میں فوت ہوا۔ عرب لغت کے مرتبین میں سے تھا۔ اس نے ایک زمانہ بادیہ کے قبائل میں خصوصاً ربیعہ اور مضر میں گزارا اور یوں لغت کے اصل چشموں سے سیراب ہوا اور اس کے بہت سے الفاظ کے معانی کی تحقیق کی۔ اس کے ساتھ ساتھ وہ ایک ماہر خطاط بھی تھا۔ اس نے نیشاپور میں لوگوں کو تعلیم دی۔ یہیں وہ مالیخولیا میں مبتلا ہوا تو ایک دن اپنے گھر کی چھت سے اپنے آپ کو نیچے گرادیا۔ جوہری کی تصانیف میں سب سے مشہور "تاج اللغة و صحاح العربية" ہے جو "الصحاح" کے نام سے جانی جاتی ہے۔ یہ عربی زبان کی ایسی لغت ہے جس میں اس نے چالیس ہزار الفاظ جمع کئے ہیں۔ لیکن کہا جاتا ہے کہ اس کی یہ لغت غلطیوں اور مسامحتوں سے بھری ہوئی تھی۔ چنانچہ اس کی موت کے بعد اس کے شاگرد ابراہیم بن صالح الوراق نے اس پر نظر ثانی کر کے اسے درست کیا۔ اب یہ ایک مستند عربی لغت سمجھی جاتی ہے۔

## ابن سیدہ (م ۱۰۶۶)

علی ابن سیدہ اندلس کے شہر مرسیہ میں پیدا ہوا اور دانیہ میں اس کی وفات ہوئی۔ لغت اور ادب اور منطق میں عالم اجل تسلیم کیا گیا۔ اپنے باپ کی طرح وہ بھی نابینا تھا۔ اس کی تصانیف میں ایک تو "المحكم و المحيط الاعظم" ہے جو الخلیل کی کتاب العین کی ترتیب کے ساتھ عربی کی ایک لغت ہے اور دوسری جو زیادہ مشہور اور متداول ہے وہ "المخصص" ہے جو ایک ایسی لغت ہے جس میں الفاظ کو موضوعات کے اعتبار سے جمع کیا گیا ہے۔

## زمخشری (م ۱۱۴۴)

محمود بن عمر ابوالقاسم زمخشر میں پیدا ہوا۔ وہ لغت، نحو، بیان اور تفسیر میں اپنے وقت کا امام تھا۔ چونکہ مکہ مکرمہ کے قریب رہتا تھا اس لئے جار اللہ (اللہ کا ہمسایہ) اس کا لقب پڑا۔ عقائد میں معتزلی تھا۔ لغت میں اس کی سب سے مشہور اور متداول کتاب "اساس البلاغة" ہے۔ اس کے علاوہ اس کی تصانیف میں "الكشاف عن حقائق التنزيل" ہے جو قرآن کی مشہور تفسیر ہے۔ نیز "المفصل فی النحو" "كتاب



الفائق فی غریب الحدیث" "اطواق الذهب" اور "نوابغ الكلم" قابل ذکر ہیں۔

☆.....☆.....☆

اس زمانے کے ایک سو سال سے بھی زیادہ عرصہ بعد عربی لغت کی تدوین میں ایسے کام ہوئے جنہوں نے سب اگلے کاموں کو پیچھے چھوڑ دیا، اور زبان میں اب وہی حوالے اور استناد کی چیز بن گئے۔ یہ وہ کام ہیں جو مصر کے ابن منظور، شیراز (ایران) کے فیروز آبادی اور یمن کے مرتضیٰ زبیدی نے سرانجام دیے۔ ان اصحاب کا مختصر احوال ذیل میں دیا جاتا ہے۔

## ابن منظور (م ۱۳۱۱)

جمال الدین محمد ابن مکرم، جو عربی زبان کی سب سے بڑی لغت "لسان العرب" کا مصنف ہے، قاہرہ کے ایک علمی گھرانے میں پیدا ہوا، اور اپنے وقت کے بڑے شیوخ سے اس نے تعلیم حاصل کی اور علوم و آداب میں اتنی استعداد بہم پہنچائی کہ وہ انشا نگاری کے دفتر میں تعینات ہو گیا۔ پھر اس نے کچھ عرصہ طرابلس الغرب میں قاضی کے عہدے پر کام کیا اور اس سارے عرصے میں وہ مطالعہ اور تصنیف و تالیف کے کام میں مصروف رہا، یہاں تک کہ اسے خالق کی طرف سے بلاوا آ گیا، اور وہ اپنی تصنیف کی پانچ سو کتابیں چھوڑ کر قاہرہ میں فوت ہو گیا۔

ابن منظور اپنے عقائد میں شیعہ تھا، لیکن رافضی نہیں تھا، جیسا کہ اس موضوع پر بات کرتے ہوئے اس کی لغت "لسان العرب" کے اسلوب سے متبادر ہوتا ہے۔ ابن منظور میں کوئی نئی بات پیدا کرنے کی زیادہ صلاحیت نہیں تھی۔ اس کا کام زیادہ تر پچھلی تصانیف کو جمع کرنے اور ان کا اختصار مرتب کرنے کا تھا۔ اس کے بارے میں صلاح الدین صفدی کا کہنا ہے کہ "مجھے ادب کی کتابوں میں کوئی ایسی کتاب معلوم نہیں جس کا ابن مکرم نے اختصار نہ کیا ہو۔"

لسان العرب: یہ وہ جامع اور ضخیم لغت ہے جس میں ازہری کی "تہذیب" ابن سیدہ کی "محکم" جوہری کی "صحاح" ابن درید کا "جمہرۃ" اور ابن الاثیر کی "نہایۃ" سب جمع ہو گئے ہیں۔ اسے ابن منظور نے الفاظ کے آخری حروف کی ہجائی ترتیب پر مرتب کیا۔ اور لغت کے الفاظ کے معانی بتاتے ہوئے قدیم راویوں کے نصوص، نیز ان معانی کے شواہد کے طور پر قرآن، حدیث، امثال اور اشعار سے استناد کیا ہے۔

ابن منظور کی دوسری تصانیف میں "مختصر الاغانی" "مختصر تاريخ بغداد" "مختصر

مفردات ابن البیطار" "مختصر العقد لابن عبدربہ" "مختصر زھرا لآداب" مختصر الحیوان للجاحظ" اور "مختصر الیتیمہ للثعالبی" شامل ہیں۔

## فیروز آبادی (م۱۴۱۴)

ابو طاہر محمد بن یعقوب فیروز آبادی شیراز کے قریب کار زین کے مقام پر پیدا ہوا۔ وہ عربی لغات مرتب کرنے والے ائمہ میں سے ایک ہے۔ اس نے شیراز' واسط' بغداد اور دمشق میں تعلیم حاصل کی' اور قدس میں دوسروں کو درس دیا۔ جب وہ سفر کرتا تو کتابوں سے لدے ہوئے کئی اونٹ اس کے ساتھ ہوتے۔ اس کی تصانیف میں سب سے مشہور "القاموس المحیط" ہے' جو عربی زبان کی نہایت ہی عمدہ اور مستند لغت ہے اور عربی مدارس میں عام مستعمل رہی ہے۔

## مرتضی الزبیدی (م۱۷۹۰)

عالم لغت اور محدث۔ اس کا تعلق یمن سے تھا' لیکن قاہرہ میں رہا اور وہیں وفات پائی۔ اس کی تصانیف میں زیادہ مشہور غزالی کی "احیاء علوم الدین" کی طویل شرح ہے جو اس نے کی۔ اس کا استعمال ہندوستان اور سوڈان میں بہت ہوا ہے۔ اس کی دوسری اتنی ہی اہم' لیکن زیادہ مشہور کتاب "تاج العروس" ہے جو فیروز آبادی کی لغت "القاموس المحیط" کی بہت مفصل شرح ہے اور بجائے خود ایک ضخیم لغت ہے۔

☆......☆......☆

## ۴۔ عربی زبان میں ادب و شعر کے مجموعے (Anthologies) اور مختارات (Selections)

اموی اور عباسی ادوار میں جب ادب و شعر کا ہر طرف چرچا ہوا' اور لوگ شاعروں کا کلام' خطیبوں کے خطبے اور ادیبوں کے اقوال اور امثال اور انشا پردازوں کے رسائل زبانی روایت کرنے لگے تو بعض دانشمند ادباء کو یہ خیال ہوا کہ اگر زبانی روایتوں کا یہ بے بہا ذخیرہ وقت گزرنے پر لوگوں کے ذہنوں میں محو ہو گیا تو عربی ادب کو اس سے کتنا بڑا نقصان ہو گا۔ یہ سوچ کر کچھ لوگوں نے ادب و شعر کی روایتوں کا انتخاب کر کے ان کو مجموعوں کی صورت میں ترتیب دینے کا بیڑا اٹھایا' اور یہ کام عباسی دور کے اوائل سے جو شروع ہوا تو آگے تک چلتا گیا۔ عربی زبان و ادب کے کم از کم تو مجموعے ایسے ہیں کہ ان کے بغیر عربی



زبان کا کوئی بھی کتب خانہ ایک معیاری کتب خانہ نہیں کہلایا جا سکتا۔ ذیل میں ان مجموعوں (Anthologies) اور ان کے مرتب کرنے والوں کا مختصر احوال درج کیا جاتا ہے۔

## "البیان و التبیین" للجاحظ (م۸۶۸)

یہ عباسی دور کے سب سے بڑے ادیب جاحظ کی آخری کتاب ہے (جاحظ کے تعارف کے لئے دیکھئے صفحہ ۱۷۹) اس میں موضوعات کا ایسا تنوع ہے جس میں کوئی ترتیب نہیں ہے۔ اس میں قرآنی آیات بھی ہیں' احادیث بھی ہیں' ادب کے نوادر بھی ہیں اور ان کے علاوہ حکمت کی باتیں' خطبات اور قصائد بھی کچھ ہے۔ یہ کتاب جاحظ نے دراصل شعوبیت (یعنی عرب مخالف خیالات وافکار) کے رد میں ترتیب دی تھی۔ اس میں وہ یہ بتانا چاہتا ہے کہ بلاغت و ادب کے میدان میں عربوں کی فوقیت مسلم ہے۔ اس مجموعے میں جو مباحث ملتے ہیں وہ کچھ اس طرح کے ہیں: ۱۔علم بیان' علم بلاغت اور ان کے قواعد۔ ۲۔خطابت (یعنی فن تقریر) اور اس کے اصول۔ ۳۔زبان کے عیوب مثلاً لکنت' لحن' تمتہ وغیرہ۔ ۴۔شاعری اور اس کے معیار۔ ۵۔رسائل اور وصیتوں کے اعلیٰ نمونے ۶۔بادیہ کے اعراب کے نوادر اور ان کے حالات وغیرہ۔ "البیان و التبیین" کی اہمیت ابن خلدون کے اس مشہور قول سے بھی جانی جا سکتی ہے کہ "ہم نے اپنے شیوخ سے سنا ہے کہ عربی ادب کے اصول اور اس کے ارکان چار دیوان (مجموعے) ہیں' اور وہ یہ ہیں: ابن قتیبہ کی "ادب الکاتب" المبرد کی "الکامل" جاحظ کی "البیان و التبیین" اور ابوعلی القالی کی "کتاب النوادر"۔ ان چار کے سوا جو کچھ بھی ہے وہ انہی کے تتبع میں ہے اور انہی سے مستعار ہے"

## "ادب الکاتب" لابن قتیبہ (م۸۸۹)

ابن قتیبہ (تعارف کے لئے دیکھئے صفحہ ۱۹۸) نے یہ کتاب عباسی حکومت کے وزیر ابوالحسن عبیداللہ بن یحییٰ کے لئے لکھی۔ یہ عربی لغت اور صرف اور نحو کے موضوع پر ایسی کتاب ہے جس سے عربی امت کے بہت سے علماء نے اکتساب کیا ہے اور اس نے انہیں بہت سی دوسری کتابوں سے مستغنی کر دیا ہے۔ قدیم زمانے سے ہی متعدد علمائے لغت نے اس کی شرح کی ہے اور اس پر حواشی لکھے ہیں۔ عربی ادب کے شائقین میں اس کتاب کی مقبولیت کا یہ عالم ہے کہ ضرورت پڑنے پر اس کتاب کا کوئی لفظ مشکل ہی سے

دستیاب ہوتا ہے حالانکہ یہ علمائے مشرق اور مستشرقین کی کوششوں سے لائپزگ' لائیڈن اور مصر میں کئی مرتبہ شائع ہو چکی ہے۔

## "الکامل فی اللغة و الادب" للمبرد (م ۸۹۸)

یہ لغت و ادب کے موضوع پر ایک ایسا بحرِ ذخار ہے جس کے کناروں کا کوئی پتا نہیں۔ بغیر کسی ترتیب کے اور بغیر کسی عنوان کے ابو العباس المبرد اس میں لغت اور اس کے مسائل پر بحث کرتا چلا جاتا ہے۔ اس کے لئے مثلاً وہ آنحضرتؐ کا کوئی قول لے لیتا ہے اور اس میں جو مشکل الفاظ آئے ہیں ان کی تشریح کرنے لگتا ہے' اور اپنی بات کی تائید میں شعرائے عرب کے کلام سے شواہد پیش کرتا ہے۔ اس کتاب کا ایک چھوٹا سا مقدمہ ہے جس میں المبرد اس کے مضامین کے بارے میں کہتا ہے: "یہ کتاب جو ہم نے تالیف کی ہے یہ مختلف آداب کی جامع ہے۔ اس میں منثور کلام بھی ہے' شعر بھی ہے' مشہور زمانہ مثل بھی ہے اور دلوں پر اثر کرنے والی موعظت بھی ہے۔ اس میں ہم نے اچھے خطبوں کا بھی انتخاب کیا ہے اور ایسے مکاتیب کا بھی جو بلاغت کا اچھا نمونہ ہیں۔ ایسا کرتے ہوئے ہم نے دراصل یہ چاہا ہے کہ اس کتاب میں جو بھی مشکل بات ہو' یا کوئی تخیلک خیال ہو اس کی ہم وضاحت کریں اور اس میں اعراب (یعنی نحو و صرف) کے جو مسائل ہوں ان کی ہم ٹھیک طرح سے شرح کریں' تاکہ یہ کتاب مکتفی بالذات ہو' اور کسی کو اس کے بعد کسی اور طرف رجوع کرنے کی ضرورت نہ پڑے"

## "العقد الفرید" لابن عبدربہ (م ۹۴۰)

ابو عمر احمد بن عبدربہ (احوال کے لئے دیکھیے صفحہ ۲۹۵) نے قرطبہ کے شہر میں رہتے ہوئے عربی زبان کے جتنے علوم سیکھے تھے' جن میں شاعری تھی' تذکرے تھے' نوادر تھے' تاریخ تھی اور اس کے ساتھ لغت اور نحو تھی' ان سب میں ان نے بڑا مقام حاصل کیا اور ان میں سے اکثر علوم کو اس نے حفظ کر لیا' اور پھر اس سارے ذخیرہ علم کا نچوڑ اس نے اپنی کتاب "العقد الفرید" میں ڈال دیا' جو چھ جلدوں میں ایک ضخیم مجموعہ ادب ہے۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ العقد الفرید عربی ادب کی سب سے عمدہ اور خوبصورت کتاب ہے۔ فائدے میں سب سے برتر' اپنے بیان میں سب سے پکی اور ترتیب اور تفصیل کے لحاظ سے بے



مثال اور قابل تقلید۔

اس کتاب کے بڑے حصے میں ابن عبدربہ نے مشرق کے حالات اور وہاں کے ادیبوں اور لکھنے والوں کے احوال جمع کر کے اپنے اہل وطن (یعنی اندلس والوں) کے سامنے رکھے ہیں۔ لیکن کتاب کی شہرت اور اس کا فائدہ مغرب تک محدود نہیں رہا۔ بلکہ اس نے مشرق میں پہنچ کر بھی ان کی ادبی کتابوں اور مجموعوں کے درمیان ایک قابل قدر جگہ بنائی' اور اہل ادب نے اسے بہت ذوق و شوق سے پڑھا۔ ابن عبدربہ نے اس کتاب میں صرف عرب کی روایات ہی نہیں لیں' بلکہ یونان' ایران اور ہندوستان کی کتابوں کے ترجموں کی صورت میں جو حکیمانہ مضامین اور موعظت کی باتیں اور نوادر موجود تھے ان سے بھی اس نے استفادہ کیا۔ کتاب کے ابواب مقرر کرنے میں بھی اس نے بڑی جدت سے کام لیا۔ وہ یہ کہ اس نے کتاب کو پچیس ابواب میں تقسیم کر کے اسے ایک ہار کی شکل دی۔ ہار کے ایک طرف بارہ موتی ہیں جن کے اس نے اس طرح کے نام رکھے ہیں: لولوۂ' فریدہ' زبرجدہ' جمانہ' مرجانہ' یاقوتہ وغیرہ' اور اسی نام کے موتی ہار کے دوسرے حصے میں مکرر صورت میں پروئے ہیں۔ مثلاً لولوۃ ثانیہ' فریدہ' ثانیہ' زبرجدہ ثانیہ وغیرہ اور ہار کے درمیان میں جو تیرھواں موتی ہے اس کا نام واسطہ ہے۔ کتاب کو اس طرح کے ابواب میں تقسیم کرنے کا یہ ایک نادر طریقہ ابن عبدربہ کو سوجھا' جس کی اس سے پہلی کوئی مثال نہیں ملتی۔ کتاب کا ہر باب ایک خاص موضوع کے بارے میں ہے اور اس موضوع پر مواد مہیا کرنے سے پہلے مرتب ایک مقدمے کی صورت میں کچھ تمہیدی کلمات کہتا ہے اور اپنی آراء کا اظہار کرتا ہے۔ ابواب کی تقسیم کچھ اس طرح سے ہے' مثلاً کتاب اللؤلؤة فی السلطان (غلبہ اور حکومت کے بارے میں) کتاب الفریدة فی الحروب (جنگوں کے بارے میں) کتاب الجوهرة فی الامثال (ضرب الامثال کے بارے میں) کتاب الواسطة فی الخطب' کتاب الدرة الثانیة فی ایام العرب ووقائعهم' کتاب الفریدة الثانیة فی الطعام و الشراب وغیرہ۔

العقد الفرید کی ایک اور خصوصیت یہ ہے کہ دوسرے مجموعوں کے مقابلے میں اس مجموعے کا مولف ابن عبدربہ اپنی شخصیت کے ساتھ زیادہ سامنے رہتا ہے۔ اس نے اپنی شخصیت کا اظہار اول تو اپنے خاص عمل انتخاب میں کیا ہے' جو اس کتاب میں دیکھا جا سکتا ہے۔ پھر ہر باب سے پہلے اپنے مقدمے میں بھی اور کتاب کے متن میں بھی جہاں جہاں وہ مناسب سمجھتا ہے اپنی آراء بھی پیش کرتا ہے اور تنقید بھی کرتا ہے۔ مثلاً ابن قتیبہ کی شعوبیت پر وہ تنقید کرتا ہے اور مبرد کے شعروں کے انتخاب کو وہ غلط اور بے کیف قرار دیتا ہے۔

العقد الفرید پر ایک اعتراض یہ ہوا کہ اس میں صرف مشرق کے عربی ادب کا تذکرہ ہے' حالانکہ

چاہیے یہ تھا کہ اس میں اندلس کے عربی ادب اور اس کی نشوونما کا احوال بیان ہوتا۔ چنانچہ عباسی دور کے وزیر اور مشہور ادیب صاحب بن عباد کے متعلق یہ بات مشہور ہے کہ جب اس کو یہ کتاب پیش کی گئی تو اس نے اسے پڑھ کر دیکھا اور یہ کہہ کر واپس کر دی کہ "یہ تو ہمارا ہی مال ہے جو ہمیں لوٹایا گیا ہے۔ میرا خیال تھا کہ اس میں اندلس کے ادب کی باتیں ہوں گی' لیکن یہ تو ادھر کے ادب کی باتیں کرتی ہے۔ اس لئے اس کی ہمیں ضرورت نہیں ہے۔" لیکن یہ العقد الفرید کا نقص نہیں ہے۔ بات یہ ہوئی کہ اندلس میں کچھ لوگوں نے تو مقامی ادب کو جمع کرنے اور اسے مدون کرنے کا کام اپنے ذمے لیا' مثلاً الفتح بن خاقان نے "مطمح الانفس" میں' ابن بسام نے اپنی کتاب "الذخیرة" میں اور مقری نے "نفح الطیب" میں۔ لیکن کچھ دوسرے لوگوں نے مشرق کے ادب اور ادبی اور شعری روایات کو اندلس میں متعارف کرانے کا بیڑا اٹھایا۔ ان میں ابوعلی القالی تھا جس نے اندلس جا کر "الامالی" لکھی اور اسی مدرسہ کے ایک اور فرد ابن عبدربہ نے "العقد الفرید" مرتب کی۔

## کتاب "الامالی" تالیف ابی علی القالی (م ۹۶۷)

اندلس میں اموی خلیفہ عبدالرحمان الناصر نے' جسے علم و ادب اور شاعری سے کافی رغبت تھی' ارادہ کیا کہ اندلس میں عربی تہذیب کو رواج دینے کے لئے اہل مشرق میں سے کوئی مناسب ادیب اور فاضل بلایا جائے۔ اس غرض کے لئے خلیفہ کی نگاہ انتخاب ابوعلی القالی پر پڑی۔ جس کا باپ اموی خلیفہ عبدالملک بن مروان کا غلام رہا تھا۔ چنانچہ اس نے ابوعلی کو قرطبہ بلا لیا اور اپنے بیٹے حکم کو ہدایت کہ اس کا شایان شان استقبال کرے۔ ابوعلی نے بغداد میں پچیس برس رہ کر اساتذہ وقت سے حدیث' لغت' ادب اور نحو و صرف میں تعلیم حاصل کی تھی' اور ان میں کامل ہو گیا تھا۔ مورخین کا اس بارے میں اتفاق ہے کہ وہ اپنے وقت میں علوم کا سب سے بڑا حافظ تھا۔ ابوعلی القالی سے خلیفہ کے بیٹے حکم نے بھی تعلیم حاصل کی اور یہ اسی تعلیم کا اثر تھا کہ اس نے اندلس میں ایک نہایت عظیم الشان مکتبہ (لائبریری) قائم کیا۔ ابوعلی اندلس میں ۹۴۲ میں آیا تھا اور وہ قرطبہ میں اپنی وفات (۹۶۷) تک اپنا علم پھیلاتا رہا۔

ابوعلی کی سب سے مشہور کتاب "کتاب الامالی و الذیل والنوادر" ہے۔ نوادر کی کتاب دراصل "امالی" کا ضمیمہ ہے۔ امالی میں ابوعلی کا طریقہ یہ ہے کہ وہ کوئی نص۔ آیت قرآنی' حدیث' خبر یا نظم۔ لیتا ہے' جس میں کوئی اجنبی یا نامانوس لفظ ہوتا ہے' اور وہ اس نامانوس لفظ کی بہت تفصیل میں جا کر شرح کرتا ہے' اور اس شرح کے ضمن میں علم و ادب اور بلاغت کی باتیں بیان کرتا چلا جاتا ہے۔



ابوعلی کی دوسری تصانیف یہ ہیں: "کتاب المحدود و المقصور" "کتاب الابل ونتاجھا" "کتاب حلی الانسان" "کتاب فعلت و افعلت" "کتاب تفسیر المعلقات السبع" اور "کتاب البارع فی اللغة" ہے جس کے متعلق کہا جاتا ہے کہ لغت میں ایسی کتاب نہیں لکھی گئی۔

## "کتاب الاغانی" لابی الفرج الاصفہانی (م ۹۶۷)

علی بن الحسین بن محمد بن احمد القرشی عرب مورخ اور ادیب اور شاعر تھا۔ اصفہان (ایران) میں پیدا ہوا۔ لیکن نسلاً وہ خالص عرب اور قریش میں سے تھا۔ اس کے باوجود وہ مذہباً شیعہ تھا۔ اس نے بغداد میں تعلیم حاصل کی اور اپنی عمر کا زیادہ حصہ وہیں گزارا۔ اسے آل بویہ اور خصوصاً ان کے وزیر مہلبی کی (جس کا وہ ندیم تھا) سرپرستی حاصل تھی۔ حلب میں سیف الدولہ حمدانی کے دربار میں اس کی بڑی آؤ بھگت رہی۔ اس نے ۹۶۷ میں بغداد میں وفات پائی۔ مرنے سے پہلے وہ دیوانگی میں مبتلا ہو گیا تھا۔

تنوخی کا بیان ہے کہ ابوالفرج کے ذہن میں مختلف علوم مستحضر رہتے تھے۔ وہ شعر بھی استادانہ کہتا تھا۔ بعضوں نے یہ بھی لکھا ہے کہ اسے جسم اور لباس کی صفائی کا مطلق خیال نہ تھا۔ اس کا شاہکار جس پر اس نے اپنے بیان کے مطابق' پورے پچاس سال صرف کئے "کتاب الاغانی" (نغموں کی کتاب) ہے' جس میں اس نے وہ سب اصوات یا نغمے یکجا کر دیے ہیں جو معروف مغنیوں ابراہیم الموصلی' اسماعیل بن جامع اور فلیح بن العوراء نے خلیفہ ہارون الرشید کے حکم سے منتخب کئے اور جن پر آگے چل کر اسحاق بن ابراہیم الموصلی نے نظرثانی کی تھی۔ ابوالفرج نے اس مجموعے میں معبد اور ابن سریج اور کئی اور گویوں کے علاوہ خلفاء اور ان کے جانشینوں کے نغموں کا بھی اضافہ کیا' اور پھر ہر نغمے کے ساتھ اس کی دھن بھی بتائی۔ لیکن یہ سب باتیں اس کتاب کا وہ حصہ ہیں جس کی اہمیت نہایت کم ہے۔ بخلاف اس کے ابوالفرج نے ان شاعروں کے متعلق جن کے نغمے اس مجموعے میں شامل ہیں بڑی سیر حاصل معلومات مہیا کی ہیں اور ان کے حالات زندگی کے ساتھ ساتھ ان کے کلام کا بہت سا نمونہ بھی دیا ہے۔ اسی طرح مولفین نغمہ (Composers) کے حالات بھی تفصیل سے بیان کئے ہیں۔ وہ اس میں قدیم عرب قبائل' ان کے ایام' ان کی معاشرت اور موسیقاروں کے ماحول کا ذکر بھی تفصیل سے کرتا ہے۔ مختصر یہ کہ کتاب الاغانی کا مطالعہ کیجئے تو دور جاہلیت سے لے کر نویں صدی عیسوی تک پوری عربی ثقافت کے ایک پہلو کی تاریخ ہمارے سامنے آ جاتی ہے۔ مصنف نے ایک اور جہت سے بھی مفید کام کیا ہے' وہ یہ کہ عرب مصنفین کا اتباع کرتے ہوئے وہ ان قدیم مصنفوں کی تصنیفات سے بڑے طویل اقتباسات بھی دے دیتا ہے جو ہم

تک نہیں پہنچیں۔ اس لحاظ سے یہ کتاب عربی اسلوب نگارش کی گوناگوں تبدیلیوں کی تاریخ کے متعلق بھی ہمارا ایک عمدہ ماخذ ہے۔

چنانچہ اس امر پر اتفاق ہے کہ اس موضوع پر ''الاغانی'' جیسی کوئی اور کتاب تصنیف نہیں ہوئی' اور اس کے بعد ادب عربی میں جو کچھ بھی لکھا گیا اس کا سارا انحصار اسی پر تھا۔ اور اگر ''کتاب الاغانی'' نہ ہوتی تو جاہلیت' صدر اسلام اور بنوامیہ کے دور کے ادبی حالات کا بہت سا ذخیرہ ضائع ہو جاتا۔ یہ کتاب جب ابوالفرج حمدان کے سیف الدولہ کے پاس لے گیا تو اس نے اسے ایک ہزار دینار دیے اور اس سے معذرت بھی کی۔ عباسی عہد کا مشہور وزیر اور ادیب صاحب بن عباد پہلے جب سفر کرتا تھا تو تیس اونٹوں پر اس کی کتابیں لدی ہوتی تھیں۔ جب اس کو ''کتاب الاغانی'' مل گئی تو اسے ان ساری کتابوں کا بوجھ ساتھ لے جانے کی ضرورت نہ رہی۔

## ''نہایۃ الارب فی فنون الادب'' للنویری (م۱۳۳۲)

شہاب الدین احمد بن عبدالوہاب البکری الکندی الشافعی ایک عرب وقائع نگار تھا جو ۱۲۷۹ء میں بالائی مصر میں پیدا ہوا اور جس نے قاہرہ میں وفات پائی۔ وہ مملوکی عہد کی تین اہم ترین دائرۃ المعارف نوع کی کتابوں میں سے ایک کا مصنف تھا (دوسری دو تصانیف عمری اور قلقشندی کی ہیں) اس کا باپ ایک سرکاری انشانگار (کاتب) تھا۔ بیٹا بھی سلطان الملک الناصر (محمد بن قلاوون) کے عہد میں بڑے بڑے مناصب پر فائز رہا۔ وہ اس کا منظور نظر بھی تھا۔ کچھ عرصے تک وہ طرابلس الشام کا ناظر الجیش رہا' اور بعض مصری صوبوں میں ناظر الدیوان کے عہدے پر بھی کام کیا۔

اس کی یادگار تصنیف "نہایۃ الارب فی فنون الادب" جو الملک الناصر کو نذر کی گئی' اس کے انتظامی تجربے کا نچوڑ تھا۔ ابتدائی زمانے میں وہ محض منشی کے فرائض انجام دیتا تھا اور ادب کا مطالعہ اس نے کہیں بعد کے زمانے میں شروع کیا۔ اس کی خواہش تھی کہ اپنے دائرۃ المعارف میں وہ سارا علم جمع کر دے جس کی تحصیل ایک لکھنے والے کے لیے ناگزیر ہوتی ہے۔

یہ کتاب پانچ فنون میں منقسم ہے۔ ہر فن کی پانچ اقسام ہیں۔ ہر قسم میں متعدد ابواب ہیں' جن کی تعداد دو سے چودہ تک ہے۔ پہلا فن زمین و آسمان کے لیے مخصوص ہے' دوسرا فن انسان کے لیے' تیسرا نباتات کے لیے اور پانچواں تاریخ کے لیے وقف ہے۔ پانچویں فن کی آخری قسم جو اسلامی تاریخ کے بارے میں ہے تقریباً نصف تصنیف پر مشتمل ہے اور صرف اسی حصے کے تقریباً نو ہزار مطبوعہ صفحات ہیں۔



وقت حصوں اور جلدوں کی تاریخوں سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس نے اس کتاب کی تکمیل میں اپنی زندگی کے پورے بیس برس لگا دیے۔ معاصرانہ تاریخ کے لیے نویری کی اس کتاب کی اہمیت اول درجے کی ہے۔ دوسرے حصوں کے متعلق اس کی قدر و قیمت اس کے مآخذ پر منحصر ہے۔ عام طور پر اٹھارویں صدی عیسوی میں اور انیسویں صدی کے اوائل میں نویری کی تاریخ کے اس حصے کو جو زمانہ قبل اسلام سے متعلق ہے' بڑی اہمیت دی گئی۔

## ''حیاۃ الحیوان'' للدمیری (م۱۴۰۵)

محمد بن موسیٰ بن عیسیٰ کمال الدین قاہرہ میں پیدا ہوا اور وہیں اس نے وفات پائی۔ شروع میں وہ اپنے آبائی شہر دمیرہ میں درزی کے کام سے کسب معاش کرتا تھا۔ پھر اس نے پیشہ ور عالم دین بننے کا فیصلہ کیا اور تحصیل علم کے لیے مشہور شافعی عالم بہاؤ الدین سبکی کے سامنے زانوئے تلمذ تہ کیا۔ اس کے علاوہ اس نے جمال الدین الاسنوی' الفیہ ابن مالک کے شارح ابن عقیل' برہان الدین القیراطی اور دوسرے علماء سے بھی درس لیا۔ یہاں تک کہ اسے فقہ' علوم حدیث' تفسیر' عربی علم اللسان اور معانی و بیان میں بڑی مہارت حاصل ہو گئی۔

جب دمیری کو متداول علوم اسلامیہ کی تدریس اور فتویٰ دینے کی اجازت مل گئی تو وہ بعض دینی درسگاہوں سے وابستہ رہا۔ اس نے تصوف کا ایک مسلک بھی اختیار کیا اور اپنی زاہدانہ زندگی کی وجہ سے مشہور ہوا۔ لوگ اسے صاحب کرامات سمجھنے لگے۔ زندگی میں اس نے چھ حج کیے اور آخری حج کے بعد اپنی وفات تک وہ قاہرہ میں ہی رہا۔

مصنف کی حیثیت سے دمیری اپنی کتاب "حیاۃ الحیوان" کی وجہ سے مشہور ہے جو علم الحیوانات کی دائرۃ المعارف ہے۔ اس کتاب کی بدولت مشرق اور مغرب دونوں میں اس کی شہرت ہوئی۔ کتاب کے دیباچے میں وہ لکھتا ہے کہ اس سے اس کا مقصد ان غلط خیالات کی اصلاح تھا جو جانوروں کے متعلق عموماً پڑھے لکھے لوگوں میں عام تھے۔ اس کتاب کی حیثیت عربی میں محض علم الحیوانات کی ایک مختصر تصنیف ہی کی نہیں' بلکہ وہ مسلم عوام کی متداول روایات و عقائد کا ایک مخزن بھی ہے۔ مصنف نے اپنے بیان کو اصل موضوع یعنی محض حیوانات ہی تک محدود نہیں رکھا' بلکہ بڑی تفصیل کے ساتھ ہر اس چیز کا حال لکھ دیا ہے جو جانوروں کے متعلق کسی طرح بھی کہی گئی ہو۔ علاوہ بریں وہ اپنا اصل موضوع چھوڑ کر دوسرے مباحث کی طرف بھی متوجہ ہو جاتا ہے' جن میں سب سے نمایاں اور اہم خلفاء کی تاریخ کا جائزہ ہے اور اس کی

پوری کتاب کا تقریباً تیرھواں حصہ ہے۔

اس کتاب کے مقالات حروف تہجی کی ترتیب کے لحاظ سے مرتب کیے گئے ہیں اور ترتیب میں حیوانات کے ناموں کے پہلے حروف کو پیش نظر رکھا گیا ہے۔ ہر مقالے میں مندرجہ ذیل مطالب سے بحث کی گئی ہے۔ (۱) ہر حیوان کے نام کے لسانی پہلو۔ (۲) حیوان اور اس کی عادات کی تفصیل (۳) حدیث کی کتابوں میں حیوانات کا ذکر (۴) بحیثیت غذا مختلف حیوانات کے حلال یا حرام ہونے کے متعلق مختلف مذاہب کی آراء (۵) حیوانات کے نام سے تعلق رکھنے والی ضرب الامثال (۶) ہر حیوان کے اعضاء اور اجزاء کے طبی اور دیگر خواص (۷) مختلف حیوانات کے خواب میں دکھائی دینے کی تعبیر۔ ان مقالوں میں جن مختلف جانوروں کا ذکر کیا گیا ہے ان میں بُراق بھی شامل ہے۔ مصنف چونکہ طبیعیات کا ماہر نہیں تھا اس لیے اس نے کسی تنقید کے بغیر جانوروں کے ذکر میں وہمی اور خیالی باتوں کو بھی جگہ دی ہے۔ دمیری نے جانوروں کے متعلق ان تمام معلومات کو جن کی حیثیت روایتی ہے ایک ترتیب کے ساتھ جمع کر کے دوسروں تک پہنچا دیا ہے' اور ان معلومات کی بنیاد سینکڑوں مآخذ پر رکھی ہے' اور اس میں کوئی شک نہیں کہ ادب عربی میں یہ اپنی نوعیت کی پہلی تصنیف ہے' جس میں علاوہ اور باتوں کے طب نسبی (خاندانی امراض) اور علم النفس کے بارے میں بھی معلومات ملتی ہیں۔

## "صبح الاعشی فی صناعة الانشاء" للقلقشندی (م ۱۴۱۸)

شہاب الدین ابوالعباس احمد بن علی مصر کے علاقے قلیوب کے ایک مقام قلقشندہ میں پیدا ہوا۔ اور وہیں بعمر ۶۵ سال وفات پائی۔ وہ مصر کا نامور مورخ' ادیب' محقق اور ماہر انشا تھا۔ اس نے چھوٹی چھوٹی کتابوں کے علاوہ فن مقالہ نویسی اور انشا و ترسّل پر ایک کتاب لکھی جو خاص طور پر حکومت مصر کے اہل کاروں کے استعمال کے لیے مرتب کی گئی تھی۔ جس طرح ابن قتیبہ نے اپنی تصانیف "عیون الاخبار" اور بالخصوص "ادب الکاتب" میں لکھنے والوں کے طبقے کو اپنے زمانے کے تقریباً تمام ضروری علوم وفنون کا ایک قاموسی جائزہ لے کر معارف عامہ کی موٹی موٹی باتیں بتانے کی کوشش کی تھی' اسی طرح قلقشندی کی اس کتاب میں جو ۱۴۱۸ کے بعد لکھی گئی اور جس کا نام "صبح الاعشی فی صناعة الانشاء" ہے اس زمانے کے قریب قریب سارے علوم وفنون بڑے جامع طریقے پر اور بڑی منظم شکل میں موجود ہیں۔ نیز اس میں نہایت بیش قیمت معلومات ملتی ہیں۔ خصوصاً وہ جن کا تعلق مصر اور شام کی تاریخ اور جغرافیے سے ہے۔

قلقشندی کی ایک اور تصنیف "نهاية الارب فی معرفة انساب العرب" بعثت نبوی کے زمانے



سے قبل کے عرب قبائل کی تاریخ اور ان کے انساب کے بارے میں ایک اہم کتاب ہے۔

☆.....☆.....☆

# علم تاریخ اور مشہور مورخین

اگرچہ ادب کے ساتھ تاریخ کا براہ راست تعلق نہیں ہے' تاہم علم کی ایک شاخ (تاریخ) میں عربی نثر کے جو مختلف اسالیب اور نمونے دیکھنے میں آتے ہیں ان کے تعارف کے لئے عربی ادب کی تاریخوں میں علم تاریخ اور اس کے مشاہیر کا ذکر کرنے کی ایک عام روش چلی آتی ہے۔ چنانچہ اس موضوع پر یہاں کچھ باتیں مختصراً کہہ دینا بے محل نہیں ہوگا۔

عربی زبان میں تاریخ نویسی کی ابتدائی شکل "مغازی" تھی جس میں غزوات کا ذکر ہوتا تھا اور ان کے زمانوں اور مواقع کے بارے میں قرآن اور حدیث سے جو معلومات ملتی تھیں ان کو جمع کیا جاتا تھا۔ اس کے بعد "فتوح" کا مرحلہ آیا۔ جس میں مسلمانوں کی فتوحات اور صلح و جنگ اور خراج اور جزیہ کے امور کا بیان ہونے لگا۔ پھر "طبقات" لکھے جانے لگے۔ یہ ان صحابہ و تابعین کے احوال کا ذکر کرتے تھے جو شریعت کے راوی ہوتے تھے اور ادب و شعر میں کلام کرتے تھے۔ پھر "انساب" کی باری آئی۔ یہ قریش اور دوسرے قبائل کے فائدے کے لیے لکھے جاتے تھے اور ان کا شجرہ نسب بیان کرتے تھے۔ اور آخر میں "ایام العرب" مدون کئے گئے جو ان زمانوں کی شاعری اور اس کے پس منظر کو اجاگر کرتے تھے۔ تاریخ نویسی سے قبل کے ان مراحل میں جن لوگوں نے شہرت حاصل کی وہ یہاں ہیں: "مغازی" میں ابن اسحاق (م ۷۶۸) "فتوح" میں واقدی (م ۸۲۳) "طبقات" میں ابن سعد (م ۸۴۵) "انساب" میں کلبی (م ۸۱۹) اور "ایام العرب" میں اصمعی (م ۸۳۱)

عربی زبان میں باقاعدہ تاریخ لکھنے کا آغاز محمد بن جریر طبری (م ۹۲۳) سے ہوتا ہے' جس کی "تاریخ الامم والملوک" نے تاریخ نگاری کا راستہ متعین کر دیا' اور اس کے بعد مورخین نے اس کام کو آگے بڑھایا۔ عربوں کے ہاں تاریخ نگاری کے دو طریقے رائج رہے۔ ایک یہ کہ سنین کا ذکر کر کے ان میں ہونے والے واقعات کا بیان کیا جائے' چاہے وہ کہیں بھی واقع ہوئے ہوں اور ان کا آپس میں کوئی تعلق ہو یا نہ ہو۔ یہ طریقہ طبری' ابن الاثیر اور ابوالفداء نے اختیار کیا۔ اور دوسرا طریقہ یہ تھا کہ واقعات کا ذکر قوموں اور حکومتوں کے ضمن میں کیا جائے۔ یہ طریقہ مسعودی' ابن طقطقی اور ابن خلدون نے اپنایا۔

عرب قوم میں جو مشہور مورخین گزرے ہیں' ان کے اور ان کی کتابوں کے نام اس طرح ہیں:

| | | |
|---|---|---|
| ابن جریر طبری | (م ۹۲۲) | تاریخ الامم و الملوک |
| مسعودی۔ | (م ۹۵۷) | مروج الذهب |
| ابن مسکویه | (م ۱۰۳۰) | تجارب الامم و تعاقب الهمم |
| ابن الاثیر | (م ۱۲۳۳) | الکامل فی التاریخ |
| ابو الفداء | (م ۱۳۳۱) | المختصر فی تاریخ البشر |
| ابن خلدون | (م ۱۴۰۶) | کتاب العبرؔ و دیوان المبتدأ و الخبر |

☆......☆......☆

## شرعی علوم: علم حدیث اور علم فقہ

علم حدیث: آنحضرتؐ نے اپنی زندگی میں جو کچھ بھی فرمایا اسے حدیث کہتے ہیں۔ آپ کی حیات مبارکہ میں صحابہ کرام یہ احادیث سنتے رہے اور اپنے سینوں میں محفوظ کرتے رہے...... آنحضرتؐ پر وحی کی صورت میں جو آیات نازل ہوتی تھیں انہیں تو آپؐ کے حکم سے لکھ لیا جاتا تھا۔ لیکن آپ کی احادیث کے لکھنے کا حکم نہیں تھا اس خیال سے کہ یہ کہیں قرآن کی آیات کے ساتھ خلط ملط نہ ہو جائیں۔ چنانچہ احادیث آنحضرتؐ کی وفات کے بعد بھی زبانی روایت کی جاتی رہیں۔ لیکن پھر یہ ہوا کہ مسلمانوں میں ایک طرف مذہبی فرقے بنتے چلے گئے اور دوسری طرف ان کے درمیان سیاسی اختلافات پیدا ہونے لگے۔ ان حالات میں بعض موقع پرست لوگوں نے حدیثیں وضع کرنی شروع کر دیں، جن کا مقصد کسی عقیدے کی تائید کرنا یا کسی گروہ کو برحق ثابت کرنا ہوتا تھا۔ یہ رجحان بڑھتے بڑھتے جب خطرناک حدود تک پہنچ گیا تو خلیفہ عمر بن عبدالعزیز کو صحیح احادیث کے جمع کرنے اور انہیں لکھنے کا خیال آیا۔ ان کے بعد اس خطرے کے پیش نظر کہ احادیث کے راویوں کی موت کے ساتھ کہیں یہ احادیث بھی ان کے ساتھ دفن نہ ہو جائیں، عباسی خلیفہ ابوجعفر المنصور نے احادیث کی تدوین کا بیڑا اٹھایا۔ چنانچہ اس نے امام مالک بن انس (م ۷۹۵) کو اس بارے میں ہدایت کی تو انہوں نے صحیح احادیث کا پہلا مجموعہ "موطا" کے نام سے مدون کیا، جو حدیث اور فقہ کا امتزاج تھا۔ اس زمانے تک چونکہ احادیث کے نام سے بہت سی گھڑی ہوئی اور جھوٹی حدیثیں روایت کی جانے لگی تھیں، اس لئے بعض ائمہ نے احادیث کے اس سارے ذخیرے کو کھنگالنے اور اس کی جانچ پرکھ کر کے اس میں سے صحیح اور قابل اعتبار احادیث کو جمع کرنے کا کام اپنے



ذمے لیا، اور اس مقصد کے لئے انہوں نے بہت سخت قسم کے معیار (Criteria) مقرر کئے، اور ان معیاروں کا سختی کے ساتھ التزام کرتے ہوئے انہوں نے حدیث کے مجموعے مرتب کئے۔ ان مجموعوں میں سے چھ مجموعے "صحاح ستہ" (یعنی چھ صحیح کتابوں) کے نام سے مشہور ہوئے۔ یہ حسب ذیل ہیں۔

۱۔ صحیح بخاری: امام محمد اسماعیل بخاری (م ۸۷۰) نے سولہ سال کی محنت اور کاوش کے بعد یہ کتاب "الجامع الصحیح" مرتب کی۔ اس میں نو ہزار حدیثیں درج کیں جنہیں انہوں نے چھ لاکھ حدیثوں کی چھان پھٹک کے بعد جمع کیا۔ اس مجموعے میں تین ہزار حدیثیں ایسی ہیں جو تکرار کے ساتھ مختلف ابواب میں بیان ہوئی ہیں۔

۲۔ صحیح مسلم: امام مسلم بن الحجاج (م ۸۷۳) نے تین لاکھ حدیثوں کی چھان بین کے بعد اپنی یہ کتاب مرتب کی۔ صحیح بخاری کے بعد یہ حدیث کی سب سے صحیح کتاب مانی جاتی ہے۔

۳۔ سنن ابن ماجہ: ابوعبداللہ ابن ماجہ (م ۸۸۷)

۴۔ سنن ابوداود: ابوداود السجستانی (م ۸۸۹)

۵۔ جامع الترمذی: ابوعیسیٰ الترمذی (م ۸۹۲)

۶۔ سنن النسائی: عبدالرحمان النسائی (م ۹۱۵)

☆......☆......☆

ان کے علاوہ مسند احمد بن حنبل (م ۸۵۵) بھی حدیث کا ایک صحیح مجموعہ قرار دیا جاتا ہے۔ اس طرح موطا امام مالک کے ساتھ یہ کل آٹھ کتابیں ہیں جو حدیث کی صحیح کتابیں شمار ہوتی ہیں۔ جن کی بہت سی شرحیں اور خلاصے لکھے گئے ہیں، اور دینی مدارس میں ان کی تعلیم دی جاتی ہے۔ ان آٹھ کتابوں کے علاوہ بھی احادیث کے کچھ اور مجموعے ہیں، جو اتنے مشہور نہیں ہیں، لیکن ان سے استفادہ ضرور کیا جاتا ہے۔

علم فقہ: اس علم کی نشوونما تو صدر اسلام کے عہد میں ہوئی۔ لیکن اس کی تدوین و تصنیف بنو عباس کے عہد میں جا کر ہوئی۔ مدینہ اس وقت فقہاء اور محدثین کا مرکز تھا۔ جب عراق میں عباسی حکومت قائم

ہو گئی تو اس کے لوگوں میں فقہ کا رواج ہوا اور ان میں ایک گروہ ایسا سامنے آیا جس نے شریعت کے معاملات میں اہل حجاز کا طریقہ چھوڑ کر نیا طریقہ اختیار کیا۔ حجاز کے فقہاء شرعی احکام کی بنیاد نصوص پر رکھتے تھے (یعنی کسی آیت یا حدیث کی بنیاد پر) اور اس معاملے میں قیاس سے بالکل رجوع نہیں کرتے تھے۔ ان کے رہنما اس معاملے میں امام مالک بن انس (م ۷۸۵) تھے۔ ادھر عراق میں فقہاء چونکہ روایت کو اہمیت دیتے تھے اور احادیث سے اتنی واقفیت نہیں رکھتے تھے' وہ فقہ کے مسائل کے لئے قیاس سے کام لینے لگے۔ ان معاملات میں وہ اپنی رائے رکھتے تھے۔ اور ان کے سربراہ امام ابوحنیفہ النعمان (م ۷۶۷) تھے۔ عباسی خلیفہ منصور نے سیاسی مصلحتوں کے تحت عراق کو حجاز پر اور بغداد کو مدینے پر ترجیح دی۔ چنانچہ اس نے ابوحنیفہ کو بغداد بلا لیا اور ان کے فقہی مذہب کو عراق' ایران' خراسان' ہندوستان' چین اور ترکی تک پھیلا دیا۔ اور مالکی مذہب حجاز' مغرب اقصی اور اندلس تک محدود ہو گیا۔ پھر محمد بن ادریس الشافعی (م ۸۲۰) آئے۔ وہ یوں تو مالک کے پیروکار تھے۔ لیکن جب وہ عراق گئے تو ابوحنیفہ کے اصحاب سے قیاس کے مسائل سیکھے اور ان دونوں مذاہب کے بین بین ایک اور مذہب کی بنیاد رکھی۔ پھر وہ مصر چلے گئے اور وہاں جا کر اپنے مذہب کی تنقیح کی اور اسے درست کر کے وہاں رائج کیا۔ ان کے بعد احمد بن حنبل (م ۸۵۵) آئے۔ انہوں نے حدیث شافعی سے سیکھی اور قیاس بعض حنفی علماء سے اخذ کیا' اور ایک اور فقہی مذہب کی تشکیل کی۔ جو نجد اور بحرین میں پھیلا۔ اس مذہب میں حدیث کے اتباع کا اہتمام زیادہ تھا اور فروع میں کافی شدت برتی جاتی تھی۔

فقہ کے یہ چاروں مذاہب: مالکی' حنفی' شافعی اور حنبلی مسلم امت میں آج تک رائج ہیں اور زندگی کے روزمرہ مسائل میں انہی میں سے کسی ایک یا دوسرے مذہب پر عمل کیا جاتا ہے۔ جو لوگ ان فقہی مذاہب میں سے کسی مذہب کی پیروی کرتے ہیں وہ مقلد کہلاتے ہیں' اور جو ان فقہی مذاہب میں سے ایک یا دوسرے کی پابندی کرنے کی بجائے اپنے مسائل براہ راست حدیث اور سنت نبوی کی روشنی میں حل کرنا چاہتے ہیں' ان کو غیر مقلد کہا جاتا ہے۔ ان کا دوسرا نام اہل حدیث ہے۔

☆......☆......☆

## عربی ادب میں قصے اور حکایات

قصہ یا حکایت انسان کی ذہنی تفریح کے لئے ہمیشہ ایک دل پسند اور موثر ذریعہ رہی ہے۔ آج کے دور



کا افسانہ اور ناول اس کی ترقی یافتہ اور خالص ادبی معیاروں پر پورا اترنے والی صورتیں ہیں۔ دنیا کے بیشتر ممالک میں زمانہ قدیم سے ان کہانیوں اور داستانوں کا سراغ ملتا ہے۔ جو انسان بچپن میں اپنے بڑوں کی زبانی سنتا تھا اور پھر بڑا ہو کر ان محفلوں میں بھی سنتا تھا جو گھروں محلوں اور چوپالوں پر جمتی تھیں۔ ایک زمانے تک تو ان کی روایت زبانی ہوتی رہی' پھر ان کہانیوں کو قلم بند کیا جانے لگا' اور مغرب میں خاص طور پر اچھے لکھنے والوں نے ان کی طرف توجہ کی اور رفتہ رفتہ اس فن کو ترقی دے کر آگے بڑھایا۔ عربوں کے ہاں قصہ اور کہانی کہنے کی ریت شروع سے ہی نہیں پنپ سکی۔ اس کی کئی وجوہات ہو سکتی ہیں۔ مثلاً یہ کہ جاہلی دور اور اس کے بعد اسلامی اور اموی دور تک عربوں کے ہاں نثر میں اظہار خیال کا کوئی زیادہ رواج نہیں تھا' اور حکایت اور داستان چونکہ نثر میں ہوتی ہے اس لئے اس کی طرف عربوں نے توجہ نہ کی۔ نثر میں ان کے ہاں شروع کے زمانوں میں صرف خطبے' مواعظ' حکمت کی باتیں اور ضرب الامثال ہی سننے میں آتی تھیں۔ دوسری وجہ یہ کہ حکایت اور داستان کے لئے تصور و خیال (imagination) کو کام میں لانا پڑتا ہے' اور واقعات کا تانا بانا اور کرداروں کی حرکات و سکنات اپنے ذہن سے گھڑ کر بیان کرنی پڑتی ہیں۔ عربوں کا ذہن اس چیز کے لئے بنا ہی نہیں تھا۔ ان کے ہاں اگر کچھ واقعات بیان کرنے کا عمل شروع بھی ہوا تو وہ "ایام العرب" کی صورت میں تھا۔ یعنی زمانہ جاہلیت میں مختلف قبائل کے درمیان طویل جنگیں ہوتی رہتی تھیں' ان کا آنکھوں دیکھا حال اور ان کے حقیقی واقعات کا بیان۔ اس بیان میں زبان اور محاورے کے کمالات تو ہوتے تھے' لیکن تخیل و تصور کا کوئی دخل نہیں ہوتا تھا۔

عربی زبان میں قصوں اور کہانیوں کے سب سے پہلے نمونے ان ترجموں کی صورت میں سامنے آتے ہیں جو عرب ادیبوں نے ہندی ایرانی ماخذ سے کیے تھے۔ مثلاً ابن المقفع کی "کلیلہ و دمنہ" جو پہلے ہندوستان سے ایران میں آئی اور پھر فارسی زبان سے عربی میں منتقل کی گئی۔ اسی طرح ایرانی کتاب "ہزار افسانہ" جو عربی کی الف لیلہ ولیلہ کے ماخذ میں سے ہے' اور الف لیلہ میں شامل بہت سی کہانیاں اسی سے لی گئی ہیں۔

جب عربوں کے ہاں خوشحالی آئی اور خلافت اور حکومت کی ذمہ داریوں کا بہت سا بوجھ عجمی وزیروں اور عہدہ داروں نے سنبھال لیا تو خلفاء اور امراء اپنا فارغ وقت راتوں کو باتیں کرنے اور ایک دوسرے کو کہانیاں سنانے میں گزارنے لگے۔ ان کی اس ضرورت کو پورا کرنے کے لئے ان کے ساتھی اور مصاحب ایک دوسرے سے بڑھ کر قصے اور حکایات جمع کر کے یاد کرنے لگے۔ اس کے بعد تویں اور دسویں صدیوں کے ادباء نے یہ کہانیاں اور داستانیں وضع کرنی شروع کیں۔ تاکہ انہیں امراء و خواص کو سنا کر ان کا دل بہلایا جا سکے۔ ان کی دیکھا دیکھی دوسری طرف عوام الناس اور کھاتے پیتے اور فارغ لوگوں کو بھی

یہ ضرورت محسوس ہوئی کہ ان کے ہاں شادیوں پر، میلوں میں اور دوسرے موقعوں پر ان کو بھی کہانیاں سنا کر محظوظ کیا جائے۔ یہ ضرورت اور زیادہ بڑھ گئی جب عباسی دور کے اواخر میں سلاجقہ اور مغلوں کے مظالم نے عالم اسلام کو ہر طرف مصائب و آفات سے دوچار کر دیا۔ چنانچہ ان لوگوں کی ضرورت پوری کرنے کے لئے داستان گوؤں کا طبقہ وجود میں آیا۔ انہوں نے عام لوگوں کو انواع و اقسام کی کہانیاں سنانی شروع کیں جو انہوں نے اس مقصد سے جمع کی تھیں۔ یہ بہادروں اور سورماؤں کی کہانیاں تھیں، جنات اور روحوں کے قصے تھے۔ جادوگروں کی کارروائیوں کا احوال تھا، اور دوسری اس طرح کی عجیب و غریب باتیں جو ان لوگوں نے کئی نسلوں اور زمانوں سے سن سن کر اکٹھا کی تھیں، اور جو تاجروں اور مسافروں نے دنیا کے ملکوں کا سفر کر کے جمع کی تھیں۔ ان کہانیوں میں مبالغہ بھی ہوتا تھا اور من گھڑت باتیں بھی ہوتی تھیں۔ اس کے بعد یہ ہوا کہ ان کہانیوں اور داستانوں کو جو اب تک سینہ بہ سینہ چلی آ رہی تھیں بعض لوگوں نے جوں کا توں، بغیر کسی ضابطے کے، جمع کر کے لکھ لیا اور کہانیوں اور داستانوں کا یہ ذخیرہ صدیوں تک نسل در نسل چلتا رہا۔ حتیٰ کہ جن لوگوں نے انہیں مدوّن کیا تھا ان کے نام بھی کسی کو یاد نہ رہے۔ ان قصوں میں جو خاص طور پر مشہور ہوئے۔ ان کے نام کچھ یوں ہیں: عنترہ کا قصہ (یا سیرت عنترہ)، ہو بلال کا قصہ، سیف بن ذی یزن کا قصہ، امیرۃ ذات الہمۃ (بہادر شاہزادی) کا قصہ، ظاہر بیبرس کا قصہ، علی الزیبق مصری کا قصہ، فیروز شاہ کا قصہ وغیرہ! ان کہانیوں پر غور کرنے سے لگتا ہے کہ یہ گیارہویں، بارہویں اور تیرہویں صدیوں میں لکھے گئے۔ ان میں سے بعض کا زمانہ صلیبی جنگوں کے چھڑنے کا زمانہ ہے، اور بعض کا سقوط بغداد کے بعد کا۔ یہ امر کہ یہ سب قصے مصر میں لکھے گئے اس بات سے عیاں ہے کہ ان میں جو واقعات بیان کیے گئے ہیں ان کے مقامات مصر میں ہیں۔ اور ان کے اشخاص کے نام بھی مصری ہیں۔

ان میں سب سے مشہور اور ہر دلعزیز عنترہ کا قصہ شجاعت اور عشق و محبت کے واقعات پر مشتمل ہے۔ عنترہ یوں تو زمانہ جاہلیت کا ایک مشہور شاعر تھا اور وہ معلقات کے سات بڑے شعراء میں سے ایک ہے۔ لیکن اس کے کردار کا جو خاص وصف اس کی ہمت، شجاعت اور جنگجوئی کی صورت میں مشہور ہوا۔ اور پھر اپنی چچازاد بہن "عبلہ" سے اس کا والہانہ عشق! اس کو لے کر اس پر افسانوں اور داستانوں کی اتنی تہیں چڑھا دی گئیں کہ کچھ صدیاں گزرنے پر عنترہ حقیقی سے زیادہ ایک داستانی وجود بن کے رہ گیا، جو ایک طرف تو سورماؤں کا سورما ہے۔ جس سے دشمنوں کی جان جاتی ہے اور دوسری طرف وہ بے پناہ محبت کرنے والا عاشق ہے اور اس کی محبوبہ عبلہ اپنے حسن و جمال اور اپنی جوانی و رعنائی میں آسمان سے اتری ہوئی کوئی حور ہے۔ ایک قصہ جو اتنی صدیوں تک مسلسل سنایا گیا ہو اس میں کئی تبدیلیوں اور اضافوں اور



کاٹ چھانٹ کا ہونا ناگزیر تھا۔ چنانچہ عنترہ کے قصے کی بھی کئی روایتیں (Versions) مروج رہیں اور ان کے یورپی زبانوں میں ترجمے ہوئے، جن میں سے ایک روایت میں عنترہ کا انجام یوں بتایا گیا ہے کہ ایک لڑائی میں اس کے ایک دشمن نے جب دھوکے سے اس پر زہر میں بجھے ہوئے نیزے سے حملہ کیا تو وہ بہت زخمی ہو گیا اور اسے اپنا انجام قریب نظر آنے لگا۔ اس نے اپنے لشکر کو جو آگے گیا ہوا تھا پیچھے بلا لیا اور اپنے خیموں میں واپس جانے کے لئے کہا، اور وہ خود ایک گھوڑے پر سوار ایک نیزے سے ٹیک لگائے کھڑا رہا۔ کچھ دیر بعد وہ وہیں مر گیا، لیکن دشمن یہ سمجھتے رہے کہ وہ زندہ ہے اور اس کے ڈر کے مارے وہ دور ہی رہے اور اس کے ساتھیوں سے کوئی تعرض نہ کیا، یہاں تک کہ وہ بحفاظت واپس چلے گئے۔ کافی دیر کے بعد ان لوگوں کو شک ہوا کہ عنترہ اتنی دیر سے جو گھوڑے پر سوار ہے کہیں زندہ بھی ہے یا نہیں۔ انہوں نے اس کے گھوڑے کی طرف ایک پتھر پھینکا تو وہ بدکا، جس سے عنترہ کا نیزہ گر گیا اور وہ نیچے آ رہا۔ اس وقت دشمن کو پتا چلا کہ اس نے جان دیتے ہوئے بھی کتنی بہادری کا کارنامہ انجام دیا اور اپنے ساتھیوں کو دشمنوں سے بچا لے گیا۔ اس قصے کا یہ انجام فرانس کے شاعر لامرتین کو بہت پسند تھا اور وہ اس کے لئے سراپا ستائش تھا۔ یونانی ادبیات میں Eliad (الیاذہ) ایک بہت بڑا رزم نامہ (Epic) ہے۔ عربی میں اس معیار کا رزم نامہ تو کوئی نہیں، لیکن بعض لوگوں کا خیال ہے کہ اگر عربی زبان میں کوئی رزم نامہ ہوتا تو عنترہ کا قصہ عربی زبان کی Eliad (الیاذۃ العرب) کہا جانے کا حقدار تھا۔

☆......☆......☆

## الف لیلہ و لیلہ (Thousand and One Nights)

حکایات کی یہ کتاب عربی زبان میں تفریح کا ایک ایسا خزانہ ہے جس کی مثال دنیا کی دوسری زبانوں میں مشکل سے ہی ملے گی۔ حکایتوں، داستانوں اور مہم جوئی کے قصوں پر مشتمل یہ کتاب کسی خاص وقت اور زمانے کی تصنیف نہیں ہے اور نہ اس کا کوئی ایک معلوم مصنف ہے، بلکہ یہ ایسی عجیب و غریب کتاب ہے جو کئی صدیوں کے عمل نمو (Evolution) کے بعد اپنی موجودہ صورت تک پہنچ پائی ہے۔ یہ عوامی ادب کی کتاب ہے جس نے مختلف ملکوں اور تہذیبوں کی داستانی روایات کو اپنے دامن میں سمیٹا ہے۔

اغلب خیال یہی ہے کہ الف لیلہ اہل ایران کی کہانیوں کی ایک مختصر سی کتاب "ہزار افسانہ" سے ماخوذ ہے، جس کی بنا انہوں نے چار کرداروں پر رکھی تھی: بادشاہ، وزیر، وزیر کی بیٹی شہرزاد اور اس کی لونڈی دنیا زاد۔ عربوں نے تیسری صدی ہجری (نویں صدی عیسوی) کے آخر میں فارسی سے اس کتاب کا ترجمہ عربی

میں کیا اور پھر وقت کے ساتھ ساتھ اس پر اضافے کرتے چلے گئے یہاں تک کہ اس کا ابتدائی فارسی اور ہندی حصہ بالکل دب کے رہ گیا۔ اس کتاب کی اصل اور ترکیبی کہانی (Frame Story) ہندی طرز حکایت کا نمونہ ہے جسے ایرانیوں نے اپنا لیا۔ یہ کہانی مختصراً یوں ہے کہ شہریار ایک ظالم بادشاہ ہے جو ہر روز نئی شادی کرتا ہے۔ لیکن وہ عورتوں سے اتنی نفرت کرتا ہے کہ ایک رات گزارنے کے بعد وہ اپنی ملکہ کو صبح ہوتے ہی قتل کر دیتا ہے۔ اس کے اس ظالمانہ رویے سے اس کی رعایا بے حد پریشان رہنے لگتی ہے۔ یہاں تک کہ ایک دن وزیر کی بیٹی شہرزاد بادشاہ کی اصلاح کے ارادے سے اس سے شادی کرتی ہے اور اس کی ملکہ بنتی ہے۔ ملکہ شہرزاد روزانہ رات کے پچھلے حصے میں ایک کہانی بادشاہ کو سنانا شروع کرتی ہے اور جب پیچیدہ سحر نمودار ہونے لگتا ہے تو وہ کہانی میں سے کہانی پیدا کر کے حالات کو ایسے موڑ پر لے آتی ہے کہ بادشاہ کو باقی کہانی سنے بنا چین نہیں پڑتا۔ چنانچہ وہ ملکہ کو ایک رات کی مہلت دیتا ہے تاکہ وہ دوسری رات کہانی ختم کر سکے۔ لیکن ملکہ ہر رات اُسی طرح کہانی میں سے کہانی نکالتی چلی جاتی ہے۔ اس طرح ہوتے ہوتے ایک ہزار اور ایک راتیں بیت جاتی ہیں اور جب آخری رات کہانی ختم ہوتی ہے تو بادشاہ ملکہ شہرزاد کا احسان مند ہوتا ہے اور اپنی اس ظالمانہ روش سے باز آ جاتا ہے۔

جیسا کہ اوپر ذکر ہوا الف لیلہ میں مختلف تہذیبوں کی داستانی روایات ہیں۔ چنانچہ کتاب کا پہلا حصہ جو زیادہ تر فارسی اور ہندی کہانیوں کے ترجمے پر مشتمل ہے اس پر ہندی قصہ گوئی کے اثرات واضح طور پر دکھائی دیتے ہیں۔ ایک قصے میں سے دوسرا قصہ نکالنا دراصل قدیم ہندی قصہ گوئی کا خاص انداز تھا۔ ہندی قصہ گوئی کے اسی اسلوب کو اپنا کر اہلِ ایران نے اپنی کہانیاں تصنیف کیں اور انہی کہانیوں نے بعد ازاں عربی میں منتقل ہو کر الف لیلہ کی صورت اختیار کی۔ الف لیلہ کے اس ابتدائی حصے کی کہانیوں کے کرداروں کے نام فارسی ہیں (شہرزاد، شہریار، شہر زمان، اردشیر، حیات النفوس، قمر الزماں بن شہر زمان، شہزادی بدور وغیرہ)

الف لیلہ کا دوسرا حصہ جسے بغدادی اور خالص عربی حصہ کہنا چاہیے، زیادہ تر عرب کے داستان گوؤں کی اپنی تخلیق ہے۔ کتاب کے اس مقامی حصے میں پڑھنے والے کو خلیفہ ہارون الرشید کے بغداد کی سوسائٹی اور اس کے اعلیٰ اور وسطی طبقوں کی ایک اجلی اور قابلِ فہم تصویر نظر آتی ہے جو ایک فصیح اور معیاری زبان اور شیریں لہجے میں پیش کی گئی ہے۔ کتاب کا یہ حصہ تقریباً دسویں اور گیارہویں صدی عیسوی میں ترتیب پایا۔ علی بن بکار اور شمس النہار، انس الوجود اور ورد الاکمام، قصہ سوتے جاگتے کا، ابوالحسن عیش پرست، قصہ تین بیٹیوں کا اور تین گداگروں کا، نیز سندباد کی حکایات...... یہ اس حصے کی مشہور اور خصوصی کہانیاں ہیں۔

کتاب کا تیسرا حصہ وہ ہے جس کی تالیف و تشکیل مصر کے بازاروں میں پانچ سو سال کے عرصے میں تمام ہوتی ہے۔ کتاب کا یہ حصہ وسعت اور ضخامت میں پچھلے دونوں حصوں سے زیادہ، موضوع کے اعتبار سے واقعہ و حقیقت کے قریب، لیکن زبان و ادب کے اعتبار سے فروتر ہیں ہے۔ جنگ و جدل، مہم جوئی، طلسمات، جادو، جنات، پریاں اور تقدیر وغیرہ اس حصے کے موضوع ہیں۔



الف لیلہ کی دریافت کا سہرا فرانس کے موسیو انطون گلان کے سر جاتا ہے جو استنبول میں فرانسیسی سفارت خانے میں سیکرٹری تھا۔ اس کے ہاتھ پہلے بعض مشرقی مخطوطات میں سے سندباد کی کچھ کہانیاں لگیں اور پھر حلب کے ایک باشندے سے اسے کہانیوں کی کتاب الف لیلہ کی چار جلدیں مل گئیں۔ گلان نے ان سب کہانیوں کا فرانسیسی میں ترجمہ کیا جو اتنا مقبول ہوا کہ دوسری یورپی زبانوں میں بھی ان غرابت آمیز (Exotic) کہانیوں کے ترجمے ہو گئے۔ ایک سو سال تک الف لیلہ کی یہی کہانیاں یورپ میں پڑھی جاتی رہیں۔ پھر جب نپولین مصر آیا تو اس کے ساتھ آنے والے ادباء اور سکالروں نے اس امر کا سراغ لگا لیا کہ الف لیلہ دراصل ایک بڑی ضخیم کتاب ہے اور اب تک اس کی جن کہانیوں کا ترجمہ ہوا ہے وہ اس کا ایک چوتھائی حصہ ہیں۔ اس کے بعد الف لیلہ کے مکمل اور مستند نسخوں کی تلاش شروع ہوئی اور جب کچھ صحیح اور قابلِ استناد نسخے اس مکمل کتاب کے دستیاب ہو گئے تو ان کے انگریزی زبان میں اچھے اور مستند ترجمے ہوئے جن میں ایڈورڈ ولیم لین، جان پین اور سر رچرڈ برٹن کے ہر دلعزیز اور معتبر ترجموں کے بعد ایک اور عمدہ ترجمہ انڈریو لنگر نے انیسویں صدی کے اختتام سے پہلے کر لیا۔ الف لیلہ کا جو ترجمہ سر رچرڈ برٹن نے کیا ہے وہ تیرہ جلدوں میں ہے اور اس میں مترجم نے جو فٹ نوٹس جگہ جگہ دیے ہیں وہ بہت مفید اور معلومات افزا ہیں۔

اہلِ یورپ کے نزدیک عربی حکایات کی اس کتاب "الف لیلہ ولیلہ" کی اہمیت کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ اس میں ہمیں عرب تاریخ کے مختلف زمانوں میں عرب سوسائٹی کے روزمرہ رہن سہن اور طرزِ معاشرت کے مطالعے کا موقع ملتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ یہ کتاب ان کے ہاں ہمیشہ سے بحث و تحقیق کا موضوع چلی آتی ہے۔

☆......☆......☆

## باب ۷

# عربی ادب کا موجودہ دور

## (انیسویں صدی کے آغاز سے بیسویں صدی کی دوسری دہائی تک)

اٹھارویں صدی کے اواخر تک آتے آتے عرب اسلامی مملکت سکڑ کر اب صرف عراق، شام، جزیرہ نمائے عرب، مصر، سوڈان اور المغرب تک محدود ہو کے رہ گئی تھی۔ لیکن عربی زبان جو پچھلے پانچ سو سال سے زوال و انحطاط کا شکار چلی آتی تھی، اس کے لیے قدرت نے یہ چاہا کہ اسے اس دور میں ایک نئی زندگی عطا کی جائے۔ یہ زندگی اسے مصر میں ملی۔ مصر اس زمانے میں دستوری طور پر تو عثمانی سلطنت کے زیر نگیں تھا لیکن عملاً اس پر ممالیک کا تسلط تھا۔ ١٧٩٨ میں فرانس کے نپولین بونا پارٹ نے مصر پر حملہ کیا اور اس پر غلبہ پالیا۔ اس کے ساتھ اہل علم کا جو گروہ آیا تھا انہوں نے جنگ کے ہنگاموں سے الگ رہ کر مصر میں تہذیب کا بیج بونے کے لیے کام کیا۔ اس سلسلے میں انہوں نے یہاں دو مدرسے قائم کیے، دو اخبار جاری کیے، ایک تھیٹر کی بنیاد رکھی، ایک مجمع علمی (علمی اکادمی) کی تنظیم کی اور ایک چھاپہ خانہ لگا دیا۔ ان سارے اقدامات کا اثر یہ ہوا کہ مصر کی فضا پر جو اندھیارا چھایا ہوا تھا وہ چھٹنا شروع ہوا اور لوگوں نے دیکھا کہ اب وہ ایک نئی زندگی کے جلو میں نئی انیسویں صدی میں پہنچ گئے ہیں، جہاں ان کے سامنے مغرب اس طرح کھڑا ہے جیسے کوئی عاقل و ہوشمند انسان ایک بے زبان حیوان کے سامنے کھڑا ہو۔ اس تبدیلی پر باقی دنیا تو حیرت زدہ ہوئی لیکن خدیوی خانوادے کے سربراہ محمد علی الکبیر کو اس پر کوئی تعجب نہ ہوا۔ اس نے یہ سمجھ لیا کہ مغرب میں جو تہذیب اور تمدن ہے وہ سب کچھ علم کی بدولت ہے اور ان کے انتظام و انصرام اور فوجی تنظیم کی وجہ سے ہے۔ چنانچہ اس نے مصر میں تعلیم کو عام کرنے کا منصوبہ بنایا۔ اس کے لیے اس نے فوجی تعلیم و تربیت اور دوسرے علوم کے لیے مدارس قائم کیے اور لوگوں کو پکڑ پکڑ کر ان میں بھیجا۔ نیز اس کام پر فرانس کے سکالروں کے ایک گروہ کو مامور کیا۔ پھر ان مدارس سے پڑھ کر نکلنے والوں کو اس نے اعلیٰ تعلیم کے لیے فرانس بھیجا۔ ١٨٢٦ میں وہ لوگ جب تعلیم حاصل کر کے واپس آئے تو تعداد میں ۴۴ تھے۔ انہوں نے آتے ہی ان سارے علوم میں ترجمہ و تالیف اور تعلیم کا کام اپنے ذمے لے لیا۔ اس کے بعد بھی تعلیم کے لیے وفد یورپ بھیجے جاتے رہے جو عموماً جامع ازہر سے ہوتے



تھے۔ پھر آگے چل کر قاہرہ میں زبانوں کا مدرسہ قائم ہوا اور اس کے ساتھ ہی ایک دار الترجمہ کا قیام عمل میں آیا اور فرانسیسی چھاپے خانے کی جگہ ایک نئے مصری چھاپے خانے نے لے لی۔ ادھر لبنان میں امیر بشیر الشہابی نے وہ سب کچھ کیا جو مصر میں محمد علی نے کیا تھا۔ اس کی اعانت امریکی اور فرانسیسی عیسائیوں کے مبلغوں نے کی، اور مدارس اور چھاپے خانے قائم کئے، کتابیں لکھیں، رسالے شائع کیے، ڈرامے کی تعلیم دی اور اس ساری کارروائی میں ان کا پورا اعتماد عربی زبان پر قائم رہا۔ چنانچہ مصر اور لبنان نے مل کر زبان اور علوم کی ترقی کے لیے بڑا کام کیا۔ یورپ کی علمی کتابوں کے ترجمے کیے گئے اور عربی کتابیں چھاپی گئیں، جس سے عربی زبان کے تن مردہ میں زندگی کی لہر دوڑ گئی۔ لیکن عربی ادبیات اور علوم تاحال گوشۂ گمنامی میں ہی رہے۔ اس لیے کہ محمد علی کو دوسرے کاموں نے مصروف رکھا اور اس کے عہد میں دفاتر کی زبان بدستور ترکی اور عربی کا آمیزہ ہی رہی۔ یہ سلسلہ یونہی چلتا رہا، یہاں تک کہ خدیوی اقتدار ١٨٦٣ میں اسماعیل کے پاس آ گیا۔ اس نے وہ سب مدارس جو اس کے پیش رو خدیو عباس اور خدیو سعید نے بند کر دیے تھے، پھر سے کھول دیے اور ان پر کچھ اور مدارس کا اضافہ کیا۔ انجینئرنگ، ڈاکٹری، دفاع اور دوسرے علوم کے لیے درسگاہیں قائم کیں اور یورپ کو وفود بھیجنے کا سلسلہ جو معطل ہو گیا تھا پھر سے جاری کر دیا۔ خدیوی لائبریری قائم کی۔ جب ملک میں امن و سکون ہوا تو غیر ملکی لوگ جن میں علماء اور ادباء بھی تھے، تجارت اور دوسری ضروریات کے لیے مصر آنے لگے۔ ان کے ساتھ ارتباط اور اختلاط کے نتیجے میں چھاپہ خانے عام ہوئے، مدارس کی تعداد میں اضافہ ہوا، صحافت کو فروغ حاصل ہوا، علوم کے ترجمے ہونے لگے جس کا اثر یہ ہوا کہ یورپی تہذیب کے اثرات بڑھنے لگے۔ چنانچہ ذہنوں میں وسعت آنے لگی، زبان ترقی کی راہ پر گامزن ہوئی اور ادبیات میں بھی زندگی کی لہر دوڑ گئی۔

پھر مصر ١٨٨٢ میں انگریزی استعمار کے نیچے آ گیا۔ انگریزوں نے آ کر ترقی کی ساری رفتار روک دی اور تعلیم کو دوسری نہج پر ڈال دیا۔ یورپ کو وفود بھیجنے کا سلسلہ ختم کر دیا۔ السنہ (زبانوں) کی تعلیم کا مدرسہ بند کر دیا۔ عربی زبان کو پیچھے کر کے ساری تعلیم انگریزی زبان میں دی جانے لگی اور تعلیم کا مقصد صرف یہ رہ گیا کہ حکومت کے لیے کارندے تیار کیے جائیں نہ کہ امت کے لیے قابل افراد۔ لیکن مصری قوم نے پیچھے ہٹنے سے انکار کر دیا اور ان کے زعماء اپنی زبان عربی کی بالادستی کے لیے اٹھ کھڑے ہوئے اور اپنی نئی نسلوں کی تعلیم کا ذمہ خود لے لیا۔ مدارس میں عربی زبان لوٹ آئی اور یورپ کو پھر سے وفود بھیجے جانے لگے۔ اسی زمانے میں جمال الدین افغانی کی شخصیت نمودار ہوئی اور اس کی تعلیمات کا اثر یہ ہوا کہ ١٨٨٢ میں عرابی پاشا کی تحریک اٹھی اور "مصر مصریوں کے لیے" کا نعرہ بلند ہوا۔ عرابی پاشا کی مسلح تحریک خدیو توفیق خود تو نہ روک سکا لیکن انگریزوں کی مدد لے کر اس نے اس تحریک کو دبا دیا۔ رفتہ رفتہ ١٩١٩ میں

انگریزوں کے فوجی تسلط کے خلاف آزادی کی جنگ ایک دفعہ پھر بھڑک اٹھی اور اس کی آواز اتنی بلند ہوئی کہ پورے عالم میں سنی گئی۔ اس جدوجہد کے نتیجے میں مصر نے ۱۹۲۳ میں ایسا دستور حاصل کر لیا جس میں اس کے حق خود ارادی کا کافی حصہ اسے مل گیا۔ آزادی کی یہ کشمکش جاری رہی اور ۱۹۳۶ میں ایک معاہدے کے تحت مصر کو مزید آزادی اور اختیار حاصل ہوا۔ اور جب ۱۹۴۵ میں دوسری عالمی جنگ ختم ہوئی تو مصر نے اس معاہدے میں تبدیلی کا مطالبہ کر دیا۔ دوسری جنگِ عظیم کے خاتمے پر حالات میں ایک بڑی تبدیلی یہ ہوئی کہ برطانوی حکومت نے فلسطین میں اسرائیلی مملکت قائم کر دی۔ اس سے عربوں کی قومی تحریک کو بہت بڑا دھچکا لگا اور عرب اقوام اس نئی مملکت کے خلاف اُٹھ کھڑی ہوئیں لیکن ۱۹۴۸-۱۹۴۹ میں ان کو اس نوزائیدہ مملکت کے خلاف ناکامی ہوئی اور مصر کے شاہ فاروق کو اس ناکامی کا ذمہ دار ٹھہرایا گیا۔ ملک میں شاہی خاندان اپنی بدعنوانیوں اور شاہ خرچیوں کی وجہ سے بہت غیر ہردلعزیز ہو گیا اور آخر ۲۲ جولائی ۱۹۵۲ کو شاہ فاروق کو معزول کر کے مصر میں جمہوریہ کے قیام کا اعلان کر دیا گیا۔

شام اور لبنان پر فرانس کا مستقل قبضہ پہلی جنگ عظیم کے بعد ہوا۔ اس زمانے میں یہودیوں اور عیسائیوں نے اپنے مدرسے الگ قائم کیے' تعلیم روز بروز پھیلنے لگی' مزید برآں ایک بڑی تعداد طلبہ کی فرانس' انگلستان اور روس کا قصد کرنے لگی۔ اس تعلیمی جدوجہد کا ثمرہ یہ ملا کہ ملک میں تعلیم یافتہ نوجوانوں کی ایک بڑی تعداد پیدا ہو گئی۔ اس تعلیمی جدوجہد کے سلسلے میں فرانسیسی اور امریکی مشنریوں کے ادارے خاص طور پر قابل ذکر ہیں اور ملک کی تعلیمی و ادبی ترقی بڑی حد تک انہی کی مرہونِ منت ہے۔ ۱۸۲۰ میں بیروت میں ایک امریکی کالج کھولا گیا' جس نے آگے چل کر باقاعدہ ایک یونیورسٹی (الجامعۃ الامیرکیۃ) کی صورت اختیار کر لی۔ تعلیم یافتہ نوجوانوں نے عربی ادبیات کی طرف توجہ دی۔ قدیم معیاری ذخیرے کو کھنگالا گیا۔ کلاسیکی شاعری کو پھر سے رواج دیا گیا۔ ابن رشدؒ ابن سینا اور ابن خلدون کی کتابیں پڑھی جانے لگیں۔ اس طرح لبنان اور شام میں ایک نئے عربی ادب کے لیے زمین تیار ہو گئی۔ لبنان کے عیسائی اس عربی تجدید میں پیش پیش تھے۔ ان کے یازجی اور بستانی خاندانوں نے اس فن میں بڑی خدمات انجام دیں۔

بطرس بستانی نے ۱۸۶۰ میں عربی کا پہلا ہفتہ وار اخبار جاری کیا۔ ۱۸۷۵ میں عربی دائرۃ المعارف (انسائیکلو پیڈیا) کا کام شروع کیا جو اس کی بے وقت وفات کے باعث ادھورا رہ گیا۔ اس کام میں سلیم بستانی' نجیب بستانی اور سلیمان بستانی بھی اس کے ساتھ شریک تھے۔ بطرس بستانی نے علاوہ ازیں عربی زبان کی پہلی جدید ڈکشنری "محیط المحیط" کے نام سے شائع کی۔ سلیمان بستانی نے ہومر کی ایلیڈ (Elliad) کا عربی نظم میں کامیاب ترجمہ کیا جو "الیاذہ ھو میروس" کے نام سے مشہور ہے۔ سلیمان بستانی کا لکھا



ہوا الیاذہ کا مقدمہ عربی زبان میں ابن خلدون کے مقدمے کے بعد دوسرا مقدمہ شمار کیا جاتا ہے۔

یازجی خاندان میں ناصیف یازجی' ابراہیم یازجی اور وردہ بنت ناصیف یازجی انیسویں صدی کے ممتاز ادیبوں میں شمار کیے جاتے ہیں۔ ناصیف یازجی کو عربی زبان و ادب سے عشق تھا۔ اس کا بیٹا ابراہیم یازجی اپنے دور میں لغت کا امام تھا۔ اس نے بازاری اور اخباری زبان پر سخت تنقید کی اور لوگوں کو صحیح زبان لکھنے پر آمادہ کرنے کے لیے اپنے لغوی تنقیدی مضامین کا مجموعہ "لغۃ الجرائد" شائع کیا۔

ان کے علاوہ دوسرے مسیحی علماء اور ادباء کی خدمات عربی زبان و ادب کے لیے اتنی اہم اور وقیع ہیں کہ آج تک ان کا جواب پیدا نہیں کیا جا سکا۔ ان میں ایک الأب لویس شیخو (م ۱۹۲۷) تھا جس نے عربی رسالہ "مشرق" جاری کیا اور پچیس سال تک اس کی ادارت سنبھالی۔ اس کی اہم تصنیف "مجانی الادب فی حدائق العرب" ہے' جو عربی زبان کے سارے قدیم ادب کا ایک عمدہ انتخاب ہے جس میں عرب شعراء اور ادباء کا ضروری تعارف بھی کرایا جاتا ہے۔ اس کے علاوہ اس کی تصانیف میں "علم الادب" اور "شعراء النصرانیہ" شامل ہیں۔ اسی کا معاصر ایک دوسرا فاضل الأب معلوف الیسوعی (م ۱۹۴۶) تھا جس نے تیس برس تک عربی جریدہ "البشیر" نکالا اور اس کے ساتھ اس کی سب سے اہم اور عظیم الشان تصنیف "المنجد فی اللغۃ" ہے' جس کا لغت پر مشتمل حصہ (قسم اللغۃ) ۱۹۰۹ میں شائع ہوا اور قسم الاعلام (مشاہیر کے سوانحی تعارف) کا دوسرا حصہ ۱۹۵۶ میں ایک اور فاضل الأب فردینان توتل الیسوعی نے شائع کیا۔ ان دونوں حصوں پر مشتمل الیسوعی اصحاب کی یہ لغات "المنجد" جامع اور مستند ہونے کے ساتھ ساتھ آج پورے عرب میں سب سے زیادہ استعمال کی جانے والی لغات ہے۔ عربی کالجوں اور یونیورسٹیوں کی تعلیم میں اس کے بغیر چارہ نہیں۔ دو حصوں پر مشتمل اس نئی "المنجد" کی مانگ کا یہ عالم ہے کہ آج سے تیس سال پہلے ۱۹۷۳ میں اس کا اکیسواں ایڈیشن شائع ہوا تھا۔

## عربوں کی بیداری کے وسائل

جیسا کہ اوپر ذکر ہوا' فرانسیسی تسلط اور اس کے نتیجے میں پروان چڑھنے والے محمد علی کے جذبۂ آزادی کا اثر یہ ہوا تھا کہ مصر اور لبنان کے آفاق پر مغرب کی جانب سے آنے والی علم کی روشنی پھیل گئی۔ چنانچہ ان دونوں ملکوں نے اس روشنی میں ترقی کرنی شروع کی۔ اس روشنی کے پیچھے وہ وسائل تھے جن کو محمد علی اور اس کے وارثوں نے فوج کو ترقی دینے' حکومت کا کاروبار منظم کرنے اور عوام کی تربیت کرنے کے لیے براہِ راست یا بالواسطہ طور پر استعمال کیا۔ ان وسائل میں سے اہم یہ تھے:

### ا۔ مدارس

محمد علی نے ابتدا میں فوجی تعلیم، ڈاکٹری اور جسمانی کھیلوں کیلیے مختلف سطحوں پر مدارس قائم کیے۔ اس کے بعد ان مدارس میں اضافہ ہوتا گیا اور طبیہ کالج، مدرسۃ الالسنہ (Languages) اور مدرسہ دارالعلوم قائم ہوئے۔ جب الالسنہ کے مدرسے سے مترجم پیدا ہونے لگے تو رفاعہ بے طہطاوی کی زیرنگرانی باقاعدہ ترجمے کا شعبہ قائم کیا گیا، جس نے جدید علوم میں مختلف مغربی کتابوں کا عربی میں ترجمہ کیا۔ پھر دارالعلوم کی بنا ڈالی گئی اور اس میں عربی زبان کے علوم میں خصوصی تعلیم دی جانے لگی۔ اس ادارے کے اساتذہ اکثر جامع الازہر کے لائق شیوخ ہوتے تھے اور کوئی شک نہیں کہ عربی زبان و ادب کی ترقی میں اس دارالعلوم نے بڑی خدمات انجام دیں اور آگے جا کر ۱۹۳۶ء میں یہ کلیۃ الآداب (Arts College) کے ساتھ ضم کر دیا گیا۔

### ۲۔ مغرب کو وفود کی ترسیل اور مغربی زبانوں کی تعلیم

پہلے محمد علی پاشا اور اس کے بعد اسماعیل پاشا نے مغربی ممالک کو اعلیٰ تعلیم کے لیے وفود بھیجنے کی جو پالیسی اختیار کی وہ عربوں کی بیداری اور ذہنی ترقی کے لیے بہت کارگر ثابت ہوئی۔ یہ وفد جو بارہ سال کی مدت کے لیے بھیجے جاتے تھے جب تعلیم حاصل کر کے وطن واپس آتے تھے تو اپنی نئی سوچ اور زندگی کے بارے میں ترقی پسندانہ نقطۂ نظر کی وجہ سے مقامی فضا کو متاثر کرتے تھے اور جدید علوم کی تعلیم میں اچھے معاون ثابت ہوتے تھے۔ اسی طرح مغربی زبانوں فرانسیسی اور انگریزی کی تعلیم جب مصر و شام میں حکومت اور انجمنوں کے مدارس، نیز مسیحی راہبوں اور مبلغوں کی درسگاہوں میں لازمی قرار دی گئی تو اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ مغرب کے علوم و افکار سے ان کے سوچنے اور اظہار خیال کے طریقوں سے عرب لوگوں کو آگاہی ہوئی اور ان کے سامنے مطالعہ و مشاہدہ کے آفاق کھل گئے، ان کی سوچ اور فکر میں تبدیلی آئی۔ جس کا اثر یہ ہوا کہ انہوں نے نثر میں بھی اور شاعری میں بھی نئے نئے اسالیب اختیار کئے اور پھر یورپی زبانوں سے ترجمہ کی بدولت عربی زبان کی ثروت میں اضافہ ہوا اور اس میں کئی طرح کے علوم و فنون کا ذخیرہ منتقل ہو گیا۔

### ۳۔ جامع ازہر

ازہر جس کا شمار دنیا کی قدیم ترین یونیورسٹیوں میں ہوتا ہے، اسے جوہر صقلی نے قاہرہ کی بنیاد رکھنے



کے فوراً بعد ہی ۹۶۹ میں قائم کیا۔ اس مدرسے کا مقصد شعائر دینی کی تعلیم دینا تھا۔ اس کے لیے اطراف عالم سے فقہ اور علوم کے ماہرین بلا کر یہاں لائے گئے۔ اس میں پہلے شیعی فقہ اور علوم کی تعلیم دی جاتی تھی اور لغت و نحو کے مسائل پر لیکچر دیے جاتے تھے۔ پھر جب فاطمیوں کی حکومت ختم ہوئی اور ۱۱۷۱ میں مصر پر صلاح الدین ایوبی کا غلبہ ہوا تو وہ چونکہ اہل سنت میں سے تھا اس نے یہاں شیعی فقہ کی جگہ شافعی فقہ کو رواج دیا اور اس کے ساتھ امام ابوحنیفہ کی فقہ بھی پڑھائی جانے لگی اس لیے کہ بغداد میں خلفاء اسی مذہب کے پیرو تھے۔ لیکن پھر صلاح الدین نے ازہر میں چاروں فقہی مذاہب کی تعلیم کی اجازت دے دی۔ اس کے بعد ممالیک کے عہد میں بھی جامع ازہر اپنی اسی راہ پر چلتی رہی اور عربی لغت اور اسلامی علوم کو جہاں تک ہو سکا زمانے کی دستبرد سے محفوظ رکھا۔ پھر جب مصر پر فرانسیسی غلبے کے بعد محمد علی کے زمانے میں ترقی کی لہر چلی اور مغرب کی علمی ترقی سے استفادے کی کوششیں ہونے لگیں تو جامع ازہر میں اس کے قدیم طریقۂ تعلیم کے باوجود بہت سے فارغ التحصیل نوجوان مغرب کی طرف بھیجے جانے والے وفود میں شامل کیے گئے۔ تاکہ وہ وہاں جا کر اپنی قدیم دینی تعلیم کے ساتھ مغرب کی نئی تعلیم اور نئے طریقوں سے آگاہی حاصل کریں۔ ثقافتوں کے اس تبادلے کا نتیجہ یہ ہوا کہ ۱۸۸۷ میں حکومت نے جامع ازہر کی اصلاح کا فیصلہ کیا اور باوجود کچھ مشکلات اور رکاوٹوں کے اس میں کچھ نئے علوم داخل کیے گئے۔ پھر شیخ محمد عبدہ نے ازہر کی اصلاح کا بیڑا اٹھایا اور روایت پرست طبقے کی مخالفتوں اور مزاحمتوں کے علی الرغم اسے ترقی دے کر نئے راستے پر ڈالا۔ اس ترقی اور اصلاح کے بعد ازہر نے عربی زبان و ادب اور دوسرے اسلامی علوم کی ترقی اور نشوونما میں بہت اہم کردار ادا کیا ہے۔ بیسویں صدی کے نصف اول میں عرب دنیا میں جتنے بھی بڑے ادیب اور عالم اور مصنف منظر عام پر آئے ان کی اکثریت مصر کی اسی جامع ازہر سے پڑھ کر نکلی تھی۔

### ۴۔ جامعۂ مصریہ (Egyptian University)

انیسویں صدی کے اواخر میں انگریزوں کی خاص تعلیمی پالیسی کے رد عمل میں کچھ آزادی پسند لوگوں نے ۱۹۰۶ میں جمع ہو کر ایک ایسی قومی یونیورسٹی قائم کرنے کا فیصلہ کیا جو ملک کی تعلیمی ضروریات کو پورا کر سکے۔ اس کے لیے انہوں نے اہل خیر سے مالی امداد کی درخواست کی اور یہ امداد حاصل ہونے پر ۱۹۰۸ میں قومی یونیورسٹی قائم کر دی گئی۔ اس کی خاطر یورپ سے اہل علم کا ایک گروہ منگوایا گیا اور مصر کے ممتاز اور منتخب ادباء اور دانشوروں کو جمع کیا گیا، جنہوں نے یونیورسٹی کے طالب علموں کو آداب و فنون اور فلسفے پر لیکچر دینے کا سلسلہ شروع کیا۔ یورپ سے جو علماء آئے ان میں دو نامور مستشرق جویدی اور نلینو بھی شامل تھے۔ انہوں نے عربی ادب اور اس کی تاریخ کے مطالعے کے لیے ایک نیا واضح طریقہ طلبہ اور

اساتذہ کے سامنے رکھا۔ ۱۹۲۵ میں اس جامعہ کو مصر کی وزارت تعلیم نے اپنے انتظام میں لے لیا اور اس یونیورسٹی میں لاء کالج، میڈیکل کالج، انجینئرنگ کالج، زراعتی کالج اور کامرس کالج کے ساتھ ساتھ فارمیسی اور دندان سازی کے شعبوں کا بھی اضافہ کیا گیا۔ پھر اس کا نام بدل کر جامعۂ فؤاد اول رکھ دیا گیا۔ جب تعلیم کی ضرورت اور بڑھی اور طلبہ کی تعداد زیادہ ہونے لگی تو اسکندریہ میں جامعۂ فاروق کے نام سے اسی طرح کی ایک اور یونیورسٹی قائم کر دی گئی اور اس میں کوئی شک نہیں کہ ان دو یونیورسٹیوں اور ان کے ساتھ جامع ازہر نے علم و ادب کو ترقی دینے اور عربی ثقافت کی روشنی پھیلانے میں نیز ماضی کو حال کے اور مشرق کو مغرب کے قریب لانے میں بہت ہی قابل قدر کام کیا۔

## ۵۔ چھاپے خانے

عربی ممالک میں چھاپے خانے جب بھی قائم ہوئے ان میں طباعت حروف سے (یعنی ٹائپ کے طریقے پر) ہی ہونے لگی۔ عربی زبان کا پہلا چھاپہ خانہ احمد فارس الشدیاق کا "مطبعة الجوائب" آستانہ (ترکی) میں قائم ہوا۔ عرب ممالک میں سب سے پہلے لبنان کے مسیحی راہبوں نے سترہویں صدی کے اوائل میں ایک چھاپہ خانہ نصب کیا۔ پھر ۱۸۴۸ میں انہی لوگوں نے ایک بڑے چھاپے خانے "المطبعة الكاثوليكية" (کیتھولک پریس) کی بنیاد رکھی۔ اس چھاپے خانے نے قدیم عربی مخطوطات اور ان کے علاوہ ہر طرح کی علمی اور ادبی کتابیں چھاپنے کا جو کام ماضی میں انجام دیا اور اب تک دے رہا ہے۔ وہ عظیم الشان ہے۔ مصر میں پہلا چھاپہ خانہ ۱۷۹۸ میں نپولین کے ساتھ آیا، جس کا ایک خاص مقصد تھا اور وہ نپولین کے ساتھ ہی واپس چلا گیا۔ اس کی جگہ محمد علی پاشا نے ۱۸۳۱ میں ایک چھاپہ خانہ بولاق پریس کے نام سے قائم کیا جو اب تک چل رہا ہے۔ لیکن اب اس میں صرف نصاب کی کتابیں اور حکومت کی منشورات اور احکام اور قانونی کتابیں شائع ہوتی ہیں۔ اس اثنا میں مصر میں بہت سے جدید طرز کے چھاپے خانے قائم ہو گئے جنہوں نے علوم وفنون اور ادب و شعر کی اشاعت میں بہت نمایاں اور قابل تحسین کام کیا ہے۔

## ۶۔ صحافت

عرب ملکوں کی بیداری اور ان کی علمی و فکری پیش رفت میں عربی اخبارات اور رسالوں نے بڑھ چڑھ کر حصہ لیا اور معاشرے پر اپنے اثرات کی وجہ سے وہ آج بھی بہت اہم ہیں۔ مصر کے روزنامے "الاهرام" اور "المقطم" نے صحافت کا ایک اعلیٰ معیار پیش کیا اور ادب و شعر کی دنیا میں "الرسالة" اور "الثقافة" جیسے ہفتہ وار رسالوں نے نئے لکھنے والوں کے لیے ایک میدان مہیا کر دیا۔ احمد حسن



زیات کے "الرسالة" کے صفحات پر کئی نووارد لکھنے والے ایسے آئے جو ادیب بن کر نکلے۔ اسی طرح ماہانہ رسالوں "المقتطف" "الهلال" "الكتاب المصري" اور "الكتاب" نے مصر میں اور "الاديب" نے بیروت میں اپنے صفحات خالص علمی، ادبی اور ثقافتی مضامین اور نئی شاعری کے لیے وقف کیے اور عربی ادب اور شاعری کے عمدہ نمونے پیش کیے۔ دمشق کی علمی اکیڈمی "المجمع العلمي" نے بھی اپنا ایک ماہوار رسالہ جاری کیا، جس کی خصوصیت یہ رہی کہ اس میں عربی کے چوٹی کے ادبا، علماء اور محققین کے مفصل مقالات شائع ہوتے تھے۔ چنانچہ اس رسالے نے عربی علوم و آداب کی جو خدمت پچھلی نصف صدی سے بھی زیادہ عرصے میں انجام دی ہے وہ بے پناہ ہے۔ اس نے اپنے صفحات میں علم و تحقیق کا ایسا قیمتی ذخیرہ مہیا کیا ہے جو مغرب میں مستشرقین کے کسی بڑے سے بڑے علمی رسالے کے سامنے فخر کے ساتھ رکھا جا سکتا ہے۔

## ۷۔ ادبی اکیڈمیاں (Literary Academies)

دمشق کی "المجمع العلمي" (علمی اکیڈمی) جس کا اوپر ذکر ہوا ۱۹۱۹ میں قائم کی گئی۔ اس کا مقصد عربی علوم و آداب میں زندگی کی روح پھونکنا اور علمی موضوعات میں بحث و تحقیق کے طریقوں کا نمونہ پیش کرنا تھا۔ اس اکیڈمی نے جدید اصطلاحوں کے عربی ترجموں کا کام بھی اپنے ذمے لیا، نیز دفتری زبان کی اصلاح کے لیے بھی کام کیا۔ اسی طرح کی ایک اکیڈمی "مجمع فواد الملكي للغة العربية" (عربی زبان کے لیے شاہ فؤاد کی اکیڈمی) مصر میں بھی قائم ہوئی۔ اس کے مقاصد میں عربی زبان کی سلامتی کے لیے اور اس کی ترقی کی خاطر مناسب اصلاحات کرنا، نئے حالات کو سامنے رکھ کر ایک بڑی لغت تیار کرنا، مصر میں متفرق مقامی عربی لہجوں کو منظم کرنا اور ہر وہ قدم اٹھانا رہا جو عربی زبان کی ترقی اور تجدید کے لیے ضروری ہو۔

☆.....☆.....☆

اوپر کے یہ تمام وسائل شرق اوسط کے ممالک خصوصاً مصر و لبنان میں علمی بیداری اور ثقافتی نشوونما کے لیے بہت مفید اور کارگر ثابت ہوئے۔ خصوصیت کے ساتھ ان ملکوں سے یورپ کو تعلیم کے لیے جو وفود بار بار بھیجے جاتے رہے ان کی وجہ سے ان عرب ملکوں میں قدیم روایات کی تاریکیاں چھٹنے لگیں اور جدید علوم وفنون کی روشنیاں ہر طرف پھیلنے لگیں۔ ان ممالک میں چونکہ انگریزوں اور فرانسیسیوں کا غلبہ زیادہ لمبے عرصے تک نہ رہا تھا اس لیے یہاں انگریزی یا فرانسیسی زبان ذریعہ تعلیم کے طور پر رائج نہ ہو



Scanned with CamScanner

سکی اور ذریعہ تعلیم یہاں شروع سے آخر تک عربی ہی رہا۔ اس سے عربی زبان کو یہ فائدہ ہوا کہ اس نے ہر طرح کے علوم وفنون کو اپنے دامن میں سمیٹا اور سائنسی ترقی اور اس سے پیدا ہونے والی نئی اصطلاحات اور لفظیات سے بھی کامیابی کے ساتھ عہدہ برآ ہوئی۔ اور سب سے بڑھ کر یہ کہ یہ نہ صرف قومی زبان بن کے رہی بلکہ اس نے سرکاری زبان کی حیثیت بھی حاصل کی جو آج تک اسے حاصل ہے۔ اس کے مقابلے میں برصغیر ہندوستان میں یہ ہوا کہ یہاں انگریزوں کا تسلط پورے نوے سال تک قائم رہا۔ انہوں نے یہاں انگریزی کو نہ صرف تعلیم کی پہلی زبان کے طور پر رائج کیا بلکہ اسے سرکاری زبان کا درجہ بھی دیے رکھا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ یہاں لوگ انگریزی زبان تو سیکھ گئے اور اس کے لٹریچر اور اس کے علوم وفنون سے بھی آگاہی حاصل کر لی لیکن یہاں کی مقامی زبانیں (اردو اور ہندی) پس منظر میں چلی گئیں۔ اگر ہم پاکستان کی بات کریں تو اردو کو یہاں وہ اہمیت حاصل نہ ہو سکی جو شرق اوسط میں عربی زبان کو حاصل رہی اور اسے سرکاری زبان کا درجہ تو آج نصف صدی سے زیادہ عرصہ گزرنے پر بھی حاصل نہیں ہو سکا۔ اسباب چاہے کچھ بھی ہوں' اس میں کوئی شک نہیں کہ عربی زبان میں تصنیف وتالیف کی جو وسعت اور ہمہ گیری ہے اور اس کی طباعت اور پیشکش کا جو معیار ہے اس میں اردو زبان یقیناً اس کا مقابلہ نہیں کر سکتی۔

عرب دنیا میں جدید دور کی شروعات اور عربوں کی بیداری اور ترقی کے عوامل کے بارے میں جتنا کچھ کہنا ضروری تھا وہ کہا جا چکا۔ اب وقت آ گیا ہے کہ قارئین کو عربی کے موجودہ دور کے ان اہل قلم اور ادباء اور شعراء کا مناسب تعارف کرایا جائے جن کی نثری اور شعری تخلیقات کی وجہ سے ہی ادب وفن کی دنیا میں رونق اور گہما گہمی رہی ہے اور جنہوں نے ان میدانوں میں ایسے کارنامے انجام دیے ہیں جو ادب کی تاریخ کا حصہ بن گئے ہیں۔ اس تعارف میں پہلے اہل قلم اور ادباء کا مختصراً ذکر کیا جائے گا اور اس کے بعد شعراء کا۔ پچھلی ایک ڈیڑھ صدی کے ادب کا چونکہ بہت تھوڑا حصہ اس برصغیر میں پہنچا ہے اس لیے صرف انہی رجال اور ان کے کاموں کا ذکر کیا جائے گا جو ہمارے ہاں کسی حد تک معروف ہیں اور ان میں سے بعض کی کتابیں یہاں دستیاب چلی آئی ہیں۔ اس موجودہ دور کے آخر میں زمانہ قریب کا وہ جدید دور آتا ہے جو دوسری عالمی جنگ کے خاتمے کے بعد شروع ہوتا ہے اور اب تک چلا جاتا ہے۔ اس نئے دور میں عربی ادب نے ارتقا کی بہت سی اہم منزلیں طے کی ہیں۔ اس میں عربی ادب افسانے اور ناول کے اس فن سے آشنا ہوا ہے جو پچھلی کئی صدیوں سے مغرب میں رائج ہے۔ اس میں عربی شاعری نے روایتی اور پابند نظم کو چھوڑ کر آزاد نظم کو پوری طرح اپنا لیا ہے اور اس میں وہ علامت نگاری سے بھی کام لینے لگی ہے۔ اس کے ساتھ اس نے ڈرامے اور تھیٹر کے فن میں بھی خاصی پیش رفت کی ہے۔ عربی زبان



میں تخلیق کی جانے والی فکشن (ناول اور افسانہ) اس لحاظ سے خوش قسمت ہے کہ یورپی زبانوں میں ترجموں کی بدولت وہ مغرب میں خاصے پیمانے پر متعارف ہو چکی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ مصر کے معاصر ناول نگار نجیب محفوظ کو اس کے کام کی اہمیت اور اعلیٰ معیار کے پیش نظر نوبیل انعام دیا گیا جو مغرب میں ایک بڑا ادبی اعزاز سمجھا جاتا ہے...... چنانچہ اس باب کے آخری حصے میں عربی ادب کے اس نئے اور ترقی پسند دور کی کچھ نمایاں خصوصیات پر بات کی جائے گی اور کچھ نئے ادباء اور شعراء کا تعارف کرایا جائے گا۔

## اہل قلم اور ادباء

### جمال الدین افغانی (م ۱۸۹۷)

ان کا نام برصغیر کے لوگوں کے لیے اجنبی نہیں ہے اس لیے کہ یہ دو مرتبہ ہندوستان آئے تھے۔ جب وہ دوسری دفعہ آئے تو انگریزی حکومت نے انہیں یہاں زیادہ عرصہ نہ رہنے دیا۔ یہاں کے لوگ انہیں عربی اہل قلم اور خطیب کی حیثیت سے کم اور امت اسلام کے ایک رہنما اور مصلح کی حیثیت سے زیادہ جانتے ہیں' جن کا مطمح نظر مسلم مملکتوں کی مغربی استعمار سے آزادی اور اس کے ساتھ پورے عالم اسلام کا اتحاد (Pan Islamism) تھا' جس کے لیے وہ ملکوں ملکوں پھرے اور حکومتوں کی مخالفتوں کی وجہ سے کہیں ٹک کر نہ بیٹھ سکے۔

جمال الدین افغانستان میں کابل کے نواح اسعد آباد میں پیدا ہوئے۔ انہوں نے کابل میں مختلف علوم وفنون میں تعلیم پائی۔ اس کے بعد وہ اپنے خاندان کے ساتھ پہلے ایران گئے اور یہاں چار سال رہ کر مزید تعلیم حاصل کی۔ پھر وہ ہندوستان کی طرف نکل گئے اور یہاں ایک برس سے کچھ زیادہ قیام کیا اور بعض جدید علوم سے روشناس ہوئے۔ پھر وہ حج کے لیے مکہ معظمہ چلے گئے۔ اس کے بعد ان کے سفروں کا ایک طویل سلسلہ ہے۔ وہ ایک ملک میں جاتے ہیں اور کچھ ہی عرصے میں وہاں سے نکال دیے جاتے ہیں اور دوسرے ملک کا رخ کرتے ہیں۔ ۱۸۷۱ء میں جب انہیں ترکی سے نکالا گیا تو وہ مصر آ گئے۔ یہاں انہوں نے اپنا ایک حلقہ قائم کر لیا جس میں علم کے متلاشیان آ کر توحید اور فلسفہ اور قومی امور جیسے موضوعات پر ان کے لیکچر سنتے تھے۔ افغانی کی گفتگو اور خطابت کا اثر ایسا تھا کہ جو بھی ان کے حلقے میں آتا وہ ان کی مقناطیسی شخصیت اور ان کے افکار کے سحر تلے آ جاتا اور امت مسلمہ کی اصلاح کا جذبہ اس

کے دل میں موجزن ہو جاتا۔ مصر میں عرابی پاشا کی تحریک کی حمایت کرنے کے الزام میں افغانی کو آٹھ سال بعد مصر سے بھی نکال دیا گیا۔ وہ ہندوستان آ گئے اور یہیں انہوں نے اپنے ایک پمفلٹ "رد دہریئین" میں سرسید احمد خاں پر کچھ الزام عائد کیے۔ ان کے گرد چونکہ لوگ جمع ہونے لگے تھے اس لیے انگریزی حکومت نے ان سے خطرہ محسوس کرتے ہوئے انہیں چلے جانے کا حکم دیا۔ ہندوستان سے نکل کر وہ پہلے لندن گئے اور پھر پیرس آ گئے۔ یہاں ان کے ساتھ شیخ محمد عبدہ بھی آ ملے۔ پیرس میں ان لوگوں نے اپنا انقلابی اور پرجوش رسالہ "العروۃ الوثقی" نکالا جس میں انگریزوں کی مخالفت میں مضامین نکلتے تھے اور پان اسلامزم کی تحریک کی حمایت کی جاتی تھی۔

جمال الدین افغانی کئی دوسرے ملکوں میں پھرنے کے بعد بالآخر استنبول واپس آ گئے اور یہیں تھوڑی کے سرطان کی وجہ سے ان کی موت واقع ہو گئی۔

جمال الدین عرب نہیں تھے اور عربی زبان و ادب میں بھی انہوں نے کوئی خصوصی تعلیم حاصل نہیں کی تھی۔ اس لیے جو زبان وہ لکھتے تھے اس میں فصاحت کا کوئی اونچا معیار نہیں پایا جاتا تھا اور بعض دفعہ الفاظ و محاورات کے استعمال میں ان سے ساحت بھی ہو جاتی تھی لیکن عربی میں جو تقریریں وہ کرتے تھے یا جو لیکچر وہ دیتے تھے وہ ایسے دلآویز عربی لہجے میں ہوتے تھے کہ سیدھا دل میں اتر جاتے اور سننے والوں کو مسحور کر لیتے تھے۔ انہوں نے خود تو ادب تخلیق نہ کیا لیکن اپنی شخصیت اور اپنی تلقین و تبلیغ سے انہوں نے کچھ ایسے لوگوں کو متاثر کیا جو آگے چل کر بڑے ادیب اور قومی رہنما بن کر ابھرے۔ اس لحاظ سے وہ ایک ادیب تو نہ تھے البتہ ادیب گر تھے۔ ادب میں ان کا ایک انقلابی نظریہ یہ تھا کہ عربی تحریر میں بجائے لفظ و محاورے کی تزئین و آرائش کے مطالب و مضامین کی سادگی اور وضاحت پر زور دینا چاہیے تاکہ جو بات بھی کہی جائے وہ سننے والوں کی سمجھ میں آئے اور ان پر اثر کرے۔ جمال الدین افغانی کی تصنیف صرف ایک رسالہ ہے "ابطال مذھب الدھریین و بیان مفاسدھم" یہ رسالہ انہوں نے فارسی میں لکھا تھا اور عربی میں اس کا ترجمہ شیخ محمد عبدہ نے کیا۔

## شیخ محمد عبدہ (م ١٩٠٥)

مصر کے مشہور مفکر، مصلح، عالم اور عربی زبان کے بڑے ادیب اور انشا پرداز بلکہ جدید ادبی بیداری



کے بانیوں میں سے ایک، جن کے افکار و نظریات نے پورے دنیائے اسلام کو متاثر کیا۔

ابتدا میں وہ تعلیم کے لیے طنطا کی مسجد میں بھیجے گئے لیکن یہاں کی تعلیم سے وہ مطمئن نہ ہوئے اور قاہرہ کی جامع ازہر میں جا کر تعلیم پانے لگے۔ یہاں کے نصاب تعلیم میں زندگی کی روح مفقود تھی اور پڑھانے والے شیوخ قدیم متون کی شرحوں اور حاشیوں پر اکتفا کرتے تھے۔ محمد عبدہ کو علمی اور فکری غذا جمال الدین افغانی کے فیض صحبت سے ملی۔ انہوں نے ازہر سے سند عالمیت حاصل کر کے اس میں پڑھانا شروع کر دیا۔ وہ ازہر میں منطق، فلسفہ اور توحید جیسے علوم کی تعلیم دیتے تھے۔ بعد ازاں وہ مصر کے دارالعلوم میں تاریخ کے استاد مقرر ہوئے تو انہوں نے مقدمہ ابن خلدون پر کئی مفید لیکچر دیے اور طلبہ کو قوموں کے عروج و زوال کے فلسفے سے آشنا کیا۔ اس کے بعد وہ حکومت کے سرکاری اخبار "الوقائع المصریۃ" کے مدیر بنے اور اس میں ادبی، اجتماعی اور اصلاحی مقالات شائع کرتے رہے۔ عرابی پاشا کی شورش میں ان پر اس کی حمایت کا الزام لگا اور وہ ملک بدر کر دیے گئے۔ مصر سے نکل کر وہ بیروت آئے۔ اسی زمانے میں انہیں جمال الدین افغانی کا دعوت نامہ ملا اور وہ پیرس جا کر ان سے ملے اور ایک شعلہ نوا رسالہ "العروۃ الوثقی" نکالنا شروع کیا جس کا مقصد صحیح دینی عقائد کی اشاعت کے علاوہ تمام مسلم ممالک میں اتحاد و اتفاق پیدا کرنا تھا۔ العروۃ الوثقی کے صرف اٹھارہ شمارے نکلے تھے کہ انگریزوں نے اس کا داخلہ مصر اور ہندوستان میں بند کرا دیا۔ نتیجتاً رسالہ بند کرنا پڑا۔ محمد عبدہ ایک دفعہ پھر بیروت چلے آئے اور یہاں کے زمانہ قیام میں انہوں نے حضرت علیؓ کی "نہج البلاغہ" اور "مقامات ھمذانی" کی شرح لکھی۔ تقریباً ساڑھے تین سال کی جلاوطنی کے بعد وہ مصر میں واپس آئے اور انہیں ابتدائی دیوانی عدالتوں کا قاضی مقرر کیا گیا۔

شیخ محمد عبدہ کی زندگی کا بڑا مقصد ازہر کی اصلاح اور ترقی تھا۔ انہوں نے خدیو مصر کی تائید و حمایت سے اس کی اصلاح کا بیڑا اٹھایا اور اس میں علاوہ دوسری بہت سی اصلاحات کے اس کے نصاب میں حساب، الجبرا، تاریخ اسلام اور سائنسی مضامین شامل کیے۔ عربی ادب کی تعلیم کے لیے مبرد کی "الکامل" اور "دیوان الحماسۃ" جیسی معیاری کتابیں مقرر کی گئیں۔ اس کے کچھ عرصہ بعد خدیو مصر نے شیخ محمد عبدہ کو مصر کا مفتی اعظم مقرر کر دیا۔ مصر کے علاوہ ساری دنیائے اسلام سے ان کے پاس استفتاء آتے تھے اور وہ ان کا جواب دیتے تھے۔ ان میں تین فتوے بہت مشہور ہوئے جن میں سے ایک میں انہوں نے فتویٰ دیا کہ ڈاک خانوں کے سیونگ بینکوں کی امانتوں پر منافع وصول کرنا جائز ہے۔

یورپ کے فضلاء اور مصر کے عیسائی اہل قلم جب اسلام پر بے دردانہ حملے کرتے تو محمد عبدہ دین کی حمایت میں سینہ سپر ہو جاتے۔ فرانس کے وزیر خارجہ ہانوتو اور عیسائی رسالے "الجامع" کے مدیر فرح انطون کے

جواب میں انہوں نے مدلل مضامین لکھے جو بعد میں "الاسلام والنصرانیۃ مع العلم و المدنیۃ" کے نام سے کتابی صورت میں شائع ہوئے۔ شیخ محمد عبدہ کی مقبولیت اور شہرت نے ان کے بہت سے حاسد پیدا کر دیے اور ان لوگوں نے جن میں علمائے ازہر پیش پیش تھے ان کے خلاف سازشیں شروع کر دیں۔ ان حالات سے تنگ آ کر انہوں نے ازہر کی انتظامی کمیٹی سے استعفیٰ دے دیا۔ اس پر پورے عالم اسلام میں احتجاج ہوا اور ہندوستان سے نواب محسن الملک نے رسالہ "المنار" میں خدیو مصر کے نام ایک مکتوب شائع کر کے مسلمانانِ ہند کے جذبات کی ترجمانی کی۔ شیخ محمد عبدہ یورپ جانے کے لیے اسکندریہ میں مقیم تھے کہ سرطان کے مرض میں مبتلا ہو کر راہیِ ملکِ عدم ہوئے۔

محمد عبدہ نے قرآن کی تفسیر کا ایک نیا طریقہ نکالا جس سے قرآن کی آیات کے مطالب کو عقل و فلسفے کے تقاضوں کے قریب لانے کی کوشش کی گئی۔ اس طرح کی کوشش ان سے پہلے ابن سینا اور ابن رشد نے بھی کی تھی۔

شیخ محمد عبدہ فصاحت و بلاغت اور ملکۂ انشا پردازی میں اپنے معاصرین پر فائق تھے۔ عربی فصاحت میں ان پر حضرت علیؓ کی "نہج البلاغۃ" کا اثر تھا، جس کی شرح انہوں نے لکھی تھی۔ وہ مصر کی جدید ادبی بیداری کے معماروں میں سے تھے۔ ان کے قلم نے عربی زبان کو ادبی، اخلاقی اور سیاسی مضامین کے بیان کی قوت بخشی۔ ان کا درس ادبی ہوتا تھا جس سے ذوقِ سلیم کی پرورش ہوتی اور اسلوبِ بیان میں سادگی، صفائی اور اثر انگیزی ہوتی تھی۔ ان کے درس سے ان کے شاگرد محمد رشید رضا، مشہور مقرر اور سیاسی رہنما سعد زاغلول، ادیب احمد تیمور، شاعر محمد حافظ ابراہیم ادیب اور افسانہ نگار مصطفیٰ لطفی المنفلوطی اور عبدالرحمان البرقوقی نے پورا فائدہ اٹھایا اور آگے چل کر ان میں ہر ایک نے مصر کی ادبی، علمی اور سیاسی دنیا میں بڑا نام پیدا کیا۔

شیخ محمد عبدہ کے بعد ان کے شاگرد خاص محمد رشید رضا نے اپنے رسالہ "المنار" کے ذریعے ان کے دینی اور اصلاحی افکار کی روشنی ساری دنیائے اسلام میں پہنچائی۔ جامعۂ ازہر کی اصلاح کی تکمیل ان کے شاگرد شیخ مصطفیٰ المراغی کے ہاتھوں ہوئی۔ ان کے اصلاحی خیالات کی ترجمانی ان کے درسوں کے فیض یافتہ شامی لیڈر امیر شکیب ارسلان کرتے رہے اور سیاسی میدان سعد زاغلول نے سنبھالا اور بالآخر مصر کو آزادی سے ہمکنار کیا۔

محمد عبدہ کی تصنیفات میں "رسالۃ التوحید" مشہور ہے، جس کے کئی زبانوں میں ترجمے ہو چکے ہیں۔ نیز پارہ عم کی تفسیر اور اس کے علاوہ "الاسلام و النصرانیۃ مع العلم و المدنیۃ" ان کی اہم کتابیں ہیں۔ پھر ان کی دو شرحیں ہیں: ایک نہج البلاغۃ پر اور دوسری مقامات ہمدانی پر۔

شیخ محمد عبدہ چونکہ بڑے پایہ کے نثر نگار تھے اس لیے ان کی نثر کا ایک نمونہ درج ذیل ہے۔ بعض



شامی علماء نے ان کو منصب افتاء پر فائز ہونے پر مبارکباد دی تو اس کے جواب میں محمد عبدہ لکھتے ہیں اور اس میں وہ ان مخالفتوں کا ذکر کرتے ہیں جو اصلاح کے راستے میں انہیں قدیم شیوخ کی طرف سے پیش آ رہی تھیں:

> اما قومی فا بعد هم عنی اشدهم قرباً منی، وما ابعد الانصاف منهم و يظنون بی الظنون، بل يتربصون بی ريب المنون، تسرعاً منهم فی الاحكام و ذهاباً مع الاوهام و ولعاً بكثرة الكلام و تلذذاً بلوك الملام. اقول فلا يسمعون، و ادعو فلا يستجيبون و اعمل فلا يعقلون، و اريهم مصالحهم فلا يُبصرون ......
>
> (رہے میرے طبقے کے لوگ تو وہ جتنا زیادہ میرے قریب ہیں اتنا مجھ سے دور ہیں۔ ان سے انصاف کی توقع ہی نہیں کی جا سکتی۔ وہ میرے بارے میں ہر طرح کے ظن و گمان سے کام لیتے ہیں، بلکہ میرے خلاف زمانے کے حوادث کا انتظار کرتے رہتے ہیں۔ اپنی آراء میں جلد بازی سے کام لیتے ہیں اور ہمیشہ وہم کے پیچھے جاتے ہیں۔ انہیں بہت بولنے کا شوق ہے اور ملامت کرنے میں وہ بڑی لذت محسوس کرتے ہیں۔ میں ان سے بات کرتا ہوں تو وہ سن کے نہیں دیتے۔ میں انہیں بلاتا ہوں تو وہ جواب نہیں دیتے۔ میں خود عمل کرتا ہوں تو وہ اس سے رہنمائی حاصل نہیں کرتے۔ میں انہیں ان کے فائدوں اور مصلحتوں سے آگاہ کرتا ہوں تو وہ بصیرت حاصل نہیں کرتے.....)

## محمد رشید رضا (م ۱۹۳۵)

بیسویں صدی کے مشہور مُصلح عالم، قرآن مجید کے مفسر، عربی زبان کے ممتاز انشا پرداز، خطیب اور اتحاد اسلامی کے داعی اور نقیب، طرابلس الشام کے ایک گاؤں میں پیدا ہوئے۔ طرابلس کے مدرسہ اسلامیہ سے عقلی اور ادبی علوم کے ساتھ ساتھ حدیث و فقہ کی تعلیم بھی حاصل کی۔ وہ فارغ اوقات میں بیروت کے اخبار کے لیے مضامین لکھا کرتے اور کبھی کبھی شعر بھی کہہ لیتے۔ اس اثنا میں انہیں سید جمال الدین افغانی اور شیخ محمد عبدہ کے "العروۃ الوثقیٰ" کے بعض شمارے مل گئے۔ ان کے مطالعے سے انہیں فکر و نظر کے نئے راستے دکھائی دیے اور انہیں جمال الدین سے ملاقات کا شوق پیدا ہوا۔ لیکن ان کے انتقال کی وجہ سے سید رشید رضا کی یہ آرزو پوری نہ ہو سکی۔ اس دوران میں مفتی محمد عبدہ ایک دفعہ طرابلس الشام گئے تو رشید رضا ان سے مل کر ان کے خیالات کے گرویدہ ہو گئے اور کچھ عرصے بعد ان سے قریب رہنے کے

لیے طرابلس کو چھوڑ کر قاہرہ آ گئے۔ یہاں مفتی محمد عبدہ کے ساتھ ان کی رفاقت روز بروز بڑھتی چلی گئی۔

سید رشید رضا نے صحیح اسلام کی دعوت اور مسلمانوں کے اصلاح کے لیے ۱۸۹۸ میں رسالہ "المنار" جاری کیا' جو ۱۹۳۵ تک برابر نکلتا رہا۔ اس رسالے میں مسلمانوں کی دینی اور دنیاوی فلاح پر مضمون ہوتے تھے' ان کی معاشی و سیاسی بدحالی پر تبصرے ہوتے تھے اور مدارس عربیہ کے نصاب تعلیم کی اصلاح پر زور دیا جاتا تھا' اسلام پر غیر مسلموں کے اعتراضات کا جواب دیا جاتا تھا اور سب سے بڑھ کر یہ کہ اس میں شیخ محمد عبدہ کی تفسیر قرآن کے اجزاء بالالتزام چھپتے تھے۔

سید رشید رضا نے مسلمانوں کے فائدے کے لیے کئی تجاویز پیش کیں۔ مثلاً ایک یہ کہ انجمن الجامعۃ الاسلامیہ قائم کی جائے جس میں تمام مسلمانوں کو متحد کیا جائے اور عثمانی سلطان کی سرپرستی میں ریاست ہائے متحدہ امریکہ کی طرح تمام مسلم ممالک کا ایک وفاق بنایا جائے جس کے تمام ممالک اندرونی نظم و نسق میں خود مختار ہوں۔ لیکن مصر کے قوم پرستوں نے اس کی مخالفت کی اور یہ تجویز کامیاب نہ ہو سکی۔ سید رشید رضا بھی ازہر کے طریقۂ تعلیم کے علاوہ سرکاری نظام تعلیم پر نکتہ چینی کرتے رہتے تھے۔ ان کا خیال تھا کہ وہی علماء اسلام کی اچھی طرح تبلیغ کر سکتے ہیں جو قدیم و جدید دونوں علوم سے بہرہ ور ہوں۔ ۱۹۰۸ میں ترکی میں نوجوانوں کے انقلاب کے بعد سید رشید رضا نے ایک دارالعلوم کے قیام کا خیال پیش کیا اور اس غرض کے لیے ایک سال تک قسطنطنیہ میں ٹھہرے رہے لیکن حکومت نے دارالعلوم کے قیام کے لیے ایسی شرائط عائد کر دیں کہ جنہیں وہ قبول نہ کر سکے اور ان کا یہ خواب ۱۹۱۲ میں کچھ عرصہ کے لیے مصر میں صورت پذیر ہو کر بالآخر ناکامی سے دوچار ہوا اور ختم ہو گیا۔

مدرسۃ دارالدعوۃ والارشاد کے قیام کے سلسلے میں سید رشید رضا اور مولانا شبلی کے درمیان خط و کتابت ہوتی رہتی تھی۔ چنانچہ انہوں نے مولانا شبلی کی دعوت پر ہندوستان کا دورہ کیا اور لکھنؤ پہنچ کر ۶ اپریل ۱۹۱۲ کو ندوۃ العلماء کے اجلاس کی صدارت کی اور عربی زبان میں ایک نہایت والا ویز اور فصیح تقریر کی' جس سے سماں بندھ گیا۔ بعد کے زمانے میں وہ زیادہ تر تصنیف و تالیف میں منہمک اور "تفسیر المنار" کی تکمیل میں مصروف ہو گئے۔ وہ ابھی سورۂ یوسف پر ہی تھے کہ پیغام اجل آ پہنچا۔ وہ سلطان ابن السعود سے مل کر قاہرہ آ رہے تھے کہ موٹر کار میں حرکت قلب بند ہو جانے سے انتقال کر گئے۔

عربی ادب میں سید رشید رضا کا مقام یہ تھا کہ وہ صحیح اور بلیغ عربی نثر لکھتے تھے اور مضامین چاہے دینی ہوں یا اصلاحی ان کی عربی نثر میں ادبی چاشنی پائی جاتی تھی۔ اس کے ساتھ وہ اچھے شاعر بھی تھے۔ ان کی آخری نظم مقصورہ رشیدیہ ہے جو انہوں نے مقصورہ ابن درید کے جواب میں لکھی تھی۔ اس میں چار سو سے زائد اشعار ہیں جن میں مسلمانوں کی اصلاح کے متعلق اپنے خیالات کو نظم کا جامہ پہنایا ہے۔



سید رشید رضا نے ہزاروں صفحات لکھے' لیکن ان کی علمی زندگی کا اہم کارنامہ "تفسیر المنار" ہے۔ اس تفسیر کا آغاز تو مفتی محمد عبدہ نے سید رشید رضا کی استدعا پر کیا تھا اور یہ المنار میں شائع ہوتی رہی۔ تاہم مفتی محمد عبدہ کے انتقال (۱۹۰۵) کے بعد اس تفسیر کا سلسلہ سید رشید رضا نے جاری رکھا اور یہ تفسیر زمانہ حال کی ضرورتوں کے پیش نظر لکھی۔ لیکن جیسا کہ اوپر ذکر ہوا وہ یہ تفسیر صرف سورۂ یوسف تک ہی لکھ پائے تھے کہ موت کا پیغام آ گیا۔ اس کے علاوہ ان کی دوسری مشہور تصنیف "تاریخ الاستاذ الامام الشیخ محمد عبدہ" ہے جو تین ضخیم جلدوں میں ہے۔ پھر ان کی کتاب "الوحی المحمدی" ہے' جس کا ہندوستان میں ان کے شاگرد عبدالرزاق ملیح آبادی نے اردو میں ترجمہ کر کے کلکتہ سے شائع کیا۔ علم کلام و مناظرہ میں ان کا ایک رسالہ "شبہات النصاری و حجج الاسلام" ہے۔ اسی طرح ایک رسالہ "نداء للجنس اللطیف" (صنف لطیف کے نام پیغام) ہے جس میں اسلام میں حقوق نسواں' تعدد ازدواج' قلائی پردہ اور طلاق کے مسائل پر حکیمانہ گفتگو کی گئی ہے۔

## قاسم امین (م ۱۹۰۸)

قاسم امین ایک انقلابی تھا جس نے بیسویں صدی کے آغاز میں مسلم عورت کی آزادی کے حق میں آواز اٹھائی۔ یہ وہ زمانہ تھا جب شرق اوسط کے ملکوں میں عورتوں کو نہ تو تعلیم دی جاتی تھی اور نہ معاشرے میں ان کے کوئی حقوق تسلیم کیے جاتے تھے۔ مسلمان عورتیں اول تو گھر سے باہر نکلتی ہی نہ تھیں اور اگر نکلتی بھی تھیں تو پوری طرح سے پردے میں ڈھکی ہوتی تھیں۔ قاسم امین کی ابتدائی تعلیم تو قاہرہ میں ہوئی لیکن بعد میں اس نے پیرس جا کر اپنی تعلیم مکمل کی۔ وہاں سے واپس آ کر اس نے محکمۂ انصاف میں ملازمت کی اور ترقی کر کے کورٹ آف اپیل کا مشیر مقرر ہو گیا اور اپنی وفات تک اسی عہدے پر رہا۔ پیرس اور یورپ کی زندگی میں قاسم امین نے جو کچھ دیکھا اس سے اس نے بڑا اثر لیا' خاص طور پر عورت کی زندگی کے معاملے میں اس نے وہاں کے حالات اور اپنے ہاں کے حالات میں بہت تفاوت دیکھا۔ وہ ایک ذہین' صاحب عقل اور حساس انسان تھا۔ یہاں اس نے مسلم عورت کو دیکھا کہ علم اور آزادی سے محروم ہے اور پردہ اس کے اور امور زندگی میں اس کی شرکت کے درمیان حائل ہو گیا ہے۔ چنانچہ اس صورت حال کی اصلاح کے لیے اس نے "تحریر المراۃ" (عورت کی آزادی) کے عنوان سے ایک کتاب لکھی' جس میں اس نے عورت کی تعلیم اور پردے سے نجات کی ضرورت پر زور دیا اور اس کے لیے شریعت' تاریخ' معاشرتی قوانین اور امر واقع سے دلائل جمع کر کے پیش کیے۔ قاسم امین کی اس کتاب پر بہت لے

دے ہوئی۔ بعض خواص نے تو اس کی تائید کی' لیکن زیادہ تر لوگوں نے اس کی مخالفت کی اور اس کی کتاب پر سخت اعتراضات کیے۔ تاہم قاسم امین پر ان تمام مخالفتوں کا کوئی اثر نہ ہوا اور اس نے ایک دوسری کتاب "المراۃ الجدیدۃ" (جدید عورت) لکھ دی' جس میں اس نے اپنے مخالفین کے اعتراضات کا جواب دیا۔

قاسم امین کی استعداد عربی زبان میں کوئی زیادہ نہیں تھی اور نہ اس کا عربی اسلوب اتنا طاقتور تھا۔ بلکہ وہ فرانسیسی زبان اور اس کے آداب پر زیادہ عبور رکھتا تھا۔ چنانچہ اس کی تحریروں میں فرانسیسی زبان اور محاورے کا اثر دیکھا جا سکتا ہے۔ البتہ وہ عربی میں جو کچھ بھی لکھتا تھا وہ بہت واضح اور صاف ہوتا تھا اور اس سے وہ اپنا مطلب پوری طرح ادا کر دیتا تھا۔

قاسم امین کی اہمیت اس وجہ سے ہے کہ عربی زبان میں اس نے پہلی دفعہ انقلابی افکار و آراء پیش کیے اور جن لوگوں نے اس کی مخالفت کی ان کو دلائل سے قائل کرنے کی کوشش کی۔ وہ اپنے اس مشن میں چاہے اپنی زندگی میں کامیاب نہ ہوا ہو لیکن اس کے نظریات وقت گزرنے پر قابل قبول ہوتے چلے گئے اور عورتوں کی زندگیوں میں بہت سی تبدیلیوں کا پیش خیمہ ثابت ہوئے۔

## جرجی زیدان (م ۱۹۱۴)

ایک عیسائی عرب فاضل' صحافی' مؤرخ اور ادیب' ۱۸۶۱ میں بیروت میں پیدا ہوا۔ وہ ایک غریب عیسائی گھرانے میں پیدا ہوا تھا اس لیے اسے باقاعدہ تعلیم میسر نہ آ سکی۔ لیکن اپنی ذاتی محنت اور کوشش سے اس نے بہت سے علوم میں دسترس حاصل کر لی۔ اس کے بعد وہ مصر چلا گیا۔ ۱۸۸۴ میں جو مہم گورڈن (Gordon) کی مدد کے لیے بھیجی گئی تھی' اس میں اس نے ترجمان کے فرائض ادا کیے۔ بعد ازاں وہ بیروت لوٹ آیا اور کچھ عرصہ (۱۸۸۶) لندن میں بسر کرنے کے بعد قاہرہ میں مستقل سکونت اختیار کر لی۔ یہاں چند سال معلمی کی اور پھر اخبار "المقتطف" میں ملازم ہو گیا۔

زیدان نے تصنیف کا کام لسانیات کے موضوع سے شروع کیا اور الفلسفة اللغوية کے نام سے ایک کتاب لکھی۔ لیکن اس میں کوئی خاص بات نہ دیکھی گئی۔ اس کے بعد وہ تاریخی تصانیف اور درسی کتابوں کی طرف متوجہ ہو گیا۔ چنانچہ اس نے تاریخ مصر الحدیث' التاریخ العام' تاریخ الیونان و الرومان' تاریخ انکلترا وغیرہ کتابیں لکھیں۔ اس نے "انساب العرب القدماء" بھی تحریر کی۔ لیکن ان تمام تصانیف کو کوئی مقبولیت حاصل نہ ہو سکی۔



۱۹۱۴ میں اس کا مشہور تاریخی ناول "المملوک الشارد" (مفرور غلام) شائع ہوا جس کا ترجمہ جرمن زبان میں ہوا۔ اس سے پہلے ۱۸۹۲ میں اس نے اپنے ادبی مجلے "الھلال" کا آغاز کیا اور پھر اس زمانے سے لے کر اپنی موت تک ساری زندگی اسی کے لیے وقف کر دی۔ وہ بڑی محنت اور سرگرمی سے کام کرتا رہا۔ مزید برآں وہ ہر سال ایک نیا ناول اور ایک عام پسند قلمی کتاب لکھ لیتا تھا۔ رفتہ رفتہ "الھلال" کی اشاعت عربی رسالوں میں سب سے زیادہ ہو گئی اور زیدان کا نام بھی ایک ناول نگار اور مؤرخ کی حیثیت سے نہ صرف بلادِ عربیہ بلکہ مشرق کے تمام اسلامی ملکوں میں مشہور ہو گیا۔

اس کے بائیس ناولوں میں سے زیادہ تر کا موضوع عربوں کی فتوحات سے لے کر عہدِ ممالیک تک اسلام کی ابتدائی تاریخ ہے۔ یہ ناول اس لیے اہم ہیں کہ ان سے تاریخ کا موضوع مقبولِ عام ہو گیا۔ یہ آسان اور رواں زبان میں لکھے گئے ہیں اور ان کا انداز رومانی اور جذباتی ہے۔ تقریباً وہی انداز جو انگریزی زبان میں سر والٹر سکاٹ کے ناولوں کا ہے۔ اس کے دیگر قابلِ ذکر تاریخی ناول یہ ہیں: شجرات الدر' فتاۃ غسان' الحجاج ابن یوسف' الامین و المامون' شارل و عبدالرحمان' احمد بن طولون' فتح الاندلس' ابو مسلم الخراسانی وغیرہ۔

زیدان کی تاریخی تصنیفات میں سب سے زیادہ اہمیت "تاریخ التمدن الاسلامی" (۵ جلدیں) کو حاصل ہے۔ اس کتاب کی بنیاد اس نے گولڈ زیہر' کریمر اور دوسرے مستشرقین کی تصانیف پر رکھی۔ اگرچہ اس میں عربی مآخذ اور جدید مشرقی زندگی کے متعلق مصنف کی ذاتی معلومات کی بدولت بہت کچھ اضافے بھی ہوئے۔ ہمارے ملک کے مولانا شبلی نے جرجی زیدان کی اس تاریخ کو غور سے پڑھا تو اس میں انہیں مصنف کا زاویہ نظر یہ دکھائی دیا کہ کس طرح مسلمانوں کی اموی حکومت اور خاص طور پر عربوں کے کردار کو ایک منفی رنگ میں پیش کیا جائے۔ چنانچہ شبلی نے اس پر ایک مفصل ریویو عربی زبان میں لکھا اور اس کا اردو ترجمہ قدرے اختصار کے ساتھ اپنے رسالہ "الندوہ" میں ۱۹۱۰ میں شائع کیا' جس میں جرجی زیدان کی پھیلائی ہوئی بہت سی غلط فہمیوں کا مدلل جواب دیا۔

بلادِ مشرق کے لیے جرجی زیدان کی آخری بڑی تصنیف "تاریخ آداب اللغة العربية" (۴ جلدوں میں) ہے۔ یہ عربی زبان میں پہلی کتاب ہے جو یورپی اصولوں کو مدِنظر رکھ کر لکھی گئی۔ عربی ادب کی اس تاریخ کے لیے جرجی زیدان نے بروکلمان اور ہوار (Huart) سے بہت کچھ استفادہ کیا۔ اگرچہ بعض اہلِ نظر کے نزدیک اس نے یورپی مآخذ کو جس طرح سے استعمال کیا اس میں تنقید کی بہت گنجائش ہے۔ یورپ کے علمی اور تحقیقی نقطۂ نظر سے بہرحال اس کی چوتھی جلد سب سے زیادہ اہم ہے کہ اس میں انیسویں صدی کے عربی ادب کا اچھا خاصا جائزہ لیا گیا ہے۔

جرجی زیدان کوئی محقق نہیں تھا اور نہ وہ عربی زبان کا کوئی بڑا ادیب تھا' تاہم یورپی طریق کار سے واقفیت کی بدولت اس سے بلادِ عربیہ میں ایک نئے دور کا آغاز ہوتا ہے۔ اس نے متعدد اور مختلف قسم کے مباحث کو لوگوں تک پہنچایا اور عربوں کو تلقین کی کہ یورپ کے ارتقا یافتہ طریق کار اور علوم قطعیہ کے علاوہ اس کی تاریخ اور ادب پر بھی توجہ کریں۔ علم و حکمت کی دنیا میں اس کی حیثیت کسی انقلابی کی نہیں۔ اس کی تصانیف (خصوصاً تاریخ التمدن الاسلامی) پر جو تیز و تند تنقید کی گئی' وہ شاید ساری کی ساری حق بجانب نہ ہو۔ بیسویں صدی کے ربع اول کی علمی و ادبی فضا کو سامنے رکھیے تو دیکھا جا سکتا ہے کہ اس میں جرجی زیدان کتنا فعال اور متحرک تھا۔ بہرصورت جدید عربی ادب اور معاشرے کی تاریخ میں اس کا نام فراموش نہیں کیا جا سکتا۔ وہ عربی میں "الھلال" جیسے مقبول اور ہردلعزیز رسالے کا بانی اور مدیر تھا۔ تاریخ' لغت' ادب اور انسانی سوسائٹی پر اس نے قابل قدر تصانیف کیں اور مشرق میں ناول نگاری کے فن کی ابتدا کی۔ یہ ایسے میدان ہیں جن میں اس کی کارگزاری کو کسی صورت نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔

## مصطفیٰ لطفی المنفلوطی (م ۱۹۲۴ء)

بہت عمدہ نثر نگار اور اچھا شاعر مصطفیٰ لطفی اسیوط کی تحصیل میں واقع ایک مقام منفلوط میں ۱۸۷۶ء میں پیدا ہوا۔ اس کے خاندان میں علم تھا اور عزت و شرافت تھی۔ اس نے مدرسے میں قرآن حفظ کیا اور ازہر میں جا کر تعلیم پائی' جہاں ادب کے مضامین سے اسے خاص دلچسپی رہی۔ پھر اس نے شیخ محمد عبدہ کی مجالس درس و ارشاد میں باقاعدہ جانا شروع کیا اور بڑے بڑے ادباء کی صحبت سے فائدہ اٹھایا۔ اپنے باپ کی نگرانی کے باوجود اس نے عربی زبان و ادب کے علاوہ دوسرے علوم کی طرف زیادہ توجہ نہ کی۔ چنانچہ وہ اشعار یاد کیا کرتا' ادب کی روایات اور نوادر جمع کرتا' شعر کہتا اور خطوط لکھا کرتا۔ تا آنکہ ازہر میں اس کی جودتِ طبع اور اس کی تحریر کے خوبصورت اسلوب کا چرچا ہونے لگا۔ شیخ محمد عبدہ نے ان صلاحیتوں کو دیکھتے ہوئے اسے اپنے قریب کر لیا اور اس کے لیے نہ صرف ادب میں بلکہ زندگی میں بھی ایک لائحہ عمل تجویز کیا۔ شاعری کو چھوڑ کر اب اس نے نثر لکھنے کی طرف توجہ کی۔ اس کے لیے وہ دلکش انداز میں لکھے ہوئے قصے اور داستانیں پڑھا کرتا' اس سے آگے بڑھا تو وہ "کتاب الاغانی" کے مطالعے میں لگ گیا اور اس میں سے اس نے فصیح و بلیغ اور دل پر اثر کرنے والی عبارتوں کا انتخاب کیا اور پھر اسی انداز کو اپناتے ہوئے وہ رسالوں میں مضامین لکھنے لگا' جنھیں لوگ بڑے شوق سے پڑھتے اور ان پر داد دیتے۔

شیخ محمد عبدہ کے ساتھ اپنے تعلق کی وجہ سے منفلوطی سعد پاشا زغلول کے بھی قریب ہو گیا' اور ان



دونوں اکابر کے ساتھ اپنی قربت کی وجہ سے "المؤید" کے مدیر کی نظروں میں آ گیا۔ چنانچہ منفلوطی کے ادیب بننے میں یہ تینوں بڑے مل کر ایک اہم عنصر ثابت ہوئے۔

منفلوطی ابھی ازہر میں پڑھتا تھا کہ ایک روایت کے مطابق اس نے خدیو عباس حلمی ثانی کی ہجو لکھی اور وہ ایک ہفتہ وار جریدے میں شائع ہو گئی۔ اس کی پاداش میں اسے قید کرنے کا حکم صادر ہوا اور منفلوطی نے کچھ عرصہ قید خانے میں گزارا۔ شیخ محمد عبدہ کی وفات پر وہ مغموم اور مایوس ہو کر اپنے گاؤں چلا گیا۔ کچھ عرصے بعد قاہرہ واپس آ کر "المؤید" میں لکھنے لگا۔ پھر مختلف سرکاری مناصب پر رہنے کے بعد آخر میں اسے پارلیمنٹ میں کوئی دفتری عہدہ مل گیا' جس پر وہ کام کرتا رہا' تا آنکہ عمر کی پانچویں دہائی میں اس نے انتقال کیا۔

مصطفیٰ لطفی المنفلوطی پاکستان میں بہت جانا پہچانا نام ہے' اس لیے کہ اس کے افسانوں کی کتاب "العبرات" (آنسو) ایم اے عربی کے نصاب میں غالباً تیس برس سے بھی زیادہ عرصے کے لیے لگی رہی۔ اسی کے ساتھ معاشرتی موضوعات پر اس کے مقالات اور خاکوں کا مجموعہ "النظرات" بھی ایم اے کے طالب علموں کے لیے بطور اضافی مطالعے کے مقرر ہوا۔ یوں لگتا تھا جیسے ایم اے عربی کا نصاب بنانے والوں کی نظر میں جدید عربی ادب کی ابتدا بھی منفلوطی سے ہوئی تھی اور انتہا بھی۔ یہ ٹھیک ہے کہ عربی ادب کی تاریخ میں منفلوطی ایسے مرحلے میں آیا جب سلیس اور خوبصورت عربی نثر کے نمونے کم کم نظر آتے تھے۔ اس زمانے میں عام طور پر عربی نثر کے دو نمونے لوگوں کے سامنے تھے: ایک القاضی الفاضل کا مسجع و مقفیٰ اور پُرتکلف اسلوب' اور دوسرا ابن خلدون کا سادہ اور بے رنگ اسلوب۔ منفلوطی نے اپنی عربی نثر میں ان دونوں اسالیب سے اجتناب کرتے ہوئے ایسا طرز اپنایا جس میں ابن خلدون کی سادگی اور سلاست تو تھی ہی' اس کے ساتھ اس میں ادبی چاشنی اور شعریت کا ایسا امتزاج تھا جس سے نثر کا یہ نمونہ بہت خوبصورت اور دلچسپ لگتا تھا۔

منفلوطی مغربی تعلیم سے بالکل بے گانہ رہا' جس کی وجہ سے نہ اس نے مغرب میں رائج ادب کے نمونے دیکھے اور نہ وہاں کے افسانوں اور ناولوں سے اسے کوئی آگاہی ہوئی۔ اس نے عربی میں جو افسانے لکھے وہ مشرق کی رومانیت اور جذباتیت میں ڈوبے ہوئے تھے۔ اس کے بیشتر افسانے ان مظلوم کرداروں کے بارے میں ہوتے تھے جن پر ان کا معاشرہ بہت ستم توڑتا تھا اور اکثر افسانوں میں یہ کردار بالآخر اپنی جان سے گزر جاتے تھے۔ ہمارے ہاں اس طرح کی کہانیوں کی وجہ سے راشد الخیری کو مصورِ غم کا خطاب دیا گیا۔ عرب دنیا میں مصطفیٰ لطفی المنفلوطی صحیح معنوں میں مصورِ غم تھا۔ "العبرات" کی اکثر کہانیوں کو پڑھتے ہوئے نوجوان آنکھوں میں اگر آنسو آ جاتے ہوں تو کوئی تعجب کی بات نہیں۔ منفلوطی

کی ان کہانیوں میں یا تو بالکل سفید کردار تھے یا بالکل سیاہ۔ ان کے بین بین بھورے (Grey) رنگ کے کردار بالکل نہیں تھے۔ کہانیوں کی اس خصوصیت کو ابراہیم عبدالقادر المازنی نے اپنی کتاب "الدیوان" میں سخت تنقید کا نشانہ بنایا۔ دوسری کتاب "النظرات" میں منفلوطی کے ان مقالات اور خاکوں کی ایک اہم بات یہ تھی کہ وہ جس طرح سے اپنے خیالات کا اظہار کرتا تھا اس میں اسلام، جدیدیت پسندی، کلاسیکی ورثے کی اہمیت کا شعور اور خلاف مغرب جذبات ہوتے تھے۔ خیالات و تصورات کا یہ نہج بیسویں صدی کے ابتدائی برسوں کے ساتھ خاص تھا۔۔۔۔ منفلوطی کے لکھے ہوئے خاکوں اور کہانیوں کی ایک خصوصیت یہ رہی کہ وہ مستقبل میں ناول کی روایت کے ارتقاء میں ایک اہم قدم ثابت ہوئے۔

منفلوطی کی ادبی حیثیت کے قائم و دائم رہنے کی راہ میں دو رکاوٹیں حائل ہوئیں۔ ایک یہ کہ اپنی بات دوسروں تک پہنچانے کے لیے اس میں طاقتور اظہار کی کمی تھی اور دوسرے یہ کہ اس کی تعلیم بہت محدود تھی۔ قوت اظہار کی کمی کی وجہ یہ تھی کہ منفلوطی کو عربی لغت سے زیادہ واقفیت نہیں تھی اور نہ عربی ادب میں اس کو بصیرت حاصل تھی۔ اسی لیے اس کی تحریر میں زبان و بیان کی غلطی بھی راہ پا جاتی ہے اور غیر ضروری اظہار بھی۔ نیز لفظوں کا غلط جگہ استعمال بھی دیکھنے میں آتا ہے۔ رہا تعلیم کا محدود ہونا تو اس کی وجہ یہ کہ اس نے نہ مشرق کے علوم کی تحصیل کی اور نہ مغرب کے علوم کے ساتھ اس کا کوئی راست تعلق قائم ہو سکا۔ اس لیے اس کی فکر پر سطحیت، سادگی اور رومانیت کا غلبہ رہا۔

منفلوطی کی تصانیف میں ایک تو "النظرات" ہے جو اس کے ان مقالات کا مجموعہ ہے۔ جو اس نے تنقید، معاشرتی امور اور وصف و بیاں اور کہانیوں کے موضوعات پر "المؤید" میں لکھے تھے۔ دوسری "العبرات" جو اس کے طبع زاد اور ترجمہ شدہ افسانوں کا مجموعہ ہے۔ پھر "مختارات منفلوطی" ہے جس میں اس نے قدیم لوگوں کے اشعار اور ان کے اقوال کو جمع کیا ہے۔ پھر اس نے بعض فرانسیسی ادباء کی چیزوں کے تراجم اپنے دوستوں سے حاصل کر کے انہیں اپنے خوبصورت ادبی اسلوب میں ڈھالا اور اس طرح عربی ادب کی ثروت میں اضافہ کیا۔

☆.....☆.....☆

بیسویں صدی کے درمیانی عرصے میں مصر کے ادبی افق پر جو شخصیات نمایاں رہیں اور انہوں نے علم اور ادب اور تنقید میں بہت وقیع اور باقی رہ جانے والا کام کیا، ان میں چار نام خصوصیت کے ساتھ قابل ذکر ہیں: احمد امین، طٰہٰ حسین، احمد حسن الزیات اور عباس محمود العقاد۔ یہ چاروں ادبی شخصیات ایسی ہیں کہ ان کا نام ہمارے لیے اجنبی نہیں ہے اور یہاں جو حلقے عربی زبان و ادب کی تعلیم سے متعلق ہیں وہ ان کے



ناموں اور کاموں سے واقف ہیں۔ احمد امین نے فجر الاسلام، ضحیٰ الاسلام اور ظہر الاسلام کے عنوانات سے اسلام کے شروع زمانے سے لے کر عباسی دور کے آخر تک کی تمدنی اور معاشرتی تاریخ لکھی، جو مسلم دنیا میں اپنی طرز کی پہلی تاریخ ہے اور اپنے اندر معلومات کا ایک بیش بہا خزانہ لیے ہوئے ہے۔ اس کا اردو زبان میں ایک اچھا اور معیاری ترجمہ ہونا ابھی باقی ہے۔ طٰہٰ حسین نے تاریخ، ادب، تنقید، سیرت، تاریخ اسلام اور تعلیم کے موضوعات پر متعدد کتابیں لکھنے کے ساتھ ساتھ چھ ناول بھی عربی زبان کو دیے۔ اس کی متعدد کتابوں خصوصاً "الایام" (خودنوشت سوانح) اور "علی ھامش السیرۃ" (سیرت کے حاشیے پر) سے اردو قارئین ترجموں کی وساطت سے واقف ہیں۔ طٰہٰ حسین نے ایک عمدہ مضمون علامہ اقبال پر بھی لکھا تھا۔ احمد حسن الزیات نے اپنے ہفتہ وار ادبی مجلے "الرسالۃ" کے صفحات پر متعدد ادیب پیدا کیے۔ وہ لغوی ادیب تھا اور اس کی کتاب "تاریخ الادب العربی" پاکستان میں ایم۔ اے عربی کے نصاب میں ایک معاون کتاب کی حیثیت سے داخل چلی آتی ہے۔ اس کتاب کے علاوہ زیات نے اپنے فصیح و بلیغ عربی اسلوب میں ادب و تنقید پر متعدد کتابیں لکھیں اور دو کتابوں کے فرانسیسی زبان سے عربی میں ترجمے بھی کیے۔ عباس محمود العقاد بنیادی طور پر شاعر تھا۔ اس نے جدید طرز کی شاعری کرنے کے ساتھ ساتھ ابراہیم عبدالقادر المازنی کے ساتھ مل کر اپنے زمانے کی پرانی طرز کی شاعری پر کڑی تنقید کی۔ لیکن اس نے اس کے ساتھ نثر میں بھی بہت کچھ لکھا اور سیاست سے لے کر فلسفۂ الہیات اور سیرت کے موضوعات پر کتابیں اور رسالے لکھے۔ اسلامی سیرت پر اس کی کتابیں "عبقریۃ محمد" اور "عبقریۃ الصدیق" اور اس طرح کی دوسری کتابیں سیرت نگاری کا ایک نیا انداز سامنے لاتی ہیں۔ ان میں سے بعض کا غالباً اردو میں ترجمہ ہو چکا ہے۔ ان چاروں اساطین ادب کے کچھ مختصر حالات دینے کے بعد موجودہ دور کی عربی شاعری اور جدید شعراء کا مناسب تعارف کرایا جائے گا۔

## احمد امین (م ۱۹۵۴)

مصری فاضل اور مصنف، قاہرہ میں پیدا ہوا۔ جامع ازہر اور مدرسۃ قانون شرعی میں تعلیم پانے کے بعد وہ مصری عدالتوں میں بطور قاضی کام کرتا رہا۔ ۱۹۲۶ میں اس کا تقرر قاہرہ یونیورسٹی کے اساتذہ میں ہو گیا جہاں وہ ۱۹۳۶ سے ۱۹۳۹ تک عربی ادبیات کا استاد رہا۔ ۱۹۴۷ میں وہ عرب لیگ کے شعبۂ ثقافت کا ناظم مقرر ہو گیا۔ احمد امین لجنۃ التالیف و الترجمۃ و النشر (تالیف و ترجمہ و اشاعت کی انجمن) کے بانیوں اور سرگرم ترین ارکان میں سے تھا۔ اس انجمن کے لیے اس نے قدیم عربی کتابوں اور تاریخ

ادب کی عام تصانیف کی، دوسرے لوگوں کے ساتھ مل کر، تصحیح و اشاعت کی۔ اس کی سب سے عالمانہ اور اہم تصنیف آٹھویں سے دسویں صدی عیسوی کے تمدن اسلامی کی تاریخ ہے جو تین حصوں میں ہے: فجر الاسلام (ایک جلد) ضحی الاسلام (تین جلدیں) اور ظہر الاسلام (چار جلدیں)۔ یہ تصنیف اس حیثیت سے قابل توجہ ہے کہ اس میں پہلی مرتبہ موجودہ زمانے کی مسلم عرب تاریخ نویسی میں بڑے پیمانے پر تنقید و تحقیق کا طریقہ استعمال کیا گیا ہے۔ ۱۹۳۳ سے وہ احمد حسن الزیات کے ہفتہ وار ادبی مجلہ "الرسالۃ" میں شریک کار رہا اور پھر ۱۹۳۹ میں اس نے اسی طرح کے ایک اور رسالے "الثقافۃ" کی ادارت کے فرائض انجام دیئے۔ اس کے ان ادبی، معاشرتی اور دوسرے موضوعات پر مقالوں کو جو ان رسالوں میں شائع ہوتے رہے بعد میں جمع کر کے کتاب "فیض الخاطر" (۸ جلدیں) کی صورت میں شائع کیا گیا۔ احمد امین کی دوسری تصانیف میں اس کی خود نوشت سوانح "حیاتی" خاص طور پر قابل ذکر ہے۔

## طٰہٰ حسین (م ۱۹۷۳)

عالم عرب کا نہایت ممتاز اور مشہور و معروف ادیب، نقاد اور انشا پرداز، جس کی شخصیت بیسویں صدی کے ایک بڑے حصے کی ادبی دنیا پر چھائی رہی اور اس نے اس دور کی کئی نسلوں کو اپنے علم، اپنے افکار، اپنی تنقید اور اپنے خوبصورت اور سحر طراز نثری اسلوب سے متاثر کیا۔

وہ مصر کے ایک چھوٹے سے گاؤں میں پیدا ہوا۔ اس کا والد ایک شوگر کمپنی میں ملازم تھا۔ وہ چھ سال کا تھا کہ آشوب چشم کے باعث اس کی آنکھوں کی بینائی متاثر ہوئی اور غلط علاج کی وجہ سے وہ ہمیشہ کے لیے نور بصارت سے محروم ہوگیا۔ نو سال کی عمر میں اس نے قرآن حفظ کر لیا اور تیرہ سال کی عمر میں قاہرہ آ کر جامع ازہر میں چھ سال نحو، اصول فقہ، منطق، فلسفہ اور ادب کی تعلیم پائی۔ اس کو سب سے زیادہ علمی فیض شیخ علی المرصفی سے پہنچا، جو مدرسہ کے اوقات کے علاوہ شوقین طلبہ کو زمخشری کی المفصل، دیوان الحماسہ اور مبرد کی الکامل کا درس دیا کرتے تھے۔

۱۹۰۸ میں جامعۂ مصریہ قائم ہوئی تو طٰہٰ حسین جامعہ کے لیکچروں میں شرکت کرنے لگا۔ اس وقت مشہور اطالوی مستشرقین جیدی اور ناللینو وہاں مختلف مضامین کا درس دیا کرتے تھے۔ طٰہٰ حسین ان مغربی اساتذہ کے نئے خیالات و نظریات سے بہت متاثر ہوا۔ اس اثنا میں اس نے فرانسیسی زبان و ادب سے بھی واقفیت پیدا کر لی تھی۔ جامعۂ مصریہ سے فراغت کے بعد اس نے ابوالعلاء معری کی شاعری اور فلسفۂ زندگی پر "ذکری ابی العلاء" لکھ کر ڈاکٹریٹ کی سند حاصل کی۔ ۱۹۱۵ میں اسے اعلیٰ تعلیم کی خاطر فرانس



بھیجا گیا۔ وہاں سوربون میں اس نے ابن خلدون کے معاشرتی فلسفے پر ایک کتاب لکھ کر ڈاکٹریٹ حاصل کی۔ قیام پیرس کے دوران میں اس نے ایک فرانسیسی خاتون سے شادی کر لی جس نے حد درجہ محبت، وفاداری اور دلسوزی سے اس کی خدمت کی اور لکھنے پڑھنے میں اس کی مددگار و رفیق بنی رہی۔ ۱۹۱۹ میں وہ تکمیل علم کے بعد مصر آ گیا اور جامعۂ مصریہ میں قدیم (یونانی و رومانی) تاریخ کا درس دینے لگا۔ ۱۹۲۵ میں وہ کلیۃ الآداب (آرٹس کالج) میں تاریخ ادب عربی کا استاد مقرر ہوا۔ ۱۹۲۶ میں اس نے کتاب "فی الشعر الجاهلی" شائع کی، جس میں اس نے جاہلی شاعری کے بارے میں یہ عجیب رائے پیش کی کہ اس کا ایک بڑا حصہ بعد کے لوگوں کا گھڑا ہوا ہے، جسے بعض اغراض کے تحت قدیم شعراء سے منسوب کر دیا گیا ہے۔ اس بات پر بہت سے ادیب اور نقاد برہم ہوئے اور اخباروں اور رسالوں میں طٰہٰ حسین کے خلاف تشنیع و مذمت کا ایک طوفان کھڑا ہوگیا۔ چنانچہ حکومت کو مداخلت کر کے اس کی اشاعت روک دینی پڑی، اور طٰہٰ نے ضروری حک و اضافہ کے بعد اسی تصنیف کو دوبارہ "فی الادب الجاهلی" کے عنوان سے شائع کیا۔ ۱۹۴۲ء میں وفد پارٹی برسر اقتدار آئی تو طٰہٰ حسین کو جامعۂ اسکندریہ کا وائس چانسلر مقرر کیا گیا۔ ۱۹۵۰ میں وفد پارٹی نے دوبارہ وزارت بنائی تو وزارت تعلیم کا قلمدان طٰہٰ حسین کے حصے میں آیا۔ اس نے اپنے زمانۂ وزارت میں مصر بھر میں ثانوی تعلیم مفت اور عام کر دی۔ اس نے اسیوط میں یونیورسٹی کے قیام کا منصوبہ بنایا، ایتھنز یونیورسٹی میں عربی زبان کی چیئر (Chair) قائم کرائی اور حکومت کو شیکسپیئر کے ڈراموں کے عربی ترجمے کرانے کی ضرورت اور اہمیت کی طرف توجہ دلائی۔ ۱۹۵۱ میں اس کو حکومت کی طرف سے پاشا کا خطاب دیا گیا۔ ۱۹۵۲ میں فوجی انقلاب کے بعد وہ کچھ گوشہ نشین سا ہوگیا لیکن اس کی علمی اور ادبی سرگرمیوں میں کوئی فرق نہ آیا۔ وہ مجمع اللغة العربية (قاہرہ) اور المجمع العلمی العربی (دمشق) کا اعزازی رفیق تھا۔ میڈرڈ اور کیمبرج یونیورسٹیوں نے اسے ڈاکٹر آف لٹریچر کی اعزازی ڈگریاں عطا کیں۔ نیز علمی اور تعلیمی معاملات میں اس کی رائے ہمیشہ وقیع سمجھی گئی۔

ڈاکٹر طٰہٰ حسین فرانسیسی ادب و ثقافت کا بھی شیدائی تھا۔ اسے فرانسیسی زبان پر بڑی قدرت حاصل تھی اور اس کے ایک معتدبہ ادبی ذخیرے کو اس نے عربی زبان میں منتقل کیا۔ کسی زمانے میں وہ حریت فکر، حد سے بڑھی ہوئی روشن خیالی اور مخصوص معتقدات کی وجہ سے بدنام تھا۔ لیکن آخری عمر میں اس میں سلامت روی، اعتدال اور توازن پیدا ہوگیا۔

طٰہٰ حسین کی شہرت و مقبولیت کا راز اس کے سحر طراز اسلوب بیان میں مضمر ہے۔ اس کے قلم میں بلا کی روانی ہے۔ وہ ایک طرز نگارش کا بانی ہے جس کی سلاست، حلاوت، صحت زبان اور قدیم عربی کا حسن مسلّم ہے۔ اس کی تحریر میں بعض دفعہ جملوں کی غیر معمولی طوالت اور ایک ہی لفظ یا جملے کی تکرار بھی ذوق

سلیم پر گراں گزرتی ہے۔ لیکن یہ خامیاں زیادہ تر اس کے ہفتہ وار کالموں میں دیکھنے میں آتی ہیں' جن پر کچھ صحافیانہ انداز غالب ہوتا تھا۔ طٰہٰ حسین نے اپنی زندگی میں کئی ادبی معرکے لڑے۔ اس کا معرکہ مصر کے دوسرے بڑے ادیب مصطفیٰ صادق الرافعی کے ساتھ مشہور ہے جو کافی عرصے تک چلتا رہا۔ رافعی عربی زبان کا بہت مقتدر ادیب اور عربی ادب و تاریخ کا عالم ہونے کے ساتھ ساتھ اسلامی اقدار اور روایات کا حامی تھا۔ طٰہٰ حسین کی طرف سے جب اسلام کے بارے میں یا عربی ادب کی قدیم روایت اور تاریخ کے بارے میں یا معاصر ادب کے بارے میں کچھ بے تکے اور مغرب پرستانہ خیالات کا اظہار ہوتا تھا تو مصطفیٰ صادق الرافعی اسے آڑے ہاتھوں لیتا تھا اور اپنے طاقتور اور فصیح و بلیغ اسلوب سے اس کے خیالات کی دھجیاں اڑا دیتا تھا۔ رافعی کے مقابلے میں طٰہٰ حسین کا رویہ گریز کا تھا اور وہ اکثر اوقات جواب دینے کے بجائے خاموشی میں ہی اپنی خیریت سمجھتا تھا۔ لیکن یہ بات ماننی پڑے گی کہ طٰہٰ حسین کے اس عافیت پسندانہ رویے نے بالآخر رافعی کو یہ سلسلہ ختم کرنے پر مجبور کر دیا۔ اس لڑائی میں طٰہٰ حسین کو تو کوئی نقصان نہ پہنچا۔ اگر کچھ نقصان پہنچا ہوگا تو مصطفیٰ صادق الرافعی ہی کو پہنچا ہوگا۔

طٰہٰ حسین کی تصانیف کا جائزہ مختلف عنوانات کے ذیل میں یوں لیا جا سکتا ہے:

۱۔ نقد ادب میں: ذکری ابی العلاء' تجدید ذکری ابی العلاء' فی الادب الجاهلی' مع المتنبی' فصول فی الادب والنقد' حافظ و شوقی' حدیث الاربعاء (بدھ کے روز کے ادبی کالم)' من حدیث الشعر و النثر' من ادبنا المعاصر (دونوں ادبی اور تنقیدی مقالات کے مجموعے)

۲۔ تاریخ وسوانح میں: الایام (خودنوشت' دو حصوں میں) علی هامش السیرة (تین جلدوں میں) الفتنة الکبری کے جامع عنوان کے تحت: عثمان' علی و بنوه' الشیخان' نیز مرآة الاسلام

۳۔ ناول: دعاء الکروان' الحب الضائع' ادیب' احلام شهرزاد' شجرة البؤس اور الوعد الحق۔ یہ آخری ناول عہد رسالت کے ان فدائیان اسلام کے درد انگیز حالات کے بارے میں ہے جنہوں نے کفار قریش کے مظالم و شدائد کا صبر و استقلال کے ساتھ مقابلہ کیا۔

۴۔ تعلیم: مستقبل الثقافة فی مصر: اس میں مصر کے نظام تعلیم پر بے لاگ تبصرہ اور اصلاح کی تدبیر ہے۔

ان کے علاوہ طٰہٰ حسین کے اور بے شمار کام ہیں جن کا احاطہ بہت مشکل ہے۔ مثلاً ایک کام ابن



واصل حموی کی تجرید الاغانی (جو پانچ جلدوں میں کتاب الاغانی کا اختصار ہے) کو ایڈٹ کر کے شائع کرنا۔ آج اصل کتاب الاغانی کی بیس جلدیں پڑھنے کے لیے کسی کے پاس وقت نہیں ہے۔ ان حالات میں تجرید الاغانی جیسی کتاب کا میسر ہونا بہت غنیمت ہے۔

طٰہٰ حسین ذہنی طور پر معتزلہ کے افکار سے بھی متاثر تھا۔ اس لیے اسے معتزلہ کے علمی آثار کی جستجو رہتی تھی۔ اس کی رہنمائی اور نگرانی میں قاضی عبدالجبار المعتزلی (م ۱۰۲۳) کی گراں قدر تصنیف "المغنی" جو معتزلی عقائد و افکار کی دائرۃ المعارف ہے' بیس جلدوں میں شائع ہوئی۔

طٰہٰ حسین کا انتقال ۱۹۷۳ میں ہوا اور عرب دنیا نے اس کی موت کا کافی سوگ منایا۔

## احمد حسن الزیات (م ۱۹۶۸)

احمد حسن الزیات نے جامع ازہر میں اسی زمانے میں تعلیم پائی جب طٰہٰ حسین بھی وہاں زیر تعلیم تھا۔ اس نے آگے چل کر مشہور ہفتہ وار ادبی پرچہ "الرسالہ" جاری کیا۔ ان دونوں کی یہ رفاقت عمر بھر قائم رہی جو بالآخر عزیزانہ تعلقات پر منتج ہوئی۔ زیات کو عربی لغت میں بے پناہ ملکہ حاصل تھا اسی لیے اس کو لغوی ادیب کہا جاتا ہے۔ یعنی ایسا ادیب جس کی تحریر میں لغت عرب پر کامل دسترس کا اظہار ہوتا ہے۔ زیات کے لکھنے کا ایک مخصوص انداز تھا۔ وہ عام طور پر مزدوج جملے لکھتا تھا یعنی دو دو تین تین جملے ایک ہی وزن میں اور عموماً ہم قافیہ۔ اپنے ہفتہ وار ادبی مجلے "الرسالہ" سے اس نے جدید عربی ادب کی بہت خدمات انجام دیں اور بہت سے نئے لکھنے والوں نے اس کے رسالے میں لکھنا شروع کیا تو رسالے کی شہرت اور زیات کی نگرانی کی بدولت بڑے ادیب بن کر نکلے۔ وہ جامعہ امریکیہ میں ادب کا پروفیسر بھی رہا اور رسالے کی ادارت کے ساتھ ساتھ ادب' تنقید اور تاریخ کے موضوعات پر قابل قدر کتابیں لکھیں اور فرانسیسی زبانوں سے کچھ کتابوں کے ترجمے بھی کیے جو کافی مقبول ہوئے۔

**تصانیف:** "تاریخ الادب العربی" : یہ درسی کتاب ہے اور اس کی مقبولیت کا یہ عالم ہے کہ ۱۹۴۷ تک اس کے دس ایڈیشن شائع ہو چکے تھے۔ "فی اصول الادب"، "من الادب الفرنسی" (یہ فرانسیسی نظموں اور افسانوں کا ترجمہ ہے) "دفاع عن البلاغة"۔ "آلام فرتر" (یہ جرمن شاعر گوئٹے کے ناول Sorrows of Werther کا ترجمہ ہے جو زیات نے فرانسیسی زبان سے کیا)۔ "رفائیل" یہ بھی ایک فرانسیسی روزنامچے کا ترجمہ ہے۔ ان سب کے علاوہ "وحی الرسالة" (تین جلدوں میں) کے

اندر اس نے اپنے وہ سب مقالات جمع کر دیے جو اس نے "الرسالۃ" کے صفحات پر لکھے تھے۔

## عباس محمود العقاد (م ۱۹۶۴ء)

ادیب، شاعر، نقاد، مترجم اور سیاسی مقالہ نگار! عقاد نے کوئی باقاعدہ تعلیم حاصل نہ کی، بلکہ جو علم بھی حاصل کیا، اپنے شوق اور محنت سے حاصل کیا۔ عقاد کو ادب کے ساتھ طبعی علوم میں بھی دلچسپی تھی۔ چنانچہ یہ کوئی تعجب کی بات نہیں کہ وہ نفسیاتی تجزیے میں دلچسپی لینے لگا اور یہ دیکھنے لگا کہ اس کا ادب پر کیونکر انطباق کیا جا سکتا ہے، مثلاً مشہور کلاسیکی شاعر ابن الرومی کے مطالعے میں! عربی ناول میں اس کی جو عطا ہے اس میں بھی یہی انداز نظر ہے۔ چنانچہ اپنے ناول "سارہ" کے تعارف میں وہ خود اس طرف اشارہ کرتا ہے کہ "سارہ" یا تو نفسیاتی تجزیے کا ناول ہے یا پھر یہ ایک بیانیہ انداز کا تجزیہ ہے۔

کسی تعلیمی سند کے بغیر ہونے کے باوجود عقاد ایک ممتاز ادیب تھا۔ وہ جدید طرز کا بہت عمدہ شاعر تھا اور اس کے ساتھ ادب کا ایک اچھا نقاد بھی۔ اس نے اپنے معاصر ادیب ابراہیم عبدالقادر المازنی کے ساتھ مل کر اپنے زمانے کی پرانی شاعری پر کڑی تنقید کی۔ اس نے اگرچہ مسلم شخصیات کی سیرت پر بھی کتابیں لکھیں، لیکن اس نے سیاسی ادب لکھنے والوں میں کافی اہمیت حاصل کی۔ اس کے ساتھ اس نے سیاسی مقالات بھی بڑی تعداد میں لکھے۔ ایک زمانے میں مصر میں کوئی ایسا اخبار نہیں تھا جس میں عقاد کے مقالے نہ چھپتے ہوں۔ وہ پارلیمنٹ کا رکن بھی بنا، اور کئی ادبی کتابیں تصنیف کیں۔ عقاد ایک بسیار نویس اہل قلم تھا۔ اس کی کتابوں کی تعداد ساٹھ تک پہنچتی ہے۔ اتنا زیادہ لکھنے کے دو نقصان ہوتے ہیں ایک تو اس سے تحریر کا اعلیٰ معیار قائم نہیں رہ سکتا، اور دوسرے یہ کہ ساٹھ کتابوں کے مصنف کے بارے میں یہ فیصلہ کرنا مشکل ہو جاتا ہے کہ ادب و علم کی دنیا میں اس کا اصل میدان کیا ہے۔ عقاد کے ساتھ بھی یہی کچھ ہوا ہے۔

عقاد کی سیاست کسی خاص اصول یا نظریے پر مبنی نہیں تھی۔ اسے جہاں بھی فائدہ دکھائی دیتا وہیں شامل ہو جاتا اور اپنے قلم کی طاقت سے بہت فائدہ اٹھاتا۔

عقاد کی تصانیف کا احاطہ تو مشکل ہے، البتہ اس کی مشہور کتابوں میں مندرجہ ذیل کا نام لیا جا سکتا ہے:
"دیوان العقاد" (شاعری) "کتاب الفصول الثلاثۃ" "ابن الرومی" "عبقریۃ محمد" "عبقریۃ الصدیق" "مجموع المقالات" "حیاۃ سعد" وغیرہ!

اوپر زیادہ تر مصر کے ادباء اور اہل قلم کا ذکر ہوا۔ لیکن بیسویں صدی میں صرف یہی لوگ ہی جدید



عربی ادب کے نمائندہ نہیں تھے، بلکہ ان کے علاوہ شام، لبنان اور عراق میں دوسرے کئی ادباء اور اصحاب قلم بھی رہے جنہوں نے عربی نثر میں قدماء کی فصاحت و بلاغت کے ساتھ ساتھ اس میں ایسی سلاست، شگفتگی اور تازگی پیدا کی کہ عربی نثر مغربی زبانوں کی نثر سے آنکھ ملانے لگی۔ ان ادیبوں اور انشا پردازوں میں امیر شکیب ارسلان، محمد کرد علی، عبدالقادر مغربی، امین ناصر الدین، یعقوب صروف، محمد شکری الآلوسی وغیرہ شامل ہیں۔ امیر شکیب ارسلان نے ایک انگریز مصنف کی کتاب پر جو مفصل حواشی لکھے ان سے اس کی کتاب "حاضر العالم الاسلامی" مرتب ہو گئی، جو چار جلدوں میں بیسویں صدی کی ابتدائی دہائیوں کی اسلامی دنیا کے حالات کا ایک عمدہ اور بھرپور جائزہ ہے۔ اس کے علاوہ اس نے "الحلل السندسیۃ فی الاخبار والآثار الاندلسیۃ" کے عنوان سے اندلس کی تاریخ بھی لکھی۔ امیر شکیب ارسلان نے اپنی زندگی کا ایک بڑا حصہ جلاوطنی کی حالت میں سوئٹزرلینڈ میں گزارا، اور وہیں بیٹھ کر وہ اپنے مقالات لکھ لکھ کر عرب دنیا کو بھجواتا رہا۔ شکیب ارسلان کی نثر میں آبشار کی سی روانی ہے۔ اس نے اپنے خاص اسلوب سے جدید عربی نثر کو ایک ایسے اعلیٰ مقام پر پہنچا دیا کہ جس کی وجہ سے اسے بجا طور پر کاتب الشرق الاکبر (مشرق کے سب سے بڑے انشا پرداز) کا خطاب دیا گیا۔

## جدید عربی شاعری

جیسا کہ اوپر ذکر ہوا اٹھارہویں صدی میں جب عرب قوم ہر جگہ محکومی اور غلامی کے سائے منڈلانے لگے تو ان کی تخلیقی قوتیں مرجھا کے رہ گئیں اور ادب و شعر کی دنیا میں ہر طرف جمود چھا گیا۔ اس جمود کو توڑنے کے لئے قدرت نے فرانس کے نپولین بوناپارٹ کو بھیجا۔ اس نے آ کر مصر پر صرف سیاسی غلبہ ہی حاصل نہ کیا، بلکہ اس کے ساتھ اس کی علمی و تہذیبی زندگی میں بھی ایک حرکت اور سرگرمی پیدا کر دی۔ بڑی تعداد میں مدارس کھولے گئے، تعلیم و تعلم کا چرچا ہوا، یورپ کو وفد جانے لگے۔ یورپ سے وفد آنے لگے۔ علمی بیداری کی یہی وہ فضا تھی جس میں عربی زبان میں واضح طور پر شاعری کے ایک نئے دور کا آغاز ہوا، اور شعر و سخن کی روٹھی ہوئی دیوی ایک بار پھر عربوں کی طرف مائل بہ کرم ہوئی۔ عربی شاعری کے اس دور احیاء میں محمود سامی البارودی اسی مقام پر ہے جہاں قدیم عربی شاعری میں امرؤ القیس تھا۔ اس کے بعد مصر کے اسماعیل صبری، احمد شوقی اور حافظ ابراہیم، عراق کے جمیل صدقی الزہاوی اور معروف الرصافی اور شام کے خلیل مطران اس روایت کو آگے بڑھاتے ہیں۔ شوقی کے ہاں پہنچ کر عربی شاعری کو وہ آہنگ، وہ الہامی کیفیت اور وہ فنی معراج نصیب ہوتی ہے جو گویا متنبی (م ۹۶۵) پر ختم ہو کے رہ گئی تھی

اور یہ کہنا بالکل صحیح ہے کہ متنبی سے لے کر شوقی تک درمیان کی ایک ہزار سالہ زمانی وسعت میں اس کی سی قامت کا شاعر کہیں دیکھنے میں نہیں آتا۔

یہاں کچھ اہم جدید شعراء کا تعارف کرانے سے پہلے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ جدید عربی شاعری پچھلے ڈیڑھ دو سو سال میں جن ارتقائی مراحل اور جن تبدیلیوں سے گزری ہے ان کا ایک سرسری سا خاکہ پیش کر دیا جائے' تاکہ مختلف وقتوں میں نمایاں ہونے والے شعراء کو ان مراحل سے منسوب کیا جا سکے۔

۱۔ شاعروں کا پہلا گروہ تو کلاسیکی شعرا کا ہے۔ اس میں وہ شعراء آتے ہیں جنہوں نے عربی زبان کی اس کلاسیکی شاعری کا احیاء کیا جو عباسی دور میں اوج کمال کو پہنچی ہوئی تھی اور اس میں اپنے زمانے اور اپنے حالات کے مطابق نئی چیزیں داخل کیں۔ اس گروہ میں مصر کے محمود سامی البارودی' احمد شوقی' حافظ ابراہیم اور عراق کے جمیل صدقی الزہاوی اور معروف الرصافی آتے ہیں۔

۲۔ دوسرا گروہ قبل رومانیوں(Pre-romantics) کا ہے۔ اس میں شاعر خلیل مطران آتا ہے جو پیدا تو لبنان میں ہوا تھا لیکن بعد میں مصر آ گیا تھا۔ پھر ''دیوان گروپ'' ہے جس میں عبدالرحمان شکری' ابراہیم عبدالقادر المازنی اور عباس محمود العقاد شامل ہیں۔ ان لوگوں نے اپنے آپ کو مدرسۃ التجدید (جدت پسند سکول) کہا اور اپنے سے پہلی نسل کی شاعری کو اپنی کتاب "الدیوان" میں تنقید کا نشانہ بنایا۔ یہ تینوں اصحاب شاعر بھی تھے اور اس کے ساتھ ساتھ انہوں نے نثر میں بھی بہت کچھ لکھا۔ اور مازنی اور عقاد کی شہرت تو زیادہ تر بطور نثر نگار کے ہوئی۔

۳۔ تیسرا گروہ رومانی شعرا(Romantics) کا ہے۔ ان میں احمد زکی ابوشادی اور اپالو گروپ کے شعراء علی محمود طہٰ' ابراہیم ناجی' ابوشبکہ اور ابوالقاسم الشابی شامل ہیں۔ یہ شعراء عقاد اور مازنی کے بجائے دراصل شامی مصری شاعر خلیل مطران کی ایک ارتقائی صورت تھے' اور خلیل مطران سے واضح طور پر متاثر تھے۔ چنانچہ خلیل نے ان کی شاعری پر تعارفی مضامین بھی لکھے تھے۔ ان شعراء کو اپالو گروپ کا نام اس لئے دیا گیا کہ ابوشادی نے ایک سوسائٹی اپالو کے نام سے قائم کی تھی جس کا وہ ایک طرح سے بانی تھا اور ناجی اس کا نائب صدر تھا۔ رومانیت کی روح جو مجہر کی شاعری میں محسوس کی جانے لگی تھی (مجہر کے شاعر وہ لوگ تھے جو عرب ممالک سے ہجرت کر کے امریکہ اور لاطینی امریکہ چلے گئے تھے) وہ ۱۹۳۰ء اور ۱۹۴۰ء کی دہائیوں میں اکثر عرب



ممالک میں تخلیق کی جانے والی شاعری میں نفوذ کرنے لگی تھی۔

۴۔ چوتھا گروہ مجہر کے شعراء کا تھا جو جیسا کہ اوپر ذکر ہوا لبنان و شام سے تعلق رکھنے والے ایسے لوگ تھے جو اپنے وطن میں اقتصادی اور معاشرتی حالات کی ناسازگاری سے دل برداشتہ ہو کر بیسویں صدی کے اوائل میں شمالی اور جنوبی امریکہ میں جا بسے تھے۔ اپنے حالات سے مجبور ہو کر یہ لوگ ہجرت تو کر گئے اور اپنے وطن سے بہت دور ایک اجنبی ماحول میں اجنبی لوگوں کے درمیان جا کر بس بھی گئے' لیکن وطن کی یاد ان کے دل سے کبھی نہ نکل سکی۔ اس زمانے میں لمبے سفر کا واحد ذریعہ سمندری سفر تھا۔ اس لئے یہ لوگ آسانی سے اپنے وطن کا پھیرا بھی نہیں لگا سکتے تھے۔ ان حالات میں انہوں نے ادبی سرگرمیوں کا سہارا لیا اور شاعری کرنے اور نثر لکھنے لگے۔ اس شاعری کی زیریں رو اپنے وطن کی یاد اور گھر کو لوٹنے کا جذبہ تھا۔ اس لئے انہوں نے نثر اور نظم میں جو کچھ بھی لکھا اس پر رومانیت غالب تھی۔ اس گروہ کے شعراء میں: جبران خلیل جبران (اگرچہ اس نے زیادہ کام نثر کی صورت میں کیا) میخائیل نعیمہ' ایلیا ابوماضی' رشید ایوب' الیاس فرحات اور رشید سلیم الخوری وغیرہ مشہور ہوئے۔

۵۔ رومانیت کا ردعمل: دو عالمی جنگوں کا درمیانی زمانہ رومانی شاعری کا زمانہ تھا۔ اس طرح کی شاعری کی دلچسپی کا مرکز فرد تھا' نہ کہ معاشرہ! اور معاشرے کے بارے میں اس شاعری کا رویا نظریاتی اور مثال سازی کے انداز کا تھا۔ لیکن جنگ عظیم دوم کے خاتمے پر عرب دنیا کے حالات میں اتنی عظیم اور ہمہ گیر تبدیلی رونما ہوئی کہ رومانی شاعری اپنی ساری خوبصورتی اور لذت آمیزی کے باوجود بے وقت کی راگنی محسوس ہونے لگی۔ جنگ کے بعد دو ایسے سانحے رونما ہوئے جنہوں نے عرب قوم کی ساری سانجھی کو ہلا کر رکھ دیا۔ ایک ۱۹۴۸ء کا المیہ فلسطین' جس نے عرب حکومتوں کی بنیادی سیاسی کمزوریوں اور بدعنوانیوں کو بے نقاب کر دیا' اور دوسرا ۱۹۵۲ء کا مصری انقلاب' جو دراصل فلسطینی جنگ میں عربوں کی شکست کا نتیجہ تھا۔ ان دونوں واقعات نے اس وقت کی شاعری کا موضوع' سوچنے کا انداز اور خود شاعری کی ہیئت کو بدل کر رکھ دیا۔ اب شاعری میں التزام(Commitment) کی بات ہونے لگی' اور اچھی اور بامعنی شاعری وہی سمجھی جانے لگی جو کسی نہ کسی مقصد کے ساتھ وابستہ (Committed) ہو' چاہے وہ مقصد عربی قومیت کو تقویت دینا ہو' یا روسی کمیونزم کی وکالت کرنا' یا اور کچھ نہیں تو ایک لادینی طرز کی آزاد خیالی کا پرچار! اس گروہ میں جن شعراء نے اپنے فن کے اعلیٰ معیار کی وجہ سے نام



Scanned with CamScanner

پیدا کیا ان میں عبدالوہاب البیاتی، صلاح عبدالصبور، احمد عبدالمعطی حجازی، نازک الملائکہ، ایڈونس (علی احمد سعید) یوسف الخال، خلیل حاوی اور بدر شاکر السیاب نمایاں ہیں۔

پھر انہی ملتزم (Committed) شعراء میں فلسطین کے رہنے والے وہ شعراء آتے ہیں جو شعراء المقاومۃ (مزاحمت کے شعراء) کہلاتے ہیں۔ ان میں محمود درویش، سمیح القاسم اور توفیق زیاد ممتاز ہیں۔ خاص طور پر پہلے دو شعراء محمود درویش اور سمیح القاسم ارض فلسطین سے تعلق رکھنے اور وہاں سے نکالے جانے کی وجہ سے عرب قارئین میں کافی ہر دلعزیز ہوئے۔

جدید عربی شاعری کے سفر کے ان نشانات راہ کا خاکہ اس لئے پیش کیا گیا کہ جدید عرب شاعروں کو پڑھتے ہوئے قاری یہ جان سکے کہ وہ شاعری کے کس دور اور کس مرحلے سے تعلق رکھتے ہیں، اور اپنے زمانے میں ان کی اہمیت کیا رہی، اور انہوں نے شاعری میں اپنی طرف سے کیا حصہ ڈالا۔

اب ہم پیچھے چلتے ہیں اور جدید شاعری کے بعض اہم نمائندوں کا مختصر تعارف کراتے ہیں۔

## محمود سامی البارودی (م ۱۹۰۴)

ایک نقاد کا قول ہے کہ اگر امرؤ القیس کا کمال یہ تھا کہ اس نے جاہلی شاعری میں قصیدے کی ابتداء کی اور اس کے مضامین کا ایک خاص نہج قائم کیا، اور بشار کا کمال یہ تھا کہ اس نے شاعری کو ترقی دی اور اس کو نئے موضوعات سے آشنا کیا تو بارودی کو اس بات کا کریڈٹ جاتا ہے کہ اس نے عربی شاعری کے مردہ جسم میں روح دوڑائی اور اس کا رنگ روپ سنوارا۔

بارودی قاہرہ میں پیدا ہوا۔ اس نے عسکری مدرسے میں تعلیم پائی اور فوج میں ملازم ہو گیا اور اس میں ترقی کرتے کرتے میجر جنرل کے عہدے تک جا پہنچا۔ لیکن اس عسکری پیشے کے ساتھ ساتھ اس کو کم عمری ہی سے شاعری اور ادب پڑھنے کا بھی بہت شوق رہا۔ چنانچہ اپنے ادبی ذوق کی تسکین کے لئے اس نے عباسی دور کے ابن المعتز، ابوفراس حمدانی، الشریف الرضی، طغرائی اور دوسرے قادر الکلام شعراء کو بہت پڑھا۔ اس مطالعے سے اس میں شاعری کا شوق پیدا ہوا اور اس کے لئے اس نے ان شعراء کے طرز کو سامنے رکھا اور انہی کے اسالیب کے مجموعی اثر سے اس نے اپنی شاعری کو بہت خوبصورت اور پرشوکت اسلوب عطا کیا۔ بارودی کی شاعری کو پڑھتے ہوئے لگتا ہے کہ انسان موخر عباسی دور کا کلام پڑھ رہا ہے۔ عرابی پاشا کی بغاوت میں بارودی کو بھی ملوث کیا گیا اور باقی لوگوں کے ساتھ اسے جلا وطن کر کے جزیرہ سراندیپ (سیلون) بھیج دیا گیا، جہاں اس نے سترہ برس گزارے۔ اس عرصے میں اس نے ایک تو



انگریزی زبان پڑھ لی، دوسرے کچھ نظمیں بھی کہہ ڈالیں۔ آخر خدیو عباس نے اس پر ترس کھاتے ہوئے اسے رہائی دے دی۔ واپس آ کر اس نے پانچ سال بڑھاپے کے امن وسکون میں گزارے۔ اس دوران میں کتابوں کا مطالعہ کیا، دوستوں سے گپ شپ کی اور کچھ مشق سخن بھی کی۔ آخر میں اس کی بینائی جاتی رہی اور وہ ۱۹۰۴ء میں انتقال کر گیا۔

بارودی کا کلام قدماء کی طرح بدیع کے تکلفات سے پاک ہے۔ اس کا اسلوب متجیدہ ہے، الفاظ فصیح ہیں اور مضامین عالی شان ہیں۔ اس کے کچھ اشعار کا نمونہ یہ ہے۔ جو ہجر کے موضوع پر ہیں۔

ردّوا علیّ الصبی من عصری الخالی — وهل یعود سواد اللمة البالی

لم یدر من بات مسروراً بلذته — انی بنار الاسی من هجره صالی

غبتم فاظلم یومی بعد فرقتکم — وساء صنع اللیالی بعد اجمال

(میرے گزرے ہوئے زمانے سے مجھے بچپن لوٹا دو، اور کیا اجڑے ہوئے بالوں کی سیاہی لوٹ کے آ سکتی ہے۔

جو اپنی لذتوں میں مسرور پڑا رہا ہے اسے یہ خبر بھی نہ ہو گی کہ میں اس کے فراق میں کیسے کیسے عذاب سے گزر رہا ہوں۔

آپ چلے گئے تو میرے دن بھی آپ کی جدائی کے بعد تاریک ہو گئے، اور زمانے کا سلوک بھی، جو کبھی اچھا تھا، اب برا ہو گیا)

جلا وطنی سے واپس آنے کے بعد جب شاعر قبرص جزیرہ سے گزرا تو اسماعیل کے عہد کو یاد کر کے اس نے کچھ اشعار کہے:

هذه الجزیرة فانظر هل تری احداً — ینای به الخوف او یدنو به الطمع

فلا مجیب یرد القول عن نبا — ولا سمیع اذا نادیت یستمع

لو کان للمرء فکر فی عواقبه — ماشاب اخلاقه حرص ولا طمع

(یہ وہی جزیرہ ہے، دیکھو کہ اس میں اب بھی کوئی ہے جو خوف کی وجہ سے دور رہے یا کسی طمع میں قریب آ جائے۔

خبر سن کر اب کوئی جواب دینے والا نہیں ہے اور نہ کوئی ایسا ہے کہ تو اسے پکارے تو وہ تمہاری پکار سن لے۔

اگر انسان کو اپنے انجام کی فکر ہوتی تو اس کے اخلاق حرص اور طمع سے کبھی ملوث نہ ہوتے)

## اسماعیل صبری (م ۱۹۲۳)

اسماعیل صبری مصر میں پیدا ہوا۔ اور مدارس میں تعلیم کے مختلف مرحلوں سے گزرنے کے بعد "مدرسة الادارة" تک جا پہنچا جو بعد میں قانون کی تعلیم کا مدرسہ بن گیا۔ وہ جب اٹھارہ سال کا ہوا تو ان دنوں طلبہ کا ایک رسالہ "روضة المدارس" شائع ہونے لگا' جس میں رفاعہ بک' شیخ حسین مرصفی (بارودی کے استاد) اور عبداللہ فکری جیسے اکابر ادباء لکھتے تھے۔ صبری اس رسالے کے مطالعے میں دلچسپی لیتا رہا اور جب وہ کچھ نظمیں کہنے کے قابل ہوا تو اس رسالے میں چھپنے بھی لگا۔ اس کے بعد وہ فرانس چلا گیا' جہاں اس نے اپنی قانون کی تعلیم مکمل کی۔ واپس آ کر اس نے محکمہ انصاف میں ملازمت اختیار کی۔ اور اس میں ترقی کرتے کرتے پہلے النائب العام (پبلک پراسیکیوٹر) کے عہدے تک پہنچا اور اس کے بعد وہ انتظامی شعبے میں منتقل ہو کر سکندریہ کا گورنر لگ گیا۔ پھر وہ محکمہ انصاف کا سیکرٹری تعینات ہوا اور ساٹھ برس کی عمر کو پہنچ کر اس سے ریٹائر ہو گیا۔

ملازمت سے فارغ ہونے کے بعد اسماعیل صبری گھر میں مقیم ہو گیا۔ جہاں وہ آنے والوں کے ساتھ ادب اور شاعری کے موضوع پر گفتگو کرتا' اور اپنے افکار و احساسات کو شعروں میں ڈھال کر ان کے سامنے پیش کرتا۔ رفتہ رفتہ اس کا گھر ادب وفن کا ایک مرکز بن گیا' جہاں شاعر لوگ آ کر اپنا کلام سناتے اور وہ اس پر ایک ناقد کی حیثیت سے اپنی رائے دیتا اور اس کی اصلاح اور تہذیب کرتا۔ اس سے لوگ اسے استاد ماننے لگے اور شعر و ادب میں اسے اولیت کا مقام دینے لگے۔ پھر وہ دل کے عارضے میں مبتلا ہو گیا' جس کا اس نے کچھ عرصہ مقابلہ کیا' اور آخر ۶۹ برس کی عمر میں اس بیماری میں انتقال کیا۔

اسماعیل صبری میں شعر کہنے کا ملکہ فطری تھا جس سے وہ جوانی میں ہی شعر کہنے لگ گیا۔ فرانس کی تعلیم نے اس کی صلاحیتوں اور اس کی فکر و احساس کو جلا بخشی۔ چنانچہ اس کا ملکہ شعری پختہ ہوا اور اس کی شاعری میں لطافت' حسن اور ایجاز کی اعلیٰ ترین خوبیاں پیدا ہو گئیں' اور وہ اپنے معاصر شعراء میں سب سے ممتاز نظر آنے لگا۔ اللہ نے اس کو ذوق سلیم اور موسیقی سے آشنا کان عطا کیے تھے۔ وہ اپنی شاعری کے معاملے میں خود بڑا ناقد تھا اور اس میں کافی رد و بدل اور اصلاح کرتا رہتا تھا' اور جب تک وہ پوری طرح اس کے ذوق سلیم کو مطمئن نہ کر دیتی وہ اسے لوگوں کے سامنے پیش نہ کرتا۔ بقول مطران اسماعیل صبری صرف اس وقت شعر کہتا جب کوئی واقعہ اس کے دل پر اثر کرتا۔ یا کوئی خبر اس کو سوچنے پر مجبور کرتی' یا وہ کوئی اچھی کتاب پڑھ لیتا اور وہ جو کچھ بھی کہنا چاہتا چند شعروں میں ہی کہہ دیتا۔

غزل کے موضوع پر اس نے ایک نظم کہی جس کے بارے میں لوگوں کا خیال ہے کہ وہ دراصل تنی



کے بارے میں تھی۔ اس کے چند اشعار یوں ہیں:

ان ھذا الحسن کالماء الذی ۔۔۔ فیہ للانفس ری وشفاء

لاتذودی بعضنا من وردہ ۔۔۔ دون بعض و اعدلی بین الظماء

وابسمی من کان ھذا ثغرہ ۔۔۔ یملأ الدنیا ابتساماً و ازدھاء

(یہ حسن ایسا آب شیریں ہے جو روحوں کو سیراب کرتا اور انہیں شفا بخشتا ہے۔
اس پر وارد ہونے کے لئے ہم میں سے بعض کو نہ روکو' بلکہ سب پیاسوں کے درمیان انصاف کرو
اور مسکراؤ' اس لئے کہ جس کو خدا نے ایسا دہن دیا ہو وہ دنیا کو مسکراہٹوں اور فخر و ناز سے بھر دیتا ہے)

خدا کو مخاطب کر کے کہتا ہے:

یا عالم الاسرار حسبی محنة ۔۔۔ علمی بانک عالم الاسرار

اخلق برحمتک التی تسع الوری ۔۔۔ الا تضیق باعظم الاوزار

(اے رازوں کے جاننے والے میرے لیے یہ جاننا ہی بڑی آزمائش ہے کہ تو سب رازوں کا جاننے والا ہے
تمہاری رحمت جو پوری کائنات پر پھیلی ہوئی ہے اس سے یہی امید ہے کہ اس کا دامن بڑے گناہوں پر بھی پردہ ڈال دے گا)

## احمد شوقی (م ۱۹۳۲)

اپنے عہد کا مشہور ترین شاعر' جس کی شاعری بہت عمدہ خیال اور زرخیز فکر کا مرقع تھی۔ شعراء کا رہنما اور ان کا امیر' اور نئی ادبی بیداری کا امام اور قائد..... اس نے صغر سنی ہی سے شعر کہنے شروع کیے اور اس میں مہارت پیدا کر لی۔ اس نے شاعری کے تمام پہلوؤں اور موضوعات میں اپنے فن کے اعلیٰ نمونے پیش کئے۔ اس نے ہر مقصد کی خاطر شاعری کی اور اس میں کمال کا اظہار کیا۔ آخر میں اپنی شاعری میں کچھ ایسی نئی چیزیں داخل کیں' جن سے عربی شاعری آشنا نہیں تھی۔ مثلاً اس نے رزمیہ شاعری (Epic) میں "دول العرب" اور "وادی النیل" جیسی طویل نظمیں پیش کیں۔ پھر وہ تمثیلی شاعری کی طرف آیا اور اس میں مصرع کلیوپطرہ' مجنون لیلیٰ' قمبیز' علی الکبیر' عنترہ اور الست ھدی جیسے ڈرامے پیش کئے اور اس

تجدید کے ساتھ وہ گویا مکمل عربی شاعر بن گیا۔ شاعری میں یہ جدتیں نہ اس سے پہلے کسی شاعر نے کی تھیں اور نہ اس کے بعد آنے والے شعراء اس معیار پر پورا اتر سکے۔ اس کے معاصر شعراء نے اس کی اس سبقت اور بلند مرتبے کا اعتراف کیا اور دور دور کے ممالک سے چل کر اس کے پاس آئے۔ اس کی تکریم کی اور اس کے ہاتھ پر بیعت کی۔ اس موقع پر ایک بڑے جلسے میں اس کے دوست اور دست راست حافظ ابراہیم نے کہا:

امیر القوافی قد اتیت مبایعاً　　　　وھذی وفود الشرق قد بایعت معی

(اے قوافی کے بادشاہ! میں تمہارے ہاتھ پر بیعت کرنے آیا ہوں اور بلادِ مشرق کے یہ سارے وفد بھی میرے ساتھ بیعت میں شامل ہیں)

احمد شوقی قاہرہ میں پیدا ہوا اور وہیں پلا بڑھا۔ اس کے والد نے اپنی آبائی جائیداد ضائع کر دی تو شوقی کو اس کی نانی نے پالا' جو خدیو اسماعیل کے محل میں خاص خادمہ تھی۔ ابتدائی تعلیم کے بعد اس نے دو سال مدرسۃ الحقوق (قانون کے مدرسے) میں گزارے۔ پھر خدیو توفیق نے اسے قانون اور ادب کی تعلیم کے لئے فرانس بھیج دیا' جہاں دو سال اس نے مونٹپلیے اور دو سال پیرس میں تعلیم حاصل کی۔ واپس آ کر اس نے خدیو کی مصاحبت اختیار کر لی۔ پہلی جنگ عظیم میں انگریزوں نے خدیو کو مصر کی حکومت سے معزول کر دیا تو شوقی سے بھی ملک چھوڑنے کے لئے کہا گیا۔ اس نے سپین میں بارسلونا کو اپنے اور اپنے اہل و عیال کے قیام کے لئے منتخب کیا۔ امن قائم ہونے پر وہ مصر واپس آ گیا۔ اب اس نے بجائے محلات سے تعلق رکھنے اور ان کے لئے شعر کہنے کے' عوام کی طرف توجہ کی اور اپنی شاعری اور نغموں سے ان کے شعور کی ترجمانی کی' ان کے تاریخی کارناموں کو سراہا اور ان کی جدوجہد کی تائید کی۔ اس سے نہ صرف مصر بلکہ پوری دنیائے عرب نے اس کی شاعری اور اس کے عظیم مقاصد کا خیر مقدم کیا۔ چنانچہ اس کے اعزاز میں مصر کے شاہی اوپیرا میں بہت بڑا جلسہ منعقد ہوا جس میں مصر اور باہر کے عرب ملکوں سے وفود آ کر اس میں شامل ہوئے۔ شوقی اسی طرح شاعری میں وحی و الہام سے سرفراز ہوتا رہا۔ تا آنکہ ۱۹۳۲ء میں اسے موت کا پیغام آ گیا۔

**شاعری:** معانی' اسلوب اور ہیئت' شاعری کے ان بنیادی ارکان میں سے ہر ایک میں شوقی نے ایسے تجربے کیے جن کی مثال اس سے پہلے کی شاعری میں نہیں ملتی۔ جس زمانے میں اقبال سرزمین اندلس کے ایک مقام پر کھڑا ماضی کے تصور میں کھو گیا تھا۔

آبِ روانِ کبیر! تیرے کنارے کوئی　　　　دیکھ رہا ہے کسی اور زمانے کا خواب



تقریباً اسی زمانے میں شوقی دمشق کی تازہ تباہی کو دیکھ کر کہہ رہا تھا:

بالامس کنت علی الزھراء اندبھم　　　　والیوم دمعی علی الفیحاء ھتان

(کل میں اندلس کے قصرِ زہرا میں کھڑا اسلاف کا نوحہ کرتا تھا اور آج میری آنکھیں دمشق کی زبوں حالی پر اشک بار ہیں)

عربی شاعری میں مدح اور قصیدہ گوئی اس سے پہلے سلاطین و امراء کے لئے خاص ہوتی تھی' اور مرثیے اور نوحے بھی افراد و شخصیات کے لئے کہے جاتے تھے۔ لیکن یہ شہر آشوب اور قوموں اور رہنماؤں کے نوحے اور قصیدے اس قومی و وطنی شاعری کا عنصر بنے جسے شوقی اور اس کے معاصرین نے آ کر رواج دیا۔ اپنے اسی قصیدے کے مقطع میں شاعر کہتا ہے:

والشعر مالم یکن ذکری و عاطفۃ　　　　او حکمۃ' فھو تقطیع و اوزان

(شاعری میں جب تک یادِ ماضی نہ ہو' جذب اور تڑپ نہ ہو' حکمت و دانائی کی باتیں نہ ہوں تو وہ شاعری کیا ہوئی۔ ایک عروضی مشق کی صورت ہی رہی)

یہ تین چیزیں' یعنی یادِ ایام' جوشِ جذبات اور حوادثِ زمانہ سے عبرت پذیری گویا اس قومی و وطنی شاعری کے اجزائے ترکیبی ٹھہرے جس کا سرخیل شوقی تھا۔

شوقی اپنے پہلے دور میں مصری قومیت کا شاعر تھا۔ لیکن اپنی شاعری کے دوسرے دور میں۔ یعنی یورپ کی جلاوطنی سے واپس آ کر وہ اس مقامیت سے بلند ہو کر شرقِ اوسط کا شاعر بن جاتا ہے' اور اہلِ مشرق کے پرشوکت ماضی اور ان کے عظیم اسلاف کے گن گا گا کر انہیں اس بات پر ابھارتا ہے کہ وہ مغرب کے مقابلے میں اپنے آپ کو ہیچ نہ جانیں' بلکہ اٹھ کر آزادی اور ترقی کی راہ میں دوسری قوموں کے ہم قدم چلنے کی کوشش کریں۔ مشرق کا اتحاد اور مشرقیت' یہ شوقی کا نعرہ تھا' اگرچہ اس کے سے شاعرانہ مخلص کے تذکرے میں "نعرے" کا لفظ کچھ سستا سا لگتا ہے۔ اپنے ایک قصیدے میں وہ شامیوں سے خطاب کرتے ہوئے کہتا ہے۔

نصحت و نحن مختلفون داراً　　　　ولکن کلنا فی الھم شرق

(میں نے یہ خیر خواہی کی باتیں کی ہیں' دراں حالے کہ ہمارے وطن ایک نہیں ہیں' لیکن ہم سب اپنے دکھ درد میں مشرقی تو ہیں)

غور کیجئے تو یہ ایک محدود دائرے میں وہی احساس ہے جو آج کی افریشیائی تحریک کے پیچھے کارفرما نظر آتا ہے۔

عربی شاعری کے موضوع اور ہیئت کے باب میں شوقی کے تجربے اس سے بھی زیادہ اہم تھے۔ اس نے اپنے تخلیقی سرمائے سے عربی شاعری کے اس بڑے نقص کی تلافی کی جو اس میں شاعری کی دو اہم اصناف یعنی رزمیہ نظم اور منظوم تمثیل کے نہ ہونے کی وجہ سے پایا جاتا تھا۔ دنیا کی ہر بڑی اور مکمل شاعری میں ان دونوں اصناف کے اچھے نمونے ضرور دیکھنے میں آتے ہیں۔ لیکن شوقی سے پہلے عربی شاعری ان دونوں اصناف سے بالکل تہی دامن تھی۔ جیسا کہ اوپر ذکر ہوا شوقی نے آ کر "وادی النیل" اور "دول العرب" جیسی طویل نظمیں کہیں۔ ان میں سے اول الذکر کے اندر وہ مصر میں عہد فراعنہ سے لے کر اپنے زمانے تک کے بڑے بڑے واقعات کو منظوم داستان کی ایک لڑی میں پروتا چلا جاتا ہے اور عربی میں ہر لحاظ سے ایک کامیاب شاہ نامہ (Epic) پیش کرتا ہے۔ اسی طرح منظوم ڈرامے میں بھی شوقی نے متعدد فن پارے عربی زبان کو دیے۔ "قلوپطرہ کا زوال" "مجنون لیلیٰ" "علی الکبیر" اور "عنترہ" اس سلسلے کے کچھ مقبول نام ہیں۔

شاعری کے کچھ نمونے: اپنی ایک نظم میں شوقی دمشق کا وصف بیان کرتے ہوئے کہتا ہے۔

آمنت باللہ و استثنیت جنته        دمشق روح و جنات و ریحان

قال الرفاق و قدجت خمائلہا        الارض دار' لہا (الفیحاء) بستان

جری و صفق یلقانا بہا (بردی)        کما تلقاک دون الخلد رضوان

دخلتہا وحواشیہا زمردۃ        والشمس فوق لجین الماء عقیان

والحور فی (دمر) اوحول (ھامتہا)        حور کواشف عن ساق وولدان

و (ربوۃ) الوادفی جلباب راقصۃ        الساق کاسیۃ والنحر عریان

(میں اللہ پر ایمان لایا ہوں اور اس کی جنت کو مستثنیٰ کر کے کہتا ہوں کہ دمشق نسیم کا جھونکا ہے' باغات ہیں اور معطر سبزہ ہے۔

جب اس کے گھنے باغ لہرا کر سامنے آئے تو ساتھیوں نے کہا یوں سمجھو کہ زمین ایک حویلی ہے۔ جس میں فیحاء (دمشق) ایک گلستان ہے۔

اس میں بردی کی نہر جاری تھی جس سے ہمارا اس طرح سامنا ہوا جیسے تم خلد میں داخل ہونے سے پہلے رضوان سے ملو۔

میں اس میں داخل ہوا تو دیکھا کہ اس کے اطراف زمرد کی طرح سبز ہیں اور سورج پانی کی چاندی کے اوپر سونے کی طرح دمکتا ہے۔ اور اس کے مضافات دمر اور ہامہ میں سرو کے درخت یوں کھڑے ہیں جیسے پنڈلیاں ننگی کیے جنت کی حوریں ہوں اور غلمان ہوں۔



اور وادی کا مقام ربوہ ایک رقاصہ کا لباس پہنے ہوئے لگتا ہے جس کی پنڈلی تو ڈھکی ہوئی ہے لیکن سینہ ننگا ہے)

غزل کے موضوع پر شوقی کہتا ہے۔

اللہ فی الخلق من صب ومن عانی        تفنی القلوب و یبقی قلبک الجانی

صونی جمالک عنا إننا بشر        من التراب' وھذا الحسن روحانی

او فابتغی فلکاً تاویہ ملکا        لم یتخذ شرکاً فی العالم الفانی

اذا تبسم ابدی الکون زینتہ        وان تنفس ابدی طیب ریحان

(مخلوق خدا میں جو عاشق اور مجبور ہیں ان کے بارے میں خدا سے ڈرو۔ ان کے دل تو فنا ہو جاتے ہیں اور تمہارا ظالم دل باقی رہتا ہے۔

اپنے حسن کو ہم سے بچا کے رکھو کہ ہم مٹی سے بنے ہوئے انسان ہیں۔ جبکہ تمہارا یہ حسن سراسر روحانی ہے۔

یا پھر کسی فلک میں پہنچ کر ایسے فرشتے کی طرح رہو' جو اس عالم فانی میں کسی طرح کے پھندے میں نہیں الجھا۔

وہ جب ہنستا ہے تو یہ کائنات اس کے حسن کا اظہار بن جاتی ہے اور جب وہ سانس لیتا ہے تو دنیا پھولوں کی مہک سے بھر جاتی ہے)

شوقی کے بعض اشعار جو ضرب المثل کی طرح مشہور ہو گئے:

وانما الامم الاخلاق ما بقیت        فان ھم ذھبت اخلاقھم ذھبوا

(قومیں اپنے اخلاق کی بدولت ہی زندہ رہتی ہیں۔ جب ان کے اخلاق نہ رہیں تو وہ بھی مٹ جاتی ہیں)

واذا اصیب القوم فی اخلاقھم        فاقم علیھم ماتماً وعویلا

(کسی قوم کے اخلاق ہی بگڑ جائیں تو پھر اس کے لئے ماتم اور گریہ وزاری کا اہتمام کرو)

اعلمت اشرف او اجل من الذی        یبنی وینشی انفساً و عقولا

قم للمعلم وفہ التبجیلا        کاد المعلم ان یکون رسولا

(کیا تم نے ایک ایسے شخص سے زیادہ عزت و شرف والا انسان دیکھا ہے جو انسانی نفوس اور ذہنوں کی تعمیر کرتا اور انہیں پروان چڑھاتا ہے۔



Scanned with CamScanner

استاد آ جائے تو اٹھ کر اس کی تعظیم بجا لاؤ۔ اس لئے کہ استاد کا مرتبہ رسول کے قریب قریب جا پہنچتا ہے۔)

## حافظ ابراہیم (م ۱۹۳۲)

حافظ ابراہیم ان پانچ بڑے شعراء میں سے ہے جن کے ہاتھوں عربی شاعری کا احیاء اور تجدید عمل میں آئی۔ دوسرے شاعر بارودی، شوقی، صبری اور خلیل مطران تھے۔ وہ مصر میں اسیوط کے علاقے میں پیدا ہوا۔ ابھی دو سال کا تھا کہ والد کا سایہ اس کے سر سے اٹھ گیا۔ اس کی ماں اسے قاہرہ لے آئی۔ یہاں اسکے ماموں نے اس کی کفالت کی، اور وہ نچلے درجے کے مختلف مدارس میں تعلیم پاتا رہا۔ اس کا ماموں پھر اسے طنطا لے گیا جہاں ابراہیم نے کچھ سال بے کاری میں گزارے۔ اس زمانے میں وہ صرف مطالعہ کرتا رہتا یا شاعری سے دل بہلاتا۔ حافظ ابراہیم کے ذہن پر یتیمی اور مایوسی کا جو اثر شروع دن سے پڑا وہ کبھی زائل نہ ہوا۔ چنانچہ وہ زندگی سے بیزار رہنے لگا اور لوگوں کے ساتھ میل جول میں اسے کوئی دلچسپی نہ رہی۔ وہ اپنی تقدیر کا شکوہ کرتا اور ان دنوں وہ جو شعر بھی کہتا وہ اس کی اس نفسی کیفیت کا ترجمان ہوتا۔ آگے چل کر اسے عسکری مدرسے میں داخل ہونے کا موقع ملا۔ اس میں تعلیم پا کر وہ فوج کا سپاہی بن گیا۔ فوج سے وہ پولیس کے محکمے میں منتقل ہوا۔ اور ایک دفعہ پھر فوج میں چلا گیا، جہاں اس کی ڈیوٹی سوڈان میں لگی۔ سوڈان پر مصر نے لارڈ کچنر کی قیادت میں حملہ کیا تھا۔ حافظ ابراہیم کافی عرصہ سوڈان میں سخت بیزاری کی حالت میں رہا اور مصر واپس آنے کی کوشش کرتا رہا۔ جب وہ اس میں ناکام ہوا تو دوسرے فوجیوں کے ساتھ وہ بھی بغاوت میں شریک ہو گیا۔ جس کی وجہ سے اس پر مقدمہ چلا اور پہلے تو اس کی تنخواہ آدھی کر دی گئی اور اس کے بعد اسے پنشن پر بھیج دیا گیا۔

واپس آ کر حافظ کی زندگی ایک بے معنی انداز میں گزرنے لگی۔ دن کو وہ ایک قہوہ خانے سے اٹھ کر دوسرے قہوہ خانے میں جا بیٹھتا اور راتوں کو مختلف مجالس میں شریک ہوتا رہتا۔ اسی زمانے میں وہ شیخ محمد عبدہ کی مجلس ارشاد میں بھی جانے لگا۔ اس حلقے کے لوگ چونکہ ان دنوں انگریزوں سے کچھ امیدیں وابستہ کرنے لگے تھے حافظ ابراہیم نے ملکہ وکٹوریہ کا مرثیہ کہا اور ایک نظم ایڈورڈ ہفتم کی تاجپوشی پر اور ایک لارڈ کرومر کو الوداع کہنے کے لئے کہی۔ لیکن اس کے بعد اس نے اپنی شاعری کو قوم کے لئے وقف کر دیا۔ شیخ محمد عبدہ کے قرب اور اس کے اثر و رسوخ سے اسے یہ فائدہ ہوا کہ حشمت پاشا وزیر تعلیم نے اسے مصری لائبریری کے ادبی حصے کا سربراہ مقرر کر دیا۔ پھر وہ اس لائبریری کا ڈائریکٹر تعینات ہوا اور اس



عہدے پر رہ کر ۱۹۳۲ء میں ریٹائر ہوا اور اسی سال فوت بھی ہو گیا۔

**شاعری:** حافظ ابراہیم اپنے زمانے میں اول درجے کا شاعر مانا جاتا تھا۔ وہ بات کا سچا اور خیر اندیش انسان تھا۔ اس کی شاعری فصیح الفاظ، پرشکوہ عبارت، محکم بنت، خوبصورت اور درخشاں طرز سخن اور مضبوط قوافی کا ایک عمدہ امتزاج تھی۔ شاعری کے لئے حافظ کے کان بہت حساس تھے اور وہ خوبصورت شاعری کا بہت اعلیٰ ذوق رکھتا تھا۔ اسے عربی ادب کے سب پچھلے زمانوں کے اتنے منتخب اور بہترین اشعار یاد تھے کہ اس میں کوئی بھی اس کے ساتھ شانہ ملا کے کھڑا نہیں ہو سکتا تھا۔ وہ ان شعراء میں سے تھا جو شعر کی رونق اور الفاظ کے حسن کو سب سے زیادہ اہمیت دیتے ہیں اور معانی و مضامین کی اہمیت ان کے نزدیک ثانوی ہوتی ہے۔ چنانچہ حافظ اپنے شعروں کے الفاظ کی تراش خراش اور محاورہ اور بندش کی چستی پر زیادہ توجہ دیتا تھا اور جب وہ شعر کہنے کا ارادہ کرتا تو ان آراء و افکار کی طرف متوجہ ہوتا جو اس وقت لوگوں کے ذہنوں پر چھائے ہوئے ہوتے، یا معاشرے میں گردش کر رہے ہوتے، یا اخبارات کے کالموں کا موضوع ہوتے۔ وہ ان پر کچھ عرصہ اپنے انداز میں سوچ بچار کرتا رہتا، اور پھر اپنے خوبصورت اور چست شعری اسلوب میں ڈھال کر دنیا کے سامنے لے آتا۔ چنانچہ سیاسی اور معاشرتی حالات، زندگی کے مختلف مظاہر، غلط قسم کی روایات و رسومات حافظ ابراہیم کی شاعری کا غالب موضوع بنی رہیں۔ حافظ کا دیوان تین جلدوں میں شائع ہوا۔ اس کے علاوہ اس نے کچھ نثری کتابیں بھی لکھیں۔ لیکن ان کی زیادہ اہمیت نہیں ہے۔

**نمونہ کلام:** عربی زبان شکوہ کناں ہے کہ اسے اپنے لوگوں نے جائز مقام نہیں دیا۔ حافظ اس کی زبان سے کہتا ہے۔

رجعتُ لنفسی فاتهمت حصاتی — وناديت قومی فاحتسبت حياتی
رمونی بعقم الشباب وليتنی — عقمت فلم اجزع لقول عداتی
ولدت ولما لم اجد لعرائسی — رجالاً واكفاء وادت بناتی
وسعت كتاب الله لفظا و غاية — وما ضقت عن آی به وعظات
فكيف اضيق اليوم عن وصف آلة — وتنسيق اسماء لمخترعات
اری لرجال الغرب عزا ومنعة — وكم عز اقوام بعز لغات
اتوا اهلهم بالمعجزات تفنناً — فيا ليتكم تاتون بالكلمات



Scanned with CamScanner

(میں نے اپنے آپ کی طرف رجوع کیا اور اپنی عقل پر تہمت لگائی۔ میں نے اپنی قوم کو پکارا اور ساتھ ہی اپنی زندگی کا حساب لیا
انہوں نے مجھے بے ثمر جوانی کا صدمہ دیا۔ کاش میں واقعی بانجھ اور بے ثمر ہوتی اور اپنے دشمنوں کی بات سن کر پریشان نہ ہوتی۔
میں نے بیٹیاں جنیں اور جب دیکھا کہ میری ان دلہنوں کے لئے موزوں بر نہیں ملتے تو میں نے انہیں دفن کر دیا۔
میں نے کتاب اللہ کے الفاظ اور مقاصد کو اپنے دامن میں لیا' اور اس کی آیات اور نصائح کے لئے میرا دامن کبھی تنگ نہ ہوا۔
تو آج میں کیسے کسی آلے کے وصف سے' یا نئی ایجادات کے نام مرتب کرنے میں پیچھے رہ سکتی ہوں۔
میں اہل مغرب میں عزت اور طاقت دیکھتی ہوں۔ اپنی زبان کو عزت بخش کر قومیں کیسے خود بھی باعزت ہو جاتی ہیں۔
وہ اپنے لوگوں کے لئے کیا کیا معجزات لے کے آئے' کاش آپ لوگ الفاظ ہی بنا پاتے)

ایک اور نظم میں حافظ عورتوں کے موضوع پر کہتا ہے:

من لی بتربیة النساء فانها — فی الشرق علة ذلک الاخفاق
الام مدرسة اذا اعددتها — اعددت شعبا طیب الاعراق
فلا اقول دعوا النساء سوافرا — بین الرجال یجلن فی الاسواق
یدرجن حیث اردن لا من وازع — یحذرن رقبته ولا من واق
کلا ولا ادعوکم ان تسرفوا — فی الحجب و التضییق والا رهاق
فتوسطوا بین الحالتین وانصفوا — فالشر فی التقیید و الاطلاق
ربوا البنات علی الفضیلة انها — فی الموقفین لهن خیر وثاق

(کون ہے جو عورتوں کی تربیت کا ذمہ لے' اس لئے کہ عورت ہی مشرق میں ساری ناکامی کا سبب ہے۔
ماں ایک درسگاہ ہوتی ہے۔ اگر تم اسے تیار کرو تو تم ایک ایسی نسل تیار کرو گے جس کی اصل صحیح اور پاکیزہ ہوگی۔
میں نہیں کہتا کہ عورتوں کو مردوں کے درمیان بے پردہ چھوڑ دو کہ وہ بازاروں میں گھومتی پھریں۔
جہاں بھی چاہیں پہنچ جائیں' نہ کسی کی گرفتاری کا ان کو ڈر ہو اور نہ کسی حفاظت کرنے والے کا خیال۔
بالکل نہیں' لیکن میں آپ سے یہ بھی نہیں کہتا کہ آپ اس کے پردے میں اسراف سے کام لیں



اور زندگی اس کے لئے تنگ اور مشکل بنا دیں۔
پس آپ ان دونوں حالتوں کے بین بین رہیں اور انصاف سے کام لیں' اس لئے کہ ساری خرابی بالکل قید کر کے رکھنے اور بالکل کھلا چھوڑ دینے میں ہے۔
بیٹیوں کو نیکی کی تربیت دیں کہ یہ ان کے لئے دونو حالتوں میں ایک اچھی روک ثابت ہوگی۔)

## جمیل صدقی الزہاوی (م ۱۹۳۶)

### علم کا شاعر

عراق کے دو بڑے اور اہم شاعروں میں سے ایک' دوسرا شاعر معروف الرصافی تھا۔ ان دونوں کا لوگ اسی طرح مقابلہ و موازنہ کرتے تھے جس طرح مصر میں احمد شوقی اور حافظ ابراہیم کا کرتے تھے۔

یہ عراق کے کرد خاندان سے تھا۔ اس کے والد اور بڑے بھائی دینی علوم اور فقہ اور قضاء سے متعلق تھے۔ انہوں نے چاہا کہ زہاوی بھی انہی کی طرح ان علوم سے سروکار رکھے اور عربی ادب اور شاعری کی طرف نہ جائے۔ لیکن زہاوی نے شاعری اور فلسفے سے شغف رکھا اور زندگی میں ان لوگوں سے مختلف راستہ نکالا۔ اس نے جدید طرز کی تعلیم تو حاصل نہ کی لیکن ترکی اور عربی زبانوں میں ترجموں کی وساطت سے اسے آزاد خیالی اور جدید سائنسی طرز فکر سے خاصی دلچسپی پیدا ہو گئی' جو ساری عمر اس کے ساتھ رہی۔ زہاوی اگرچہ کوئی یورپی زبان نہیں جانتا تھا' لیکن اس نے ترکی اور فارسی زبانوں میں مہارت حاصل کی تھی اور اس سے کام لے کر اس نے عمر خیام کی رباعیات کا عربی میں ترجمہ کیا۔

زہاوی نے عام شعراء کی طرح اپنی زندگی بے کاری میں نہ گزاری' بلکہ وہ ہمیشہ کچھ اہم امور سرانجام دیتا رہا۔ شروع میں بغداد کی تعلیمی کمیٹی کا رکن مقرر ہوا' پھر اسے سرکاری چھاپے خانے کا منتظم بنایا گیا۔ اس کے بعد وہ ایک سرکاری رسالے کو ایڈٹ کرنے پر مامور ہوا۔ آگے چل کر وہ کورٹ آف اپیل کا رکن منتخب ہوا۔ زہاوی کی شہرت کا سن کر ترک خلیفہ نے اسے آستانہ بلا بھیجا۔ لیکن اس کے تنقیدی رویے نے اسے زیادہ دیر وہاں نہ ٹکنے دیا۔ پھر جب عثمانی دستور کا اعلان ہوا تو پہلے تو وہ سرکاری ادارے میں اسلامی فلسفے کا مدرس مقرر ہوا۔ پھر دارالفنون میں عربی ادبیات کا مدرس تعینات ہوا۔ جب وہ بغداد واپس آیا تو قانون کے مدرسے میں اسے شریعت کا استاد لگایا گیا۔ اور آخر میں وہ عراق کی پارلیمنٹ کا ایک رکن منتخب ہوا۔ ان مختلف مناصب پر رہنے اور مختلف نوعیت کے فرائض انجام دینے کے باوجود زہاوی نے شاعری اور


Scanned with CamScanner

مطالعے کے ساتھ اپنے شغف میں کوئی کمی نہ آنے دی۔ اس کے زمانے میں سیاسی تبدیلیاں ہوتی رہیں۔ پہلی جنگ عظیم میں ترکوں کو شکست ہوئی اور عراق میں فیصل کی بادشاہت قائم ہوئی۔ تاہم زہاوی اور اس کی طرح کے سوچنے' سمجھنے اور شاعری کرنے والے لوگ ان سیاسی ہنگاموں سے الگ تھلگ رہے۔ کچھ عرصے کے لئے شاہ فیصل اول نے اسے مجلس اعیان کا ممبر مقرر کیا' لیکن اپنی شاعری کے جرات مندانہ لہجے اور اپنی رائے کے کھلے اظہار کے باعث وہ زیادہ عرصہ وہاں نہ رہ سکا۔ جس کا اسے بعد میں افسوس رہا۔ اور وہ ۱۹۳۶ء میں بغداد میں فوت ہو گیا۔

جمیل صدقی الزہاوی کی ایک بڑی خصوصیت یہ ہے کہ اس نے اپنی شاعری کو تعلیم کا ذریعہ بنایا۔ اس نے اپنی جوانی میں علوم طبعیہ اور فلسفے کا جو مطالعہ کیا تھا' اپنی تیز ذہانت کے طفیل وہ ان علوم کی گہرائی میں اترا' اور وہاں اسے جو کچھ حاصل ہوا اس پر اس نے کتابیں لکھیں' اور یہی نہیں بلکہ ان علوم کو اپنی شاعری کا موضوع بھی بنایا۔ چنانچہ اس نے دو کتابیں "الکائنات" اور "تعلیل الجاذبیۃ" کے نام سے لکھیں۔ اس طرح اس کے ہاں شاعری صرف جذبہ و احساس کا اظہار نہ رہی' بلکہ یہ جدید فکر اور اس کی علمی معلومات کا اظہار بھی بن گئی۔ اپنی نظم "سماحۃ العقل" میں وہ زمین' سورج اور کائنات کے اس نظام کے بارے میں خالص سائنسی انداز میں بات کرتا ہے:

| | |
|---|---|
| لا تقبل الاجرام عداً | کلا ولا الابعاد حداً |
| العقل یرجع خائباً | عنها وان لم یال جهداً |

(اجرام فلکی کا احصاء ممکن نہیں ہے اور نہ ان کے درمیان فاصلوں کی کوئی حد ہے
عقل جب ان کے بارے میں سوچتی ہے تو نامراد لوٹتی ہے۔ اگرچہ وہ اپنی اس کوشش میں کوئی کمی نہیں کرتی)

زمین کی گردش کے بارے میں کہتا ہے:

| | |
|---|---|
| فتطوف مثل فراشة | لاقت بجنح اللیل وقداً |
| و بدور محورها توجه | نحو نور الشمس خدا |
| لولا دلیل الجذب ما | ملکت بهذا السعی رشدا |

(پس زمین ایک پتنگے کی طرح طواف کرتی ہے جس نے رات کے ایک حصے میں آگ پالی ہو۔
اور اپنے محور کے گرد گھومتی ہے' اپنا چہرہ سورج کی روشنی کی طرف رکھتے ہوئے۔
اگر کشش ثقل کی رہنمائی نہ ہوتی تو اپنی اس حرکت میں وہ سیدھی راہ نہ پا سکتی)



اسی طرح اپنی ایک اور نظم "سلیل القرد" (بندر کی اولاد) میں وہ ڈاروِن کے نظریہ ارتقا کی بات کرتا ہے۔ جس کے بارے میں اس کا خیال تھا کہ یہ بدیہیات میں شامل ہو چکا ہے۔ اس لئے اس پر بحث کرنا بے سود ہے۔ کہتا ہے:

| | |
|---|---|
| عاش فی الغاب القرد دهرا طویلا | قبل ان یلتقی للترقی سبیلا |
| ولد القرد قبل ملیون عام | بشراً فارتقی قلیلا قلیلا |
| ای شیء الم بالقرد حتی | هجر الغاب نجله والقبیلا |
| انه لولا العقل کان ضعیفا | وعلیه الحیاة عبئاً ثقیلا |
| وعلی رجلیه مشی بعدان سار | علی اربع زمنا طویلا |

(جنگل میں بندر ایک طویل عرصے تک رہا۔ پیشتر اس سے کہ اسے ترقی کا راستہ ملتا
بندر دس لاکھ سال پہلے پیدا ہوا۔ ایک انسان کی صورت میں اور آہستہ آہستہ ترقی کرتا رہا
کس چیز نے بندر کو مجبور کیا کہ وہ جنگل کو چھوڑ دے اور اپنی اولاد اور قبیلے سے دور ہو جائے؟
اگر عقل نہ ہوتی تو وہ کمزور ہوتا اور زندگی اس کے لئے ایک بھاری بوجھ ہوتی
آخر وہ دو ٹانگوں پر چلنے لگا' بعد اس کے کہ وہ ایک طویل زمانہ چار ٹانگوں پر چلتا رہا تھا)

زہاوی کا سب سے بڑا کام اس کی طویل نظم "ثورۃ فی الجحیم" ہے' جسے وہ خود بھی اپنی بہترین تخلیق قرار دیتا تھا اور اس کے زمانے کے دوسرے شعراء بھی۔ اس نظم کا خیال اس نے معری کے "رسالۃ الغفران" سے لیا' اور اسی طرح کی ایک نفیس تخلیق کی۔ اس نظم میں شاعر نے ایک مختصر اور پرزور طریقے پر اپنا سارا فلسفہ حیات بیان کر دیا ہے' اور بتایا ہے کہ اسے عقل پر اور انسان کی عزت و حرمت پر کامل یقین ہے۔ نیز وہ ہر قسم کے توہمات کو رد کرتا ہے۔ زہاوی نے عورتوں کے حقوق کے بارے میں بھی ایک مضمون لکھا اور اسے مصری رسالے "المؤید" میں شائع کیا۔ اس مضمون کو پڑھ کر لوگ بہت بگڑ گئے۔ انہوں نے زہاوی پر الزام لگایا کہ اس نے شریعت پر حملہ کیا ہے اور عراق کے گورنر کے پاس پہنچ کر اسے قانون کے مدرسے (لاء سکول) کے استاد کی ملازمت سے برطرف کر دیا جائے۔ زہاوی کی ایک خود نوشت تحریر سے پتا چلتا ہے کہ شاہ فیصل نے اسے ملک الشعراء بنانے کا ارادہ ظاہر کیا تھا' جس کے ساتھ اچھی خاصی تنخواہ بھی ہوتی تھی۔ لیکن زہاوی اس پر آمادہ نہ ہوا۔ وہ ایک تنخواہ دار مدح کرنے والے شاعر کی سطح پر نہیں اترنا چاہتا تھا۔



Scanned with CamScanner

# معروف الرصافی (م ۱۹۴۵)

## انسانیت کا شاعر

عراقی شاعر اور ادیب' اپنی زندگی کے بیشتر حصے میں وہ تدریس کے شعبے سے منسلک رہا۔ عراق میں اس کے اور جمیل صدقی الزہاوی کے درمیان مقابلہ بازی اور ہجوگوئی کا سلسلہ چلتا رہتا تھا۔ رصافی امت مسلمہ کی حالت کی اصلاح اور عالم میں اس کا اتحاد چاہتا تھا۔ وہ اپنے "دیوان" کی وجہ سے مشہور ہوا۔ اس نے نثر میں بھی تصانیف کیں جن میں "نفح الطیب فی الخطابة و الخطب" اور "محاضرات فی الادب العربی" قابل ذکر ہیں۔

ایک عرب نقاد نے کہا کہ اگر رصافی جدید تعلیم سے بھی بہرہ ور ہوتا تو اس کا جو شعری ملکہ تھا اس سے وہ عرب شاعری کا رُخ ہی بدل دیتا۔ وہ ایک معمولی خاندان سے تھا۔ اس کا باپ پولیس میں ملازم تھا اور اکثر گھر سے دور رہتا۔ چنانچہ اس کی تربیت اس کی ماں نے کی۔ بغداد کے ایک قرآنی مدرسے میں ابتدائی تعلیم کے بعد وہ ایک فوجی سکول میں داخل ہوا۔ لیکن تین سال بعد تربیت مکمل کرنے سے پہلے ہی اسے چھوڑ دیا۔ اس کے بعد وہ بعض مذہبی مدارس میں جاتا رہا جہاں اس نے عربی زبان اور دوسرے روایتی مضامین کی تعلیم حاصل کی' اور ایک عرصہ محمود شکری الآلوسی کا شاگرد رہا۔ اس کے بعد اس نے بغداد کے ایک سرکاری سکول میں عربی کے استاد کے طور پر کام کیا اور یہاں ۱۹۰۸ تک رہا۔ عثمانی دستور کے اعلان کے بعد اسے استنبول بلایا گیا کہ ایک اخبار "سبیل الرشاد" کے مدیر کے فرائض انجام دے۔ استنبول میں بھی وہ عربی کا استاد رہا اور پھر عثمانی پارلیمنٹ میں عراق کے نمائندے کے طور پر اس کا رکن بھی رہا۔ استنبول میں اس کا قیام اس کی زندگی کا سب سے اچھا زمانہ تھا۔ یہیں اس نے ایک ترکی خاتون سے شادی بھی کی۔ جنگ عظیم کے خاتمے پر وہ استنبول کو چھوڑ کر بجائے بغداد آنے کے پہلے دمشق پہنچا اور بعدازاں یروشلم آ گیا' جہاں وہ معلمین کے ٹریننگ کالج میں عربی ادب کا استاد رہا۔ اس زمانے میں وہ ایک بڑی مایوسی سے دوچار ہوا۔ وہ یوں کہ شریف حسین نے جب عربوں کے نام پر عثمانیوں کے خلاف جنگ کا اعلان کیا تو رصافی نے جو پان اسلامزم کا حامی تھا شریف حسین کے اس رویے کی سخت مخالفت کی۔ اس چیز نے بغداد کے شاہ فیصل کو اس پر ناراض کر دیا۔

بالآخر ۱۹۲۱ میں وہ عراقی حکومت کی دعوت پر بغداد واپس آیا' اور اس کے بعد وہ تعلیم' سیاست اور صحافت کے میدانوں میں متعدد مناصب پر کام کرتا رہا۔ ۱۹۲۸ میں اس نے استاد کی ملازمت سے استعفیٰ



دے دیا اور ایک گمنامی کی زندگی بسر کرتا رہا۔ اپنی پنشن کی محدود آمدنی کو اس نے تمباکو کی ایک چھوٹی سی دکان کھول کر پورا کرنے کی کوشش کی۔ آخر میں وہ ایک تنہا اور نادار شخص کی حیثیت میں مر گیا۔

دنیا کے ادب اور شاعری میں انسانیت کے بارے میں بہت کچھ کہا گیا ہے۔ انسانیت کے ماننے والے چاہتے ہیں کہ اس دنیا میں باہمی روابط ایک ہی سطح پر ہوں۔ نہ کوئی سفید ہو' نہ سیاہ' نہ مشرقی ہو' نہ مغربی' نہ مسلم ہو نہ مسیحی! انسانیت عربی شاعری کا موضوع کبھی نہیں رہی' سوائے ابوالعلاء معری کی لزومیات کی شاعری کے' اس جدید زمانے میں جب عرب شعراء نے دیکھا کہ اہل یورپ نے عربی اور مشرقی قوموں کے سیاسی حقوق ماننے سے انکار کر دیا ہے۔ اور ان کی آزادی اور عزت کی بھی ان کی نگاہ میں کوئی قدر نہیں رہی' تو انھوں نے اپنی آزادی اور باعزت زندگی کے لئے آواز اٹھائی۔ ان کے ساتھ رصافی نے بھی کہا:

اذا لم يعش حراً بموطنه الفتى — فسمّ الفتى ميتاً و موطنه قبرا
اعيرني انى انتحلتك قبلة — او جه وجهي كل يوم لها عشرا

(اگر ایک شخص اپنے وطن میں بھی آزاد نہ ہو تو اسے مردہ قرار دو اور اس کے وطن کو قبر سمجھو۔
کیا یہ میری آزادی ہے کہ میں نے تمھیں قبلہ سمجھ لیا ہے جس کی طرف میں دن میں دس دفعہ اپنا رخ کرتا ہوں۔)

اس زمانے میں کچھ لوگوں نے دیکھا کہ ایک جماعت ہے جو مذہبی قومیت کی بات کرتی ہے' چنانچہ انھوں نے اسے ختم کرنے اور وہ دیوار توڑنے پر اصرار کیا جو ایک امت کے افراد کے درمیان تفرقہ پیدا کرے' خاص طور پر مسلمانوں اور عیسائیوں کے درمیان جو ایک ہی وطن سے تعلق رکھتے تھے۔ اس بارے میں رصافی نے کہا:

اما آن ان تنسى من القوم اضغان — فيبنى على اس المواخاة بنيان
اما آن ان يرمى التخاذل جانباً — فتكسب عزا بالتناصر اوطان
علام التعادي لاختلاف ديانة — وان التعادي في الديانة عدوان
اذا جمعتنا وحدة وطنية — فماذا علينا ان تعدد اديان

(کیا اب وقت نہیں آیا کہ لوگوں کے درمیان بغض اور کینہ ختم کر دیا جائے اور بھائی چارے کی بنیاد پر عمارت کھڑی کی جائے۔
کیا وقت نہیں آیا کہ ایک دوسرے سے دست کش ہونے کے رویے کو خیر باد کہا جائے اور ملک ایک دوسرے کے ساتھ کھڑے ہو کر عزت حاصل کریں۔

مذہب کے اختلاف پر یہ ایک دوسرے سے عداوت کیا معنی؟ مذہب کی بنا پر عداوت رکھنا تو زیادتی ہے۔
جب ہم سب کو ایک وطن کی وحدت نے جمع کر دیا ہے تو اگر مذہب مختلف بھی ہوں تو ہمیں اس سے کیا نقصان ہوگا؟)

رصافی کے کلام سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ اپنے لئے نہیں بلکہ اپنے ہم وطنوں کے لئے جینا چاہتا تھا اور اس سے بھی آگے بڑھ کر تمام انسانیت کے لئے۔ اس اعتبار سے رصافی کے دل میں نازک انسانی احساسات موجزن رہتے ہیں جو اس کے دیوان میں جگہ جگہ اظہار پاتے ہیں۔ وہ فقراء اور بے بس افراد کے ساتھ انسانی ہمدردی اور توجہ کا خواہاں تھا۔ اسی لئے وہ عورتوں کو ان کے حقوق دینے کی دعوت دیتا۔ وہ چاہتا تھا کہ عورت کے راستے سے وہ تمام رکاوٹیں دور کر دی جائیں جو اس کی ترقی اور اس کے اپنے پیروں پر کھڑے ہونے کی راہ میں حائل ہیں۔ وہ عورت کو طلاق دینے کا بہت مخالف تھا اور عورت کو اس کے قصور کے بغیر طلاق دینے کو اس کے لئے بہت اہانت کی بات سمجھتا تھا۔ اس کی نظم "المطلقة" (طلاق یافتہ عورت) اس سماجی برائی کے بارے میں بہت عمدہ نظم ہے۔ اس میں وہ کہتا ہے۔

| | |
|---|---|
| وطلقها على جهل ثلاثاً | كذلك يجهل الرجل الغضوب |
| وافتى بالطلاق طلاق بت | ذووفتيا تعصبهم عصيب |
| فبانت عنه لم تات الدنايا | ولم يعلق بها الذام المعيب |
| فظلت وهي باكية تنادي | بصوت منه ترتجف القلوب |

(مرد نے اس کو انجانے میں تین طلاقیں دے دیں' ایک مغلوب الغضب مرد اسی طرح انجان رہتا ہے۔
اس طلاق کے بائن ہونے کا ان لوگوں نے فتویٰ دیا جو عورت کے معاملے میں بہت سخت تعصب رکھتے ہیں۔
اس بے چاری سے اگرچہ کوئی برا فعل صادر نہ ہوا اور نہ اس میں کوئی عیب پایا گیا' لیکن وہ اپنے مرد سے الگ ہوگئی۔
وہ روتی رہی اور ایسی آواز سے انصاف کو پکارتی رہی جو دلوں کو ہلا کر رکھ دے۔)

یہ ہمدردی اور دلسوزی صرف مسلم بیواؤں اور یتیموں کے لئے ہی نہیں ہے' بلکہ ارمن قوم کے ان یتیم بچوں اور بیواؤں کے لئے بھی وہ اسی طرح کڑھتا ہے جن پر ترک قوم نے "ہلہ" کی سازش کے بعد ظلم کے پہاڑ توڑ دیے تھے۔ اپنی ایک اور نظم "ام الیتیم" (یتیم کی ماں) میں ماں مریم کو خطاب کرتے ہوئے



کہتا ہے۔

| | |
|---|---|
| امريم ان الله لاشک ناقم | من القوم في قتل النفوس المحرّم |
| فليس بدين كل ما يفعلونه | ولكنه جهل و سوء تفهم |

(اے مریم کوئی شک نہیں کہ اللہ ان لوگوں سے ضرور بدلہ لے گا جو جانوں کو بے جا قتل کرتے ہیں
اس لئے کہ جو کچھ وہ کرتے ہیں وہ دین نہیں ہے' بلکہ وہ جہالت ہے اور فہم و دانش کی خرابی ہے)

تاہم ان نظموں میں جذباتیت کچھ زیادہ ہی دکھائی دیتی ہے جو مصطفیٰ لطفی المنفلوطی کی درد بھری اور رلانے والی کہانیوں کی یاد دلاتی ہے۔ ایک دوسرے مصری شاعر حافظ ابراہیم کی طرح رصافی کو بھی قدرتی آفات کے بیان کرنے میں دلچسپی تھی۔ اس کے شعری مجموعے کے ایڈیٹر نے ایک الگ حصہ ان نظموں کے لئے رکھا تھا جو رصافی نے آتش زنی کے واقعات اور غربت اور ناداری سے متعلق سانحات پر لکھی تھیں۔ زہاوی کی طرح رصافی نے بھی عراقی شاعری کی زبان کو سادہ بنا دیا' خاص طور پر اپنی سیاسی اور معاشرتی نظموں میں۔ رصافی کے مرثیوں میں موضوع اور پیکر تراشی میں کچھ کچھ روایتی انداز کی جھلک دکھائی دیتی ہے' اور اس کے کلام میں نہ صرف عباسی شعراء (مثلاً متنبی اور معری) کے لفظ و محاورے کی گونج سنائی دیتی ہے' بلکہ جاہلی شعراء طرفہ اور سموئل کا سا انداز بھی دیکھنے میں آتا ہے۔ رصافی نے متنبی اور معری میں سے ہر ایک پر پوری پوری نظم لکھی تھی۔ معری کے بارے میں وہ اپنی نظم میں کہتا ہے کہ "وہ صرف عرب شاعر نہیں تھا' بلکہ پوری انسانیت کا شاعر تھا۔" چنانچہ یہ امر دلچسپی سے خالی نہیں کہ جب وہ بغداد کے قید خانے پر ایک نظم کہتا ہے تو اس میں جاہلی محاورہ اور جملے شامل کر دیتا ہے' درآں حالیکہ وہ نظم بالکل جدید زبان میں قید خانے کی غلاظت اور کثافت اور آلودگی کا ایک واضح اور ہو بہو (Graphic) نقشہ پیش کرتی ہے۔

آخر میں طلاق کے موضوع پر اس کے کچھ شعر آج کی صورت حال میں برمحل لگتے ہیں۔

| | |
|---|---|
| غلوتم في ديانتكم غلوا | يضيق بعضه الشرع الرحيب |
| اراد الله تيسيراً وانتم | من التعسير عندكم ضروب |

(تم لوگوں نے اپنے دین میں اس طرح غلو سے کام لیا کہ اس کی کشادہ دامن شریعت میں کوئی گنجائش نہیں ہے۔
اللہ نے تو آسانیاں چاہی تھیں اور تم لوگوں نے طرح طرح کی مشکلات زندگی میں پیدا کر دیں۔)

# خلیل مطران (م ۱۹۴۹)

خلیل مطران ان شاعروں کی صف اول میں تھا جنہوں نے آزادی کے گیت گائے اور اس کے ترانے لکھے۔ وہ ۱۸۷۲ء میں لبنان میں پیدا ہوا۔ اس وقت وہاں کی فضا پر ترکی استبداد کا اثر تھا۔ کچھ عرصے بعد عبدالحمید نے خلافت سنبھالی تو اس ظلم و جبر میں اور اضافہ ہو گیا۔ مدحت پاشا اور کچھ نوجوان ترکوں کی ایک جماعت نے اسے راہ راست پر لانے کی کوشش کی' لیکن اس نے ان کی ایک نہ چلنے دی اور جو بھی اس کے راستے میں آیا اس کو سخت سزا دی۔ ان حالات کو دیکھ کر بہت سے لوگ ملک چھوڑ کر فرانس اور سوئٹزر لینڈ چلے گئے اور وہاں جا کر اپنی قوم کے بارے میں سوچنے لگے کہ اس کا کیا انجام ہو گا۔ خلیل مطران نے جب اپنے وطن کی یہ حالت دیکھی کہ وہ کس طرح سلطان عبدالحمید کے ظلم و استبداد کے بوجھ تلے دبا ہوا ہے تو اس کی زبان پر شعر جاری ہو گئے اور کچھ ہی عرصہ بعد وہ اپنے شعروں میں اس ظلم و جبر کے خلاف احتجاج کرنے لگا۔ جب عثمانی خلیفہ کو اس کا علم ہوا تو اس کے آدمیوں نے خلیل مطران کے گھر پر چھاپہ مارا' لیکن انہیں وہاں سے کوئی ایسا مواد نہ ملا جس سے شاعر کو گرفتار کر کے قید میں ڈالا جا سکے۔ چنانچہ انہوں نے اسے چھوڑ دیا' لیکن اس پر نگرانی شروع کر دی۔ مطران کے گھر والوں نے جب یہ حالات دیکھے تو اسے اپنی تعلیم کی تکمیل کے لئے پیرس بھیج دیا۔ وہاں اس کے بعض ترک نوجوانوں کے ساتھ روابط قائم ہوئے۔ لیکن وہ وطن واپس آنے کی بجائے جنوبی امریکہ کے ملک کی طرف جانے کا سوچنے لگا' اور اس مقصد سے اس نے ہسپانوی زبان بھی سیکھنی شروع کر دی۔ لیکن تھوڑے ہی عرصے میں وہ اتنی دور ہجرت کرنے کے خیال سے باز آیا اور مصر کی طرف ہجرت کرنے کو ترجیح دی۔ چنانچہ ۱۸۹۲ء میں وہ مصر آ گیا۔ جہاں اس سے پہلے اس کے وطن سے بہت سے آزادی پسند لوگ پہنچے ہوئے تھے۔

خلیل مطران کے دیوان میں اس کے زمانہ شباب کے باغیانہ اشعار میں سے کچھ بھی نہیں ہے۔ اس نے مصلحت اس میں سمجھی کہ اس طرح کے اشعار کو جن میں اس کے سیاسی جذبات کا اعلان تھا حذف کر دے۔ ایسے معاملات میں وہ احتیاط پر یقین رکھتا تھا اور تقیہ کا مذہب اختیار کئے ہوئے تھا۔ جدید شاعری میں جس طرح مطران نے تقیہ پر عمل کیا اس طرح کسی اور شاعر نے نہ کیا۔ وہ اپنی جوانی کے زمانے سے ہی استبداد کے خلاف لڑنا چاہتا تھا' لیکن احتیاط اور تقیہ کی اس پالیسی کے ہوتے ہوئے وہ یہ کیونکر کر سکتا تھا۔ اس کا حل اس نے یہ نکالا کہ تاریخ کو پردہ بنائے اور اس پردے کی آڑ میں وہ جو کچھ بھی کہنا چاہتا ہے کہے۔ چنانچہ ظاہر میں وہ تاریخی موضوع پر نظم کہتا تھا لیکن باطن میں قوموں کی غصب شدہ آزادی کی بات کرتا تھا۔ اسی طرح کی ایک نظم اس نے فرانس کے جرمنی پر حملے کے بارے میں لکھی' جس میں جرمنی



کو شکست ہوئی۔ اس شکست کا جو اثر جرمن لوگوں پر ہوا اسے بیان کرتے ہوئے وہ اس میں اپنے وطن کے لوگوں کو رکھتا ہے جو عثمانی استبداد کے سامنے بے بس تھے۔

| | |
|---|---|
| واقام اصحاب البلاد مآتماً | وکسوا علی القتلی ثیاب حداد |
| ناحت عرائسهم علی ازواجها | والامهات بکت علی الاولاد |
| واشتد عسرهم ولم یک مجدیاً | من بعد فقد احبة و بلاد |

(ملک کے لوگوں نے ماتم کا اہتمام کیا اور مقتول افراد کو ماتمی لباس پہنایا
ان کی دلہنوں نے اپنے شوہروں پر نوحے کیے اور مائیں اپنی اولاد پر گریہ کناں ہوئیں۔
وہ شدید غم میں مبتلا تھے' لیکن اس کا اس وقت کوئی فائدہ نہیں تھا' جب اپنے محبوب افراد اور اپنا ملک دونوں نہ رہے)

پھر یہ ہوتا ہے کہ وہی جرمنی جسے شکست ہوئی تھی کچھ عرصے کے بعد اپنی قوت مجتمع کر کے فرانس پر حملہ کرتا ہے اور فرانس کے ظالم اور جابر اپنے زخم چاٹتے رہ جاتے ہیں۔ مطران اب اپنی بے عزتی کا بدلہ لینے والے جرمنوں کے بارے میں کہتا ہے

| | |
|---|---|
| فاستعصموا بالصبر ثم تکاتفوا | وتحرروا من رق الاستعباد |
| وتناسوا الثار والاحقاد فی | اکبادهم کالبیض فی الاغماد |
| واستفتحوا باریس فاستوفوا بها | اوتارهم وشفوا صدی الاکباد |
| کل بمسعاه یفوز ومن یثب | عند الحوادث لم یفز بمراد |

(انہوں نے صبر کا دامن تھاما اور ایک دوسرے کے ساتھ مل کے کھڑے ہوئے اور غلامی کے طوق سے آزاد ہو گئے۔
وہ بدلہ لینے کے لئے تیار ہوئے۔ ان کے دلوں میں نفرت اس طرح دبی ہوئی تھی جس طرح تلواریں اپنی نیاموں میں لٹکتی ہیں۔
انہوں نے پیرس فتح کر لیا اور اپنے سارے ارمان نکال لئے' اور جگر کی گرمی کو ٹھنڈا کیا۔
ہر کوئی اپنی کوشش سے ہی کامیاب ہوتا ہے اور جو ہر بات حوادث پر چھوڑ دے وہ مراد نہیں پا سکتا)

جیسا کہ اوپر ذکر ہوا خلیل مطران نے اپنی شاعری میں صراحت کے ساتھ استعمار کے خلاف کچھ نہ کہا' اور جو بات بھی کہی چھپا کر کہی۔ لیکن اس کا ایک قطعہ ایسا ہے جس میں وہ آزادی اظہار کو دبانے والے انگریزوں کے قانون مطبوعات کے خلاف کھل کر بات کرتا ہے' اور کہتا ہے

| | |
|---|---|
| کسروا الاقلام هل تکسیرها | یمنع الایدی ان تنقش صخرا |

قطعوا الایدی وھل تقطیعھا — یمنع الاعین ان تنظر شزرا

(انہوں نے قلمیں تو توڑ دیں' لیکن کیا ان کے توڑ دینے سے ہاتھ پتھر پر نقش و نگار نہیں بنا سکتے
انہوں نے ہاتھ کاٹ دیئے' لیکن ہاتھوں کے کٹنے سے آنکھوں کو حقارت کی نظر ڈالنے سے تو نہیں
روکا جا سکتا)

خلیل مطران ایک ہشت پہلو شخص تھا۔ اس نے بہت سے میدانوں میں امتیاز حاصل کیا' صحافت میں' مالیات میں' تجارت میں' زراعت میں' اور پھر سب سے بڑھ کر شاعری میں۔ مصر میں آنے کے بعد اس نے مشہور اخبار "الاہرام" میں صحافی کے طور پر کام کرنا شروع کیا۔ پھر اس نے کچھ اپنے رسالے نکالے' جو زیادہ عرصہ نہ چلے۔ پھر وہ تجارت اور سٹہ بازی کی طرف چلا گیا' جہاں اس نے کافی دولت جمع کر لی۔ لیکن ایک بدقسمت سودے میں وہ اپنی تمام جائیداد ہار گیا' جس نے اسے مایوسی میں مبتلا کر دیا۔ خوش قسمتی سے وہ جلد ہی خدیو کی زرعی سوسائٹی میں سیکرٹری لگ گیا۔ جہاں اس نے اپنی اچھی کارکردگی کی وجہ سے کافی عزت اور شہرت کمائی۔ کافی برس مطران نیشنل تھیٹر کمپنی کا ڈائریکٹر بھی رہا۔ یہاں کام کرتے ہوئے اس نے مصری تھیٹر کے مقاصد کو بہت فائدہ پہنچایا۔ بطور شاعر کے خلیل مطران کو ۱۹۱۳ء میں اور پھر ۱۹۴۷ میں باقاعدہ خراج عقیدت پیش کیا گیا۔ اس نے "شاعر القطرین" (دو ملکوں یعنی لبنان اور مصر کے شاعر) کا نام پایا' اور طہٰ حسین نے ایک دفعہ اس کے بارے میں کہا کہ "وہ جدید عربی شاعری کا رہنما ہے اور تمام معاصر شعراء کا استاد ہے۔"

خلیل مطران نے اچھی شاعری کے لئے کچھ رہنما اصول اپنے ہم عصروں کو دیئے۔

پہلا یہ کہ ایک نظم میں وحدت ہونی چاہیے' یعنی شروع سے آخر تک وہ ایک ہی موضوع کے بارے میں ہو۔

دوسرا یہ کہ نظم میں سب سے زیادہ اہمیت معنی و مضمون کی ہونی چاہیے۔ لفظ و محاورے کی آرائش پر اس کے بعد دھیان دینا چاہیے۔

تیسرا یہ کہ تصور و خیال کا عام اور معمولی نہ ہونا اور مضمون کا بھی پامال نہ ہونا اچھی شاعری کے لئے ضروری ہیں۔

پہلی جنگ عظیم کے خاتمے پر استعماری طاقتوں نے عثمانی علاقوں کو آپس میں تقسیم کر لیا۔ فرانس نے لبنان اور شام لے لئے' انگریزوں نے فلسطین اور عراق پر قبضہ کر لیا۔ پورا عالم عربی اب ان طاقتوں کے پیچھے آ گیا۔ خلیل مطران اس صورت حال پر بہت جز بز ہوا اور اپنی باغیانہ فکر کو اس نے اپنی ایک طویل نظم "نیرو" کا موضوع بنایا۔ اس طرح اس نے استعماری طاقتوں کے خلاف کچھ کہنے کے لئے پھر تاریخ کی



آڑ لی۔ اس نظم میں اس نے "نیرو" کے ظلم و جبر کے لئے ان عوام کو ذمہ دار ٹھہرایا جنہوں نے اس کی بہت عزت و تکریم کر کے اسے اپنے سر پہ بٹھا لیا تھا۔ وہ گویا اپنے اہل وطن پر یہ الزام لگانا چاہتا تھا کہ انہوں نے ہی اپنے اوپر استعمار کی یہ لعنت مسلط کی۔ اس نظم کے کچھ اشعار یوں ہیں:

ذلک الشعب الذی آتاہ نصرا — ھو بالسبۃ من "نیرون" احری

ای شیء کان "نیرون" الذی — عبدوہ؟ کان فظ الطبع غرا

صنعوہ من قواھم مابہ — صار طاغوتا علیھم او اضرا

(وہی قوم جس نے اسے فتح دلائی وہ اب نیرو کی طرف سے اہانت کے مستحق ٹھہرے۔
نیرو آخر کیا تھا جس کو وہ پوجتے تھے' وہ ایک مغرور اور بدمزاج شخص ہی تو تھا۔
انہوں نے اسے اپنی ایسی قوتوں سے نوازا' جس سے وہ ان پر سرکش آمر بن گیا بلکہ اس سے بھی کوئی بری چیز)

☆.....☆.....☆

## عربی ادب میں فکشن (افسانہ' ناول' ڈرامے) کا رواج

افسانے کی قدیم اور روایتی شکل قصہ یا حکایت ہے۔ قدیم عربی ادب میں قصے یا کہانی کو ادب کی ایک صنف کے طور پر کبھی اختیار نہ کیا گیا۔ جاہلی زمانے میں قصے کا وجود "ایام العرب" میں ملتا ہے جو قبائل کی باہمی جنگوں کے احوال کا بیان ہوتا تھا' اور جو تاریخ میں محفوظ چلا آیا ہے۔ پھر قرآن کریم میں لوگوں کو عبرت دلانے کے لئے انبیاء کے قصے بیان ہوئے اور بتایا گیا کہ کس طرح بعض انبیاء کی قوموں نے ان کے ساتھ اچھا سلوک نہ کیا۔ ان کی دعوت سے انکار کیا اور اپنے اس رویے کی پاداش میں عذاب سے دوچار ہوئیں۔ اس ضمن میں حضرت یوسف علیہ السلام کا قصہ بھی ایک مکمل سورت کی شکل میں بیان ہوا۔ قرآن میں یہ قصہ جس طرح بیان ہوا ہے وہ آج کے افسانے کے بہت قریب ہے۔ لیکن تعجب ہے کہ قرآن کی ان حکایات اور کہانیوں کا نمونہ سامنے ہوتے ہوئے بھی عربوں میں قصہ گوئی کی کوئی تحریک پیدا نہ ہو سکی۔

عربوں کے ہاں قصوں اور کہانیوں کا رواج تیسری صدی ہجری میں ان ترجموں کی بدولت پڑا جو عجمی قوموں ایران اور ہندوستان کی کہانیوں کے عربی زبان میں کئے گئے۔ ان میں ایک کتاب "کلیلہ ودمنہ" تھی جو ہندوستان سے ایران آئی اور پھر فارسی زبان سے عربی کے مایہ ناز ادیب ابن المقفع نے اس کا



Scanned with CamScanner

عربی میں ترجمہ کیا۔ اسی طرح کتاب "الف لیلہ ولیلہ" بھی شروع میں ایران کی کہانیوں کی ایک چھوٹی سی کتاب "ہزار افسانہ" سے عربی میں ترجمہ ہوئی۔ اور عرب میں آ کر اس پر اتنے اضافے کیے گئے کہ یہ حکایتوں، داستانوں اور مہم جوئی کے قصوں کی ایک ایسی ضخیم کتاب بن گئی، جو اپنے ترجموں کی بدولت پوری دنیا میں تفریح کا ایک بڑا خزانہ ثابت ہوئی، یہاں تک کہ دوسری زبانیں اس کا جواب پیدا کرنے سے قاصر رہیں۔

لیکن جہاں "کلیلہ و دمنہ" جانوروں کی حکایات پر مشتمل قدیم طرز کی ایک ادبی کتاب رہی، وہاں "الف لیلہ ولیلہ" کو عوامی ادب (Folk Core) کے کھاتے میں ڈال دیا گیا اور اس کا شمار ادب عالیہ میں کبھی نہ ہو سکا۔

## عربی افسانہ

افسانے کی صنف نے یورپ اور مغربی دنیا میں انیسویں صدی میں ظہور کیا۔ سر والٹر سکاٹ، واشنگٹن ارونگ، ایڈگر ایلن پو، بالزاک، موپاساں، چیخوف اور دوسرے لوگوں نے اپنے فنکارانہ طرز حکایت نویسی سے اس کو ادب کی ایک باقاعدہ صنف کے طور پر منوایا اور اسے پڑھنے والوں میں ہر دلعزیز بنا دیا۔ جب بیسویں صدی آئی تو اس صنف میں کچھ اور لوگوں نے تجربے کیے، اور انگلینڈ میں سمرسٹ ماہم اور کیتھرین مینسفیلڈ اور امریکہ میں شیروڈ اینڈرسن، ایف سکاٹ فٹز جیرالڈ اور ارنسٹ ہیمنگوے نے مختصر کہانی یا افسانے کو ترقی دے کر ادبی اظہار کی ایک موثر اور نہایت فنکارانہ صورت عطا کر دی۔

انیسویں صدی میں جب عرب ادباء کا یورپ سے واسطہ پڑا تو وہ افسانے کی اس صورت سے آشنا ہوئے، اور یہ انہیں بہت اچھی لگی۔ یہ لوگ ابتدا میں ان قصوں کا عربی میں ترجمہ کرنے لگے۔ لیکن یہ ترجمہ اصل کے مطابق نہیں ہوتا تھا، بلکہ اسے عربی کی صنف مقامات کے اسلوب میں ڈھالا جاتا تھا اور ان کہانیوں کی فضا بھی مصر کے مقامی حالات کے مطابق رکھی جاتی تھی۔ نیز ان میں کسی حد تک عوامی زبان بھی استعمال کی جاتی تھی، تاکہ مصر کے قاری کے لئے یہ ایک مانوس چیز ہو اور وہ اس سے لطف اندوز ہو سکے۔ اس طرح کے ترجمے شروع میں رفاعۃ الطہطاوی نے کئے۔ لیکن بعد میں فصیح عربی لکھنے والوں میں سے حافظ ابراہیم اور مصطفیٰ لطفی المنفلوطی نے بھی یورپی افسانوں کے ترجمے کئے۔ یہ ترجمے اگرچہ فصیح زبان میں ہوتے تھے، تاہم یہ اصل کے مطابق نہیں ہوتے تھے، بلکہ ان میں اصل کہانی کے بنیادی خطوط ہی سامنے رکھے جاتے تھے اور پوری کہانی کو مصری فضا اور مصری محاورے میں ڈھال دیا جاتا تھا۔ منفلوطی نے اپنی کتاب "العبرات" میں کچھ کہانیاں تو یورپی زبانوں سے ترجمہ کیں، لیکن کچھ کہانیاں



خود بھی لکھیں۔ چنانچہ منفلوطی کی ان کوششوں کو عربی افسانے کا آغاز قرار دیا جا سکتا ہے۔

مغربی افسانے کی طرز پر اگر عربی زبان میں کسی نے سب سے پہلے کسی حد تک کامیاب افسانہ لکھا تو وہ محمود تیمور تھا، جس کے ۱۹۱۷ میں لکھے ہوئے افسانے "فی القطار" (گاڑی میں) کو باوجود کچھ خامیوں کے جدید معنوں میں باقاعدہ افسانہ قرار دیا گیا۔ پھر پہلی جنگ عظیم کے بعد کے زمانے میں یکے بعد دیگرے بہت سے افسانہ نگار منظر عام پر آنے لگے، اور اس گروہ نے اپنی تخلیقات سے مصری ادب میں اس فن کی بنیادیں رکھ دیں۔ ان لوگوں کے میدان میں آ جانے سے صنف افسانہ میں تخلیقی سرگرمی زیادہ ہو گئی اور یوں لگا کہ اس وقت کے سیاسی اور معاشرتی ماحول میں جو خرابیاں اور بے اعتدالیاں نفوذ کر گئی تھیں ان کو بے نقاب کرنے اور ان پر تنقید کرنے کا منصب افسانے نے اپنے ذمے لے لیا تھا، اور اس زمانے کی شاعری اس صورتحال سے تقریباً لاتعلق تھی۔ افسانوں کی اس مقبولیت کو دیکھتے ہوئے اخبارات اور رسائل نے بھی ان کے لئے اپنے صفحات وا کر دیئے، اور افسانے ان جرائد و رسائل میں بڑی باقاعدگی سے چھپنے لگے۔ شروع کے اس مرحلے میں یہ سب افسانہ نگار چونکہ مغربی تعلیم سے آراستہ تھے اور ان میں سے کچھ مغرب میں بھی رہے تھے، اس لئے ان کے افسانے زیادہ تر مغربی افسانوں سے ماخوذ اور متاثر ہوتے تھے، اور اس امر کا اعتراف خود افسانہ نگار بھی کرتے تھے۔ مثلاً محمود تیمور نے کہا کہ وہ فرانس کے موپاساں سے متاثر ہے، اور اس کے بعض افسانوں میں جو واقعیت (Realism) دکھائی دیتی ہے وہ فرانس ہی کے زولا سے لی ہوئی ہے۔ اسی طرح ایک دوسرے افسانہ نگار محمود طاہر لاشین نے صاف صاف یہ اقرار کیا کہ اس نے اپنے متعدد افسانوں کا خیال روس کے چیخوف سے لیا ہے۔ لیکن اس کے یہ معنی بھی نہیں کہ افسانہ نگاروں کی یہ کھیپ ہمیشہ غیر ملکی ادب پر انحصار کرتی رہی۔ بلکہ ان کے اندر جو انفرادی سوچ اور ذاتی احساس تھا اس کو کام میں لاتے ہوئے انہوں نے بالکل اوریجنل افسانے بھی لکھے۔ جن میں سے اکثر وہ تھے جو اپنے موضوع عرب ممالک کی داخلی زندگی اور معاشرے کے روزمرہ واقعات سے حاصل کرتے تھے، اور غیر شعوری طور پر انسانی نفسیات کا مطالعہ بھی پیش کرتے تھے۔ اوپر جن افسانہ نگاروں کا ذکر کیا گیا، ان میں سے بعض کے نام مع ان کے مجموعوں کے حسب ذیل ہیں۔

۱۔ عیسیٰ عبید کا "احسان هانم"
۲۔ شحاتہ عبید کا "درس مولم"
۳۔ محمود تیمور کے تو مجموعے "الشیخ جمعه" سے لے کر "فرعون الصغیر" تک
۴۔ محمود طاہر لاشین کا "سخریة الناس" اور "یحکی ان"
۵۔ نجیب محفوظ کا "همس الجنون" جو اس کا اولین مجموعہ تھا۔

ان کے علاوہ بعض وہ ادباء بھی افسانہ نگاروں میں شامل ہو گئے' جن کی شہرت کسی دوسری صنف ادب میں تھی' مثلاً

۶۔ ابراہیم عبدالقادر المازنی (مشہور نقاد) کے مجموعے: "صندوق الدنیا" "خیوط العنکبوت" اور "فی الطریق"

۷۔ توفیق الحکیم (مشہور ڈرامہ نگار) کا "عهد الشیطان"

توفیق الحکیم کا افسانہ "عهد الشیطان" ایک ذہنی مسئلے کے بارے میں ہے۔ یہ مسئلہ علم کا ہے۔ اس افسانے کا ایک کردار ہے' جس نے گوئٹے کے جرمن ناول "فاؤسٹ" سے خیال لے کر یہ خواہش ظاہر کی کہ اس کے سامنے بھی اسی طرح شیطان آئے جس طرح فاؤسٹ کے سامنے آیا تھا اور اسے وہ چیز عطا کرے جو اس کی دلی خواہش ہے۔ ادھر اس نے اپنی اس خواہش کا اظہار کیا اور ادھر شیطان نمودار ہو گیا اور اس سے پوچھنے لگا۔ تمہیں کیا چاہیے۔ اس کردار نے کہا کہ مجھے علم دے دو اور اس کے بدلے میں جو چاہو مجھ سے لے لو۔ شیطان نے کہا ٹھیک ہے اور بدلے میں اس نے جوانی کا مطالبہ کر دیا۔ اس شخص نے یہ مطالبہ منظور کر لیا اور دونوں کے درمیان بات ٹھہر گئی۔ اس کے بعد شیطان گم ہو گیا اور ہمارا یہ صاحب علم سے اپنا دامن بھرنے لگا۔ اور جہاں جہاں بھی اور جس طرح کا بھی علم اسے ملا اس نے جمع کر لیا اور بہت بڑا عالم اور سکالر مشہور ہو گیا۔ لیکن زیادہ عرصہ نہ گزرا تھا کہ اس نے محسوس کیا کہ وہ جسمانی طور پر بالکل بدل گیا ہے۔ اس کی کمر ٹیڑھی ہو گئی ہے۔ اس کے چہرے پر جھریاں پڑ گئی ہیں' اور اس کا رنگ میلا ہو چلا ہے۔ اس نے اپنے آپ سے پوچھا: کیا میں نے اتنا عرصہ اپنے جسم کو بھلائے رکھا اور اس کی بالکل خبر نہ لی؟ پھر اسے یاد آیا کہ شیطان نے اس کے ساتھ یہ معاہدہ کیا تھا کہ اسے علم دے دے گا اور بدلے میں اس کی جوانی اس سے لے لے گا۔ "تو افسوس!" وہ کہنے لگا "اس سودے میں شیطان میری ساری جوانی لے گیا اور مجھے موت کے قریب کر دیا۔ یہ سودا تو مجھے بہت مہنگا پڑا۔"

نجیب محفوظ کے مجموعے "همس الجنون" (دیوانگی کی سرگوشی) میں زیادہ تر افسانے جنسی رغبت اور مرد اور عورت کے درمیان تعلق کی بگڑی ہوئی صورتوں کے بارے میں ہیں۔ اس کی ایک کہانی "هذیان" کچھ اسی طرح کی صورتحال کے بارے میں ہے۔ ایک نوجوان بیوی اپنے نیک اور مخلص میاں کے گھر ایک بچی کو جنم دیتی ہے اور ساتھ ہی زچگی کے بخار میں مبتلا ہو جاتی ہے اور اسی بخار کی حالت میں ایک دفعہ وہ بڑبڑانے لگتی ہے اور اس نوجوان کا نام لیتی ہے جس نے اس کی شادی سے پہلے اس کا ہاتھ مانگا تھا لیکن اسے انکار ہو گیا تھا۔ اس ہذیان میں وہ کچھ گناہ اور معصیت کا ذکر بھی کرتی ہے۔ یہ باتیں سن کر اس کا خاوند شک میں مبتلا ہو جاتا ہے اور چاہتا ہے کہ وہ اس ضمن میں کچھ اور باتیں کرے۔ لیکن علاج کی وجہ سے عورت کی یہ ہذیانی کیفیت ختم ہو جاتی ہے اور وہ صحت یاب ہونے لگتی ہے۔ مرد اسے پھر سے ہذیان



میں مبتلا کرنے کے لئے بیوی کو دوائی دینا بند کر دیتا ہے' لیکن اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وہ اس تکلیف میں مر جاتی ہے۔ اب خاوند کے دل میں جو شک تھا اس کے ساتھ احساس جرم بھی شامل ہو جاتا ہے اور پھر یہ خیال کہ وہ بدنصیب رہا اور ناکامی سے دوچار ہوا' یہ ساری باتیں مل کر اس کی زندگی میں زہر گھول دیتی ہیں' جس سے بچنے کے لئے وہ ایک دن دریا میں کود کر اپنی جان لے لیتا ہے۔ البتہ اس کے گرد و پیش کے لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ اس نے اپنی مخلص بیوی کا غم برداشت نہ کرتے ہوئے اپنی جان لے لی۔

یہ سب افسانے دوسری جنگ عظیم سے پہلے کے زمانے کے تھے۔ دوسری جنگ عظیم کے بعد عرب اقوام پے در پے ایسے سانحات سے دوچار ہوئیں جنہوں نے ان کا مزاج' ان کی سائیکی اور ان کے سوچنے کا انداز بالکل بدل دیا' اور ان کے سیاسی اور معاشرتی حالات میں بہت دوررس تبدیلیاں رونما ہوئیں۔

جنگ کے خاتمے کے بعد مئی ۱۹۴۸ میں برطانوی انتداب کے اٹھتے ہی یہودیوں نے فلسطین میں اسرائیلی ریاست کے قیام کا اعلان کر دیا۔ اس کے فوراً بعد ہمسایہ عرب ریاستوں نے اسرائیل پر حملہ کر دیا' لیکن مقابلے میں شکست کھائی۔ اس جنگ کے نتیجے میں فلسطین کے دس لاکھ عرب باشندے گھر سے بے گھر ہو کر مہاجر بن گئے۔ پھر ۱۹۵۶ میں مصر' اردن اور شام نے مل کر اسرائیل کا ایک تجارتی راستہ بند کرنے کی کوشش کی تو اسرائیل نے جوابی کارروائی کرتے ہوئے صحرائے سینا پر حملہ کیا اور پانچ دن میں اسے فتح کر لیا۔ بعد میں بڑی طاقتوں کے دباؤ کے تحت اسرائیل کو اپنے علاقوں میں واپس جانا پڑا۔ اس کے گیارہ سال بعد جون ۱۹۶۷ کی چھ یومی جنگ میں اسرائیل نے اپنا وہی عمل دہرایا اور مصر' اردن اور شام پر حملہ کر کے پانچ دن میں ایک طرف صحرائے سینا فتح کر لیا اور دوسری طرف شہر یروشلم کا مسلم حصہ بھی اپنے قبضے میں کر لیا۔

اسرائیل کے خلاف ان جنگوں میں عرب پے در پے جن ہزیمتوں اور جن تلخ تجربوں سے گزرے انہوں نے ان کی نئی نسل میں ایک برگشتگی' ایک انتقامی جوش اور ایک زخم خوردہ جذباتی کیفیت پیدا کر دی۔ الثورہ الثورہ (انقلاب) کی صدا ہر سمت سے کانوں میں پڑنے لگی۔ عرب نوجوان نسل نے یہ دیکھ لیا تھا کہ اسرائیل کے مقابلے میں ان کی اس شکست کے پیچھے ان کے حکمرانوں کی کمزوریاں اور بدعنوانیاں تھیں۔ وہ اپنے عیش و عشرت میں اتنے مست تھے کہ انہیں یہ پتا بھی نہیں تھا کہ ان کی فوج کے پاس صحیح قسم کا اسلحہ بھی ہے یا نہیں! انقلاب کی ان آوازوں کا اثر یہ ہوا کہ بالآخر ۱۹۵۲ میں مصر میں شاہ فاروق کو تخت سے معزول کر دیا گیا اور اس کی جگہ فوجی افسروں نے اقتدار سنبھال لیا۔ ان حالات کا اثر یقیناً ادب پر بھی پڑا اور "الادب الثوری" اس ادب کو کہا جانے لگا جو اپنے اندر انقلابی روح رکھتا ہو' جو

حالت موجودہ میں تغیر لانا چاہتا ہو' اور یہ سارا انقلاب اور یہ جذبہ بغاوت صرف بیرونی غاصب کے مقابلے میں ہی نہیں تھا' بلکہ اس کا ہدف اتنی ہی شدت کے ساتھ خود عربوں کے اندر کے کاہل' رجعت پسند اور تخریبی عناصر بھی تھے۔

جب ہم ادب اور خاص طور پر افسانے کی بات کرتے ہیں تو یہ دیکھتے ہیں کہ ان شکستوں کے بعد پوری عرب دنیا میں "نظرثانی" کی ایک تحریک چل نکلی۔ ہر چیز پر نظرثانی' چاہے وہ عربی معاشرہ اور اس کی موجودہ ہیئت ہو' چاہے وہ عقلیات اور افکار ہوں' چاہے وہ روایتی ورثہ اور اس کی قدر و قیمت ہو' یا جدید اور ترقی یافتہ نظام ہائے زندگی اور ان کی کمزوریاں۔ اس طرح مختلف اصناف ادب کے موضوعات اور ان کی صورت (Form) کے بارے میں بھی نظرثانی کی جانے لگی۔ اور زندگی کی مختلف اقدار اور فنی تخلیقات اور افکار پر تنقید۔ خصوصیت کے ساتھ خود تنقیدی کا رواج عام ہوا۔

عالم عرب میں نئی افسانوی تخلیقات کو سامنے رکھتے ہوئے یہ کہا جا سکتا ہے کہ "نظرثانی" کے اس عمل نے' جو اب عمومیت اختیار کر کے ایک چیلنج بن کر ابھرا ہے' عربی افسانہ نگاری میں مندرجہ ذیل نتائج پیدا ہوئے ہیں:

۱۔ افسانہ حقیقت اور واقعے کے اور زیادہ قریب ہو گیا ہے۔ بات کہنے اور تنقید کرنے کے انداز میں جرأت پیدا ہوئی ہے اور نئی تکنیک اور نئی فارم کے تجربے زیادہ اعتماد کے ساتھ کئے جانے لگے ہیں۔

۲۔ ادباء کے ایک خاص گروہ کے ہاں اس صورت حال کا اثر قدرے مختلف بھی ہوا ہے۔ وہ یوں کہ ان کی کہانیوں میں اجنبیت کا احساس' تلخی و تندی' یاس آمیز احتجاج اور لایعنیت کی پرچھائیاں دکھائی دینے لگی ہیں۔

۳۔ اور سب سے اہم یہ کہ نئے حالات میں فن اور فن کار کی معاشرے سے علیحدگی کا اسطورہ (Myth) کم از کم ایک طویل عرصے کے لئے ختم ہو گیا ہے اور "فن برائے فن" کے نظریے سے ساری ہوا نکل چکی ہے۔ یہ تبدیلی محض نظریہ و خیال کی دنیا میں واقع نہیں ہوئی بلکہ اس کا عملی اظہار ادیبوں' شاعروں اور افسانہ نگاروں کی نئی تخلیقی پیداوار میں صاف نظر آتا ہے۔

جون ۶۷ اور اس کے بعد کے واقعات کا عکس کسی نہ کسی شکل میں عربی افسانوں کی غالب اکثریت کے موضوعات میں ملتا ہے' اور اس امر کا مشاہدہ ہم افسانوں کی درج ذیل اقسام میں بخوبی کر سکتے ہیں:

اول وہ افسانے جو محاذ پر شکست کے واقعات اور عوامی مسلح کارروائیوں کی تصویر پیش کرتے ہیں۔ مثلاً سلیمان فیاض کے افسانے "احزان حزیران" (جون کے غم) میں ایک سپاہی ہے جو لڑائی میں اپنی



دونوں ٹانگوں سے محروم ہو چکا ہے۔ وہ اپنے گھر میں پڑا اس امید میں دن گنے جا رہا ہے کہ کسی روز عرب قوم اپنی مقبوضہ زمین واپس حاصل کرے گی۔ وہ لکڑی سے جنگی ہتھیار بنا بنا کر خوش ہوتا ہے اور یوں گویا اپنے آپ کو تسلی دیتا ہے کہ وہ ابھی تک جنگی تیاریوں میں حصہ لے رہا ہے۔ یہ سپاہی دراصل عرب عوام کی علامت ہے جنہیں اپنا دفاع کرنے کے پورے مواقع اور ذرائع میسر نہیں ہیں۔ محمد خضر کے افسانے "جھولے" میں محاذ سے ایک فوجی اپنے دوست کے گھر اس کے اہل و عیال کو اس کی موت کی خبر سنانے آتا ہے۔ وہ جنگی کیمپ میں اپنے اس دوست کی زبانی اس گھرانے کے افراد کے بارے میں بہت کچھ جان چکا ہے۔ اس کی بیوی' اس کی ماں اور اس کی چھوٹی سی پیاری بچی۔ جب وہ اس کے گھر پہنچتا ہے تو اس کی بچی سے کھیلنے لگ جاتا ہے اور دریا کے کنارے پر لگے ہوئے ایک جھولے میں اس کے ساتھ بیٹھ کر جھولا جھولتا ہے۔ اس حالت میں اسے محسوس ہوتا ہے جیسے شہید باپ کی روح ہر طرف سے امنڈ کر اس میں سما گئی ہے' جیسے وہی اس خاندان کا سربراہ ہے' اس بچی کا باپ ہے اور اس کے دوست کی روح اس کے اندر اور ماحول کی ہر چیز کے اندر حلول کر گئی ہے۔ احمد خلف کی کہانی "ایک نیم مردے کا آشی خوذ" ان افسانوں سے اس لحاظ سے مختلف ہے کہ اس میں وہ غازیانہ مبالغہ آمیزی نہیں ہے اور نہ امر واقع پر نالہ و شیون کی کیفیت ہے۔ یہ کہانی جنگ کے المیے کی سیدھی سچی تصویر کشی ہے۔ ایک فوجی جس کا چہرہ لڑائی میں مسخ ہو گیا ہے۔ اپنے گھر واپس آتا ہے۔ اس کی بیوی بیس برس کی ایک نوجوان عورت ہے۔ وہ دشمن کے خلاف اس جنگ کو جاری دیکھنا چاہتا ہے۔ لیکن اسی جنگ نے اس کے خاوند کا چہرہ بگاڑ کر اسے بے کار کر دیا ہے۔ اب نہ وہ لڑنے کے قابل رہا ہے اور نہ اپنی اس نوجوان بیوی کے ساتھ زندگی بسر کرنے کے قابل ہے۔ وہ ایک بے حد پیچیدہ اور لاینحل نفسیاتی کشمکش میں مبتلا ہے۔ آخر ایک دن مایوسی کے ایک لمحے میں وہ سامنے لٹکے ہوئے کلاک پر گولی چلا دیتا ہے۔ اس "وقت" سے انتقام لینے کی خاطر جس نے اسے اس حال کو پہنچایا ہے۔ لیکن وقت گزرتا جاتا ہے اور اس کے ساتھی محاذ پر اپنی جنگ جاری رکھتے ہیں۔

دوسری قسم ان افسانوں کی ہے جو عوامی مسلح مقابلے (یعنی فدائین) کی تحریک کے بارے میں ہیں۔ اس تحریک اور اس کی مختلف تنظیموں کا چونکہ عرب عوام کو وسیع پیمانے پر براہ راست تجربہ حاصل ہوا ہے' اس لئے اس موضوع پر ان کے افسانے تجربے کی صداقت اور مشاہدے کی گہرائی سے زیادہ مالا مال ہیں۔ ان افسانوں میں اگرچہ ایک ہی طرح کی نفسیاتی کیفیت دکھائی دیتی ہے۔ مثلاً شکست کا پیہم احساس' ایک دکھ اور کرب مسلسل اور سب کچھ چھوڑ کر فدائی خدمات کی طرف پیش قدمی کرنے کا جذبہ۔ لیکن اس عام فریم میں ایسے افسانوں کی تعداد بھی کم نہیں ہے جن کے اندر فنی اور تکنیکی مہارت کے عمدہ نمونے دیکھے

میں آتے ہیں۔ اس طرح کا ایک افسانہ سہیل ادریس کا "کھلا بیابان" ہے جو اس المیے کا عکس ایک ایسے کابوس کی صورت میں دکھاتا ہے جو ایک تعلیم یافتہ عرب کے سینے پر چڑھ چڑھ کر آتا ہے۔ اس افسانے کا اسلوب بالکل نیا ہے اور اس کی زمانہ حال کی ترکیب اور ہیئت (Form) قاری کو ایک ایسی فضا میں لا کھڑا کرتی ہے جس میں باوجود المیے کے احساس کے امید کی دھڑکن بھی صاف سنائی دیتی ہے۔ اسی طرح محمد عیتانی کے افسانے "دوست" میں موت جیسی ہولناک چیز معرکہ کارزار میں اپنا خوفناک لبادہ اتار کر ایک ایسی عام اور معمولی چیز بن کے رہ جاتی ہے جس کے ساتھ ایک فدائی مجاہد روزانہ اور صبح وشام اٹھتا بیٹھتا ہے۔ یہاں تک کہ وہ اس کے ساتھ ایسے گھل مل جاتا ہے جیسے اپنے کسی ہمیشہ ملنے والے دوست کے ساتھ۔

اس طرح کے افسانوں کے مجموعے کا اگر جائزہ لیجئے تو باوجود ان کی بعض فنی کمزوریوں کے ان کے اندر ہمیں ایک ایسی قوم کا رزم نامہ پڑھنے کو ملتا ہے جسے شکست نے ہلا کر رکھ دیا ہے اور جو پھر سے اپنے آپ کو مجتمع اور مسلح کرنے لگی ہے اور ایک عوامی جنگ کی تحریک میں شامل ہو کر اپنے چھنے ہوئے وطن کی آزادی کے لئے میدان میں اتر آئی ہے۔

ان افسانوں کی تیسری قسم وہ ہے جو اپنے موضوعات عرب ممالک کی داخلی زندگی سے حاصل کرتے ہیں اور ان سیاسی' اجتماعی' نفسیاتی اور نظریاتی اسباب کو روشنی میں لاتے ہیں جو دراصل اس شکست کی بنیاد بنے اور جن کا آج بھی عرب معاشرے کو سامنا کرنا پڑ رہا ہے۔ اس طرح کے افسانوں میں' جن میں بیک وقت گہرائی بھی ہے اور جرأت اظہار بھی' نجیب محفوظ کے افسانوں کا تازہ مجموعہ "تحت المظلة" (چھتری کے نیچے) پیش پیش ہے۔ ان افسانوں میں اس ادیب نے عرب قوم کی موروثی کمزوریوں' ان کے اندر انقلاب سے فائدہ اٹھانے والی بیورو کریسی' ان کے ایک خاص طبقے کی بے حسی اور لاتعلقی اور انقلابی تغیرات لانے کے بارے میں ہچکچاہٹ۔ ان سب چیزوں کے خلاف اپنی وہ جنگ جاری رکھی ہے جو اس کی تخلیقات کا طرہ امتیاز ہے۔

اس تیسری قسم میں وہ افسانے بھی شامل کئے جا سکتے ہیں جن کے اندر موجودہ صورتحال سے کامل مایوسی اور مقابلہ و جہاد کے بے فائدہ پن کا یقین پایا جاتا ہے۔ ان میں سے بعض افسانے نجات کی صورت اسی میں دیکھتے ہیں کہ قوم پھر سے غیبی اور موہوم عقائد کی طرف لوٹ جائے اور اپنا معاملہ آسمانی تقدیر کے سپرد کر دے۔ جس طرح امین شنار کے افسانے "کابوس" میں دیکھنے میں آتا ہے۔ ایسے افسانہ نگار دراصل موجودہ عرب حکومتوں اور ان کے تحت بسنے والے معاشروں کے رویے سے دل برداشتہ ہو کر ایسے مقام پر آ پہنچے ہیں جہاں اصلاح کی ہر تدبیر اور تلافی کی ہر کوشش انہیں عبث اور بے نتیجہ دکھائی دیتی



ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ ایسے معاشرے میں ہر فرد بے بس اور مجبور محض ہے اور اس کے سامنے سوائے اس کے اور کوئی راستہ نہیں کہ وہ امر واقع کو تسلیم کر کے اس سے مصالحت کر لے۔

ایک آخری قسم ان افسانوں کی ہے جو خود فلسطین کے مقبوضہ علاقوں میں رہنے والے ادباء کے قلم سے نکلے ہیں۔ تجربے کی صداقت اور حرارت ان افسانوں کا امتیازی وصف ہے اور ان کے کردار بہت وضاحت اور گہرائی سے کھنچے ہوئے دکھائی دیتے ہیں۔ باوجود اس کے کہ ان میں سے اکثر افسانے اپنی شکل وہیئت میں عام کہانی کا سا انداز لئے ہوئے ہوتے ہیں' تاہم دو یا تین ادباء اس سے خاص طور پر مستثنیٰ ہیں۔ مثلاً توفیق فیاض جس کا مجموعہ "زرد راستہ" فنی اعتبار سے اعلیٰ پائے کی چیز ہے۔ یہی بات امیل حبیبی کی کتاب "چھ دنوں کی مسدس" کے بارے میں بھی کہی جا سکتی ہے۔ یہ چھ افسانے باہم مربوط ہیں اور یہ مل کر ناول کی ایک ایسی قسم کا روپ دھار لیتے ہیں جو جون کی جنگ کے بعد سے اب تک کے افسانوی ادب کی بلاشبہ سب سے خوبصورت اور دلچسپ چیز ہے۔ یہ افسانے فلسطینی عربوں کے ایک وسیع گروہ کے دل میں دبی ہوئی اس چنگاری کی کہانی ہیں جو اس نئی قسم کی نازیت کے خلاف شعلہ بن کر بھڑکنے کے لئے بے تاب ہے۔ لیکن ضروری وسائل اور تنظیم کی کمی کے باعث مناسب موقع کے انتظار میں ہے۔ اور ان کے اس خواب کی کہانی جس میں گم ہو کر ایک فلسطینی عرب اپنے آپ کو پھر سے اپنی چھوڑی ہوئی زمین پر یا اپنے شہری مکان میں چلتا پھرتا ہوا دیکھتا ہے' اور لمحے دو لمحے کے لئے زمانے کا لگایا ہوا زخم بھول جاتا ہے۔

☆......☆......☆

## عربی ناول

عربی ناول کی ابتدائی صورت جرجی زیدان (م ۱۹۱۴ء) کے وہ تاریخی ناول ہیں جو اس نے کسی حد تک انگریزی کے سر والٹر سکاٹ کے انداز میں بیسویں صدی کے اوائل میں لکھے۔ اس کے ان ناولوں کا موضوع عربوں کی فتوحات سے لے کر عہد ممالیک تک کے بعض اسلامی ادوار کی ایسی تاریخ ہے جس میں سیاسی واقعات وشخصیات کو افسانہ و رومان کے رنگ میں پیش کیا گیا ہے۔ یہ فنی اعتبار سے تاریخی ناول کے اس معیار پر پورا نہیں اترتے جو زمانہ قریب میں قائم ہوا ہے۔ بلکہ یہ سیدھے سادے بیانیہ انداز میں لکھے ہوئے ایسے ناول ہیں جو قاری کو اس کی تاریخ سے آشنا کرتے ہیں۔ چنانچہ ان ناولوں کا پڑھنے والوں پر یہ اثر دیکھنے میں آیا کہ لوگ تاریخ کے موضوع میں دلچسپی لینے لگے۔



Scanned with CamScanner

اس کے بعد کی ایک کوشش محمد المویلحی (م۱۹۳۰) کی "حدیث عیسی بن ھشام" ہے۔ عرابی پاشا کی بغاوت (۱۸۸۲) کی ناکامی کے بعد مویلحی نے اپنے طرزِ نگارِ قلم سے واقعات و حکایات کا ایک سلسلہ لکھا۔ جن میں حکایت کا آغاز تو مسجع زبان میں بدیع الزمان ہمدانی کے مقامات کی طرز پر ہوتا تھا' البتہ آگے چل کر مویلحی جو کچھ بھی کہنا چاہتا اپنی خوبصورت اور اعلیٰ نثر میں کہتا۔ یہ سلسلہ بہت مقبول ہوا اور اس کے کئی ایک ایڈیشن نکلے۔

بعض لوگوں کا خیال ہے کہ جرجی زیدان کے تاریخی ناول اور مویلحی کے جدید مقامات "حدیث عیسی بن ھشام" اگرچہ صحیح معنوں میں ناول کی تعریف میں نہیں آتے' تاہم ان دونوں نے عربی زبان میں باضابطہ ناول نگاری کے لئے راستہ ضرور ہموار کیا اور ان کی یہ اہمیت ایسی ہے کہ اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔

عربی زبان میں پہلا کامیاب ناول محمد حسین ہیکل کا "زینب" ہے جو مصر میں ۱۹۱۳ میں شائع ہوا۔ فن کی دنیا میں یہ ایسا نومولود تھا جو ابھی مکمل پختگی کو تو نہ پہنچا تھا' لیکن بہرحال زندہ اور سلامت رہا۔ اس کے بعد ناول نگاری میں نشوونما شروع ہوا اور اس زمانے میں (یعنی دو عظیم جنگوں کے بیچ کے برسوں میں) یہ اپنی پختگی اور بلوغ کو پہنچ گیا۔ ناول کی صنف میں نئے لکھنے والوں کے ساتھ کچھ بڑے ادیب بھی شامل ہو گئے (جیسے طٰہ حسین' ابراہیم عبدالقادر المازنی اور توفیق الحکیم وغیرہ) جس سے اس فن کو وقار حاصل ہوا۔

عربی میں جب لوگوں نے ناول لکھنے شروع کئے تو گویا ان کا بیاڑہ کھل گیا اور وہ ناول لکھتے چلے گئے۔ ان ناولوں کے موضوعات اور بنیادی خیال ایک دوسرے سے مختلف تھے۔ چنانچہ ان میں سے بعض ناول نگاروں نے اپنے کسی کردار کے نفسیاتی تجربے کو کہانی کی بنیاد بنایا' بعض نے اپنے ذاتی تجربوں کو سامنے رکھ کر ناول لکھے' بعض نے معاشرے کے بعض طبقوں کے مسائل کہانی کی صورت میں پیش کیے اور کچھ دوسرے لوگوں نے قدیم تاریخ کو ناول کا موضوع بنایا۔ ان ناول نگاروں میں وہ لوگ بھی تھے جو اس سے پہلے افسانہ نگاری میں اپنا مقام بنا چکے تھے۔ اس لئے وہ ناول کی طرف آئے تو اس میں بھی انہوں نے اپنے فن کا اچھا مظاہرہ کیا۔ ان میں سے محمود تیمور' محمود طاہر لاشین' اور توفیق الحکیم کے نام لیے جا سکتے ہیں۔

عربی ناولوں کی اس ساری پیداوار کو اگر سامنے رکھا جائے' تو انہیں مندرجہ ذیل اصناف میں تقسیم کیا جا سکتا ہے:

## ۱۔ نفسیاتی تجربے کے ناول

ان میں عیسی عبید کا "ثریا" محمود تیمور کا "رجب آفندی" محمود تیمور ہی کا "الاطلال" اور طٰہ حسین کا



"ادیب" شامل ہیں۔

## ۲۔ ذاتی تجربے کے ناول

ان میں ابراہیم عبدالقادر مازنی کا "ابراھیم الکاتب" عباس محمود العقاد کا "سارہ" توفیق الحکیم کا "عصفور من الشرق" اور محمود تیمور کا "نداء المجھول" آتے ہیں۔

## ۳۔ معاشرتی طبقوں کے ناول

اس صنف میں محمود طاہر لاشین کا "حواء بلا آدم" اور طٰہ حسین کا "دعاء الکروان" اچھی مثالیں ہیں۔

## ۴۔ ذہنی ناول

یہ ناول کی ایک خاص قسم ہے' جس کی توفیق الحکیم کا ناول "عودۃ الروح" صحیح نمائندگی کرتا ہے۔

## ۵۔ تاریخی ناول

اس صنف میں محمد فرید ابوحدید کا "ابنۃ المملوک" اور نجیب محفوظ کا "عبث الاقدار" کچھ عمدہ نمونوں کی صورت میں سامنے آتے ہیں۔

اوپر مختلف اصناف کے تحت جن ناولوں کے نام لئے گئے' ان میں سے کسی ایک ناول کو لے کر اس کی کہانی مختصراً بیان کی جاتی ہے' تاکہ ایک اندازہ قائم ہو سکے کہ اس میں ناول نگار نے کیا کہنا چاہا ہے اور کس طرح سے کہا ہے۔

### ۱۔ نفسیاتی تجربے کا ناول: طٰہ حسین کا ''ادیب'' (۱۹۳۵)

یہ ناول ایک ایسے ادیب کے حالات و کردار کا تفصیلی مطالعہ ہے' نیز اس کی ذہنی کیفیات کا تجزیہ ہے جسے ناول کا راوی (جو خود طٰہ حسین ہے) بہت قریب سے جانتا ہے۔ یہ ادیب باوجود اپنے عاجزانہ اور دیہاتی پس منظر کے اپنی غیر معمولی قابلیت کی وجہ سے اعلیٰ تعلیم کے لئے فرانس جانے کا وظیفہ حاصل کر لیتا ہے۔ لیکن ایک بات اس نے چھپا کے رکھی ہے کہ وہ شادی شدہ ہے۔ اب جب اس کے باہر جانے کا وقت آتا ہے تو وہ اس کشمکش میں پڑ جاتا ہے کہ وظیفہ قربان کر دے یا اس کی خاطر اپنی عائلی زندگی کی



Scanned with CamScanner

قربانی دے۔ اس کا دوست اسے وظیفہ قربان کرنے کا مشورہ دیتا ہے۔ لیکن وہ کچھ دن گومگو کی کیفیت میں رہنے کے بعد آخر اپنی بیوی کو طلاق لکھ کر بھجوا دیتا ہے اور خود تعلیم کے لئے فرانس چلا جاتا ہے۔ یہاں پہلے وہ مرسیلیہ میں اترتا ہے اور پہلی رات جینوا کے ایک ہوٹل میں گزارتا ہے۔ اس نیت سے کہ دوسرے دن پیرس چلا جائے گا' لیکن یہاں اسے ایک لڑکی فرنند مل جاتی ہے جو اسی ہوٹل میں کام کرتی ہے۔ وہ اس کے ساتھ تعلق قائم کر لیتا ہے۔ پھر پیرس جا کر وہ کچھ عرصے کے بعد ایک تعلیمی مقصد کے بہانے پھر مرسیلیہ آ جاتا ہے اور اس لڑکی سے ملتا ہے۔ یہاں وہ ایک عرصہ اکٹھا رہتے ہیں۔ جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ہمارا یہ "ادیب" بیمار پڑ جاتا ہے۔ اور بڑی مشکل سے پیرس واپس پہنچ کر اپنا علاج کراتا ہے اور اپنی تعلیم جاری رکھتا ہے۔ صحت یاب ہونے کے بعد وہ جو امتحان دیتا ہے اس میں بہت اونچے نمبروں سے کامیاب ہوتا ہے۔ اس اثنا میں عالمی جنگ چھڑ جاتی ہے اور مصری یونیورسٹی اپنے سب طلبہ کو یورپ سے واپس آ جانے کے لئے کہتی ہے۔ لیکن یہ صاحب آنے سے انکار کر دیتے ہیں اور وہیں رہ جاتے ہیں۔ وقت کے ساتھ اب اس نوجوان کی زندگی میں تبدیلی آ جاتی ہے۔ اب وہ کبھی تو اپنی پڑھائی میں بہت محنت کرتا ہے اور کبھی اپنا وقت بے کاری اور تفریح میں گزارنے لگتا ہے۔ اس زمانے میں اس کی دوستی ایک اور لڑکی "ایلین" سے ہو جاتی ہے جو اس کے تفریحی لمحوں میں اس کا ساتھ دیتی ہے' اور اسے اچھا وقت مہیا کرتی ہے۔ پھر جب وہ سوربون کے امتحان میں بیٹھتا ہے تو یکایک اس کا ذہن خالی (Blank) ہو جاتا ہے اور وہ اپنے پرچے میں ایک لفظ بھی نہیں لکھ سکتا اور امتحان میں ناکام ہو جاتا ہے۔ اس کے بعد اس پر ذہنی اختلال کے دورے پڑنے لگتے ہیں اور وہ پیرس کے نواح میں ایک ہوٹل میں رہتے ہوئے یہ سمجھتا ہے کہ وہ قید میں ہے اور اسے افریقہ جلاوطن کر دیا گیا ہے۔ اس عرصے میں وہ بعض اوقات اپنے گاؤں کو اور اپنی بیوی حمیدہ کو بھی یاد کرتا ہے۔ لیکن پھر موت آ کر یہ سب کچھ ختم کر دیتی ہے۔

اس ناول میں "ادیب" کے جو حالات اور واقعات بیان ہوئے ہیں ان کے متعلق عام خیال یہ ہے کہ ان میں سے بہت کچھ ذرا مختلف صورت میں طٰہٰ حسین کے اپنے حالات ہیں۔ چنانچہ اس ناول کے کردار "ادیب" میں خود طٰہٰ حسین کافی حد تک موجود ہے۔ اس وجہ سے بعض ناقدین کی رائے یہ ہے کہ یہ ناول تجزیاتی ہونے کے ساتھ ساتھ ذاتی تجربے کا بھی ناول ہے۔

### ۲۔ ذاتی تجربے کا ناول: عباس محمود العقاد کا "سارہ" (۱۹۳۸)

یہ ایک مرد اور ایک خوبصورت اور آزاد خیال لڑکی کی کہانی ہے۔ جن کی محبت بہت سے اتار چڑھاؤ سے گزرتی ہے اور بالآخر ختم ہو جاتی ہے۔



"ہمام" کو یہ لڑکی "سارہ" ایک درزن کے ہاں ملی تھی جس سے وہ اپنے ایک دوست کے بارے میں پوچھنے گیا تھا۔ سارہ کی خوبصورتی اور دلکش شخصیت نے اس کا دل موہ لیا اور وہ اس کے عشق میں گرفتار ہو گیا۔ سارہ اگرچہ شادی شدہ تھی' لیکن یہ شادی اس کے لئے ناکام ثابت ہوئی تھی اور اسے اس سے کچھ نہیں ملا تھا۔ وہ ایک تعلیم یافتہ اور آزاد خیال لڑکی تھی' اور یورپ کی ہر چیز پر جان چھڑکتی تھی۔ اس نے زندگی میں جنسی پابندی کا ([illegible]) رویہ اختیار کیا ہوا تھا اور چاہتی تھی کہ اس زندگی سے زیادہ سے زیادہ لطف حاصل کرے۔ ہمام اور سارہ کی محبت بڑھنے لگی اور ان کی ملاقاتیں بھی زیادہ ہونے لگیں۔ لیکن سارہ کی لاابالی طبیعت اور اس کے آزادمنش رویے نے ہمام کے لئے فکر و پریشانی کے اسباب پیدا کر دیے' اور اس کے دل میں سارہ کے کردار اور اس کی وفا کے بارے میں کچھ شکوک پیدا ہونے لگے۔ یہ شکوک جب زیادہ ہونے لگے تو ان کے بارے میں اصل حالات معلوم کرنے کے لئے اس نے اپنے ایک دوست "امین" کو سارہ کے پیچھے لگا دیا۔ لیکن وہ کچھ دن لڑکی کا پیچھا کرنے کے باوجود کوئی ایسی معلومات فراہم نہ کر سکا جن سے ہمام کو یقین حاصل ہو جاتا۔ اس دوران میں ہمام اور سارہ کے تعلقات کبھی تو اچھے اور گرم جوش ہو جاتے' اور کبھی پھر سے سرد پڑ جاتے اس لئے کہ سارہ ہمام کو مسلسل شک و شبہے کے مواقع مہیا کرتی رہتی۔ آخر اس نے اپنے دوست "امین" کو پھر سے باقاعدہ طور پر سارہ کی جاسوسی کرنے کا کام سونپ دیا۔ کچھ عرصے کے بعد امین نے آ کر خبر دی کہ سارہ ایک گھر میں بار بار جاتی ہے اور ایک شخص کے کمرے میں رہتی ہے۔ یہ سن کر ہمام کو اطمینان حاصل ہوتا ہے اور اس نے جو تعلق عارضی طور پر قطع کیا تھا' اب اسے پوری طرح ختم کر دیتا ہے۔ اگرچہ اس کے بعد بھی وہ سوچتا رہ جاتا ہے کہ کہیں ایسا تو نہیں ہے کہ سارہ دوستی کے زمانے میں تو اس کے ساتھ وفادار رہی' لیکن جب وہ اس کے ساتھ قطع تعلق کر لیتا تو وہ اس کی دوستی سے مایوس ہو کر دوسرے راستے اختیار کرنے لگی۔

اس ناول کا ہیرو ہمام خود عقاد ہے۔ اس نے صرف نام تبدیل کیا ہے' باقی اس کی شخصیت' اس کی سوچ' اس کا فلسفہ اور لوگوں اور خاص کر عورتوں کے بارے میں اس کی آراء بالکل عقاد کی اپنی ہیں۔ حتیٰ کہ اس کا پیشہ بھی وہی ہے جو عقاد کا رہا یعنی صحافت اور تصنیف و تالیف۔ اس وجہ سے عقاد نے اس ناول میں ہمام کے کردار کے روپ میں ایک ایسی گہری محبت کا بالکل ذاتی تجربہ بیان کیا ہے جس میں شک اور غیرت زہر گھول دیتے ہیں۔ بعض لوگوں کا اور غالباً عقاد کا اپنا بھی خیال ہے کہ یہ ناول شاید ہمام کے ساتھ ساتھ سارہ کے کردار کا ایک نفسیاتی تجزیہ بھی پیش کرتا ہے۔ اس بنا پر اسے نفسیاتی تجربے کا ناول بھی کہا جا سکتا ہے۔



Scanned with CamScanner

### ۳۔ معاشرتی طبقے کا ناول: محمود طاہر لاشین کا ''حواء بلا آدم'' (۱۹۳۴)

یہ ناول غریب طبقے کے مسائل کے بارے میں ہے' جن کے حل کے لئے یہ طبقہ سرتوڑ کوشش کرتا ہے' لیکن اس کے سامنے پتھر کی ایسی دیوار آ جاتی ہے کہ وہ اسے ہٹا نہیں سکتا۔

''حواء'' ایک غریب اور یتیم لڑکی ہے جسے اس کی نانی پالتی ہے' اس لئے کہ اس کی ماں کی وفات کے بعد اس کے باپ نے دوسری شادی کر لی ہے۔ باوجود نامساعد حالات کے حواء اپنی تعلیم میں دلچسپی لیتی ہے اور اپنی ذہانت کے طفیل کالج میں بہت اچھے نمبروں سے کامیاب ہوتی ہے۔ اسے تعلیم کے لئے باہر بھجوائے جانے کے لئے بھی مستحق قرار دیا جاتا ہے' لیکن اونچے طبقے کی کوششوں سے حواء باہر جانے میں کامیاب نہیں ہو سکتی اور اس کی جگہ ایک امیر آدمی کی لڑکی کو بھیج دیا جاتا ہے۔ اس پر حواء کے معصوم دل میں بغاوت اور نفرت کے جذبات پیدا ہوتے ہیں' لیکن وہ اس بارے میں کچھ بھی نہیں کر سکتی۔ آخر وہ اپنے آپ کو کام میں مصروف کر لیتی ہے' اور اس کے ساتھ کچھ سماجی خدمات کے لئے اپنے آپ کو وقف کر دیتی ہے۔ وہ کچھ عرصہ موسیقی کا فن بھی سیکھتی ہے۔ اس اثناء میں وہ ایک خیراتی ادارے کے سکول میں ٹیچر لگ جاتی ہے۔

ایک خیراتی جلسے میں جس میں وہ سب سے نمایاں اور پیش پیش ہوتی ہے' وہ ایک امیر خاندان سے متعارف ہوتی ہے۔ خاندان کی بیگم اسے پسند کر لیتی ہے اور اسے اپنی بیٹی کی تعلیم پر مامور کرتی ہے۔ حواء اب ان پاشا لوگوں کے گھر میں آنے جانے لگتی ہے جہاں وہ ہر طرف عیش و حشم کے سامان دیکھتی ہے۔ اور گھر کی کشادگی' چمک دمک اور چیزوں کی فراوانی دیکھ کر اس کے دل میں خیال پیدا ہوتا ہے کہ کاش اسے بھی کبھی اس طرح کی زندگی میسر آ سکتی۔ دریں اثناء اس کو خاندان کا بیٹا ''رمزی'' اچھا لگنے لگتا ہے۔ وہ تعلیم یافتہ ہونے کے باوجود کچھ شرمیلا اور دھیمی شخصیت کا ہے۔ حواء اسے اپنے لئے پسند کر لیتی ہے' اور ایک دفعہ کسی اتفاق سے اسے اپنے گھر بھی لے جاتی ہے' لیکن اپنے گھر کی حالت دیکھ کر بعد میں پچھتاتی ہے کہ رمزی کو اپنا گھریلو ماحول نہیں دکھانا چاہیے تھا۔ ایک دفعہ پاشا اور اس کی بیگم کہیں باہر جاتے ہیں تو حواء کو اپنی چھوٹی بیٹی کو تھیٹر دکھانے کے لئے بھیجتے ہیں اور رمزی کو بھی ان کے ساتھ کر دیتے ہیں۔ اس سے حواء کے دل میں امید کی ایک کرن پیدا ہو جاتی ہے۔

لیکن یہ امید زیادہ دیر نہیں رہتی۔ اس لئے کہ رمزی کی منگنی پاشا کے ایک امیر دوست کی بیٹی سے ہو جاتی ہے۔ یہ صدمہ حواء کے لئے شدید ہوتا ہے' اور رمزی کی شخصیت کی کمزوری کو دیکھتے ہوئے وہ اس سے بھی کسی مدد کی امید نہیں کر سکتی۔ آخر شادی کا دن آ جاتا ہے۔ شادی کی رات حواء پاشا لوگوں کے گھر



جاتی ہے اور دوڑ دوڑ کر شادی کا سارا کام کاج کرتی ہے۔ پھر اپنے گھر واپس آ کر وہ عروسی جوڑا پہنتی ہے اور ایک زہر پی کر لیٹ جاتی ہے اور مر جاتی ہے۔

یہ ناول عربی میں بہت اچھا لکھا ہوا تھا' اس لئے کافی مقبول ہوا۔ صرف ایک اعتراض جو اس پر بعض حلقوں کی طرف سے ہوا یہ تھا کہ حواء کو اگر مرنا ہی تھی تو اسے دلہن کا لباس پہننے کی کیا ضرورت تھی۔ اس سے ناول میں خواہ مخواہ جذباتی عنصر پیدا کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ لیکن دوسرے لوگوں نے اس انجام کو بالکل فطری سمجھا۔ اس لئے کہ بیچاری غریب لڑکی اتنا عرصہ اونچے خاندان کی بہو بننے کا خواب دیکھتی رہی تھی۔ اور جیسا کہ عموماً ہوتا ہے اس کے لئے اس نے ایک عروسی جوڑا بھی بنا رکھا ہوگا۔ اب جب اس نے مرنے کا فیصلہ کیا تو پاشا لوگوں کو یہ بتانا چاہا کہ ایک دلہن وہ بھی تھی جو ان کے گھر کی بہو بن سکتی تھی' لیکن طبقاتی فاصلے کی وجہ سے نہ بن سکی۔

۴۔ ذہنی ناول کی صرف ایک ہی مثال زیادہ معروف ہے اور وہ توفیق الحکیم کا ''عودۃ الروح'' ہے' لیکن اس ناول کی کہانی کی پیچیدگی اور طوالت کے باعث اس کا اختصار یہاں پیش کرنا مناسب نہیں معلوم ہوتا۔

### ۵۔ تاریخی ناول: نجیب محفوظ کا ''عبث الاقدار'' (۱۹۳۹)

یہ ان تین ناولوں میں سے پہلا ناول ہے جس کی بنیاد مصر کی قدیم تاریخ کے واقعات پر ہے۔ نجیب محفوظ نے دراصل ۱۹۳۰ میں انگریزی زبان کی ایک کتاب A History of Egypt کا عربی میں ترجمہ کیا تھا جس میں فراعنہ کے زمانوں کی تاریخ کا احوال تھا۔ اس سے نجیب کی توجہ تاریخی ناول لکھنے کی طرف مبذول ہوئی۔ اگرچہ اس کا منصوبہ تو بہت بڑا تھا' تاہم وہ صرف تین ناول ہی لکھ پایا' جن میں سے پہلا عبث الاقدار (تقدیر کا کھیل) ہے۔ یہ ناول قومی تاریخی ناول کی صحیح ابتدا قرار دیا جاتا ہے' جس میں تاریخ کی تعلیم نہیں دی جاتی' بلکہ تاریخی واقعات کو فنکارانہ انداز میں پیش کیا جاتا ہے۔

اس ناول کی کہانی مختصراً یہ ہے کہ مصر کے فرعون خوفو کو ایک نجومی بتاتا ہے کہ وہ اپنے خاندان کا آخری فرد ہے جو مصر کے تخت پر بیٹھا ہے۔ اس کے بعد جو شخص اس تخت پر بیٹھے گا وہ عوام میں سے ہوگا' اور وہ وہ بچہ ہے جو آج ''اون'' کی بستی میں ایک کاہن کے گھر میں پیدا ہوا ہے۔ نجومی کی اس پیشگوئی سے فرعون اس فکر میں پڑ جاتا ہے کہ مصر کے تخت کو ہر صورت میں عوام کے ہاتھوں میں جانے سے بچایا جائے۔ چنانچہ وہ اس بستی پر حملہ کرتا ہے تاکہ اس نومولود کو پنگھوڑے میں ہی قتل کر دے۔ لیکن کاہن کو بادشاہ کی نیت کا پتا چل جاتا ہے اور وہ اپنی تدبیر سے بچے کو ایک خادمہ ''زایا'' کے ہاتھ کہیں دور بھیج دیتا ہے' اور اس کی جگہ ایک خادمہ کے بچے کو اپنا بچہ بنا کر پیش کرتا ہے۔ بادشاہ اس سے کہتا ہے کہ ملک اور



Scanned with CamScanner

تخت کی خاطر اپنے بچے کو خود قتل کر دے۔ لیکن کاہن خنجر ہاتھ میں لے کر اپنے آپ کو مار دیتا ہے۔ اس پر بادشاہ آگے بڑھ کر پہلے ماں کو اور پھر بچے کو قتل کر دیتا ہے۔

اس کے بعد واقعات کا ایک طویل سلسلہ ہے جس کے دوران یہ ہوتا ہے کہ خادمہ زایا جو بچے کو لے کر کسی دوسرے مقام پر گئی تھی وہ راستے میں بڑی مصیبتوں میں گھر جاتی ہے اور بمشکل ان سے جان چھڑا کر وہ ایک زیر تعمیر ہرم کے انسپکٹر کے پاس پہنچ جاتی ہے اور اسے اپنا دکھڑا سناتی ہے۔ انسپکٹر اس سے شادی کر لیتا ہے اور اس کے بچے کو اپنے بچوں میں شامل کر دیتا ہے۔ یہ بچہ ''ددف'' عسکری تربیت پا کر ایک بہادر نوجوان کے روپ میں بڑا ہوتا ہے۔ اور ہر طرف اس کی ہمت اور شجاعت کے چرچے ہونے لگتے ہیں۔ ددف بعض مقابلوں میں کامیاب ہو کر ولی عہد کی پسندیدگی حاصل کر لیتا ہے اور اس کے گارڈز میں شامل ہو جاتا ہے۔ محل میں پہنچ کر وہ ایک شہزادی ''مری سی منخ'' کو دیکھتا ہے جو مصر کی سب سے خوبصورت لڑکی ہے اور اس کے عشق میں گرفتار ہو جاتا ہے۔ پھر کچھ واقعات میں وہ اپنی جرأت و شجاعت کا ثبوت دیتا ہے' اور ان میں سے ایک واقعے میں وہ ولی عہد کو شیر کے حملے سے بچاتا ہے۔ جس پر ولی عہد اسے پہلے اپنے گارڈز کا افسر اعلیٰ مقرر کرتا ہے اور پھر اس کو ایک فوج کی کمان دے کر سینا کی طرف روانہ کرتا ہے جہاں اسے باغیوں کی سرکوبی کرنی ہوتی ہے۔ ددف اس مہم سے کامیاب واپس آتا ہے تو سارے محل میں اس کی شان بڑھ جاتی ہے۔ اس موقع پر وہ بادشاہ خوفو سے شہزادی کا ہاتھ طلب کرتا ہے' جس پر بادشاہ راضی ہو جاتا ہے۔ یہ خبر سن کر ددف اپنے گھر آتا ہے تو قیدی عورتوں میں سے ایک عورت اسے ملتی ہے جو مصری زبان بولتی ہے اور بتاتی ہے کہ ان باقی لوگوں نے اسے بیس برس سے قید کر رکھا تھا اور وہ ان میں سے نہیں ہے۔ اس لئے وہ اسے ان سے نجات دلا دے۔ وہ اس عورت کو ایک کمرے میں چھوڑ کر گھر والوں کے ہاں چلا آتا ہے اور ان کی خوشیوں میں شریک ہو جاتا ہے۔ پھر اسے اس عورت کا خیال آتا ہے تو وہ اپنی ماں کو لے کر اس کے پاس جاتا ہے۔ وہ عورت اسے دیکھتے ہی پہچان لیتی اور پکارتی ہے: زایا' زایا' میرا بیٹا کہاں ہے۔ جب زایا اور وہ باتوں کا تبادلہ کرتے ہیں تو پتا چلتا ہے کہ وہ قیدی عورت ددف کی اصل ماں ہے جس نے اپنے بچے کی زندگی بچانے کی خاطر اسے زایا کے ہاتھ دور بھیج دیا تھا۔

اس موقع پر ددف کو خبر ملتی ہے کہ فرعون خوفو کے خلاف ایک سازش ہو رہی ہے جو ولی عہد نے تیار کی ہے۔ جس کے مطابق اگلے دن جونہی خوفو ہرم سے باہر آئے گا اسے قتل کر دیا جائے گا۔ ددف سارے کام چھوڑ کر خوفو کو اس سازش سے بچانے کی تدبیر سوچتا ہے اور دوسرے دن جب ایک حملہ آور بادشاہ کی رتھ پر حملہ کرتا ہے تو ددف آگے بڑھ کر اسے قتل کر دیتا ہے۔ مقتول کا نقاب اتارنے پر پتا چلتا



ہے کہ حملہ آور کوئی اور نہیں بلکہ ولی عہد تھا۔ بادشاہ خوفو پر اب سارے حالات منکشف ہو جاتے ہیں' اور وہ تسلیم کر لیتا ہے کہ نجومی نے جو کچھ کہا وہ سچ تھا۔ اس لئے وہ اس کے سوا کوئی چارہ نہیں دیکھتا کہ ملک ایک ایسے انسان کے حوالے کر دے جو اپنے اوصاف کی وجہ سے اس کا سب سے زیادہ حقدار ہے۔ اس طرح وہ ایک عوامی آدمی ددف کو مصر کا تخت حوالے کر دیتا ہے۔

نجیب محفوظ نے جب یہ تاریخی ناول لکھا تو یہ فکشن میں اس کا پہلا تجربہ نہیں تھا' بلکہ اس سے پہلے وہ متعدد افسانے لکھ چکا تھا' جو اس کے مجموعے ''همس الجنون'' میں شامل ہیں۔ اسی لئے نقادوں کی نظر میں یہ ناول تکنیکی اعتبار سے معیار پر پورا اترتا ہے۔ اس میں ناول نگار نے مختلف کرداروں کی جس طرح تصویر کشی کی ہے وہ انسانی طبائع کے بارے میں اس کے گہرے مشاہدے کا پتا دیتی ہے۔ نجیب محفوظ کا یہ ناول بہت دلچسپی سے پڑھا جاتا رہا ہے۔ کچھ نقادوں کو اس ناول میں زبان و بیان کی کچھ لغزشیں بھی دکھائی دیں' لیکن یہ چونکہ نجیب کے ابتدائی زمانے کا کام تھا۔ اس لئے اس طرح کی مسامحتوں کا عبارت میں راہ پا جانا کوئی بڑی بات نہیں تھی۔ تاہم آگے چل کر نجیب محفوظ کی زبان پختہ ہو گئی اور اس نے محلہ و بازار کی زندگی کو جس طرح سے بیان کیا اس کے لئے اس کا خاص اسلوب ہی سب سے موزوں تھا۔

☆......☆......☆

یہ ناول کے ابتدائی بلوغ کا زمانہ تھا۔ اس کے بعد اور خاص طور پر دوسری جنگ عظیم کے بعد کے لکھنے والوں کے ناولوں میں زیادہ معنویت' پختگی اور بدلے ہوئے سیاسی و سماجی حالات کا گہرا شعور دکھائی دینے لگتا ہے۔ اس عرصے میں عرب دنیا میں بہت اہم اور دوررس نتائج کے حامل واقعات رونما ہوئے' جن کا اثر اس دور کے لکھنے والوں کی تخلیقات میں کسی نہ کسی طور ظاہر ہو کر رہا۔

ان واقعات میں عرب ملکوں میں تیل کی دریافت ہے' جس کے نہ صرف ان ملکوں پر بلکہ بین الاقوامی دنیا پر گہرے اثرات مرتب ہوئے۔ ناول نگار عبدالرحمان منیف نے اپنے ایک انٹرویو میں کہا کہ عرب دنیا کے اندر ہماری معاصر زندگی میں جو ناول لکھے گئے ہیں ان کے بعض پہلوؤں کو سمجھنے میں تیل کی اقتصادیات مددگار ثابت ہو سکتی ہیں۔ اسی طرح جبرا ابراہیم جبرا کے ناول ''البحث عن الوليد مسعود'' میں ایک کردار کی زبانی تیل کی آمدنی سے جڑے ہوئے حالات کی بازگشت سنائی دیتی ہے۔ دوسرے یہ کہ اس زمانے میں مشرق اور مغرب کے باہمی تعلق کی صورت میں واضح تبدیلی رونما ہوئی۔ اس سے پہلے مشرق سے جو بھی طلبہ یورپ جاتے اور وہاں کچھ عرصہ رہتے تھے' وہ وہاں کی تہذیب اور طرز زندگی سے مرعوب ہو کر لوٹتے تھے۔ لیکن اب یہ رجحان بدل گیا۔ سوڈانی ادیب طیب صالح کے ناول ''موسم



Scanned with CamScanner

الهجرة الی الشمال" (شمال کی طرف ہجرت کا موسم) کے واقعات میں یہ بدلی ہوئی صورت حال دیکھی جا سکتی ہے۔ (سوڈانی ادیب یورپ کو شمال اور مشرق یعنی سوڈان کو جنوب کہتا ہے) —— اس کے ساتھ ساتھ اس دور میں اب ساری توجہ عرب قومیت اور مصر کی علاقائی قومیت پر مرکوز ہونے لگی اور ملک میں مغربی قوموں کے افراد کی موجودگی کی صورت میں بہت سی خرابیاں اور قباحتیں دیکھی جانے لگیں۔ نجیب محفوظ کا ناول "زقاق المدق" (Midaqq Alley) مصر میں انگریزوں کی موجودگی کی خرابیوں اور مضرتوں کو ایک سماجی المیے کی صورت میں سامنے لاتا ہے۔

پھر جیسا کہ پہلے بھی بتایا گیا' ۱۹۴۸' ۱۹۵۶ اور ۱۹۶۷ ایسے سال ہیں جو جدید عرب دنیا کے لیے مصائب و آفات کے سال ثابت ہوئے۔ ان تینوں برسوں میں نوزائیدہ مملکت اسرائیل نے عربوں کو میدان جنگ میں بُری طرح شکست دے کر انہیں ان کی کمزوریوں سے آگاہ کر دیا۔ انہی حالات کے نتیجے میں ۱۹۵۲ میں مصر میں انقلاب آیا اور فوج نے بادشاہ کو معزول کر کے اقتدار خود سنبھال لیا۔ اس کے بعد کے واقعات میں جمال عبدالناصر کا نہر سویز کو قومیانے کا اقدام (۱۹۵۶) اور مصر و شام کا اتحاد (۱۹۵۸ـ۱۹۶۱) شامل ہیں۔ اس زمانے میں عرب اتحاد کا نعرہ اتنے زور سے بلند ہوا کہ خلیج عرب سے بحر اوقیانوس تک اس کی گونج سنی گئی۔ تاہم ۱۹۶۰ کی دہائی میں مصر میں عام زندگی جس ڈگر پر چل رہی تھی اس کے بعض پہلو خاصے بھیانک (Grim) تھے۔ نجیب محفوظ کا ناول "الکرنک" (۱۹۷۴) ان بھیانک پہلوؤں کو خاصی تفصیل کے ساتھ سامنے لاتا ہے۔

اس عشرے میں دراصل مختلف انقلابی نظاموں (Regimes) کے سامنے اب تنظیم نو کا کام تھا۔ یہ تعمیر کن بنیادوں پر اور کن اصولوں کی روشنی میں ہو۔ یہ ایک ایسا مسئلہ تھا جس میں حکمران طبقے اور عوام کے سوچنے اور سمجھنے والے طبقوں میں اختلافات پائے جاتے تھے۔ آمر حکومتوں کے سامنے مقابلے (Confrontation) کی یہ فضا ایک بڑا چیلنج تھا۔ اس زمانے میں جو ادب پیدا ہوا اس میں علامتوں کا استعمال دیکھا جانے لگا ہے۔ جب آپ اپنی بات مکمل کر نہ کر سکیں تو پھر آپ علامتی انداز بیان کا سہارا لیتے ہیں۔ چنانچہ دانشور اور ادباء جو بات ان حالات میں کہنا چاہتے تھے وہ اپنے ناولوں کے مختلف کرداروں کی زبانی کہتے تھے۔ ایسا ایک ناول نجیب محفوظ کا "ثرثرة فوق النیل" (نیل کی لہروں پر گپ شپ) ہے۔ جس میں ایک کشتی (House Boat) پر بہت سے لوگ جو پڑھے لکھے' سوچنے سمجھنے اور زندگی کا تجربہ رکھنے والے ہیں' سوار ہیں اور کشتی نیل کی لہروں پر رواں ہے۔ ان لوگوں میں ایک وکیل ہے' ایک افسانہ نگار ہے' ایک نظریہ حقوق نسواں (Feminism) کی تحریک کی کرتا دھرتا خاتون ہیں' ایک سرکاری عہدہ دار ہے' ایک آرٹ کا نقاد ہے' جو ایک ایسی خاتون کا ساتھی ہے جو امور نسواں میں خاصا



تجربہ رکھتی ہیں اور کشتی میں سوار ہونے والی نوجوان لڑکیوں کے لیے ایک اچھی رہنما ہیں —— یہ سب لوگ کشتی پر سوار اپنے خیالات کا تبادلہ بھی کرتے جاتے ہیں اور مصر کے حکومتی نظام اور ملکی اور معاشرتی صورت حال پر کھل کر رائے زنی بھی کرتے جاتے ہیں۔

جون ۱۹۶۷ کی تباہ کن شکست کے حالات شامی ادیب حلیم برکات نے اپنے ناول "عودة الطائر الی البحر" میں بیان کیے ہیں۔ یہ ایسی جنگ تھی جس میں عربوں کی طرف سے کوئی ہیرو نہیں تھا۔ اس شکست کا ردعمل دو طرح سے ہوا: ایک مکمل خاموشی کی صورت میں اور دوسرا شدید برہمی کے برملا اظہار کی صورت میں۔ اس شکست سے پیدا ہونے والی صورت حال میں فلسطینی لوگوں کے اس المیے نے جنم لیا جسے وہ آج تک بھگت رہے ہیں۔ اس المیے کے حل کی ایک کوشش میں کیمپ ڈیوڈ کا معاہدہ طے ہوا' لیکن اس کی وجہ سے ایک طرف حکمرانوں اور دوسری طرف فوج کے بعض عناصر اور عوام کے درمیان شدید اختلافات پیدا ہو گئے۔ یہاں تک کہ مصری صدر انور السادات کو ۱۹۸۱ میں اس کی پاداش میں جان سے ہاتھ دھونے پڑے۔ پھر لبنان میں بھی خانہ جنگی رہی اور اسرائیل نے اس پر قبضہ کیا' جس نے حالات کے بگاڑ میں اور اضافہ کر دیا۔

ان سب حالات نے ارباب عقل و دانش اور ادباء کو کئی سطحوں پر متاثر کیا۔ یقیناً ناول نگار بھی ان سے الگ تھلگ نہ رہ سکے۔ چنانچہ ۱۹۵۰ کے بعد کی دو دہائیوں میں جو ناول لکھے گئے ان میں یہ سارا ماضی کبھی راست طور پر' کبھی زیریں رَو کی صورت میں اور کبھی علامتی اور بالواسطہ انداز میں دیکھا اور پرکھا جا سکتا ہے۔ ان برسوں میں جو ناول لکھے گئے ان کا احاطہ تو ناممکن سی بات ہو گی' البتہ ان میں سے آٹھ اہم ناولوں اور ان کے مصنفین کے نام نیچے دیے جاتے ہیں۔ ان کا انتخاب ایک مغربی فاضل روجر ایلن نے عربی ناول کے موضوع پر اپنی ایک کتاب میں کیا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ یہ آٹھ ناول میری طرف سے "عربی کے بڑے ناولوں" کی فہرست تیار کرنے کی کوشش نہیں ہے۔ البتہ یہ ناول بہت سی باتوں میں ایک دوسرے سے مختلف ہوتے ہوئے بھی ناول نگاری کی معاصر روایت کی اچھی نمائندگی کرتے ہیں:

| | | |
|---|---|---|
| ۱۔ ثرثرة فوق النیل | نجیب محفوظ | (۱۹۶۶) |
| ۲۔ ما تبقی لکم | غسان کنفانی | (۱۹۶۶) |
| ۳۔ عودة الطائر الی البحر | حلیم برکات | (۱۹۶۰) |
| ۴۔ ایام الانسان السبعة | عبدالحکیم قاسم | (۱۹۶۹) |
| ۵۔ موسم الهجرة الی الشمال | طیب صالح | (۱۹۶۹) |
| ۶۔ السفینة | جبرا ابراہیم جبرا | (۱۹۷۰) |

۷۔ چار ناول: اسماعیل فہد اسماعیل (۱۹۷۱ـ۱۹۷۳)

کانت السماء زرقاء

المستنقعات الضوئیۃ

الحبل

الضفاف الاخری

۸۔ النہایات عبدالرحمان منیف (۱۹۷۸)

ناول نگاری کے فن کی پختگی کے اس دور میں اب ناولوں کی کہانیاں اور پلاٹ سادہ نہیں رہتے۔ ان میں کرداروں کی تعداد اور ان سے جڑے ہوئے واقعات کی تعداد بھی زیادہ ہوتی جاتی ہے اور ان کی شخصیتیں بھی پیچیدہ ہوتی جاتی ہیں۔ چنانچہ ان آٹھ ناولوں کی کہانیوں کو اگر اختصار کے ساتھ بیان کرنے کی کوشش بھی کی جائے تو کتاب کے اس حصے میں اس کی گنجائش نہیں نکل سکے گی۔ اس لیے نیچے ان ناولوں کے موضوعات کی طرف کچھ اشارے کیے جائیں گے یا ان میں سے بعض کی کہانی کا ڈھانچا سا بیان کیا جائے گا۔

نجیب محفوظ کے ناول "ثرثرۃ فوق النیل" کا موضوع کیا ہے؟ اس کا ذکر اوپر آ چکا ہے۔ یہ دراصل واقعات کا نہیں تنقیدی افکار و آراء کا ناول ہے۔ غسان کنفانی ایک فلسطینی ناول نگار ہے۔ اس نے فلسطینی لوگوں کے المیے کو جس موثر طریقے سے پیش کیا ہے کوئی دوسرا نہیں کر سکا۔ بقول ناول نگار کے اس ناول کے پانچ ہیرو ہیں: حامد، مریم، زکریا، وقت اور صحرا۔ اور یہ سب متوازی خطوط یا مختلف سمتوں میں حرکت نہیں کرتے" بلکہ وہ ایک دوسرے کو ایسے بندھے ہوئے طریقے سے کاٹتے ہیں کہ ان سب سے مل کر کہانی کی صرف دو لڑیاں (Threads) بن پاتی ہیں۔ غسان کے اس ناول میں تجربے کے عمل کی بعض خصوصیات نے اس میں فنکارانہ خوبی پیدا کر دی ہے۔ حلیم برکات کا ناول علاوہ دوسری باتوں کے جون ۱۹۶۷ کی چھ روزہ جنگ کے واقعات کی ایک پُر اثر اسلوب میں واقعاتی تصویریں پیش کرتا ہے اور بتاتا ہے کہ کس طرح یہ واقعات عام عرب سوسائٹی پر اثر انداز ہوتے ہیں۔ اس کے لیے وہ کچھ کردار تخلیق کرتا ہے اور ان کے گرد ایک دلچسپ اور قابل یقین کہانی کا تانا بانا بنتا ہے۔ عبدالحکیم قاسم کا ناول مصری دیہی سوسائٹی اور اس میں رہنے والے ان سات درویشوں کی کہانی بیان کرتا ہے جو ایک بزرگ کی خانقاہ کی سالانہ زیارت کے لیے نکلتے ہیں۔ یہ کہانی جو پندرہ برسوں پر پھیلی ہوئی ہے اس کی روایت ایک نوجوان کرتا ہے جو پندرہ برس بعد اپنی یونیورسٹی تعلیم کے نتیجے میں کافی بدل چکا ہے اور اب واپس آ کر وہ پچھلے سارے واقعات کو ایک دوسری نظر سے دیکھتا ہے۔ طیب صالح کا ناول جدید عربی ادب کے ان متعدد



ناولوں میں سے ہے جن کا موضوع مشرق اوسط اور مغرب کی تہذیبوں کے ملاپ سے پیدا ہونے والے مسائل ہیں۔ اس ناول میں ایک دوسری سے جڑی ہوئی دو کہانیاں ہیں اور اس کے دو ہی راوی ہیں اور وہ دونوں سوڈانی ہیں۔ پہلے راوی کی کہانی جب اس مرحلے پر پہنچتی ہے جب نوجوان انگلستان میں کئی سال گزار کر اپنے وطن واپس آ جاتا ہے تو دوسرا راوی، جو خود بھی انگلستان میں سات سال رہ کے آیا ہے، بعد کے واقعات بیان کر کے کہانی کو آگے بڑھاتا ہے۔ یہ ناول جب ۱۹۶۷ میں شائع ہوا تو نقادوں نے اس کا بڑا خیر مقدم کیا۔ وقت کے ساتھ ساتھ اس ناول کی ہر دلعزیزی بڑھتی گئی ہے اور اب لگتا ہے کہ یہ ناول عربی فکشن کی ایک چھوٹی سی کلاسیک ثابت ہوگا۔

جبرا ابراہیم جبرا بھی فلسطینی ناول نگار ہے۔ یہ چونکہ بہت پڑھا لکھا اور موسیقی اور مصوری سے گہرا شغف رکھنے والا ادیب ہے، اس لیے اس کے ناول کے کردار عموماً انٹیلیکچوئل اور فنکار اور فلسفی ہوتے ہیں۔ اس کا یہ ناول "السفینۃ" (The Ship) ایک جہاز پر سفر کرنے والے چند کرداروں کی کہانی اور ان کا ایک طرح سے نفسیاتی مطالعہ ہے۔ ان کرداروں میں ایسے محبت کرنے والے جوڑے ہیں جن میں سے بعض کی شادی دوسری جگہ ہو چکی ہے، لیکن وہ اپنے پہلے عاشقوں میں اپنی دلچسپی قائم رکھتے ہیں اور ان کے ساتھ رہنے کے لیے باقاعدہ منصوبہ بنا کر اس جہاز کے سات روزہ سفر کا پروگرام بناتے ہیں جو بیروت سے یونان جا رہا ہے۔۔۔۔ ناول کا صرف نام ہی سمندر سے متعلق ہے، ورنہ ناول کے موضوع کا زیادہ تعلق زمین سے ہے، جو کسی کے لیے تاریخ ہے، کسی کے لیے ایک رائے داری ہے اور کسی کے لیے مستقبل کی آرزو ہے۔

اسماعیل فہد اسماعیل کے چار ناول وقت کے جس فریم میں رکھے گئے ہیں وہ ۱۹۶۰ کی دہائی کا عراق اور اس کے خاص حالات ہیں۔ ان چار ناولوں کی صورت میں اسماعیل نے بہت بڑا منصوبہ بنایا تھا جو شاید نجیب محفوظ کے ٹرائلوجی سے بھی آگے جاتا۔ لیکن اسے وہ کامیابی حاصل نہ ہو سکی جو اس سے متوقع تھی۔ اس کے باوجود اسماعیل کے یہ الگ الگ ناول تکنیک کے لحاظ سے، وقت کو برتنے کے لحاظ سے اور ناولوں کے مرکزی کردار کے شعور و آگہی کی مختلف سطحوں کی دریافت کے اعتبار سے بہت سی خوبیاں اپنے اندر رکھتے ہیں۔ ان ناولوں میں تاریخ بھی ہے، سیاست بھی ہے اور معاشرتی تناؤ اور آویزش کی بعض صورتوں کی حکایت بھی ہے۔ اسماعیل فہد اسماعیل کے طرز نگارش کی ایک خصوصیت اس کا اختصار ہے۔ وہ کم سے کم الفاظ میں اپنے کرداروں کے باطن کی کیفیت بیان کرتا ہے اور اس میں وہ ایسی فنکاری سے کام لیتا ہے جیسے وہ کوئی نثری نظم لکھ رہا ہو یا مختصر ترین مختصر افسانہ لکھ رہا ہو۔

عبدالرحمان منیف کے اس ناول "النہایات" کو جو چیزیں دوسرے ناول سے جدا کرتی ہیں وہ اس

میں پایا جانے والا صحرا ہے' انتہائی شدید گرمی ہے' سفر کی دشواریاں ہیں اور خوراک کی تلاش ہے۔ اس ناول کا ماحول ایک گاؤں الطیبہ ہے جو بالکل صحرا کے کنارے واقع ہے اور زندگی کی دشواریوں اور خطرات میں گھرا ہوا ہے۔ بڑے شہر میں افسر شاہی کے لوگ ایک عرصے سے اس گاؤں کے قریب ایک بند (Dam) بنانے کا سوچ رہے ہیں اور اس بارے میں بحثیں اور ملاقاتیں (Meetings) کیے جاتے ہیں' لیکن فیصلہ نہیں کر پا رہے۔ ایک دفعہ ایسا ہوتا ہے کہ اس گاؤں میں چار مہمان آ نکلتے ہیں جو اس علاقے میں شکار کھیلنا چاہتے ہیں۔ ناول کا ہیرو عساف انہیں شکار کھلانے لے جاتا ہے۔ دن چڑھے تک وہ شکار کے پیچھے بھاگتے رہتے ہیں لیکن خاطر خواہ کامیابی نہیں ہوتی۔ دوپہر کا کھانا کھانے کے بعد انہیں پھر خیال آتا ہے کہ مزید شکار کھیلا جائے۔ عساف اب انہیں صحرا کے اندر دور ایک ایسے مقام تک لے جاتا ہے جہاں زیادہ شکار مل سکتا ہے۔ یہ سب لوگ صحرا کے اندر چلے جاتے ہیں۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ چاروں مہمان تو بڑی مشکل سے جان بچا کر واپس آ جاتے ہیں' لیکن عساف جو بہت دور نکل گیا تھا گرمی اور پیاس سے مر جاتا ہے۔ عساف کی آخری رسومات میں سارا گاؤں شامل ہوتا ہے اور جب وہ اسے دفن کر کے واپس آتے ہیں تو گاؤں کا بڑا مختار کہتا ہے۔ "اگر وہ ڈیم بنانے کا فیصلہ کر لیں تو میں ایک بل ڈوزر لے کے آؤں گا اور اس کام کی ابتدا اپنے ہاتھ سے کروں گا"...... اس طرح یہ ناول افراد کا ناول نہیں' بلکہ ایک آبادی اور برادری (Community) کا ناول ہے جو قدرت کی طاقتوں کے خلاف ایک ابدی کشمکش میں مبتلا ہیں اور جن کا سب سے بڑا مسئلہ بقا (Survival) کا ہے' یعنی یہ کہ وہ موسم کی سختیوں کا کیونکر مقابلہ کریں اور زندہ رہیں۔

عربی ناول کے موضوع پر بات ختم کرنے سے پہلے مصر کے سب سے ممتاز اور نوبل انعام یافتہ ناول نگار نجیب محفوظ کے متعلق کچھ باتیں بتانا ضروری معلوم ہوتا ہے۔ نجیب محفوظ (پیدائش ۱۱ دسمبر ۱۹۱۱) قاہرہ کے ایک قدیم محلے میں پیدا ہوا اور جامعہ فؤاد الاول (بعد میں قاہرہ یونیورسٹی) سے فلسفے کے مضمون کے ساتھ گریجویشن کی۔ اس کے بعد اس نے پوسٹ گریجویٹ تحقیق کے لیے بھی کام شروع کیا' لیکن پھر اسے چھوڑ کر وہ ادب کی طرف آ گیا۔

پچھلی کئی دہائیوں سے عربی ناول کے میدان میں نجیب محفوظ کا نام سب سے نمایاں چلا آتا ہے۔ اس کی تخلیقی سرگرمی کا یہ عالم ہے کہ ۱۹۸۱ تک کے عرصے میں اس کے تینتیس (۳۳) ناول اور مختصر افسانوں کے مجموعے شائع ہو چکے تھے۔ پھر ان میں سے متعدد کتابوں کے کئی کئی ایڈیشن نکل چکے ہیں (۱۹۸۱ میں تین ناولوں کا نواں ایڈیشن چل رہا تھا) اور یہ سب پورے مشرق اوسط میں بہت دلچسپی سے پڑھے جاتے ہیں۔ چنانچہ اس میں کوئی شک نہیں کہ وہ عرب دنیا کا سب سے معزز اور محبوب ناول نگار ہے۔ جب



۱۹۵۶۔۱۹۵۷ میں اس کا مشہور ثلاثیہ (Trilogy) "بین القصرین" پہلی دفعہ منظر عام پر آیا تو لوگوں کو فی الفور پتا چل گیا کہ ایک صف اول کا ناول نگار عربی افق پر نمودار ہوا ہے۔

نجیب محفوظ کے بارے میں تفصیل سے جاننے کے لیے ہم اپنے ملک کے مشہور عالم اور ادیب ڈاکٹر خورشید رضوی کے مضمون "نجیب محفوظ" سے رجوع کرنے کی سفارش کریں گے جو ان کے مجموعۂ مقالات "تالیف" میں شامل ہے۔ یہاں موقع اور موضوع کی مناسبت سے اس مضمون کے چند اقتباسات ذیل میں دیے جاتے ہیں:

"اس دور میں (یعنی ۱۹۴۵ کے مابعد) نجیب کے قلم کی رفتار تیز رہی اور اس نے ہر سال ایک ناول کے حساب سے "خان الخلیلی" (۱۹۴۶) "زقاق المدق" (۱۹۴۷) "السراب" (۱۹۴۸) اور "بدایۃ ونہایۃ" (۱۹۴۹) پیش کیے۔ "السراب" کو چھوڑ کر ان ناولوں میں مجموعی اعتبار سے قاہرہ کے نچلے متوسط یا محنت کش طبقے کی زندگی کی جیتی جاگتی تفصیلات بڑے موثر انداز میں سامنے لائی گئی ہیں اور یہی بالآخر نجیب محفوظ کا فنی امتیاز ٹھہرا۔

"۱۹۴۶ سے ۱۹۵۲ کے دوران نجیب محفوظ ایک طویل ناول بھی ترتیب دیتا رہا جسے بالآخر اس کے شاہکار کی حیثیت اختیار کرنا تھی۔ ۱۱۹۳ صفحات کے اس ناول کا نام نجیب نے "بین القصرین" رکھا۔ وہ کہتا ہے کہ جب میں اسے لے کر ناشر سعید السحار کے پاس پہنچا تو سحار نے اسے دیکھا۔ پھر ہاتھ میں لے کر ان ہزار صفحات کو الٹا پلٹا اور کہنے لگا۔ "اسے میں کیوں کر چھاپ سکتا ہوں؟ ناممکن سی بات ہے۔" پھر جب یوسف السباعی نے اسے "الرسالۃ الجدیدۃ" میں بالاقساط شائع کر دیا تو سحار نے کہا کہ ایک جلد میں تو اسے چھاپنا ممکن نہیں' تین حصوں میں تقسیم کر دیا جائے اور ہر حصے کا نام بھی الگ الگ ہو۔ اس طرح "بین القصرین" (۱۹۵۶) "قصر الشوق" (۱۹۵۷) اور "السکریۃ" (۱۹۵۷) شائع ہوئے جو مجموعی طور پر "الثلاثیۃ" (تین ناولوں کا سیٹ) کے نام سے معروف ہوئے۔ الثلاثیۃ میں قاہرہ کی تصویر کشی کو ڈکنز کے ہاں لندن اور زولا کے ہاں پیرس کی تصویر کشی سے مشابہ بتایا گیا ہے۔ نیز یہ کہا گیا ہے کہ ثلاثیہ کو عربی ادب کی تاریخ ہی میں نہیں بلکہ بیسویں صدی میں مصر کی معاشرتی تاریخ کے مطالعے میں بھی ایک سنگ میل کی حیثیت حاصل ہے۔

"الثلاثیۃ" ایک مصری خاندان پر مرور وقت کے ساتھ واقع ہونے والے تغیرات وحوادث کی داستان ہے۔ یہ ۱۹۱۷ سے لے کر ۱۹۴۴ تک کے زمانے پر پھیلی ہوئی ہے اور تاجر السید احمد عبدالجواد سے چل کر اس کی تیسری پشت تک کے کرداروں پر مشتمل ہے جو مختلف عوامل کے زیر اثر مصر کے متوسط طبقے کے بنتے بگڑتے ہوئے معاشرتی ونفسیاتی خدوخال کی عکاسی کرتے ہیں۔ ہر چند کہ اس داستان میں تقدیر' موت'



Scanned with CamScanner

محبت، سیاست وغیرہ بہت سے اہم موضوعات در آتے ہیں تاہم اس میں کسی مرکزی موضوع کو تلاش کرنا دشوار ہے۔ مجموعی اعتبار سے اسے ان اثرات کا ایک حزیں مشاہدہ کیا جا سکتا ہے جو وقت انسانوں پر مرتسم کرتا ہے اور جس پر انسانوں کا کچھ بس نہیں چلتا۔"

اس مضمون کا ایک دوسرا اقتباس نجیب محفوظ کے میلانات ونظریات کے بارے میں:

"نظریاتی اعتبار سے نجیب محفوظ کے ہاں مختلف اور بسا اوقات متضاد رجحانات کا ایک آمیزہ ملتا ہے۔ اس کے ہاں سوشلزم کے میلانات بھی محسوس کیے گئے اور مذہبی و روحانی تجربے کی تڑپ بھی۔ اس کے خیال میں سوشلزم کی ایک تعبیر یہ بھی تو ہو سکتی ہے کہ عدل خداوندی کے راستے کی تمام رکاوٹیں دور کر دی جائیں۔ اپنے رویے کے لیے اس نے "الصوفیۃ الاشتراکیۃ" (اشتراکی تصوف) کی ترکیب استعمال کی جس میں وہ گویا معاشرتی انصاف اور التطلع الی اللہ (خدا کی جستجو) کی یکجائی کی صورت پیدا کرتا ہے۔

"سیاسی طور پر غالباً Hilary Kiloptrik کے الفاظ اس کا ایک مناسب خاکہ پیش کرتے ہیں:

**a socially concerned man without a definite political commitment**

"چنانچہ الاخوان المسلمون کے لیے اس کی ناپسندیدگی اور بائیں بازو کے وفدیوں کی طرف اس کے جھکاؤ کا ذکر کیا گیا ہے۔ لیکن اسے "بائیں بازو کا آدمی" قرار دینا بھی مشکل ہے۔ کیمپ ڈیوڈ معاہدے کی حمایت پر بایاں بازو اس سے کیونکر خوش ہو سکتا ہے۔ اس کی بعض تحریروں نے اسے مذہبی حلقوں میں اور کیمپ ڈیوڈ معاہدے کی حمایت نے عرب دنیا کے بہت سے حلقوں میں معتوب بنا دیا اور اسے اسرائیلی عناصر سے اپنے ربط کی نفی کے لیے باقاعدہ وضاحتیں کرنا پڑیں۔ نوبل انعام پانے پر اسرائیلی وزیر خارجہ نے اسے مبارکباد کا پیغام بھیجا اور اسے رجل السلام (امن کا نمائندہ) قرار دیا۔ یہ بھی معلوم ہوا ہے کہ اسرائیلی اہل قلم اس سے ملاقات کرتے رہے ہیں اور اسرائیل میں کافی عرصہ قبل اس پر خاصا کام ہو چکا ہے، جس میں الثلاثیہ کا عبرانی ترجمہ بھی شامل ہے۔ اسرائیل کا یہ التفات یقیناً نئے سوالات اور عرب دنیا میں نجیب محفوظ کے لیے نئی مشکلات پیدا کرے گا۔ چنانچہ یہ خیال بھی عام ہے کہ نجیب کے نوبل انعام کے پس منظر میں کیمپ ڈیوڈ کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ تاہم یہ بات اپنی جگہ ریکارڈ پر موجود ہے کہ صف اول کے عرب اہل قلم نے بہت مدت پہلے اس کے فنی کمالات کو تسلیم کر لیا تھا۔ مثلاً "بین القصرین" کی اشاعت کے بعد طٰہٰ حسین نے کہا تھا کہ بلاشبہ یہ ناول دنیا کی کسی بھی زبان میں لکھے گئے بین الاقوامی سطح کے کسی بھی ناول سے موازنے کے لائق ہے۔ عباس محمود العقاد نے ۱۹۶۲ میں امریکی ادیب John Steinbeck کو ادب کا نوبل انعام ملنے پر تبصرہ کرتے ہوئے ناول اور ڈرامے کے میدان میں جن عرب ادیبوں کو اس کا ہم پلہ بلکہ بعض پہلوؤں پر اس پر فائق قرار دیا تھا ان میں نجیب محفوظ کا نام بھی شامل تھا۔"

☆......☆......☆



# عربی ادب میں ڈراما

مصر میں تھیٹر کی سرگرمی انیسویں صدی کے اواخر اور بیسویں صدی کے شروع برسوں میں دیکھنے میں آئی، خاص طور پر جب جارج ابیض نے مصر میں آ کر ایک تھیٹریکل کمپنی قائم کی۔ یہ سرگرمی پھر ۱۹۱۹ کے انقلاب کے بعد زیادہ ہوئی اور جہاں پہلے ایک کمپنی تھی اب وہاں سات آٹھ کمپنیاں اور ڈرامے کی انجمنیں دیکھی جانے لگیں۔ لیکن پہلی جنگ عظیم کے بعد کے برسوں کے تھیٹر میں ہر جگہ مزاح اور ظرافت کا رنگ غالب رہا اور سٹیج پر زیادہ مقبولیت مضحک کھیلوں کو حاصل ہوئی اور سنجیدہ ڈرامے کی حیثیت ثانوی رہ گئی۔ آگے چل کر سنجیدہ ڈرامے پیش کرنے والے تھیٹر کے لیے مشکلات پیدا ہو گئیں اور صورت حال کی اصلاح کے لیے ۱۹۲۳ میں رمسیس کمپنی وجود میں آئی جس نے سنجیدہ تھیٹر کی ساکھ بحال کرنی چاہی۔ تاہم زیادہ عرصہ نہ گزرا کہ اس کمپنی کو بھی مشکلات کا سامنے رہنے لگا جن میں سب سے بڑی مالی مشکلات تھیں کہ اس طرح کے تھیٹر کی آمدنی زیادہ نہیں ہوتی تھی۔ پھر یہ ہوا کہ اسی زمانے میں مصر میں سینما آ گیا۔ چنانچہ پہلی خاموش فلم ۱۹۲۷ میں اور پہلی ناطق فلم ۱۹۳۵ میں وہاں پردۂ سیمیں پر دکھائی گئیں۔ سینما کے آ جانے سے لوگوں نے اب تھیٹر جانا کم کر دیا۔

ان حالات میں نظر آنے لگا کہ سنجیدہ تھیٹر کی بقا کے لیے سرکاری سرپرستی کے سوا چارہ نہیں۔ چنانچہ ۱۹۳۵ میں سرکاری تھیٹریکل کمپنی قائم کی گئی اور اس کا سربراہ مشہور شاعر خلیل مطران کو بنایا گیا۔ اس طرح سینما کے پہلو بہ پہلو تھیٹر بھی چلتا رہا اور کچھ دوسری قومی سطح کی کمپنیاں بھی میدان میں آ گئیں، اس لیے کہ تھیٹر کا اپنا ذائقہ اور اپنا انداز تفریح تھا۔ اس زمانے میں تھیٹر کے تعلق سے بہت سے ادباء اور فنکار مشہور ہوئے مثلاً یوسف وہبی، زکی طلیمات، فواد شفیق، سلیمان نجیب اور خواتین میں روز الیوسف، فاطمہ رشدی، زینب صدقی وغیرہ جن میں سے کچھ نام جانے پہچانے لگیں گے۔ اس کے بعد یہ ہوا کہ ڈرامے کے فن کی تعلیم کے لیے ایک درسگاہ قائم کی گئی۔ لیکن یہ زیادہ دیر نہ چلی، اس لیے کہ قدیم روایات کے محافظوں نے اسے پسند نہ کیا۔ اسی طرح تھیٹر سے متعلق تعارفی اور تنقیدی مضامین کی اشاعت کے لیے ایک رسالہ بھی نکالا گیا۔

اس وقت تک تھیٹر کے لیے جو لوگ لکھ رہے تھے وہ کچھ معروف اور کچھ گمنام لکھنے والے تھے جو خود بھی لکھتے تھے اور فرانسیسی اور دوسری زبانوں سے ترجمہ بھی کرتے تھے۔ اس کے بعد یہ ہوا کہ دو بہت بڑے ادیب تھیٹر کے لیے لکھنے کی طرف مائل ہو گئے۔ یہ تھے مصر کے شاعر اعظم احمد شوقی اور مشہور ادیب اور ناول نگار توفیق الحکیم۔ ان دو اکابر کی تخلیقات کی وجہ سے عربی ڈراما اب باقاعدہ ادب کی ایک صنف

بن گیا اور ان لوگوں نے جو ڈرامے عربی زبان میں لکھے وہ عربی ادب کا حصہ قرار پائے۔

احمد شوقی نے فرانس میں اپنے قیام کے زمانے میں وہاں کا تھیٹر بہت دیکھا تھا۔ جس میں کلاسیکی ڈرامے بھی ہوتے تھے رومانی ڈرامے اور کچھ نئے اسلوب کے ڈرامے بھی۔ شوقی کو فرانس کے کلاسیکی ڈرامے نے زیادہ متاثر کیا۔ چنانچہ اس نے واپس آ کر عربی میں جو ڈرامے لکھے وہ ایک تو تاریخی شخصیات اور واقعات کے بارے میں تھے، دوسرے وہ سوائے ایک کے سب کے سب منظوم تھے۔ شوقی نے کل ملا کر سات ڈرامے لکھے، جن میں چھ المیہ (Tragedy) تھے اور ایک طربیہ (Comedy)۔ المیہ ڈراموں میں پانچ منظوم تھے اور ایک نثر میں تھا، اور جو ڈراما طربیہ تھا وہ بھی منظوم تھا۔ ان کے نام اس طرح ہیں:

(۱) علی بک الکبیر (۲) مصرع کلیوپترا (قلوپطرہ کا زوال) (۳) مجنون لیلی (۴) عنترہ (۵) قمبیز (۶) امیرۃ الاندلس (اندلس کی شہزادی) صرف یہی ڈراما نثر میں تھا (۷) الست ھدی: یہ طربیہ ڈراما تھا اس کے باوجود شوقی نے اسے منظوم رکھنا ہی بہتر سمجھا۔

افسوس ہے کہ جگہ میں گنجائش نہ ہونے کے باعث ان میں سے کسی ڈرامے کا کوئی نمونہ یہاں پیش نہیں کیا جا سکتا۔ البتہ چلتے چلتے ڈراما "مجنون لیلی" سے چند سطریں یہاں نقل کر دینے میں کوئی حرج نہیں۔ ڈرامے میں لیلیٰ نے بالآخر اپنے بڑوں کا کہا مان کر اپنے قبیلے کے ایک نوجوان ورد سے شادی کر لی ہے۔ مجنوں کو جب اس کا پتا چلتا ہے تو وہ لیلیٰ سے ملنے کے لیے آتا ہے۔ لیلیٰ کا شوہر جو ایک معقول انسان اور کھلے دل والا ہے اسے مجنوں سے ملنے دیتا ہے۔

| | | | |
|---|---|---|---|
| لیلی | : | أجل هو الزوج فاعلم قيس ان له | حقاً عليّ اؤديه و سلطانا |
| قیس | : | اذن تحابيتما! | |
| لیلیٰ | : | بل انت تظلمني | فما احبُّ سواک القلب انسانا |
| - | | ولست بارحة من داره ابدا | حتى يسرّ حتى فضلا و احسانا |
| | | نحن الحرائر ان مال الزمان بنا | لم نشكُ الا الى الرحمان بلوانا |
| قیس | : | بل تلحقين معي | |
| لیلیٰ | : | لا لا اخون له | عهداً فما حاد عن عهدي ولا خانا |
| | | فتىً كنبع الصفا لم يختلف خُلُقا | ولا تلوّن كالفتيان الوانا |
| قیس | : | (متهكماً) | |
| | | اراک في حب ورد جدّ صادقة | و كان حبک لي زُورا و بهتانا |



| | | |
|---|---|---|
| لیلیٰ | : | قیس! |
| (لیلی | : | ہاں وہ شوہر ہے اور یہ جان لو قیس کہ اس کا مجھ پر حق بھی ہے جسے میں ادا کروں گی اور غالب حیثیت بھی |
| قیس | : | تو تم دونوں ایک دوسرے سے محبت کرتے ہو۔ |
| لیلی | : | نہیں تم زیادتی کر رہے ہو، اس لیے کہ اس دل نے سوائے تمہارے کسی انسان سے محبت نہیں کی۔ |
| | | اور میں اس کے گھر کو چھوڑنے والی نہیں ہوں، جب تک وہ مجھے اپنی عنایت اور احسان کے ساتھ خود جانے کے لیے نہ کہہ دے |
| | | ہم آزاد عورتیں ہیں۔ اگر زمانہ ہمیں دوسری طرف لے جائے تو ہم اپنے مصائب کی شکایت سوائے خدا کے اور کہیں نہیں کر سکتے۔ |
| قیس | : | نہیں، تم میرے ساتھ جاؤ گی۔ |
| لیلی | : | نہیں، میں اس کے ساتھ کیے ہوئے عہد میں خیانت نہیں کروں گی اس لیے کہ وہ بھی اس عہد سے کبھی نہیں پھرا۔ |
| | . | وہ ایک صاف چشمے کی طرح ہے جس کا خلق ایک سا رہتا ہے اور وہ دوسرے نوجوانوں کی طرح ہر وقت رنگ نہیں بدلتا رہتا۔ |
| قیس | : | (طنز کے انداز میں) |
| | | میں دیکھ رہا ہوں کہ تو ورد کی محبت میں سچی ہے، اور میرے لیے تمہاری محبت ایک جھوٹ اور بہتان تھی۔ |
| لیلی | : | (چیخ کر) قیس! |

توفیق الحکیم کے بعض ڈرامے تو وہ ہیں جو اس نے ۱۹۲۳ میں فرانس جانے سے پہلے لکھے۔ یہ عام طرح کے ڈرامے تھے اور ان کے موضوع بھی کچھ سیاسی اور کچھ معاشرتی تھے۔ مثلاً اس نے اپنے ڈرامے "الضيف الثقيل" (بوجھل مہمان) میں برطانوی استعمار پر پھبتے اڑائے تھے۔ اسی طرح اپنے ڈرامے "المراۃ الجدیدۃ" (نئی عورت) میں اس نے عورت کے بے پردہ ہونے کے بارے میں اپنے موقف کا اظہار کرتے ہوئے کہا تھا کہ اس خطرے سے بچنا چاہیے۔ اسی عرصے میں اس نے "علی بابا" کے نام سے ایک غنائیہ ڈراما (اوپیرا) بھی لکھا تھا، لیکن وہ سٹیج نہ ہو سکا۔ پھر فرانس میں تین سال رہ کر ۱۹۲۷ میں واپس

آنے کے بعد توفیق الحکیم نے اپنے ڈراموں کا انداز بالکل ہی بدل دیا اور اب اس نے ایسے ڈرامے لکھے جنہیں اس نے "المسرح الذهني" (ذہنی ڈراما) کا نام دیا۔ اس طرح کے ڈرامے اس نے مغرب میں ابسن اور برنارڈ شا کے ہاں دیکھے تو ان سے متاثر ہو کر اس نے اس نئے دور میں "اهل الكهف" اور "شهرزاد" جیسے ڈرامے لکھے جو توفیق الحکیم کے فن ڈراما نگاری کی معراج سمجھے جاتے ہیں۔ ان کے ساتھ ساتھ اس نے معاشرتی، نفسیاتی اور سیاسی موضوعات پر بھی ڈرامے لکھے۔ ان میں "الخروج من الجنة"، "سر المنتحرة" (خودکشی کرنے والی کا راز) اور "نهر الجنون" کا نام لیا جا سکتا ہے۔ توفیق الحکیم کے ڈراموں کا مجموعہ دو جلدوں میں شائع ہوا۔ ان میں اهل الكهف اور شهرزاد اور اسی قبیل کے دوسرے ڈرامے ایسے ہیں جن کی بنا پر ڈراما نگاری میں توفیق الحکیم کی شہرت مستحکم چلی آتی ہے۔

☆.....☆.....☆

## زمانۂ حال کی عربی شاعری

اوپر جدید شاعری کے کچھ نمائندوں کا ذکر ہوا تھا۔ لیکن زیادہ عرصہ نہ گزرا کہ وقت کا یہ بے مروت دھارا شوقی، حافظ اور مطران کو پیچھے چھوڑ کر نئی گزرگاہوں میں نکل آیا۔ وہ یوں کہ ان شعراء کے زمانے کا اجتماعی اور خارجی مزاج شاعری بالآخر ایک ٹائپ بن جانے کی وجہ سے اپنی قدر کھونے لگا اور وجدانی اور انفرادی شاعری کا علم اٹھائے نوجوان شعراء کا ایک ایسا طبقہ ہر جگہ نمودار ہوا جس نے اپنے بڑوں کی اس شاعری سے بیزاری کا اعلان کیا اور اسے شعر المناسبات (تقریباتی شاعری) کا نام دے کر اس کا خاکہ اڑانے کی کوشش کی۔ مصر کے دو صف اول کے ادیب اور شاعر عباس محمود العقاد اور ابراہیم عبدالقادر المازنی اس تنقید و تنقیص میں پیش پیش تھے اور اس طبقے کے شعراء میں ابراہیم ناجی، ابوالقاسم الشابی، علی محمود طہ اور حسن کامل الصیرفی کے علاوہ شمالی اور جنوبی امریکہ کے بعض ممالک کو ہجرت کر جانے والے شعراء (شعراء المہجر) مثلاً جبران خلیل جبران، میخائیل نعیمہ اور ایلیا ابو ماضی کا ایک بڑا گروہ بھی شامل تھا۔ داخلی شاعری کا موضوع نفس انسانی اور اس کی گوناگوں کیفیات و واردات ہوتی ہیں۔ اس لیے اس دور کی شاعری میں قدرتی طور پر تنوع کی چاشنی اور دھنک کے رنگوں کی سی کیفیت پائی جانے لگی۔ پھر اس دور کے شعراء بھی تعداد میں زیادہ تھے اور ان میں جو سچے اور خالص فنکار تھے ان کا اپنا لب و لہجہ تھا، اپنا انفرادی رنگ تھا۔ کوئی ان میں صرف محبت و چاہت کا متلاشی تھا، کسی کے سر میں ایک پیہم کشمکش کا سودا سمایا ہوا تھا، اس زندگی کے کارزار میں بھی اور موت کے محاذ پر بھی۔ کوئی اپنے آپ کو اس زندگی کی حیاتی



لذتوں اور جسم و روح کی عیاشیوں میں ہی گم کر کے حقیقت کا کھوج پانا چاہتا تھا اور کسی کا وجدان رنج و الم افسردگی اور فکر میں محصور ہو کر رہ گیا تھا...... یہ کہنا تو بہت مشکل ہے کہ یہ نئی داخلی و وجدانی شاعری اپنی پیش رو شاعری کے مقابلے میں ہر لحاظ سے ایک بہتر اور اعلیٰ ترنمونہ بن کر آئی، اور نہ کوئی یہ دعویٰ کر سکتا ہے کہ اس طبقے میں شوقی جیسا قد آور شاعر بھی پیدا ہوا، لیکن اتنا ضرور کہا جا سکتا ہے کہ اس طرزِ سخن نے عربی شاعری کے چمن میں اتنے رنگا رنگ پھول کھلا دیے کہ دبستان عرب میں اس سے پہلے یہ دل فزا منظر کا ہے کو دیکھنے میں آیا ہوگا۔ عربی شاعری کے اس دور میں اچھے شعراء کی فہرست خاصی طویل ہے اور ان لوگوں کا زمانہ وہی ہے جس میں ہمارے یہاں ادب کی ترقی پسند تحریک کا ہر طرف شور و غلغلہ تھا۔

آگے بڑھنے سے پہلے یہاں مہجری شعراء کا کچھ ذکر مناسب ہوگا۔ جیسا کہ اوپر ذکر ہوا، یہ وہ لوگ تھے جو لبنان، شام اور فلسطین سے نکلے اور شمالی اور لاطینی امریکہ میں جا کر آباد ہو گئے۔ وہاں پہنچ کر ان کا سب سے بڑا مسئلہ اپنی شناخت کو قائم رکھنا اور اس تہذیبی صدمے (Shock) پر غلبہ پانا تھا جو انہیں وہاں کے حالات میں جا کے لگا۔ چنانچہ وہ پہلے تو کلاسیکی شاعری کی طرف متوجہ ہوئے لیکن پھر انہوں نے عباسی شعراء کی اس نصیحت پر عمل کرنا بہتر سمجھا کہ شاعر کو وہی کچھ لکھنا چاہیے جو اس کی روزمرہ گفتگو کا موضوع ہوتا ہے۔ نتیجتاً انہوں نے عربی شاعری کی تجدید کا فیصلہ کیا اور اس کے لیے دو تحریکیں سامنے آئیں ایک "الرابطة القلمية" (قلم کا رابطہ) اور دوسری "العصبة الاندلسية" (اندلسی گروہ)۔ مہجری شعراء نے اپنی اس کوشش میں ایک نیا محاورہ وضع کیا، نئے استعارے تلاش کیے اور نئی بحور و اوزان ایجاد کیے۔ اس ضمن میں انہوں نے دوسری زبانوں سے ترجمہ کرنے کی ضرورت کا بھی احساس کیا، تاکہ عربی زبان میں ترجموں کے ذریعے نیا خون داخل کیا جا سکے۔ ان شعراء میں نمایاں امین الریحانی (م ۱۹۴۰) اور جبران خلیل جبران (م ۱۹۳۱) تھے۔ اگرچہ جبران کی زیادہ شہرت اس کی شاعری کی وجہ سے نہیں بلکہ اس کی نثری تخلیقات کی وجہ سے ہوئی۔ الرابطة القلمية کے دوسرے شعراء میں نسیب عریضہ (م ۱۹۴۶) میخائیل نعیمہ، ایلیا ابو ماضی (م ۱۹۵۷) اور رشید ایوب (م ۱۹۴۱) تھے۔ میخائیل نعیمہ شاعر ہونے سے زیادہ ایک ممتاز نقاد اور نثر نگار تھا۔ اس کی کتاب "الغربال" (چھلنی) عربی ادب میں جدید تنقید کی پہلی اہم کتاب سمجھی جاتی ہے۔ اس نے تین جلدوں میں اپنی خود نوشت بھی لکھی۔ ان کے علاوہ لاطینی امریکہ میں الیاس فرحات، رشید سلیم الخوری (الشاعر القروی) اور فوزی معلوف بھی مہجر کے نمایاں شعراء میں تھے۔

اب ہم اس مقام پر آگئے ہیں جہاں سے عربی شاعری کا موجودہ تازہ ترین دور شروع ہوتا ہے۔ یہاں تھوڑی دیر کے لیے ٹھہر کر اس زمانے کے شرق اوسط کے سیاسی اور سماجی حالات پر ایک نظر ڈال

لیجئے۔ یہ وہ زمانہ ہے جب عرب اقوام نے دوسری عالمی جنگ کا خون اور آگ سے ترتیب دیا ہوا کھیل نہ صرف قریب کھڑے ہو کر دیکھا ہے بلکہ ان کے بعض علاقے اس مجنونانہ کھیل کا باضابطہ سٹیج بنے ہیں۔ جنگ کی لائی ہوئی قلت، مہنگائی اور معاشی لوٹ کھسوٹ نے اخلاق کے معیار بدل ڈالے ہیں۔ سوچنے کا انداز بدل دیا ہے اور پرانی قدروں کی جگہ نئی قدریں لا کھڑی کی ہیں۔ جنگ کے ایام میں عریاں ہو کر سامنے آنے والے سامراج کے خلاف دلوں میں نفرت اور کدورت اپنی آخری حدوں کو پہنچ گئی ہے اور اس سامراج کے مہرے اور کٹھ پتلیاں چاہے وہ حکومت کے ایوانوں میں ہوں یا رئیسانہ محلات میں، ان کے خلاف ایک ہمہ گیر بغاوت اُبھر رہی ہے..... اور اس جلتی پر جس المیے نے تیل کا کام کیا ہے وہ عربوں کے وطن فلسطین پر یہودیوں کا قبضہ ہے۔ یہودیوں کے خلاف پہلی جنگ (۱۹۴۸) میں عرب جن تلخ تجربوں سے گزرے ہیں، انہوں نے ان کی نئی نسل میں ایک برگشتگی ایک انتقامی جوش اور ایک زخم خوردہ جذباتی کیفیت پیدا کر دی ہے۔

☆.....☆.....☆

۱۹۴۰ کی دہائی کے آخری برسوں سے عربی شاعری میں چار بڑے رجحانات غالب رہے۔

- آزاد شاعری کی تحریک
- مجلّہ "شعر" کی تحریک (جو اس ادبی مجلّے کے صفحات پر چلی)
- حزیران (جون ۶۷ کی شکست) کا تجربہ
- بیروت پر اسرائیلی غلبے کا تجربہ

## آزاد شاعری کی تحریک (عراقی سکول) ۱۹۴۷ـ۱۹۵۷

۱۹۴۷ میں عراقی شعراء نازک الملائکہ اور بدر شاکر السیاب نے دو ایسی تجرباتی نظمیں شائع کیں جو جدید عربی شاعری کا عموماً اور آزاد شاعری کا خصوصاً نقطۂ آغاز ثابت ہوئیں۔ ان دونوں نظموں میں مصرعے چھوٹے بڑے تھے اور ان کی بحریں بھی ایک سی نہیں تھیں۔ ان نظموں کا نیا انداز اب تک کی مسلّمہ شعری اقدار کے خلاف گویا ایک بغاوت تھی۔

۱۹۴۹ میں نازک الملائکہ نے اپنا دوسرا مجموعہ "شظایا و رماد" (بم کے ٹکڑے اور راکھ) شائع کیا جس میں بہت سی آزاد نظمیں شامل تھیں۔ اس کے تعارف میں ملائکہ نے کہا کہ شاعری کی اب تک کی صورتیں بہت زیادہ برتی جا چکیں، اور اب ان میں آج کے شاعر کے ان تجربوں کا ٹھیک ٹھیک اظہار کرنے کی صلاحیت نہیں ہے جو دوسری جنگ عظیم کے بعد کے واقعات سے پیدا ہوئے ہیں۔ اس نے اس امر پر زور دیا کہ آزاد شاعری کا مصرع چاہے تین انچ کا ہو یا آٹھ انچ کا، شاعر کو اپنی بات کرنے کی پوری آزادی دیتا ہے اور اسے اپنی سطروں میں الفاظ کی بھرتی کرنے کی ضرورت پیش نہیں آتی۔



۱۹۵۰ کی دہائی کے درمیانی برسوں میں نازک الملائکہ، بدر شاکر السیاب، عبدالوہاب البیاتی اور بلند الحیدری نے شاعری کو نئے اور لچکدار قالب عطا کیے اور اسے ۱۹۳۰ اور ۱۹۴۰ کی دہائیوں کی حقیقت سے گریز کرنے والی (Escapist) شاعری کی جذبات نگاری سے آزاد کرا دیا۔ سیاب اور بیاتی کا تعلق عراق کی کمیونسٹ پارٹی سے تھا۔ اس تعلق نے عراق کے سیاسی اور سماجی مسائل کے بارے میں ان کے شعور و آگہی کو تیز و تند کر دیا۔ ان کو سب سے زیادہ اس بات کی فکر تھی کہ ان کی شاعری میں عام لوگوں کے مسائل کی عکاسی ہونی چاہیے۔ اسی لیے انہوں نے ایسی زبان لکھنے کی کوشش کی جو بالکل سامنے کی ہو اور بآسانی سمجھ میں آ سکے، لیکن اس میں شاعرانہ مضبوطی اور توانائی ضرور ہونی چاہیے۔ اپنی اس سیاسی وابستگی کی وجہ سے سیاب اور بیاتی کو حکومتی ظلم و ستم کا نشانہ بننا پڑا اور وہ جلاوطن بھی کیے گئے۔ لیکن اس سے ان کے یقین و اذعان میں کوئی کمی نہ آئی اور وہ اپنے فیصلے پر جمے رہے۔ ان حالات کا ذکر بدر شاکر السیاب کی طویل نظم "انشودۃ المطر" (بارش کا نغمہ) میں ملتا ہے جو بتاتی ہے کہ عراق میں کس طرح طاقت کا غلط استعمال ہو رہا ہے۔ یہ نظم جب بیروت کے ادبی رسالے الآداب (۱۹۵۴) میں شائع ہوئی تو اس نے آزاد شاعری کی تحریک کو ادب کی دنیا کے نقشے پر لا کھڑا کیا اور سیاب کو اپنی نسل کا پیش رو شاعر قرار دیا۔ سیاب کی یہ نظم پوری عرب دنیا میں مقبول ہوئی اور اس کی کامیابی کا راز یہ تھا کہ اس میں سیاب نے آزاد اور کلاسیکی دونوں طرح کی شاعری کو بڑی قابلیت سے ایک دوسرے میں مدغم کر دیا تھا۔ کلاسیک کا اثر عبدالوہاب البیاتی کی نظم "ارنسٹ ہیمنگوے کے لیے" میں بھی دیکھا جا سکتا ہے۔ اس میں بظاہر یہ لگتا ہے کہ بیاتی لورکا کی نقل اتار رہا ہے، لیکن دراصل وہ ایسی تکنیک سے کام لیتا ہے جو نظم کو بغیر انتباہ کے ایک تجربے سے دوسرے تجربے میں منتقل کر دیتی ہے۔ راست طرز خطاب سے بالواسطہ طرز خطاب میں اور ایک طرح کے جذبے سے دوسری طرح کے جذبے میں!

## مجلّہ "شعر" کی تحریک (شامی سکول) ۱۹۵۷ـ۱۹۶۷

جب شامی شاعر یوسف الخال ۱۹۵۵ میں امریکہ سے لبنان واپس آیا تو اس نے دیکھا کہ کوئی رسالہ یا جریدہ ایسا نہیں ہے جو صرف جدید شاعری کی اشاعت کے لیے وقف ہو۔ یہ دیکھ کر اس نے جدید شعراء کا کلام چھاپنے کے لیے ایک رسالہ اور ایک مطبع شروع کرنے کا فیصلہ کیا۔ ۱۹۵۶ میں اس نے کچھ ایسے

نوجوان شعراء کو اپنے گرد جمع کیا جو عرب شاعری میں انقلاب لانا چاہتے تھے اور جنوری ۱۹۵۷ میں اس نے سہ ماہی رسالہ ''شعر'' جاری کر دیا جس میں صرف شاعری چھپتی تھی۔ اس رسالے کے شعراء میں یوسف الخال' بدر شاکر السیاب' ایڈونس (علی احمد سعید)' انسی الحاج' شوقی ابی شقرا' نو آد رفقہ' محمد الماغوط' جبرا ابراہیم جبرا' توفیق صائغ' خلیل حاوی' ریاض الریس' عصام محفوظ' سعدی یوسف اور دوسرے لوگ شامل تھے۔ آزاد شاعری کے نمائندے نازک الملائکہ اور بلند الحیدری بھی اس رسالے میں باقاعدہ لکھتے تھے۔

مجلہ ''شعر'' کے شعراء نے شاعری کے بارے میں معروف سیاسی و سماجی اور ادبی نقاد انطون سعدہ کے انقلابی افکار کو اپنایا۔ اس نے اپنی ایک کتاب میں کہا تھا کہ شاعری کو صرف سیاسی اور سماجی حقیقتوں کی تصویری پیش نہیں کرنی چاہیے بلکہ اسے مستقبل کا رویا (Vision) بھی سامنے لانا چاہیے۔ اس نے کہا کہ شاعروں کو اپنے اظہار کی صورتیں اور پیکر خود تخلیق کرنے چاہئیں اور دنیا میں قبل از اسلام جو تہذیبیں پھلیں پھولیں ان کی روایات سے فائدہ اٹھانا چاہیے۔ اس نے معاصر شاعروں کو مشورہ دیا کہ شاعری کے کلاسیکی ورثے کی قدر و قیمت متعین کریں اور اس کے مثبت پہلوؤں کا تعلق دوسری ثقافتوں کے مثبت پہلوؤں کے ساتھ قائم کریں۔

مجلہ ''شعر'' کی تحریک سے وابستہ شعراء زیادہ تر عیسائی تھے اور اپنے مخصوص نقطۂ نظر سے لکھتے ہوئے انہوں نے عربی شاعری کے میدان میں کچھ وسعت پیدا کی۔ عرب قارئین کو پہلی بار دوسری تہذیب و ثقافت میں جھانکنے اور اسے سمجھنے کا موقع ملا۔ مثلاً یوسف الخال کی شاعری ایک مسیحی مابعد الطبیعیاتی تجربے کی بات کرتی تھی۔ دوسری طرف رفقہ عصری مسائل کے بارے میں مسیحی نقطۂ نظر سامنے لاتا تھا اور شقرا پہاڑی گاؤں میں رہنے والے لبنانی عیسائیوں کی زندگی کے مناظر دکھاتا تھا۔

یوسف الخال کا فکری انضباط' ایڈونس کے تصور و خیال کی قوت' انسی الحاج کا جارحانہ لہجہ' شقرا کا کٹیلا مزاج اور محمد الماغوط کا طنزیہ وار ـــــ یہ مجلہ ''شعر'' کی تحریک کے امتیازی خدوخال تھے۔ مجلہ شعر کے شعراء نے کلاسیکی اور جدید شاعری' زبان و بیان' ترجمہ اور مذہب کے بارے میں لوگوں کے خیالات کو کلی طور پر بدل دینے میں اہم کردار ادا کیا۔ رسالہ ''شعر'' نے اہم امریکی اور یورپی شعراء کا عرب قارئین سے تعارف کرانے میں بھی ایک فعال کردار ادا کیا۔ اس رسالے کی اشاعت ۱۹۶۳ میں بند ہو گئی۔ یہ ۱۹۶۷ میں پھر نکلنے لگا اور آخر ۱۹۷۰ میں ہمیشہ کے لیے بند ہو گیا۔

## حزیران (جون ۶۷ کی شکست) کا تجربہ: ۱۹۶۷ـ۱۹۸۲

حزیران (جون) ۱۹۶۷ کے مہینے میں عرب افواج پر اسرائیل کی مکمل فتح نے عرب دنیا کو حیران و



مبہوت کر دیا۔ بیروت کے رسالے "الآداب" نے اپنے اگست ۱۹۶۷ کے شمارے میں نزار قبانی کی نظم "علی هامش دفتر النکسة" (کتاب ہزیمت کے حاشیے پر) شائع کی جس میں شاعر نے شکست سے پاش پاش ہوئی قوم کی مزاجی کیفیت کو بہت عمدہ طریقے سے بیان کیا۔ اس نظم پر ساری عرب دنیا میں پابندی لگا دی گئی۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ یہ نظم ہر عرب ملک میں سمگل ہو کر پہنچی۔ خفیہ طریقے سے اس کی اشاعت کی گئی اور اسے بہت سے لوگوں نے زبانی یاد کر لیا۔ اس نظم نے سیاسی احساس محرومی اور غصے اور برہمی کا ایسا طوفان برپا کر دیا جس کا اظہار اب اس شاعری میں ہونے لگا جسے "ادب حزیران" کہا گیا۔ یہاں اس نظم کے ایک حصے کے کچھ اشعار درج کرنا بے محل نہیں ہوگا:

### کتاب ہزیمت کے حاشیے پر

اگر میری پیشی کا انتظام ہو جائے
اور میری بخیریت واپسی کا بھی
تو میں سلطان کو یہ کچھ کہنا چاہوں گا
اور سلطان بھی اس امر سے آگاہ ہو جائے گا

اے سلطان! اگر میرے کپڑے پھٹے ہوئے اور تار تار ہیں
تو اس کی وجہ یہ ہے کہ تمہارے خونخوار بھیڑیے مجھے پھاڑ کھانے کے لیے کھلے چھوڑ دیئے گئے ہیں
اور تمہارے ہر روز کے مخبر وہ لوگ ہیں
جو میرے ہر قدم کو کتوں کی طرح سونگھتے ہیں
تقدیر کی مانند اٹل!

وہ میری عورت سے بڑی تفصیل میں پوچھ گچھ کرتے ہیں
اور میرے ہر دوست کا نام لکھتے ہیں
تمہارے سپاہی مجھے لات مارتے ہیں اور پیٹتے ہیں
مجھے اپنے جوتوں میں سے کھانے پر مجبور کرتے ہیں
اس لیے کہ میں ان دیواروں تک پہنچنے کی جرأت کرتا ہوں
تمہارے سامنے حاضر ہونے کے لیے


Scanned with CamScanner

تم دو جنگیں ہار گئے
اور تمھیں کوئی یہ بتانے والا نہیں کہ کیوں
تمہاری رعایا میں آدھے لوگ تو گونگے ہیں
ان کی اَن سنی آہوں کا فائدہ ہی کیا
اور دوسرے آدھے جوان دیواروں کے درمیان ہیں
وہ خرگوشوں اور چیونٹیوں کی طرح
خاموشی سے اندر دوڑتے پھرتے ہیں

اگر مجھے سلطان کے پہرہ داروں سے امان مل جائے
تو میں کہوں گا: اے سلطان
تم نے جو جنگیں ہاری ہیں تو اس کی وجہ یہ ہے
کہ تمھیں انسانیت کے مفاد اور اس کی پکار سے دور
ان دیواروں کے درمیان محصور کر دیا گیا ہے

عرب لوگ جو ازالۂ فریبِ نظر (Disillusionment) سے گزر رہے تھے انہوں نے دیکھا کہ ارض فلسطین سے نکل کر باہر آنے والے نئے شاعروں میں محمود درویش، سمیح القاسم اور توفیق زیاد کی شاعری ان کے جذبات اور ان کی امنگوں کی ترجمان ہے۔ یہ شاعر جو اسرائیل میں رہ رہے تھے شعر تخلیق کرنے کو ایک اجنبی تہذیب کے درمیان رہتے ہوئے اپنی عرب شناخت کو منوانے کا واحد ذریعہ سمجھتے تھے۔ ان شعراء کو مزاحمت کے شعراء کہا گیا۔

شاعر اس وقت یہ سمجھتے تھے کہ ۱۹۶۷ کی جنگ نے عرب فوجی حکومتوں کے اخلاقی دیوالیہ پن کو اور اس سے پیدا ہونے والی اخلاقی خرابیوں کو بے نقاب کر دیا تھا۔ اس خیال کو سمیح القاسم کی نظم "ابناء الحرب" (جنگ کے بیٹے) میں ایک گہری طنز کی صورت میں پیش کیا گیا:

| جنگ کے بیٹے | ابناء الحرب |
|---|---|
| شادی کی رات | فی لیلة الزفاف |



| اسے جنگ کی طرف لے گئے | ساقوه للحرب |
|---|---|
| اور پانچ سال تنگی کے گزر گئے | ومرّت خمسة عجاف |
| اور ایک دن جب وہ سُرخ سٹریچر پر لیٹا ہوا واپس آیا | ويوم ان عاد على حمّالة حمراء |
| تو اسے بندرگاہ پر | لاقاه فى الميناء |
| اس کے تین بیٹے آ کر ملے | ابناؤه الثلاثة |

۱۹۷۳ کی جنگ میں عرب فوجوں کو جو جزوی فتح حاصل ہوئی اس نے ان کے رہنماؤں کا اعتبار کسی حد تک بحال کر دیا۔ ان دونوں جنگوں نے ایک متحدہ عربی شخصیت کا شعور پیدا کر دیا جس نے اپنے آپ کو ایک مشترکہ ثقافتی ورثے کے ساتھ وابستہ کیا۔ لیکن اس اتحاد نے عرب ریاستوں میں حکمرانوں کے نزدیک کچھ عدم استحکام کی کیفیت پیدا کر دی، اس لیے کہ ان کے باشندوں نے یہ کہنا شروع کر دیا کہ وہ عرب پہلے ہیں اور کسی خاص ملک کے باشندے بعد میں! اپنی حکومتوں کو استحکام بخشنے کے لیے ان کے قومی رہنماؤں نے عربوں کے ثقافتی ورثے کو مختلف حصوں میں تقسیم کرنے کی پالیسی پر عمل کرنا شروع کر دیا۔ جاہلی اور اموی شعراء سعودی شاعر کہلائے، عباسی شعراء عراقی کہلائے اور ابو تمام اور معرّی جیسے شاعر شامی شعراء ٹھہرے۔ تاہم حزیران کے شعراء اپنا الہام (inspiration) کلاسیکی ماضی میں ہی تلاش کرتے رہے، جہاں انہوں نے ایسی دنیا دیکھی جس میں عرب ثقافت ایک تھی۔

## بیروت کا تجربہ (۱۹۸۲)

جون ۱۹۸۲ میں اسرائیل نے لبنان پر حملہ کر دیا اور بیروت میں داخل ہو گئے۔ یہ پہلا موقع تھا کہ اسرائیل نے کسی عرب دارالحکومت پر قبضہ کیا تھا۔ بیروت کی تباہی کے عرب ثقافت پر تباہ کن اثرات پڑے۔

اسرائیل کے اس قبضے کے دوران میں جو شاعری کی گئی اس میں تین غالب پیکر (Images) اُبھر کر سامنے آتے ہیں۔ یہ ہیں: بازار، صحرا اور سمندر! سعدی یوسف محاصرے میں آئے ہوئے بیروت کے کوچہ و بازار کے مناظر کی تصویریں دکھاتا ہے۔ ایڈونس کی نظم "صحرا" ایک ایسے تہذیب یافتہ شہر کا بیان ہے جو اب ملبے میں تبدیل ہو چکا ہے۔ جب شہر نہ رہا تو پھر زندگی میں صحرا ہی باقی رہتا ہے جو اس نظم میں تطہیرِ ذات اور مراقبہ و استغراق کی جگہ ہے، جس میں انسان اپنی اصل کو واپس آ جاتا ہے۔

سمندر کا تصور محمود درویش کی مؤخر نظموں میں بار بار آتا ہے، جہاں یہ گھر سے بے گھر ہوئے


Scanned with CamScanner

فلسطینیوں کا ایک عارضی وطن ہے۔ اس کی نظم "ساحل اوقیانوس پر ایک قدیم اور خوبصورت شہر پر کچھ خیالات" اس وقت لکھی گئی جب تنظیم آزادیٔ فلسطین (P.L.O.) بیروت سے چلی گئی تھی۔ جبکہ اس مجموعے کی آخری سات نظمیں اس وقت لکھی گئیں جب اس تنظیم کی فوج طرابلس کو بھی چھوڑ رہی تھی۔ ان تمام نظموں میں مایوسی کی ایک کیفیت نفوذ کیے ہوئے لگتی ہے۔ یہ فلسطینیوں کے عدم تحفظ اور زود پذیری کی بے مثال تصویریں ہیں۔ یہ پہلا موقع تھا کہ ایک فلسطینی شاعر نے فلسطینی رہنماؤں کو اس بنا پر آڑے ہاتھوں لیا کہ انہوں نے لوگوں کو جھوٹی اُمیدیں دلائی تھیں۔ محمود درویش کے لیے اسرائیل کے لبنان پر قبضے نے یہ ثابت کر دیا کہ فلسطینی رہنماؤں میں فکریاتی جہت کی کمی تھی۔ ہمارے پاس صرف لفظ ہی لفظ ہیں' اس نے کہا' بس بولتے جاؤ اور بولتے جاؤ۔

مستقبل کا مؤرخ یہ بتائے گا کہ عربوں کی ثقافتی اور تہذیبی زندگی میں بیروت نے کیا کردار ادا کیا تھا۔ ایک وقت میں وہ واحد جگہ تھی جہاں مصر' شام' عراق اور دوسرے ملکوں کے شعراء آ کر پناہ لیتے تھے اس لیے کہ یہاں وہ اپنا کلام سنسر کے خوف کے بغیر شائع کر سکتے تھے۔ شاعروں کے لیے بیروت عرب ثقافت کی وحدت کی علامت تھی۔ برسوں پہلے سیاست دانوں نے عرب دنیا کو مختلف سیاسی ریاستوں میں تقسیم تو کر دیا' لیکن ان ملکوں کو وہ کوئی ثقافتی اور تہذیبی شناخت نہ دے سکے۔ چونکہ بیروت ان کی مملکتوں اور ان کے نظاموں کے لیے ایک خطرہ بنا ہوا تھا۔ اس لیے انہوں نے اسے تباہ کر دیا۔ اس کے شاعروں کو خاموش کر دیا اور انہیں اپنے اپنے ملکوں کو واپس چلے جانے پر مجبور کر دیا۔

عرب شاعری کی طاقت اس بات میں ہے کہ وہ افراد کی مصیبتوں اور المیوں کے بارے میں لکھتا ہے جو سیاست دانوں کے رویوں سے نالاں ہیں۔ سیاست دان قومیت کا نعرہ لگاتے ہیں اور علاقائی مفادات کی بات کرتے ہیں۔ شاعر فرد کا نعرہ لگاتے ہیں اور عرب عزت و وقار کو آگے بڑھاتے ہیں۔ ایک پروپیگنڈا کرتا ہے اور دوسرا سچ کہتا ہے۔ اس سے ظاہر ہے کہ عربی شاعری کا مستقبل خطرات سے خالی نہیں۔

یہ دیکھنا اب دلچسپی سے خالی نہیں ہو گا کہ کیا مستقبل کی شاعری ان شعراء سے آئے گی جو اپنے آپ کو ایک خاص عرب ملک کا باشندہ سمجھتے ہیں یا ان شعراء سے جو ایک ہی قدیم' لیکن حیات نو کی حامل اور متحرک روایت کے نمائندوں کے طور پر لکھیں گے!

زمانۂ حال کی عربی شاعری کی اس فصل کو اب اس شاعری کے کچھ ایسے نمونوں پر ختم کرتے ہیں' جن کی فکر انقلابی ہے' جن کے اندر غصہ اور برہمی کی باتیں ہیں' اجنبی نظاموں پر طنز ہے' عرب شیوخ و سلاطین پر کھلی کھلی چوٹیں ہیں اور سب سے بڑھ کر وہ مزاحمتی رویہ ہے جو فلسطین کے المیے سے پیدا ہوا ہے۔ اس حصے میں آٹھ جدید شاعروں کی تخلیقات سے ایک ایک نظم لی گئی ہے جو ان شاعروں کے طرزِ فن اور ان



کے خیالات کی اچھی نمائندگی کرتی ہے' سوائے محمود درویش کے' کہ اس کی اہمیت اور ہردلعزیزی کے پیش نظر اس کی چار نظمیں یہاں دی گئی ہیں۔ یوں ان شعراء کا کلام اتنا زیادہ اور پھیلا ہوا ہے کہ اگر ایک ہی شاعر کے تمام مجموعوں سے اچھی نظموں کا انتخاب کیا جائے تو اس کے لیے ایک کتاب درکار ہو گی...... ہر شاعر کی نظم سے پہلے اس شاعر کا بہت مختصر سا تعارف بھی دیا گیا ہے۔

## نزار قبانی (۱۹۳۲......)

شام میں دمشق کے ایک خوشحال گھرانے میں پیدا ہوا۔ شامی یونیورسٹی میں قانون کی تعلیم حاصل کی اور شام کے سفارتی محکمے میں شامل ہو گیا۔ چنانچہ مختلف یورپی اور ایشیائی دارالحکومتوں میں اپنے ملک کی نمائندگی کی۔ اس کا پہلا شعری مجموعہ "قالت لی السمراء" (مجھ سے گندم گوں دوشیزہ نے کہا) ۱۹۴۴ میں اس وقت شائع ہوا جب اس کی عمر ابھی انیس برس کی تھی' اور یہ فوراً ہی مقبول ہو گیا۔ اس کے بعد سے نزار قبانی کی مقبولیت اور شہرت بڑھتی ہی چلی گئی ہے۔ کچھ عرصہ پہلے تک اس کے پچیس شاعری کے مجموعے اور ایک خودنوشت شائع ہو چکی تھی۔ اس کی شاعری کے خاص موضوع دو ہیں: ایک عورت اور مرد کا رشتہ اپنی تمام ابعاد (dimensions) کے ساتھ اور دوسرے عرب سیاسی اور معاشرتی زندگی پر کھلی کھلی طنز اور مزاحمت کے رویے' جہاں کہیں بھی ہوں' ان کی حمایت! نزار لبنان میں رہتا ہے اور اس کا اپنا اشاعتی ادارہ ہے۔

### الحب والبترول (محبت اور پٹرول)

اس نظم میں شاعر ایک محبِ وطن عرب لڑکی کو زبان دیتا ہے اور وہ پٹرول کے چشموں کے مالک اپنے عرب خاوند سے یوں مخاطب ہوتی ہے:

(تم کب سمجھو گے اے میرے سردار!
کہ میں تمہاری داشتاؤں کی طرح ایک داشتہ نہیں
اور نہ تمہاری عروسی فتوحات میں ایک اور فتح ہوں
نہ میں ایک ہندسہ ہوں تمہاری شادی کے رجسٹر کا
(جو ہر سال اس میں درج ہوتا ہے)

تم کب سمجھو گے اے میرے، سردار!..... اے صحرا کے شتر بے مہار!)

اس طرح وہ اپنے متمول اور عیاش خاوند کو اپنے مختلف ہونے کا یقین دلاتی چلی جاتی ہے اور پھر اس سے صاف صاف کہتی ہے۔

(اے پٹرول کے حاکم اتر جا اپنی ہوس رانی کی دلدل میں اتر جا
اور یہ تیل کی دولت؟ اسے اپنی محبوباؤں کے قدموں میں بہا دے
تو نے پیرس کے شبانہ کلبوں میں اپنی رجولیت کا گلا گھونٹا
اور اپنا جذبۂ غیرت ان وحشیاؤں کی باہوں میں سلایا
تم نے قدس کو بیچا خدا کو بیچا..... اپنے پیاروں کی مٹی تک بیچی!
جیسے اسرائیل کے نیزے تمہاری بہنوں کے خون میں نہیں رنگے تھے
جیسے ہمارے گھر ہمارے در و دیوار نہیں ڈھائے گئے تھے
اور ہمارے مجھنے آگ کا ایندھن نہ بنے تھے
تم تو یوں سو رہے ہو جیسے یہ قیامت
تم پر نہیں گزری ہے
تم کب سمجھو گے اے میرے سردار!
اے صحرا کے اونٹ!
تمہارے اندر کا وہ "انسان" کب بیدار ہوگا؟)

## فدوی طوقان (۱۹۱۷.....)

فلسطین کے شہر نابلوس میں پیدا ہوئی اور وہیں تعلیم پائی۔ اس کے بھائی ایک معروف شاعر ابراہیم طوقان نے اسے شعر کہنے کی طرف راغب کیا۔ اس کی شروع کی نظمیں رومانی اور روایتی انداز کی تھیں۔ اس کے بعد اس نے آزاد شاعری شروع کی اور جب ۱۹۶۷ کی جنگ میں اس کا شہر اسرائیل کے قبضے میں چلا گیا تو اس کی شاعری میں مزاحمت کا رنگ پیدا ہو گیا۔ اس کی شاعری کے پانچ مجموعے شائع ہو چکے ہیں اور وہ ابھی تک اپنے شہر نابلوس میں رہتی ہے۔

### انگلستان میں ایک فلسطینی اردنی عورت

شاعرہ اس نظم میں اپنے قیام انگلستان کا ایک دلخراش تجربہ ایک مکالمے کی صورت میں پیش کرتی ہے



جو اس فلسطینی عورت اور ایک انگریز عورت کے درمیان واقع ہوتا ہے۔

(کیسا سوگوار موسم ہے یہاں!
.....آسمان ہر آن ایک دھند میں لپٹا ہوا ہے
تم کہاں کی رہنے والی ہو؟..... اسپین کی؟
نہیں میں اردن کی بیٹی ہوں
اردن؟ معاف کرنا میں سمجھ نہیں پائی
میرا وطن قدس کی وہ خنک پہاڑیاں ہیں
..... میرا وطن سراسر روشنی اور دھوپ ہے
اچھا اچھا اب میں سمجھی..... تم یہودیہ ہو
(آہ وہ گھاؤ جو میرے جگر تک چلا گیا..... بھیانک دشنام!))

## نازک الملائکہ (۱۹۲۳.....)

عراق کی شاعرہ اور نقاد۔ بغداد کے ایک ادبی گھرانے میں پیدا ہوئی۔ پہلے کچھ عرصہ بغداد کے ٹیچرز ٹریننگ کالج میں تعلیم پانے کے بعد وہ امریکہ کی پرنسٹن یونیورسٹی میں چلی گئی جہاں اس نے انگریزی ادب میں اختصاص حاصل کیا۔ اس نے عراق اور کویت میں اعلیٰ تعلیم کے اداروں میں تدریسی فرائض بھی انجام دیے۔ وہ عربی زبان میں آزاد شاعری کی تحریک کے نمایاں پیش رووں (Pioneers) میں سے ہے جس کی اس نے اپنی شاعری اور اپنی تنقید کے ساتھ پوری حمایت کی۔ اس کی شاعری کی خصوصیت اس کے موضوعات کا تنوع اور اشعار میں پیکروں کا استعمال ہے۔ ستر کی دہائی کے بعد سے اس نے اسلامی پارسائی کا پر جوش لہجہ اختیار کر لیا ہے جو معاصر صورت حال میں کم کم دیکھنے میں آتا ہے۔ اس کا پہلا مجموعہ "عاشقة الليل" ۱۹۴۶ میں آیا تھا۔ اس کے بعد اس کے تین اور مجموعے آ چکے ہیں۔ وہ شاعری کی بہت اچھی نقاد بھی ہے چنانچہ اس کی کتاب "قضايا الشعر المعاصر" (معاصر شاعری کے مسائل) اس زمانے میں شاعری کی تنقید پر بہت اچھا کام سمجھا جاتا ہے۔

### اشتراکی گیت

نازک الملائکہ اپنی اس نظم میں اشتراکیوں کے اس طریق کار کا مذاق اڑاتی ہے جو انہوں نے عرب

معاشرے میں اختیار کیا' اور جس میں ظن و تشکیک کی ایک رَو چلانا اور جاسوسی کی فضا قائم کرنا بنیادی اقدام ہے۔ ہر بات میں شک کرنا' حتیٰ کہ پھولوں اور دن رات کے لمحوں میں بھی شک کرنا کہ کہیں یہ ہمارے مقابلے میں عربوں کے طرفدار تو نہیں ہیں۔

(جب ان ٹیلوں پر رات اتر آئے تو اے ساتھی! اٹھ کھڑے ہونا
ہم تاک رکھیں گے اس کی' تاریکی کے روزن میں سے' اک گہری خاموشی میں
کون کہہ سکتا ہے؟ یہ اندھیارا شب کا چوری چھپے کوئی سازش کرلے
جھلمل کرتے تاروں اور شام کے سناٹے کو بھی اپنے ساتھ ملالے!
وہ اس لیے کہ یہ ٹیلے' اور وہ جو پگڈنڈی جاتی ہے
اور یہ اندھیارا' یہ سب دراصل کارندے ہیں..... کارندے ہیں!
اے ساتھی آ' اس یاسمن کو اس کی رجعت کیشی کی سزا دے ڈالیں
اور اس بدباطن سوسن کی مکاری سے بھی نمٹ لیں
اور وہ چشمے' ان کی ریشہ دوانی تو ابدی ہے' نجانے کب سے چلی آتی ہے
اور یہ شام کا لمحہ— یہ اپنے جھٹپٹے میں افواہیں پھیلانے ہی تو آتا ہے
اے ساتھی ہوشیار! کہ اس گلاب کے پھول کا بھی ایک مذہب ہے' عقیدہ ہے'
اور نکہتِ گل کی یہ تیز مہک؟— اس کی روح یقیناً عربی ہے' عربی ہے!)

## صلاح عبدالصبور (۱۹۳۱۔۱۹۸۱)

مصری شاعر اور ڈراما نگار۔ قاہرہ یونیورسٹی میں تعلیم پائی اور جدید مغربی ادب خصوصاً ایلیٹ کا خصوصی مطالعہ کیا۔ ماہانہ ادبی رسالے "الکاتب" کا مدیر رہا۔ نیز وزارت ثقافت میں انڈر سیکرٹری کے عہدے پر بھی کام کیا اور اس کے بعد اپنی وفات تک حکومت کے اشاعتی ادارے دارالمعارف کا ڈائریکٹر رہا۔ صلاح عبدالصبور کا پہلا شعری مجموعہ "الناس فی بلادی" ۱۹۵۷ء میں شائع ہوا۔ اس کے بعد اس کے دو اور مجموعے آچکے ہیں۔ علاوہ ازیں اس نے ادب اور تنقید پر متعدد مقالات بھی لکھے' جن سے تین مجموعے مرتب ہوئے۔ اس نے کئی ڈرامے بھی تخلیق کیے جن میں سے ایک "مأساۃ الحلاج" کا ترجمہ Murder in Baghdad کے نام سے ہوا۔ صلاح عبدالصبور معاصر عرب شعراء میں سب سے جدید اور ترقی پسند مانا گیا ہے۔ وہ اپنی نئی ڈکشن میں عرب دنیا میں جدید انسان کے مسائل پر اظہار خیال کرتا رہا۔



### بادشاہ عجیب بن خصیب کی ڈائری

صلاح عبدالصبور کی اس نظم میں طنز کا لہجہ کچھ زیادہ ہی راست اور کٹیلا ہے۔ اسکا ہدف کوئی قابلِ شناخت عربی سلطان ہے۔ یہ نظم چونکہ بہت طویل ہے اس لیے اس کا صرف ایک حصہ نمونے کے طور پر پیش ہے۔

(میں نے یہ فرماں روائی زورِ بازو سے نہیں' میراث میں پائی ہے
اپنے ستائیسویں جدِ اعلیٰ سے (اگر حرام کاری نے ہمارے خون میں ملاوٹ نہیں کر دی)
پھر بھی میں اپنے جد کی اس تصویر سے کتنا مشابہ ہوں..... جو اس کے مصور نے بنائی تھی
(اس مصور پر سنا ہے ملکۂ عالیہ کی نظر تھی)
اور باوجود قبلہ گاہ کے نصائح کے..... میں نے حوا کی بیٹیوں کو جانا پہچانا
ان کی لونڈیاں' جب شام کا اندھیرا چھانے لگتا
میرے پاس چلی آتیں..... میرے پہلو میں سوتیں..... لہو و لعب کرتیں
اور مجھے وہ سب کچھ سرگوشی میں بتلاتیں جو میرے قبلہ گاہ کا راز تھا
یعنی ان لمحوں کا حال' جب خون جوش میں ابلنے لگتا' اور پھر پیاس بجھانے بنا ٹھنڈا پڑ جاتا
اور وہ ایک چادر کھینچ کر اوپر تان لیتے
اور پھر جب ان کے کاہن ان کا تدارک کرتے..... ان کی خواہش ایک بلبلے سے لمس سے آسودہ ہو جاتی
اور وہ اپنے خدا کی ثنا کرنے لگتے
لیکن ایک شام..... کاہن کی حذاقت کے علی الرغم اس کی دوا ناکام ہوئی
اور قبلۂ سلطانی نے جام نا نوش کیا..... ان کی آنکھ سے اس وقت ایک آنسو ڈھلک آیا
ان کے ہاتھ میں اس وقت بھی ایک ریشمی پلو تھا)

## بدر شاکر السیاب (۱۹۲۶۔۱۹۶۴)

عراق کا یہ شاعر بصرے میں پیدا ہوا۔ بغداد کے ٹیچرز ٹریننگ کالج میں پہلے دو سال عربی ادب کی اور پھر دو سال انگریزی ادب کی تعلیم پائی اور ۱۹۴۸ میں گریجویشن کی۔ اس کے بعد اس نے سکول ٹیچر' سول ملازم اور صحافی کے طور پر کام کیا۔ ۱۹۴۰ کی دہائی کے آخری برسوں میں اس نے عراق کی کمیونسٹ

پارٹی میں شمولیت اختیار کی اور اس کا سرگرم کارکن رہا۔ لیکن پھر اسے چھوڑ دیا اس لیے کہ کمیونسٹ پارٹی کا رویہ فلسطینی مسئلے، عرب قومیت اور عرب ثقافتی ورثے کے بارے میں بالکل سرد مہری اور عدم ہمدردی کا تھا۔ اپنے آزاد خیالات کی وجہ سے وہ کمیونسٹوں کے بھی عتاب میں رہا اور عرب قوم پرستوں نے بھی اسے اپنا مخالف ہی سمجھا۔ اس مسلسل عقوبت کے ماحول نے اس کی صحت پر بُرا اثر کیا۔ وہ بیمار رہنے لگا اور بالآخر فالج میں مبتلا ہو کر کویت میں فوت ہو گیا۔

سیاب جدید عربی ادب کے چوٹی کے شعراء میں شمار ہوتا ہے۔ اس کے تجربوں نے جدید عربی شاعری کا دھارا ہی بدل دیا۔ ۱۹۴۰ کی دہائی کے آخری برسوں میں اس نے نازک الملائکہ کے ساتھ مل کر آزاد شاعری کی تحریک شروع کی اور اپنی تخلیقات کے طفیل اسے کامیاب بنا دیا۔ اس کا تیسرا شعری مجموعہ "انشودۃ المطر" (بارش کا نغمہ) جب شائع ہوا تو اسے اس وقت کا سب سے بڑا ادبی واقعہ سمجھا گیا۔ شاعری میں اس کے سات مجموعے ہیں اور کچھ تراجم ہیں آراگون، ناظم حکمت اور ایڈتھ سٹول کے۔ ایڈتھ کا ٹی ایس ایلیٹ کے ساتھ اس پر کافی اثر تھا۔

## بارش کا نغمہ

(شام چھائی لیتی ہے اور بادل
اپنے موٹے آنسو ٹپ ٹپ بہاتے ہیں
اس بچے کی طرح جو سونے سے پہلے بڑبڑاتا ہے
کہ اس کی ماں، جسے اس نے ایک سال پہلے
جاگ کر دیکھا تو وہ کہیں نہ تھی..... اور اس سے کہا گیا
اس کے بار بار پوچھنے پر
کہ وہ دو دن بعد واپس آ جائے گی
وہ ہر صورت میں واپس آئے گی
اگرچہ اس کے ساتھی سرگوشی میں اس سے کہتے کہ وہ تو وہاں ہے
پہاڑی کی طرف، اپنی قبر میں موت کو گلے لگا کر سوئی ہوئی
مٹی چاٹتی اور بارش پیتی ہوئی
ٹپ ٹپ..... ٹپ ٹپ
ٹپ ٹپ



## عبدالوہاب البیاتی (۱۹۲۶۔.....)

یہ عراقی شاعر بغداد میں پیدا ہوا اور وہیں کے ٹیچرز ٹریننگ کالج میں تعلیم پائی۔ اس سے فارغ ہو کر اس نے عربی زبان و ادب میں تدریس کا پیشہ اختیار کیا۔ وہ کئی سال عراق کی کمیونسٹ پارٹی کا رکن بھی رہا۔ لیکن بعد میں نظریات میں اختلاف کی وجہ سے اس سے قطع تعلق کر لیا۔ تدریس کے علاوہ اس نے صحافی اور سفارتی اہلکار کے طور پر بھی کام کیا۔ اس کا پہلا شعری مجموعہ ۱۹۵۰ میں شائع ہوا اور ۱۹۵۴ میں اس کا دوسرا مجموعہ "اباریق مھشمۃ" (ٹوٹی پھوٹی صراحیاں) جب منظر عام پر آیا تو اس نے شاعر کو تمام عرب دنیا میں مشہور کر دیا۔ اپنے انتہا پسندانہ سیاسی میلانات کی وجہ سے بیاتی کو کئی دفعہ ملازمت سے ہاتھ دھونے پڑے اور وہ جلاوطن بھی ہوا۔ جلاوطنی کا یہ عرصہ اس نے شام، لبنان، مصر اور روس میں گزارا۔ اس کے باوجود وہ لکھتا رہا اور جدید عرب شعراء میں وہ کثیر الکلام لوگوں میں شمار ہوتا ہے۔ وہ ۱۹۷۲ میں بغداد واپس آیا تو حکومت نے اسے کافی عزت دی اور پھر اسے میڈرڈ کے عراقی سفارتخانے میں ثقافتی اتاچی کے عہدے پر مامور کر دیا۔ بیاتی اب بھی میڈرڈ میں رہتا ہے۔ اس کی بائیں بازو سے وابستہ شاعری بہت سے مطالعات کا موضوع رہی ہے۔ پہلے اس کی شاعری مجموعِ نظمیں (Collected Poems) کے عنوان سے تین جلدوں میں شائع ہوئی تھی۔ بعد میں اس کی شاعری کا ایک اور مجموعہ بھی آ گیا۔

## مختصر تقریر کے لیے معذرت

(خواتین و حضرات!
میری تقریر مختصر ہے
میں نہیں چاہوں گا کہ لفظ میرا زیادہ وقت لیں
میری زبان
کوئی لکڑی کی تلوار نہیں ہے
میرے الفاظ اے خواتین سونا ہیں
میرے الفاظ اے حضرات غصے کے آنسو ہیں
میں بِکے ہوئے نہیں ہوں، صرف تھکا ہوا ہوں
شمعیں بجھتی جاتی ہیں
راتیں ٹھنڈی پڑتی جاتی ہیں

میں اپنا دل ایک بریف کیس میں لیے پھرتا ہوں
ایک مردہ بچے کی طرح
ہزاروں غداریوں اور ارزاں جھوٹوں کے درمیاں
میری تقریر مختصر ہی ہے
میں پیے ہوئے نہیں ہوں، صرف اپنے مصائب سے کھیل رہا ہوں
میں کوئی میز نہیں ہوں
روم جل رہا ہے
اور میری روح کا دم گھٹا جاتا ہے
ہزاروں غداریوں اور ارزاں جھوٹوں کی وجہ سے
خدا حافظ
خواتین و حضرات!.....)

## سمیح القاسم (۱۹۳۹.......)

اس شاعر کا تعلق فلسطین کے گاؤں جلیلی سے ہے۔ وہ ایک دروز خاندان میں پیدا ہوا اور راما اور ناصرہ میں تعلیم پائی، جس کے بعد اس نے ایک اسرائیلی پبلک سکول میں مدرسی اختیار کی۔ لیکن اپنے سیاسی نظریات کی وجہ سے وہاں سے نکال دیا گیا۔ وہ اسرائیلی کمیونسٹ پارٹی کا ممبر بھی رہا۔ نیز اس نے حیفا میں بطور صحافی کے کام کیا اور اس کے ساتھ عربی پریس اور فلسطینی لوک فن کے مراکز کے امور کی نگرانی کی۔ اپنی شاعری اور سیاسی وابستگی کی وجہ سے وہ کئی مرتبہ یا تو قید رہا ہے یا گھر میں محصور رکھا گیا ہے۔ سمیح القاسم ابھی تیس سال کا ہی تھا جب اس کی شاعری کے چھ مجموعے شائع ہو کر نہ صرف فلسطینی گاؤں جلیلی میں، بلکہ پورے عرب کے عوام و خواص میں مقبول ہو چکے تھے۔ اس کی شاعری کا موضوع زیادہ تر فلسطینی قید و بند اور کشمکش اور مزاحمت ہے۔ اب تک اس کے کل ملا کر پچیس مجموعے شاعری کے، ایک خود سوانحی ناول، ایک ڈراما اور ایک روزنامچہ شائع ہو چکے ہیں۔ اب سے بیس سال پہلے وہ حیفا میں ہی رہتا تھا اور اس نے "الاتحاد" اور "الجدید" نامی رسالوں کے لیے بہت سے مقالات اور نظمیں لکھی تھیں۔

### رفاح کی ایک لڑکی

(ببول کا درخت جھکا ہوا ہے



رفاح کے گیٹ موم سے مہر بند کیے ہوئے ہیں
ان پر کرفیو کا تالا ہے
لڑکی کا کام یہ ہے
کہ روٹی اور پٹیاں ایک زخمی سپاہی کے لیے لے جائے
جو آدھی رات کے بعد گھر پہ آیا تھا

لڑکی کو ایک گلی پار کرنی تھی
جس پر اجنبی آنکھیں پہرہ دے رہی تھیں
جس پر بندوقوں نے نشانے باندھے ہوئے تھے
ایک چلتی زرخ بدلتی ہوئی تیز ہوا میں

ببول کا درخت جھکا ہوا ہے
رفاح میں ایک گھر کا دروازہ
ایک زخم کی طرح کھلتا ہے
وہ کود کر صحن میں جا پڑتی ہے
دوسری مرتبہ کودنے سے ایک پام کا درخت
ایک وحشت کی پڑی پر کھڑا اسے اپنے ساتھ لپٹا لیتا ہے

وہ تیسری مرتبہ کودتی ہے
یکا یک ایک تیز شعاع لپکتی ہے
رک جاؤ!.....کون ہے وہاں؟
پانچ بندوقیں
وہ آنکھیں پھاڑے دیکھتی ہے..... پانچ بندوقیں!

ببول کا درخت پھٹ کر دو حصے ہو چکا ہے

دوسری صبح ایک عدالت لگی ہوئی ہے
مجرم کے لیے
قاتل کے لیے
جو آٹھ سال کی بچی تھی!.....)

## محمود درویش (۱۹۴۲.....)

فلسطینی شاعر محمود درویش ایک گاؤں البروہ میں پیدا ہوا' جو عکا کے میدانی علاقے کے مشرق میں تھا۔ یہ گاؤں ۱۹۴۸ کی جنگ میں اسرائیلیوں نے اس طرح تباہ کیا کہ اس کا نشان بھی باقی نہ رہا اور محمود اپنے ہی وطن میں مہاجر بن کے رہ گیا۔ وہ بہت شروع میں ہی سیاسی کشمکش کی راہ پر چل دیا اور اسرائیل کی کمیونسٹ پارٹی راکہ میں شمولیت اختیار کر لی جس کے نتیجے میں اس نے اسرائیلی حاکموں کے ہاتھوں مسلسل ایذا رسانی اور خانہ بندی کا عذاب جھیلا۔ جب وہ فلسطین میں تھا تو جلیلی میں رہتا تھا' اور کچھ عرصے کے لیے اس نے راکہ کے اخبار "الاتحاد" کی ادارت بھی کی۔ ۱۹۷۱ میں وہ اسرائیل کو خیرباد کہہ کے بیروت چلا آیا جہاں اس کی شہرت بطور ایک مزاحمتی شاعر کے مستحکم ہوتی چلی گئی۔ اس کی شاعری میں اب نزاکت خیال (Sophistication) زیادہ ہو گئی اور وہ اپنی نظموں میں اکثر علامات اور اساطیر سے کام لینے لگا' جس سے اس کے موخر زمانے کے کلام میں کچھ ابہام سا دیکھا جانے لگا ہے۔ کچھ عرصہ پہلے تک اس کی شاعری کے چودہ مجموعے شائع ہو چکے تھے۔

محمود درویش کو ۱۹۶۹ کا لوٹس انعام دیا گیا جو اس نے نئی دہلی میں افریقی ایشیائی ادباء کی کانفرنس (نومبر ۱۹۷۰) کے موقع پر آنجہانی اندرا گاندھی کے ہاتھوں وصول کیا۔ اس کے بعد ۱۹۸۳ میں اسے لینن انعام سے نوازا گیا۔ محمود نے ۱۹۸۲ کے بعد بیروت کو بھی چھوڑ دیا۔ اب وہ پیرس میں رہتا ہے جہاں وہ فلسطینی ادبی رسالے "الکرمل" کا مدیر ہے۔ PROTA محمود درویش کی شاعری کے ایک مجموعے کا انگریزی میں ترجمہ کرنے کا اہتمام کر رہی ہے۔

ذیل میں اس کی چار نظمیں اس کے نمونہ کلام کے طور پر پیش ہیں۔

### وفا

(تمہاری آواز میرے دل میں' میری رگ جاں میں گونجتی ہے



اگر تم اس معرکے میں میرے ہمرکاب نہیں بھی ہو تو کیا ہے
یہ ساری کہانی جواب میرے لہو میں شامل ہو چکی ہے
اس نے میرے رگ و پے میں نفرت بھر دی ہے
اور میرے ہونٹوں پر آگ کا فتیلہ رکھ دیا ہے
میں اپنے شعروں کو اور ان کے حسن بیاں کو ہوا میں بکھیر دوں گا
اگر میرے اوزان اور قافیے شعلہ اگلتی ہوئی تلواریں ثابت نہ ہوئے!

لفظ کی حرمت پر میرا ایمان ہے
چاہے اس کی خاطر میں مر کر خاک ہو جاؤں' یا زندہ رہوں اور دشمن کی گھات میں بیٹھوں
لفظ کی تاثیر پر میرا ایمان ہے
چاہے اس آگ میں خود میں جل کر راکھ ہو جاؤں..... یا میرا دشمن اس میں بھسم ہو

اگر میں قلم ہاتھ میں تھامے کھیت بھی رہوں گا
تو لوگ میرے کتبے پر تحریر کریں گے "وہ شخص جو مرا نہیں تھا")

### شناختی کارڈ

(لکھو
کہ میں ایک عرب ہوں
اور میرے کارڈ کا نمبر پچاس ہزار ہے
میرے بچے آٹھ ہیں
اور نواں..... اس گرما کے بعد آنے والا ہے
کیا تمہیں یہ بات اچھی نہیں لگی؟

لکھو
کہ میں ایک عرب ہوں


Scanned with CamScanner

پتھروں کی ایک کان میں اپنے جفاکش ساتھیوں کے ساتھ محنت کرتا ہوں
میرے بچے آٹھ ہیں
ان کے لیے میں چٹان تلے سے
روٹی کھینچتا ہوں
اور کپڑے، کتابیں اور کاپیاں!
میں تمہارے در پر خیرات کا وسیلہ نہیں ڈھونڈتا
نہ تمہاری سرزنش کی دہلیز پر
اپنے آپ کو چھوٹا ہونے دیتا ہوں
کیا تم کو میری یہ بات بُری لگی ہے؟

لکھو
کہ میں ایک عرب ہوں
ایک نام جس کا کوئی لقب نہیں
ایک ایسے وطن میں صابر و قانع، جس میں ہر ذی نفس
غیظ کی ایک ہیجانی کیفیت میں رہتا ہے
میری جڑیں
زمانے کی ولادت سے
اور صدیوں کے آغاز سے پہلے
سبزے کی روئیدگی
اور سرو و سمن کی نشوونما سے بھی پہلے
اس زمین میں بہت گہری اتر گئی تھیں
میرا باپ..... ہل کے قبیلے سے ہے
تمہارے اشراف و اعیان سے نہیں
اور میرا دادا بھی ایک دہقان تھا
جس کا نہ حسب تھا نہ نسب
مجھے کتابوں سے پہلے، مشرق سے چڑھتا سورج زندگی کا سبق دیتا ہے



اور میرا گھر..... ایک رکھوالے کی کٹیا ہے
لکڑیوں اور بانسوں سے بنی
کیا تم میرے اس سماجی رشتے سے خوش ہو؟
میں، کہ ایک نام ہوں جس کا کوئی لقب نہیں!

لکھو!
کہ میں ایک عرب ہوں
میرے بالوں کا رنگ جلے کوئلے کا ہے
اور آنکھوں کا رنگ چاکلیٹی
اور میرے شناختی نشان؟
میرے سر پر کوفیہ ہے، جس پر عقال بندھا ہے
میری ہتھیلی پتھر کی طرح سخت اور کھردری ہے
جسے ہاتھ میں لینے سے نرم ہتھیلیوں میں خراشیں پڑتی ہیں
میرا پتہ؟
میں ایک دور کھڑے گاؤں سے ہوں جسے اب دنیا بھول چکی ہے
اس کی گلیوں اور کوچوں کا کوئی نام نہیں
اور اس کے سب باسی کھیتوں میں ہوتے ہیں یا پھر پتھر کی کانوں میں
کیا تمہیں یہ سب بُرا لگتا ہے

لکھو!
کہ میں ایک عرب ہوں
تم نے میرے اسلاف کی انگور کی بیلیں چھین کے لے لیں
اور وہ قطعہ ارضی بھی جو ہم جوتتے تھے
میں اور میرے سب بچے!
اور تم نے کچھ بھی نہ چھوڑا میرے لیے
اور میرے ان بیٹوں اور پوتوں کے لیے


Scanned with CamScanner

سوائے ان چٹانوں کے
کیا ان کو بھی تمہارے یہ حاکم سلب کر لیں گے؟
اگر ایسا ہے
تو پھر صفِ اول کی پیشانی پر لکھ لو
کہ میں، جو انسانوں سے نفرت نہیں کرتا
نہ کسی پر غلبہ و سطوت چاہتا ہوں
میں جب فاقوں مرتا ہوں
تو اپنے غاصب کا گوشت نوچ کے کھاتا ہوں
ڈرو اور حذر کرو!
میرے فاقوں سے
اور میرے طیش و غضب سے!)

## ایک طرح کا گیت

(تمہارے لب شہد ہیں، اور تمہارے ہاتھ)
صہبا کے دو جام ہیں
دوسروں کے لیے!

گھنا درخت باد کش ہے، شاہ بلوط کا سوکھا جھاڑ
چھوٹی کنگھی ہے
دوسروں کے لیے!

تمہارے سینے کا مخمل اور شبنم اور ڈیزی کے گرے پھول
ایک فرش ملائم ہے
دوسروں کے لیے!



اور میں جو تمہاری اندھیری فصیلوں پر بے خواب راتیں کاٹتا ہوں
میں صحرائی ریتوں کی پیاس ہوں..... اور اپنے اعصاب میں
ایک سلگتا ہوا آتش دان ہوں
وہ کون ہے جس نے مجھ پر تمہارے دروازے بند کیے ہیں
وہ سرکش و جابر کون ہے؟
مجھے تمہارے شہد کی چاہ رہے گی
کیا ہوا اگر اب یہ شہد اغیار کے پیالوں میں ٹپکتا ہے
اے مدھ مکھی!
جس نے سوائے لب یاسمن کے اور کسی شے کا رس نہیں چوسا

## تنی ہوئی پیشانی اور برہمی

(اے میرے وطن اے شہباز!
جو اپنے قفس کی چوبی سلاخوں میں سے
میری آنکھوں میں
ایک سرخ انگارا سی منقار گاڑے دیتے ہو
موت کے حضور میں
میرا کل سرمایہ بس اتنا ہی ہے
یہ تنی ہوئی پیشانی اور حالتِ برہمی!

میں نے وصیت کی ہے کہ میری قبر پر میرے دل کی جگہ سے ایک شجر نمو کرے
اور میری جبیں پر چکاوک آ کے بسیرا کریں
اے شہباز!
میں ہرگز تیرے پروں کی اوٹ کے لائق نہیں ہوں
میرے لیے انگاروں کا تاج ہی بہتر ہے
میرے وطن! ہم نے تمہارے زخموں کے ساتھ جنم لیا تھا
اور تمہارے زخموں کے ساتھ ہی پروان چڑھے

ہم نے بلوط کے درخت سے رزق حاصل کیا
تا کہ جب تمہاری صبح نمود کرے تو ہم اس کا نظارا کر سکیں

اے شہباز!
جو بے جواز اور بے سبب
زنجیروں میں جکڑے ہو
اور اے داستانی موت، جس کی ہم سب کو خواہش رہی
تمہاری سرخ انگارا منقار میری دونوں آنکھوں میں
شعلے کی ایک تلوار کی مانند گڑی ہے
اور میں ہرگز تمہارے شہپر کے لائق نہیں ہوں
موت کے حضور میں میرا کل سرمایہ بس یہی ہے
یہ تنی ہوئی پیشانی اور ایک حالت برہمی!

☆...... ☆...... ☆



Scanned with CamScanner

# کتابیات

## عربی


۱. تاریخ الادب العربی — احمد حسن الزیّات
۲. الوسیط فی الادب العربی و تاریخه — مصطفی عنانی و احمد الاسکندری
۳. المفصّل فی تاریخ الادب العربی — احمد الاسکندری، احمد امین، علی الجارم، عبدالعزیز البشری، احمد ضیف
۴. المجمل فی تاریخ الادب العربی — طٰہٰ حسین، احمد الاسکندری، احمد امین، علی الجارم، عبدالعزیز البشری، احمد ضیف
۵. الادب العربی (جز آن) — الدکتور عمر فروخ
۶. الشعر و الشعراء — ابن قتیبه
۷. دیوان الحماسة (ابو تمّام) — بشرح التبریزی
۸. المفضّلیات — ابن الضبی
۹. جمهرة اشعار العرب فی الجاهلیة والاسلام — القرشی
۱۰. شرح المعلّقات السبع — للزوزنی
سلسلة "الروائع" — فؤاد افرام البستانی
۱۱. الشعر الجاهلی . الشنفری
۱۲. امرؤ القیس
۱۳. طرفة و لبید
۱۴. عمرو بن کلثوم. حارث بن حلّزه
۱۵. زهیر بن ابی سلمی
۱۶. عنتره بن شدّاد
۱۷. النابغة الذبیانی
۱۸. الاعشی الأکبر
۱۹. کعب بن زهیر
۲۰. الخنساء
۲۱. الحُطیئه
۲۲. الاخطل (۳)
۲۳. الفرزدق (۲)
۲۴. جریر (۲)




Scanned with CamScanner

سلسلة "المجانى الحديثة عن مجانى الاب شيخو" — فؤاد افرام البستانى

٢٥. العصر الجاهلى
٢٦. عصر صدر الاسلام والدولة الأموية
٢٧. العصر العباسى
٢٨. النثر العباسى

سلسلة "مناهل الادب العربى"

٢٩. عمر بن ابى ربيعه
٣٠. شوقى (جزآن)
٣١. الامير شكيب ارسلان
٣٢. شعراء البلاط الاموى — الدكتور عمر فروخ
٣٣. ديوان المتنبى — بشرح البرقوقى
٣٤. ديوان ابن زيدون — كامل كيلانى' عبدالرحمان خليفه
٣٥. ترجمان الاشواق — ابن العربى
٣٦. كليلة و دمنة — ابن المقفع
٣٧. الادب الصغير' الادب الكبير — ابن المقفع
٣٨. رسائل الجاحظ — الجاحظ
٣٩. مقامات بديع الزمان الهمذانى — الهمذانى
٤٠. مقامات الحريرى — الحريرى
٤١. فى الادب الاندلسى — الدكتور جودة الركابى
٤٢. الادب العربى المعاصر فى مصر — الدكتور شوقى ضيف
٤٣. الادب القصصى و المسرحى فى مصر — الدكتور احمد هيكل
٤٤. ديوان محمود درويش (مجلّدان) — محمود درويش
٤٥. مجلّة "الآداب" البيروتية — (١٩٦١-١٩٦٣)

## English

1. A Literary History of the Arabs — R.A. Nicholson
2. Arabic Literature — H.A.R. Gibb
3. Arabic Literature — I.M. Filshtinsky
4. A Critical Introduction to Modern Arabic Poetry — M.M. Badawi
5. Modern Poetry of the Arab World — Abdullah-ul-Udhari
6. Modern Arabic Poetry-An Anthology — Edited by Salma Khadra Jayyusi
7. The Arabic Novel ----- A Historical and Critical Introduction — Roger Allen
8. Victims of a Map — Samih-ul-Qasim, Adonis, Mahmud Darwish,
   Translated by Abdullah-ul-Udhari
9. Modern Arabic Poets (1950-1975) Issa J. Boullata




Scanned with CamScanner

## اردو

۱۔ عربی ادب کی تاریخ (جلد اول وجلد دوم) ڈاکٹر عبدالحلیم ندوی

۲۔ عربی شاعری: ایک تعارف (آغاز تا عہد بنی اُمیہ) ڈاکٹر خورشید رضوی

۳۔ اندلس کی اسلامی میراث: عربی شاعری اندلس میں (ایک طائرانہ جائزہ) ڈاکٹر خورشید رضوی

۴۔ تالیف (مجموعۂ مضامین) ڈاکٹر خورشید رضوی

۵۔ عربی ادب میں مطالعے محمد کاظم

۶۔ اخوان الصفاء اور دوسرے مقالات محمد کاظم

۷۔ اردو دائرہ معارف اسلامیہ

☆......☆......☆

ہجری سن معلوم کرنے کا طریقہ:

ہجری سن = (عیسوی سن ـ ۶۲۱) / ۰۹۷ء

# اشاریہ

## اسماء

Scanned with CamScanner

# اشاریہ

## کتب

# اشاریہ

## مقامات


برقی کتب (E-book) کی دنیا میں خوش آمدید
آپ ہمارے کتابی سلسلے کا حصہ بن سکتے ہیں
مزید اس طرح کی شان دار، مفید اور نایاب کتب کے
حصول کے لیے ہمارے واٹس ایپ گروپ کو جوائن
کریں
ایڈمن پینل :
محمد ذوالقرنین حیدر : 03123050300
محمد ثاقب ریاض : 03447227224
سدرہ طاہر : 03340120123
Imagitor



محمد کاظم

۱۔ اخوان الصفاء اور دوسرے مضامین

۲۔ جنیدِ بغداد: سوانح، نظریات، رسائل

۳۔ عربی ادب میں مطالعے

www.sang-e-meel.com
ISBN 969-35-1545-5
9 799693 515458
Rs. 1500.00